رجسٹرڈ نمبر ایل-۱۸۹۲

جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین - ایم اے، پی ایچ ڈی

قیمت سالانہ صہ؍ مطبع جامعہ دہلی فی پرچہ ۸؍

نقش چغتائی

یعنی

عبدالرحمن چغتائی کا دوسرا کارنامہ

اس میں رنگین اور سادہ انیس تصاویر ہیں جو مرقع چغتائی سے الگ اور مختلف اشعار پر ہیں۔ کتاب کی تقطیع کسی قدر چھوٹی یعنی ۲۰×۱۷/۸ سائز کی ہے۔ کاغذ نفیس، طباعت عمدہ، جلد بہت لچکدار، ضخامت دو سو صفحات اور ہر صفحہ دو رنگ میں چھپا ہوا ہے۔

احباب کی خدمت میں یہ ایک اچھا تحفہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ قیمت صرف پانچ روپئے۔

خطبات خالدہ خانم

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے وہ آٹھ خطبات جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مرکزی حال میں تقریباً ایک ماہ تک دئے۔ لایق خاتون کی تقریروں کا موضوع بھی بڑا ہی دلچسپ تھا یعنی "ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش" یہ سب خطبات کتابی صورت میں شائع ہوگئے ہیں۔ جلد طلب کیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت اردو صرف عہ، انگریزی سے ر

اصول تعلیم

از

خواجہ غلام السیدین صاحب ایم، ایڈ

اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اب اچھے تعلیم یافتہ حضرات اس جانب متوجہ ہوگئے ہیں اور اسے خالص علمی مضامین کیلئے بھی اظہار خیال کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ خواجہ صاحب ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈہ کے پرنسپل ہیں اور اس لئے اس موضوع پر لکھنے کا پورا حق رکھتے ہیں۔ کتاب اساتذہ اور تعلیمی طبقہ کے مطالعہ کے لایق ہے اور ہر اسکول اور کالج کے کتب خانہ میں ضرور ہونی چاہئے قیمت للعہ

نیم شب (ڈراما)

از

جناب اشتیاق حسین صاحب قریشی۔ ایم۔ اے

اس ڈرامے کا زمانہ سنہ ۱۹۸۵ء ہے مصنف نے یہ مان کر کہ اس وقت ہندوستان میں اشتراکیت کا زور ہوگا فنی حیثیت سے وہ جد وجہد، دشواریاں، مصائب کامیابیاں اور ناکامیاں دکھائی ہیں جو ہر بڑی تحریک کا خاصہ ہیں۔

قیمت صرف ۸ر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

قائم مقام ایڈیٹر :- محمد عاقل - ایم اے

نمبر ۷	جولائی ۱۹۳۵ء	جلد ۲۴

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا)

حکومت ہند کا مجوزہ دستور

سنہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے ذریعہ سے جو اصلاحات ہندوستان کے دستور اساسی میں پارلیمنٹ نے کی تھیں وہ عارضی اور تجربہ کے لئے تھیں اور پارلیمنٹ نے یہ پیشگی فیصلہ کیا تھا کہ دس سال بعد تمام مسئلہ پر از سر نو غور کیا جائے گا اور اس عرصہ میں اصلاحی تجاویز کے عملی تجربہ سے جو خرابیاں اور نقائص ظاہر ہوں گے ان میں ترمیم اور تنسیخ کی جائیگی۔ ہندوستانی قوم پرستوں کو یہ اصلاحی تجاویز ابتدا ہی سے ناپسند تھیں۔ اُنھوں نے ان کے خلاف طرح طرح سے احتجاج کئے اور چاہا کہ مقررہ مدت سے پہلے ہی ان میں ان کی مرضی کے مطابق رد و بدل ہو جائے۔ لیکن باوجود سخت شورش و ہنگامہ کے اس چیز کی طرف دھیان نہیں دیا گیا گو حکومت ہند اور صوبجاتی حکومتوں کی طرف سے کچھ سرکاری اور غیر سرکاری کمیٹیاں اصلاحات کے متعلق رپورٹیں وغیرہ تیار کرتی رہیں۔ جب مقررہ مدت کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو بہت سی کمیٹیاں اور شاہی کمیشن بیٹھنا شروع ہوئے، بٹلر ی ریاستوں کی کمیٹی، سائمن کمیشن اور اس کی متعلقہ کمیٹیاں، تری اور امدادی افواج کی کمیٹی، وغیرہ لیکن چونکہ ان کے تقررات سے ہندوستانیوں کا اطمینان نہیں ہوا اور انہیں خود اپنی قسمت کے فیصلہ کے کاموں میں شریک نہیں کیا گیا اس لئے ملک میں ہنگامہ برپا رہا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر مسٹر سائمن دستوری کمیشن کے صدر نے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ ملک معظم کی حکومت کے نمایندوں اور برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمایندوں کی ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا جائے تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے ایسی تجاویز پیش کی جاسکیں جو عام طور پر اکثریت کے لئے قابل قبول ہوں۔

۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء کو لارڈ ارون نے جو اُس وقت وایسرائے تھے اور ۸ر دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کو وزیر ہند نے واضح اور صاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا کہ ہندوستان کی دستوری ترقی کا مقصد نوآبادی طرز کی حکومت ہے اور یہ بات ملک معظم کے سنہ ۱۹۱۷ء کے اعلان میں مضمر ہے۔ گول میز کانفرنس اور ان اعلانات

سے ملک میں نسبتاً بہتر فضا پیدا ہوگئی۔ نومبر ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا اور جس دن پورے مندوبین کا پہلا اجلاس ہوا ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں نے کل ہندوستان کے وفاق یعنی آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہونے کے لئے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اس کانفرنس کی کارروائی نامکمل رہی اور اس کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا لیکن اس کے اختتام پر وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے حکومت برطانیہ کی پالیسی کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا۔

"ملک معظم کی حکومت کی رائے یہ ہے کہ حکومت ہند کی ذمہ داری مرکزی اور صوبہ جاتی جماعت ہائے قانون ساز کو صرف ایسی شرائط کے ساتھ پوری طرح سپرد کر دی جائے جنھیں زمانۂ انتقال حکومت میں بعض مطالبات اور دوسرے مخصوص حالات کی ضمانت کے لئے ناگزیر سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کی سیاسی آزادیوں اور حقوق کی ضمانت بھی ضروری ہے۔

"زمانۂ انتقال حکومت میں جن محافظتی قوانین کی ضرورت ہے ان میں ملک معظم کی حکومت اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھے گی کہ محفوظ اختیارات کو اس نہج سے قانون میں درج اور بعد میں نافذ کیا جائے کہ جس سے نئے دستور کے ذریعہ سے مکمل ذمہ داری کی طرف ہندوستان کی جو ترقی ہو اس پر کوئی خراب اثر نہ پڑ سکے۔"

قومی حکومت کی طرف سے اسی بات کو دوبارہ دوسری گول میز کانفرنس میں دوہرایا گیا۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں وائٹ پیپر شائع ہوا جس میں دستوری اصلاحات کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی تجاویز درج تھیں۔ اس پر غور کرنے کے لئے برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ایوان عوام اور ایوان امرا کی ایک مشترکہ کمیٹی بنائی جس نے برطانوی ہند کے مندوبوں کو بھی اپنے مشوروں میں شریک کیا۔ جب ان مندوبوں نے دیکھا کہ پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی میں رجعت اور ردعمل کی طرف رجحان زیادہ ہے تو انھوں نے ایک میمورنڈم پیش کیا جو نہایت اعتدال اور معقولیت پر مبنی تھا اور ہندوستان کے کمترین مطالبہ کا اظہار کرتا تھا۔ لیکن مشترکہ کمیٹی نے اس کی تجاویز کو بھی مسترد کر دیا۔

یہ مختصر تاریخ ہے مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ کی اور دستور ہند کے اس مسودہ قانون کی جو اب

دارالعوام سے گذر کر دارالامرا میں منظوری کے لئے پہنچ گیا ہے ۔

اس تمام روداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سال کے اصلاحی تجربوں پر غور کرنے کے لئے چھ سات سال سے زیادہ صرف کئے جا چکے ہیں اور معلوم نہیں ابھی کتنی مدت اور اس کام کے لئے صرف کی جائے گی اور حال یہ ہے کہ جن تجاویز کو آخری طور پر اختیار کر کے قانونی جامہ پہنایا جا رہا ہے انھیں قبول کرنے کے لئے ملک میں کوئی طبقہ تیار نہیں ہے ۔ کانگریس کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ تو نو آبادی طرز کی حکومت لینے پر بھی آمادہ نہیں ہے مگر آزاد، اعتدال پسند، ہندو فرقہ پرست، مسلم فرقہ پرست، ریاستیں غرض کوئی بھی اس دستور سے خوش نہیں ہے ۔

حکومت برطانیہ کے مدبروں نے دستور اساسی کیلئے گذشتہ چھ سات سال میں جتنی کوششیں کی ہیں اُن سب میں خوف اور گھبراہٹ کا عنصر غالب نظر آتا ہے ۔ وہ ہندوستانیوں پر اعتماد کرنا نہیں چاہتے ۔ انھیں ڈر ہے کہ اگر ان کو ذرا سا بھی اقتدار دیا گیا تو پھر ہمارے اقتدار کا خاتمہ ہے اس لئے ایک مرتبہ جس چیز کو ایک ہاتھ سے دیتے ہیں دوسرے ہاتھ سے فوراً اُسے واپس لے لیتے ہیں اگر ایک ہاتھ سے ذرا سا سہارا دیتے ہیں تو دوسرے ہاتھ سے نیچے ڈھکیل دیتے ہیں ۔ بعض نہایت معقول ، اعتدال پسند وقیع اور مستند لوگوں کا خیال ہے کہ نئے دستور کا مسودہ تو موجودہ دستور سے بھی خراب ہے اور اس نئے دستور سے تو پرانے دستور پر قائم رہنا ہی بہتر ہے ۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی سفارشات اور گورنمنٹ آف انڈیا بل میں ایسے کیا نقائص پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے سر فیروز سیٹھنا ، سر چمن لال سیتلواڈ اور سر کاؤس جی جہانگیر جیسے اعتدال پسند نائٹ بھی اس کے مخالف نظر آرہے ہیں ۔

سب سے پہلی بات جو اس ضمن میں قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ مشترکہ پارلیمنٹری رپورٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا بل کو " اکثریت کی وہ عام مقبولیت " حاصل نہیں ہے جس کے لئے گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا ۔ کسی ایسی حکومت کے دستور کے لئے جو خود مختار ہونے کا حوصلہ رکھتی ہے پہلی شرط یہ ہے کہ سیاسی احساس رکھنے والی آبادی کے ایک کثیر حصہ کی اُس سے تشفی ہوتی ہو اور عوام کے نمائندوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا ہو۔

کمیٹی نے دستور بناتے وقت کسی ہندوستانی سیاسی جماعت کے مشورہ کو حتیٰ کہ برطانوی ہند کے مندوبین کے میمورنڈم کو بھی جو حد درجہ اعتدال پر مبنی تھا اور ہندوستان کے کمترین مطالبہ کو ظاہر کرتا تھا قبول نہیں کیا۔ ان حالات میں جو دستور بنے گا وہ ہندوستان کا اپنا بنایا ہوا نہ ہوگا بلکہ غیروں کا مسلط کیا ہوا ہوگا اور اس لئے اصول خود اختیاری کے منافی ہوگا۔

دوسری بات جس کے لئے ہندوستان کی طرف سے پیہم مطالبہ تھا اور جس کا آخر وبیسرائے اور وزیر ہند نے وعدہ بھی کر لیا تھا وہ یہ تھی کہ دستور میں صراحت کے ساتھ درج کر دیا جائے کہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کا مقصد نوآبادی طرز کی حکومت ہے۔ اس بات کو قصداً مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے نظر انداز کیا جس سے کمیٹی کی نیت کی طرف سے سخت بدگمانی پیدا ہوگئی اور بعد کی اشک شوئی سے اس کی تلافی نہ ہوسکی۔

تیسری بات جو اس سلسلہ میں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے اس بات کا کوئی تعین نہیں کیا کہ کتنی مدت میں ہندوستان میں نوآبادی طرز کی حکومت کے قائم ہو جانے کا امکان ہے۔ تحفظات کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کیا یہ ابدی اور اٹل ہیں یا کبھی ان کے ختم ہونے کا بھی وقت آئے گا اور اس بات کا کون فیصلہ کرے گا کہ اب ان تحفظات کو ختم ہو جانا چاہیئے۔

مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے اپنے قول کے مطابق چار بنیادی اصولوں پر اپنے مجوزہ دستور کی بنیاد رکھی ہے:۔

(۱) خود دستور کے اندر نشوونما کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔

(۲) صوبوں میں عاملہ کو مضبوط ہونا چاہیئے۔

(۳) انتظام وعملہ کو متدین اور اعلیٰ اہلیت کا ہونا چاہیئے۔

(۴) متصادم اغراض ومفاد میں توازن قائم رکھنے کے لئے ایک غیر جانبدار عالم کو برسر اقتدار ہونا چاہیئے۔

پہلا اصول خاص طور پر ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ "خود دستور کے اندر نشوونما اور ترقی کے عناصر موجود ہونا چاہئیں" یہ بات نہایت مناسب ہے اور ہر شخص اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ

ترقی کے اس بیج کو جو نشو و نما پاکر ایک تناور درخت بن جائیگا پارلیمنٹری کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے کس حصے میں دبا کر رکھا ہے اور اس سے مکمل ذمہ دار اور نو آبادی طرز کی حکومت کیسے پیدا ہوگی۔ کمیٹی بظاہر صرف غیر تحریری روایتوں (کنونشنس) پر بھروسہ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ غیر تحریری روایتیں تصادم کے امکانات کو تو شاید رفع کر سکتی ہیں اور ایک حد معین تک ترقی کا بھی سبب ہو سکتی ہیں مگر ان سے مکمل ذمہ دار اور نو آبادیوں کے مرتبہ کی حکومت پیدا نہیں ہو سکتی۔ مانٹیگو چیمس فورڈ کے دستور میں ایک مقررہ میعاد گذرنے کے بعد تحقیقات اور اس کی بنیاد پر تبدیلی اور اصلاح کی سفارش کی گنجایش تھی مگر مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے اس میعادی تحقیقات کے امکان کو بھی ختم کر دیا۔ اُن کے یہاں ایک سفارش البتہ اس نوعیت کی ہے جس میں درج ہے کہ اگر ہندوستان کی کوئی مجلس مقننہ دستور میں ترمیم کی کسی قرارداد کو منظور کرے اور گورنر جنرل یا گورنر کے حضور میں تحریری عرضداشت پیش کرے کہ ملک معظم ازراہ لطف و کرم پارلیمنٹ کو اس امر سے مطلع فرمائیں تو یہ قرارداد پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے اُس مجوزہ فیصلہ کے ساتھ جو ملک معظم کی حکومت اس مسئلہ کے بارے میں کرنا چاہتی ہے پیش کی جائے گی۔ یہ سفارش جس قدر ناکافی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس سے ہندوستان کی مجبوری و بے چارگی میں کمی واقع نہیں ہوتی اور خود دستور کے اندر نشو و نما کا امکان پیدا نہیں ہوتا۔

کمیٹی کا دوسرا اصول یہ ہے کہ صوبوں میں عاملہ کو مضبوط ہونا چاہئے۔ یہ اگر مان بھی لیا جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس مضبوطی کو حاصل کرنے کے لئے گورنر کو وہ تمام مخصوص اور امتیازی اختیارات سونپ دئے جائیں جن کی مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے سفارش کی ہے۔

کمیٹی کا تیسرا اصول یہ ہے کہ ایک متدین اور اعلیٰ اہلیت رکھنے والا عملہ حکومت کے لئے وہی کام کرتا ہے جو ریڑھ کی ہڈی انسانی جسم کے لئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اعلیٰ ملازموں کو ایسے حقوق مل دئیے جائیں جو مجوزہ دستور نے انھیں دئیے ہیں۔ ان کے مرتبہ اور مراعات کا فیصلہ کرنے کے لئے دو چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے اول تو وزرا اور ان کے مابین جو تعلقات ہوں ان میں صحیح فرق مراتب کا خیال رکھا جائے اور دوسرے ہندوستانی رعایا کی معاشی اہلیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ کسی حکومت کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی رعایا پر ناقابل برداشت محاصل کا بار ڈال کر اعلیٰ اہلیت کے افسر مقرر کرے۔ ایسی صورت میں اعلیٰ اہلیت کو

قربان کیا جا سکتا ہے۔

کمیٹی کا آخری اصول کہ انصاف کی ترازو کے پلڑوں کو برابر رکھنے کے لئے ایک غیر جانب دار شخص کو برسر اقتدار رہنا چاہیئے اُس وقت تک تو اہم سمجھا جا سکتا ہے جب تک ہندوستان کے مختلف فرقوں اور مرکز و صوبوں کے درمیان تصادم پایا جائے۔ لیکن جب ہندوستانی اور برطانوی اغراض میں تصادم ہو اس وقت کمیٹی کے منتخب کئے ہوئے اشخاص پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ گورنر کے امتیازی اختیارات پر پابندی عاید کرنے والی کوئی اور جماعت ہو جس پر عام طور پر لوگوں کو اعتماد ہو۔

اب ذرا آیئے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ مشترکہ کمیٹی کی سفارشات اور گورنمنٹ آف انڈیا کے مسودہ قانون پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ کس حد تک یہ موجودہ دستور سے بہتر ہیں یا اس سے بھی خراب اور بدتر ہیں۔

نئے دستور کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس سے صوبوں کو خود مختاری مل جائیگی اس ضمن میں سب سے پہلے صوبجاتی خود مختاری کے مفہوم کی وضاحت کر دینا چاہیئے۔ مختلف آدمیوں کے ذہن میں اس کے مختلف مفاہیم ہیں۔ لیکن جب ہندوستانی رائے عامہ کے ایک حصہ نے اس کا مطالبہ یہ سمجھ کر کیا تھا کہ یہ نوآبادی طرز کی حکومت کی جانب دوسرا قدم ہے تو وہ اس کا مفہوم ایسی حکومت سمجھتے تھے جس میں صوبہ کی حکومت عوام کی منتخب کی ہوئی مجلس مقننہ کو جواب دہ ہوگی اور برطانوی پارلیمنٹ کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ لیکن مشترکہ کمیٹی کے نزدیک صوبہ جاتی خود مختاری کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ ان کے نزدیک صوبہ کے تمام اختیارات کا منبع و مرکز عوام کی منتخب کی ہوئی مجلس مقننہ نہیں ہے اور صوبہ کی مجلس عاملہ کا تمام معاملات میں مجلس مقننہ کو جواب دہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس خود مختاری میں گورنر اور مقننہ دونوں شریک ہوں گے!

جہاں عوام کی حکومتیں پائی جاتی ہیں وہاں جماعت عاملہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ عوام صرف مجلس مقننہ کا انتخاب کرتے ہیں اور عاملہ کو اس کا جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عوام مقننہ اور عاملہ دونوں کا علیحدہ علیحدہ انتخاب کرتے ہیں اور عاملہ مقننہ سے آزاد رہ کر بھی اپنے اختیارات کو استعمال کر سکتی ہیں اور مقننہ اپنے فرایض قانون سازی کو پورا کرتی رہتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ صوبوں میں ان دو قسموں کی عاملہ میں سے کس قسم کو منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ صوبہ جاتی حکومتوں میں عوام کی منتخب کی ہوئی عاملہ جو مقننہ سے آزاد رہ کر اپنا کام کرتی ہے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ مشترکہ کمیٹی نے ایک قسم کی پارلیمنٹری حکومت یعنی مقننہ کو جواب دہ عاملہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

اس فرق کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ غور اور مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ گورنروں کو جو اختیارات کمیٹی نے دیئے ہیں بعض دوسرے ملکوں میں بھی عاملہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان ممالک میں عاملہ کو عوام منتخب کرتے ہیں تو اس مشابہت سے کمیٹی کی تجاویز کے لئے وجہ جواز پیدا نہیں ہوتی اور یہاں کی حکومت مختار کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہو جاتی۔ اس لئے اگر کمیٹی صوبہ جاتی خود مختاری دینے کا دعوے کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عاملہ کو مقننہ کا جواب دہ بنا رہی ہے گویا پارلیمنٹری طرز کی خود مختاری قائم کر رہی ہے۔

پارلیمنٹری طرز کی خود مختاری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مقننہ کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے اور اس کا اظہار مندرجہ ذیل چار اہم طریقوں پر ہوتا ہے:۔

(۱) قانون سازی میں

(۲) محاصل اور خرچ کی نگرانی میں

(۳) انتظام مملکت میں۔ اور سب سے بڑھ کر

(۴) عاملہ کو مقرر اور برطرف کرنے میں

مؤخر الذکر سے مراد یہ ہے کہ کوئی عاملہ اس وقت تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتی جب تک اُسے مقننہ کی اکثریت کی تائید حاصل نہ ہو۔ آیئے دیکھیں کہ صوبوں کو جو خود اختیاری دی گئی ہے اُس میں یہ چیز کہاں تک حاصل ہوئی ہے۔

(۱) سب سے پہلے قانون سازی سے ابتدا کیجئے۔ اس میں صوبہ کی مجلس مقننہ کے چار اور مد مقابل نظر آتے ہیں جنھیں صوبہ کے لئے اسی طرح قانون بنانے کا حق حاصل ہوگا جیسا خود صوبہ کی مقننہ کو۔ ان میں سے ایک برطانوی پارلیمنٹ ہے جو حق رائے دہندگی، حلقہ ہائے انتخاب اور طریقہ ہائے انتخاب کے تمام مسائل

کے متعلق خود قانون بنائے گی ۔ اس معاملہ میں گویا ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کو بدستور قائم رکھا گیا ہے ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ رجعت پسند بات یہ ہے کہ آیندہ دارالامرا میں ہندوستان کے متعلق جو مسودہ قانون ان کی منظوری کے لئے پیش ہوگا ۔ اور جسے دارالعوام منظور کر چکا ہوگا اُس کی آخری منظوری میں یہ نہ صرف تاخیر کر سکیں گے بلکہ اپنی طرف سے دارالعوام کی تجاویز کو مسترد بھی کر سکیں گے ۔

اس کے بعد دوسرا مدمقابل گورنر ہوگا جسے "گورنر کے قوانین" بنانے کا اختیار ہوگا اور ان پر صوبہ کی مقننہ کو ترمیم و تنسیخ تو کجا بحث و مباحثہ کا بھی حق اس وقت تک حاصل نہ ہوگا جب تک گورنر خاص طور پر اس بات کی اجازت نہ دے ۔ اس کے علاوہ گورنر کو ہنگامی قوانین بنانے کا ہر وقت اختیار ہوگا اور یہ ایک دفعہ چھ مہینہ تک جاری رہنے کے بعد دوبارہ چھ مہینہ کے لئے جاری کئے جا سکتے ہیں ۔ ایسے محکموں میں جو وزرا کی ماتحتی میں ہوں گے ہنگامی قوانین مقننہ کے مجتمع ہونے کے صرف چودہ دن بعد تک جاری رہیں گے ۔ لیکن ایسے محکموں میں ایک دوسرے طریقہ پر ہنگامی قوانین زیادہ عرصہ تک جاری رکھے جا سکتے ہیں ۔ گورنر پر سال میں صرف ایک مرتبہ مقننہ کو جمع کرنے کی پابندی عاید کی گئی ہے ۔ اس لئے اگر گورنر اور وزرا چاہیں گے تو محض ہنگامی قوانین کے ذریعہ سے ایک سال تک حکومت کر سکیں گے ۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا ہمیشہ کیا بھی جائے گا ۔ لیکن دستور میں اس قسم کا اختیار اُنھیں حاصل ہے ۔ پھر کمیٹی نے اپنی سفارشات کے ذریعہ سے گورنروں کو منتقل شدہ محکموں کے لئے بھی قانون بنانے کا حق دے دیا ہے جو موجودہ دستور میں اُنھیں حاصل نہیں ہے ۔ اس وقت گورنر صرف اپنی منظوری نہ دے کر ان محکموں کے قوانین کو مسترد کر سکتا ہے لیکن نئے دستور میں وہ قوانین کو مسترد بھی کر سکے گا اور اپنے طرف سے بھی بنا سکے گا ۔ اس لئے اگر وزرا چاہیں گے تو گورنر کی وساطت سے مقننہ کی مرضی کے خلاف قانون بنوا سکیں گے ۔

مجلس مقننہ کا تیسرا مدمقابل گورنر جنرل ہے ۔ مشترکہ کمیٹی نے گورنر کو تو مخصوص اختیارات دئے ہی تھے کہ وہ امن و امان قائم رکھے ، اقلیتوں کے حقوق اور اعلیٰ عہدہ داروں کے مفاد کی نگہداشت کرے لیکن صرف گورنر کے مخصوص اختیارات سے کمیٹی کا اطمینان نہیں ہوا اس لئے اُس نے گورنر جنرل کو بھی اس کام میں شریک کیا ہے ۔ اگر گورنر جنرل کو خیال ہو کہ گورنر ان معاملات میں اپنے فرایض کو ٹھیک طریقہ پر انجام

نہیں دے رہا ہے تو اُسے صوبہ کے معاملات میں مداخلت اور قانون سازی کا اختیار حاصل ہے اور اس طرح وہ اپنی مخصوص ذمہ داریوں کی بجا آوری کے سلسلہ میں جس محکمہ کے لئے چاہے قانون بنا سکتا ہے۔

پھر گورنر جنرل کو دستور میں ایک اور اہم حق یہ حاصل ہے کہ وہ مرکزی اور صوبہ جاتی محکموں کی تقسیم میں جب چاہے ردو بدل کر سکتا ہے۔ صوبہ جاتی حکومتوں کو اختیارات تفویض کرنے کے بعد جو اختیارات باقی بچتے ہیں وہ گورنر جنرل کو مل جاتے ہیں۔ اس لئے بعض اہم مسائل کے متعلق وہ جب چاہے اس بات کا اعلان کر سکتا ہے کہ فلاں محکمہ یا مسئلہ صوبہ جاتی حکومت سے متعلق نہیں ہے بلکہ مرکزی حکومت سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ گورنر جنرل کو حق حاصل ہوگا کہ جب یکساں قوانین صوبوں اور مرکز میں بنائے جائیں تو مرکزی قانون کو صوبہ کے قوانین کے مقابلہ میں مرجح قرار دے۔

صوبہ کی مقننہ کا چوتھا مد مقابل مرکزی یعنی وفاقی مقننہ ہوگی۔ بعض معاملات میں صوبہ اور مرکز دونوں کو قانون بنانے کا حق حاصل ہوگا اور مرکزی قانون کو صوبہ کے قانون پر ترجیح حاصل ہوگی۔

اس سے ظاہر ہوا کہ صوبہ کی مقننہ پانچ قانون ساز جماعتوں میں سے ایک ہوگی اور جن معاملات میں قانون بنائے گی بھی ان میں گورنر کی خوشنودی مزاج کی پابند ہوگی۔ کیونکہ اگر گورنر کو اس کا کام پسند نہ آئے تو وہ اعلان کر سکتا ہے کہ دستور پر عمل ناممکن ہوگیا ہے اس لئے مقننہ برطرف کی جاتی ہے اور اس کے بعد اپنے آپ قانون بنا کر حکومت چلا سکتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی مشترکہ کمیٹی کی مجوزہ تجاویز موجودہ دستور سے زیادہ خراب ہیں۔ کیونکہ موجودہ دستور میں اس قسم کی کارروائی کو صرف اس وقت جائز رکھا گیا ہے جب دستور پر عمل کلیتہً ناممکن ہو جائے۔ لیکن کمیٹی کی مجوزہ تجاویز میں جزی طور پر ناقابل عمل ہونے کی صورت میں بھی یہی کارروائی اختیار کی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ قانون بناتے وقت مجلس مقننہ پر برابر یہ ہیبت سوار رہیگی کہ کہیں گورنر کے پاس سے یہ پیغام نہ آجائے کہ اس قانون سے امن و عدالت، اقلیتوں کے حقوق اور اعلیٰ عہدہ داروں کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے لہٰذا اس پر غور و مباحثہ ترک کیا جائے۔

پھر بقیہ میدانوں میں جہاں مقننہ نسبتاً آزاد رکھی گئی ہے وہاں بھی اور مختلف پابندیاں

پائی جاتی ہیں ۔ پولس ایکٹ میں کوئی ترمیم یا تنسیخ گورنر کی پیشگی منظوری کے بغیر نہیں کی جاسکتی ۔ پھر جس قانون کو چاہے گورنر اپنی ترمیموں کے ساتھ مقننہ میں دوبارہ غور کے لئے واپس کرسکتا ہے ۔ غرضکہ گورنر کی حیثیت نئے دستور میں ایک مطلق العنان بادشاہ جیسی ہوگی ۔

(۲) اب آئیے صوبہ جاتی خودمختاری کے دوسرے پہلو یعنی آمدنی و خرچ کے مسئلہ کو دیکھیں پہلے محاصل عاید کرنے والے قوانین کو لیجئے ۔ گورنر کو ہمیشہ اختیار ہوگا کہ " گورنر کے قوانین " کے ذریعہ سے صوبہ پر نئے محاصل عاید کرسکے ۔ پھر گورنر اپنے ہنگامی قوانین کے ذریعہ سے بھی وقتی طور پر محاصل عاید کرسکتا ہے ۔ گورنر جنرل بھی اپنے ہنگامی قوانین اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر بنا سکتا ہے ۔ غرضکہ محصول عاید کرنے میں بھی صوبہ کی مقننہ خودمختار نہیں ہے بلکہ اس کی تین اور مد مقابل ہیں ۔

خرچ کی منظوری کا اختیار بھی مقننہ کو بلا شرکت غیرے حاصل نہ ہوگا ۔ کیونکہ بعض بڑے بڑے اخراجات پر مقننہ کی رائے لینا ضروری نہ سمجھی جائے گی ۔ آمدنی کو اخراجات کی مختلف مدوں میں تقسیم کرنے کے تناسب کون مقرر کرے گا اس مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ کمیٹی نے بحث نہیں کی ہے لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنا غالباً صحیح ہے کہ اس بات کا تعین گورنر ہی کرے گا کہ کتنے اخراجات کے لئے مقننہ کی منظوری لی جائے اور کتنے کے لئے نہ لی جائے ۔ پھر جن اخراجات کو مقننہ نامنظور کرے گی انھیں دوبارہ منظور کرنے کا اختیار بھی گورنر کو حاصل ہوگا ۔ چنانچہ جو اخراجات منظور کئے جائیں گے وہ تین قسم کے ہوں گے اول ایسے جن کی مقننہ نے منظوری دی دوسرے ایسے جنھیں مقننہ نے نامنظور کیا لیکن گورنر نے منظور کیا اور تیسرے ایسے جو مقننہ کی اظہار رائے کے لئے پیش ہی نہیں کئے گئے اور گورنر نے بہ اختیار خود انھیں منظور کردیا ۔

(۳) انتظام مملکت کے روزمرہ کے مسائل میں بھی مقننہ کی رائے آخری تسلیم نہیں کی جائے گی ۔ ایسے معاملات میں جہاں گورنر کو اپنی مخصوص ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہوگا وہ خود اپنی طرف سے کاروبار چلانے کے لئے قاعدے مقرر کردے گا ۔ ان مخصوص ذمہ داریوں میں اقلیتوں کے حقوق اعلیٰ عہدہ داروں کے مفاد اور امن و قانون شامل ہوں گے ۔ قدرتی طور پر ان مسائل کے متعلق مقننہ میں جو بحث بھی کی جائیگی

اُس میں گورنر کے بنائے ہوئے قاعدوں کی پابندی کرنا ہوگی۔ اور مقننہ ان مسائل کے بارے میں جن نتائج پر پہنچے گی اُن پر عملدرآمد ممکن نہ ہوسکے گا۔ پھر اقلیت اور اعلیٰ عہدہ داروں کے مسائل ایسے نہیں ہیں جو صرف چند محکموں تک محدود رہیں گے بلکہ کسی محکمہ میں پیدا ہوسکتے ہیں اس لئے ملازموں کا مقننہ کے زیر اثر ہونا لازمی نہ رہے گا۔ اگر مقننہ اپنا اثر قائم کرنے پر مصر ہوگی تو دستور کو جزئی طور پر ناقابل عمل قرار دیکر مقننہ کو برطرف کردیا جائے گا اور گورنر وزراء کے ساتھ مل کر حکومت کا کام چلاتے رہیں گے۔

(۴) اب پارلیمنٹری طرز کی حکومت کے آخری اختیار کو لیجئے۔ یہاں ہندوستانی دستور کا دوسرے خودمختار دستوروں سے اختلاف پوری طرح نمایاں ہوجاتا ہے۔ انگلستان میں مقننہ دارالعوام کیبنٹ کو بناتی، قائم رکھتی اور برطرف کردیتی ہے کوئی وزارت اس وقت تک حکومت نہیں کرسکتی جب تک اُسے اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو۔ جب کبھی اکثریت اس کی طرفدار نہیں رہتی وزارت یا تو مستعفی ہوجاتی ہے یا مقننہ کا انتخاب دوبارہ کراتی ہے تاکہ نئے انتخاب میں اُسے اکثریت حاصل ہوسکے۔ اگر نئے انتخاب میں اکثریت حاصل ہوجائے تو نبھا ورنہ اُسے استعفا دینا پڑتا ہے۔ دوسری خصوصیت انگلستان کی وزارت کی یہ ہے کہ اُس کے تمام اراکین میں یکجہتی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ وزارت یکجائی طور پر ہر محکمہ کے معاملات کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وزراء کا تقرر ملک معظم کرتے ہیں لیکن یہ تقرر وزیراعظم کی سفارش پر ہوتا ہے جو خود مقننہ میں جو جماعت اکثریت رکھتی ہے اُس کا رہنما ہوتا ہے۔
لیکن ہندوستان کے مجوزہ دستور میں گورنر پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے وہ چاہے تو یکجائی طور پر وزراء کا تقرر کرسکتا ہے اور چاہے تو فرداً فرداً۔ اگر وہ نہ چاہے تو وزیراعظم کے تقرر کی بھی اُس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ چاہے تو عاملہ کے ہر جلسہ کی صدارت کرسکتا ہے۔ انگلستان کا بادشاہ اور نوآبادیوں کا گورنر عاملہ سے بالا اور ارفع ہوتا ہے لیکن ہندوستان کا گورنر اُس کا ایک جزو ہوگا۔ وزراء کا کام مشورہ اور امداد دینا ہے۔ لیکن گورنر اُن کا مشورہ ماننے کے لئے پابند نہ ہوگا۔ وزرا کی بات نہ مانی جائے تو وہ استعفےٰ دے سکتے ہیں گورنر ان کی جگہ دوسرے وزرا کا تقرر کردے گا۔ اگر دوسری وزارت میں شریک ہونے کے لئے کوئی تیار نہ ہو تو وہ مقننہ کو برطرف کردے گا۔ اس کے بعد نیا انتخاب کیا جاسکتا ہے

اگر نئے انتخاب سے بھی مقننہ کی وہی صورت رہے اور مطیع و فرمانبردار وزرا دستیاب نہ ہوں تو اس میں گورنر کی پوری جیت ہے ۔ وہ پرانے وزرا کو واپس نہ بلائے گا بلکہ وہ وزرا اور مقننہ دونوں کا خاتمہ کر دیگا اور تمام اختیارات پر خود قابض ہو جائے گا ۔ دستور کی اس تباہی کا سبب صرف یہ ہوگا کہ گورنر اور وزرا میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا ۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مقننہ کو حکومت کے بنانے یا نہ بنانے کا اختیار نہ ہوگا ۔ حکومت کا ایک بڑا اور معتد بہ حصہ یعنی گورنر اور اعلیٰ عہدہ دار مقننہ کی نگرانی کا اثر قبول کرنے کے لئے مجبور نہ ہوں گے ۔ مقننہ اگر کسی وزارت کی حمایت کرے گی تو اس سے اس کی زندگی میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ وزارت اور خود مقننہ دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

پھر گورنر کو اختیار ہوگا جب چاہے مقننہ کا اجلاس منعقد، ملتوی اور ختم کر دے اور وہی اپنے اختیار تمیزی سے اس بات کا بھی فیصلہ کرے گا کہ مقننہ کا اجلاس کس مقام پر ہونا چاہئے غرض گورنر مقننہ کا مالک ہوگا ۔ وزرا کی کوئی شنوائی نہ ہوگی ۔ کمیٹی نے ان پر اتنا اعتبار بھی نہیں کیا کہ انھیں مشورہ دینے کا حق ہی حاصل ہو جاتا ۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ پتہ چلانا کہ مجوزہ تجاویز سے صوبہ جاتی خود مختاری کا گراں بہا تحفہ کسے عنایت فرمایا گیا ہے ذرا مشکل ہے ۔ مقننہ کو تو اس سے خود مختاری ملے گی نہیں کیونکہ ایسے کسی معاملہ میں جس میں گورنر سے اس کا اختلاف ہوگا اس کا فیصلہ آخری نہ مانا جائے گا ۔ دستور کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جب کبھی گورنر اور مقننہ میں اختلاف ہو قصور ہمیشہ مقننہ کا ہوگا ۔ تو پھر کیا خود مختاری گورنر کو ملے گی ؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے کیونکہ گورنر بجائے خود آخری حاکم نہیں ہے بلکہ اپنی تمام مخصوص ذمہ داریوں، اختیارات اور فیصلہ ہائے تمیزی میں وہ گورنر جنرل اور اس کی معرفت وزیر ہند کو جواب دہ ہے ۔ پھر کیا گورنر جنرل کو یہ خود مختاری ملی ہے ؟ اسے بھی نہیں کیونکہ اُسے تمام ایسے معاملات میں جہاں یہ اپنے خاص اختیارات استعمال کرے گا وزیر ہند کے احکام کی تعمیل کرنا ہوگی نتیجہ یہ نکلا کہ صوبہ جاتی خود مختاری وزیر ہند اور برطانوی کیبنٹ کو عنایت فرمائی گئی ہے ۔ لیکن انھیں تو پارلیمنٹ کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے خود مختاری پہلے سے ہی حاصل تھی ۔ پھر

مشترکہ کمیٹی نے خواہ مخواہ انھیں کیوں زیر بار احسان کیا!

ممکن ہے اس تمام بیان کو مبالغہ پر محمول کیا جائے۔ آئیے دو ٹھوس مثالیں لے کر دیکھیں کہ ہمارا بیان کہاں تک صحیح ہے۔ فرض کیجئے ایک وزارت عوام کے اس قدیم مطالبہ کے پورا کرنے کا تہیہ کرتی ہے کہ جماعت عاملہ کے ذمہ عدالت کا کام سپرد نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اپنے اس فیصلہ پر عمل وہ گورنر کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے امن و قانون اور اعلیٰ عہدہ داروں کے مفاد پر اثر پڑتا ہے جو خاص طور پر گورنر کی نگرانی میں دئے گئے ہیں۔ گورنر وزرا کا فیصلہ قبول کرنے کے لئے پابند نہ ہوگا اور مقننہ میں اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کو جب چاہے بند کر سکے گا۔ دوسری مثال لیجئے۔ ہندوستانی رائے عامہ نے ہمیشہ ذمہ دار اور بے ضرر سیاسی رہنماؤں کے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی والوں کا لگا رہنا ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے فرض کیجئے کہ ایک وزیر اس برائی (؟) کو ختم کر دینے کی ہمت کرتا ہے۔ اُسے فوراً گورنر کے مخصوص اختیارات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نئے دستور کے مطابق انسپکٹر جنرل آف پولس گورنر کی اجازت کے بغیر وزیر کو اُن رپورٹوں کے دکھلانے سے بھی انکار کر سکتا ہے جو اس قسم کے سی۔ آئی۔ ڈی والے دیتے ہیں۔ مقننہ کا وزیر کی حمایت میں ہونا وزیر کے کچھ کام نہ آئے گا۔ اگر اُنھوں نے کچھ اکڑ دکھائی تو اس سے نہ صرف وزیر صاحب کی وزارت چھن جائیگی بلکہ غریب مقننہ کو بھی یہ اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے۔

صوبہ جاتی خود مختاری کی اس طویل بحث کے بعد کہ یہی فی الحقیقت مشترکہ کمیٹی کا سب سے بڑا کارنامہ بیان کیا جاتا ہے اب آئیے اس کی دوسری سفارشات کا بھی مطالعہ کریں۔

مشترکہ کمیٹی نے ہندوستانیوں کے اس دعوے کو تسلیم کیا کہ مرکزی ذمہ داری کے بغیر صوبہ جاتی خود مختاری مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انھوں نے مرکز میں بھی ایسے وزرا کا تقرر کرنا منظور کیا جو مقننہ کو جواب دہ ہوں گے لیکن ایک ہاتھ سے جو کچھ دیا تھا وہ مندرجہ ذیل طریقہ پر دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا:-

(۱) مرکزی مقننہ کو وفاقی طرز کا بنایا۔ اس وفاق میں برطانوی ہندوستان اور دیسی ریاستیں

دونوں کو شامل کیا ۔ ریاست کے نمایندوں کی تعداد کا تناسب ایک تہائی رکھا ۔ طریقہ انتخاب بالواسطہ تجویز کیا یعنی صوبوں کی مجالس مقننہ وفاقی مجلس کے لئے نمایندے منتخب کرکے بھیجیں اور ریاست کے حکمراں اپنے نمایندے نامزد کریں ۔ یہ تمام تجاویز مجوزہ دستور کو موجودہ دستور سے بھی زیادہ خراب بنا دیتی ہیں ۔ اگر وفاق صرف برطانوی صوبوں کا ہوتا اور طریقہ انتخاب بلا واسطہ ہوتا تو صورت حال بہتر ہوتی ۔ لیکن بالواسطہ انتخاب سے ترقی پسند جماعتوں کو آسانی سے مرکزی مجلس میں اکثریت نہ حاصل ہوسکے گی ۔ پھر ریاستوں کے نامزد کئے ہوئے ایک تہائی قدامت پسند اراکین ہمیشہ حکومت کا ساتھ دے کر ترقی کی مخالفت کیا کریں گے ۔

(۲) تمام محکمے وزرا کو سپرد نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ایک طرح کی دوعملی قائم کردی گئی ہے ۔ جو محکمہ ویسرائے اور اُس کے مشیروں کو سپرد کئے گئے ہیں اُن کے متعلق فیصلہ کرتے وقت وزرا کی کونسل کو مشورہ میں شریک نہ کیا جائے گا بلکہ اپنی ذاتی مرضی سے ویسرائے جس طرح چاہے فیصلہ کرسکے گا ۔

(۳) پھر جو محکمے وزرا کو سپرد بھی کئے گئے ہیں ان میں تحفظات اور ویسرائے کے مخصوص اختیارات اور ذمہ داریوں کی وجہ سے وزیروں کے اختیارات بہت محدود ہوگئے ہیں ۔

(۴) فوج اور مدافعت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا کیونکہ ان پر اختیار ملے بغیر خود مختاری کی تمام گفتگوئیں محض دھوکہ اور فریب ہیں ۔ لیکن مدافعت، غیر ملکی تعلقات اور فوج کے مسائل ویسرائے کی نگرانی میں رکھے گئے ہیں جن پر وزرا اور مقننہ کو کوئی موثر اختیار حاصل نہیں ہوگا ۔

(۵) اس کے بعد اہم چیز مالیات ہے ۔ مالیات میں محاصل عاید کرنے اور خرچ منظور کرنے کے اختیارات صرف جزئی طور پر وزرا کو دئے گئے ہیں اور ویسرائے کو اپنے مشیر مال کی معرفت مداخلت کا بہت بڑا اختیار حاصل ہے ۔ محاصل درآمد و برآمد کے ذریعہ سے اپنی صنعتی و تجارتی تامین کی جو آزادی ہندوستان کو حاصل ہوگئی تھی وہ بھی واپس لے لی گئی ہے کیونکہ مشترکہ کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ " برطانوی تجارت کے خلاف جب کوئی تعزیری قانون بنایا جائے " تو ویسرائے کو مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے ۔ یہ چیز بہت مبہم ہے اور اس کی توضیح و تعبیر میں وسعت کی بہت گنجایش ہے ۔

(۶) ہندوستانی مدت سے اس بات کا مطالبہ کر رہے تھے کہ ساحلی جہاز رانی صرف ہندوستانیوں کے لئے مخصوص کر دی جائے اور غیر ملکیوں کو اس میں مقابلہ کا موقع نہ دیا جائے۔ اس قسم کا ایک مسودہ قانون موسوم بہ "حاجی بل" گذشتہ مجلس مقننہ میں پیش بھی کیا گیا تھا جو مجلس کے جلد برطرف ہو جانے کی وجہ سے منظور ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ مگر کمیٹی نے یہ کہہ کر کہ چونکہ ہندوستانی کمپنیوں کو برطانوی سمندروں میں جہاز رانی سے کوئی نہیں روکتا اس لئے انھیں بھی برطانیہ کو اپنے ساحلوں میں جہاز رانی سے نہ روکنا چاہیئے۔ نامنظور کر دیا اس دلیل کی ستم ظریفی اور منافقت محتاج وضاحت نہیں۔ ایک بالشتیئے سے کہا جاتا ہے کہ تمھیں دیو اپنے سے کشتی لڑنے کی اجازت دیتا ہے تم اُس سے کشتی لڑنے میں کیوں تامل کرتے ہو۔

(۷) پہلی گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی طرف سے برابر اس امر کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ بنیادی یا "کلیدی" اور نوخیز صنعتوں کو صرف ملکیوں کے لئے محدود کر دیا جائے۔ اکثر ممالک اسی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔ ہمیں بھی ملکیوں اور غیر ملکیوں میں امتیاز کرنے کا حق ملنا چاہیئے۔ خود برطانیہ کے دستور میں اس قسم کی امتیازی کارروائیاں پائی جاتی ہیں اور نوآبادیوں میں نقل سکونت 'حق انتخاب' تجارت کی اجازت اور ملکیت کا حق حاصل کرنے کے معاملوں میں برطانوی اور نوآبادیوں کی رعایا کے مابین امتیازی سلوک کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ حق بھی ہندوستانیوں کو نہیں دیا گیا بلکہ اس قسم کے جو حقوق موجودہ دستور میں ملے تھے وہ بھی مشترکہ کمیٹی نے چھین لئے۔

(۸) دارالامرائے گورنمنٹ آف انڈیا بل میں جو حال ہی میں ترمیم کی ہے اُس سے مرکزی مقننہ کے ایوان اعلیٰ میں بلاواسطہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں پر بڑا کرم فرمایا گیا ہے۔ لیکن عوام کی نمایندگی کے فرائض عموماً ایوان ادنیٰ انجام دیتا ہے۔ اس لئے ضرورت اسی میں بلاواسطہ انتخاب کے جاری کرنے کی تھی۔ ایوان اعلیٰ کے لئے یہ چیز اتنی ضروری نہ تھی۔ پھر جس جماعت کو بلاواسطہ انتخاب کا حق دیا گیا ہے اس کی نوعیت و ساخت کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ایوان اعلیٰ میں کل نشستیں ۲۶۰ ہوں گی۔ ان میں ۱۵۶ برطانوی ہند کے نمایندے ہوں گے اور ۱۰۴ ریاستوں کے۔ برطانوی ہند کے جو ۱۵۶ نمایندے ہوں گے ان میں سے ۲۲ الکٹورل کالجو

سے منتخب کئے جائیں گے۔ اس کے معنی ہوئے کہ ۲۶۰ کی مجلس مقننہ میں صرف ۱۲۸ بلاواسطہ منتخب کئے جائیں گے گویا منتخب شدہ جماعت ہمیشہ اقلیت میں رہے گی۔ پھر جو لوگ بلاواسطہ منتخب ہوں گے انہیں بھی ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی میں سے صرف ایک لاکھ امیر آدمی منتخب کریں گے۔ یہ سب کم و بیش قدامت پسند اور رجعت پسند ہوں گے لیکن ان میں سے ۱۰ کے متعلق تو پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ برابر حکومت کا ساتھ دیں گے۔ پھر یہ ایوان اعلیٰ قوت و اقتدار میں کسی حیثیت سے ایوان ادنیٰ سے کم نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں لارڈ زیٹ لینڈ صاحب کی یہ نگاہ لطف و کرم بد نصیب ہندوستانیوں کے لئے اور بھی زیادہ بلاخیز ثابت ہوگی۔

غرضکہ مندرجہ بالا اور دوسرے اسی قسم کے نقائص کی وجہ سے مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی سفارشات اور اس کی بنیاد پر تیار کیا ہوا گورنمنٹ آف انڈیا بل ہندوستانیوں کی اکثریت کے لئے ناقابل قبول ہیں۔

محکومیتِ نسواں

عورتوں کے متعلق قوانین ایک عرصہ کے غور کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سوسائٹی نے عورت کی زندگی کا نصب العین محض ازدواج اور ازدواجی زندگی تک محدود کر رکھا ہے۔ عورت کی تعلیم و تربیت میں تمام تر یہی مطمح نظر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ گویا بیاہی زندگی کو دلکش بنانے کی کوشش عورت کے لئے اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے طبقۂ نسواں کی کسی دوسری قسم کی بہبودی لائق التفات بھی نہیں۔ اور اس ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی غیر منصفانہ روش اختیار کرنا گویا جائز ہے۔

شوہر یا "مالک" اگلے زمانہ میں عورتیں یا تو زبردستی اور ظلم سے مردوں کے ہاتھ آتی تھیں یا ماں باپ کر خریدی جاتی تھیں۔ تاریخ یورپ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا تھا بیچ ڈالتا تھا اور اُس کی مرضی کی کچھ پروا نہیں کرتا تھا۔ البتہ مذہب عیسوی نے آکر ازدواج کے لئے ایجاب و قبول کا طریقہ رائج کیا۔ لیکن ترقی کے اس زینہ پر پہنچنے کے بعد بھی عورت کا نکاح قبولتے وقت "ہاں" کہنا یہ محض ایک رسمی بات تھی۔ خود لڑکی کی اتنی مجال کب تھی کہ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف "نہیں" بھی کہہ سکتی؟ اگر واقعی کوئی عورت بضد ہوکر شادی سے انکار چاہتی تو اس کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا بجز اس کے کہ کسی کلیسا میں داخل ہوکر راہبانہ زندگی بسر کرنے کا حلف لے لیتی۔ دینِ مسیح کے پھیلنے سے پیشتر عورت کے مقابلہ میں مرد مالک الکل کی حیثیت رکھتا تھا۔ عورت کے مقابلہ میں مرد کے لئے نہ کوئی تعزیر تھی نہ کوئی قانون۔ مرد جب چاہتا عورت کو چھوڑ دیتا۔ لیکن عورت کو کسی حالت میں مرد سے علیحدگی کا اختیار نہ تھا۔ انگلستان کے پرانے قوانین میں مرد کو عورت کا "مالک" کہا جاتا تھا بلکہ حقیقتاً وہ اس کا بادشاہ مانا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شوہر کے قتل کا اقدام قانونی اصطلاح میں "بغاوتِ ادنیٰ" کہلاتا تھا۔ اور اس کی پاداش میں عورت کو زندہ جلا دینے کا حکم تھا جو بغاوت کی سزا سے بھی زیادہ ہے۔ اور اب تک انگریزی قوانین میں بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں

عورت گویا مرد کی زرخرید مال جانی ہے اب بھی گرجا میں نکاح کے وقت اُس سے تمام عمر شوہر کی اطاعت کا عہد لیا جاتا ہے۔ اور عمر بھر قانون کے رو سے وہ اپنا عہد پورا کرنے پر مجبور ہوتی رہتی ہے۔ شوہر کی مرضی کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر چاہے بھی تو اپنے لئے کوئی جائداد نہیں پیدا کر سکتی اور اگر پیدا کرتی ہے تو وہ سب خود بخود شوہر کی ہو جاتی ہے[۵۱]۔ اس بارہ میں انگلستان کا قانون عورت کی حیثیت اتنی بھی نہیں باقی رہنے دیتا[۵۲] جو اکثر ممالک میں غلاموں کی تھی۔ مثلاً قانون روما کے رو سے بعض صورتیں ایسی تھیں جن میں قانون غلاموں کی جائداد پر تصرف کو (یعنی جو آقا نے غلام کو بخش دی ہو) آقا کے لئے حرام قرار دیتا تھا۔ لیکن انگلستان کی عورتیں ان سے بھی بدتر ہیں۔ اگرچہ ہمارے قانون میں زن و شوہر "ایک جان دو قالب" کہلاتے ہیں مگر اس لئے کہ عورت کی جائداد شوہر کی جائداد کے مرادف مانی جائے۔ نہ اس لئے کہ کبھی عورت بھی مرد کی جائداد پر تصرف کر سکے۔ البتہ اس "ایک جان دو قالب" کے اصول پر مرد اپنی عورت کے افعال و کردار کا دوسروں کے مقابلہ میں ذمہ دار ہے مگر یہ اسی طرح جیسے کوئی آقا اپنے غلام کے افعال کا یا کوئی شخص اپنے مویشیوں کے حرکات و سکنات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ غرضکہ اس قانونی نظریہ سے مستفید ہے تو مرد نہ کہ عورت۔ عملاً شادی کے معنیٰ یہ ہیں کہ عورت خود کو مرد کی غلامی میں دیدے۔ جہاں تک قانون اور رواج کا تعلق ہے بیاہی سے بن بیاہی اور بیوہ ہر طرح اچھی ہے۔

محکوم بیوی سے اچھا برتاؤ چنداں لائق تعریف نہیں

میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ لوگ عورتوں کو غلاموں سے بہتر نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر لوگ اپنی زوجہ کو لونڈیوں سے بدرجہا زیادہ آزاد اور باحیثیت بنا کر رکھتے ہیں

---

[۵۱] ہندوؤں میں بھی اکثر صورتوں میں شوہر اپنی زوجہ کی جائداد کا مالک مانا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں میں اگرچہ قانوناً یہ امر تسلیم نہیں کیا گیا ہے لیکن ہندوستان بھر میں عملدرآمد فی الحمد اسی اصول پر ہے۔ دیگر اقوام میں حالت اس سے بہتر نہیں ہے۔

(مترجم)

[۵۲] زمانہ حال میں انگلستان کے قانون میں چند ترمیمات ہوئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں جن سے عورتوں کے حقوق جائداد میں مستقل تر ہوتے جاتے ہیں۔

(مترجم)

او ممکن ہے کہ اُن پر کبھی کوئی تشدد نہ کرتے ہوں۔ بہت سے مرد تو ایسے ہیں جو واقعی زن مرید ہیں۔ اور اپنی بیوی کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مگر یہ ویسی صورت ہے جیسے کوئی آقا باوجود اپنے وسیع اختیارات کے اپنے غلاموں سے شفقت کا برتاؤ کرتا رہے اور اپنی حکومت جتانا مناسب نہ سمجھے۔ تاہم غلام غلام ہی ہے اور آقا پھر آقا ہے!۔

بعض باتوں میں زوجہ لونڈی سے بھی بدتر ہے

سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ کم ازکم مسیحی ممالک میں لونڈیوں کو اتنا اختیار ضرور دیا گیا تھا بلکہ اُن کا اخلاقی فرض بھی یہ تھا کہ آقا اگر ان سے مباشرت کرنا چاہے تو وہ انکار کردیں آقا انھیں مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن یہ کیا اندھیر ہے کہ اپنی زوجہ پر اس قسم کا جبر بھی ہر طرح جائز ہے؟! ہر شوہر کو اختیار دیدیا گیا ہے کہ جب چاہے بغیر زوجہ کی مرضی کے اُس غریب کو اپنی رکیک ترین حیوانی خواہش رفع کرنے کا آلہ بنالے۔ اس سے بڑھکر توہین آمیز جبر کیا ہوسکتا ہے؟ جب کوئی عورت اپنے شوہر کے کسی ظلم سے تنگ آکر اوس سے بھاگنا چاہتی ہے تو قانون طرح طرح سے اس کو شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ اولاد اگر ہو تو وہ معمولاً باپ کی ہے نہ کہ ماں کی۔ اگرچہ ماں کے مقابلہ میں باپ جو شفقت اولاد کے ساتھ کرسکتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ انگلستان کا قانون اب تک یہی ہے کہ شوہر خواہ کتنا ہی جابر وظالم کیوں نہو جب تک اُس کے ظلم کے ثبوت کے ساتھ اُس کی زناکاری کا ثبوت بھی نہ دیا جائے وہ بیچاری طلاق بھی نہیں مانگ سکتی۔ اور مرد اگر عورت کو صرف زناکار ثابت کردے تو اُسے بآسانی طلاق کی ڈگری مل سکتی ہے۔ اگر کوئی عورت شوہر کو چھوڑ کر جانا چاہے تو اپنے گھر کا ایک حبہ اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔ مرد چاہے تو اُسے زبردستی پکڑ لائے یا عدالت کے ذریعہ سے پکڑ بلائے[لہ] یعنی "تاوقتیکہ عدالت دونوں میں قانونی مفارقت نہ کرلے عورت شوہر کے ساتھ رہنے سے قانوناً انکار نہیں کرسکتی۔

[لہ] لیکن اب یہ قانون نہیں رہا۔ برطانوی ہندوستان میں بھی اب عورت کو شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن عام طور پر عملدرآمد جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے۔ اکثر ہندوستانی ریاستوں میں البتہ اب بھی تقریباً یہی قانون باقی ہے۔ (مترجم)

غلام اور بیوی کے قانونی حقوق کا مقابلہ

مردوں کے اس غیر معمولی اقتدار نے عورتوں کو از حد پست بنا رکھا ہے۔ ہر چیز مردوں کے قابو میں ہے اور ذرا ذرا سی بات کے لئے عورت مرد کی محتاج ہے اور اسی پر اس کو بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے لازمی طور پر اس کی خواہش بلکہ خدا سے دعا یہی ہوتی ہے کہ شوہر اچھا ملے جو اسے چاہے اور اس کو ہمیشہ اپنی محبوبہ بنائے رکھے۔ لطف یہ ہے کہ اتنے بڑے مسئلہ کے پیش نظر ہونے کے باوجود اس بیچاری کو شوہر کے انتخاب کا فی الجملہ ایک ہی موقع ملتا ہے۔ اور جب بعد کو اسے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا انتخاب غلط تھا تو اس محکومیت کی بدولت قدرتی طور پر اس کے دل میں ایک جدید انتخاب کی آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کاش وہ کسی بہتر حاکم کی محکوم بنکر رہتی اور اس شخص کی اسیر دام نہ رہتی جو ظالم ثابت ہوا۔ اس صورت حال کے دکھانے سے میرا منشا یہ ہرگز نہیں کہ عورتوں کو آئے دن شوہر بدلنے کی اجازت دیدی جائے۔ میرا منشا صرف اس قدر ہے کہ جس طبقہ کے لئے بجز غلامی اور محکومیت میں زندگی بسر کرنے کے دنیا میں کوئی چارہ کار نہیں ہے اس طبقہ کے افراد کو فقط اپنے آقا کے انتخاب کا حق دیا بھی گیا تو کیا؟ اپنا بُرا خود تلاش کرنے کا اختیار ان حالات میں اگر دیا گیا ہے تو وہ کوئی آزادی نہیں ہے۔ بے شک عورت اور غلام میں اتنا ہی فرق ہے کہ یہ اپنا مالک خود منتخب کر سکتی ہے اور غلام کو یہ اختیار نہیں۔ لیکن دور غلامی کی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ ظلم و تعدی ثابت کرنے کی صورت میں غلام اپنے آقا کو قانوناً مجبور کر سکتا تھا کہ وہ اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے۔ مگر عورت کے لئے سخت سے سخت ظلم کی شکایت بھی طلاق پانے کے لئے کافی نہیں تاوقتیکہ وہ شوہر کی زناکاری بھی ثابت نہ کرے۔

عورتوں اور غلاموں کی دنا شعاری کی تشریح

میں کوئی مبالغہ کرنا نہیں چاہتا اور نہ مبالغہ کی کوئی حاجت ہے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ قانون نے عورت کو جس قدر ذلیل بنا رکھا ہے عملی زندگی میں دراصل وہ اتنی ذلیل نہیں وجہ یہ ہے کہ مرد کا مفاد عورت کی ذات سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہ عورت کو خود بھی زیادہ نہیں دبا سکتا۔ یہ عورت کی بہت بڑی خوش نصیبی ہے کہ مرد اپنے تمام قانونی اختیارات اس کے خلاف نہیں استعمال کرنے پاتا لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ وہ مرد کے جذبات اور محسوسات ہیں جو عورت کو مہلت زیست عطا کئے ہوئے ہیں! موجودہ طرز معاشرت کی حمایت کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ مرد و زن میں اگر مساوات نہیں تو نہ سہی مگر عورت کے

حقوق کم ہیں تو اس کی سے ایسے بے پایاں فوائد حاصل ہیں کہ اس صورت حال کو انگیز کرنا چاہئے۔ مگر کسی قسم کے جبر و ظلم کو قانوناً جائز رکھنے کی ضرورت جتانے سے خواہ وہ ضرورت فی نفسہٖ ثابت ہو یا نہ ہو مگر آدمی کی حریت پسندی کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ دنیا میں ظلم کا قانونی جواز ہی نمو دِ آزادی کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ مطلق العنانی اگر دنیائے سیاست میں کوئی بری چیز ہے تو اس کا وجود خانگی دنیا میں بھی اُسی قدر بُرا ہے۔ اور دونوں سے ایک ہی قسم کے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ مرد اور عورت کی باہمی محبت کی طرف اشارہ کرکے خانگی ظلم کی حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مرد ظالم اور حکومت پسند سہی پھر بھی عورتیں اپنے شوہروں پر جان فدا کئے ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہی بات پُرانے زمانہ کے غلاموں پر بھی صادق آتی ہے۔ روما اور یونان کے غلام بھی اپنی جان قربان کر دیتے تھے لیکن اپنی وفاداری پر حرف نہیں آنے دیتے تھے۔ نہ اُن سے بڑھ کر کوئی مظلوم تھا نہ اُن سے بڑھ کر جاں نثار۔ لیکن اس وفاداری اور خلوص کے زندہ نمونے باقی رکھنے کے لئے اُس جابرانہ قانون غلامی کو باقی رکھنا کبھی قرین عقل نہیں سمجھا گیا۔ بے شک دنیا کا یہی دستور ہے کہ آزاد آدمی اُتنا وفادار نہیں ہوسکتا جتنا کہ ادنیٰ غلام۔ جنس وفا ظلم ہی سے پیدا ہے۔ اور وہ اس طور پر کہ جو شخص ظلم کرسکتا ہو اور پھر بھی ظلم سے باز رہتا ہے تو اس سے اظہار تشکر انسان کا خاصہ ہے۔ یہی اظہارِ تشکر جاں نثاری کی حد تک پہونچ سکتا ہے جو گویا وفاداری کی انتہا ہے۔

مرد کی مہربانی اُس کے اقتدار کو جائز نہیں بناتی

اب اُن لوگوں سے بڑھ کر لائق شکر گذاری اور قابل تعریف کون ہوسکتا ہے جس کا یہ حال تھا کہ اگر چاہتے تو ایک پل میں ہزاروں لاکھوں انسانی ہستیوں کو بلاخوف بازپرس نیست و نابود کر دیتے مگر پھر بھی وہ ایسی حرکتوں سے باز رہے؟ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کسی انسان کا اس حد تک بااختیار ہو جانا اصولاً قابل ستائش یا قابل برداشت ہے؟ اسی طرح مرد اگر عورت کے مقابلہ میں اپنے سارے اختیارات کام میں نہ لائے تو وہ اپنی بساط کے لحاظ سے قابل ستائش ضرور ہے۔ لیکن اس کا اس قدر بااختیار ہونا ہی ایک مخدوش بات ہے۔

مرد کو تشدد سے کہاں تک روکا گیا ہے

اکثر دیکھا گیا ہے کہ رواجِ غلامی سیاسی مطلق العنانی، اور خانگی خود رائی ان سب کی حمایت جب کبھی کی جاتی ہے تو صرف بہترین مثالیں پیش کرکے کی جاتی ہے۔ اس سے کس کو

انکار ہے کہ ان صورتوں میں بھی شریف انسانوں کی شرافت اپنا جوہر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ لیکن اگر دنیا میں سب لوگ شریف ہی ہوا کریں تو ہر چیز اچھی ہو جائے۔ قانون اور قاعدے اچھوں کی روک کے لئے نہیں بنائے جاتے بلکہ بُرے لوگوں سے ڈر کر بنائے جاتے ہیں اور اُنہی کے لئے ہوتے ہیں۔ زن و مرد کے تعلقات کے سے عام مسائل بھی محض اچھی مثالوں اور جزئی واقعات کو پیش کر کے حل نہیں کئے جا سکتے۔ دنیا کے ہر مرد کی نیک دلی اور رحم پر کون بھروسہ کر سکتا ہے؟۔ یہ کہنا مقصود نہیں کہ دنیا کی عورتوں اور مردوں کو رواداری اور خلوص کی تعلیم بے کار ہے یا تضیع اوقات کے مرادف ہے۔ کہنا یہ ہے کہ نہ ہم محض اس تعلیم پر بھروسہ کر سکتے ہیں نہ یہ تعلیم ہر فرد بشر کو دے سکتے ہیں۔ ابھی جو تدابیر مرد و زن کے حقوق کی حفاظت کے لئے قانون اور رواج نے کی ہیں محض یکطرفہ ہیں۔ بُری عورتوں کے لئے ہر طرح کی تعزیر موجودہ نظام قوانین میں موجود ہے لیکن بُرے مردوں کی روک ٹوک کا اہتمام قانون سازوں کے نزدیک چنداں ضروری نہیں۔ بُرے سے بُرے مرد کی ماتحتی میں بھی کوئی نہ کوئی بدنصیب عورت ضرور دیدی گئی ہے جو اگر چاہے تو بعض صورتوں میں بلاخوف تعزیر اُسے موت کے گھاٹ اُتار کر اپنے اختیارات کا ثبوت دے سکتا ہے۔ کوئی ملک ایسا نہیں جہاں ادنیٰ طبقوں میں مرد کا اپنی عورت کو مارنا اور گالیاں دینا کوئی غیر معمولی بات سمجھا جاتا ہو۔ یہ نتیجہ بس اسی خیال کا ہے کہ عورت ایک شے محض ہے جو مرد کے حوالہ کر دی گئی ہے اور اُسے وہ جس طرح چاہے استعمال کرے۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ اپنی زوجہ کو مارنا کوئی قانونی جرم نہ تھا۔ اور اب بھی کم از کم رواج کی رو سے شوہر اپنی زوجہ کے ساتھ بہت کچھ ایسا برتاؤ کر سکتا ہے جو کسی اور کے ساتھ اگر کرے تو نہایت مطعون ہو۔ حال میں اگر قانون نے اس بارے میں کچھ ترقی کی ہے تو اس قدر کہ مرد اگر اپنی عورت پر تشدد کرتا ہے تو اُسے سزا دیجاتی ہے لیکن ایسی سزا سے کیا فائدہ کہ سزا کے بعد اگر وہ چاہے تو اپنی سزا کا بھی عوض اُس مظلومہ سے لے لے؟ جب تک ایسی سزاؤں کے بعد اُس مظلومہ کو علیحدگی کا قانونی حق نہ دیدیا جائے ایسی سزائیں دراصل عورت کیلئے اور بھی زحمت کا باعث ثابت ہوں گی۔

شریف مرد یا درندے بشکل انسان؟

کوئی غور تو کرے کہ دنیا میں ایسے مردوں کی تعداد کتنی ہو گی جنھیں ہم وحشی درندوں سے بہتر نہیں خیال کر سکتے ہیں؟ اور موجودہ قوانین ازدواج کی بدولت ان درندوں کو

نے شکار پر قابو حاصل کرنے میں کتنی آسانیاں ہیں ؟ ان حالات پر اگر صحیح طریقہ سے غور کیجئے تو واقعی کلیجہ منہ آتا ہے۔ جس قسم کے لوگوں کو "شیطان مجسم" کہہ سکتے ہیں ممکن ہے کہ تعداد میں وہ اُتنے ہی نہوں جتنے دنیا کے فرشتہ خصال لوگ۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایسے لوگوں کی کمی ہرگز نہیں جنھیں درندہ کہنا حقیقتاً بالکل بجا ہو۔ اور انہی میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں غیر متعلق لوگ تہذیب کا پتلا باور کرتے ہیں وہی ہیں جن سے بڑھ کر قانون کا احترام بظاہر کوئی نہیں جانتا۔ اور جو اپنے ماتحتوں اور محکوموں کے علاوہ ہر ایک کے لئے خوش خلقی کا مجسم نمونہ ہیں اور شرافت کے پتلے بنے ہوئے ہیں۔ ان دورُخے شریفوں کا حال اُن مظلوموں کے دلوں سے پوچھئے جن کی زندگی کا دار و مدار اُن کے چشم کرم پر ہے اور جن کی زندگی ان بدنفس موذیوں نے حرام کر رکھی ہے !

مساوات حقوق کی ضمانت ہے

مرد جو اب تک ہر شعبۂ زندگی میں برسر اقتدار رہے ہیں اُنھوں نے کم از کم سیاسی دنیا میں اپنے آپ کو بے پایاں اقتدار کا اہل نہیں ثابت کیا اور اپنی نا اہلیت کو صدیوں کے مباحثہ اور مجادلہ کے بعد تسلیم کر لیا۔ ان مباحثوں میں جو دلائل پیش کئے جا چکے ہیں وہ اُن کی نوک زباں پر ہیں اور اب مسلّم بھی ہو چکے ہیں اب جو بات پیش نظر ہے وہ یہ کہ جو اختیارات مردوں کو حاصل رہے ہیں وہ کچھ اس بنا پر اُنھیں نہیں ملے تھے کہ اُنھوں نے خود کو سلیم الطبع اور حلیم ثابت کیا تھا۔ اور نہ وہ تمام اختیارات اُن کے لئے اس بنا پر چھوڑے جا سکتے ہیں کہ اُن کی مطلق العنانی سے خانگی معاملات میں کسی خاص بہبودی کی توقع ہوسکتی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں رذیل شخص اپنی شرارت اپنے غصہ اور اپنی خود غرضی کا اظہار اگر کرتا ہے تو اکثر اُسی کے مقابلہ میں جسے وہ اپنے سے کمتر اور کمزور سمجھتا ہے۔ اس قسم کی بری خصلتوں کی جڑ دراصل حکومت پسندی کا جذبہ ہے جو بغیر حاکم اور محکوم کا تعلق پیدا ہوئے رونما نہیں ہوسکتا۔ اور مساوات ہی وہ چیز ہے جس سے بدنفسوں کی بدنفسی دبی رہ سکتی ہے۔ جو شخص اپنے برابر والوں سے درشتی سے پیش آتا ہو تو سمجھ لیجئے کہ اُس کو ہمیشہ ادنیٰ ہی سے سابقہ رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ بدتمیز ہوگیا ہے۔ ایسا آدمی برابر والوں کی صحبت سے بھاگتا ہے کیونکہ برابر والے اُس کو راضی نہیں رکھ سکتے۔ وہ صرف اُنہی لوگوں سے خوش رہ سکتا ہے جنھیں وہ ہمیشہ سے عاجز کرنے اور ستانے کا عادی ہے۔

آدمی کیونکر تشدد پسند یا ظالم بن جاتا ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اچھے گھرانے درحقیقت ہمدردی اور شفقت کی درسگاہیں ہیں۔ جہاں محبت ایثار و انکسار کی عملی تعلیم ہوتی ہے۔ لیکن جہاں اس لاجواب ایثار و انکسار کی تعلیم ہوتی ہے وہاں افسرِ خاندان کو سب سے بڑھکر خود رائی اور دوسروں کی ناواجب ایثار پسندی کا بھی ذوق پیدا ہو جاتا ہے جو تمام زندگی عمر باقی رہتا ہے۔ اور اکثر رفتہ رفتہ ہوس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ انسان کے برے ارادے جب ہی تک دبے رہتے ہیں جب تک اُن کے دبانے کے لئے کوئی بات موجود ہو۔ اکثر بلا ارادہ بھی ہر شخص دوسرے کو دبانے کی کوشش کرتا رہتا ہے مگر یہ اُسی وقت تک جب تک دوسرا دبتا رہے۔ جب انسان کی فطرت ہی یہ واقع ہوئی ہے تو مرد ایسی عورت کو جو ہر وقت اس کی ہمدم و دمساز ہے کہاں تک نہ دبائے گا؟ برابر والوں کی صحبت میں خواہ اُس کی خود غرضی اور سیرت کی خرابیاں پوشیدہ رہیں لیکن کمزور اور محروم الحقوق عورتوں کے مقابلہ میں مرد کی بدمزاجیاں رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ بہت سے لوگ بعض صورتوں میں کہنے لگتے ہیں کہ فلاں لڑکی نے یا اُس کے والدین نے پہلے سے شوہر کی طبیعت کا اندازہ کیوں نہ کر لیا کہ وہ بعد کو ظالم ثابت ہوا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ لڑکی اور لڑکی والوں کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ پہلے سے کسی مرد کی طبیعت کا صحیح امتحان کر لیا کریں۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے مرد کی طبیعت کا حال ظاہر ہی نہیں ہوتا۔ اور بعض اوقات شادی سے مرد کی شخصیت ہی بدل جاتی ہے یعنی سنگدل ظالم ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے قانونی اختیارات پر ناز کرنے لگتا ہے۔ جب اُسے غصہ آتا ہے تو وہ سب کچھ کر بیٹھتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی بہت سی حرکتیں اگر ثابت بھی ہوئیں تو قانون کی حد کے اندر ہی رہیں گی۔ اور اکثر عورتیں اپنے شوہروں کی سب کچھ بھلی بُری اس لئے اُٹھا لیتی ہیں کہ وہ خود سمجھتی ہیں کہ دنیا میں وہ غلامی ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔

قانون سازوں کو کیا کرنا چاہیئے

غرضکہ انسان اس قدر کم ظرف واقع ہوا ہے کہ وہ بے پایاں اختیارات کا اہل نہیں۔ اگر کوئی مرد زیادتی کر سکے مگر نہ کرے تو بیشک اس کی شرافت ہے۔ لیکن قانون سازوں کے لئے شرافت یہ ہے کہ وہ حتی الامکان "زیادتی" ہی کو ناممکن بنا دیں۔

عذابِ جان عورتیں اور ان کا انتقام

میں جانتا ہوں کہ اس تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں اگر عورت چاہے تو ظالم شوہر سے کسی نہ کسی طرح ضرور بدلہ لے سکتی ہے۔ اگر شوہر کو دق کرنا مقصود ہو تو اُسے

دق بھی کر سکتی ہے بلکہ شوہر کے لئے عذاب جان بن سکتی ہے۔ لیکن انتقام تو وہ چیز ہے کہ ظلم کو رد کرنے کے بجائے ظلم در ظلم پیدا کر دیتا ہے۔ دوسرے یہ تو صرف ضدی اور غصہ ور عورتوں کے لئے ہو سکتا ہے جن کے متعلق مجھے بھی یقین ہے کہ اگر انھیں کچھ اختیارات حاصل ہوں گے تو وہ ان کو بہت بری طرح استعمال کرینگی۔ نیک بیبیاں اس بدنما ہتھیار سے کبھی کام نہیں لے سکتیں۔ لیکن بفرض محال کوئی عورت اگر اپنے اس آخری حربے سے کام بھی لے تو فرمائیے کہ بالآخر پالا کس کے ہاتھ رہیگا ؟ ۔

محبت اور حریت | میں مانتا ہوں کہ دنیا میں محبت وہ چیز ہے جو پتھر کو موم بنا دیتی ہے۔ زن و شوہر میں محبت یوں بڑھتی ہے کہ مدتوں دونوں ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اور بالآخر دونوں کا مفاد زندگی ایک ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عورت مرد پر حاوی ہو جاتی ہے مگر افسوس کہ پھر بھی وہ آزاد نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ سیاسی محکومیت ہو یا خانگی لیکن اس میں شک نہیں کہ محکوم کو چاہے جتنے اختیارات دیدیجئے بلکہ خود اس کے کہنے پر چلنے لگئے لیکن آزادی چیز ہی اور ہے۔ ممکن ہے کہ کسی حرم سلطانی میں کوئی لونڈی ہو جس کی خدمت کے لئے سینکڑوں لونڈیاں مقرر ہوں اور وہ سب پر حکومت کرتی ہو۔ لیکن بہتر تو یہی ہے کہ نہ اس کی ماتحتی میں کوئی لونڈی ہو نہ وہ کسی کی لونڈی ہو۔ ایسے اختیارات کبھی آزادی کا بدل نہیں ہو سکتے۔ یہ وہ اختیارات ہیں کہ جو خود اس کے حقوق سے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اسے بخشے گئے ہیں اور اخلاقاً اس کے لئے مضر ہیں۔ کیونکہ اس نے خود کو مٹا کر یہ جزئی راحت حاصل کی ہے۔ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو بالکل اپنا فرمانبردار بنا لیا تو یہ بھی کچھ اچھا نہوا۔ کیونکہ وہ اگر اپنے اثر سے شوہر کو راہ راست پر لگا سکتی ہے تو اسے گمراہ بھی کر سکتی ہے۔ بحالات موجودہ اس کی تربیت اس قدر محدود اور تنگ نظری کے ساتھ ہوئی ہے کہ بجز خانگی معاملات کے کسی معاملہ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ رائے قائم کرنا اور ضمیر سے صحیح طریقہ پر کام لینا اس کے لئے بہت دشوار ہے۔ ان حالات میں اگر اس نے اپنے شوہر کے غیر خانگی معاملات میں زیادہ دخل دیا تو یہ بھی خرابی ہی کی نشانی ہے۔

مرد افسر خاندان | لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح ہر قوم میں ایک بادشاہ یا سردار ہوا کرتا ہے اسی طرح ہر گھرانے میں ایک افسر خاندان ہونا چاہیئے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ مرد اگر با اختیار نہو تو وہ افسر خاندان کیسے

بن سکتا ہے۔ اور خاندان کا انتظام کیسے ٹھیک رہ سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر گھرانے میں ایک "مدبر کرتا" یا افسر ہوا کرے۔ مختلف قسم کی تجارتوں میں برابر دیکھا جاتا ہے کہ کئی کئی آدمی برابر کے شراکت دار ہوتے ہیں۔ نہ ان میں کوئی افسر ہوتا ہے نہ ماتحت اور سب مل کر شراکت کا کام اور انتظام کامیابی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ یہی صورت ہر خاندان میں پیدا ہو سکتی ہے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ اگر خاندان میں افسر خاندان ہوتا بھی ہے تو اس کو خاندان والوں پر اس قدر بے پایاں قانونی اختیارات کبھی نہیں حاصل ہوتے جتنے کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں حاصل ہیں۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہمیشہ مرد ہی افسر خاندان اور مالک الکل ہوا کرے؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مرد و زن گھرانے کے فرائض آپس میں بانٹ لیں؟ یہ صورت تو بحالت موجودہ بھی بہت سے گھرانوں میں کامیاب نظر آتی ہے۔ اختیارات کی کمی بیشی پر ازدواجی اور خانگی زندگی کا دار و مدار اصولاً ضروری نہیں۔ دنیا میں بہت سے خاندان ایسے ملیں گے جن میں عورتیں اپنے مردوں سے کہیں زیادہ لائق اور منتظم واقع ہوتی ہیں۔ اس لئے میرا مطلب یہ ہے کہ جو جس کام کا زیادہ اہل ہو اُسی کے سپرد وہ کام ہونا چاہیئے۔ فقط مرد بن جانے سے اہلیت نہیں آجاتی۔

نکاح میں معاہدہ کی تجویز میں یہ مانتا ہوں کہ انتظامی معاملات میں ایسے اُمور آپڑتے ہیں جن میں دو شخصوں کی رائے ایک نہیں ہو سکتی نہ کوئی باہمی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ اور خانگی اُمور میں تو ہر لحظہ ایسے ہی مسائل درپیش ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ایسے معاملات کو تو ہمیشہ ایک ہی شخص کی رائے پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسے فیصلوں کا حق ہر گھر میں فقط مرد ہی کو حاصل رہے۔ اس کا قدرتی حل تو یہ ہے کہ اپنی اپنی صلاحیت کے لحاظ سے عورت اور مرد ملکر تقسیم کار کر لیں اور اپنی اپنی جگہ دونوں خود مختار رہیں۔ بے جا دخل در معقولات کوئی نہ کرے۔ اصولی معاملات میں صلاح و مشورہ بُری چیز نہیں۔ لیکن اگر عورت کے لئے جس امر میں مرد کی رضامندی شرط ہے وہاں مرد کو عورت کی رضامندی حاصل کرنا بھی ضروری ہونا چاہیئے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن میں قانون کو دخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن فریقین اگر چاہیں تو نکاح سے پہلے جیسے مالی معاملات کی بابت اکثر سمجھوتا کر لیتے ہیں ان اُمور کی بابت بھی معاہدہ کر سکتے ہیں۔ باہمی مروت جس طرح اور بہت سے معاہدوں کی ضامن ہوتی ہے اس قسم کے معاہدوں کو بھی قائم رکھ سکتی ہے۔ ناچاقی کی تو بات ہی اور ہے جو اگر پیدا ہونا ہے تو

دوسری باتوں کے بجائے ان معاہدوں سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آپس کی رضا جوئی کا لحاظ ہوتا ہے تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اس کا تجربہ بیاہی زندگی میں برابر ہو رہا ہے۔ اور اسی سے یقین ہوتا ہے کہ فریقین کی استعداد اور لیاقت کے لحاظ سے دنیاوی امور کی باہمی تقسیم کی بابت آپس کا سمجھوتہ ہمیشہ ممکن رہیگا۔ اور جس طرح تجارتی شراکتوں میں آپس کے معاہدہ یا سمجھوتے کی بنا پر کامیابی سے کام چلتا رہتا ہے خانگی زندگی میں بھی سب کام چل سکتا ہے۔

باہمی سمجھوتہ اور اتفاق

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ موجودہ حالات میں باہمی سمجھوتا اس لئے آسان ہوتا ہے کہ ایک فریق دب جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ دونوں اپنے اپنے قانونی حقوق کے حدود کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ مبادا اگر عدالت تک جانے کی نوبت آئی تو معلوم ہے کہ قانوناً ایک کے حقوق زیادہ ہیں اور دوسرے کے کم۔ لیکن میں یہ کہوں گا باہمی سمجھوتے کی تمام تر یہی وجہ نہیں ہوتی کہ عورت قانون سے خائف ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عورت سمجھوتے پر راضی ہو جایا کرتی اور مرد راضی نہوا کرتے لیکن پایا یہ جاتا ہے کہ جو لوگ خاص کر بدخو نہیں ہیں ان میں زن و شو کی زندگی عملی سمجھوتے کی حیرت انگیز نظیر ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ مرد کے لئے اُس سمجھوتے پر قائم رہنے کے لئے کوئی نمایاں مجبوری نہیں ہوتی۔ دونوں کے قدرتی اغراض خود ہی ہر فریق کو اس عملی معاہدہ کی پابندی پر مجبور کرتے ہیں اور آپس کی رضامندی اور اتفاق میں کوئی فرق نہیں پیدا ہونے پاتا۔ میں مانتا ہوں کہ زن و شو میں مساوات قائم کرنے کے لئے جن اصول پر عمل کرنا ضروری ہے اُن میں بھی اس کا لحاظ ضروری ہوگا کہ کونسا فریق کس کام کا زیادہ اہل ہے۔ اور اس کا لحاظ کرنے میں بعض اوقات مرد کی افضلیت قدرتاً قابل لحاظ ہوگی۔ مثلاً اکثر صورتوں میں شوہر عمر اور تجربہ میں زوجہ سے زیادہ ہوگا۔ لیکن یہ فرق زیادہ سن آنے پر بالکل غیر اہم ہو جائے گا۔ اور مرد کو محض مرد ہونے کی بنا پر افضل نہ سمجھا جائے گا۔ مگر جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے یہ تو کسی طرح جائز ہی نہیں ہو سکتا کہ ترازو کا کوئی پلہ بھاری کر دیا جائے۔ سیاسی دنیا میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جو حکومت آزادی کے اصول پر چلتی ہے اُسے مساوات ملحوظ رکھنا پڑتی ہے۔ جہاں تک اختیارات بخشنے کا تعلق ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک گروہ تو بالکل خود سر اور مطلق العنان بنا دیا جائے اور دوسرا محکوم مطلق۔ اور

بھر یہ بھروسہ کیا جائے کہ حاکم گروہ ہمیشہ مہربان اور روا داری سے پیش آئے گا۔ اول تو وہ آزادی کوئی آزادی ہی نہیں جس کے سلب ہو جانے کا ہر آن دھڑکا لگا رہے۔ اور نہ وہ حقوق کوئی حقوق ہیں جو آن واحد میں بغیر کسی مشورہ یا اطلاع کے ضبط کئے جا سکیں۔ اور موجودہ حالات میں تو حقوق کا وجود ہی خارج از بحث ہے کہ جو کچھ اختیارات ہیں سب مرد کو حاصل ہیں۔ عورت کو نہ صرف یہ کہ کوئی اختیار نہیں بلکہ سخت سے سخت ظلم برداشت کرنے پر بھی اُس کے لئے اخلاقاً اور شرعاً شوہر کی اطاعت فرض خیال کی جاتی ہے!

عورتوں میں "ایثار کا مادہ"

بعض لوگ جب ضد پر آجاتے ہیں تو یہاں تک کہنے لگتے ہیں کہ مرد تو پھر بھی عورت کے ساتھ مروت کر جاتا ہے۔ اگر عورتوں کو کچھ بھی حقوق دیدئے گئے تو بس پھر وہ اپنے ہی حقوق کا راگ گائینگی۔ دوسرے کے حقوق کچھ بھی نہ مانینگی۔ لہذا عورتوں کو سب باتوں میں دبائے رکھنا چاہئے ورنہ پھر یہ کسی بات میں کسی سے دبنے والی نہیں ہیں۔ پرانے لوگوں کا یہی قول تھا اور انھیں اس کے اعلان میں شرم بھی نہیں آتی تھی۔ اگر عورتوں کا واقعی یہی حال ہے تو یہ مردوں ہی کے برتاؤ کا نتیجہ ہے۔ اُن کے اس حال پر ہنستے ہوئے مردوں کو شرم آنی چاہئے۔ لیکن زمانہ کے لوگ جو سمجھدار ہیں وہ اب صاف صاف یوں نہیں کہتے بلکہ یہی مطلب یوں ادا کرتے ہیں کہ عورتوں میں قدرتاً ایثار کا مادہ زیادہ ہے۔ اور اگر انھیں برابر کے حقوق دیدئے جائیں گے تو ان کی سیرت کی یہ خوبی جاتی رہیگی۔ ان کی خصلت برعکس ہو جائے گی۔

اول تو میں اس بات کو تفصیل کے ساتھ دُہرانا نہیں چاہتا کہ یہ غیر معمولی ایثار عورتوں میں تربیت سے پیدا ہوا ہے۔ اور اسی طرح پیدا ہوا ہے جیسے مردوں میں خود پرستی اور خود غرضی۔ میں کہتا ہوں کہ عورتوں میں اگر ایثار کی صفت قدرتی ہے تو مساوی حقوق ملنے پر یہ صفت ان میں اور بھی اصلیت کی شان کے ساتھ نمودار ہوگی۔ کیونکہ پھر یہ ایثار کی مجبوری سے نہ ہوگا نہ مرد کی خود غرضیوں کا نتیجہ شمار کیا جائیگا۔ اور ایثار اگر اچھی چیز ہے تو مردوں کو چاہئے کہ خود بھی کچھ ایثار سیکھیں۔ بلکہ اس کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق اگر زیادہ نہیں تو مساوی ہی تسلیم کرلیں۔ عورتوں کے حقوق کی کمی نے اب تک اُنکو خود پرستی اور خود غرضی کی تعلیم دی۔ یہاں تک کہ فلسفہ اور مذہب سے بجائے اس کے کہ ایسی ناجائز تعلیم کو

روکنے کا کام لیا جاتا اس تعلیم کو فروغ دینے کا کام لیا گیا۔ اگرچہ مسیحیت دنیا میں پیغام مساوات لے کر آئی تھی لیکن یہ اُمید نہیں ہوسکتی کہ اس سے درس مساوات کا کام کبھی بھی لیا جائے گا۔ اور اب سوائے اس کے کہ لوگوں کو مساوات کا احساس عملاً پیدا کرایا جائے اس خود پرستی اور خود غرضی کے مٹنے کی کچھ اُمید نہیں ہوسکتی۔

بوالہوس عورتیں | دنیا میں ایسی عورتیں یقیناً ہیں جن کو چاہے جتنے حقوق دیدیجئے اور اُن کے ساتھ چاہے جس قدر مساوات برتئے وہ راضی نہیں ہوسکتیں۔ ایسی عورتوں کا بن بیاہا رہنا ہی بہتر ہے۔ بلکہ جو لوگ ایسی عورتوں کے دام میں آگئے ہوں اُن کے لئے طلاق کا قانون واقعی آیۂ رحمت ہوگا۔ مگر موجودہ غیر مساویانہ قوانین کے ہوتے ہوئے ایسی عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ کمی نہیں ہوسکتی۔ مرد ایسی عورت کے مقابلہ میں اپنے پورے اختیارات استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جس کا آخری نتیجہ عورت کے لئے تباہی ہے۔ اور اگر اس نے رواداری برتی تو پھر عورت کی دست درازی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس کے قانونی حقوق تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ یوں اُس کو جو کچھ مل جائے غنیمت ہے۔

عورت کی آزادی کا اثر عام اخلاق پر اور انصاف کا نظریہ | زن و شوہر کے حقوق کی مساوات سے صرف یہی مقصد نہ پورا ہوگا کہ دونوں کی زندگی عیش و مسرت سے گذریگی۔ بلکہ اس سے نوع انسان کے لئے یہ دنیا ایک عالمی مدرسۂ اخلاق بنجائیگی۔ ممکن ہے کہ اس حقیقت کو لوگ مدتوں تسلیم نہ کریں مگر واقعہ یہی ہے کہ اخلاقی احساس کی درستی فقط ہم پلہ اشخاص کی صحبت اختیار کرنے سے ہوسکتی ہے۔ نوع انسان کی اخلاقی تربیت میں اب تک قوت و اقتدار کا قانون بہت بڑی حد تک شامل رہا ہے۔ ادنیٰ اقوام میں دیکھئے کہ برابر کی حیثیت رکھنے والوں سے لوگ اپنا کوئی اہم واسطہ نہیں قائم کرتے۔ بلکہ اگر کوئی واسطہ رکھتے ہیں تو صرف عداوت کا۔ ایسی سوسائٹی میں ہر شخص دوسرے کے مقابلہ میں یا تو اعلیٰ ہے یا ادنیٰ۔ گویا سوسائٹی ایک زینہ ہے کہ جس کے کوئی دو قدمچے ایک سطح پر ہو ہی نہیں سکتے۔ سارے اصول اخلاق اس ایک امر پر مبنی ہیں کہ ایک حاکم ہے تو دوسرا محکوم۔ ورنہ ایک دوسرے کا دشمن ہے یا رقیب۔ گو مجھے اس سے انکار نہیں کہ حاکم اور محکوم ہونا ضروریات حیات انسانی سے ہے۔ لیکن میں یہی کہونگا کہ شائستہ معاشرت کو مساوات کے اصول پر مبنی ہونا چاہئے۔ دنیا میں ہم اطاعت، شجاعت، فیاضی سب کا دور دورہ دیکھ چکے۔ لیکن اس زمانہ میں ہم عدل و انصاف کا

چرچا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب وہ حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ عملی خوبیوں کی بنا انصاف اور صرف انصاف قرار پائیگا۔ پھر انصاف کے ساتھ ہمیں ہمدردی کی صفت بھی اختیار کرنا ہوگی۔ یہ کچھ نئی بات نہیں ہے کہ دنیا کی نظر آج اپنے مستقبل پر بالکل نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں چند ہی مخصوص لوگ ہوا کرتے ہیں جو گذشتہ حالات پر غور کرکے مستقبل پر بھی نظر دوڑاتے رہتے ہیں۔

برابری کا دعویٰ کیا اثر رکھتا ہے

انسان کے لئے یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ برابر والوں میں رہ کر زندگی بسر کرسکے صحبت وہی اچھی جس میں برابر کے لوگ شریک ہوں۔ اگر کسی موقع پر میں آپ کی مدد یا آپ کی رہبری کروں تو کل آپ برابری کے دعوے کے ساتھ میری مدد اور رہبری کرسکیں۔ اس برابری کا احساس پیدا کرنے کے لئے دنیا میں بہت کم مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اب تک دنیا کی تربیت گاہ مساوات کے اصول سے بہت بیگانہ رہی ہے۔ خاندانی زندگی کو دیکھئے تو خاندان اگر ایک طرف اطاعت اور ایثار پسندی کی درسگاہ ہے تو دوسری طرف انانیت اور خود رائی کی۔ خواہ اس کے ارکان آپس میں کتنی ہی محبت اور شفقت کا برتاؤ رکھتے ہوں لیکن اُن میں مساوات کا کوئی جذبہ نہیں پیدا ہونے پاتا۔ آزاد اور خود مختار قوموں میں "شہریت" بے شک ایک ایسی چیز ہے جو مساوات کے اصول پر قائم کی جاتی ہے۔ لیکن شہریت کا اثر لوگوں کی خانگی زندگی اور عادات و اطوار پر بہت گہرا نہیں ہے۔ اور روزمرہ کے محسوسات انسانی سے اس کو کوئی تعلق ہی نہیں۔ اگر خاندانی زندگی بھی مساوات کے اصول پر مرتب کیجائے تو پھر خاندان سے بڑھ کر حریت پسندی کی درسگاہ کوئی نہو۔ اور اُس کی عملی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ ارکان خاندان میں حکومت کی جگہ مساوات کو دیدیجائے۔ پھر آپس کے اختلاط سے جو قدرتی ہمدردی پیدا ہوگی وہ انسان کے لائق ایک چیز ہوگی۔ ایسی مساوات اور ہمدردی سب سے پہلے والدین کے باہمی برتاؤ سے ظاہر ہونی چاہئے تاکہ خاندان کے بچے اُن کی تقلید کریں اور اُن اوصاف کے گرویدہ بنیں۔ انسان کو دنیا میں جو کچھ کرنا ہوتا ہے اُسے وہ پہلے اپنے ہی گھر سے سیکھتا ہے۔ جو شخص اوائل زندگی سے یا تو محکوم بنا رہا ہو یا حاکم اور جس نے اپنے گھر میں بھی مساوات کا برتاؤ نہ دیکھا ہو اُس میں حقیقی آزادی کا جذبہ پیدا ہونا ہی مشکل ہے۔ اور ان حالات میں پرورش پانے کے بعد بھی اگر کوئی خود کو "آزادی پسند" کہتا ہے تو یہ اُسی معنے میں آزادی پسند ہوگا جس معنی میں قدیم اور وسطی زمانہ کے جاگیردار اور زمیندار اپنے کو آزادی پسند کہتے تھے۔

حالانکہ جو آزادی وہ اپنے لئے پسند کرتے تھے ایک لمحہ کو بھی دوسروں کے لئے گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ درحقیقت اُن کی انانیت تھی جو اُنھیں دوسروں سے مغلوب ہونے کا تصور بھی گوارا نہیں کرا سکتی تھی۔

شرارت کا قانونی سدباب ہونا چاہئے

موجودہ غیر مساویانہ قوانین کے ہوتے ہوئے بھی دنیا میں (اور خاصکر انگلستان کے اعلیٰ طبقہ میں) ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنی بیاہی زندگی میں مساوات کا اصول صحیح طور پر برتتے ہیں۔ واقعی اگر ایسے لوگ موجود نہوں جن کا معیار اخلاق زمانہ کے قوانین سے اعلیٰ و ارفع ہو تو پھر قانون میں اصلاح کیسے ہو سکتی ہے؟ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنی قابل رشک زندگی پر ادنیٰ انسانوں کی زندگی کو قیاس نہ کریں جن کی تعداد دنیا میں زیادہ ہے۔ اُنھیں لازم ہے کہ ایسی اصلاحات کی عملی حمایت کریں جن سے شریروں کی شرارت کا سدباب ہو سکے۔ اور صنف نازک جابرانہ قوانین کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ اُنھیں فطرتِ انسانی کی اس حقیقت پر نظر رکھنا چاہئے کہ جو شخص با اختیار بننے کا اہل نہیں ہوتا وہی سب سے زیادہ با اختیار بننا چاہتا ہے۔ اور جو اختیارات اُسے حاصل ہوئے ہیں انھیں استعمال کئے بغیر اُسے چین نہیں آتا۔ اُس کے قلب کی تسکین اس احساس کو زندہ کئے بغیر نہیں ہوتی کہ میں فی الواقع صاحب اختیار ہوں ادنیٰ طبقوں میں ان قانونی اختیارات کے استعمال کرنے والے بکثرت ہوتے ہیں۔ اگر انصاف سے دیکھئے تو ان کی عورتوں کی زندگی غلامی کی زندگی سے بھی بدتر ہے۔ ان بندیوں کی فرمانبرداری ضرب المثل ہے۔ مگر اسی فرمانبرداری نے شوہروں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ شوہر اپنی زوجہ کی جو توہین چاہتا ہے۔ اور یہ جائز بھی سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ زوجہ کے مقابلہ میں اُس کی فرعونیت اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ جس قدر حقارت کا برتاؤ وہ اپنی منکوحہ کے ساتھ روا رکھتا ہے شاید اتنی حقارت سے دوسری عورت کو دیکھنا وہ خود بھی گوارا نہیں کرتا۔

مذہبی احکام کا عذر

اکثر لوگ جب استدلال سے ہارنے لگتے ہیں تو مذہب کی آڑ پکڑ کر زبان بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے مقابلہ میں بھی کہا جائے کہ مذہب نے عورت کے لئے شوہر کی اطاعت فرض کر دی ہے اور اس کے لئے کوئی چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ اتنا تو میں خود مانے لیتا ہوں کہ کلیسا کے احکام عورتوں پر یہ فرض ضرور عاید کرتے ہیں۔ لیکن مسیحیت کے احکام سے ایسے کسی فرض کا عاید ہونا اخذ ہو سکتا ہے

جن نہیں مانتا۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ پال نے کہا ہے کہ "اے عورتو! اپنے شوہروں کی اطاعت کرو" مگر یہ بھی تو سینٹ پال ہی نے کہا ہے کہ "اے غلامو! اپنے آقاؤں کی اطاعت کرو"۔ ان اقوال سے یہ کیا لازم آتا ہے کہ سینٹ پال کسی رواج کو مٹانے یا قائم کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اُن کا مقصد تو محض مسیحیت کی اشاعت تھا۔ اور وہ زمانہ کے رنگ کے خلاف دنیا کو کسی اور بات پر اُبھارتے تو اُن کا اصلی مقصد بھی فوت ہو جاتا۔ اُنھوں نے تو اُس زمانہ کی مطلق العنان فوجی حکومت کو بھی یہ کہہ کر تسلیم کر لیا کہ جس کسی کو قوت اور اقتدار حاصل ہے وہ سب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اب اس کو چاہے سیاسی حکومت کی "مسیحی" شکل قرار دے لیجئے۔ لیکن اُن کا حکم تو یہی تھا کہ اُس کی بھی اطاعت کئے جاؤ۔ اور اس سے یہ سمجھنا کہ مسیحیت کسی خاص طرزِ حکومت کو یا زمانہ کے رواج کو تغیر سے محفوظ کرنے آئی تھی دراصل مسیحیت کا درجہ گھٹا کر اُسے مسلمانوں یا برہمنوں کے مذہب کے ہم پلہ بنا دینا ہے۔ اگر مسیحیت کی یہی شان ہوتی تو وہ اُن اقوام کا مذہب بنکر نہ رہ سکتی جو دنیا میں سب سے زیادہ ترقی پر ہیں۔ اسلام اور مذہب ہنود میں یہی بات ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کی اُن قوموں کے مذاہب بنکر باقی ہیں جن کی حیات اگر جمود محض سے تعبیر نہیں ہو سکتی تو تنزلِ دوامی کے مُرادف ضرور ہے۔ تاریخ مسیحیت کے ہر دور میں ایسے لوگ بکثرت ہوئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جنھوں نے مسیحیت کو بھی ہمیشہ اسی قسم کا ایک استبداد پسند مذہب بنا کر دکھانا چاہا۔ ایسے لوگوں کا مقصدِ زندگی ہی یہ ہوا کرتا ہے کہ ہم ایک طرح کے مسیحی مسلمان بنکر رہ جائیں اور انجیل کا کام قرآن سے لینے لگیں اور ہر قسم کی اصلاح اور ترقی کو ممنوع خیال کرنے لگیں۔ اس قماش[1] کے لوگ پرانے زمانہ میں بہت با اثر ہوا کرتے تھے۔ اور جو لوگ اُن کی مخالفت کرتے تھے اُنھیں بڑی بڑی سختیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن اُن کی مخالفت بہرکیف جاری رکھی گئی۔ اگر نہ جاری رکھی گئی ہوتی تو ہم موجودہ ترقی نہ حاصل کر سکے ہوتے۔ اور آئندہ بھی بغیر ایسے لوگوں کی مخالفت کے ترقی کی اُمید نہیں ہو سکتی۔

---

[1] ہمیں یہ دیکھ کر سخت تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ یورپ کے آزاد خیال سے آزاد خیال آدمیوں کے ذہن بھی جب وہ محکوم اقوام کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں تعصب اور تنگ خیالی سے

عورت کی جائداد اور انگلستان کا قانون

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کے بعد اس بحث کی ضرورت نہیں کہ آیا عورت کی جائداد عقد کے بعد کس حد تک مرد کی جائداد کے مرادف بھی جانا چاہیئے۔ انگلستان کے قوانین کی رو سے جائداد کے معاملات میں کنواری عورت بیاہی سے اچھی ہے کہ وہ اپنی جائداد پر اختیار رکھتی ہے۔ اکثر لوگ اس خیال سے لرزتے ہیں کہ زن و شو کی جائدادیں الگ الگ ہوا کریں۔ یہ اُن کے نزدیک زن و شو کی مشترکہ زندگی کے نصب العین کے بالکل خلاف ہے۔ میں خود اس خیال کا آدمی ہوں کہ اگر دو شخصوں یہ

پاک نہیں ہوتے۔ مل کو ایک لامذہب شخص کہا جاتا ہے۔ اُس کے فلسفیانہ اجتہاد اور بے نظیر قوت استدلال کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ لیکن اوپر کی عبارت پڑھنے کے بعد ہم یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ ذہنی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کے بعد بھی آدمی جذبات کا ہی غلام رہتا ہے۔ اوپر کی عبارت کسی عالم اور فلسفی کی لکھی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسے کم حیثیت مقرر کی معلوم ہوتی ہے جو اپنے جاہل سامعین کے تعصبات کو برانگیختہ کر کے اپنی دلیل منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ تاریخ مذاہب و اقوام میں مل کی نظر بالکل وسیع نہیں معلوم ہوتی۔ اس نشۂ غرور نے کہ وہ ایک حکمران قوم کا فرد ہے اس کی قوت شعور و تمیز کو سلب کر لیا ہے محکوم اقوام کی ہر چیز اور ہر اصول زندگی کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مشرقی اقوام کے حالات اور مذاہب کے مطالعہ کے لئے اُس کے ماخذ وہ مسیحی مبلغین اور سیاسی مصنفین ہیں جن میں سے اکثر اپنی روزی کو قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کو اہل مشرق کے مذاہب کے نقائص دکھا کر اُن کو تبلیغ مسیحیت کا حامی بنائے رکھیں۔ جن لوگوں نے قرآن و تاریخ کا مطالعہ ایمانداری سے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام سے زیادہ حریت پرور مذہب دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ جنوری ۳۵ء کے رسالہ جامعہ میں اسلام اور عورت پر ایک مبسوط مضمون شائع ہو چکا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں قارئین کی توجہ خاص طور پر اس مضمون کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

اتنا اتحاد ہو جائے کہ دونوں آپس میں اپنے پرائے کی تمیز بالکل اٹھا دیں تو واقعی یہ بات قابل رشک ہوگی۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ آپ تو میری چیز کو اپنی چیز سمجھیں مگر میں آپ کی چیز کو اپنی چیز نہ سمجھ سکوں ظاہر ہے کہ یہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔ بلکہ اگر ایسے اتحاد میں ہمیشہ میرا ہی فائدہ رہا کرے تب بھی میں یہی کہونگا کہ میں اس سے باز آیا۔ میں تو انصاف چاہتا ہوں !

امریکہ میں جائداد کا مسئلہ | اس قسم کے غیر منصفانہ برتاؤ کو جو جائداد کے بارہ میں عورتوں کے ساتھ جائز رکھا جاتا ہے میرے خیال میں فوراً موقوف کرنا چاہئے۔ اور یہ ایک سہل سی بات ہے جو بغیر ہوئے رہ بھی نہیں سکتی[۵۱] جمہوریہ امریکہ کی بعض ریاستوں نے عورتوں کے مالی حقوق کو اپنے نظام اساسی میں تسلیم کرکے انھیں کم از کم زندگی کی ایک راہ میں آزاد کر دیا ہے۔ اب وہاں کم از کم اتنا تو ہوگیا کہ جو لوگ امیر لڑکیوں کے ساتھ محض اُن کی دولت کے لالچ میں شادی کرکے مال و متاع اپنے قبضہ میں کر لیا کرتے تھے۔ اُن کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔

عورتیں اور فکر معاش | جن گھرانوں میں گھر بار کا خرچ کسی جائداد کی آمدنی سے نہیں بلکہ محنت کی کمائی سے چلا کرتا ہے وہاں نظام معاشرت یوں قائم ہے کہ مرد کماتا ہے اور عورت گھر کا دھندا کرتی ہے اور بچوں کی پرورش اور ان کی ابتدائی تربیت میں اپنی جان کھپاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ تقسیم کار عام طور پر کچھ غیر مناسب نہیں۔ سچ پوچھئے۔ تو اس میں بھی مرد ہی مزے میں رہتا ہے۔ کیونکہ اگر اُس مصیبت کو بھی پیش نظر رکھئے جو عورت کو ایام حمل، وضع حمل اور بچوں کی نگہداشت میں ہوتی ہے بلکہ خاندان کی راحت کے لئے گھر بھر کا انتظام کرنے اور جزرسی کے ساتھ شوہر کی کمائی خرچ کرنے اور اُسے پس انداز کرنے میں برداشت کرنا پڑتی ہے۔ تب اندازہ ہوگا کہ عورت پر کیا کچھ نہیں گذرتی۔ میں اس کا قائل نہیں کہ عورت کو گھر کا کام چھوڑ کر کمانے پر مجبور کیا جائے۔ کیونکہ خاندان کو جو نفع وہ اپنے حسن انتظام اور کفایت شعاری سے پہنچا سکتی ہے غالباً اُسقدر نفع وہ اپنی کمائی سے نہیں پہنچا سکتی موجودہ حالات میں جو مرد اپنی عورتوں کو تلاش معاش پر مجبور کرتے ہیں وہ درحقیقت انصاف نہیں کرتے۔ بلکہ بہ احتیاطی

---

[۵۱] برطانیہ میں ۱۹۲۵ء سے عورتوں کو ترکہ مردوں کے مساوی ملنے لگا ہے۔ مترجم

کرتے ہیں ۔ غرضکہ میں اس چیز کو عام رواج کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتا کہ سب بیاہی عورتیں مردوں کی طرح فکر معاش میں مبتلا ہو جائیں ۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ کم ازکم جس عورت کے پاس ذاتی مستقل جائداد نہو اُسے کمانے کی استعداد پیدا کرنا چاہئے ۔ جس کے بغیر وہ خودداری اور عزت کی زندگی اپنے شوہر کے گھر میں بسر نہیں کر سکتی ۔ اگر شادی کو ایک آزادانہ اور مساویانہ معاہدہ کے طور پر مان لیا جائے تو نہ اطاعت غلامانہ کا سوال باقی رہتا ہے نہ شادی کسی فتنہ و فساد کا سبب ہو سکتی ہے ۔ صورت حال وہ پیدا ہو جانی چاہئے کہ نہ تو عورت تمام تر شوہر کی محتاج ہو ۔ نہ اُس کی اس قدر پابند ہو کہ اگر وہ اخلاقاً اپنے شوہر سے علیحدہ ہو کر رہنے کی مستحق قرار پائے تو (خواہ طلاق لے یا نہ لے) اُس سے علیحدہ رہ کر زندہ رہ سکے ۔ عورت کے شادی پر آمادہ ہونے کے یہ معنیٰ ہونا چاہئے کہ بجائے اس کے کہ وہ کوئی اور پیشہ اختیار کرتی اُس نے خانہ داری اور بچوں کی نگہداشت وغیرہ کا پیشہ اختیار کر لیا اور جب تک اُس کی ضرورت اس پیشہ میں رہیگی وہ دوسرا پیشہ نکرے گی ۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت حال کے پیدا ہونے پر بھی گھر بار سنبھالنے والی عورتیں ایسے پیشوں سے محروم رہیں گی جو بغیر گھر چھوڑے ہوئے نہیں کئے جاسکتے ۔ میرا منشا عورتوں کو گھر کے باہر گھسیٹنا نہیں ہے ۔ ہونا یہ چاہئے کہ عورتیں محض عورت ہونے کی بنا پر کسی جائز پیشہ سے روکی نہ جائیں ۔ انھیں ہر قسم کے کاروبار میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچانا چاہئے ۔ اور شادی کے باوجود بھی اُن میں اس کی صلاحیت موجود رہنی چاہئے کہ وہ جب چاہیں کسی مناسب پیشہ میں لگ جائیں ۔ ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہ رہے ۔ یہ تو وہ امور ہیں جن میں لامحالہ قانون سازی سے بھی مدد لینے کی ضرورت نہیں جب رائے عامہ ان اصول کو تسلیم کرے گی تو اس اصلاح کے لئے خود بخود مواقع پیدا ہونے لگیں گے اور طبقۂ نسواں کے لئے بہت سی راہیں کھل جائیں گی ۔ پھر حسب ضرورت قانون سازی سے بھی کام لیا جاسکتا ہے ۔

ہندوستانی کارخانوں کے مزدور

(ذیل میں پروفیسر احمد مختار ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اس تحریری شہادت کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو انھوں نے مزدوروں کے شاہی کمیشن کے سامنے پیش کی تھی ۔)

مزدوروں کی بھرتی ہمارے کارخانوں کے مزدوروں کا آبائی پیشہ کھیتی ہے ۔ بے گھرے مزدور، بیوی بچوں کو ساتھ رکھتے ہیں لیکن گھر والوں کے بال بچے وطن میں ہی رہتے ہیں ۔ مزدور اُن کے گذارے کے لئے پابندی سے اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ بھیجتا رہتا ہے اور اپنے گاؤں میں کبھی کبھی سال کے کچھ دن گذارنے ضرور جاتا ہے ۔ کارخانے کی یکساں نشست سے جب تھک کر اُکتا جاتا ہے تو کھلے کھلے کھیتوں میں کسانی کام کرنے سے اس کی تفریح ہوتی ہے ۔

مزدوروں کو یا تو اُن کے ہم پیشہ مزدوروں کی معرفت یا مستری ٹھیکیداروں کے ذریعے سے یا براہ راست بھرتی کیا جاتا ہے ۔ شمالی ہندوستان میں عموماً ہم پیشہ مزدوروں کی اطلاع پر اُن کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں ۔ بمبئی اور احمدآباد میں یہ کام مستری کو سپرد کیا جاتا ہے ۔ احاطہ مدراس میں "سردار" کو نگراں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور وہی مزدوروں کو جگہیں قیمتاً مہیا کرتا ہے اور کارخانے کے اوقات میں اُن کے کام کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔

جب کوئی موقع ملتا ہے مزدور عموماً اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ چنانچہ آبادی کی زیادتی کی وجہ سے کسان اپنا گھربار چھوڑ کر ہندوستان کے مختلف صنعتی علاقوں میں جاتے رہتے ہیں ۔ صوبہ جات متحدہ کے مزدور، پنجاب، بنگال، آسام، بمبئی وغیرہ جاتے ہیں ۔ دستی پارچہ بافی کی صنعت کو مشین کے بنے ہوئے کپڑے سے بہت نقصان پہنچا ہے اور اس کی وجہ سے جلاہے جن کا آبائی پیشہ کپڑا بُننا تھا روئی کے کارخانوں میں ملازم ہوگئے ہیں ۔ بمبئی میں یہ لوگ "پوربیئے بھیا" کہلاتے ہیں وہ صوبہ جات متحدہ کے ہندو ہوتے ہیں ۔ ماہر کاریگر پنجاب سے، پٹھان قرضخواہ سرحد سے جاتے ہیں ۔ الہ آباد اور اس کے آس پاس کے ضلعوں سے بہت سے مزدور کلکتہ اور

صوبہ جات متوسط تک جاتے ہیں۔ ہندوستان میں صنعتی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ کے بہت امکانات ہیں۔ جب اصول کفایت کو پیش نظر رکھکر زراعت و تجارت کی نئی تنظیم کی جائے گی تو بہت سے آدمی ان پیشوں میں غیر ضروری ثابت ہوں گے اور یہ لوگ صنعتوں میں بھرتی کئے جاسکیں گے۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ اگر فیکٹری کی زندگی میں تھوڑی سی اصلاح ہو جائے تو وہ بھی آسانی سے کارخانوں میں ملازم رکھے جاسکتے ہیں۔ فقیر، ملّا، سادھو اور دوسرے آدمیوں کو بھی ملک کی ایک مفید آبادی بنایا جاسکتا ہے۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ جہالت، افلاس، عدم تنظیم، بیرونی معاملات سے ناواقفیت، خاندان سے گہرے تعلق اور وطن سے محبت کی بنا پر ہمارا کثیر طبقہ آبادی جو مواقع اسے فی الحال حاصل ہیں اُن سے پورا فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ لیکن پھر بھی لوگ کم و بیش ایک جگہ سے دوسری جگہ روزگار کی تلاش میں نکلتے ہیں اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذات پات کا فرق مٹ جانے کے ڈر سے لوگ گھر سے باہر قدم نہیں دھرتے۔

ہمارے مزدوروں کو ابتدائی زندگی سے ایک خاص کام سے لگ کر روزی کمانا نہیں سکھایا جاتا۔ وہ مستقل طور پر کسی ایک پیشہ سے وابستہ نہیں ہوتے۔ اور اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ فیکٹری کی زندگی انھیں ویران نظر آتی ہے۔ انھیں نہ پنشن ملنے کی امید ہوتی ہے نہ پراویڈنٹ فنڈ کے منافع کی۔ وہ جتنا کماتے ہیں اتنا ہی روزانہ خرچ کر ڈالتے ہیں اور جب مرتے ہیں تو اُن کے بال بچے مصیبت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مزدوروں کی کثیر تعداد کے لئے روزگار غیر مستقل ہوتا ہے۔ اُن کی ملازمت کا تسلسل ایک دن میں بھی ختم ہوسکتا ہے اور برسوں تک بھی جاری رہ سکتا ہے۔ مزدوروں کا مستقل ہونا دو باتوں پر منحصر ہوتا ہے اوّل تو اس بات پر کہ انھیں بھرتی کس علاقہ سے کیا گیا ہے اور دوسرے اس پر کہ کارخانے کی زندگی کیسی ہے، آرام کی یا تکلیف کی۔ اگر کارخانہ دیہی علاقے میں ہوتا ہے جہاں کا ماحول صاف ستھرا اور دلکش ہے تو مزدوروں میں جلد جلد تبدیلی نہیں ہوتی۔ سوجن پور (پنجاب) کے ایک کارخانے میں سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء میں مزدوروں کی اوسط غیر حاضری فی مہینہ فی شخص صرف نصف دن تھی۔ کٹائی کے زمانہ میں یعنی مئی میں یہ اوسط زیادہ ہو گیا تھا یعنی ایک دن فی مزدور۔ جون جولائی میں یہ کم ہو گیا تھا البتہ اگست ستمبر میں جب ملیریا کا زور ہوا یہ اوسط

۶ء ۱ ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے کارخانے میں قریب کے دیہاتوں سے مزدوروں کو بھرتی کیا جاتا تھا اور اس میں غیر حاضری کا اوسط فی ماہ صرف ½ ہوتا تھا۔ کٹائی اور ملیریا کے موسم میں اس اوسط میں اضافہ ہو جایا کرتا تھا لیکن بہت کم۔

جب کارخانے کی زندگی اچھی نہیں ہوتی اور مزدور کچھ تو مقامی ہوتے ہیں اور کچھ بیرونی تو اس وقت غیر حاضری کی اوسط مدت بڑھ جاتی ہے۔ پنجاب کے روئی کے کارخانوں میں جہاں زیادہ تر صوبجات متحدہ کے مزدور کام کرتے ہیں یہ اوسط سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ امرتسر کے ایک روئی کے کارخانے میں ہر روز دس فی صدی مزدور غیر حاضر رہتے ہیں۔ سوجن پور کے کارخانے میں ایک مزدور کی مدت ملازمت ۷ سال ہوتی ہے۔ ضلع لاہور کے ایک کارخانہ میں مزدوروں کی اکثریت کئی سال سے وہیں مقیم ہے۔ راولپنڈی کے قریب کی ایک فیکٹری میں ملازمت کی اوسط مدت چار سال ہے۔ لیکن شہری علاقوں میں مزدوروں کی ادلا بدلی بہت زیادہ ہے۔ امرتسر کے ایک کارخانے میں ملازمت کی مدت کا اوسط صرف ڈیڑھ سال ہے اور پاس کے ایک دوسرے کارخانے میں اس سے بھی کم یعنی صرف دس مہینے۔

مزدوروں کی اس خانہ بدوشی کے کئی اسباب ہیں:-

(۱) رہنے کے لئے بُرا اور غیر تندرست انتظام۔

(۲) کٹائی کے زمانے میں مزدوروں کا کام چھوڑ کر چلا جانا۔

(۳) بے امتیاز بھرتی اور ایک دم برطرفی۔

(۴) کام کے گھنٹوں کی زیادتی اور کارخانہ کی زندگی کی ناموافقت۔

(۵) مزدوروں کی مذموم عادات۔

ابھی تک ہندوستان میں کوئی ایسا قاعدہ رائج نہیں ہے جس کی وجہ سے ایک علاقہ کے زاید از ضرورت مزدوروں کو دوسرے علاقے میں جہاں اُن کی طلب زیادہ ہو منتقل کیا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض علاقوں میں جس وقت مزدوروں کی کثرت ہوتی ہے عین اُسی وقت دوسرے علاقوں میں اُن کی قلت ہوتی ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت ہر قسمت میں صنعتی مزدوروں کے دفتر قائم کرے اور انھیں صوبہ کے صنعتی

مزدوروں کے محکمے سے وابستہ کردے اور قسمتوں کے دفاتر صوبہ کے محکمے کے ذریعہ سے ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہیں۔

نگرانی کا انتظام | منیجر کارخانے کے ہر شخص کو کام سپرد کرتا ہے۔ اس لئے اُس میں انتظام کرنے کی پوری اہلیت ہونی چاہئے۔ لیکن ایسے منیجر صرف بڑے کارخانوں میں نظر آتے ہیں۔ ورنہ چھوٹے کارخانوں میں حکم اور تابعداری کے علاوہ منیجر اور مزدوروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

ہندوستان میں نگرانی کرنے والے عملے کے انتخاب میں کئی دشواریاں ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں میں ہندوستانی مشکل سے ہی اعلیٰ عہدوں پر پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں کہیں کارخانوں میں یورپین ملازم ہیں وہاں ہندوستانیوں کی ترقی بہت محدود ہوتی ہے۔ ریلوے ورکشاپ میں نسلی امتیاز انتہائی بری شکل میں نظر آتا ہے حالانکہ وہاں توکم ازکم ہندوستانی اور یورپین کو برابر کا مقابلہ کرنا چاہئے تھا۔ مثال کے طور پر ایک ریلوے ورکشاپ میں یورپین اُمیدواروں کو چودہ آنے سے لے کر ڈیڑھ روپیہ تک یومیہ اجرت ملتی ہے۔ اُن کے ساتھی ہندوستانی امیدواروں کو اس کے برخلاف صرف ۸ آنے سے لے کر ایک روپیہ تک ملتا ہے۔

کچھ کارخانوں میں ہندوستانی بھرتی ہی نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کے نسلی امتیاز کو جلد ختم ہو جانا چاہئے اور جو اس قسم کے امتیازات روا رکھتے ہیں ان کا کوئی مال حکومت کو نہ خریدنا چاہئے۔

اعلیٰ افسروں اور ان کے ماتحتوں کے تعلقات بظاہر خوشگوار معلوم ہوتے ہیں گو بُرے برتاؤ کی شکایتیں بھی اکثر سننے میں آتی ہیں۔ ان لوگوں کو اکثر اپنی افسری شان کا گھمنڈ ہوتا ہے اور بعض اسٹرائکوں کا سبب یہی گھمنڈ ہوا ہے۔ اس کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ افسر صنعتی کاروبار میں مزدوروں کی اہمیت برابر کی نہ سمجھیں اور اُن کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ نہ کرنے لگیں۔ یہ بات مالکوں اور مزدوروں کی پنچایت بنا کر حاصل کی جاسکتی ہے۔

مزدوروں کو مستری یا سردار کی معرفت بھرتی کرنے کے طریقے میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ یہ لوگ مزدوروں کو ایک خاص اُجرت دلانے کا وعدہ کرتے ہیں اور بعد میں اُن کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر برابر ماہوار اپنا حق و انعام وصول کرتے رہتے ہیں۔ صنعتی مزدوروں کے دفتر قائم کرکے اس خراب طریقے سے نجات

حاصل کی جاسکتی ہے۔

چھوٹے کارخانوں میں حاضری کے رجسٹر باقاعدگی کے ساتھ نہیں رکھے جاتے۔ مزدوری ادا کرنے کا کام ایک منشی کے سپرد ہوتا ہے جیسے رشوت اور بے ضابطگی کا خوب موقع رہتا ہے۔ جو کارخانے چھوٹے ہیں ان میں البتہ مینجر خود اُجرت تقسیم کرتا ہے۔

بعض کارخانوں میں (مزدوری کے) ٹھیکیدار یا درمیانی آدمی کے ذریعے انجام دیتا ہے اور اس کی وجہ سے بچوں اور عورتوں سے کم معاوضہ پر بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔

رہنے کا انتظام | رہنے کا انتظام ہر جگہ مختلف ہے۔ کہیں کارخانے کے مالکوں کی طرف سے ہے کہیں حکومت کی طرف سے اور کہیں مالکان مکان کی طرف سے، کہیں گاؤں میں کارخانے کے قریب مزدور اپنے مکانوں میں رہتے ہیں۔ کہیں رہنے کے لئے مکان بنانے کے واسطے مزدوروں کو روپیہ قرض دیا جاتا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ عام طور پر مکانوں میں گنجائش مزدوروں کے مطلب کے موافق نہیں ہوتی اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ مزدور اپنے مکانوں کے کچھ حصے کو دوستوں اور جان پہچان والے آدمیوں کو شکمی کرایہ پر اٹھا دیتے ہیں۔ اس سے مکان گنجائش سے زیادہ آباد ہو جاتے ہیں اور تندرستی پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔

مزدوروں کو کارخانہ کے مالکوں کی زمیندارانہ ذہنیت کی خاص شکایت رہتی ہے۔ ایسے واقعات دیکھے گئے ہیں جس میں اسٹرائک کی حالت میں مزدوروں کو گھروں سے نکال دیا گیا اور وہ بالکل خانماں برباد ہو گئے۔

عموماً مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر مزدوروں کے مکان بہت زیادہ ناقابل اطمینان ہوتے ہیں:-

(۱) ہوا کا خراب انتظام یا عدم انتظام۔ خراب ہوا سے طاقت حیات کم ہوتی ہے اور امراض کے امکانات قوی ہوتے ہیں۔ ان دونوں سے جسمانی اور دماغی اہلیت کار کم ہوتی ہے۔

(۲) کمرے کی لمبائی چوڑائی مختصر ہوتی ہے اور ان میں عموماً ضرورت سے زیادہ آدمی رہتے ہیں۔ مزدور ان میں بھیڑ بکری کی طرح بھرے رہتے ہیں۔

(۳) مزدوروں کی غیر تندرست عادت جس کا خاص سبب اُن کی جہالت اور افلاس ہے۔

(۴) شہر کے جن محلوں میں مزدوروں کے مکانات ہوتے ہیں وہ گندے ہوتے ہیں اور رات کے وقت اُن میں گائے بھینس باندھی جاتی ہیں۔

(۵) ان مکانات میں صحن نہیں ہوتے اس لئے خلوت کا امکان نہیں ہوتا۔

(۶) عموماً مزدوروں کے مکانوں کا فرش ناہموار ہوتا ہے جس پر سیمنٹ کا پلاستر نہیں کیا جاتا شہروں کے مکانات کی پوتائی کبھی نہیں کی جاتی۔

(۷) عموماً غسلخانے اور پیشاب خانے مہیا نہیں کئے جاتے۔ بعض وقت پیخانے غائب ہوتے ہیں اور جہاں کہیں ہوتے ہیں وہاں اُن کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ روشنی کا انتظام خراب ہوتا ہے صاف پانی آسانی سے مہیا نہیں ہوسکتا۔ کنوؤں سے جہاں کہیں پانی بھرا جاتا ہے انھیں صاف حالت میں نہیں رکھا جاتا۔ میونسپلٹی بھی مزدوروں کی ضروریات کی طرف توجہہ نہیں کرتی۔

(۸) مکانوں کی زائد از گنجائش آبادی سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

تندرستی جہاں کہیں صفائی کا معقول انتظام نہیں ہوتا وہاں ہر عمر کے لوگوں میں شرح اموات زیادہ ہوتی ہے۔ طبی تحقیقات پر کام کرنے والوں کی کانفرنس نے ۱۹۲۶ء میں ایک قرار داد منظور کی تھی جس کا مطالعہ اس سلسلہ میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:۔

" اس کانفرنس کی یہ قطعی رائے ہے کہ ایسے امراض سے جن کا روکنا ممکن ہے، ہر سال اوسطاً پچاس ساٹھ لاکھ آدمی مرجاتے ہیں اور جو مبتلا ہوکر صحت پا جاتے ہیں اُن کے ہر سال اوسطاً دو تین ہفتہ ضرور ضائع ہوجاتے ہیں ہندوستان میں ہر شخص امراض اور غذا کی خرابی سے اوسطاً بیس فیصدی نقصان اٹھاتا ہے۔ ایسے بچوں کی پیداوار کا اوسط جو جوان ہوکر کھاتے کماتے ہیں ہندوستان میں پچاس فی صدی ہے حالانکہ اس اوسط کو نہایت آسانی سے اسّی اور نوّے فیصدی کیا جاسکتا ہے "

پیدائش اور اموات دونوں کی شرحیں زیادہ ہیں۔ اس کا سبب زیادہ تر غذا، جسمانی طاقت اور مکانوں کی خرابی ہے۔ گھر کا ماحول بہت تاریک اور غم آلود ہوتا ہے اور اس کے اثرات میں جو کسر رہ جاتی ہے وہ کارخانے کی خراب زندگی سے پوری ہوجاتی ہے۔ کارخانوں میں مندرجہ ذیل بدنما پہلو نظر آتے ہیں:۔

(۱) خراب صفائی ۔ چھوٹے کارخانوں کے مالک مکانوں پر سالانہ سفیدی کرانے میں بُخل سے کام لیتے ہیں کارخانہ کے احاطہ میں ملبہ اور کوڑا اکٹھا ہوتا رہتا ہے ۔ نالیوں کو تیزی سے پانی بہا کر صاف نہیں کیا جاتا۔ پیخانوں کا انتظام کافی نہیں ہوتا ۔ پینے کے لئے اچھے پانی کی رسد ناکافی ہوتی ہے ۔

(۲) ہوا کا خراب انتظام خاص کر بنولہ نکالنے والے کارخانوں میں

(۳) روئی کے کارخانوں میں مصنوعی نمی پہنچانے کے انتظام پر پورا قابو نہیں رکھا جاتا ۔

(۴) کام کے اوقات طویل ہوتے ہیں ۔

کچھ کارخانوں کے مالکان، طبی امداد کا بندوبست رکھتے ہیں جس سے مزدوروں کو فائدہ پہنچتا ہے مزدور حکیم کے علاج کو ڈاکٹری علاج پر ترجیح دیتے ہیں ۔ ہر کارخانے کو جو ۵۰ یا زائد مزدوروں کو بھرتی کرتا ہے ایک طبیب یا ڈاکٹر کو بھی ملازم رکھنا چاہئے ۔ لیڈی ڈاکٹروں کا انتظام بھی معقول نہیں ہے اور جو ہے اس سے مزدوروں کو فائدہ نہیں پہنچتا ۔ حاملہ ماؤں اور نوزائیدہ بچوں کی نگہداشت کا بھی پورا بندوبست ہونا چاہئے ۔ دیسی دائیاں بہت گندی اور اصول صحت سے ناواقف ہوتی ہیں ۔ اُن کی مناسب تعلیم بھی ضروری ہے ۔

ہیضہ، میریا، انفلوئنزا، پلیگ، اور تپ دق سے بھی مزدوروں کی بہت سی جانیں تلف ہوتی ہیں بیماری کے لئے بیمہ مزدوروں کے لئے لازمی کر دینا چاہئے ۔

مزدوروں کی بھلائی کے دوسرے کام | مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لئے چند کارخانوں میں بہت ہی ابتدائی قسم کے کام شروع کئے گئے ہیں ۔ لیکن جہاں کہیں بھی یہ کام کئے جاتے ہیں وہ فرض کی حیثیت سے نہیں بلکہ خیرات کے طور پر کئے جاتے ہیں ۔ ایسے کارخانے بہت کم ہیں جو مزدوروں کی تعلیمی اور تفریحی رجحانات کو پورا کرتے ہوں ۔ کچھ کارخانوں میں دوائیں مفت تقسیم کی جاتی ہیں ۔ اس کے علاوہ ہم آہنگی اور اتحاد عمل کو پیدا کرنے کے بھی کوشش کی جاتی ہے ۔ اس کام کے لئے مالکوں اور مزدوروں کی ایسی پنچایتی کمیٹی بنانا بہت موزوں ہے جس میں دونوں کے نمائندے ایک دوسرے کی بات سُن اور سمجھ سکیں اور مشترکہ اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے بحث و مباحثہ کر سکیں ۔

ایک کامیاب اور دوراندیش صنعتی نظام میں ایسے لوگوں کا موجود رہنا بہت ضروری ہے جو مزدوروں

کی بھلائی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خدمات بڑے کارخانوں کو تنہا اور چھوٹے کارخانے والوں کو مل کر حاصل کرنا چاہیں۔ بھلائی کا کام مندرجہ ذیل اصولوں کے ماتحت ہونا چاہیئے:۔

(۱) کھانے کی دوکانیں۔ کھانا مزدوروں کو اسی قیمت پہ ملنا چاہیئے جتنی اُس کی طیاری میں لاگت لگی ہو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کے لئے علیحدہ کمرے ہونا چاہیں اور اُس میں آرام و آسائش کا پورا اہتمام ہونا چاہیئے۔

(۲) کارخانوں اور مزدوروں کے گھروں میں پوری صفائی ہونا چاہیئے۔ سینما، میجک لنٹرن کے ذریعہ سے تندرستی، غذا اور صفائی کے متعلق سبق دینا چاہیئے۔

(۳) مزدوروں کا طبی معائنہ ہونا چاہیئے۔ طبیب اور ماہران دنداں لازمی طور پر کارخانوں میں رکھے جائیں۔ ابتدائی طبی امداد اور تندرستی کے اصول کی تعلیم کے لئے جماعتیں کھولی جائیں۔

(۴) مزدوروں کو بھرتی کرتے وقت قوت تمیز سے کام لیا جائے تاکہ بعد کو انھیں ایک دم برطرف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مدارس شبینہ قائم کرکے بھلائی کے کاموں کو وسعت دی جاسکتی ہے۔ مدارس یکشنبہ، نیم اوقات کے مدارس اور مزدوروں کے بچوں کے لئے مدرسے کھولے جاسکتے ہیں۔ امداد باہمی کو بھی امداد باہمی کی دوکانیں اور امداد باہمی کے قرضوں کی انجمنیں قائم کرکے پیدا کیا جاسکتا ہے۔

محافظت | کارخانوں میں ہنگامی واردات بھی ہوتی رہتی ہیں جن کے اسباب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سیسے کے زہر کا اثر۔ جن صنعتوں میں اس کا امکان ہو وہاں میعادی طبی معائنہ لازمی قرار دیا جائے

(۲) مشین کا کھلا ہوا ہونا۔ چھوٹے کارخانوں میں گریوں اور فیتوں کے گرد باڑ نہیں لگائی جاتی یا باڑ ایسی لگائی جاتی ہے جس سے بچاؤ کی جگہ الجھاؤ پیدا ہونے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔

(۳) سیکھے ہوئے مزدوروں کی جگہ بے سیکھے مزدور رکھ لئے جاتے ہیں جس سے واردات لازماً بڑھ جاتی ہیں۔

(۴) مزدور کی غفلت اور لاپرواہی۔ بہت سے ایسی ہنگامی واردات کا جن کی رپورٹیں ہوتی رہتی ہیں مزدوروں کی مناسب نگرانی رکھنے سے سدباب کیا جاسکتا ہے۔ غفلت و لاپرواہی کا سبب یا تو مزدور کی ناواقفیت

ہوتی ہے یا ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننے کا شوق۔ اس لئے سیفٹی فرسٹ کی تدابیر کارخانوں کے لئے بہت ضروری ہیں۔

مزدوروں کو معاوضہ | قانون معاوضۂ مزدوران کا فائدہ مزدوروں کو اسی وقت پہنچتا ہے جب اس قانون کے ماتحت جو کمشنر نگرانی کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں وہ اپنے وسیع اختیارات کو فیاضی اور وسعت خیال سے استعمال کرتے ہیں اس ضمن میں جو رپورٹیں نکلی ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کمشنروں کی طرف سے معائنہ نہ ہوتا تو بہت سے معاملات دبا دئے جاتے۔ مزدور نادار اور جاہل ہوتے ہیں اور بعض وقت آجر اُنہیں قصداً دھوکا دیتے ہیں اس لئے کمشنروں کو اپنا کام مستعدی سے کرنا چاہئے۔

ہرجانہ سے بچنے کے لئے طرح طرح کے عذر پیش کئے جاتے ہیں اور جب ہرجانہ دیا جاتا ہے تو وہ معاملہ کی اہمیت کے لحاظ سے بہت کم ہوتا ہے۔ چھوٹے کارخانوں کے مالک اس قسم کے بہانے زیادہ کرتے ہیں۔

ماہر مزدور بھی قانون معاوضہ سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اور غیر ماہر مزدوروں کو تو محض اس کا برائے نام ایک خیالی تصور ہوتا ہے۔ سالانہ رپورٹوں سے خصوصیت کے ساتھ یہ بات ظاہر ہوتی ہے اس لئے اس قانون کے منافع کو پوری طرح شہرت دینے کی بہت ضرورت ہے۔

ایسی مثالوں کا بھی پتہ چلا ہے جن میں فوت شدہ مزدور کے کسی رشتہ دار کا پتہ نہیں چل سکا۔ اس لئے اپنے قریبی رشتہ داروں کا نام درج کرانا ہر مزدور کے لئے لازمی قرار دے دیا جائے۔ مزدور بہت نادار ہوتے ہیں۔ وہ وکیل کا محنتانہ اس امید پر ابتدا میں ادا نہیں کر سکتے کہ بعد میں ہرجانہ وصول ہونے کی صورت میں اس سے بہت زیادہ رقم مل جائے گا۔ پھر اُسے اپنا دعوے ثابت کرنے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔ اس کے ساتھی برطرفی کے ڈر سے اُس کی امداد نہیں کرتے۔ اس لئے سرکاری وکیلوں کو مزدوروں کے معاوضہ کے مقدمات کی پیروی مفت کرنا چاہیئے۔

کام کے اوقات | چھوٹے کارخانوں میں عورتوں اور بچوں سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ عام طور پر بڑے اور اچھے انتظام والے کارخانے قانون کی حدود کے اندر رہنا چاہتے ہیں۔ فصلی کارخانے، جہاں تک ہو سکتا ہے، اوقات اور بچوں کو ملازم رکھنے والے قوانین کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں۔

بنولے نکالنے والے کارخانے خصوصیت کے ساتھ قانون کی خلاف ورزی کرنے میں بڑے دلیر ہوتے ہیں بہت سے کارخانے اتوار اور دوسری تعطیلوں کے دنوں میں بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ مقامی حکومتوں نے ایسے کاموں کو جن میں مسلسل پیداوار حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے قانون کے عمل سے مستثنیٰ کر دیا ہے لیکن مزدور کو چھٹے دن کا ہفتہ ضرور ملنا چاہئے، چاہے کارخانہ میں ساتوں دن برابر کام ہوتا رہے۔

کام کے گھنٹوں میں کمی ہو جانے کا یہ لازمی نتیجہ نہیں ہے کہ پیداوار فی کس میں بھی کمی ہو جائے۔ برخلاف اس کے اس کمی سے پیداوار میں اضافہ کا بھی امکان ہے۔ اگر نگرانی معقول ہو تو کام کے گھنٹوں کی کمی کی وجہ کر مزدوروں کی کاہلی اور سرگشتی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

اُجرتیں | مزدوروں کو اُجرتیں عموماً نقدی کی شکل میں دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی کارخانوں میں جنسی شکلوں میں بھی خاصی ادائیگی کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی مکانات بھی مفت یا کم کرایہ پر مہیا کئے جاتے ہیں۔ کبھی غلہ بازار کے بھاؤ کے مقابلے میں سستے داموں پر دیا جاتا ہے۔

کئی کارخانوں میں مزدور مقررہ اوقات سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ زاید از وقت کام کی اُجرتوں کے نرخ معمولی نرخوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ بہت سے کارخانوں میں زاید از وقت کام کی کوئی مزدوری نہیں دی جاتی ضلع گرداسپور (پنجاب) کے ایک ضلع میں زاید از وقت کام کرنے والے مزدوروں کو جس قدر زیادہ وہ پہلے دن کام کرتے ہیں اسی کے حساب سے دوسرے دن قبل از وقت کام چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت ہوتی ہے۔

واقعی یا من مانے قصوروں پر جرمانے عاید کئے جاتے ہیں۔ تصور عموماً مندرجہ ذیل ہوتے ہیں:۔

(۱) بلا اطلاع کی غیر حاضری

(۲) کارخانے میں دیر سے حاضری

(۳) گستاخی اور نافرمانی وغیرہ وغیرہ

کسی قسم کی باقاعدہ تحقیقات نہیں کی جاتی اور اکثر حالتوں میں جرمانوں کو آمدنی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن ہونا یہ چاہئے کہ ان جرمانوں کو مزدوروں پر ہی صرف کیا جائے۔ جرمانے صرف شاذ و نادر حالتوں میں ہونا چاہئیں اور قانوناً اُن کی مجموعی رقم ایک مہینہ میں ایک دن کی اُجرت سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔

اُجرتیں روزانہ، ہفتہ وار، نصف ماہی یا ماہانہ ادا کی جاتی ہیں۔ عموماً اُجرتیں ماہوار دی جاتی ہیں اور ایک یا دو ہفتہ کی تنخواہ کا بقایا رکھا جاتا ہے۔ ایسے مزدوروں کو جن کی تنخواہ پچاس یا اس سے کم ہے ادائگی ہفتہ وار ہونا چاہئے جن اُجرتوں کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اُنھیں آمدنی میں کبھی شامل نہ کرنا چاہئے۔ اُنھیں مزدوروں کی تعلیمی اور معاشرتی کاموں پر صرف کرنا چاہئے۔ آج کل مزدوروں کو ایک مقررہ میعاد ملازمت کے بعد استحقاقی رخصت پوری تنخواہ پر شاذ و نادر ہی دی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہونا چاہئے بلکہ انھیں ایک مہینہ کی رخصت آدھی تنخواہ پر یا پندرہ دن کی پوری تنخواہ پر ہر سال ملنا چاہئے۔

اکثر چھوٹی صنعتوں میں کم معاوضہ پر بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ ایسے کارخانوں کے لئے قانون بن جانا چاہئے کہ ایک مقررہ رقم سے کم تنخواہ کسی حال میں نہ دیں گے۔

مزدور اکثر مقروض رہتے ہیں۔ پنجاب میں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ۶۲ فی صدی مزدور مقروض ہیں۔ امرتسر کے دو کارخانوں میں یہ تناسب ۹۰ فی صدی معلوم ہوا۔ شولاپور میں جو تحقیقات کی گئی اس میں ۶۳ فی صدی خاندانوں نے قرض پر سود دینا ظاہر کیا۔ شرح سود بھی بہت زیادہ گراں ہوتی ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ ایک آنہ فی روپیہ فی ہفتہ ہوتی ہے اس لئے حکومت کی طرف سے شرح سود کا تعین بہت ضروری ہے۔

مزدوروں کی صنعتی اہلیت کار | مزدوروں پر جو اثر کارخانہ کی زندگی کا پڑتا ہے۔ اس کا براہ راست بیان کرنا دشوار ہے البتہ اس کے بالواسطہ اثرات بیان کئے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں میں نے ۲۳۸ مزدوروں کا قد اور وزن معلوم کیا تھا۔ اُن میں سے ۱۴۹ پانچ سال سے ملازم تھے اور ۲۰۰ تین سال سے زیادہ کی۔ پنجاب کی جیلوں کے ۵۹۴ قیدیوں کا بھی میں نے قد اور وزن معلوم کیا تھا۔ مزدوروں کا اوسط وزن ۱۱۵٫۳ پونڈ معلوم ہوا اور قیدیوں کا ۱۲۶٫۳ پونڈ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کارخانے کے ایک اوسط مزدور سے تو ایک اوسط قیدی بھی بہتر حالت میں ہے!

کارخانوں کی غیر تندرست زندگی کا اثر ہمارے مزدوروں کی اہلیت کارکردگی پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ اگر کام کے گھنٹے معقولیت کے ساتھ کم کردیئے جائیں اور رہنے کے مکانوں کی صفائی اور دلکشی کا بند و بست ہو جائے اور معاشری اور تعلیمی احول پیدا کر دیا جائے تو حالات میں بہت کافی اصلاح ہو جائے۔

شراب اور افیون گانجے کے استعمال سے بھی مزدوروں کی اہلیت کار گھٹ جاتی ہے اور یہ چیزیں بھی خبر گیری اور تعلیم سے رفع کی جا سکتی ہیں۔

مزدوروں کا اشتراک عمل کارخانوں کے مالکوں کی تنظیم مزدوروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ بعض اوقات یہ لوگ مزدوروں کے خلاف ملکر کام کرتے ہیں ۱۹۲۷ء میں امرت سر کے ایک کارخانے کے مالک نے اقرار کیا کہ ۴۰ میل کے فاصلہ پر جو دوسرا کارخانہ ہے اُس سے جو مزدور علیحدہ کیا جاتا ہے اُسے میں اپنے یہاں ملازم نہیں رکھتا۔ پنجاب میں یہی دو کارخانے ایسے ہیں جن میں ایک ہی قسم کا مال طیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے برطرف کئے ہوئے ملازم کے لئے زندگی کی کوئی صورت سوائے اس کے نظر نہیں آتی کہ وہ کم اُجرت پر کوئی دوسرا کام شروع کرے۔

ٹریڈ یونین کی ترقی سے مزدوروں کی حالت ضرور زیادہ مستحکم ہو جائے گی۔ اس وقت تو کارخانہ کے مالک عموماً ٹریڈ یونین سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے ممبروں کو طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں حکومت کے کارخانوں میں بھی یہی کیفیت دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ ٹریڈ یونین کے قانون میں ترمیم کی ضرورت ہے مثلاً ایک ترمیم یہ ضروری ہے کہ ٹریڈ یونین کے افسران کے انتخاب کے وقت یہ پابندی نہ ہو کہ مزدوروں کی ان انجمنوں میں کم از کم نصف افسران اسی صنعت کے ملازم ہوں گے جس کے لئے کہ ٹریڈ یونین قائم کی جارہی ہے کیونکہ مزدوروں کی عام جہالت کی وجہ سے اس قسم کے لوگ مزدوروں کے حقوق کی ٹھیک طریقہ پر نمائندگی نہیں کر سکیں گے۔

صنعتی فسادات ہڑتالوں کے اسباب معاشی بھی ہوتے ہیں اور غیر معاشی بھی۔ مزدوروں کو بعض ہڑتالوں سے فائدہ ہوا ہے اور بعض سے نقصان۔ چھوٹے کارخانوں میں مزدوروں کو اپنے مطالبات پیش کرنے کا بہت کم موقع دیا جاتا ہے گو بڑے کارخانوں میں اب اس کے امکانات پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

صنعتی فسادات کے قانون میں متعدد خامیاں ہیں۔ مثلاً عام منفعت کی صنعتوں کے مزدوروں پر غیر مناسب پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں اور اُن کے ساتھ کوئی خاص رعایت ملحوظ نہیں رکھی جاتی۔ ہمدردی کی ہڑتالوں کا بھی اس قانون سے سدباب ہو گیا ہے۔

مالک اور ملازم کے باہمی تعلقات دری کے کارخانوں میں، دری بننے والوں کو سو دو سو روپیہ پیشگی دیدیئے جاتے ہیں اس کے معاوضہ میں وہ اپنے مزدور ساتھ لاتے ہیں جو عموماً چھوٹے بچے ہوتے ہیں اور انھیں جو جی میں آتا ہے وہ اجرت دیتے ہیں۔ پیشگی رقوم جو انھیں اس طرح ملتی ہیں اُن کو یہ لوگ فضول خرچی میں صرف کردیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں اس قرض کے بارے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ ایسی پیشگی رقوم کے طریقے جن میں محنت رہن رکھی جائے بالکل بند کردینے چاہئیں۔

لاہور کے ایک کارخانے میں ماہر مزدور انفرادی تحریری معاہدوں کے بعد ملازم رکھے جاتے ہیں جن سے عام طور پر وہ پانچ سال تک کام کرنے کے لئے پابند ہوجاتے ہیں مگر مالک جب چاہے انھیں تین مہینہ کا نوٹس دیکر علیحدہ کرسکتا ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں مزدور دھوکا نہ دے جائے اُسے نقد کی صورت میں ضمانت ادا کرنا ہوتی ہے جو یا تو ایک دم لے لی جاتی ہے یا رفتہ رفتہ ماہواری تنخواہ سے ایک سال کی مدت میں کاٹ لی جاتی ہے ضمانت کی رقم تین مہینہ کی تنخواہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ معلوم نہیں یہ معاہدہ قانوناً جائز ہے یا نہیں لیکن عدالت میں اس قسم کے معاہدوں کے پیش کرنے کی اجازت نہ ہونا چاہیئے۔

کارخانہ کے قانون پر عملدرآمد کارخانہ کے قانون پر پورے طریقہ پر عملدرآمد نہیں ہوتا۔ بہت سے ایسے کارخانے ہیں جن میں مشین اور تیل بھاپ بجلی کی طاقت کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ صرف صوبہ پنجاب میں تقریباً ۲۲۵ و ۲ مزدور ایسے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اور ان میں سے پندرہ فیصدی ۹ سے ۱۲ برس تک کی عمر کے بچے ہیں ان کارخانوں کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے۔ صفائی کا خراب انتظام، کچے فرش اور گندے صحن سب کا صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ مزدوروں اور امیدواروں سے کام بھی بہت زیادہ لیا جاتا ہے اور انھیں ہفتہ وار چھٹی بھی آرام کے لئے نہیں دی جاتی۔ دوسرے صوبوں میں دری اور بغیر رجسٹری کرائے ہوئے چمڑے کے کارخانوں کی حالت بھی ایسی ہی خراب ہے۔ چمڑے کی دباغت کے کارخانوں کے احاطے بڑے گندے اور غلیظ ہوتے ہیں۔ ہوا کا انتظام بہت ناقص ہوتا ہے اور کام کے کمروں کی تاریکی سے ڈر لگتا ہے۔ کام کے گھنٹوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔ مزدور اپنے مالکوں کے غلام ہوتے ہیں اور دن رات میں کسی وقت بھی انھیں کام پر بلایا جاسکتا ہے سیالکوٹ کے ورزشی سامان بنانے والے کارخانوں کی بھی جہاں

تک بچوں کو ملازم رکھنے اور کام کے گھنٹوں کا تعلق ہے بالکل یہی حالت ہے۔

عام طور پر کارخانہ کا مالک اپنی حسب مرضی کام کرنا چاہتا ہے اور جب برطانوی ہند میں کام چلنا نہیں دیکھتا تو ریاستوں میں چلا جاتا ہے جہاں کارخانہ کے قانون پر کوئی عملدرآمد نہیں ہوتا۔ اس لئے کارخانہ کے قانون کو تمام ہندوستان پر جاری ہونا چاہیے۔

بہت کم جاہل مزدوروں کو کارخانہ کے قانون کا علم ہوتا ہے۔ اس قانون کے ترجموں کو نوٹس بورڈ پر چپکا دینے سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قانون کے فوائد پوری طرح مزدوروں کے ذہن نشین کرادئے جائیں۔

کام کے اوقات، آرام کے وقفے، تعطیلیں، صفائی کا انتظام، مشین کی محافظت سب کارخانہ کے قانون پر معقول طریقہ پر عملدرآمد کرنے سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس قانون پر عملدرآمد ٹھیک طریقہ پر نہیں ہورہا ہے۔ معائنہ کی تعداد بہت کم ہے اور اس کے لئے عملہ کافی نہیں ہے اور بعض کارخانے کے مالک انسپکٹروں سے زیادہ چالاک ہوتے ہیں اور انھیں خوب دھوکہ دیتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ صحیح قسم کے معائنہ کرنے والوں کو خاصی تعداد میں بھرتی کیا جائے۔

کارخانوں کے متعلق معلومات بھی پوری طرح فراہم نہیں ہیں۔ اس لئے اُجرت شماری اور اخراجات زندگی کی پیمائش کے کام بھی شروع ہونے چاہئیں۔ بمبئی کے دفتر مزدوران کی طرف سے جو معلومات شائع ہوئی ہیں وہ بہت مفید ثابت ہوئی ہیں۔

دوڑ

(ذیل کا مضمون ہنگری کے مشہور ناول نگار فرانس ہرزیگ کے ایک "افسانہ کا ترجمہ ہے۔ مدیر)

وہ بڑا جہاز کس تیزی سے بڑھا چلا جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے سفید جھاگ کی دم سی ہے جو جگ مگ جگ مگ ہوتی ہے۔ نیا جہاز ہے اور یہ سفر اس کا پہلا سفر ہے۔ بالکل اوپر کپتان کے کمرہ میں جو چاروں طرف شیشوں سے بند ہے کوئی پانچ چھ جاپانی بحری افسر کھڑے ہیں! جیبوں میں ہاتھ، ساکت جیسے تصویریں۔ سامنے ایک سفید جہاز اس تیزی سے جا رہا ہے جیسے کوئی ہرن جس کے پیچھے بھیڑیا چھٹا ہو۔ ان افسروں کی نگاہیں اسی سفید جہاز کے چکنے چکنے خوبصورت (HULL) پر جمی ہوئی ہیں۔ آج صبح سویرے سے یہ نیا جہاز اس سفید جہاز کے پیچھے پیچھے ہے۔ اس جہاز کا نام ہے کیلی ڈونیا اور یہ یورپ کا سب سے تیز جہاز ہے، طلوع آفتاب کے وقت سے جاپانی برابر یورپیوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اور اپنے انجن میں اتنا ایندھن جھونکے جاتے ہیں کہ ڈر ہے کہ پھٹ نہ جائے۔ اگر کوئی صورت نکل سکتی کہ یہ جہاز اپنی رفتار کو دوگنا کر سکے تو اس کے لئے ان کا ہر ملاح اپنی عمر کا ایک ایک سال خوشی سے دے دیتا!

دوسرے درجہ کے سامنے والے عرشہ پر دو مسافر ایک کونے میں ہوا سے بچے بیٹھے ہیں۔ انہیں اس دوڑ کی ذرا خبر نہیں جس سے ملاحوں کے اعصاب مارے تناؤ کے ٹوٹے جاتے ہیں اور جس نے جہاز کو اس سرے سے اس سرے تک ہلا رکھا ہے۔ ایک حبشی ہے، دوسرا ہندی۔ سیاہ آدمی کلیسائے روم کا ایک پادری ہے اور جزائر سینڈوچ میں مشن کے کام میں شرکت کے لئے جا رہا ہے۔ گندمی رنگ والا مسافر انگلستان کے کسی دارالفنون میں پڑھتا تھا اب اپنے وطن کو لوٹ رہا ہے۔ دونوں بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ یورپ میں جو جو بیتی ہے اس پر گفتگو ہے۔

سیاہ رنگ پادری نے پوچھا۔ "ہاں تو آپ نے ان کے دارالفنون میں طالب علمی ختم کیوں کر دی؟"

"وہاں رہنے اور طلبِ علم جاری رکھنے میں کوئی فائدہ نہ تھا"

"کیا آپ نے سب کچھ سیکھ لیا، جان لیا" حبشی نے پوچھا۔

"میں نے کسی ایک شعبۂ علم پر ساری توجہ صرف نہیں کی۔ میں تو اصل میں یورپی تہذیب کی روح کو سمجھنا چاہتا تھا۔ یعنی وہ کیا چیز ہے جس نے ان سفید رنگ لوگوں میں وہ احساسِ فوقیت پیدا کر دیا ہے جس سے ہماری طبیعت چڑتی ہے ؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے میں اس مرکزی' بلکہ اس بنیادی تصور کا پتہ چلانا چاہتا تھا جس پر ان کی ساری تہذیب بنی ہے"۔

"یعنی آپ روحِ مغرب کا پتہ چلانا چاہتے تھے۔ پھر کچھ پتہ ملا ؟"

"سچ تو کچھ نہ ملا !"

"دیکھئے، اگر ایک (DREDGING) مشین کے سمندر میں چلانے سے کچھ اوپر نہ آئے تو اس کے یہ معنی تو نہ ہوں گے کہ سمندر کے تہ ہی نہیں"۔

"اچھا' تو کیا آپ کے خیال میں یورپ کی روح اتنی گہری ہے جتنی کہ سمندر کی تہ ؟ میرا تو گمان ہے کہ یورپ کے' جدید یورپ کے' روح ہے ہی نہیں۔ مجھے تو سوائے مقطوع اعضا اور منتشر ٹکڑوں کے کچھ بھی نہ ملا۔ جیسے کسی نے مردہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہوں۔ میں اپنے سے پوچھا کرتا تھا کہ آیا کبھی بھی یورپ کی عظمت کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ خود ہماری نظر مینڈک کی طرح محدود ہو اور اس وجہ سے یورپ بڑا معلوم ہوتا ہو ؟ اگر یورپ سے مراد ہیں سب یورپ والے تو پھر تو یورپ کا وجود ہی نہیں اس لئے کہ مجھے تو کوئی ایسی مخلوق وہاں ملی نہیں جو اس براعظم کا جزو بن گئی ہو جس پر وہ بستی ہے۔ اگر آج ہمارے جدید ایشیائی یا منگولوں کے غول یورپ پر چڑھائی کر دیں تو مجھے ذرا شبہ نہیں کہ سفید نسل کے آدھے آدمی نہایت جوش و خروش سے ان کا خیر مقدم کریں گے۔ اس لئے کہ یہ آپس میں اتنا لڑے ہیں کہ اب موت یہ جہنم سے بھی زیادہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں"۔

"مگر ان کا علم۔ یورپ کے پاس جو علم ہے تم اسے کیسے نظر انداز کر سکتے ہو ؟"

"ہاں بیشک۔ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اتنا جانتے ہیں کہ انسانی اعصاب

تے کا حل نہیں کر سکتے۔ مگر ان کا علم ہی کیا ہے؟ ٹکڑوں اور پرزوں کا مجموعہ۔ بلاشبہ ٹکڑے بھی نہایت علم انسان ہیں، مگر ہیں پھر منتشر ٹکڑے، تہذیب و تمدن سے من حیث الکل جدا۔ الگ الگ اپنا وجود رکھتے ہیں، جیسے کوئی پالتو پلی جنگل میں پہنچ کر بھٹکی بھٹکی پھرے۔ مغربی علم کو اب تمدن و تہذیب سے تقریباً کسی طرح کا واسطہ نہیں رہا ہے۔ ان کے عالموں کی نظر سے علم کا اصلی مقصد اوجھل ہے۔"

"اور یہ اصلی مقصد ہے کیا؟"

"صرف ایک، یعنی انسانی زندگی کا سہارا بننا۔ اب ذرا دیکھئے۔ یہ سفید لوگ صنعت کے ساب میں اپنی ذکاوت پر کیسے نازاں ہیں۔ ہاں کسی چیز پر اتنا فخر نہیں کرتے۔ لیکن ان کی مشینیں آدمی ہی پر ضرب لگاتی ہیں۔ امن کے زمانہ میں آدمیوں کو بیکار رکھتی ہیں اور جنگ میں حیرت خیز قوت کے ساتھ انسانی زندگی کی تباہی کا سامان کرتی ہیں۔"

"ہاں مشین۔ مگر یورپ کے پاس تو مشین کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ اس کے پاس خیالات و تصورات ہیں، جذبات ہیں، اس کے پاس مذہب ہے، آرٹ ہے۔"

"جناب والا — ذرا ٹھہریئے۔ میں جب پورٹسمتھ سے جہاز پر بیٹھا ہوں تو انگلستان کے تمام اخبار ہوائی حملہ کے خطرہ کے بیان سے بھرے پڑے تھے۔ شہر کے سارے بسنے والے، مرد، عورت، بچے، بڑے سب کے سب سوتے سوتے میں مارے جا سکتے ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کے ذہن پر آج یہ خطرہ مسلط ہے۔ لیکن یہ کسی کو نہیں سوجھتی کہ شاید مسیح کا دین محبت اس اجتماعی قتل و خونریزی کو روک سکے۔ اور رہا آرٹ۔ سو آرٹ زندگی کا زیور ہے۔ اور جب زندگی ہی میں کوئی معنی و مقصد باقی نہ رہے تو بھلا آپ ہی فرمائیے کہ اس کے زیور سے فائدہ۔ یورپی آرٹ تو ایک مردہ جسم کا زیور ہے اور بس۔"

"پھر آخر تمہارے خیال میں ہونے والا کیا ہے؟"

"سفید نسل کے لوگ بھٹک کر ایک اندھی گلی میں جا پہنچے ہیں۔ مڑنا یہ چاہتے نہیں۔ کہ انسانیت کبھی پیچھے نہیں مڑتی۔ لہٰذا اب کوئی صورت باقی نہیں، بس یہ اپنا کام کر چکے۔"

"تمہیں ان پر رحم نہیں آتا؟"

ہندی نے اپنے مونڈھے ہلائے۔ اور بولا: "آج تو یہ لوگ انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ مگر آپ کہئے، آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں ایک مسیحی پادری ہوں اور مداخلت الٰہی پر یقین رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سفید لوگ خدا کے منتخب لوگ ہیں۔ خدا نے انھیں دوسری نسلوں سے زیادہ ذکی اور مخترع قوت ذہنی بخشی ہے اور زیادہ قوی قوت ارادی تاکہ وہ دنیا میں اپنے کام کو پورا کر سکیں۔"

"اور ان کا یہ کام کیا ہے؟ شاید یہی کہ آپ کے بے زبان بھائیوں یعنی رنگین نسلوں کے آدمیوں کی رہبری کرنا، انھیں کام دینا، خیالات دینا، محبت دینا؟ ہاں تو کیا کہنا، اس کام کو تو سفید نسل والوں نے نہایت شاندار طریق پر انجام کو پہنچایا ہے۔ انھوں نے ہماری قدیم سلطنتیں تباہ کر دیں، اور ہمارے قدیم تمدن کو برباد کر دیا۔ ان سفید لوگوں کے اعمال نے جو خون اور جو آنسو بہائے ہیں وہ سب یکجا کئے جا سکیں تو اس میں تمام یورپ ڈوب سکتا ہے۔"

حبشی پادری کچھ دیر بالکل چپ رہا اور پھر بولا: "لکھا ہے کہ حکومت خداوندی تم سے چھین لی جائیگی اور کفار کو دی جائیگی کہ وہ اس کے پھل پائیں۔"

ہندی نے پوچھا: "یہ کیسی حکمت ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمھارے خدا نے اپنی محبوب قوم کے انتخاب میں ایسی غلطی کی ہو؟"

"وہ تو انسانوں کو اپنے اعمال کا اختیار دیتا ہے اور جس طرح وہ اپنے اس اختیار کو صحیح یا غلط استعمال کرتے ہیں اسی طرح انھیں جزا اور سزا دیتا ہے۔"

"لیکن اگر وہ پہلے سے جانتا تھا کہ کیا ہوگا تو پھر ——" "ہاں۔ اسے تو پہلے سے یہی معلوم تھا کہ بہار کے پھول خزاں میں مرجھا جائیں گے۔ پھر بھی اس نے بہار کو پھولوں سے سجایا۔ کہ یہی پھولنے اور مرجھانے کا عمل ہی تو زندگی ہے۔"

ہندی نے کہا: "ٹھیک ہے۔ اگر تمھارا خدا سفید انسان کو بھی مرجھا دے تو میں سر تسلیم خم کرتا ہوں۔"

بات چیت یہاں تک پہنچی تھی کہ جاپانی جہاز کی سیٹیاں فتحمندی کی خوشی میں بجنے لگیں۔ ایک ایک

اٹ کرکے یہ جہاز دوڑ میں کی ڈ دنیا کو دبانے لگا اور بالآخر اس سے آگے نکل گیا۔ ہر ہر لحظہ شکست خوردہ سعید جہاز پیچھے ہوتا جاتا تھا۔ شام کے دھندلکے میں یہ چھوٹا ہوتے ہوتے شکل سے دکھائی دے رہا تھا۔ جاپانی بحری افسران کپتان کے گرد جمع تھے اور ان کے نیلے پتلے ہونٹوں پر ایک تبسم تھا جس میں کچھ حقارت کی بھی آمیزش تھی۔

ادبیات کا مستقبل

(ذیل میں انگلستان کے نہایت ممتاز نوجوان شاعر ڈے لیوس کی ایک تقریر کے حصے ترجمہ کرکے پیش کئے جاتے ہیں جو انھوں نے ریڈیو پر کی تھی اور بعد کو رسالہ LISTENER میں شایع ہوئی تھی۔ مدیر)

ادبیات کے مستقبل پر نظر کرنی ہے تو دماغ سے یہ غلط خیال نکال دینا چاہیئے کہ زندگی اور ادب کوئی الگ الگ عالم ہیں یا ادب چاند کی طرح ایک مردہ جسم ہے جو محض اس لئے نظر آتا ہے کہ سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں، بس زندگی کے لئے ایک آئینۂ خود نمائی۔ نہیں۔ زندگی اور ادب میں اس سے بہت زیادہ گہرا تعلق ہے۔ زندگی پروٹیس کی طرح دم بدم متغیر رہتی ہے اور لحظہ بہ لحظہ اپنی شکل تبدیل کرتی رہتی ہے۔ ادب اس پروٹیس سے زور آزمائی کرتا ہے اس وقت تک کہ اسے کسی ایک شکل میں گانٹھ نہ لے اور اسے اپنا راز بتانے پر مجبور نہ کرے۔ لیکن پروٹیس پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر نئے سرے سے وہی قصہ شروع ہوتا ہے۔ اس کا پتہ پہلے سے لگا لینا کہ اس مرتبہ زندگی کیا شکل اختیار کریگی اگر ممکن ہے تو اسی کے لئے جو اس کی موجودہ شکل پر پوری طرح حاوی ہو۔ لہذا اگر ادب کے متعلق پیش گوئی کرنی ہے تو پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس وقت زندگی ادبیات پر کس کس طرح اثر انداز ہے۔

ان اثرات میں سے اس وقت میں تین کا ذکر کرتا ہوں یعنی سیاسیات، نفسیات، اور اختراعات حکمی۔ سیاسیات کے معنی ہیں، یا کم از کم ہونے چاہئیں، مل جل کر رہنے سہنے کا علم۔ اب آپ پوچھیں گے کہ اس علم کو آخر غریب مصنف سے کیا سروکار جو اپنے چھوٹے سے کمرہ یا دیہاتی گھر میں بیٹھا خوش خوش کچھ گھسیٹ رہا ہے۔ اس بیچارہ کے دروازہ پر تو بھوک کا بھیڑیا اتنی دفعہ آچکا ہے کہ اب یہ اسے پالتو جانور سمجھنے لگے تو بیجا نہیں، اسے کیا مطلب کہ سلطنتیں تباہ ہوتی ہیں یا اجتماعی زندگی برباد۔ سو جناب یقین فرمائیے کہ مصنف کوئی عزلت نشیں کیکڑا نہیں ہوتا نہ یہ کسی ایسے جزیرہ میں بستا ہے جہاں وقت کوئی چیز نہیں اور پکے پکے پھل آکر منہ میں ٹپک جاتے ہیں! یہ ضرور سچ ہے کہ ایک حد تک یہ انفرادیت پسند ہوتا ہے

جب کوئی جماعت زوال آمادہ

لیکن سامنے پس منظر سے یہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کا رجحان بھی رہا ہے۔ جب کوئی جماعت زوال آمادہ

ہو یا کسی حیات بخش تعمیری تکالیف سے گذر رہی ہو تو اس کا رجحان بہ حیثیت فرد کے تو جو کچھ محسوس کرتا ہے

وہ کرتا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ اسے کچھ اور زیادہ بے چینی بھی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ وقتوں میں جب مل جلکر رہنا

سہنا دشوار اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے تو مصنف سیاسیات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ کوئی اور راہ ہی اسے

نہیں دکھائی دیتی سوائے اس کے کہ بیچارہ پاگل ہو جائے۔ ہاں کوئی راہ نہیں دکھائی دیتی جس پر چلکر یہ اپنی جماعتی

ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے۔ چنانچہ سب سے حساس مصنفوں نے یہی راہ اختیار کی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہمارے دور کا غالب رنگ سیاسی ہے۔ متیک' میرے سامنے کے لکھنے والوں میں جتنی

دلچسپی سیاسیات سے ہے سابقہ العلات لارنس کے بعد سے انگریزی مصنفوں میں کبھی نہیں رہی۔ یہ لوگ

محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کی پرانی ساخت نئے تجربات کا ساتھ نہیں دے سکتی اور یہ انھیں یقین نہیں آتا کہ اس

میں ضروری تبدیلیاں کرنا اس اہل سیاست ہی کا کام ہے۔ ان لوگوں نے ڈ۔ ہ۔ لارنس کی مثال سے

بھی ایک سبق سیکھا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جنگ کے بعد لارنس نے اپنے گرد ایک گروہ جمع کرنے کی کوشش

کی تھی۔ انتشار اور تنہائی کے شدید احساس نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا لیکن اگرچہ لارنس بڑا آدمی تھا

اور اس کی ذات میں بہت کشش بھی مگر وہ ناکام رہا۔ اس سے ہم لوگ متنبہ ہو گئے کہ کوئی گروہ جو کسی

فرد کے گرد جمع ہو آج کل کامیاب نہیں ہو سکتا۔ واقعات عالم کا دباؤ اتنا سخت ہے کہ وہ مرکزی شخصیت

سے جلد یا دیر نہ اٹھ سکے گا اور اس وقت یہ چھوٹا سا گروہ مجبوراً منتشر ہو جائیگا۔

یہی وجہ ہے کہ نوجوان لکھنے والے جان بوجھ کر یا بے جانے کسی ایسی عالمی تحریک سے وابستہ

ہوتے جاتے ہیں جس کی بنا کسی خاص فرد پر نہ ہو بلکہ عامۃ الناس پر ہو مثلاً اشتراکی یا فاشستی تحریک

ہے۔ اور چاہے لوگ اصل معاملہ پر پردہ ڈالنے کی کتنی ہی کوشش کریں یہ مسلم ہے کہ یہ تحریکیں آخر کار

جماعتی طبقوں کے باہمی تصادم سے متعلق ہیں۔ اس لئے ہم ادبیات کے متعلق پہلی پیشین گوئی تو یہ کر سکتے ہیں

کہ اگر اور جب بھی ان طبقات کا اختلاف زیادہ بڑھا اور ظاہر ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ لکھنے والے یا ادھر ہونگے

یا ادھر۔ اور جہاں یہ ہوا ادبیات کے غرض وغایت کا ایک نیا تصور فروغ پائے گا۔ ادبیات کو افراد کے

باہمی تعلقات سے زیادہ طبقوں اور جماعتوں کے روابط و تعلقات سے سروکار ہو جائے گا' ادب سے عمل کی تنقید کی جگہ عمل کے لئے رہنمائی کا کام زیادہ لیا جانے لگیگا ۔ اور کشمکش حیات میں ادب بالارادہ کسی ایک فریق کا ساتھ دیگا ۔ یعنی ادب سبق سکھائیگا اور تلقین کرے گا ۔

شاید آپ یہ پڑھکر بگڑتے ہوں گے کہ یہ سب کچھ غیر متعلق باتیں ہیں ۔ تہذیب و تمدن تو حیات قومی کا پھول ہے' اسکو جنگ آزمائیوں کا ہتھیار نہیں ۔ میں جانتا ہوں کہ ایک مذہب خیال یہ بھی ہے اور اس کا مرکز کیمبرج ہے' کہ جس طرح بھی بن پڑے قومی تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھنا چاہیئے ۔ مگر ذرا ایک لمحہ کے لئے سوچیئے تو سہی ۔ زندہ جسم کو مرجانے کے بعد بھی ایک سائنس داں دل کو نکال کر یا تھوڑا سا چمڑا کاٹ کر انھیں بہت دیر تک زندہ رکھ سکتا ہے لیکن ان کی زندگی بے معنی زندگی ہے ۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ اگر کسی تہذیب و تمدن کو جسم اجتماعی کی بربادی کے بعد بھی مصنوعی طور پر زندہ رکھا جائے تو اس میں بھی کوئی معنی و مقصد نہ ہوگا ۔

جی نہیں ۔ جنھیں ادب اور سیاسیات کا تعلق ناپسند ہے ان کے لئے بس ایک ہی اور چیز رہ جاتی ہے یعنی نفسیات ۔ فرائڈ نے انسان کو اپنی غیر شعوری زندگی کی طرف متوجہ کرکے ایک ایسے عمل کا آغاز کیا ہے جس کے نتائج شاید اتنے ہی اہم ثابت ہوں جتنے کہ انقلاب صنعتی کے یا اکتشاف امریکہ کے ۔ عین اس وقت جب فرائڈ اپنے اس عظیم الشان کام کی ابتدا کر رہا تھا مصنف جماعتی زندگی کے انتشار کو محسوس کرکے اپنے آخری قلعہ میں پناہ گزیں ہونا چاہتا تھا یعنی خود اپنی ذات میں ۔ ادب کی نظر اندر کی طرف کو ہو چلی تھی یعنی مختلف افراد کے باہمی تعلق و تصادم کی جگہ ادب کو ذہن انسانی کی اندرونی کشاکش سے زیادہ لگاؤ ہو گیا تھا ۔ اسی قسم کے لکھنے والوں کی آج نوجوان مصنفوں میں سب سے زیادہ قدر ہے مثلاً ممالک یورپ میں رلکے' کافکا' پروست اور انگلستان میں جائس اور ایلیٹ ۔ ان کے بعد والے جو ہیں وہ کبھی ادہر ہیں کبھی اودہر ۔ کبھی سیاسی ہمدردیاں اپنی طرف کھینچتی ہیں کبھی غیر شعوری زندگی کی خدمت کی خواہش اپنی طرف ۔ بہت سے ہیں' مثلاً اوڈن (AUDEN)' جو کچھ دن سیاست سے تعلق رکھکر بالآخر نفسیات کی طرف آگئے ہیں ۔ اور چونکہ فرائڈ نے فرد پر نفسی زندگی کے باب میں بہت زور دیا ہے اس لئے

سچ پوچھئے تو آج کل لبرل فلسفہ کا سب سے بڑا معیں رہی ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ لبرل فلسفہ زندگی جو کچھ عرصہ سے بے پتہ ہے اور جسے لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاسی میدان جنگ میں کام آچکا وہ شاید ادب اور نفسیات کے اسی تعاون سے پھر حیات نو حاصل کرے .... اور سچی بات تو یہ ہے کہ ادب بغیر آقا کے زیادہ دن تک خوش نہیں رہا .... اس وقت بھی وہ فیصلہ کرنے کی فکر میں ہے کہ کس آقا کی خدمت کرے، انقلابی تحریک کی یا فرائڈ کے لبرل فلسفہ کی۔

لیکن ایک تیسرا عنصر ہے جس نے اس فیصلہ کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ پہلے جو میدان خالص ادب کا سمجھا جاتا تھا اس میں اب اختراعات حکیمہ مداخلت کر رہی ہیں۔ اور شخصی طور پر میں اسے اچھا سمجھتا ہوں کہ ہم طباعت کی موجودہ بے پناہ طوفاں سے نفرت کریں تو بجا ہے .... لیکن ادب کی اس غیر ضروری فراوانی میں یہ ضرور ہے کہ سنجیدہ اور محض تفریحی تحریروں میں امتیاز بآسانی ہوجاتا ہے۔ تفریحی تحریر کی جگہ میں سمجھتا ہوں کہ اختراعات اس وقت بھی لیتی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ بہرحال تفریحی تحریریں اکثر دلکش ہیں وہ یا تو اس لئے کہ حقیقت سے ان کی مطابقت ایسی شدید ہوتی ہے کہ اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں یا پھر وہ ہمیں ایسی دنیا دکھاتی ہیں جو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ اور یہ کام سینما اور لاسلکی اس وقت بھی بہت بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ جب دوربینی کے آلات ذرا زیادہ مکمل ہو جائیں گے اور شاکیسر کی طرح الڈس ھکسلے کے خیال کے بموجب (FEELIES) کا رواج ہو جائے گا تو پھر حقیقت سے مطابقت کے اعتبار سے یہ ہمارے حقیقت نگاروں کے بڑے سے بڑے حوصلہ سے آگے ہوں گی اور بعید از حقیقت مناظر پیش کرنے میں بھی ہماری تفریحی تحریروں سے کہیں زیادہ بعید از حقیقت چیزیں پیش کر سکیں گی۔ میں تو اس دن کا بھی تصور کر سکتا ہوں جب ہم کسی مشین پر ایک کتاب رکھ دیا کریں گے جیسے اب گراموفون میں رکارڈ رکھتے ہیں اور اس میں جو کچھ لکھا ہوگا اس کا جیتا جاگتا منظر ہمارے سامنے آجایا کرے گا۔ اپنے گھروں میں آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہم ان اشخاص کو دیکھ اور سونگھ سکیں گے جن کی تصویر مصنف نے پیش کی ہے۔ لیکن اسے ادب کہہ سکیں گے یا نہیں اور اس میں ہمارا جو حصہ ہوگا اس پر پڑھنے کا اطلاق ہو سکیگا یا نہیں یہ میرے تخیل سے باہر کی بات ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ علمی اختراعات عنقریب ادب کو مجبور کرنے والی ہیں کہ وہ اپنے اصلی کام کے متعلق فیصلہ کرے۔ وہ کیا کام ہے جو چھپے ہوئے الفاظ سے بہ نسبت دوسرے ذرایع کے بہتر طریق پر لیا جا سکتا ہے۔ میرا گمان ہے کہ پہلا مورچہ جو ادب اپنے حریفوں کے سپرد کردے گا وہ توحقیقت نگاری ہے .... سچ پوچھو تو مجھے تو شبہ ہے کہ ناول نگاری کی عمر اور سو برس کی بھی باقی ہے یا نہیں۔

میں سمجھتا ہوں، چاہے یہ اچنبھے ہی کی بات کیوں نہ ہو، کہ ادبیات میں جس چیز میں باقی رہنے کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے وہ شعر ہے۔ شعر اور پریوں کی کہانیاں جو ادب کی سب سے سادی شکلیں ہیں۔ شاعری کچھ تو اسنادوں کی مدد سے اور خاصکر اپنے توازن وترنم کے باعث قلب انسانی کی ان گہرائیوں میں پہنچ جاتی ہے جہاں اور کسی چیز کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ پریوں کی کہانیاں یعنی تمثیلی قصے، اس لئے باقی رہیں گے کہ یہ تعلیم کا بے مثل ذریعہ ہیں۔ پروپگنڈا، وعظ حکمی کتابیں صرف ذہن شعوری پر اثر ڈال سکتی ہیں۔ تمثیلی قصے کہانیاں، چونکہ یہ نہایت ابتدائی قسم کے ہوتے ہیں، چونکہ سب کے لئے ہوتے ہیں، چونکہ ان میں دلیل وبرہان سے کام نہیں لیا جاتا، اس لئے یہ ہماری عقل کے قلعوں کے پاس سے چپکے سے آگے نکل جاتے اور اور ہمارے ذہن غیر شعوری سے براہ راست تعلق پیدا کر لیتے ہیں .... لیکن شاعری اور ان افسانوں کو اپنی اصلی سادگی کو قایم رکھ کر ظاہری وسطحی نفاست میں بہت کچھ اضافہ کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ جدید انسان کا پیچیدہ ذہن آرٹ کے اصلی سادہ معنی سے اپنے کو اسی وقت متاثر ہونے دیتا ہے جب اس میں بظاہر قدرت ونفاست موجود ہو۔

تصنیف وتحریر کا مستقبل تمامتر جماعت کے مستقبل پر منحصر ہے۔ لیکن ظن غالب یہ ہے کہ کوئی نظام اجتماعی بھی بروئے کار آئے ادب کی حیثیت روز بروز زندگی کے رہبر کی ہوتی جائے گی۔ ادب اور اخلاق میں جو عارضی مغائرت ہے وہ ختم ہو جائے گی .... میرا خیال ہے کہ ادبیات میں انقلاب شروع ہو چکا ہے۔ لیکن میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جماعتی زندگی کا انقلاب ادبی انقلاب سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اگر یہ نہ ہوا تو وہ بے سود ہوگا اور بے معنی۔ اور اگر کسی کو انقلاب کا لفظ

ہ بعاتا ہوں اس کے لئے اس قول پر یہ تحریر ختم کرتا ہوں :-

ارتقا رایک رقص ہے ، اور انقلابات اس میں بمنزلہ قدم - ہیں -

دنیا کی رفتار

غیر ممالک

جاپان | جاپان کا عروج تاریخ عالم میں بیسویں صدی کا غالباً سب سے مہتم بالشان واقعہ شمار کیا جائیگا۔ چالیس سال میں اس نے چار جنگیں کیں اور چاروں میں کامیاب ہوا۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں چین سے، سنہ ۱۹۰۴ء میں روس سے، سنہ ۱۹۱۴ء میں جرمنی سے اور سنہ ۱۹۳۱ء میں پھر چین سے۔ اس کی ظفر مند فوجوں نے ابھی شکست کا منہ نہیں دیکھا ہے اور ان کی جانبازی نے اس چھوٹے سے دور افتادہ جزیرہ کو دنیا کی سب سے بڑی قوتوں میں شامل کر دیا ہے اور دوسری قوتیں اس کی ترقی کی رفتار سے سخت تردد میں ہیں۔

یہ سچ ہے کہ اوروں کی طرح جاپان بھی بہت سخت اندرونی مسائل سے دو چار ہے۔ معاشی اس کی زرعی کساد بازاری کا ذکر کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ چاول اور ریشم کا کام کرنے والے بہت برے حال میں ہیں۔ طبقات معاشی کی کشاکش کے آثار بھی کبھی کبھی ظاہر ہوتے ہیں۔ سیاسی تشدد اور حریت دشمنی کے مظاہر سے بھی جاپانی زندگی پاک نہیں، مگر ہر سیاح جو حال میں جاپان گیا ہے یہی کہتا ہے کہ جاپانی قوم میں باوجود ان داخلی مشکلات کے ایک غیر معمولی قوت اور ولولہ پیدا ہے، جو اسے برابر آگے بڑھا رہا ہے۔ منچوریا میں جو ہوا اور چین میں جو ہو رہا ہے وہ اسی حوصلہ مندی کے خارجی مظاہر ہیں اور قرائن یہ ہیں کہ یہ مظاہر ایک سلسلہ کی ابتدائی کڑیاں ہیں۔

جاپان فی الحال اس حقیقت کو دنیا سے تسلیم کرانا چاہتا ہے کہ مشرقی ایشیا کا علاقہ اپنے مخصوص مسائل رکھتا ہے اور اس علاقہ میں بس ایک قوت ہے جو انھیں حل کر سکتی ہے اور وہ جاپان ہے۔ اندرون ملک میں ضبط و نظم ہے، باہر موثر طور پر کام کرنے کے لئے تجارتی اور فوجی قوت موجود ہے، اور ایک

جیسے قوم کے نوجوانوں کی دلی حمایت حاصل ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں کے شروع میں جاپانی قوت کے مسئلہ پر بحری نقطۂ نظر سے غور کیا گیا ہے۔ اس کا اصلی محاذ بحری محاذ سمجھا گیا ہے اور انگلستان اور امریکہ کی متحدہ قوت اس کی حریف۔ مگر اب جاپان نے سمندر کی رخ ہٹا کر براعظم ایشیا کی طرف توجہ کی ہے۔ اور غالب گمان ہے کہ اگلے بیس تیس سال کی سیاست میں اسی عنصر سے جاپانی رویہ کی تعیین ہوگی۔ اور اس زمانہ میں جاپان کے لئے چین اور منگولیا کے مسائل کو اور روس اور منچوکو کے ساتھ تعلقات کو خاص اہمیت حاصل ہوگی۔ ان مسائل کو خاطر خواہ طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جاپان کو بحری محاذ پر پورا اطمینان ہو اور بظاہر جاپانیوں کا خیال ہے کہ وہ اس طرف سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کے بحری معاہدہ کے وقت جو دول باہم ملکر جاپان کی حریف بن سکتی تھیں وہ اب غالباً نہ مل سکیں اور جاپانیوں کا اندازہ ہے کہ مشرقی ایشیا میں انگلستان اور امریکہ کا اتحاد عمل اس قدر بعید ہو گیا ہے کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ واشنگٹن کے معاہدہ کی مقرر کردہ نسبت ۵ : ۵ : ۳ جس میں امریکہ اور انگلستان کے پانچ پانچ کے مقابلہ میں اس کی قوت تین ہونی چاہئے مسترد کر رہا ہے اور باوجودیکہ امریکہ کو دو بڑے ساحلوں کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور برطانوی بیڑہ کو غیر معمولی فاصلوں پر اپنی سلطنت کے مفاد کی حفاظت کا فرض انجام دینا ہوتا ہے لیکن جاپان قومی خودداری کے چلتے ہوئے فقرے کی آڑ میں دنیا کی سب سے بڑی بحری قوت سے مساوات کا طالب ہے اور اس سے کم درجہ پر کسی طرح راضی نہیں۔ غرض جاپان نے بحری محاذ پر اپنے کو بالکل محفوظ کر لیا ہے، اور جب انگلستان اور امریکہ کے اتحاد کی طرف سے اس نے یوں تسکین کر لی ہے تو دوسرے دول مغرب کے اپنے خلاف ملنے کا تو اسے کیا اندیشہ ہوگا۔ منچوریا میں جمعیتہ اقوام کی مداخلت سے اس امکانی اتحاد کی حقیقت تو دنیا پر آشکار ہو ہی چکی ہے۔

جاپان کے نزدیک اصلی مسئلہ روس کا ہے اور اس کے بعد چین کا۔ منچوکو کی نئی ریاست کے قیام کی اصلی وجہ یہی ہے کہ جاپانی جنرل اسٹاف کے نزدیک اس وقت مفاد قومی کے تحفظ کے لئے شمالی

مشرقی ایشیا کا تمام علاقہ وہی اہمیت رکھتا ہے جو ۱۹۰۵ء میں جزیرہ نمائے کوریا کو حاصل تھی۔ یعنی فوجی قوتوں کے ترقی اور فن جنگ کے جدید تغیرات نیز ذرائع نقل و حمل کی ترقیوں کے پیش نظر جنرل اسٹاف کے نزدیک جاپان کی مشرقی سرحد منگولیا سے پرے سمجھنی چاہیئے۔

جاپان کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے چین کی بنیادی دشواری یہ ہے کہ ادھر دنیا نئے نئے تصورات کا جولانگاہ بن گئی ہے جو نوعی اعمال کے لئے محرکات کا کام دیتے ہیں اُدھر یہ سب سے قدیم متمدن قوم اپنے صدیوں کے حاصل کردہ محاسن و معائب کو یک بیک چھوڑ نہیں سکتی۔ جاپان کے سپاہی حب وطن کے نشہ میں سرشار اور اپنی ریاست کو تمام محاسن اخلاق کا جامع جانکر دنیا فتح کرنے نکلتے ہیں ادھر یہ غیر معمولی طور پر متمدن لوگ فی الجملہ قومیت اور حب وطن کے اس تصور تک سے یک قلم ناآشنا ہیں جس نے یورپی اقوام اور ان کے ریس میں جاپان کو دوسروں کے حقوق تلف کرنے تک پر آمادہ کرایا ہے۔ اپنے وطن سے محبت یوں تو چینیوں میں بھی کسی اور سے کم نہیں، لیکن یہ محبت انھیں جارحانہ سیاسی اعمال کے لئے آمادہ نہیں کرسکتی۔ یہ ریاست اور وطن کو ایک چیز نہیں جانتے۔ ان کے خیال میں تو ریاست ایک مصیبت ہے جس سے بچنے کی تدبیر کرتے رہنا چاہیئے، اور اس کی مداخلت سے اپنے خاندان کو جیسے تیسے محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اب دور جدید کی ضرورتیں ان چینیوں کو مجبور کررہی ہیں کہ یہ بھی ریاست کو اپنے قومی مفاد کا حامل سمجھیں اور یہ خیال تیزی سے ترقی بھی کررہا ہے۔ لیکن دوسروں میں تو یہ جنون کی حد تک ترقی پاچکا ہے۔ اور شاید چینی ریاست جب تک اپنی اس کمزوری کو رفع کرپائے ممکن ہے کہ اپنی خودمختاری ہاتھ سے کھوچکی ہو۔

چین کی دوسری مشکل معاشی ہے۔ ملک کی معاشی حالت اس وقت جتنی بری ہے شاید کبھی پہلے نہ تھی۔ عالمی کساد بازاری کے اثرات چین میں ۱۹۳۲ء سے ظاہر ہونے شروع ہوئے اور ۱۹۳۴ء میں ان کا اثر بہت بڑھ گیا۔ اور سال کے آخر میں حکومت نانکنگ کی مالی حالت بہت ہی تشویشناک ہوگئی تھی۔ یہ حکومت شنگھائی کے ساہوکارہ سے برابر قرض لے کر اپنا کام چلا رہی تھی۔ شنگھائی کے ساہوکارہ میں اس وقت زر بہت تھا۔ اس لئے کہ ملک میں بدامنی کے باعث اور سرمایہ لگانے کے مواقع مفقود ہونے کی وجہ سے سارا

سرمایہ شنگھائی میں جمع ہو گیا تھا اس لیے حکومت کو بھی یہاں آسانی سے قرض مل جاتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۳۴ء میں شنگھائی سے چاندی نہایت وسیع پیمانہ پر باہر جانا شروع ہوئی اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اس منڈی سے حکومت کی ضرورتیں پوری نہ ہو سکیں گی۔ اس سے پہلے چین میں باہر سے چاندی آیا کرتی تھی لیکن اب چونکہ چین میں جو باہر کا مال جاتا ہے اس کے مقابلہ میں چینی مال کم باہر جا رہا ہے یعنی چونکہ توازن تجارت چین کے خلاف ہے اس لئے اس کمی کی تلافی چاندی کو باہر بھیج کر ہو رہی ہے اور اس سے اندیشہ ہے کہ چینی زر رائج کی بنیادیں بالکل کھوکھلی نہ ہو جائیں۔

ان حالات میں غریب چین جاپان کا مقابلہ کیسے کرے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ چین اپنے طاقتور "دوستوں" میں سے ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں لا کھڑا کرتا تھا۔ مگر اب بظاہر جاپان کے لئے میدان صاف ہے لہذا چین کو اکیلے جاپان سے اپنا معاملہ سدھارنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی مداخلت کی توقع چھوڑ کر چینی حکومت برابر جاپان سے تصفیہ کی کوشش کر رہی ہے۔ اپنے وفادار سپہ سالاروں کو جاپان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہی برطرف کیا جاتا ہے، محاصل تجارتی میں ترمیم کر کے جاپان کے لئے رعایت کی صورتیں نکالی جاتی ہیں، چینی جہاز سازی کے مرکزوں میں جاپانی استاد کام کر رہے ہیں، اور لوگ تو یہ تک کہہ رہے ہیں کہ جنرل چیانگ کائی شک چین کو جاپان کے ہاتھ بیچے دے رہا ہے۔ لیکن خود قوم پرست چینی اپنی مجبوری کو سمجھ کر جنرل چیانگ پر ایسا شبہ نہیں کر سکتے۔ وہ جانتے ہیں کہ روز بد کو جتنا ٹالا جا سکے ٹالنا چاہئے۔ ممکن ہے اس زمانہ میں بین الاقوامی سیاست میں کوئی ایسی تبدیلی رونما ہو کہ دوسری دول جاپان کو روکنے کے قابل ہو جائیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ کمزوری کی سیاست ہے جو واقعات کا مقابلہ احتمالات سے کرنا چاہتی ہے۔

چین کے معاملہ میں اس وقت اگر کوئی مداخلت کے لئے آمادہ معلوم ہوتا ہے تو وہ روس ہے۔ لیکن روسی مداخلت کے معنی چینی نظام ہیئت اور چینی معاشرت کی درہمی برہمی ہے۔ اس لئے چینیوں کا سواد اعظم اور موجودہ چینی حکومت اس مداخلت کے مخالف ہیں۔ لیکن آج نہیں تو کل چین کے معاملہ میں روس اور جاپان کا تصادم ناگزیر ہے۔ کمزور اور لاچار کے طاقتور ہمسایوں میں ہمیشہ چشمک رہتی ہے۔ چنانچہ روس اور

جاپان میں بھی تعلقات برابر کشیدہ رہتے ہیں۔ کبھی زیادہ کبھی کم۔ اور دونوں طرف سے برابر آمادگی جنگ کا اظہار بھی ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اصل صورت حال یہ ہے کہ روس اپنی اندرونی معشیت کو منظم کرنے میں اس قدر منہمک ہے کہ باہر کے جھگڑوں سے اپنا دامن حتی الوسع بچانا چاہتا ہے۔ چنانچہ باوجود تیز تیز تقریروں کے جاپان کے ساتھ رعایتیں ہوتی رہتی ہیں۔

سب سے پیچیدہ معاملہ چینی مشرقی ریلوے کا تھا۔ روس نے جب ۱۸۹۶ء میں منچوریا پر اپنا تسلط قایم کرنے کی ٹھانی تھی تو اس منصوبہ کا آغاز اسی ریل کے اقرارنامہ سے کیا تھا۔ مگر ۱۹۰۵ء میں جاپان سے شکست کھانے کے بعد روس کا اثر اس علاقہ میں گھٹنا شروع ہوا اور اب ۲۳ مارچ ۱۹۳۵ء کو روس نے اس ریل کا بیعنامہ ریاست منچوکو کے نام لکھ کر اس علاقہ میں جاپان کے تسلط کو عملاً تسلیم کر لیا ہے بقول لٹوینوف، وزیر خارجہ روس "یہ بیعنامہ مشرق بعید کے دشوار ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ کا حل ہے اور روسی جاپانی تعلقات کے نشوونما میں ایک قابل لحاظ مثبت عنصر"۔ اسی سلسلہ میں لٹوینوف نے دو چیزوں کا اور بھی ذکر کیا تھا۔ ایک تو جنگ سے اجتناب کے اس معاہدہ کا جس کی تجویز روس نے ۱۹۳۱ء میں کی تھی لیکن جس پر جاپان نے ہنوز کوئی توجہ نہ کی، دوسرے منچوریا اور سائبیریا کی سرحدوں پر سے فوجیں ہٹا لینے اور قلعے تعمیر نہ کرنے کی تجویز کا کوئی سال بھر سے زیادہ ہوا جاپان کی طرف سے کی گئی تھی مگر جس پر روس نے اب تک گفتگو کرنے سے انکار کیا ہے۔ گویا وزیر خارجہ روس نے یہ اشارہ دیا ہے کہ اگر پہلی تجویز پہ جاپان غور کرے تو روس دوسری پر گفتگو کے لئے آمادہ ہے۔ لیکن ان صلح جویانہ اشاروں کے باوجود روس خوب جانتا ہے کہ جلد یا بدیر جاپان سے ٹکر ہوگی اور صلح ہے اک مہلت سامان جنگ۔ ہاں اپنی طرف سے وہ اس وقت چھیڑ نہ کریگا۔

جاپان کے لئے روس کی یہ کمزوری اور داخلی مشغولیت جنگ چھیڑ دینے کا موقع ہو سکتی تھی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جاپان بھی پہل کرنا نہیں چاہتا۔ مقابلہ سخت ہے اور جاپان کے ہاتھ بھی خالی نہیں۔ منچوکو کے قیام سے متعدد توجہ طلب مسائل نکل آئے ہیں جن کا حل نکالنا ہے۔ دوسرے جاپان اپنے تمام فوجی نظام کی تجدید کر رہا ہے اور اس میں ابھی کئی سال کا کام باقی ہے۔ لیکن اپنی سرپرستی اور قیادت میں منچوکو کے

قیام سے اس کی سرحدوں کا معاملہ جاپان کے لئے نہایت اہم ہوگیا ہے۔ اور مستقل طور پر روس سے تصادم کا ٹالنا غالباً ممکن نہ ہو۔ منچوکو کی وجہ سے جاپان کو مغربی جانب منگولیا سے ہٹنا ہے اور منگولیا کی وجہ سے روس سے بھی۔ منگولیا کے دو حصے ہیں بیرونی اور اندرونی۔ بیرونی میں روسی اثر نہایت قوی ہے اور اندرونی منگولیا میں جنوب و مشرق سے چینی کسانوں کی کثرت آمد نے یہاں کی خانہ بدوش اور مویشی پالنے کی معیشت کے نظام کو درہم برہم کرنا شروع کر دیا ہے۔ جاپانیوں کا خیال ہے کہ منچوکو کے ذریعہ منگولیا کو مدد دے کر اس ابتدائی نظام معیشت کی عمر بڑھا سکیں گے اور اس کے حامیوں کو اپنا ساتھی بنالیں گے۔ لیکن فوجی ضرورتوں کے باعث انھیں ریلیں بنا کر ذرائع نقل و حمل بھی درست کرنے ہیں اور جہاں ریل پہنچی وہاں چینی کسان بھی پہنچتا ہے اور زمین پر قبضہ کر کے عمیق کاشت شروع کر دیتا ہے جس سے وہ خانہ بدوش نظام لامحالہ ختم ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح منگولی ابتدائی معیشت کا علاقہ برابر روسی سرحد کی طرف ہٹتا جائیگا اور اس کے ساتھ ساتھ جاپانی بھی آگے بڑھنا چاہیں گے۔ منگولیا میں روس اور جاپان کے اس ناگزیر تصادم سے پہلے گمان ہے کہ خود منگولیا والے روس سے ٹکرا جائیں گے کہ انھیں برابر جاپان سے شہ مل رہی ہے۔

کیا تعجب ہے کہ جنرل اسمٹس جیسے شاطر سیاسی نے دوسرے اہل سیاست کو یہ مشورہ دیا ہے کہ مشرق پر نظر رکھیں!

ایک دلچسپ دستاویز | جاپان کی حوصلہ مند سیاست کے مستقبل پر ایک دستاویز سے جسے کینٹن کے چینی اخبارات نے شائع کیا ہے خوب روشنی پڑتی ہے۔ ۱۹۲۷ء میں شاہ جاپان نے اپنے وزیر اعظم مسٹر تناکا کو حکم دیا تھا کہ وہ سیاست عالم پر ایک عام تبصرہ کر کے جاپان کے لئے ایک مفصل لائحہ عمل بنائیں جو عرصہ تک جاپانی سیاست کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے سکے۔ وزیر اعظم نے ایک سال کے مطالعہ اور غور کے بعد ایک یادداشت بصیغہ راز پیش کی جس کی نقل وزارت خارجہ جاپان کا ایک چینی مترجم لے اڑا اور چینی اخبارات نے اسے شائع کر دیا۔ جاپانی وزارت خارجہ نے اس کی صحت سے فوراً انکار کیا لیکن عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دستاویز صحیح ہے اور واقعی بارگاہ شاہی میں پیش کی گئی تھی۔

اس دستاویز میں توسیع سلطنت کو چھ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) پہلا دور منچوریا اور منگولیا پر تسلط حاصل کرنے کا ہے۔ فتح منچوریا کی تدابیر مفصل درج کی گئی ہیں اور بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ منچوریا اور صوبہ جہول پر حملہ اور قبضہ کے معاملہ میں تفصیلات تک میں اس دستاویز کی پابندی کی گئی ہے۔ منچوریا کے بعد اندرونی منگولیا کو لینے کی تجویز کی گئی ہے۔ اور تدبیر یہ بتائی گئی ہے کہ نیم مختار منگولی شاہزادوں کو جاپانی اثر میں لایا جائے۔ اس پر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے عمل ہو رہا ہے۔ حال میں جاپانی فوج نے چہار کے ضلع پر قبضہ کرکے گویا اندرونی منگولیا کی شاہراہ پر تسلط پا لیا ہے۔ اس کے بعد بیرونی منگولیا کی باری ہے۔ جو اس وقت عملاً روس کے ماتحت ہے۔ اس مقصد کے حصول کا زمانہ روس کی قوت اور دوسرے معاملات میں روس۔ جاپانی تعلقات کی نوعیت پر منحصر رکھا گیا ہے۔

(۲) دوسرا دور دریائے یانگسی کی وادی پر تسلط کا ہے جو چین کا سب سے زیادہ آباد اور زرخیز علاقہ ہے۔ سنہ ۳۲ء میں شنگھائی پر جو حملہ ہوا تھا وہ دراصل اس مقصد کے حصول کے لئے ایک قبل از وقت کوشش تھی جسے چینی مقابلہ کی شدت اور دول یورپ کی مداخلت کے اندیشہ سے فی الحال عارضی طور پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔

(۳) تیسرا دور کینٹن میں جاپانی اثر کو اتنی ترقی دینے کا ہے کہ جنوبی چین پر عملاً جاپان کا تسلط ہو جائے۔ سارے چین پر یہ تسلط دغاباز اور خود غرض سپہ سالاروں اور تعلقہ داروں کو قابو میں لا کر حاصل کرنے کی تجویز ہے۔ نسخہ مجرب ہے، کیا عجب ہے کہ کارگر ہو!

(۴) چوتھا دور فرانسیسی ہندی۔ چین میں اثر بڑھانے اور بالآخر اسے سلطنت جاپان میں شامل کرنے کا ہے۔

(۵) پانچواں دور لندیزی جزائر شرق الہند اور جزائر فلپائن پر قبضہ کا ہے اور

(۶) چھٹا دور، یا دش بخیر، ہندوستان پر قبضہ کا! اس لئے کہ بقول مجوز "ہندوستان کو بحیثیت سلطنت کوئی خارجی مضبوط قوت ہی متحد رکھ سکتی ہے۔ انگریز اس حیثیت کو چھوڑتے جاتے ہیں جو انھیں مغلوں سے ورثہ میں ملی تھی اور دہلی میں جس قوی اور با اقتدار حکومت کی ضرورت ہے

اس کا فراہم کرنا جاپانیوں کے لئے ہی مقسوم ہے" خانہ انوری کا پتہ ہے بلائے آسمانی ابھی سے معلوم کر رہی ہے!

غرض منصوبہ یہ ہے کہ سائبیریا کو چھوڑ کر سارے ایشیا پر ٹوکیو کا سیاسی، معاشی اور فوجی اقتدار ہو اور جاپان دنیا کی سب سے قوی حکومت ہو، اور اس کی سلطنت روم، برطانوی اور مغل سلطنتوں سے بھی بڑی ہو۔

یورپ | جاپان اور روس میں جنگ کے امکانات پر جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس مرتبہ بھی یہ جھگڑا ۱۹۰۵ء کی طرح صرف انھیں دو قوموں تک محدود رہ سکے گا۔ دنیا رفتہ رفتہ چھوٹی ہوتی جاتی ہے اور سیاسی رابطوں اور سیاسی رقابتوں کا ایک ایسا جال بن گیا ہے کہ اسے کہیں سے چھیڑیئے دور دور تک اثر پہنچتا ہے۔ مثلاً روسی اثر کو قابو میں رکھنے کے لئے برطانوی سیاست کی شاطر کاریاں اور جرمنی کو دبائے رکھنے کے لئے فرانس کی ریشہ دوانیاں بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ انگلستان کی سیاست یہ ہے کہ روسی اثر کو دبانے کے لئے جرمنی سے سمجھوتہ کرو، فرانس کی تدبیر یہ ہے کہ جرمنی کو دبانے کے لئے روس سے میل بڑھاؤ۔

روس کی طرف انگلستان کا جو رویہ ہے اس کے متعلق انگلستان کے مشہور اشتراکی صحیفہ LABOUR MONTHLY کے مدیر نے صاف صاف لکھا ہے کہ برطانوی سیاست خارجہ کا سب سے اہم مقصد اس وقت روس پر حملہ ہے۔ اس نے جتایا ہے کہ فرانس اور روس کے معاہدہ کی شدید مخالفت انگلستان کے با اثر اخبارات ٹائمس اور ڈیلی ہرالڈ کر رہے ہیں۔ آبزرور اور ڈیلی میل جیسے ہر دلعزیز اخبارات جرمنی، پولینڈ اور جاپان کے باہم ملکر روس کے خلاف اقدام کی توقع کا ذکر ایک طے شدہ اور پسندیدہ امر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ برطانوی ہوائی فوج کے پرچہ AEROPLANE کی یہ تحریر بھی اس نے نقل کی ہے کہ "ہم برسوں سے اپنی ہوائی فوج کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ تمھارا واقعی عظیم الشان کارنامہ یہ ہوگا کہ جرمنی جا کر روسی حملہ کو روکنے میں مدد دو" نیبر متصل لکھتا ہے، "اگر روس کے خلاف جنگ کے بھڑکانے

اور اس کی تیاری کرنے میں برطانوی سامراج کا واقعی حصہ دیکھنا ہو تو سیاسی صحافت کے درپردہ رموز اور میٹھی منافقتوں سے قطع نظر کرکے فوج اور دیگر ملازمین سرکار کے رسالوں اور عام پسند اخباروں کے صاف صاف اور ناتراشیدہ اعلانات کو دیکھئے جو سیاسی ماہروں کی بہ نسبت برطانوی سامراج کی حقیقی مقاصد کی بہتر ترجمانی کرتے ہیں۔ جیسا کہ جرمنی کے خلاف جنگ کی تیاری کے وقت ثابت ہو چکا ہے۔ جب اسکوتھ، گرے اور ہالڈین ان جنگی تیاریوں سے انکار کرتے تھے جو یہ سب درپردہ کر رہے تھے اور عوام کو "بحری تعطیل" اور "جرمنی سے مفاہمت" کے سبز باغ دکھاتے تھے تو اس وقت یہی ڈیلی میل اور لارڈ نارتھ کلف اور لارڈ رابرٹس کھلے کھلے الفاظ میں جرمنی سے ہونے والی جنگ کا ذکر کرتے تھے۔ یہی حال آج آنے والے "دشمن" روس کے ساتھ ہے۔"

سیاسی منافقتوں کے سلسلہ میں تو انگلستان کے ہونہار نوجوان سیاسی انتھنی ایڈن کی وہ کامیابی ہے جو انھیں ماسکو میں حاصل ہوئی اور جس کی وجہ سے روس اور انگلستان نے امن اور تحفظ عامہ کے لئے باہمی تعاون کی ضرورت کا اقرار کیا ہے۔ لیکن روس اور انگلستان کے تعلقات میں پچھلے دس برس میں کچھ ایسا اتار چڑھاؤ رہا ہے کہ اس اعلان سے زیادہ توقعات وابستہ کرلینا غلطی ہوگی۔ پہلے تو انگلستان نے روس کی انقلابی حکومت کو سنہ ۲۴ء تک تسلیم ہی نہ کیا، پھر تسلیم کرنے کے تین ہی سال بعد لندن میں روسی تجارتی سفارتخانہ پر چھاپہ مارا گیا اور وہاں سے کچھ ایسے کاغذات برآمد ہوئے کہ سیاسی تعلقات پھر منقطع ہو گئے۔ سنہ ۲۹ء میں یہ رشتہ پھر جڑ گیا۔ مگر سنہ ۳۳ء میں روس میں برطانوی انجنیرں پر مقدمہ چلا اور اس سے تعلقات سیاسی پھر کشیدہ ہو گئے۔ مگر سنہ ۳۴ء میں پھر ایک تجارتی معاہدہ ہوا جس کے اثرات پر کنیڈا اور اسکاٹلستان نہایت سختی سے احتجاج کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ سیاسی تعلقات کی نوعیت برابر بدلتی رہی ہے اس لئے موجودہ خوشگوار اعلانات کو "میٹھی منافقتوں" ہی میں شمار کیا جائے تو زیادہ بعید از حقیقت نہ ہوگا۔

انگلستان نے جو رویہ کچھ عرصہ سے جرمنی کے ساتھ اختیار کیا ہے اس سے بھی مذکورہ بالا خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ ہٹلر کے برسر اقتدار آنے پر کیا کچھ شور وغل انگلستان میں نہ مچا۔ مگر سچ ہے "کامیابی کی طرح

کوئی چیز کامیاب نہیں ہوتی۔ اب تو انگلستان براہ راست ہٹلر کی جرمنی سے روابط بڑھا رہا ہے۔ اور ممتاز برطانوی اہل سیاست اور با اثر انگریزی اخبارات نے جرمن امن پسندی کے راگ الاپنے شروع کر دئے ہیں اور انداز یہ ہے کہ کسی مستقل سیاسی مفاہمت کے لئے فضا تیار کی جارہی ہے۔ کوئی چار مہینے ہوئے کہ لارڈ لودین نے، جن سے ہندوستانی بہ حیثیت صدر فرینچائز کمیٹی واقف ہیں اور جو اپنے معروف سیاسی خیالات کی وجہ سے تو می۔ اشتراکت سے کوئی بڑی ہمدردی نہیں رکھ سکتے، جرمنی کی سیاحت کی، ہٹلر اور بہت سے اور ممتاز نازی اہل سیاست سے ملاقاتیں کیں اور واپسی پر اخبار ٹائمس میں ہٹلر کے مطالبات کے متعلق لکھا کہ " وہ مساوات چاہتا ہے، جنگ نہیں چاہتا، وہ تو جنگ کو یک قلم ترک کرنے تک کو تیار ہے؟ پولینڈ سے معاہدہ کرکے اس نے عہد نامہ ورسائی کے سب سے خطرناک اور تلخ عنصر یعنی پولی کوریڈور کے مسئلہ کو دس سال کے لئے امکانی اسباب جنگ کی فہرست سے خارج کر دیا ہے، وہ قطعی طور پر اور ہمیشہ کیلئے الساس لورین کو فرانس کا حصہ تسلیم کرتا ہے، اور سب سے اہم بات یہ کہ اگر آسٹریا کے دوسرے پڑوسی بھی اسی کا وعدہ کریں تو یہ بھی اپنے محبوب آسٹریا کے معاملہ تک میں فوجی مداخلت سے باز رہنے کا عہد کرنے کو تیار ہے۔ اور اپنی خواہش امن کا ثبوت دینے کے لئے اپنے تمام پڑوسیوں سے جنگ سے اجتناب کا عہد کرنے کو آمادہ ہے۔ اسلحہ کے معاملہ میں بھی وہ صرف مساوات کا طالب ہے اور اگر دوسرے بھی اپنے یہاں ملے قبول کریں تو یہ بھی اسلحہ کی بین الاقوامی نگرانی کو تسلیم کرنے کا وعدہ کرتا ہے مجھے ذرا شبہ نہیں کہ اس کا یہ رویہ تمامتر خلوص پر مبنی ہے۔ ہٹلر کی جرمنی جنگ کی خواہاں نہیں ہے"

انگلستان کا موقر اور سلطنت برطانوی کی سیاست میں نہایت با اثر رسالہ راونڈ ٹیبل لکھتا ہے کہ ہٹلر کے نزدیک مشرقی اشتراکیت سے مغربی دنیا کا پشت پناہ جرمنی ہی کو ہونا چاہئے۔ جرمنی کی اس امن پسندی اور اس کی فوجی تیاریوں میں مطابقت کی کوشش بھی اس موقر رسالہ نے یوں کی ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی فاتحوں کے غلط رویہ پر ہے۔ اور لارڈ بالفور نے ۱۹۱۶ء میں وزارت برطانوی کے سامنے جو یادداشت پیش کی تھی اس کا یہ حصہ نقل کیا ہے کہ " تاریخ میں شکست خوردہ ریاست کی فوجی قوت کو ختم کرنے کی جو مثالیں ہیں ان میں سے ایک وہ کوشش بھی ہے جو نپولین نے معرکہ ینا کے بعد

پرشیا کی فوج کو ختم کرنے کے لئے کی۔ کوئی دوسری کوشش شاید اتنی ناکام نہ ہوئی ہوگی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نپولین ہی کی سیاست نے پرشیا کو اس فوجی نظام کی ترتیب پر مجبور کیا جس نے جدید جرمن کو پیدا کیا۔"

الغرض برطانوی سیاست کا رخ جرمنی سے مفاہمت کی طرف ہے۔ ان سطور کے لکھتے وقت جرمنی اور انگلستان میں بحری قوت کے تناسب باہمی کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے اور قرائن ہیں کہ اٹلی اور فرانس کی ناپسندیدگی کے باوجود بہت جلد باہمی مفاہمت سے جرمن کا مطالبہ کہ اس کی بحری طاقت برطانیہ کی قوت کی ۵۳ فیصد ہو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور سیاست عالم میں پھر ایسے ہی جتھے بن جائیں گے جیسے جنگ سے پہلے تھے، ایک طرف انگلستان، جرمنی، پولینڈ اور غالباً جاپان۔ دوسری طرف فرانس، روس، اٹلی اور یورپ کی بعض فرانس دوست جدید ریاستیں۔ اس لئے کہ فرانس کسی طرح جرمن سے سمجھوتہ پر تیار نہیں۔ فرانس کی سیاست کا سب سے بڑا مسئلہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اپنے کو اپنے مشرقی ہمسایوں سے کس طرح محفوظ رکھے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ ان میں نااتفاقی رہے اور فرانس نے اس حل سے بہت کچھ کام لیا ہے دوسرا حل یہ ہے کہ ان پڑوسیوں کے مشرق میں جو عظیم الشان قوت روس کی ہے اس کو اپنا حلیف بنائے۔ چنانچہ اس پر جنگ سے پہلے عمل تھا۔ اسی کے پیش نظر اب پھر روس سے معاہدہ ہوا ہے اور برابر تعلقات کے بڑھانے کی کوششیں جاری ہیں۔

ہندوستان

بین الاقوامی فضا اور ہندوستان

وسائل آمد و رفت اور ذرائع خبر رسانی کی ترقی اور پیدائش پر پیمانہ کبیر کے فروغ نے جس سے نئی منڈیوں کی تلاش اور تسخیر ضروری ہو جاتی ہے یوں تو دنیا کے کسی گوشہ کو بھی مغربی ممالک کے اثر و اقتدار سے آزاد نہیں رکھا ہے لیکن برطانیہ کی محکومیت اور اس کے ساتھ صنعتی، تجارتی اور مالی وابستگی کی وجہ سے ہندوستان خصوصیت کے ساتھ مجبور ہو گیا ہے کہ دول عظمیٰ کی رفتار سیاست میں جو کچھ بھی تبدیلی ہو اس کا عکس اپنی سیاسی اور معاشی زندگی میں بھی مشاہدہ کرے۔

بین الاقوامی معاملات کے منصفانہ اور پُرامن تصفیہ کے لئے جنگ کے بعد جو فضا پیدا کی گئی تھی اور جو قوانین اور ادارے بنائے گئے تھے اُن سے منحرف ہو کر مغربی ممالک اب دوبارہ جنگ سے پہلے کی مزاجی دھینگا مشتی کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ اسلحہ اندوزی کی دوڑ شروع ہو گئی ہے۔ رقابت اور مسابقت کا زور شور ہے۔ کمزور ملکوں پر طاقتور ملک دانت جمائے بیٹھے ہیں۔ جرمنی نے معاہدہ ورسائی کو ختم کر دیا۔ تاوان جنگ کی ذمہ داری اپنے سر سے اتار پھینکی۔ فوج، اسلحہ اور بحری و ہوائی جہازوں کے معاملوں میں اپنے کھوئے ہوئے حقوق سب واپس لے لئے۔ اب اس کا مرتبہ دوسرے دول سے کم نہیں ہے۔ آسٹریا کو اپنے اندر جذب کرنے کی دھن اس پر سوار ہے۔ سار کے علاقہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ ڈانزگ اور میمل کے علاقے بھی عنقریب اس کے قبضہ میں آ جائیں گے۔ اٹلی اپنی فوجی قوت کا خوب مظاہرہ کر رہا ہے اور ملک حبش کو ہضم کرنے کا پکا ارادہ کر چکا ہے۔ جاپان چین میں گھستا چلا جا رہا ہے۔ جرمنی اور جاپان دونوں انجمن اقوام کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے ہیں اور اٹلی بھی علیحدہ ہونے کی دھمکی دے رہا ہے۔

چین اور ملک حبش کا اس کے سوا کوئی دوسرا تصور نہیں ہے کہ وہ کمزور ہیں اور کمزور کو آزادانہ جینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اُسے ہمیشہ کسی طاقتور ملک کے غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہئے۔ جاپان اور اٹلی کو اپنی مصنوعات کے لئے منڈی اور اشیاء خام کی ضرورت ہے۔ اپنی نئی نسل کے حوصلوں اور اُمنگوں کو پورا کرنے کے لئے نوآبادیوں اور محکوم ممالک میں ترقی کے مواقع چاہئیں۔ ان دونوں کے پاس منظم طاقت ہے اور طاقت سب سے بڑا حق ہے۔

جب طاقت حق ہے اور کمزور کا کوئی ساتھی نہیں تو پھر ہندوستان کا کیا حشر ہونے والا ہے؟ گذشتہ بیس سالوں میں جو تحریریں اور کتابیں شائع ہوئیں اُن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ بس اب ظلم و ناانصافی کا زمانہ ختم ہوا۔ کمزور اور پس ماندہ ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کا احترام ہوگا۔ اگر ان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی فی الحال سکت نہیں ہے تو انہیں سہارا دے کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا موقع دیا جائے گا۔ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اور جمہوری طرز حکومت کی توسیع کی جائے گی۔ بین الاقوامی معاملات میں قانون و انصاف کا دور دورہ ہوگا۔ زور اور قوت کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ معاملات کا تصفیہ جدال و قتال سے نہیں بلکہ

مصالحت و مفاہمت اور معقول و پرامن گفتگوؤں سے کیا جایا کرے گا۔ اسلحہ اور عسکری قوت چونکہ غیر ضروری ہو جائیں گے اس لئے ان کی بہت زیادہ تخفیف کردی جائیگی۔ لیکن یہ سب زائل ہو گئے

؎ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

معاملہ اگر زور آزمائی کا نہ ہوتا اور سمجھانے بجھانے سے کام نکل سکتا، تقریری تحریری درخواستوں مشاورتی جلسوں اور ملاقاتوں کا اثر قبول کیا جاتا یا معمولی معاشی دباؤ یا اور اسی قسم کی پُرامن شورشوں مثلاً مظاہروں، جلسوں، ہڑتالوں، عارضی سول نافرمانیوں اور عدم ادائیگی محاصل سے عوام کے جذبات و احساسات کی شدت کی ترجمانی ہوسکتی تو ہندوستان کو بھی امید ہوتی کہ اس کی بھی شنوائی ہوگی اور حق و انصاف کے مطالبے سے مجبور ہوکر ہندوستان کو بھی آزاد ممالک کا مرتبہ دے دیا جائے گا۔ لیکن جب دنیا کی رائے عامہ کے نزدیک دلائل کی قوت محض زور اور طاقت پہ منحصر ہوجائے تو کیا نہتے اور بے زور ہندوستان کے لئے مایوسی کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی رہ جاتا ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریک امن کی ناکامی ہندوستان کی تحریک آزادی کے لئے ایک نہایت جانکاہ سانحہ ثابت ہوگی۔ ہندوستان کے وہ لوگ جنھوں نے مہاتما گاندھی کے اصول عدم تشدد کو اختیار کیا ہے اس وقت ایک بڑی سخت ابتلا و آزمائش سے دوچار ہیں۔ انھوں نے ایک اہم ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور ایک بڑے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انھوں نے انسانی فطرت کے متعلق بہت زیادہ حسن ظن اور خوش عقیدگی سے کام لیا تھا۔ انجمن اقوام اپنی موجودہ شکل میں بذات خود تو نہیں لیکن اس کا تخیل اور لٹریچر ان کے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھا۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں انجمن اقوام کی تباہی کا اثر ہندوستان کی تحریک عدم تشدد پر بالکل وہی نہ پڑے جو خلافت کی منسوخی کا اثر ہندوستان کی تحریک خلافت پر ہوا تھا یعنی یہ کہ پاؤں تلے کی بنیاد نکل جانے کی وجہ سے انتشار اور بدنظمی کی کیفیت پیدا ہوجائے۔ اس وقت بھی کانگریس کمزور نظر آرہی ہے اس کے بعد اس کے اور زیادہ منتشر ہوجانے کا اندیشہ ہے مہاتما گاندھی کی تحریک کی جگہ کوئی دوسری

تحریک آسانی سے نہیں لے سکتی ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سوال یہ ہے کیا اقوام مغرب کی طرح ہندوستان کی ملکی سیاست کو بھی دور بعد از جنگ سے دور قبل از جنگ کی طرف واپس جانا پڑے گا؟ قدامت پسند جماعت کے نزدیک صورت حال کا اس سے بہتر کوئی دوسرا ارتقا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ غالباً ناممکن ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تحریک مستقبل میں کیا شکل اختیار کرے گی اس کے متعلق فیصلہ بہت مشکل ہے۔ عوامل اس قدر غیر متیقن متضاد اور پیچیدہ ہیں کہ ان کے نتیجہ سے جو حرکت پیدا ہوگی اس کا اندازہ کرنا سہل نہیں ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ صورت حال تشویشناک ضرور ہے۔

نئی مجلس مقننہ میں کانگریسی جماعت

مہاتما گاندھی نے جب سے کانگریس کی پالیسی پر اثر ڈالنا شروع کیا ہے ہندوستان کی قومی تحریک کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہوگئی ہے کہ اس کے کارکن سیاسی ترقی اور معاشری اصلاح کے کام ساتھ ساتھ کرنے لگے ہیں۔ سیاسی تحریکیں وقتی جوش اور ہنگامے میں تو خوب سرسبز ہوتی ہیں لیکن جہاں مخالف ہوا چلی اور جوش ٹھنڈا ہوا یہ تحریکیں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔ جماعتی زندگی منتشر اور رہنماؤں اور پیرووں کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن معاشری اصلاح کے کام آہستہ آہستہ پھیلتے ہیں، زیادہ مستقل بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں اور وقتی شورشوں کا اتنا اثر قبول نہیں کرتے کہ دفعتہ بہت زیادہ پھیل جائیں اور پھر یکبارگی ختم ہو جائیں۔ پھر سیاسی کاموں کے مقابلہ میں معاشری کام حکومت کی پکڑ دھکڑ سے بھی بڑی حد تک محفوظ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان حالات میں جب کہ سیاسی تحریکوں کو چلانا ناممکن ہو جاتا ہے اور چند روز تک جوش و خروش دکھا کر یہ تقریباً فنا ہو جاتی ہیں۔ کانگریس کے کارکن سیاسی تحریک کے زمانۂ انحطاط میں معاشری کاموں میں پناہ لیتے ہیں۔ عوام سے اپنا تعلق قائم رکھتے ہیں اور آئندہ کے لئے اپنی قوت کو مجتمع کرتے رہتے ہیں۔

پہلی تحریک عدم تعاون میں پسپائی کے بعد کانگریس ۱۹۲۲ء میں دو گروہوں میں منقسم ہوگئی تھی۔

ایک گروہ نے تو دوبارہ انہی مجالس قانون ساز پر قبضہ کیا جن کا پہلے خود اُس نے نہایت شدومد سے بائی کاٹ کیا تھا۔ مگر دوسرے گروہ نے وضع پر قائم رہ کر کونسلوں سے اپنی علیحدگی کو جاری رکھا اور تعمیری کاموں میں مصروف ہوگیا۔ دونوں گروہوں نے اپنی اپنی جگہ بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور جب سیاسی صورت حال کے ارتقانے انھیں حکومت کے بلا واسطہ مقابلہ کے لئے دوبارہ واپس بلایا تو دونوں گروہ منظم اجتماعی قوت اور رائے عامہ کی پوری حمایت اور اعتماد کے ساتھ اپنے نئے فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہوگئے۔

پچھلی تحریک سول نافرمانی میں بھی جب کانگریس کے لئے حکومت سے براہ راست مقابلہ کے امکانات مفقود ہوگئے۔ حکومت کی طرف سے ہنگامی قوانین اور سختیوں میں اضافہ ہوا۔ کانگریس کے تمام ادارے اور شاخیں غیر قانونی اور اس کا سرمایہ لائق ضبطی قرار دے دیا گیا۔ اخباروں، تقریروں، جلوسوں، جلسوں حتیٰ کہ نقل و حرکت پر پابندی عاید کردی گئی۔ رہنماؤں کو جیل میں رہنے کے سوا کسی دوسرے کام کا موقع نہ رہا۔ مہاتماجی نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرکے اپنی پوری توجہ اور قوت اچھوتوں کے لئے وقف کردی۔ لوگوں میں عام طور پر تھکن اور بے دلی پیدا ہوگئی اور مقابلہ کی سکت باقی نہ رہی تو سوال پیدا ہوا کہ کانگریس کی منتشر قوتوں کو دوبارہ مجتمع کرنے کی کیا صورت نکالی جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو سول نافرمانی کی قرارداد منسوخ کرنا پڑی جس سے کانگریس کو دوبارہ ایک قانونی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء کی طرح اس مرتبہ پھر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک جماعت کونسلوں میں داخل ہوکر اندر سے حکومت کا مقابلہ کرے اور کانگریس کے احیا میں جو باہر دشواریاں پیش آئیں ان کا قانونی اور دستوری طریقہ پر مداوا کرے اور اس طرح پنڈت موتی لال، پریسیڈنٹ پٹیل اور سوراج پارٹی کی قائم کردہ روایات کو زندہ رکھے اور باقی سب لوگ باہر رہ کر تعمیری کاموں میں مصروف رہیں۔ اور عوام سے ملنے کے مواقع میں اضافہ کریں۔ اپنی پُرخلوص خدمت، دیانت اور ایثار سے لوگوں کے دلوں میں عزت و اعتماد پیدا کریں۔ اور ایسے تعمیری کاموں میں مصروف رہیں جن کے بغیر ایک متحدہ قومیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی اور سوراج ملنے کے بعد چلایا ہی نہیں جاسکتا۔ تعمیری کاموں کا تذکرہ تو اس کے بعد دوسرے عنوان کے

تحت میں کیا جائے گا یہاں کانگریس پارلیمنٹری جماعت کے قیام اور اُس نے اسمبلی کے گذشتہ اجلاس میں جو کام کئے ہیں اُن پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

کانگریس پارلیمنٹری جماعت کو اپنے قیام کی ابتدا میں سخت پیچیدگیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف تو سوشلسٹ جماعت تھی جو کاونسل کے داخلہ کو تضیع اوقات سے تعبیر کرتی تھی اور کانگریس کی پالیسیوں کو ایک سوشلسٹ رنگ دینے کے لیے مصر تھی۔ دوسری طرف پنڈت مالویہ اور مسٹر اَنے تھے جو چاہتے تھے کہ کانگریس صاف اور واضح الفاظ میں کمیونل اوارڈ کو مسترد کر دے۔ کانگریس کے رہنماؤں کے لئے یہ موقع سخت آزمائش کا تھا۔ ملک میں ان کی قوت بالکل منتشر ہو چکی تھی۔ کمیونل اوارڈ کے مسئلہ میں ہندوؤں کی اکثریت مالویہ جی کی طرف دار معلوم ہوتی تھی۔ انتخاب جداگانہ حلقوں سے ہونے والا تھا جہاں مسلمانوں کی ہمدردی سے کسی فائدہ پہنچنے کی امید نہ تھی اور ہندوؤں کی مخالفت سے نقصان کا اندیشہ تھا۔ اس مسئلہ پر کانگریس کے درمیان تفرقہ یقینی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس موقع پر کانگریس نے اپنے تدبر اور عاقبت اندیشانہ معاملہ فہمی کا پوری طرح ثبوت فراہم کر دیا۔ خطروں اور دشواریوں کی موجودگی میں اس نازک وقت پر کانگریس کے رہنماؤں نے اعلیٰ قومی تخیل کے مقابلہ میں پست فرقہ وارانہ ذہنیت کو ترجیح نہیں دی۔ وقتی مصلحت کی خاطر قوم کے مستقل مفاد کو قربان نہیں کیا۔ انھوں نے وہ رویہ اختیار کیا جو ہر چند نہ تو فرقہ پرست مسلمان کے لیے پسندیدہ تھا نہ فرقہ پرست ہندو کے لئے مگر جس سے آئندہ کے لئے مصالحت اور مفاہمت کا دروازہ کھلتا تھا۔ انھوں نے اصولاً ایک غیر قوم کی ہندوستان کے خانگی معاملات میں مداخلت کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ کمیونل اوارڈ کو بجائے خود انھوں نے نہ قبول کیا نہ مسترد بلکہ فرقہ وارانہ مسائل کے حل کو تمام قوموں کے متفقہ سمجھوتہ پر منحصر رکھا جس کی ایک صورت یہ پیش کی کہ ایک ایسی دستور ساز انجمن طلب کی جائے جس کا انتخاب ملک کی تمام بالغ آبادی (اگر ضرورت ہو تو جداگانہ حلقوں سے) کرے۔

ان تجاویز کو عملی دشواریوں یا دوسرے اسباب کی بنا پر لائق پسند سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے لیکن اس سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس نے اس موقع پر جو رویہ اختیار کیا اس سے اس کے اس دعوے کی تائید ضرور ہوتی تھی کہ وہ ملک کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ بلکہ پنڈت مالویہ

کی مخالفت اور کانگریسی پالیسی کی حمایت میں کانگریس کے بعض لیڈر مثلاً مسٹر بھولا بھائی ڈسائی اور سردار پٹیل تو اپنی ایک دو تقریروں میں خلاف توقع حد تک خاصے آگے بڑھ گئے تھے۔

بہر حال اس موقع پر کانگریس نے قومی نصب العین کی خاطر اپنے آپ کو نہایت دلیری اور جسارت سے خطرے میں ڈالا۔ پنڈت مالویہ مسٹر آنے اور ان کی بنائی ہوئی کانگریس نیشلسٹ پارٹی اور ہندو مہا سبھا نے انتخاب کے موقع پر کانگریس کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن یہ کانگریس کی خوش نصیبی تھی (اور اس سے لوگوں میں اُس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے) کہ ان تمام مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود بنگال پنجاب اور سندھ کو چھوڑ کر باقی تمام صوبوں سے کانگریسی ممبر بڑی بھاری اکثریت کے ساتھ منتخب ہوئے۔

کانگریسی جماعت نے انتخاب کے وقت رائے دہندوں سے تین کاموں کے انجام دینے کا وعدہ کیا تھا (۱) وائٹ پیپر کی منسوخی اور ہندوستان کی سوراجی دستور بنانے کے لئے دستور ساز انجمن کا مطالبہ (۲) تمام ایسے قوانین کی منسوخی جن سے ہندوستان کی قومی تحریک کو دبانے کا کام لیا جاتا ہے اور (۳) موجودہ دستور کی پابندیوں کے باوجود قومی مفاد اور بہبود کے لئے جو کچھ بھی کیا جا سکتا ہے اس کی کوشش۔

ایک سو چالیس ممبروں سے زاید کی مجلس قانون ساز میں کانگریسیوں کی تعداد صرف ۴۴ تھی۔ اس لئے اپنے وعدوں کو بہ تمام و کمال پورا کرنے کی توان سے توقع کرنا ہی بے جا تھی۔ پھر ہندوستانی مجلس کی ذیلی کی جو حالت ہے اس میں اراکین کی کسی کوشش کا نتیجہ خیز ثابت ہونا بھی محض حکمرانوں کی مرضی اور مصلحت پر موقوف ہوتا ہے اس لئے سوال "فتح و شکست" کا نہیں بلکہ "دل ناتواں" کے "مقابلہ" کا تھا' سو اس اعتبار سے کانگریسی جماعت کی کارگذاریوں کو اپنے مقصد کے حصول میں بڑی حد تک کامیاب سمجھنا چاہیئے۔ انھوں نے اسمبلی کے گذشتہ اجلاس میں عام طور پر بہت اچھا اثر پیدا کیا۔ ان کی جماعت کی انضباط و تنظیم اور مجلس میں پابندی کے ساتھ حاضری نہایت قابل تعریف رہی۔ دوسری جماعتوں سے ان کا اتحاد عمل اور مصالحت اور مفاہمت بھی جس کے بغیر یہ مجلس میں اپنی کسی تحریک کو بھی منظور اور حکومت کی تحریکوں کو نامنظور نہ کرا سکتے تھے بہت پسندیدہ رہا۔ مسٹر بھولا بھائی ڈسائی نے خصوصیت کے ساتھ کانگریس کے وقار کو خوب بلند کیا۔ ان کی تقریروں کی خوش بیانی' ان کے اخلاق کا حسن' ان کے خیالات کی وسعت اور بردباری اور

دل کی کشادگی اور فراخی نے دوست دشمن ہر ایک سے بہت جلد خراج تحسین وصول کر لیا۔ کانگریسی جماعت میں اگر انھیں سب سے زیادہ مقبول آدمی کہا جائے تو غالباً نادرست نہ ہوگا۔ مسٹر ستیا مورتی کے سوالات اور مسٹر گوبند ولبھ پنت کی تقریریں بھی کانگریسی جماعت کی عزت بڑھانے میں خاصی معاون ثابت ہوئیں۔

وائٹ پیپر کی مخالفت میں کانگریس کی اپنی تحریک پاس نہ ہو سکی۔ لیکن مسٹر جناح کی جو تحریک پاس ہوئی اس میں کانگریس کو بلاشبہ ایک شریک غالب کی حیثیت حاصل تھی۔

دستور ساز انجمن کا مطالبہ البتہ کانگریس کی طرف سے پیش نہیں ہوا۔ ہر چند اس کے پیش کرنے سے کسی نتیجہ کے پیدا ہونے کی توقع نہ تھی لیکن وعدہ کے ایفاء کے سلسلہ میں اس کام کو ہر حال کرنا چاہئیے تھا۔ ممکن ہے آئندہ اجلاس میں اس کے ممکن العمل پہلوؤں پر توجہ کی جائے۔

ایسے قوانین کی منسوخی کے لئے جن سے قومی تحریک کو دبایا جاتا ہے اگر فرقہ قانون نے اجلاس کے آخری دنوں میں رخنہ اندازی کے طریقوں مثلاً ڈھائی ڈھائی گھنٹے کی تقریریں وغیرہ نہ کی ہوتیں تو شاید کانگریس کے پاس کچھ کام دکھلانے کے لئے ہوتا۔ اب شملہ کے اجلاس میں ممکن ہے اس کے لئے بھی کوشش کی جائے۔

کانگریسی جماعت نے اپنی طرف سے جو تحریکیں پیش کیں ان میں مندرجہ ذیل خاص طور پر لائق ذکر ہیں:-

نظربندوں کو رہا کیا جائے۔ ہندوستانی سیوادل اور خدائی خدمتگاروں اور دوسرے کانگریسی اداروں کو کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ جو کانگریسی ابھی تک قید میں انھیں آزاد کیا جائے۔ محاصل کا بار ہلکا کیا جائے۔ مہاتما جی کی دیسی صنعتوں کی انجمن کے خلاف حکومت نے جو سرکلر بھیجا ہے وہ واپس لیا جائے اور سرت چندر بوس رکن مجلس مقننہ کو آزاد کیا جائے۔

ریلوے بجٹ میں حکومت کے خلاف کانگریس نے بہت سی تحریکیں منظور کرائیں مثلاً صرف ہندوستانیوں کو ہی ریلوے کی ادنٰے اور اعلٰے ملازمتوں میں بھرتی کیا جائے۔ تیسرے درجے کے مسافروں کی شکایتوں کو رفع کیا جائے۔ ریلوے محاصل اس طرح وصول کئے جائیں جن سے زراعت وصنعت کی ترقی میں امداد ملے۔

عام بجٹ میں کانگریس نے مندرجہ ذیل تحریکیں منظور کرائیں:- نمک کے محصول کو عہ سے ۱۵/ آنہ فی من کیا جائے پوسٹ کارڈ کو نصف آنہ، ایک تولہ کے لفافہ کو ایک آنہ اور پیکٹ کی شرح محصول میں تخفیف

کی جائے ۔ کھالوں پر برآمد کا محصول جاری رکھا جائے تاکہ ملکی دباغت کی صنعت کو ترقی ہو۔ انکم ٹیکس ایک ہزار سے زیادہ اور دو ہزار سے کم آمدنیوں پر نہ لیا جائے ۔

لیکن کانگریس کی یہ تمام تحریکیں جو مجلس میں پاس ہوئیں وائسرائے نے اپنے اختیار خصوصی سے مسترد کردیں ۔ سر جیمس گرگ وزیر مالیات نے سرکاری رویہ کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی کہ کانگریسی تحریکیں چونکہ نیک نیتی پر نہیں بلکہ دانستہ مخالفت پر مبنی ہیں اس لئے جب تک کانگریس پارٹی کی نیت درست نہ ہوگی اس وقت تک ان کی کسی ترمیم یا تجویز کو چاہے وہ بظاہر کتنی ہی معتدل کیوں نہ معلوم ہو حکومت منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے ۔ لیکن وہ غالباً یہ بھول گئے کہ کانگریس کی تعداد مجلس میں صرف ۴۴ تھی جتنی تحریکیں پاس ہوئیں ان میں کانگریس کے علاوہ ایسی دوسری جماعتوں کے ووٹ بھی شامل تھے جن کی نیت کے متعلق اتنی آسانی سے شاید ان کے لئے بھی قطعی فیصلہ ممکن نہ تھا ؟

اسمبلی میں کسی اور دوسری جماعت نے کانگریسی جماعت کے برابر کام نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں مسٹر جناح نے وائٹ پیپر کی مخالفت میں اپنی تحریک کو تین جداگانہ اجزا میں منقسم کرکے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی ۔ لیکن یہ ان کی انفرادی کامیابی تھی ۔ اُن کی آزاد جماعت ہر قسم کی بندشوں اور وفاداریوں سے آزاد رہی اور اسے جماعت کہنا خواہ مخواہ کی زبردستی ہے ۔ مسلم گروپ بھی منتشر رہا ۔ کراچی کے المناک سانحہ کے سلسلہ میں جو التوا کی تحریک پیش کی گئی اس میں بھی کانگریسی جماعت نے وسعت نظر سے کام لیا اور مسٹر گوبا کی تحقیقات کی تحریک کی پُرزور حمایت کی ۔

حکومت کی جماعت نے اپنی اہلیت کی کچھ اچھی نمائش نہیں کی اور عوام کی ہمدردی حاصل کرنے میں ناکام رہی سابق وزیر تجارت مسٹر بھور کی تقریریں نسبتاً بے ضرر رہیں ۔ وزیر قانون، مسٹر سرکار کی تقریروں میں تلخی، بغض اور دلآزاری کا پہلو نمایاں رہتا تھا اور وزیر مالیات مسٹر گرگ کی ابتدائی تقریریں گو قابل اطمینان تھیں مگر آخری تقریریں سخت جنگ جویانہ ثابت ہوئیں انھوں نے کانگریس کو ترکی بہ ترکی جواب دئے جو اس وجہ سے کہ موجودہ جماعت عاملہ غیر جواب دہ اور ناقابل بدل ہے اور پبلک کے کسی حصہ کی اُسے نمائندگی حاصل نہیں ہے ناگوار معلوم ہوئے اور اس سے عموماً یہ اثر پڑا کہ حکومت کسی قسم کی مفاہمت کے لئے آمادہ

نہیں ہے بلکہ کانگریس سے جب تک وہ پوری طرح اطاعت قبول نہ کرے ہر میدان میں لڑائی جاری رکھنا چاہتی ہے۔

کانگریس اور حکومت کی تعمیری کوششیں۔ پہلی تحریک عدم تعاون کے بعد کانگریس کی جن تعمیری کوششوں نے خاص اہمیت حاصل کی، وہ کھدر اور ہندی کی تحریکیں تھیں۔ اُس وقت کھدر کو رواج اور ترقی دینے کے لئے تمام ہندوستان کے کاتنے والوں کی ایک انجمن بنائی گئی تھی جو کانگریس کی طرح ایک سیاسی ادارہ نہ تھی بلکہ جو سیاست سے علیحدہ رہ کر صرف کھادی کی ترقی میں مشغول رہتی تھی۔ یہ ادارہ جب سے اب تک کام کر رہا ہے۔ کھادی کے بعض قدیم مرکزوں میں اس کے کارخانے قائم کئے گئے ہیں اور اس کی شاخیں تقریباً ہر ضلع اور بڑے قصبہ میں موجود ہیں جہاں خالص کھدر (یعنی ہاتھ کا کتا اور ہاتھ کا بنا ہوا) فروخت کیا جاتا ہے۔ اس کے کام کو مستعد اور پُر جوش کانگریسی خیال کے نوجوانوں کی ایک جماعت چلا رہی ہے۔

ہندی پھیلانے کی کوشش کانگریس کے کارکنوں کی طرف سے منظم طریقہ پر خصوصیت کے ساتھ جنوبی ہند میں شروع کی گئی۔ اس مقصد کے لئے ایک سبھا بنائی گئی جس نے گاؤں گاؤں میں تعلیم بالغان، دیہی کتب خانے اور دوسرے تعلیمی مراکز قائم کرکے ہندی کی توسیع میں بہت کوشش کی۔ لاکھوں ایسے لوگوں کو جو پہلے ہندی نہیں جانتے تھے، ہندی بولنا اور لکھنا سکھایا۔ ان کے دل میں ہندی کی محبت پیدا کی اور ضمناً ان پر خلوص کام کرنے والوں نے اپنی سیرت کی اعلیٰ خصوصیات کو بھی اپنے گرد وپیش کی آبادی میں پھیلایا۔ مہاتما گاندھی کی تمام تحریکوں کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ خواص کی نہیں بلکہ عوام کی تحریکیں ہوتی ہیں۔ اپنی تمام تحریکوں کی بنیاد وہ عوام کی تائید وحمایت اور قبولیت پر رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کھادی اور ہندی کی تحریکوں کی توسیع کے لئے خواص کا سہارا اور ایسے کام نہیں سوچے جن میں اعلیٰ فنی اہلیت اور قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ایسے کام اختیار کئے جن میں بہت معمولی محنت، مہارت اور کم خرچ سے کام چل جاتا ہے۔

ان مستقل غیر سیاسی اداروں کے علاوہ جو دوسرے نیم سیاسی ادارے اُس زمانہ میں تعمیری کوششیں کر رہے تھے وہ کچھ آشرم اور درسگاہیں تھیں جنھیں قومی تحریک کا مرکز سمجھنا چاہئے یا عارضی مصیبتوں مثلاً سیلاب یا وبائی امراض میں امداد دینے والوں کی جماعتیں ہوتی تھیں جو جب تک مصیبت رہتی تھی کام کرتی تھیں

اور بعد میں منتشر ہو جاتی تھیں۔

اس مرتبہ تحریک سول نافرمانی میں پسپائی کے بعد جب دوبارہ تعمیری کوششوں کو زندہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو تمام ہندوستان کے کاتنے والوں کی انجمن اور جنوبی ہند کی ہندی پھیلانے والی سبھا تو موجود ہی تھیں لیکن یہ کانگریس کے تمام نوجوان کارکنوں کو جو اب جیل سے نکلنے کے بعد بیکار تھے اپنے اندر جذب نہ کر سکتی تھیں۔ دوسرے کانگریس اپنی تعمیری کوششوں کو اس مرتبہ صرف کھادی تک محدود رکھنا نہ چاہتی تھی بلکہ انھیں وسعت دینا چاہتی تھی۔ مہاتما جی کے سامنے سب سے اہم معاشری مسئلہ اچھوتوں اور اعلیٰ ذات والوں کی تفریق مٹانا تھا۔ اس لئے اُنھوں نے پہلے تو ایسے کارکنوں کی ایک جماعت بنائی جو اچھوتوں کے مسائل کا مطالعہ کریں، اُن کی زندگی سدھاریں اور اُن کا رتبہ بلند کر کے انھیں اعلیٰ ذات میں شامل کریں۔ اس جماعت کا مقصد بھی غیر سیاسی تھا اس لئے اس کے قیام میں کوئی قانونی دشواری نہ تھی۔ پھر بہار کے زلزلہ کی تباہیوں کے بعد کانگریس کے کارکنوں کو مصروفیت کا بہت اچھا موقع مل گیا اور بہار کی امداد اور تعمیر نو میں ان لوگوں نے بڑی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد مہاتما جی نے دیسی صنعتوں کو ترقی دینے والی انجمن قائم کی۔ اس کا مقصد بھی غیر سیاسی بیان کیا گیا پھر بورسد میں پلیگ پھیلنے پر ایک جماعت سردار پٹیل کی سرکردگی میں طاعون زدہ لوگوں کی امداد کے لئے پہنچی۔ مہاتما جی نے اندور میں ہندی یونیورسٹی کے قیام اور ہندی کی مزید اشاعت کے لئے کوششیں کیں اور اب کوئٹہ کی تباہی کے بعد کوئٹہ کے مصیبت زدوں کی امداد کی طرف کانگریس کے کارکن متوجہ ہیں۔

لیکن حکومت اس مرتبہ بہت زیادہ چوکنا ہے۔ وہ کانگریس کی تعمیری کوششوں کو بھی اتنا ہی خطرناک سمجھ رہی ہے جتنا اُس کی تخریبی کوششوں کو سمجھتی تھی۔ ہنگامی قوانین اور دوسرے طریقوں سے وہ سیاسی تحریکوں کو تو دبائے ہوئے ہے لیکن وہ اس طرف سے بھی ہوشیار رہنا چاہتی ہے کہ کہیں معاشری تحریکوں کے چور دروازے سے گھس کر کانگریس عوام میں دوبارہ اثر و اقتدار حاصل نہ کر لے چنانچہ وہ کانگریس کی ہر چال کی پہلے سے ہی پیش بندی کر رہی ہے اور ہر میدان میں کانگریس سے مقابلہ پر

آمادہ ہے۔ اس سال کے مالیہ میں لوگوں کا خیال ہے مہاتما جی کی دیہی صنعتوں کی انجمن کو زک دینے کے لئے ایک کروڑ روپیہ دیہی تعمیر نو کے لئے منظور کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلور جوبلی فنڈ کا روپیہ بھی دیہی فلاح و بہبود کے کاموں میں صرف کیا جائے گا۔ کوئٹہ کے مصیبت زدوں کی امداد کا کانگریس کو موقع نہیں دیا گیا بلکہ حکومت نے خود اپنے فوجی اور سول ملازموں سے ان کی امداد کے لئے وہ کام لئے جو بہار میں بابو راجندر پرشاد نے کانگریس کے کارکنوں سے کرائے تھے۔ اس باہمی مقابلہ اور سابقت سے اگر حاجتمند لوگوں کی خدمت زیادہ ہوسکتی تو اس سے بہتر کیا بات تھی لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس کھینچا تانی میں دونوں فریق ایک دوسرے کے کام میں روڑے اٹکائیں گے اور کوئی بھی ضروری کام انجام نہ دے سکے گا۔ حکومت کے وسائل بہت ہیں لیکن اس کے تعمیری کارکنوں میں خلوص نہ ہونے کی وجہ سے اتنے ہی زیادہ مہنگے اور بے اثر ہوتے ہیں۔ حکومت کانگریس کے کاموں میں کامیابی کے ساتھ مزاحم ہوسکتی ہے لیکن اس سے بہتر تعمیری کام نہیں کرسکتی نہ لوگوں کا اتنا زیادہ اعتماد حاصل کرسکتی ہے۔

کانگریس سوشلسٹ جماعت کانگریس کی پارلیمنٹری اور تعمیری کارگذاریوں کے مطالعہ کے بعد جب ہم سوشلسٹ جماعت کے اغراض و مقاصد اور عزائم کا مطالعہ کرتے ہیں اور بڑے کانگریسیوں کے خلاف ان کی سخت تنقیدیں سنتے ہیں تو ہم بالکل ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہمیں باور کرایا جاتا ہے کہ کانگریس کے تمام اقوال بیانات اور قرار دادیں مہمل، متضاد، مبہم، ذو معنی اور منافقانہ ہیں۔ اس کا لائحہ عمل فضول اور اس کی سعی و کاوش بے نتیجہ ہیں۔ مہاتما گاندھی کے اقوال و اعمال خصوصیت کے ساتھ تکلیف دہ حد تک مضحک اور ناقابل معاف طریقہ پر بے کار ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شخص چاہتا کیا ہے اور کیا کر رہا ہے؟ کیا قوم و ملک کو اس نے اپنی اوہام اور باطل پرستی کے لئے ایک کھلونا بنا رکھا ہے؟ کبھی ایک بات کہتا ہے کبھی دوسری۔ اس کی کسی دو باتوں میں باہمی ربط اور یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ انگریزوں کا دشمن بھی نہیں اور انھیں ہندوستان سے نکالنا بھی چاہتا ہے۔ غریب مزدوروں اور کسانوں کا بھی دوست ہے اور ان سرمایہ داروں، راجاؤں مہاراجوں کا بھی جو ان کا خون چوس رہے ہیں۔ ملک کی صنعتی ترقی کا بڑا حامی ہے لیکن مشین کا جو تنہا اس صنعتی ترقی کی ضامن ہوسکتی ہے مخالف ہے۔ کونسل کے داخلہ کی کبھی

سخت مذمت کرتا ہے کبھی اس کی حمایت کرنے لگتا ہے۔ اپنے معتمد اور منتخب ساتھیوں سے سول نافرمانی کو شروع کراتا ہے۔ پھر اُن سے اس کو بند کرنے کو کہتا ہے۔ ان کے ایثار و قربانی کی تعریف نہیں کرتا بلکہ انھیں برا بھلا کہہ کر ساری ناکامی کا الزام اُن کے سر تھوپتا ہے۔ کسی جماعتی پابندی اور رشتے کو تسلیم نہیں کرتا۔ اپنے ذاتی فیصلوں کو اکثریت کی رائے سے زیادہ وقیع اور اٹل سمجھتا ہے جب کانگریس کو اس کی رہنمائی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ مہمل باتوں کے لئے روزے رکھ رکھ کر اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ اندرونی آوازیں سنتا ہے اور ان کی بنیاد پر سخت سے سخت فیصلے کرتا ہے۔ عدم تشدد اور تلاش حق کا ایک ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ اپنے روحانی تجربوں اور وہم پرستیوں کی خاطر سیاسی زندگی کا جیسا اس نے ستیاناس کیا ہے کسی دوسرے آدمی نے دنیا کے کسی حصہ میں نہیں کیا اس عجائب پرست ملک میں اپنی عجیب عجیب حرکتوں سے جو خوش عقیدگی اور بے محبت شیفتگی اس نے اپنے لئے پیدا کی ہے اس کی بنا پر اس کا وجود ہندوستان کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی سخت رکاوٹ بن گیا ہے یا تو یہ پیدائشی طور پر بے وقوف اور کم عقل ہے یا سخت قسم کا منافق اور حیلہ ساز۔ غرضکہ دونوں صورتوں میں کانگریس سے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا اقتدار ختم ہونا نہایت ضروری ہے۔

کانگریس کو ایک واضح اور معقول پروگرام کی ضرورت ہے۔ کانگریس کی ابتدا سرمایہ داروں اور علمی پیشہ والوں نے کی جو سرکاری عہدوں، ملازمتوں، ملک کی تجارت اور صنعت میں زیادہ حصہ کے خواہش مند تھے۔ اپنے مطالبات کو وقیع بنانے کے لئے وہ کبھی کبھی ہندوستان کے گونگے بہرے عوام کی مفلسی اور جہالت کی بھی شکایت کرتے تھے لیکن اصل میں ہمیشہ اپنے طبقہ اور جماعت کا مفاد ان کی نظر کے سامنے رہتا تھا۔ اور اسی کے لئے حقوق حاصل کرنے کی وہ طرح طرح سے کوشش کرتے تھے۔ یہ جنگ گویا برطانوی اور ہندوستانی، بڑے اور چھوٹے سرمایہ داروں کے مابین تھی۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ پھر متوسط طبقہ کے تاجر اور علمی پیشہ والے بھی اس میں شریک کرلئے گئے لیکن یہ سب محفل کی رونق بڑھانے کے لئے شامل کئے جاتے تھے۔ مال غنیمت کے تقسیم کے وقت انھیں کسی حصہ کے ملنے کا موقع نہ تھا۔ مگر جب حکومت

کی بے اتفاقی اس کے بعد بھی قائم رہی اور انھیں " غیر مطمئن تعلیم یافتوں کا ایک قلیل التعداد گروہ " کہہ کر جسے
ملک کی نمایندگی کا ہرگز کوئی حق حاصل نہیں ہے طعنہ دیا اور چڑایا گیا تو انھوں نے کسانوں، مزدوروں
اور عوام کی طرف بھی رخ کیا۔ جلسوں میں انھیں بھی بڑی تعداد میں شریک کرنے لگے اور ان کی طرف سے
بھی مطالبات قراردادوں کی شکل میں پیش کئے جانے لگے۔ بڈھے تجربہ کار تو اصل حقیقت سے واقف
تھے۔ لیکن اونچے طبقوں کے پُرجوش، بے فکر اور نوآموز نوجوانوں اور ادنیٰ طبقوں کے ذہین اور سمجھدار
رہنماؤں کی وجہ سے کانگریسی سیاست نے ایک نیا، غیر متوقع اور ناپسندیدہ رنگ اختیار کرنا شروع
کیا۔ ان لوگوں نے ایمانداری سے یہ اعتقاد رکھنا شروع کیا کہ کانگریس کا مقصد واقعی غریب کسانوں
اور مزدوروں کی حمایت کرنا ہے۔ ابتدا میں بڈھوں نے نوجوانوں کو سمجھانا چاہا۔ لیکن جب یہ سرپھرے
جوشیلے نوجوان اپنے طبقہ اور خود اپنی ہلاکت پر مصر نظر آئے تو یہ گھبرائے اور ان سے کنارہ کشی اختیار
کرنے لگے۔ اس طرح کانگریس میں پہلا افتراق تحریک عدم تعاون کے زمانہ میں رونما ہوا اور اعتدال پسند
لبرل طبقہ نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر اپنی ایک جماعت بنالی۔ لیکن عام طور پر سرمایہ داروں اور زمینداروں
کا طبقہ جسے اس بات کا یقین تھا کہ عوام کے گلے کی زنجیر ابھی اس کے ہاتھ میں ہے اس بات سے خائف
نہیں ہوا بلکہ حکومت کو ڈرانے کے لئے اسے ایک کارگر حربہ سمجھ کر استعمال کرتا رہا۔ مہاتما گاندھی کے
خیالی اور مثالی نصب العین اسے مطمئن کرنے کے لئے کافی تھے۔ اگر ان شرائط کے ساتھ عوام میں بیداری پیدا
ہو تو یہ خطرناک نہیں تھی۔ لیکن عدم تعاون کی تحریک کے بعد اور تحریک سول نافرمانی کے زمانہ میں معاملات
نے زیادہ سنجیدہ صورت اختیار کرنا شروع کی اور نوجوانوں خصوصیت کے ساتھ بے روزگار تعلیم یافتہ
نوجوانوں نے غالباً سرمایہ داروں کی رعونت کے ردّعمل کے زیر اثر کسانوں اور مزدوروں کی بہبودی کے
نصب العین کو ایک مذہبی فریضہ بنالیا۔ اس وقت نہ صرف کمزور بلکہ قوی دل کے سرمایہ داروں میں بھی
آیندہ کے متعلق تشویش پیدا ہوئی اور یہ سوچ کر کہ آگ سے کھیلنا اچھا نہیں ہے کانگریس کی مالی اعانت
اور اخلاقی حمایت سے ہاتھ کھینچنا شروع کیا۔ انھوں نے دل میں کہا کہ زیادہ کے لالچ میں کہیں جو ہے
وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ دوسری طرف حکومت کی سختیاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا

کہ جب تک حکومت کی سختی کم نہ ہو اور یہ نیا خطرناک عنصر قابو میں نہ آئے تحریک میں اپنے روپیہ اور اعانت سے گرمی پیدا کرنا مناسب نہیں ہے۔

کانگریس کے پرانے رہنما جو چرخہ، اچھوتوں کی اصلاح، شراب نوشی کے انسداد، گرام سدھار سودیشی، ہندو مسلم اتحاد، آشرموں کی زندگی وغیرہ کا پرچار کرتے ہیں وہ تو بے ضرر بھلے مانس ہیں اُن کی قومی اور سودیشی تحریک سے تو تجارت اور صنعت کو بھی خوب نفع پہنچتا ہے لیکن جو جائدادوں کی ضبطی، کسانوں کو عدم ادائگی محاصل اور مزدوروں کو ہڑتالوں پر آمادہ کرتے ہیں اور اپنے آیندہ دستور حکومت میں سرمایہ داروں، زمینداروں، راجاؤں مہاراجوں کو کوئی جگہ دینا نہیں چاہتے، بڑے کارخانوں اور تجارتوں کو سرکاری انتظام کے ماتحت چلانا چاہتے ہیں اور دولت کی مساوی تقسیم چاہتے ہیں ان سے ہمارا اشتراک عمل نہیں ہوسکتا حکومت اور برطانوی سرمایہ دار سے ہمارا مقابلہ ہے اُن سے ہم لڑنا چاہتے ہیں ملک کے اندر ساہوکار اور زمیندار میں بھی آپس میں چشمک ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی بیعت، رہنمائی بعد اقتدار میں ہم لڑنا نہیں چاہتے جو اس مقابلہ کو ختم کر کے ہمیں بھی ختم کر ڈالیں۔

کانگریس کے پرانے رہنماؤں سے جن میں ان کی برادری کے بنئے، ساہوکار اور سرمایہ دار بھی تھے اور جن پر اس بنیاد پر انھیں اعتماد تھا انھوں نے کہا کہ آپ کو صاف صاف اپنے ارادوں کو بتا دینا چاہئیے۔ آپکا ارادہ بھی کیا وہی ہے جو آپ کی جماعت کے نوجوان کہتے ہیں۔ ان رہنماؤں کے دل کا حال تو خدا جانتا ہے لیکن جو جواب اُنھوں نے دئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے سرمایہ داروں، زمینداروں اور راجاؤں مہاراجوں کی اتنی تشفی ضرور ہو گئی ہے کہ وہ کانگریس کو پہلے کی طرح اب ہوا نہیں سمجھتے بلکہ جو ان میں ہمت والے ہیں وہ شاید پھر کانگریس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس موافق صورت حال کے پیدا ہونے میں غالباً اُس ملامت کو بھی بڑا دخل ہے جو کانگریس کے پرانے رہنما اپنے نوجوان ساتھیوں کو وقتاً فوقتاً معلوم نہیں سرمایہ داروں کو دکھلانے کے لئے یا واقعی کرتے رہتے ہیں۔ رہے کانگریس سوشلسٹ سو اُن کی عمارت بغیر بنیاد کے کھڑی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر کانگریس سے علیحدہ ہوئے تو جو تھوڑی لیڈرشپ ملی ہوئی ہے وہ بھی جاتی رہے گی اور ہمیں دبا کر بالکل فنا کر دیا جائے گا۔ یہ لوگ ظاہراً مہاتما جی اور اُن کے رفقا کی چاہے

کتنی ہی برائی کریں لیکن جب اُن کی قوت ایثار کو دیکھتے ہیں تو دل میں ان کی غریب دوستی کے قائل ہو جاتے ہیں۔ کیا مہاتما جی غریبوں کی خاطر صرف ایک لنگوٹی باندھے نہیں پھرتے۔ کیا وہ کئی مرتبہ جیل نہیں جاچکے ہیں۔ کیا انھوں نے اچھوتوں کے لئے روزہ رکھ کر اپنی زندگی کو خطرہ میں نہیں ڈالا۔ سوشلسٹ جماعت میں باتیں کرنے والے بہت ہیں لیکن کام کرنے والے کم ہیں۔ سوشلسٹ انقلاب کے لئے جس جانبازی اور سرفروشی کی ضرورت ہے اس کی ہمت کتنے ایسے لوگوں میں ہے جو اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے ہیں اور اس نسبت کے سہارے سے اعلیٰ تعلیمیافتہ سوسائٹی میں جس میں مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہوتی ہے تعیش پسند وضع اور لباس پر قائم رہتے ہوئے غرور اور زعم باطل کے ساتھ مور کی طرح دم پھیلائے اکڑتے پھرتے ہیں جب تک وہ انقلابی دیوانگی پیدا نہ ہو جو سوشلسٹ رہنماؤں کو ہر خطرہ کے برداشت کرنے کے لئے آمادہ کردیتی ہے کانگریس سوشلسٹ جماعت کی تمام باتیں ہوائی قلعوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں ان کی علمی واقفیت، منطقی استدلال، نظری تکمیل اور انقلابی ادب کے گہرے مطالعہ سے انکار نہیں ممکن ہے ان چیزوں میں انھوں نے بڑی دستگاہ حاصل کی ہو لیکن عملی کامیابی کے لئے ضرورت دوسری خصوصیات کی ہے۔ زندگی منطق سے بالا چیز ہے۔ اپنی متضاد، مہمل، ناقابل فہم اور مضحکہ خیز اقوال و اعمال کے باوجود بلکہ غالباً انہی کی وجہ سے کانگریس کے پرانے رہنماؤں میں عمل کی قوت زیادہ ہے۔ اُنھیں لوگوں کا اعتماد حاصل ہے اور وہ انھیں ایثار پر آمادہ کرسکتے ہیں۔ کانگریس کے گذشتہ اجلاس میں وہ نہایت آسانی سے سوشلسٹ جماعت پر حاوی ہوگئے۔ ان کا اعتبار ملک میں بڑھ رہا ہے۔ کمیونل ایوارڈ کے مسئلہ میں انھوں نے اگر مسلمانوں کو خوش نہیں کیا تو ناراض بھی نہیں کیا۔ پھر ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے بابو راجندر پرشاد نے مسٹر جناح سے گفتگو کی جو ہر چند کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس سے کسی قسم کی بدمزگی یا غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ کاؤنسل میں اُن کا کام عام طور پر پسند کیا گیا۔ ان کی تعمیری کوششیں خصوصاً بہار کے زلزلہ کے سلسلہ میں نہایت قابل تعریف رہیں۔ سرمایہ داروں اور راجاؤں کے اندیشوں کو باطل اور بے بنیاد ثابت کرنے کی بھی کوشش کررہے ہیں۔ کانگریس نیشلسٹ اور کانگریس سوشلسٹ جماعتوں کے قیام سے اُن کے اقتدار پر کوئی خراب اثر نہیں پڑا۔ حال میں مسٹر کنزرو نے بمبئی میں اعتدال پسند جماعت کی طرف سے کانگریس

کے ساتھ اتحاد عمل کے لئے کنایہ اور اشارہ سے آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید کانگریس کی یہ آزمودہ کار جماعت آہستہ آہستہ متحدہ کوشش کے ساتھ کسی کام کو شروع کرنے کی دوبارہ تیاری کر رہی ہے۔ یہ کام غالباً نئے گورنمنٹ آف انڈیا بل سے متعلق ہوگا جس کے متعلق تفصیلی بحث اسی رسالہ کے ابتدائی مضمون میں کی جا چکی ہے۔

ہندوستانی مسلمان دنیا اور ہندوستان کی رفتار ترقی دیکھنے کے بعد اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس دوران میں ہندوستانی مسلمان کیا کرتے رہے۔ ان میں ایک اُمید افزا بیداری کے آثار نظر آرہے ہیں آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو پہچان رہے ہیں۔ ان میں خودداری، عزت نفس، حمیت اور جسارت پیدا ہو رہی ہے ہندوستان میں جو ان کا صحیح مقصد زندگی ہے اس کا ایک دھندلا سا احساس اُن میں پایا جا رہا ہے۔ دریوزہ گری اور اغیار پرستی کی جو قبیح عادتیں ان میں پیدا ہوگئی تھیں وہ فنا ہو رہی ہیں۔ وہ اپنی زندگی آزادی سے بسر کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں کے مقاصد کے آلۂ کار بن کر زندہ رہنا نہیں چاہتے۔ اب تک کی بے راہ روی ان کے لئے بہت سبق آموز ثابت ہوئی ہے۔ انھوں نے مختلف راہبروں کے ساتھ تھوڑی دور چل کر عبرت حاصل کی ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ اُن کے درد کا علاج وہ نہیں ہے جو دوسروں کا ہے۔ انھیں خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے عزت کی زندگی بسر کرنے کے لئے ذاتی سعی وعمل سے کام لینا ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے دوسروں کا سہارا تکنا بے کار ہے۔ بے کس اور عاجز بن کر کبھی سرکار اور کبھی ہندوؤں سے رحم و کرم کی التجا کرنا فضول ہے بلکہ اپنی تنظیم خود کرنا چاہئے۔ نئے حالات و واقعات کے مطابق اپنے خیالات و اعمال کو بدلنا چاہئے۔ وہ ایک زبردست فلسفہ اور پیغام کے امین ہیں۔ انھیں اس امانت کو ہندوستان میں محفوظ رکھنا ہے۔ انھیں دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا ہے۔ سچا رفیق اور ہمدرد کوئی نہیں ہے۔ سب اپنا مطلب نکالنے کے لئے دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ اقتدار اور رہنمائی کی جگہوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے۔ خود غرض اغیار اپنا کام نکالنے کے لئے انھیں کبھی کبھی اونچی جگہوں پر بٹھا دیتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے ہاتھ سے اس طرح گدی پر بٹھایا جانا مسلمان کی غیرت کے منافی ہے۔ عزت و مرتبہ کسی کے دینے سے نہیں ملتا۔ یہ اپنی کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اپنی زندگی کی اعلیٰ اخلاقی مثال،

احساس فرض، خدمت خلق، ہمدردی اور مروت سے اپنی قومی افضلیت اور برتری کا ثبوت فراہم کرنا ہے انھیں حق و انصاف کی حمایت میں اپنی مجاہدانہ سرفروشیوں سے اپنے مذہب کی تعلیم کا زندہ نمونہ پیش کرنا ہے۔ انھیں اپنا مقررہ فریضۂ خدمت ایمانداری سے ادا کرنا ہے۔ جہاں کہیں بھی ہیں جماعت کے جس طبقے سے بھی ان کا تعلق ہے۔ مزدور ہیں یا کسان و کاریگر۔ تاجر ہیں یا محرر، ادیب ہیں یا مقرر، ڈاکٹر ہیں یا انجنیئر انھیں ہر جگہ اپنی اعلیٰ اہلیت کو نمایاں کرنا ہے اور اپنے آس پاس کے لوگوں کے ساتھ ایمانداری، انصاف، ہمدردی، مروت اور انسانیت کا برتاؤ کرکے ان کی محبت و عزت حاصل کرنا ہے۔ اُن کا کام دوسروں کی عطا کی ہوئی دستوری مراعات اور حقوق سے نہیں چلتا اور ان کی توقیر و عزت اس بات سے نہیں ہوتی۔ وہ یہ چیز اپنی ذاتی کوشش سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی فتح اور اُس قوم و مذہب کی فتح جس کے وہ نام لیوا ہیں اُس وقت ہے جب ان علاقوں سے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں اپنی ہردلعزیزی اور اعتماد کی بنا پر کثیر اکثریت کے ساتھ میونسپلٹیوں اور مجالس قانون ساز میں منتخب ہو سکیں۔ لوگوں کو اُن کی زبان اور ان کے ادب کے مطالعہ کا شوق ہو اُن کے مذہب کا احترام اُن کے دل میں پیدا ہو۔ ان کا سب سے بڑا تحفظ خود ان کے نیک اعمال ہیں ورنہ رکیک حرکتوں، کمینے جوڑ توڑ اور ایمان و قوم فروشی سے اگر کوئی رعایت یا حق تسلیم کرا لیا تو اس سے ممکن ہے ذاتی عروج اور اقتدار کچھ عرصہ کے لئے حاصل ہو جائے لیکن اسلام کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔

جن لوگوں میں ترقی کی یہ صحیح سوچ پیدا ہو رہی ہے وہ ابھی تک عموماً منتشر ہیں اور صرف انفرادی طور پر اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کر رہے ہیں۔ مطبع اور منبر پر جن لوگوں کا قبضہ ہے انھیں مسلمانوں کی ترقی کی اس رفتار کا علم نہیں ہے۔ نمائش و اشتہار سے بے نیاز، جفاکش اور ایماندار مسلمانوں کا یہ باعزم اور خاکسار گروہ خاموشی سے اپنا کام کر رہا ہے مستقبل دراصل اس کے ہاتھ میں ہے اور جن کی بلند بانگ آوازوں سے اس وقت فضا گونج رہی ہے وہ اندر سے خالی ہیں۔

تنقید و تبصرہ

کتب :-

فردوس الحکمۃ | مصنفہ ابو الحسن علی بن سہل ابن طبری ۔ تصحیح ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مدیر شعبہ عربیہ لکھنؤ یونیورسٹی حجم تقریباً ۷۵۰ صفحے ۔ قیمت عہ ۔ ملنے کا پتہ ، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ، دہلی

یہ کتاب عربی میں فن طب کی ان امہات کتب میں سے ہے جو عباسی عہد میں لکھی گئیں ۔ اس کے مصنف نے جو ایک ممتاز اہل علم اور نامور علمی خاندان سے تھا امیر المومنین متوکل علی اللہ کے عہد میں طب کی یہ جامع کتاب مرتب کی ۔ اس میں اس وقت تک کے جملہ طبی مہمات اور مسائل بیان کئے گئے ہیں اور نہایت خوبی اور سلاست کے ساتھ ۔ عبارت صاف اور ادیبانہ ہے ۔ اور مسائل محققانہ ۔ اس کا مصنف ابو الحسن علی بن سہل اس عہد کا مشہور ماہر طب تھا جس کا شاگرد ابوبکر محمد بن زکریا رازی جیسا امام ہے ۔ یہ کتاب اگرچہ اس عہد کی مشہور کتب میں سے ہے جس کا ذکر جابجا متاخرین ائمہ طب کی کتابوں میں آتا ہے لیکن اب تک یہ طبع نہیں ہوئی تھی ۔ ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی تصحیح سے لیگ موریل کی طرف سے برلن میں چھاپی گئی ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کی تصحیح میں بہت محنت سے کام لیا ہے اور یورپ اور ہندوستان میں اس کے متعدد نسخوں سے مقابلہ کرکے تصحیح کی ہے ۔ اہل طب کے واسطے یہ کتاب ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے ۔

(ا ۔ ج)

مکتوبات نیاز | مصنفہ جناب نیاز فتحپوری صاحب ۔ تقطیع چھوٹی ۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات ۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ۔ جلد سادہ اور خوشنما ۔ قیمت ۲ ؎ ملنے کا پتہ نگار بک ایجنسی ۔ لکھنؤ ۔

یہ جناب نیاز فتحپوری کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے احباب کو لکھے ہیں صحافت اردو میں ادیب و نقاد کی حیثیت سے نیاز صاحب کا مرتبہ بلند و ممتاز ہے ۔ ان کا ایک خاص رنگ ہے

جس نے نئی نسل کی تحریروں پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے ۔ زیر نظر مجموعہ ان کی ادبی زندگی کا عطر سمجھنا چاہیئے ۔ ہر خط ایک شعر ہے اور ایک خاص کیفیت کا حامل ۔ خطوط مختلف موضوع پر لکھے گئے ہیں لیکن کوئی خط ایسا نہیں ہے جو اپنی جگہ پر پاکیزگی ذوق، لطافت بیان اور ندرت ادا کی بہترین مثال نظر نہ آتا ہو ۔ نیاز صاحب نے غالب کی روایات کو نہایت کامیابی کے ساتھ نہ صرف جاری رکھا ہے بلکہ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ یہ خطوط شگفتگی اور رنگینی کا ایک خزانہ ہیں ۔ ان کی مسرت اور سرخوشی متعدی ہے ۔ آپ کتنے ہی حزیں و ملول و افسردہ کیوں نہ ہوں ان خطوں کے پڑھنے کے بعد تازگی اور نشاط پیدا ہونا بالکل یقینی ہے خستہ و مضمحل دل و دماغ کو ان سے وہی کیف و زندگی حاصل ہوتی ہے جو مرجھائے اور سوکھے ہوئے درختوں کو بارش سے میسر آتی ہے ۔ نیاز صاحب کا یہ کارنامہ بھی ہماری رائے میں ان کی دوسری ادبی کوششوں کے ہم پلہ ہے ۔

خطوط میں مصنف کو اپنے قدرتی اور صحیح جذبات و خیالات کے اظہار کا جیسا موقع ملتا ہے ایسا کہیں نہیں ملتا ۔ کیونکہ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کا مخاطب کوئی اجنبی شخص نہیں ہے بلکہ ایک ہمدرد دوست ہے جس کے سامنے آزادی، بے تکلفی اور بے باکی سے ہر قسم کی بات کہی جا سکتی ہے۔ مصنف کی انتہائی پُرخلوص اور مکمل غیر مصنوعی تحریروں کے نمونے اگر کہیں دستیاب ہو سکتے ہیں تو اس کے اُن خطوط میں جو وہ اپنے عزیز دوستوں کو لکھتا ہے ۔ پھر اُس کی ذاتی زندگی کے مطالعہ کے لئے بھی یہ بہترین ماخذ ہیں ۔ ان خطوں سے نیاز صاحب کی ذاتی زندگی کے متعلق بہت اچھی رائے قائم کرنا پڑتی ہے ۔ نیاز صاحب ایک فیاض، مخلص، عالی حوصلہ، دوست پرست اور آزاد مشرب شخص نظر آتے ہیں ۔ ان کی سیر چشمی اور فراخدلی توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچتی ہے ۔

مصنف کے خطوط عموماً اس کی زندگی میں شایع نہیں ہوتے ۔ لیکن نیاز صاحب اپنے لئے بجائے خود ایک قانون و مثال ہیں ۔ ان کی آزاد فطرت دوسروں کی تقلید گوارا نہیں کرتی ۔ اس لئے یہاں بھی انہوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے ۔

خطوط جن لوگوں کو لکھے گئے ہیں ان کا صحیح نام و پتہ نہیں دیا گیا اس سے مشکوک طبیعتیں شبہ کر سکتی ہیں

کہ یہ سب ادیب کے تخیل کی کارفرمائی ہے ورنہ درحقیقت خطوط لکھے کسی کو نہیں گئے - لیکن ایک ادیب کو اس کی تحریروں کے سوا کسی اور جگہ دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے - یہی اس کی اصل زندگی ہے اسی سے اس کی اچھائی اور برائی کا فیصلہ کرنا چاہئے - باقی جو کچھ ہے وہ دھوکا اور فریب ہے - پھر اس قسم کا شبہہ محض وقتی طور پر پیدا ہوسکتا ہے قائم نہیں رہ سکتا - کیونکہ خطوط کی صداقت اور زندگی فوراً تمام شکوک کا ازالہ کر دیتی ہے -

مکتوبات مطالعہ کے لائق ہیں - شروع میں جناب نیاز اور ان کے ایک مکتوب کی عکسی تصاویر بھی ہیں - (م - ع)

رسائل :-

ساقی | افسانہ نمبر - مرتب جناب شاہد احمد صاحب بی اے آنرز - ضخامت ۱۰۰ صفحات تقطیع بڑی - کتابت وطباعت بہتر کاغذ متوسط قیمت خاص نمبر ۱؎ قیمت سالانہ ؏ - مقام اشاعت دہلی -

اس سے پہلے متعدد بار رسالہ ساقی اور اس کے خاص نمبروں کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے - یہ علمی و ادبی رسالہ تقریباً چھ سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس نے اپنے معیار کو بڑی خوش اسلوبی سے قائم رکھا ہے -

اس رسالے کے ہر سال چار خاص نمبر شائع ہوتے ہیں زیر نظر نمبر اس کا افسانہ نمبر ہے - اس میں کل ۳۴ مضامین نظم و نثر ہیں - بیس افسانے ہیں - دس طبعزاد ہیں اور دس دوسری زبانوں کے بہترین افسانوں کے ترجمے - ان تمام افسانوں پر علیحدہ علیحدہ تفصیلی رائے کا اظہار طوالت کا موجب ہوگا جس کی اس موقع پر گنجائش نہیں - مختصر یہ ہے کہ ہر افسانہ ترجمہ یا طبعزاد کسی نہ کسی خصوصیت کا حامل ہے - مضمون نگاروں میں جناب مولانا عنایت اللہ صاحب بی اے علیگ سابق ناظم دارالترجمہ - خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی جناب خواجہ غلام السیدین پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڈھ - جناب ڈاکٹر اعظم کریوی جناب ام اسلم - جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی - جناب اختر حسین رائے پوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں - خود مرتب صاحب

سکوت کے عنوان سے بہت اچھا فسانہ لکھا ہے۔ سید وقار عظیم صاحب کا مضمون فسانے کی تنقید بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ نظموں کا معیار بھی خاصا بلند ہے۔ رسالے میں تین بلاک کی تصویریں بھی ہیں ایک ساقی کے خاص مضمون نگاروں کا گروپ فوٹو ہے۔ دوسری سالومی کی اور تیسری لولہ سونیئر کی تصویر ہے۔ رسالے کا ٹائیٹل بھی رنگین ہے اور نہایت خوشنما۔ غرض حیثیت مجموعی یہ خاص نمبر کامیاب ہے اور نہایت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔

(ح - ح)

<u>الاطفال</u> | یعنی ہمدرد صحت دہلی کی اشاعت خاص۔ مرتبہ حکیم حافظ عبد الحمید صاحب دہلوی۔ تقطیع بڑی حجم ۲۰۸ صفحات، کاغذ معمولی کتابت و طباعت متوسط۔ قیمت خاص نمبر قسم اول ۱۲ قسم دوم ۸؍ قیمت سالانہ عہ؍ مقام اشاعت ہمدرد منزل لال کنواں دہلی۔

یہ رسالہ حکیم عبد الحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ کی نگرانی و ادارت میں کئی سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہے اپنے مضامین و ترتیب کے اعتبار سے اسے اردو کے دوسرے طبی رسالوں کے مقابلے میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ ہر سال اپنا ایک خاص نمبر بھی نکالتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کسی خاص موضوع پر ماہرین فن سے مضمون لکھوائے جاتے ہیں زیر نظر نمبر بچوں سے متعلق ہے۔ اور فاضل مرتب نے بڑی محنت و کوشش سے بچوں کے مختلف امراض ان کی غور و پرداخت ان کی تربیت سے متعلق ہندوستان اور مغربی ممالک کے ماہرین فن کے مضامین فراہم کئے ہیں دلچسپ دستی تصاویر، مرقعوں اور کارٹونوں کے علاوہ تقریباً ۲۲۴ بلاک کی تصویریں ہیں آخر میں نقش کے عنوان سے علامہ سر اقبال کی بچے پر ایک نظم اور متعدد دلچسپ افسانے ہیں یہ بھی بچے کے ہی متعلق ہیں۔ باہر کے مضمون نگاروں میں محترمہ خالدہ خانم کا مضمون خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس وقت بچہ کے متعلق اردو زبان میں بہت کم لٹریچر موجود ہے اس خاص نمبر کی اشاعت نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے اس لئے جناب مرتب اہل ملک کی طرف سے خاص طور سے شکریہ کے مستحق ہیں ہمیں امید ہے کہ ان کا رسالہ اور یہ خاص نمبر زیادہ سے زیادہ قبولیت حاصل کریں گے۔ (ح - ح)

غـــزال یہ ادبی و فنی رسالہ حکیم محمد طالب صاحب اور عمر فاروق صاحب ۔ ایم اے کی ادارت میں لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے ۔ بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے مضامین بھی بلند معیار ہیں ۔ کتابت وطباعت اور کاغذ بھی نہایت نفیس قیمت سالانہ چھ روپئے رعایتی للعہ ۔

عصمت سالگرہ نمبر مرتبہ جناب رازق الخیری ۔ حجم ۲۷۵ صفحات تقطیع بڑی ۔ قیمت قسم اول عہ قسم دوم عہ قیمت سالانہ تین روپئے (سے)

یہ رسالہ ۲۸ سال سے طبقہ نسواں کی مفید و گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے پہلے علامہ راشد الخیری اس کے ایڈیٹر تھے اب اس کی زمام ادارت ان کے ہونہار صاحبزادے جناب رازق الخیری صاحب کے ہاتھ میں ہے اور مولانا پرچے کے نگراں ہیں ۔

زیر نظر نمبر اٹھائیسویں سال کا خاص نمبر ہے اس میں خانہ داری حفظان صحت، تربیت اولاد، صنعت و حرفت، مذہب، اخلاق ۔ معاشرت، تمدن ۔ تاریخ و سیر، سیر و سیاحت، پر بہت اچھے مضمون ہیں دلچسپ افسانے اور ڈرامے بھی ہیں ۔ اچھی اور پاکیزہ نظمیں اور غزلیں بھی ہیں ۔ خاص بات یہ ہے کہ اکثر مضامین اور نظمیں خود عورتوں کی ہیں مردوں میں علامہ راشد الخیری ۔ منشی پریم چند ۔ حضرت عزیز لکھنوی، جناب تلوک چند محروم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ رسالے کا ٹائیٹل خوشنما رنگین ہے اس کے علاوہ بلاک کی ۵ رنگین اور ۶۵ ایک رنگ کی تصاویر ہیں ۔ غرض ہر اعتبار سے یہ نمبر مرتب کی محنت جانفشانی اور سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہے ۔

اس رسالے نے مضمون نگار خواتین کا ایک خاص حلقہ قائم کر لیا ہے جو اپنے سنجیدہ اصلاحی مضامین کے ذریعے ملک و قوم کی بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس عرصے میں عورتوں کے طبقے میں جو عام بیداری پیدا ہوئی اس میں عصمت اور اس کے محترم بانی کی سنجیدہ کوششوں کو بہت کچھ دخل ہے ۔ (ح ۔ ح)

اخبار :-

صدق (دس روزہ) ایڈیٹر جناب مولنا عبدالماجد دریا بادی - حجم ۱۲ صفحات کتابت وطباعت اورکاغذ اوسط - قیمت سالانہ للعہ فی پرچہ ا؎ مقام اشاعت دفتر حق ہیوٹ روڈ لکھنؤ -

ناظرین مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے مشہور اخبار سچ کو بھولے نہ ہوں گے یہ مفید اخبار مولانا نے بعض اہم مصروفیتوں کی وجہ سے بند کردیا تھا بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب یہ دوبارہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا کر صرف نام اور اہتمام میں تبدیلی ہوئی ہے ورنہ تمام خصوصیات بعینہ سچ کی ہیں وہی سچی باتیں وہی محققانہ علمی و مذہبی مضامین اور وہی مولانا کا قلم !

یہ رسالہ پہلے پندرہ روزہ نکلتا تھا مگر تیسرے نمبر سے دس روزہ کردیا گیا ہے ضخامت بھی اتنی ہوتی ہے کہ ایک ہفتہ وار پرچے کا اوسط پڑجاتا ہے - ہمیں امید ہے کہ جناب منیجر صاحب اسے بہت جلد ہفتہ وار کردیں گے -

---

مطبوعات موصولہ :-

ترجمۃ القرآن جناب پادری احمد شاہ صاحب نے ہندی میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے - ہم ہندی سے واقف نہیں اس لئے اس کے حسن و قبح کے بارے میں کچھ عرض نہیں کرسکتے - قیمت ۱؎ پتہ پادری احمد شاہ صاحب نور منزل ڈاک خانہ راج پور دہرہ دون -

---

توجیہ محاورات وکنایات زبان اردو از جناب ابو عامر محمد باقر حسن صاحب القاری قادری قیمت ۲؎ ملنے کا پتہ ابو عامر اینڈ سن محلہ شاہ ولایت سہارنپور -

---

نسوانی دنیا مدیر مسئول عنایت اللہ خاں صاحب - چندہ سالانہ ۲؎ مقام اشاعت لاہور - یہ رسالہ عورتوں کیلئے لاہور سے جاری ہوا ہے مضامین ، افسانے ، اور نظمیں سب کا معیار اچھا خاصا بلند ہے - اُمید ہے کہ آئندہ اور ترقی کریگا -

---

مراسلہ

اے خوشا وہ قوم مستقبل ہو جس کا سا ندار
کل سے بہتر آج ہو اور آج سے بہتر ہو کل

کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا شمار بھی کسی ایسی ہی خوش نصیب قوم میں کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان کی گذشتہ نصف صدی کی تاریخ بھی ایک مسلسل ترقی و عروج اور فتح و کامرانی کی داستان ہے؟ کیا ان کا قدم بھی برابر آگے کی طرف اٹھ رہا ہے؟ کیا ان کی تعداد میں اضافہ، ان کی تندرستی و اہلیت میں بیشی، ان کی تجارت و صنعت و زراعت میں مرفہ الحالی، ان کے مکانات میں شوکت و دبدبہ، ان کے طریقہ رہائش میں آرام و آسایش، ان کے تہواروں اور تقریبوں میں بشاشت و شادمانی، ان کی زندگی میں اطمینان و یقین، ان کی عبادت میں فراغت و دلجمی اور ان کے ادب میں شگفتگی اور تندرستی پائی جاتی ہے؟ کیا ان کی طبیعت بھی نچلا بیٹھنا پسند نہیں کرتی؟ نئے نئے خواب دیکھتی اور اُن کی تعبیر یں تمام دنیا میں تلاش کرتی پھرتی ہے؟ کوئلہ سے ہیرا، راکھ سے سونا، اور قطرہ سے گوہر بناتی ہے۔ بنجر زمین سے غذا اور مٹی سے فولاد نکالتی ہے۔ ویرانوں کو شہر اور جنگلوں کو گلزار بناتی ہے۔ بیماریوں کے علاج اور نقصانوں کی تلافی کرتی ہے۔ اپنے راستہ میں جس چیز کو حایل دیکھتی ہے اُس کی تسخیر پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر سرنگیں، دریاؤں پر پل، سمندروں کے لئے جہاز، ہوا کے لئے طیارے بناتی ہے۔ مقام اور زمانہ کے فاصلوں کو اس طرح مٹا رہی ہے گویا ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اُس کی آزادی میں کوئی چیز مخل نہیں ہوتی، کوئی پابندی اس کے لئے پابندی نہیں رہتی۔ ہر دشواری اس کی ایجاد و اختراع کے لئے ایک مہمیز کا کام کرتی ہے ——— ہاں، کیا ہندوستان کی مسلمان آبادی زمین کی خلافت اور اقوام کی امامت کے فرایض انجام دے رہی ہے؟

سوال سخت ہے اور دل دکھانے والا۔ میں آپ کے ان اداروں کے نام سننا نہیں چاہتا جن کو آپ نے گذشتہ پچاس سال میں قائم کیا ہے، میں نتائج دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری نظر ذرایع پر نہیں مقاصد پر ہے۔

میں "آج" کو بھی دیکھا نہیں چاہتا۔ "آج" سے جو "کل" پیدا ہوگا میری نظر اُس پر ہے۔ آیئے، میرے ساتھ دیکھئے اور مجھے بتلایئے کہ کل آپ کی کیا حیثیت ہوگی؟ کن جگہوں پر آپ کا قبضہ ہوگا؟ کس طریقہ پر آپ زندگی گذار رہے ہوں گے اور آپ کی ہندوستان اور دنیا میں کیا اہمیت اور عزت ہوگی؟

بُری بات منہ سے نکالتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ بیمار کی حالت کتنی ہی مایوس کن کیوں نہ ہو لیکن جب تک سانس چلتی ہے زندگی کی آس رہتی ہے۔ علاج و دوا ترک نہیں کی جا سکتی۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتے۔

عزیزو، اب بھی آنکھ کھول سکتے ہو۔ زندگی کے لئے ایک آخری کوشش کر سکتے ہو۔ حشر کے برپا ہونے میں کیا کسر رہی ہے۔ کراچی کے شہیدوں کے خون کی لالی، کوئٹہ کا زلزلہ، پشاور اور ایبٹ آباد کی آتشزدگی، لاہور میں گردوارہ شہید گنج کے معاملہ میں ذلت و رسوائی اگر تمھیں جگانے اور ہوشیار کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں تو پھر اور کیا چاہتے ہو؟

اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھو۔ خود اعتمادی، جرات و جسارت ——— اسی سے افراد اور قومیں بنتی ہیں اپنے اوپر اعتماد کرو، ہمت بلند رکھو اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالو۔ کوئی انعام بلند ہمتی اور سرفروشی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اپنی ذاتی زندگی بناؤ اور اپنی ان بنی ہوئی زندگیوں کو ملا کر قومی زندگی تعمیر کرو۔

انقلاب فرانس

مصنفہ

مولوی عبدالقادر صاحب بی۔ اے (جامعہ)

مکتبہ جامعہ دنیا کے مختلف ممالک کے انقلابات پر مختصر کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اٹلی، روس، امریکہ، آئرلینڈ وغیرہ کے انقلابات کے حالات زیر ترتیب ہیں۔ ناظرین کیلئے یہ بہت ہی دلچسپ اور پُر از معلومات سلسلہ ہے خصوصاً یہ پہلی کتاب اُردو زبان میں اس موضوع پر ایک خاص حیثیت کی حامل ہے۔ فوراً طلب فرمائیے۔ قیمت صرف ۱۲ر

انجام (ڈراما)

مصنفہ

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن)

یہ ڈراما رسالہ جامعہ میں شائع ہو کر بیحد پسند کیا جا چکا ہے اور جامعہ کے طلبا نے اسٹیج بھی کیا تھا۔ اس میں انسان کی خود غرضی کا ایک نمونہ اور جھوٹی مذہبیت کی پردہ دری اس انداز میں کی گئی ہے کہ پڑھنے والے حیرت سے دنگ رہ جاتے ہیں اور وہ اثر لیکر اُٹھتے ہیں کہ اُنکی روح ایک عرصہ تک بےچین رہتی ہے۔

مزاحیہ پارٹ بھی بڑا خوشگوار ہے۔ کتاب الہ آباد کے خوشنما ٹائپ میں نہایت اچھی چھپی ہے۔ قیمت صرف ۱۲ر

کسان

مترجمہ

جناب محمود علی خانصاحب جامعی

اس کتاب میں کسان کے افلاس کے اسباب اور ان کے علاج پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا ہے کہ قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کسطرح رفتہ رفتہ اسکو خوشحال سے محتاج بنایا گیا؟ اور اب کیا صورتیں اختیار کی جائیں کہ دوبارہ اس کے دن پھر جائیں۔

کسانوں کے غریب طبقہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ضرور پڑھیں۔ قیمت عـہ

دو خدائی خدمتگار

مترجمہ

جناب محمود علی خانصاحب جامعی

ڈاکٹر خانصاحب اور خان عبدالغفار خاں کے حالات زندگی انگریزی زبان میں مہاتما گاندھی کے ارشاد پر مہادیو ڈیسائی نے لکھے تھے۔ یہ کتاب ان ہی حالات کا نہایت سلیس اور نفیس اُردو ترجمہ ہے۔ اسے پڑھکر آپ صوبہ سرحد کی سیاسی تحریک سے ابتدائی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے اور آٹھ تصویریں بھی ہیں۔ قیمت صرف ۱۲ر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اگست ۳۵ء

رجسٹرڈ نمبر ایل - ۱۰۹۲

جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ ڈی

قیمت سالانہ صہ مطبع جامعہ دہلی فی پرچہ ۵ر

نقش چغتائی

یعنی

عبدالرحمٰن چغتائی کا دوسرا کارنامہ

اس میں رنگین اور سادہ اُنیس تصاویر ہیں جو مرقع چغتائی سے الگ اور مختلف اشعار پر ہیں۔ کتاب کی تقطیع کسی قدر چھوٹی یعنی ۲۷×۱۷/۸ سائز کی ہے۔ کاغذ نفیس طباعت عمدہ، جلد مجلد لچکدار، ضخامت دو سو صفحات اور ہر صفحہ دو رنگ میں چھپا ہوا ہے۔

احباب کی خدمت میں یہ ایک اچھا تحفہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ قیمت صرف پانچ روپے۔

خطبات خالدہ خانم

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے، پی ایچ ڈی

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے وہ آٹھ خطبات جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مرکزی ہال میں تقریباً ایک ماہ تک دیئے۔ لائق خاتون کی تقریروں کا موضوع بھی بڑا دلچسپ تھا یعنی "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" یہ سب خطبات کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ جلد طلب کیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑیگا

قیمت اُردو صرف عہ، انگریزی سے ؍

اصول تعلیم

از

خواجہ غلام السیدین صاحب ایم، ایڈ

اُردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اب اچھے تعلیم یافتہ حضرات اس جانب متوجہ ہوگئے ہیں اور اسے خاص علمی مضامین کیلئے بھی اظہار خیال کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ خواجہ صاحب ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے پرنسپل ہیں اور اس لئے اس موضوع پر لکھنے کا پورا حق رکھتے ہیں کتاب اساتذہ اور تعلیمی طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہے اور ہر اسکول اور کالج کے کتب خانہ میں ضرور ہونی چاہیے۔ قیمت ۲؍

نیم شب (ڈراما)

از

جناب اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے

اس ڈرامے کا زمانہ ۱۹۵۰ء ہے مصنف نے یہ مان کر کہ اس وقت ہندوستان میں اشتراکیت کا زور ہوگا فنی حیثیت سے وہ جدوجہد، دشواریاں، مصائب کامیابیاں اور ناکامیاں دکھائی ہیں جو ہر بڑی تحریک کا خاصہ ہیں۔

قیمت صرف ۸ر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

قایم مقام ایڈیٹر:- محمد عاقل۔ایم۔اے

جلد ۲۴ | اگست ۱۹۳۵ء | نمبر ۸

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

فیڈریشن یا وفاق

اگر دو یا دو سے زیادہ ریاستیں اس طرح مل کر ایک نئی ریاست بنائیں کہ اُن کا وجود بھی قائم رہے اور اُن سے مل کر جو ریاست بنی ہے اُس میں ریاست کے تمام اوصاف موجود ہوں تو اُسے وفاق[۱] کہیں گے۔ اس تعریف کو سمجھنے کے لئے سیاسی اتحاد کی بعض اور صورتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

ایک صورت تو دو ریاستوں کے متحد ہونے کی یہ ہے کہ ریاستیں علیحدہ علیحدہ ہوں، لیکن اُن کا بادشاہ ایک ہی ہو۔ ۱۶۰۳ء میں اسکاٹلینڈ کا بادشاہ جیمس ششم انگلستان کا بادشاہ بھی ہوگیا۔ دونوں ریاستوں کا وجود علیحدہ علیحدہ قائم رہا۔ دونوں کے داخلی قانون میں فرق تھا، صرف بادشاہ کے ایک ہونے کے باعث خارجی حکمت عملی ایک تھی۔ یہ صورت ۱۷۰۷ء تک قائم رہی اُس کے بعد قانونِ[۲] اتحاد کی رو سے دونوں ریاستوں نے اپنی انفرادیت کو چھوڑ دیا اور ایک ریاست متحد ہوگئی ۱۶۰۳ء اور ۱۷۰۷ء کے درمیان انگلستان واسکاٹلینڈ کے اتحاد کو شخصی[۳] اتحاد کہا جائے گا۔ اسی قسم کا اتحاد ملکہ وکٹوریہ سے قبل موجودہ خاندان کی حکومت میں انگلستان و ہنوور کا تھا۔ ۱۷۰۷ء کے بعد انگلستان واسکاٹلینڈ کے اتحاد کو حقیقی[۴] اتحاد کہتے ہیں، اور اس کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً جنگ میں شکست کے بعد کوئی ملک کسی دوسری سلطنت سے ملحق ہوجائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ ریاستیں کسی خاص مقصد کے لئے متحد ہوجائیں۔ اُن کی جداگانہ حیثیت قائم رہے۔ لیکن اُس مشترک مقصد کے لئے وہ مشترک ادارے قائم کرلیں۔ ان اداروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ریاستوں کی سیادت قائم رہتی ہے، اور اگر وہ چاہیں تو ان مشترک اداروں کو توڑ سکتی ہیں۔ اس اتحاد کو اتحادِ جزوی[۵] کہیں گے اور یہ وفاق کی ادنیٰ صورت ہے۔

امریکہ میں ۱۷۸۱ء سے ۱۷۸۹ء تک، سوئٹزرلینڈ میں ۱۸۴۸ء تک اور جرمنی کی ریاستوں میں ۱۸۶۶ء تک

---

۱ FEDERATION ۲ ACT OF UNION ۳ PERSONAL UNION ۴ REAL UNION ۵ CONFEDERATION

اسی قسم کا اتحاد تھا۔

وفاق اتحاد کی ان تمام صورتوں سے مختلف ہے۔ وفاق میں شریک ہونے والی ریاستیں اپنی خود مختاری کا ایک بڑا جزو قربان کرتی ہیں۔ داخلی امور میں کسی قدر اختیارات کو محفوظ رکھ کر، باقی تمام اختیارات اُس جدید ادارہ[1] کو سپرد کر دیتی ہیں جو ان کے اتحاد سے پیدا ہوتا ہے اور جسے ان سب پر بلحاظ اختیارات و وسعت فوقیت حاصل ہوتی ہے اور جو ایک ریاست کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی وفاق میں ریاستوں کی انفرادیت کا کچھ حصہ محفوظ رہتا ہے اور کچھ حصہ آپس میں مدغم ہو کر ایک اعلیٰ ریاست کو تشکیل دیتا ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وفاق کی تشکیل بالکل متضاد طریقہ پر ہو، یعنی ایک مملکت پہلے مختلف حصوں میں منقسم ہو جائے اور پھر وفاق مرتب ہو، مثلاً برطانوی ہندوستان ایک وحدانی ریاست تھا، لیکن اس کے صوبوں کو خاص اختیارات دے کر ماتحت ریاستوں کی صورت دی گئی اور پھر وفاق قائم کیا جا رہا[2] ہے، یہی صورت کناڈا[3] اور جنوبی افریقہ[4] میں پیش آئی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فرق کچھ اہم نہیں ہے، نہ اس سے وفاق کی نوعیت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ اس لئے کہ وفاق کی تشکیل کے بعد ایسے اجزا کا موجود ہونا ضروری ہے جو بعض امور میں ایسے اختیارات رکھتے ہوں جن میں مرکزی حکومت باختیار خود مداخلت نہ کر سکے، اور اس طرح ان کی انفرادی حیثیت قائم ہو، اور اُن سے مل کر ایک ایسی ریاست بنے جس کے اختیارات چند دیگر امور میں ان تمام اجزا کی تمام وسعت میں تسلیم کئے جائیں اور جن سے قانوناً سرتابی ممکن نہ ہو۔ اتحاد جزوی میں شریک ہونے والی ریاستیں مشترک ادارے کے احکام سے قانوناً منحرف ہو سکتی ہیں، ان کی حیثیت شخصی حلیف کی ہوتی ہے اور وہ معاہدہ کو منقطع کر سکتی ہیں، اس کے علاوہ اتحاد جزوی میں مشترک مقاصد بہت محدود ہوتے ہیں، مثلاً کسٹمس[5] میں یگانگت یا فوجی اور دفاعی اتحاد، وفاق میں اس مشترک ادارہ کے اختیارات زیادہ وسیع ہوتے ہیں، عام طور پر کسٹمس،

[1] میرا عقیدہ ہے کہ ریاست ایک ادارہ ہے، لیکن یہاں اس کے فلسفہ پر بحث فضول ہے۔ [2] مسودہ قانون حکومت ہند جو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہے۔ [3] قانون برطانوی شمالی امریکہ ۱۸۶۷ء۔ [4] تجویز مورخہ ۹ر جون ۱۹۰۹ء منظور کردہ کیپ ہاؤس آف اسمبلی۔ [5] CUSTOMS درآمد و برآمد پر محصول۔

امور خارجہ، دفاع، تجارتی معاہدے، وسائل آمد و رفت، ڈاک، تار، اور اکثر ایسے امور جو تمام وفاق سے متعلق ہوں مرکز کی سپرد ہوتے ہیں، اتحاد جزوی میں مرکزی ادارہ کو سیادت حاصل نہیں ہوتی، اور وحدانیہ کو کامل سیادت حاصل ہوتی ہے، وفاق میں سیادت[1] اعلیٰ کا مسئلہ پیچیدہ ہے، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرکزی ادارہ کو، نیز مقامی اجزا کو ایسے حقوق حاصل ہوتے ہیں جنھیں سیادت کا جزو سمجھا جاسکتا ہو۔
یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وحدانی[2] ریاستوں میں بھی صوبوں اور مقامی اداروں کو بعض اختیارات حاصل ہوتے ہیں، لیکن ان اختیارات کی وسعت خواہ کسی وفاق کے اجزا سے زیادہ ہو، تاہم ان کی نوعیت میں فرق نمایاں ہے، وفاق کے اجزا کو جو اختیارات حاصل ہوئے ہیں وہ اُن کا حق ہیں اور اُن میں تبدیلی اُن کی یا اُس اعلیٰ قوت کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتی جو وفاق کی ضامن ہے، خواہ یہ اعلیٰ قوت قوم ہو یا کوئی بیرونی طاقت، اس کے مقابلہ میں وحدانی حکومت کو اقتدار کلی حاصل ہوتا ہے، وہ اپنی مرضی کے مطابق ماتحت اجزا کے اختیارات میں کمی اور اضافہ کرسکتی ہے، اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ کسی اختیار کو کلیتہً سلب کرلے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدانی و وفاقی حکومتوں کا فرق قانونی ہے، اور اُسی حد تک راسخ ہے جہاں تک قانون کی دسترس ہے، اگر سیادت اعلیٰ حقیقی کے نقطۂ نظر سے بحث کی جائے تو امتیازات مٹ جاتے ہیں، لیکن یہ دلیل درمیان میں لانی مفید نہیں ہے، اس لئے کہ اگرچہ سیادت حقیقی[3] تمام اداروں کی روح رواں ہے اور انھیں بناتی یا بگاڑتی رہتی ہے، تاہم اُس کا اظہار چند محسوس اداروں کے ذریعے سے ہوتا ہے، جن میں سب سے زیادہ اہم قانون ہے، اور اس لئے وفاقی و وحدانی حکومتوں میں امتیاز بہت اہم ہے، اس لئے کہ قانونِ اساسی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، خواہ اس کی حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

سیادت حقیقی ناقابل تقسیم ہے، غیر محسوس ہے، اور اس کا تعین دشوار ہے، لیکن سیادت قانونی[4]

---

[1] (SOVEREIGNTY) [2] (UNITARY)

[3] REAL SOVEREIGNTY [4] LEGAL SOVEREIGNTY

یعنی قانون بنانے کی قوت محسوس بھی ہے، متعین بھی ہے اور قابل تقسیم بھی ہے۔ لہٰذا وحدانی اور وفاقی حکومتوں کا فرق اس طرح واضح کرنا آسان ہوگا کہ وحدانی حکومتوں میں سیاوت قانونی صرف مرکز کو حاصل ہوتی ہے اور وفاق میں مرکز اور اجزائے وفاق پر منقسم ہوتی ہے، خواہ دونوں کے حصوں میں کتنا ہی تفاوت ہو۔

اگرچہ وفاق اور وحدانی حکومت کا اساسی فرق وہی ہے جو مندرجہ بالا سطور میں مذکور ہے، تاہم دنیا کی تمام وفاقی حکومتوں میں چند خصوصیات ہوتی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وفاق میں آئین اساسی[لے] کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بعض ممالک اب بھی ایسے ہیں جن میں آئین اساسی تحریر کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد بعض روایات پر قائم ہے، ان میں چند روایات ایسی ہیں جو تمام قانون کی بنیاد بن گئیں ہیں، مثلاً انگلستان میں آئین اساسی کسی جگہ لکھا ہوا نہیں ہے، تمام کام روایات سے چلتا ہے، صرف قانونی روایت یہ بن گئی ہے کہ پارلیمنٹ کو تمام اختیارات حاصل ہیں، چنانچہ مشہور مقولہ ہے کہ "پارلیمنٹ[ٹے] عورت کو مرد اور مرد کو عورت بنانے کے علاوہ تمام کام کرسکتی ہے" پارلیمنٹ کو خود اپنے حقوق بڑھانے اور گھٹانے کا حق حاصل ہے، اپنی ترکیب میں تبدیلیاں کرسکتی ہے، اور وہ جو قانون بھی منظور کرلے، قانوناً اس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ پارلیمنٹ میں بادشاہ بھی شامل ہے، اس لئے کہ بادشاہ کی منظوری تمام قوانین کو رائج کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس قسم کے آئین کے مقابلہ میں تحریری آئین ہوتے ہیں، تاکہ وہ تمام امور جو آئین اساسی کا جزو ہیں قلمبند ہو جائیں اور پھر اُن کے متعلق چون وچرا کی گنجائش نہ رہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں اب تحریری آئین کا رواج ہے۔

آئین اساسی کی صرف اسی نہج پر تقسیم نہیں ہوتی، بلکہ ایک اور صورت بھی ہے وہ یہ کہ آئین اساسی میں تبدیلی کیونکر ہوسکتی ہے۔ اگر آئین اساسی میں تبدیلی کا وہی طریقہ ہو جو کسی معمولی قانون بنانے کا ہے تو ایسے آئین اساسی کو ترمیم[عے] پذیر کہیں گے اور اگر اس میں تبدیلی کسی خاص طریقہ سے ہی ہوسکتی ہے جو

لے CONSTITUTION ٹے DE LLOME عے FLEXIBLE

معمولی قانون بنانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تو اسے استوار[1] کہیں گے ظاہر ہے کہ اُستوار سے استوار آئین بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس میں ترمیم نہ ہو سکتی ہو، لیکن فرق صرف طریقہ کا ہے۔ اگرچہ اُستوار آئین کو بھی بدلنے کا طریقہ آسان ہو سکتا ہے لیکن بالعموم طریقہ اس طرح وضع کیا جاتا ہے کہ آئین اساسی کی تبدیلی کسی فوری جذبہ کے ماتحت عجلت میں نہ ہو سکے۔

وفاق کا آئین مختلف ریاستوں میں سمجھوتہ کا نتیجہ ہوتا ہے، وہ اپنی سیادت قربان کرتی ہیں اُن کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اُن امور کے علاوہ جن کا مرکزی حکومت کے اختیار میں ہونا ناگزیر ہے اُن کے اختیارات قائم رہیں اور ان اختیارات کو اُن کی مرضی کے خلاف کسی عام جوش کے ماتحت نہ چھینا جائے، لہٰذا وفاقی حکومتوں کا آئین بالعموم تحریری بھی ہوتا ہے اور اُستوار بھی، ممکن ہے کہ آئندہ چل کر اختیارات کے متعلق جھگڑا ہو، ایسے موقع پر تحریری دستاویز میں شک وشبہ کو کم دخل ہوتا ہے ان ہی وجوہ کی بنا پر وفاقی حکومتوں میں آئین اساسی کو ایک مقدس میثاق کا درجہ حاصل ہوتا ہے، جس میں ترمیم عجلت کے ساتھ نہیں ہو سکتی اور جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وفاق ایک وحدانی ریاست کو تقسیم کرنے کے بعد وجود میں آیا ہے تو بھی تحریری واستوار آئین کی ضرورت باقی رہتی ہے اس لئے کہ وحدانی حکومت کو توڑ کر وفاق اُسی حالت میں قائم کیا جاتا ہے جب ملک میں ایسے اجزا موجود ہوں جو جداگانہ اختیارات چاہتے ہوں اور اُنھیں قائم رکھنا مقصود ہو۔

اس کے علاوہ وفاق میں عدالت[2] کو ایک خاص درجہ حاصل ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وفاقی حکومت کے لئے آزاد عدالت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ملک میں بیک وقت دو حکومتیں قائم ہیں اور ہر شہری دونوں کا ماتحت ہے تو بعض اوقات مشکلات کا پیش آنا ممکن ہے۔ ممکن ہے کہ کسی معاملہ کے متعلق مقامی وقومی حکومتوں میں اس امر پر نزاع ہو جائے کہ وہ کس کے ماتحت ہے؟ ممکن ہے کہ مرکزی یا مقامی مجلس آئین ساز ایسا قانون مرتب کرے جو دوسرے کے حقوق میں دست اندازی کرتا ہو۔

---

[1] (RIGID)

[2] (JUDICIARY)

ان حالات میں ایک ایسے آزاد ادارہ کی ضرورت ہے جو متنازعہ فیہ امور کا قانونی فیصلہ کر سکے۔ یہی سبب ہے کہ وفاقی حکومتوں میں عدالت کو ایک سیاسی اہمیت حاصل ہوتی ہے، عدالت وفاقی حکومتوں میں آئین کی پاسبان ہے۔ اُس کی دیانت اور آزادی پر حقوق و فرائض کی تفویض کا دارومدار ہے۔ لہذا اُسے تمام سیاسی اثرات سے آزاد رکھا جاتا ہے اور اُس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ جب تک ایک طاقتور عدالت قائم نہ ہو، وفاق کا وجود خطرہ میں رہتا ہے۔

تیسری خصوصیت مرکزی حکومت کی تشکیل سے متعلق ہے۔ عام طور پر مجالس آئین ساز کے دو ایوان ہوتے ہیں، ایک میں براہ راست[1] نمایندگی سے قوم کے نمایندے منتخب ہوتے ہیں جو آبادی کے لحاظ سے منتخب کئے جاتے ہیں، دوسرے ایوان میں ریاستوں یا صوبوں کے نمایندے ہوتے ہیں۔

وفاق میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ تقسیم اختیارات کا ہے۔ اس لئے کہ ہر وفاق میں شہریوں کو دو حکومتوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے، ایک تو مقامی حکومت اور دوسری مرکزی حکومت۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ دونوں حکومتوں کے اختیارات کو قانوناً بالکل واضح کر دیا جائے۔ عام طور پر ان کا تذکرہ آئین اساسی میں ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بعض اختیارات کی ایسی نوعیت ہے کہ وہ صرف مرکزی حکومت ہی کی سپرد ہو سکتے ہیں ورنہ وفاق بیکار ہے، ان میں سے بعض کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔

(۱) امور خارجہ تمام بین الاقوامی معاملات میں وفاق کی حیثیت ایک ریاست کی ہوتی ہے۔ لہذا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر جزوی[2] ریاست اپنے خارجی امور کو علیحدہ علیحدہ طے کرے۔ تاریخ میں کوئی ایسی

---

[1] یہاں براہ راست نمایندگی سے یہ مراد ہے کہ قوم نمایندوں کو بلا واسطہ منتخب کرتی ہے۔ اس میں ایوان انتخاب ELECTORAL COLLEGE کے طریقہ کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ عملاً اس طریقہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ قوم کے نمایندے ہوتے ہیں اداروں کے نہیں [2] جزوی ریاست کی اصطلاح اس مضمون میں اُن ریاستوں کے لئے استعمال ہوئی ہے جن سے وفاق مرتب ہوا ہے۔

مثال نہیں ہے کہ وفاق کی ریاستیں خارجی امور میں آزاد ہوں۔ اگر وفاق کلی نہ ہو، بلکہ جزوی ہو، تو بھی متعدد طریق کار کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی خارجی حکمت عملی میں اختلاف و انتشار پیدا نہ ہو۔ اس لئے امور خارجہ ہمیشہ مرکزی حکومت کی سپرد ہوتے ہیں۔

(۲) امور خارجہ سے ملحق مسئلہ دفاع کا ہے۔ لہٰذا بحری بری اور ہوائی افواج پر وفاق کو اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بغیر نہ یہ ممکن ہے کہ مرکزی حکومت بین الاقوامی امور میں اختیار و اقتدار کے ساتھ نمائندگی کرے، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ جزوی ریاستوں پر اپنا اقتدار قائم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وفاق کی ہستی ہی اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ مرکزی حکومت افواج پر قادر ہو اور جزوی ریاستوں کو بغاوت سے روک سکے اور غیر ممالک سے اگر جنگ کا موقع ہو تو پوری قوت کے ساتھ اُس میں شریک ہو سکے۔

(۳) ایسی خدمات جن کا تمام ملک سے تعلق ہے، مثلاً ڈاک، تار، ٹیلیفون وغیرہ۔ ان کو اگر جزوی ریاستوں یا صوبوں کے سپرد کر دیا جائے تو نظم و نسق میں دشواریاں پیدا ہوں گی اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کے ذریعہ سے مرکزی حکومت کو آمدنی ہوتی ہے جو ضروری کاموں پر خرچ کی جا سکتی ہے۔

(۴) امور تجارت جو تمام ملک سے متعلق ہوں، تجارتی قوانین، سکہ، اور اوزان کی یکسانیت سے اتحاد میں قوت پیدا ہوتی ہے اور تجارت میں آسانی، مفاد میں یگانگت قوم کے تمام اجزا کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیتی ہے۔ ایک بڑی ریاست منڈیوں کی تلاش، تجارتی مراعات کے حصول، تجارتی حقوق کے تحفظ، صنعت و حرفت کو ترقی دینے اور جدید وسائل پیدا کرنے میں ہمیشہ زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ اگر ان امور کو صوبوں یا جزوی ریاستوں پر چھوڑ دیا جائے تو یہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۵) امور تجارت کے ضمن میں بنک، وسائل آمد و رفت، سڑکیں، ریلیں، بحری، بری اور ہوائی راستوں کی نگرانی۔ اجارے، وغیرہ بھی آتے ہیں۔ اس میں حقوق تصنیف، ایجاد وغیرہ کی حفاظت شامل ہے

(۶) غیر ملکیوں کے حقوق کا تعین، شہری بننے کے قواعد۔ اقلیتوں کی حفاظت، آبادی سے متعلق دوسرے امور بھی عام طور پر مرکزی حکومت کے سپرد ہوتے ہیں۔ اس میں مذہبی رواداری بھی

شامل ہے ۔ یہ وہ امور ہیں جو عام طور پر مرکزی حکومت کی تحتی میں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ نہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ ہر وفاق میں تقسیم کی تفصیلات میں فرق ہوتا ہے۔ یہاں پر چند ایسے امور کا ذکر کیا گیا ہے جو تمام وفاقوں میں مشترک ہیں۔ ادنیٰ تامل سے ظاہر ہو جائے گا کہ یہ امور ایسے ہیں جن کا وفاق کے تمام رقبہ سے تعلق ہے ۔ جزوی ریاستوں اور صوبوں کے اختیارات کی فہرست بنانی بہت دشوار ہے۔ اس لئے کہ ان میں بہت تنوع ہوتا ہے ۔ عام طور پر ایسے امور ان کی سپرد ہوتے ہیں جو مقامی طور پر ہی بہتر انجام پا سکتے ہیں۔ ان میں تنوع کا سبب مقامی حالات میں اختلاف اور تاریخی اثرات ہیں۔ اگر وفاق ایسی صورت میں مرتب ہوا کہ جزوی ریاستوں کو اپنے حقوق سے دستبرداری گراں گزرتی تھی تو انھوں نے زیادہ سے زیادہ حقوق جو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھے جا سکتے تھے اپنے لئے محفوظ کر لئے۔ اگر وفاق کسی اعلیٰ قوت نے مرتب کیا تو صوبوں اور جزوی ریاستوں کے حقوق کو کم کر دیا۔

حقوق کے تعین کے باوجود ایک حلقہ ایسا رہ جاتا ہے جو اس تعین کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ انسان ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے ، جس وقت وفاق مرتب ہوتا ہے اس وقت زندگی کے بہت سے شعبے ظہور پذیر نہیں ہوتے اور بعد میں نمایاں ہوتے ہیں ، بہت سی صورتیں ایسی پیش آتی ہیں جو قانون وضع کرنے والوں کے ذہن میں نہیں تھیں ، ان کو اختیارات باقیہ[1] کہتے ہیں ۔ اکثر وفاق ان اختیارات کو جزوی ریاستوں یا صوبوں کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ بعض وفاق ایسے بھی ہیں جو انہیں مرکزی حکومت کی نگرانی میں رکھتے ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے ۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ان سے مسئلہ کا خاطر خواہ تصفیہ نہیں ہوتا ۔ کیونکہ یہ کون بتا سکتا ہے کہ آئندہ جو صورت پیش آئے گی اس کی کیا نوعیت ہوگی ؟ لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ اختیارات کی فہرست میں وقتاً فوقتاً ترمیم ہوتی رہے ۔ بعض ممالک میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ مرکزی اور مقامی حکومتوں کو بعض متعین اور بعض غیر متعین امور میں یکساں اختیار دے دئے گئے ہیں ، وہ اس امید پر کہ جب مناسب ہوگا آئندہ ظہور میں آتا رہے گا ۔ اگر کوئی مسئلہ محض مقامی نوعیت رکھتا ہو

---

[1] (RESIDUARY POWERS)

تو مرکز اُس میں دست اندازی نہیں کرے گا اور اگر اُس کی مرکزی حیثیت ہوئی جس کا ملک سے تعلق ہے تو مرکز اُس کے متعلق قانون وضع کرے گا۔ اس صورت میں دستورِ اساسی میں مذکور ہوتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر کوئی جزوی ریاست یا صوبہ کوئی قانون بنائے اور اُسی مسئلہ پر مرکز بھی کوئی قانون وضع کرے تو مرکزی قانون کو تفوق حاصل ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت در پردہ تمام اختیاراتِ باقیہ مرکز کی سپرد کر دیتی ہے۔

ایک زمانہ میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وفاق کے لئے ناگزیر ہے کہ حکومت کے عاملہ[1] مقننہ[2] اور عدالت کے فرائض میں ایسی راسخ اور سخت تقسیم ہو کہ ایک دوسرے کے کام میں مخل نہ ہو سکیں، بظاہر یہ طریقہ ناگزیر اور مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ صورت ممکن نہیں ہے، عاملہ کو ایسے احکام نافذ کرنے پڑتے ہیں جن کی حیثیت اس وقت قانون سے کم نہیں ہوتی۔ بسا اوقات بعض امور کا فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے جو عدالت کی خصوصیت ہے۔ پھر اگرچہ عاملہ خود قانون بنانے کا اختیار نہ رکھتا ہو، لیکن مقننہ اُس کی ہدایت اور مشورہ سے قانون سازی کا کام انجام دیتا ہے۔ مقننہ کے بعض قوانین وقتی امور کے لئے ہوتے ہیں اور عاملہ کے احکام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور بعض اوقات عدالت کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں، عدالت تو ظاہر ہے کہ ہر وقت قانون بناتی رہتی ہے اور اس کی نظیریں اور قانون کی تفسیر ہر ملک کے قانون میں ایک بہت اہم مرتبہ رکھتی ہیں[3]۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے فرائض میں کلی تقسیم ممکن ہی نہیں ہے۔ مانٹسکیو[4] کے اثر کے ماتحت ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ تجربہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ قانونی اعتبار سے یہ طریقہ اب تک قائم ہے لیکن عملی طور پر ٹوٹ چکا ہے، سیاسی جماعتوں کی قوت نے عاملہ اور مقننہ کی جدائی کو زائل کر دیا ہے۔ عدالت کی آزادی قائم ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا

---

[1] EXECUTIVE یعنی عامل حکومت جو قانون کو عملی جامہ پہناتے ہیں [2] LEGISLATURE) مجالس آئین ساز [3] JUDGE MADE LAW [4] MONTESQUIEU فرانسیسی فلسفی اور ماہر سیاسیات۔

کہ اُس کی قوتِ مقننہ دوسرے ممالک سے ذرہ برابر بھی کم ہے۔

وفاق کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے مفید ہوگا کہ اُن امور پر قدرے غور کیا جائے جو اس کے قیام میں معین ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان سے اس کی ضرورت اور فائدہ کا بہتر اندازہ ہو سکے گا۔ وفاق کے قیام کو مندرجہ ذیل اسباب سے تقویت پہونچتی ہے۔

(۱) جزوی ریاستوں کا ایک دوسرے سے ملحق ہونا، اگر ریاستیں دور ہوں تو ان میں اتحاد پیدا ہونا دشوار ہوتا ہے۔ اگر سب کی اراضی ایک ہی سلسلہ میں ہو تو اتحاد و یگانگت کے جذبات اور مفاد کی یگانگت بہت جلد پیدا ہو جاتی ہے۔ نظم ونسق میں آسانی ہوتی ہے۔ جغرافیائی قربت سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کسٹمس وسائل آمد و رفت و خبر رسانی، دفاع ہر چیز میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات جغرافیائی بُعد وفاق کے رستہ میں شدید مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کی ابتدائی سلطنت کے مختلف آزاد ریاستوں پر تقسیم ہو جانے کا سب سے بڑا سبب جغرافیائی بُعد تھا۔ سلطنت برطانیہ کی مختلف مستعمرات کا ایک وفاق میں شامل ہونا اسی وجہ سے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اب تک جتنے وفاق قائم ہوئے ہیں ان میں یہ جغرافیائی قربت موجود رہی ہے۔

(۲) محض جغرافیائی قربت دو ریاستوں کو اس پر مشکل سے آمادہ کر سکتی ہے کہ وہ اپنی آزادی سے دستبردار ہو جائیں، جب تک کہ وفاق کی اور وجوہ بھی موجود نہ ہوں۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم دفاع کی ضرورت ہے۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کو متحد ہونے پر جس چیز نے زیادہ راغب کیا وہ دفاع کا مسئلہ تھا۔ جزوی ریاستوں میں اتنی طاقت کہاں ہوتی ہے کہ وہ بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن جب وہ مل کر وفاق بنا لیتی ہیں تو ایک عظیم الشان سلطنت معرض ظہور میں آجاتی ہے جیسا کہ امریکہ میں ہوا یا کم از کم اُن کی طاقت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ سوئٹزرلینڈ میں ہوا۔ ہندوستان میں دفاع کی بہتر صلاحیت ہوگی اگر وہ متحد رہے، اگر ہر صوبہ خود مختار ہو جائے تو ظاہر ہے کہ یہ صلاحیت باقی نہ رہے گی۔

(۳) دفاع کے برابر ہی اہم اقتصادی و معاشی فوائد ہیں۔ تجارت کے ذیل میں بعض فوائد بیان

ہو چکے ہیں ، اگر جزوی ریاستیں علیحدہ علیحدہ رہیں تو سب کو محصول لینا پڑتا ہے لیکن اگر وہ متحد ہو جائیں تو ایک ہی جگہ محصول لیا جاتا ہے اور تجارت کو اس سے ترقی ہوتی ہے ، اور بہت سے فوائد جو پہلے مذکور ہو چکے ہیں رونما ہوتے ہیں . بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ محض اقتصادی مفاد جزوی ریاستوں کو ملانے میں کامیاب ہوئے ہیں ، جرمنی کی ریاستوں میں پہلے محاصل کے متعلق ہی اتحاد قایم ہوا تھا ، یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ مشرقی یورپ میں بہت سی ریاستوں کے قیام نے اقتصادی و معاشی زندگی کو نقصان پہونچایا ہے ،

(۴) سیاسی مقاصد جس طرح ریاستوں کے متحد ہونے سے دفاع میں آسانی ہوتی ہو اسی طرح آبادی ، رقبہ ، آمدنی اور ذرائع کے جمع ہونے سے وفاق کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے ، بین الاقوامی امور میں اُس کی آواز کو وقعت حاصل ہوتی ہے ، اور دوسری اقوام میں اُس کی عزت بڑھتی ہے . یہ صورت جزوی ریاستوں کو حاصل نہیں ہو سکتی .

(۵) نسلی امتیازات کو وفاق کے قایم کرنے میں کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے ، مثلاً امریکہ کو اس وجہ سے آسانی ہوئی کہ اُس کی حکمراں قوم بیشتر ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی تھی ، ایک نسل کی آبادی کی روایات ، مطمح نظر ، طریق زندگی ، جذبات اور خصوصیات میں یگانگت ہوتی ہے ، لہٰذا اگرچہ جزوی ریاستوں میں ایک ہی نسل کی آبادی ہو تو وہ اتحاد و وفاق کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے .

نسلی امتیاز بعض اوقات وحدانی مملکتوں کو وفاقی صورت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے ، مثلاً کناڈا کی حکومت وحدانی تھی ، وہاں کی آبادی میں اینگلو سیکسن نارڈک[۱] اور فرانسیسی لاطینی[۲] شامل تھے ، ان میں بغض و عداوت کے جذبات موجود تھے ، جن میں ہر روز ترقی ہوتی جاتی تھی ، لہٰذا کناڈا کو فرانسیسی اور انگریز صوبوں پر تقسیم کر کے وفاق قایم کر دینے سے یہ عداوت کم ہو گئی اور اب ان میں اتحاد کے جذبات ترقی پذیر ہیں . اسی طرح جنوبی افریقہ میں ولندیزوں اور انگریز بیگانگی محسوس کرتے تھے ، جسے وفاق

---

[۱] ANGLO SAXON NORDICS [۲] FRENCH LATINS

نے بہت کم کر دیا ہے اور نفاق کی جگہ اتحاد پیدا کر دیا ہے۔

(۶) زبان، ادب اور تمدن[1]۔ نسل کا امتیاز اس قدر نمایاں پیز نہیں ہے، لیکن زبان کا فرق بہت اہم ہے۔ اگر دو آدمیوں کی زبان مختلف ہو تو اُن میں بیگانگی قائم رہتی ہے اور یگانگت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس لئے کہ یگانگت تو تبادلۂ خیالات و یکسانئ جذبات سے پیدا ہوتی ہے اور زبان کے امتیاز سے ان کا پیدا ہونا دشوار ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو اپنی زبان سے ایسی الفت ہوتی ہے کہ وہ اُسے چھوڑنے پر کبھی راضی نہیں ہوتا، اور زبان ہی پر کیا موقوف ہے؛ وہ لطیف چیز جسے تمدن کہتے ہیں ہر انسان کو عزیز ہوتی ہے اور ہر قوم کا تمدن دوسری قوم سے مختلف ہوتا ہے۔ ادب، فنون لطیفہ، علوم اور رجحانات سے تمدن پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمدن ہر قوم کی عمر بھر کی کمائی ہے اور اُسے چھوڑنے پر کوئی قوم تیار نہیں ہو سکتی، اگر وہ تیار ہو جائے تو وہ خودکشی پر آمادہ ہے۔ لہٰذا زبان و تمدن کا اختلاف بھی وہی حکم رکھتا ہے جو نسلی اختلاف رکھتا ہے۔ یہی سبب ہو کہ جہاں کہیں بھی ایسی اقوام میں وفاق قائم ہوا جہاں مختلف قوموں کی مختلف زبانیں تھیں اور ان کے تمدن میں فرق تھا، وہاں تمام زبانوں کو تسلیم کیا گیا ہے اور انھیں یکساں درجہ دیا گیا ہے مثلاً سوئٹزرلینڈ میں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی، کناڈا میں انگریزی و فرانسیسی، جنوبی افریقہ میں ڈانڈیزی اور انگریزی سرکاری زبانیں ہیں۔

(۷) مذہب کی یگانگت سے وفاق کی تعمیر میں بہت مدد ملتی ہے۔ اور مذہب کا اختلاف جزوی ریاستوں کو متحد ہونے سے روکتا ہے۔ اگرچہ مذہب کو موجودہ سیاست میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو پہلے تھی، لیکن یہ تصور کرنا غلط ہوگا کہ مذہب کا اثر سیاست سے بالکل زائل ہو چکا ہے، مذہبی اختلاف اب بھی سیاسی اتحاد کے راستے میں حائل ہوتے ہیں، بالخصوص اگر مذہب کے ساتھ ساتھ نسلی، یا زبان و تمدن کی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں تو مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے، وحدانی سلطنت میں یہ زیادہ نمایاں ہوتی ہیں، لیکن وفاق میں بھی اکثر جغرافیائی بُعد بھی شامل نہ ہو تو دقتوں میں کمی نہیں

---

[1] اس مضمون میں تمدن کو CULTURE کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

واقع ہوتی۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جہاں اس قسم کی دشواریاں ہوں وہاں وفاق سے ہی مسئلہ کسی حد تک حل ہو سکتا ہے۔ بالخصوص اگر ان اختلافات کو جغرافیائی حدود میں مقید رکھنا ممکن ہو تو کامیابی کی زیادہ امید ہو سکتی ہے۔

(۸) بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی سلطنت ایسی نوآبادیاں قائم کرے جو ایک دوسرے سے متحد نہ ہوں اور یکساں طور پر اُس سلطنت کی ماتحت ہوں۔ اگر ان میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ سلطنت کا تفوق کم کرنا ضروری ہے تو اُس کی مخالفت ان کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، جیسا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہوا۔

اختلافات و یگانگت کی مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا ہو گا کہ جہاں کامل اتحاد دشوار ہو اور وحدانی سلطنت کا قیام یا وجود مشکل ہو، وہاں وفاق سے دشواریاں دور ہونے کا امکان ہوتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وفاق کی بنیا د اکثر اختلاف پر ہوتی ہے، جہاں اتحاد میں فائدہ نظر آتا ہے لیکن اپنے وجود کو قربان کرنا ممکن نہیں ہوتا وہاں وفاق کا طریقہ کارگر ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ وفاق کے قیام کے بعد یگانگت کی طرف قدم تیزی سے بڑھتا ہے اور ساتھ رہنے اور مشترک مفاد کی حفاظت اور مشترک دشواریوں کو حل کرنے کی ساعی مختلف اجزا میں اعتماد و محبت پیدا کرتی ہے، باہمی شبہات کا ازالہ ہوتا ہے اور رشتہ مؤدت مضبوط ہوتے ہوتے قوم کی ہستی و یگانگت کو ایک حقیقت بنا دیتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ایک مرکز پر لانا آسان نہ تھا، لیکن آج امریکن قوم کسی طرح بھی وفاق کو توڑنے پر راضی نہ ہو گی اور جزوی ریاستوں کے وجود سے امریکن قوم کے تصور میں کسی قسم کا فرق نہیں آتا۔ اس طرح سوئٹزرلینڈ میں مذہب، زبان، اور نسل کے امتیازات موجود ہیں لیکن وفاق نے تمام اجزا کو قومیت کے مضبوط رشتہ میں منسلک کر دیا ہے اور اب یہ رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ فرانسیسی بولنے والے سوئس فرانس کے تابع ہو کر رہنا پسند نہیں کریں گے، نہ جرمن اور اطالوی اجزا جرمنی یا اطالیہ کے ماتحت رہنا پسند کریں گے۔ اس وقت تک تو ایسا ہی ہوا ہے کہ وفاق نے بتدریج قومیت کے احساس کو ترقی دی ہے اور اُسے زیادہ مضبوط بنایا ہے۔

وفاق پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ طریق حکومت کمزور ہے۔ اختیارات کی تقسیم سے حکومت کو وہ مرکزیت و برتری حاصل نہیں رہ سکتی۔ جو وحدانی مملکتوں میں حاصل ہوتی ہے۔ اور اس وجہ سے حکومت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور موثر طریقہ پر کام نہیں کر سکتی۔ یہ الزام درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ اگر اس الزام کا منشا یہ ہے کہ قومی وجود خطرہ میں ہوتا ہے اور وفاق کے ٹوٹنے اور جزوی ریاستوں کے آزاد ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا اب تک نہیں ہوا ہے اور نہ وفاق میں ایسا ہونے کا وحدانی حکومت سے زیادہ امکان ہے، اس لئے کہ وہ طاقت جو مملکت کو تخریب سے بچاتی ہے وفاق میں بھی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تخریب کا امکان وحدانی حکومت میں زیادہ ہے۔ اس لئے کہ وہاں اگر کسی فریق کو بے اطمینانی ہو تو اُسے رفع کرنا زیادہ دشوار ہے۔ وفاق میں اتنا دشوار نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کمزوری کے یہ معنی ہیں کہ حکومت اپنے فرائض انجام دینے میں قاصر رہتی ہے تو یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ ایسا تو کہیں نہیں ہوتا کہ تمام امور مرکزی حکومت ہی انجام دے۔ وحدانی حکومتیں بھی مقامی اداروں کو اختیارات تفویض کرتی ہیں۔ لہٰذا اختیارات کے تعین سے کمزوری کا پیدا ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔

پند نامہ شغلی دکھنی

اردو ادب کے بہت کچھ جواہر پارے انجمن ترقی اردو کی بدولت تباہی سے بچ گئے اور اکثر انمول موتی اب بھی ہماری توجہ کے محتاج ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ پند نامہ ہے جس کے مصنف نے خود کو شغلی کہا ہے۔ شغلی کے متعلق اردو شعرا کے تمام تذکرے خاموش ہیں، دکھنی ادبیات کے ذخیرہ کے مطالعہ سے صرف چند اشعار ایسے ملتے ہیں جو شغلی کے بتائے جاتے ہیں، اس پند نامہ میں ۱۰۵ اشعار ہیں لہذا یہ شغلی کے کلام کا مستقل نمونہ کہا جا سکتا ہے، ان ۱۰۵ اشعار میں سے صرف ۱۰۳ ملتے ہیں شاید دو شعر ضائع ہو گئے،

شغلی کے متعلق میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ وہ نصرتی کا ہمعصر تھا یا فوراً اس کے بعد پیدا ہوا، کیونکہ یہ پند نامہ نصرتی کی مشہور مثنوی گلشن عشق کے ساتھ ہی شامل ہے گلشن عشق کا یہ قلمی نسخہ (جس کے لئے میں نواب حبیب الرحمن صاحب شروانی (صدر یار جنگ بہادر) کا مشکور ہوں) ۱۰۶۸ھ میں تصنیف ہوا اور ۱۱۶۰ھ میں اس کی کتابت ہوئی اس سے یہ امر یقینی ہے کہ یہ ۱۱۶۰ھ سے قبل کی تصنیف ہے لیکن صحیح تاریخ کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کسی فارسی پند نامہ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔

سو اس وجہ تھی فارسی میں کتاب ۔۔۔ سو شغلی دکھن سال؟ کیتا شتاب

سبب کیا جو کوئی معنی فارسی ۔۔۔ نپا تا سو پا دے کیا آرسی

لیکن اس کے متعلق باوجود کوشش کے زیادہ معلومات نہ مل سکیں، اس سلسلہ میں پنجاب کے اکثر کتب خانے دیکھے، رامپور کے کتب خانہ میں بھی معلوم کیا، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ دفتر دیوانی سرکار نظام میں بھی جستجو کی۔ ان مقامات میں آصفیہ سے تین غیر مطبوعہ قلمی تذکرے ملے ایک تذکرہ دفتر دیوانی سے ملا کسی فرصت میں انشاء اللہ ان پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے گی شغلی کے

متعلق میری کوششیں جاری ہیں۔ اگر میں نہ کر سکا تو ممکن ہے کہ یہ سعادت کسی دوسرے کے حصہ میں ہو۔

اس سلسلہ میں ایک "ذات" کا شکریہ ضروری سمجھتا ہوں جس سے مجھے اپنے کام میں بہت کچھ مدد مل جاتی ہے، یہ غائبانہ شکریہ میرا فرض تھا۔ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں مل سکی، بہر حال۔

ع حساب دوستاں در دل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پند نامہ

کہ یک دن محمد علیہ السلام ۔۔۔ لیے اصحاب بیٹھے مدینہ تمام

تہاں یک شخص آ نبی کوں سلام ۔۔۔ کیا ہور کہن لاگیا یوں کلام ۔۔۔ ۱۔ اس جگہ ۲۔ کو ۳۔ اور ۴۔ کہنے لگا

جو میں آیا ہوں تمن قدم کن ۔۔۔ کہ شہ یمن تے نصیحت سکن ۔۔۔ ۱۔ آیا ۲۔ تمہارے ۳۔ پاس ۴۔ سے ۵۔ سیکھنے

تمیں منجھ نصیحت کے دیو عقل ۔۔۔ تو تس پر حکم میں کروں گا عمل ۔۔۔ ۱۔ تم ۲۔ مجھے ۳۔ یعنی تس حکم پر میں عمل کروں گا

سو یو بات سن کر نبی یوں کہے ۔۔۔ تیرا بول مقصود جہاں لگ اچھے ۔۔۔ ۱۔ جس قدر ۲۔ ہے

تو تب وہیں ادا اصحاب کینا سلام ۔۔۔ نبی سوں ہو ایسے کے یوں ہم کلام ۔۔۔ ۱۔ کیا ۲۔ سے

جو میرا ارادہ ہے یوں دل منے ۔۔۔ جو طاعت کروں رب کی تل تل منے ۔۔۔ ۱۔ میں ۲۔ تل تل منے، گھڑی گھڑی، ہمیشہ،

جو کرتا اچھوں بندگی میں سدا ۔۔۔ کدھی بھی نہ طاعت سوں ہوؤں جدا ۔۔۔ ۱۔ رہوں ۲۔ کسی وقت۔

کیا بات و اصحاب اسدبات جب　　سو سنکر نبی یوں کہے بات تب　　۱؎ اس طرح

جو اوّل ہو کے پاک وضو توں ساز　　جماعت سوں پنج وقت کرتوں نماز　　۱؎ تو

اگر تو امر رب کا سر پر لیا　　گویا کے شب و روز طاعت کیا　　۱؎ بہ

او اصحاب نے یو سنیا بات جب　　بجے دوسرا کیا سوال اسد ھات جب　　۱؎　　۲؎ دوسرا

جو ہیں ہو بھلا اس خلق ہیں رہوں　　کریں سب قبول بات جو ہیں کہوں

سو یو بات سن کر نبی یوں کہے　　اگرچہ خدا ترس ہو توں رہے

تو ہوے گا خلق دوست تیرا تمام　　اتو ہیں پھرے گا تو ہو کر امام　　۱؎ سب

سو یو بات سنیا تا چہ سیوم سوال　　کیا پھر و اصحاب یوں حال حال

کشادہ ہووے دل جو منجہ تنگ ہے　　ہووے موم سال جو منج سنگ ہے　　۱؎ ۲؎ ر میرا

سو اسو جہ اد شخص کیتا بیان　　سو اس کے نبی نے کئے یوں نشان

جو کچھ بات تج دل میں آوے اگر　　تو نا بھول ربنوں سدا یاد کر

تو تب جا تیرا دل ہوئے گا کشاد　　بہت تس پر بہوت ہوئے گا شاد شاد

سو یو بات سن دیں و اصحاب نے　　کیا سوال پھر دیں محمد کنے　　۱؎ کے پاس

صادق یا محمد علیہ السلام　　بڑا ہے جو مقصود میرا تمام

جو میرا ارادہ اہے یو اصل　　رہوں ہو حضوری خدا کی اگل　　آگے

سو یو بات سنکر نبی نے شتاب　　دئے سوال کا اسکوں یوں کر جواب

ہے سگتا حضوری توں ہونی اگر　　تو قرآں تلاوت شب و روز کر

بہت یو سوال کیتا نبی کے سنگات　　کہ اے یا خدا کے رسول پاک ذات　　۱؎ ساتھ

میں ڈرتا ہوں رب سوں بہوت کل آج　　سو یو بات کا سے کہو کیا علاج　　۱؎ بہت

نبی یوں کہے تب اے بندہ خدا　　شب و روز کر یاد رب کوں سدا

ظاہر ہو۔ باطن خدا یاد کر　　تو ہووے گا تب دوست مقبول تر

بھے یو سوال نبی کے کیتا اگل ۔۔ جو ہوؤں میں عاقل خلق سوں سگل ۱ آگے سامنے ۲ سب ۳ نیز
نبی یوں کہے یاد کر موت کوں ۔۔ تو عاقل ہووے گا ہمہ خلق سوں
کیا سوال یہ یوں نبی کے اگل ۔۔ جو پاؤں میں ایمان پیسرا اگل
سو یو بات سن کر نبی یوں کہن ۔۔ کہے اس شخص کے نشاں یوں کرن
جو ہنس کمہ ہووے گا خلق سات جب ۔۔ کرے گا سگل سوں میٹھی بات تب
تو تب تجکو ایمان ہووے گا تمام ۔۔ کہ رحمت عطا ہووے گی صبح و شام
بھے یو سوال کیتا میں آگناہ ۔۔ ہووے دن بدن کم لگوں نیک راہ ۱ کیا ۲ گناہ
نبی تب دے اسکوں یوں کر جواب ۔۔ جو توبہ کیا کر سدا بے حساب
کیا سوال پھر یوں سوں اصحاب ۔۔ جو مجکوں نہ ہووے قبر کا عذاب
سو اسکوں نبی جواب یوں کر دتے ۔۔ جو مسکیں غریباں فقیراں جتے ۱ جتنے ، جس قدر
اہے سو اُنن پہ تو ہو مہربان ۔۔ نہ آزار دے اُن اُپر کر آسان ۱ اُن
تو تجکوں اُنن کی دعا سوں ثواب ۔۔ ہوے گا نہوے ؟ قبر کا عذاب
کہیا او شخص پھر کے اے یا رسول ۔۔ جو میری دعا ہوئے ہر دم قبول
دے جواب یوں خاتم الانبیاء ۔۔ جو تجکوں اہے جیو جنے دیا ۱ جان ۲ جس نے
سو اس پاس منگ تو دعا مستجاب ۔۔ ہووے گا ہر کام تیرا شتاب ۱ مانگ
کیا سوال پھر کر او درحال ویں ۔۔ جو ننگا رہوں تا قیامت کہ نئیں ؟
جو سُن کر اُٹھے یوں محمد نے بول ۔۔ جو توں مومناں کا نکو عیب کھول ۱ نہیں
کسی کا یہاں میل نا دھوے گا ۔۔ قیامت کوں نا پھر ننگا ہوے گا
کیا سوال پھر یوں نبی کے اگل ۔۔ قیامت نہ ہو جائے مجہ پہ سگل ۱ دشوار
سبب کیا جو ہوے گا برا او وقت ۔۔ سو او وقت سب پہ کہلے گا سخت ۱ بیتے گا ، گذرے گا
تو اس وقت پر میں عرش کے تلار ۔۔ رہوں چھاؤں تل کچھ نہ دیکھوں ازار ۱ تلے ، نیچے ۲ تلے ۳ آزار

سو یو نقل جب اوشخص نے کیا　　سو تسکوں دئے جواب یوں نبیا
اگر کوئی دواپ میں کریں جنگ جدل　　لڑے تو صلح کر خدا کے بدل
یوں کرتا رہے گا صلح تو سدا　　تو تج عرش تل چھاؤں دیگا خدا
نبی کی زبانی سنیا بات یوں　　بہے پھر سوال کیتا نبی سات یوں
جو اعمال نامہ سفید دھائے کر　　رہے داہنی؟ بات مج آئے کر　　۱ داہنا سیدھا
نبی نے دئے جواب اسدہا سوں　　جو ماور پدر کوں خوشی راکھ توں
تو تب جا او اعمال نامہ نچھل　　سیدی بات پر آرہے گا سگل
کیا سوال پھر بدوں وا اصحاب نے　　نبی کے آن کے روبرو سامنے
جو دنیا سے ہو وے میرا دل سرد　　بہے تسپر ہمیشہ اچھوں پر درد　　۱ رہوں
نبی نے دئے جواب اسدھات سوں　　سدا دیکھتا اچھ گورستاں توں
تو تب دل دنیا سوں سرد ہویگا　　بہوت موم دل پر درد ہوے گا
کیا سوال پھر کر جو مجکوں اتال　　جو ہونا شفاعت تمارا کمال　　۱ حاصل ۲ تمہارا
دئے جواب یوں کر نبی پاک ذات　　کہے یوں وا اصحاب سات بات
جو رانڈاں یتیماں، امیراں، گدا　　اہے سوانن پر رحم کر سوا
تو تب جا شفاعت تجھے ہوے گا　　انن کا درد دکھ اگر کھوے گا
یو سنکرا واصحاب نے سوال یوں　　کیا پھر نبی سات در حال دوں
جو آئے روز محشر کوں دیدار میں؟　　خدا دیکھے کا امیدوار ہیں
سو سن کر نبی جواب یوں کر دئے　　نصیحت وا اصحاب کوں یو کئے
جو ہمسائیگاں پر کرم کی نظر　　کیا کر توں احسان انن کے اپر
تو تب کیئں قیامت کوں دیدار توں　　دیکھے گا اگر ہے بڑا پکار تو
کیا سوال پھر یوں کہ اے پاک تن　　کہ دونوں جہاں میں رہوں میں امن

دے جواب یوں کر نبی نے بیاں ۔ جو مت بول، قید کر توں زباں
اگر بد زبان تلوں ۔ کیسے نا کہے ۔ تو ہر دو جہاں میں امن تے رہے
کیا سوال پھر یوں کہ اے یا رسول ۔ جو تو یہ پڑے رب کینے منبع قبول (١؎ مسری ۲؎ مجھ)
نبی نے دئے جواب سدھات سات ۔ کہ یوں واصحاب کے سات بات
جو توں اپنے نفس پر قہر کر ۔ ہمیشہ خدائے تعالیٰ سوں ڈر
نین میں انجھو لیا کے روز ار زار ۔ تو تو ہر سوں تج کرے گا غفار (١؎ آنکھ ٢؎ آنسو ٣؎ لاکر)
کیا سوال پھر یوں کہے پاک تن ۔ جو ہوئے نہ مرنے میں منجہ جان کندن
نبی یوں کہے پھر واصحاب سوں ۔ جو جا پوچھ ہے ایک بیمار کوں
شہ ایک ہوئے کا مرد میں تو آن کر ۔ تو نا ہوئے گی جان کندن تج اپر
نبی سوں ہوا پھر کہ یوں ہم کلام ۔ جو میرا ہوئے دوست عالم تمام
دئے جواب پھر یوں نبی تاجدار ۔ جو بد کام سوں توں ہو پرہیزگار
کبھی نابول توں جھوٹ نقصان ہے ۔ عمل نیک کر کچھ کہ انسان ہے
تو تب کئیں خلق دوست ہوئیگا تمام ۔ جو ان میں رہے گا تو ہو نیک نام
سو یو بات سن کر نبی کے اکل ۔ کہن لاگیا یوں بیان کر سگل
جو مجکوں دیکھے غضب سوں خدا ۔ رکھے اپنے رحم میں رب سدا
سو یو بات سن کر نبی یوں کہے ۔ اگر غضب سوں رب کے ڈرتا ہے
تو طاعت عبادت کیا کر سدا ۔ تجھے غضب ناپھر کرے گا خدا
سو یو بات سن کر کیا دیں اسلام ۔ نبی سوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام
جو میں آب کوثر کا پیتا رہوں ۔ عمر ہوا بد نک بن جیتا رہوں (١؎ تلک - تک)
کہے یوں محمد علیہ السلام ۔ دے پیاسے کوں پانی بھوکے کوں طعام
تو تب آب کوثر کا ہوئے گا عطا ۔ عمر ہو بجے گا سدا بے خطا

بہے لیو۔ از نبی نے دئے یوں جواب — کہ واللہ اعلم بالصواب
امت کوں محمد علیہ السلام — نصیحت کئے پند نامہ تمام
سو یو پند نامہ سنے تو ثواب — ہے اتنا جو ہوئے نکوئی[1] عذاب
اگر کوئی دیکھے اسے بھر نظر — تو گویا نبی کوں آ[2] و دیکھا بشر
اگر کوئی اسکوں پڑے گا تمام — کہ دوزخ کی ہے آنچ اسکوں حرام
اگر کوئی اس پر کرے گا عمل — سو او ہوے گا خاص بندہ اصل
سو اس وجہ تھی فارسی ہیں کتاب — سو شغلی دکھن سال کیتا شتاب
سبب کیا جو کوئی معنی فارسی — نپاتا سو یا دے کیا آرسی[3]
ہوئے ایک سو پانچ بیتاں تمام — زصدق محمد علیہ السلام

[1] نہ کوئی
[2] وو
[3] صاف۔ ظاہر

محکومیتِ نسواں

عورتوں کے ساتھ مساوات کے سوال میں ایک بات اور مضمر ہے جس کا میں آسانی کے ساتھ دوسروں کو قائل کر سکتا ہوں۔ میرا قول یہ ہے کہ چونکہ دنیا میں لوگ عورت کو خانگی فضا میں قید رکھنا چاہتے ہیں اسی لئے ان کو زندگی کے کسی شعبہ میں قدم رکھنے نہیں دیتے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس زمانہ میں جبکہ سیاسی خیالات اس قدر اشاعت پا رہے ہیں اور معاشیات کا چرچا جزو سیاست ہو رہا ہے، شاید ہی کوئی ایسا ہوتا جو دنیا کی نصف آبادی کو اکثر اقسام کی پیشہ وری اور تقریباً تمامی اعلیٰ معاشرتی فائدوں سے محروم رکھنا گوارا کرتا، اور یہ جائز رکھتا کہ جو کاروبار احمق سے احمق یا ادنیٰ سے ادنیٰ مرد کے لئے ہنر ہو سکتا ہے وہ لایق سے لائق عورت کے لئے عیب قرار دیا جائے، اور مرد کے لئے صرف اس لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ وہ عورت کا حاکم بنا رہے۔ دو صدی پیشتر تو عورت کی نا اہلیت ثابت کرنے کے لئے صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے نا اہل مانی جاتی رہی ہے۔ کیونکہ اس وقت تک یہ بات بھی پیش نہیں کی گئی تھی کہ عورت کا ذہن مرد کے ذہن کے برابر نہیں ہے۔ اب بالآخر یہ حیلہ پیدا کیا گیا ہے کہ عورت کو مرد کے برابر درجہ دینا سوسائٹی کے مفاد کے خلاف ہے۔ (یا یوں کہئے کہ مرد کے مفاد کے خلاف ہے!) اور یہ بالکل وہی صورت ہے جیسے حکومت کے بے پایاں اختیارات کے خلاف جب کوئی آواز بلند کی جاتی ہے تو اقتدار پسند اور حکومت پرست لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ایسی تحریک مفاد سلطنت اور سیاسی مصلحت کے خلاف ہے اور اس طرح حکومت والوں کے لئے شدید سے شدید افعال و اعمال بھی جائز ہو جاتے ہیں۔ یہ زمانہ تو وہ ہے کہ قوت جہاں کہیں کام کرتی ہے میٹھی چھری بن کر کام کرتی ہے۔ اور جب کبھی انداز ظلم اختیار کرتی ہے تو یہی پکار رہی جاتی ہے کہ میں انصاف اور بہبودی کی دیوی ہوں۔ عورت کے لئے جب کوئی چیز حرام قرار دی جاتی ہے تو کہا بھی جاتا ہے کہ اس چیز کو اس کے لئے جائز کرنا خود اس کی زندگی تباہ کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو لوگ اس طرز تقریر کے عادی ہیں وہ تجربہ کی روشنی

ہیں کوئی استدلال پیش کریں۔ اگر یہی بات ہے کہ عورتیں فی الجملہ مردوں کے مقابلہ میں ہر کام کے لئے نااہل ثابت ہوئی ہیں تو آیندہ بھی جب مرد کے بالمقابل آئیں گی ناکام رہیں گی۔ اور جس شعبۂ زندگی میں ناکام رہیں گی اُس میں قدرتاً اُن کی تعداد از خود کم ہوجائے گی۔ اس میں سوسائٹی کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ اور تجربہ کی رو سے یہ ماننا ہوگا کہ احمق سے احمق اور کمزور سے کمزور مرد ذی فہم اور توانا عورت کے مقابلہ میں سوسائٹی کے مفاد کے لحاظ سے فی الجملہ قابل ترجیح نہیں مانا جاسکتا۔ مقابلہ ہی وہ چیز ہے جس میں اہل اور نااہل کی تمیز ہر نقطۂ نظر سے ہوسکتی ہے۔ جو لوگ عورتوں کی مخالفت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اُن کو بھی اس زمانہ میں ماننا پڑے گا کہ خاص کر آج کل عورتوں نے جو بھی کام انجام دئے ہیں اُن میں واقعی وہ مردوں سے کسی طرح کم نہیں رہیں۔ گو یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ بعض کاموں میں وہ ماہرین کا مقابلہ نہیں کرسکتیں لیکن ان کی یہ کمی بالعموم کسی ذہنی کمزوری کی وجہ سے نہ تھی۔ یہ بات دوسری ہے کہ اُنھیں وہ آسانیاں نہ حاصل ہوئی ہوں جو مردوں کے لئے عام طور پر موجود ہیں۔ کیا یہ ظلم نہیں؟ اور کیا خود یہی امر سوسائٹی کے مفاد کے خلاف نہیں کہ عورتوں کو مردوں کے مدمقابل بن کر میدان عمل میں آنے سے طرح طرح سے روکا جاتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ بہت سے ناکارہ مرد دنیا میں اس وجہ سے منتخب ہوگئے ہیں کہ اُن سے بہتر عورتیں اُن کے مقابلہ میں نہیں آنے دی گئیں؟ سوسائٹی کا کیا اسی میں فائدہ ہے کہ لائق اور نالائق میں تمیز نہ کی جائے؟ کیا منصفانہ مقابلہ اسی کا نام ہے؟ کیا اعلیٰ ذمہ داریوں کو اپنے سر پر لینے کے لئے دنیا میں اتنے مرد نکل آئے ہیں کہ لیاقت اور نالائقی کا سوال ہی دنیا سے ناپید ہو رہا ہے؟ کیا مردوں کی صلاحیت پر ہم کو اس قدر عقیدہ رکھنا زیبا ہے کہ ہم اپنی نصف آبادی کو کار دنیا انجام دینے میں بالکل فراموش کردیں اگرچہ اُس نصف آبادی سے ہم کو لایق سے لائق افراد کے ملنے کی توقع ہوسکتی ہے؟ مقتضائے انصاف کیا ہے اور منفعت خلق کا امکان کس صورت میں زیادہ ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ کسی گروہ پر یہ پابندیاں عاید کرنا کہ اُس کے افراد مثلاً طبیب نہ بن سکیں یا وکالت نہ کرسکیں یا قانون سازوں میں شامل نہ کئے جائیں یہ فقط اُن ہی کے ساتھ ناانصافی نہیں بلکہ اُن لوگوں کی بھی حق تلفی ہے جنھیں اطبا یا وکیلوں کی ضرورت ہے، اور قانون ساز جماعتوں کے لئے اپنے نائب منتخب کرنا ہیں۔ مقابلہ کو کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص

بنا مقابلہ کے فوائد سے دنیا کو ایک حد تک محروم کرنے کے مرادف ہے۔

عورتوں کا حق انتخاب رائے دہندگی

اپنے استدلال کے ضمن میں میں جزئیات کو صرف اس حد تک شامل کرنا چاہتا ہوں کہ عورت کے سیاسی حقوق کے تعین میں مدد ملے کیونکہ جب ان حقوق پر روشنی ڈالی جائے گی تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی صلاحیت اور استعداد کا کچھ نہ کچھ اندازہ پہلی ہی نظر میں آسانی سے ہو سکے گا۔ ان حقوق سے میری مراد عورتوں کے حق رائے دہندگی سے ہے جو میونسپلٹی یا پارلیمنٹ کے امیدواروں کا انتخاب کرنے میں اب تک عورتوں کو حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ عورتیں دو طرح سے ان انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں۔ ایک تو خود اس انتخاب میں بطور امیدوار کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو کر اور دوسرے مقابلہ کرنے والوں میں سے کسی امیدوار کے حق میں رائے دے کر ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ اپنے لئے اپنے حکمرانوں کے منتخب کرنے کا حق سیاسی دنیا میں ابھی تک صرف مردوں کو حاصل ہے۔ لیکن اصولاً قانون نے اس حق کو عورت کے لئے یوں تسلیم کر رکھا ہے کہ اُسے اپنے دنیاوی آقا یعنے شوہر کے انتخاب کی کامل آزادی دے دی ہے۔ اور قانونی زبان میں کم از کم کہا یونہی جاتا ہے کہ عورت اپنا بر ڈھونڈھنے کے لئے بالکل آزاد ہے۔ یہ انتخاب درحقیقت اُس شریک زندگی کا انتخاب ہے جو زندگی بھر اُس کا حکمراں بنا رہے گا۔ اب جن شرائط اور قیود کے ساتھ مردوں کو حق رائے دہندگی قانون نے عطا کیا ہے اُن شرائط اور قیود کے ماسوا کوئی پابندی اس حق کے بارے میں عورتوں کے لئے کسی طرح جائز نہ ہونا چاہئے جس طبقہ اور جس حیثیت کے مرد اس حق کے استعمال کے اہل ہیں اُسی طبقہ اور حیثیت کی عورتیں کیوں اس حق سے محروم قرار دی جاتی ہیں۔ اُن کو یہ حق اس لئے چاہئے کہ وہ اپنی سیاسی مساوات کی طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ اس سے بہتر کوئی ضمانت اُن کے حقوق کی نہیں ہو سکتی جو لوگ عورتوں کی آزادی کے باب میں مجھ سے اتفاق نہیں رکھتے انھیں کم از کم اس سیاسی مسئلہ میں میری تائید کرنا چاہئے۔ کیونکہ اگر عورت کو دائمی غلامی میں رکھنا ہے تب تو اور بھی ضرورت ہے کہ اُن کی حفاظت کی جائے تاکہ جس قدر اُن کو پیسنا منظور ہے اُس سے زیادہ وہ نہ پیسی جائیں۔ غلاموں کے لئے ان کے آقاؤں نے جو حفاظت کے طریقے قانون

میں مقرر کئے ہیں وہ ہمیں معلوم ہیں۔

اہلیت اور ذمہ داری

اس مسئلہ پر کہ عورتیں کس قسم کے پیشہ کی اہلیت رکھتی ہیں، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک عملی سوال ہے۔ جب کوئی عورت کسی کام یا منصب کے لئے اپنے کو پیش کرے گی تو میدان عمل میں اپنا امتحان خود دے گی۔ اگر وہ کامیاب ہوئی تو یہی اُس کی اہلیت کی دلیل ہے۔ خواہ وہ کسی پیشہ میں سربرآوردہ بننا چاہے یا کسی انتخاب میں کامیاب ہو لیکن نظام قانون بہرکیف وہ ہونا چاہئے جو نااہل کو ذمہ داری سے دور رکھے۔ جو قوانین عورتوں کے لئے ترقی کی راہ مسدود کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں اگر اس اصول پر مبنی ہیں کہ قابل عورتیں صرف مستثنیات کے طور پر شمار میں آتی ہیں تو ان مستثنیات کے ساتھ ناانصافی کیونکر جائز ہوگی؟ میں تو کہتا ہوں کہ انہی مستثنیات سے یہ کلیہ باطل ہوتا ہے کہ عورتیں کسی لائق نہیں۔

عورتوں کی ذہنی کمزوری

اب میں چاہتا ہوں کہ عورت اور مرد میں دماغی قوت اور ذہنی قابلیت کا جو فرق بتایا جاتا ہے اُس کی وجہ بتانے کی کوشش کروں۔ اس ضمن میں عورت کی جو کمزوری دکھائی جاتی ہے اُس سے مجھے فی الجملہ انکار نہیں۔ لیکن جن حالات میں عورتیں اب تک پرورش پاتی رہی ہیں اور اُن کی تعلیم سے جو بے توجہی برتی گئی ہے یہ اُس کا نتیجہ ہے کہ اکثر عورتیں ذہانت اور عالی دماغی میں اکثر مردوں سے کم ہیں۔ دونوں جنسوں کا یہ فرق کوئی فطری فرق نہیں نہ اُن کی ذہنیت اور سرشت کے متفرق ہونے کا نتیجہ ہے۔ عورت کو جس حال میں ہم پاتے ہیں اُس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ اُس سے آگے ترقی نہیں کرسکتی محض غلط ہے۔ جو کچھ اب تک دنیا میں عورتوں نے کر دکھایا اُس سے تو یہ ضرور ثابت ہوا کہ وہ کس حد تک کس بات کی اہل تھیں۔ لیکن اب تک جو کام اُن سے لئے ہی نہیں گئے اور جن باتوں سے وہ برابر روکی جاتی رہی ہیں اگر ان میں وہ پوری نہیں اترتیں تو اُس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ نااہل ہیں درست نہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ چونکہ عورتوں میں کوئی بڑی شاعرہ یا فلسفہ داں وغیرہ کبھی نہیں ہوئی اس لئے آیندہ بھی پیدا نہیں ہوسکتی ایک لغو بات ہے۔ زائد از زائد یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ ہنوز غور طلب ہے اور بحث کا محتاج ہے۔ لیکن اس میں کسی کو کیا کلام ہوسکتا ہے کہ ملکہ

الزبتھ اور جون آف آرک صنف اناث سے تھیں جو ملک کے انتظام میں یا حریت پرستی میں اپنا اپنا نام کر گئیں یہ تو تاریخی بات ہے جس میں خیال اور رائے کو دخل نہیں جس سیاست میں عورتوں نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا ہے اُسی سیاست میں وہ تمامتہ نااہل اور حقوق سے محروم قرار دی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو شیکسپیر کے ایسے شاعرانہ مضامین قلمبند کرنے میں کوئی قانون حائل نہ تھا اور پھر بھی وہ شیکسپیر کے برابر شاعر اپنی صنف میں نہ پیدا کر سکیں۔ لیکن لایق غور تو یہ ہے کہ ملکہ الزبتھ یا ملکہ وکٹوریہ کو تاج و تخت اگر ورثہ میں نہ ملا ہوتا تو ادنیٰ سے ادنیٰ سیاسی خدمت یا ذمہ داری کا اُن کے سپرد ہونا ہرگز نہ گوارا کیا گیا ہوتا۔ اور نہ ان دونوں میں سے کسی کو اپنی بے مثل قابلیت کے ثابت کرنے کا موقعہ ملا ہوتا۔ بلکہ اُن کا شمار بھی دنیا کی دیگر نااہل عورتوں میں کیا جاتا۔

عورت کی انتظامی قابلیت محض تجربہ ہی پر دارومدار ہو تو میں یہ کہوں گا کہ دنیا نے عورتوں کو اُسی چیز کی ذمہ داری سے محروم کر رکھا ہے جس کی صلاحیت اُن میں خاص کر موجود ہے۔ زندگی کے وہ شعبے جن میں کامیابی حاصل کرنے سے قانون نے بظاہر اُن کو کبھی نہیں روکا اُن کی جانب توجہ کرنے کے بجائے انھوں نے کسی نہ کسی وجہ سے بہت زیادہ انتظامی معاملات میں زیادہ کامیابی حاصل کی۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ دنیا کے فرمان رواؤں میں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے لیکن قابلیت سے حکمرانی کرنے والوں میں عورتوں کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے بہت سی ایسی گذری ہیں جنھوں نے نہایت نازک وقت میں اپنے تاج و تخت کو سنبھالا۔ اور ایسے ایسے کارنمایاں کئے جو بالعموم عورتوں کی رواج پسندی اور توہم پرستی کے دیکھتے ہوئے اُن سے بہت بعید تھے۔ انھوں نے قابلیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ اُن کی حکومت نہایت ضابطہ اور استحکام کے ساتھ قایم رہی اور اُن کے احکام ذہانت کا بہترین نتیجہ ثابت ہوئے۔ عورت نہ صرف ملکہ یا حکمراں کی حیثیت سے کامیاب ہوئی بلکہ جب کبھی اُس کو ولیہ یا متولیہ کا درجہ دیا گیا تو بھی اُس نے اپنی انتظامی قابلیت کے بے مثل جوہر دکھائے[۱]۔ یہ امور اس قدر ناقابل انکار ہیں کہ عرصہ ہوا ایک مرتبہ ایک

---

[۱] صرف مغربی دنیا ہی میں نہیں بلکہ مشرق کو لیجئے مثلاً ہندوستان کی جن ہندو ریاستوں میں عمدہ نظام (بقیہ بر صفحہ آیندہ)

صاحب جو اس حقیقت کی تردید کرنا چاہتے تھے بے ساختہ کہہ گئے کہ بادشاہ سے تو اگلے ہی اچھی کیونکہ بادشاہ کی آڑ میں عورتیں حکومت کرتی ہیں لیکن ملکہ کی آڑ میں مرد"! میں جانتا ہوں کہ ایسے بے تکے مزاحیہ فقروں پر بحث کرنا ایک بیکار سی بات ہے۔ لیکن ایسی باتوں کا اثر لوگوں کی طبیعت پر ضرور پڑتا ہے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ بادشاہوں کی آڑ میں عورتیں حکومت کرتی ہیں مستثنیات کی بات اور ہے لیکن کمزور فرمانرواؤں کی کمزوریاں فقط زن مریدی ہی کے باعث نہیں ہوتیں بلکہ خوشامد خورے مردوں کی خوشامد کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ زن مرید بادشاہوں سے اگرچہ زیادہ امیدیں وابستہ نہیں ہوسکتیں۔ لیکن اس کے خلاف مثالیں بھی موجود ہیں۔ اور اُن صورتوں پر خاص کر نظر کرنا چاہیئے جن میں بادشاہوں نے اپنے اختیارات کسی عورت کو تفویض کر دیئے ہوں۔ مثلاً چارلس ششم جو اپنے نامور باپ لوئی یازدہم کی وفات کے وقت نوعمر تھا مگر اُس نے باپ کی دوراندیشانہ وصیت کے

(بقیہ صفحہ سابقہ) حکومت جاری ہے ظلم و تعدی کے بغیر امن و امان قائم ہے زراعت ترقی پر ہے اور لوگ خوش حال ہیں اُن میں ۵، فی صدی آپ بھی پائیں گے کہ ہاں کوئی عورت برسر اقتدار ہے۔ یہ بات میرے لئے کچھ توقع کے خلاف تھی لیکن ہندو ریاستوں کی بابت میں نے یہ دفتری معلومات بہت وضاحت کے ساتھ حاصل کی ہے۔ ہندو عورت کو اصولاً بادشاہت نہیں دیتے لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض رؤسا اپنے جمود اور عشق پسندی کی وجہ سے عمر طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی گدی کسی نابالغ بچہ کو ملتی ہے اور نابالغ کی ماں عموماً اس یتیم کی ولیہ کے طور پر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے چنانچہ جب اس صورت حال پر نظر کیجئے کہ ان عالی خاندان خواتین کو کبھی محل کے باہر کی ہوا بھی نہیں لگی ہے نہ اُنھیں بجز اپنے خاص عزیزوں کے دنیا کے کسی مرد سے دو بدو گفتگو کا موقع ملا ہے بلکہ وہ ان پڑھ ہوتی ہیں اور اگر لکھ پڑھ بھی سکتی ہیں تو اُن کی زبان میں وہ کتابیں نہیں ہوتیں جن کے ذریعہ سے وہ سیاسیات کو بطور علم کے حاصل کر سکیں تب حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ ان دشواریوں کے باوجود ان کی قدرتی صلاحیت اُن کو انتظامی معاملات میں کس قدر جلد ماہر بنا دیتی ہے۔

(مصنّف)

بوجب ایک مدت تک اپنی ماں کو سلطنت کا مختار بنائے رکھا۔ فرانس کا ایک اور بادشاہ سنٹ لوئی تھا جو شارلیمیگنی کے بعد سب سے زبردست اور بہترین فرمانروا گذرا ہے۔ ایک عرصے کے لئے اُس نے اپنی بہن کو تمام اختیاراتِ سلطنت دے رکھے تھے۔ یہ وہ فرمانروا ہیں جو اپنے اپنے زمانہ میں اپنے معاصرین میں سب سے بہتر حکمران خیال کئے جاتے تھے اور ان کے زمانہ کا سا زمانہ مشکل سے کسی ملک کو ملتا ہے۔ اسی طرح شہنشاہ چارلس پنجم کو لیجئے جو اپنے وقت کا سب سے بڑا مدبر مانا جاتا ہے۔ اُس کے دربار میں جتنے لائق و فائق لوگ تھے شاید ہی کسی فرماں روا نے جمع کئے ہوں۔ یہ وہ حکمراں تھا جس نے شاید کبھی ذاتی نفع کے آگے جذبات کی پروا نہیں کی۔ لیکن اسی شخص نے اپنے خاندان کی دو شہزادیوں کو یکے بعد دیگرے ولایت ندرلینڈ (ہالینڈ) کی گورنری پر مامور رکھا یہاں تک کہ اُس کے انتقال کے بعد ایک دوسری شہزادی وہاں پھر اسی عہدہ پر ممتاز ہوئی اور ان سے ایک (شہزادی مارگریٹ آف آسٹریا) تو اپنے زمانہ کی سب سے بڑی سیاست دان سمجھی جاتی تھی۔ یہاں پر ایک بات تو ختم ہو گئی۔ اب یہ قول لیجئے کہ عورتوں کے پردہ میں مرد حکمرانی کرتے ہیں تو فی الجملہ اس پر بھی وہی حجت صادق آتی ہے جو پہلی بات کے ضمن میں بیان کی گئی۔ اس قول کا بھی منشا گویا یہی ہے کہ عورتیں جب حکمراں بنتی ہیں تو اُن ہی لوگوں کے ذریعہ سے حکومت کرتی ہیں جو ان کی ذات کے لئے راحت رساں ہوتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے بارہ میں ایسی مثالیں بہت شاذ ملیں گی۔ اس بارے میں سب سے زیادہ بے اصول ملکہ کیتھرین ثانیہ کہی جا سکتی ہے لیکن اُس کے زمانہ میں بھی شاذ ہی یہ صورت دیکھی گئی۔ اور اس عورت کی مثال میں بھی یہ بات نہیں پائی گئی کہ اس کی حکومت کی جو خوبیاں تھیں وہ کچھ مردوں کی کارگذاری کا نتیجہ کہی جا سکیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کسی عورت کے راج میں انتظام حکومت اگر اچھا ہوتا ہے تو اس لئے کہ سارا انتظام لائق اور منتخب مردوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس حسن انتخاب کی داد کس کو دیجئے گا؟ پس عورت اگر بحیثیت حکمراں کے اپنی قابلیت کی بنا پر کامیاب ہو سکتی ہے تو میرے نزدیک وزارت کا عہدہ بھی اُس کے لئے نہایت موزوں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نہ صرف انتظام حکومت بلکہ حکام کو منتخب کرنے کا

کام عموماً وزرا بلکہ وزیر اعظم کے سپرد ہوا کرتا ہے۔ اور سلطنت کے مختلف صیغوں میں اچھے حکام کا تقرر ہی امور عامہ کی بہتری کی ضمانت ہوا کرتا ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آدمی کی سیرت جس قدر جلد عورت پہچان لیتی ہے مرد نہیں پہچانتا۔ مرد پر عورت کو یہ ایک ایسی فوقیت حاصل ہے کہ اُس کے حسنِ انتخاب کا یقین دلا سکتی ہے اور یہ وہ بات ہے کہ ملکی انتظام میں اس کا لحاظ سب باتوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ تاریخ اس قضیہ کو ثابت کر چکی ہے۔ لیکن یہ بھی تاریخ ہی سے ثابت ہے کہ جن عورتوں نے اپنے طرزِ حکومت کی خوبی میں نام پیدا کیا ا جن کا شمار با اقتدار فرمانرواؤں میں ہوا وہ وہی تھیں جو عنانِ حکومت واقعی اپنے ہی ہاتھ میں رکھتی تھیں اور اپنے عائدین کے حُسنِ انتظام کی داد خود لیتی تھیں۔ اور اگر اُنہوں نے کسی کی اچھی صلاح پر کان دہرے اور عمل کیا تو یہ ثبوت اس بات کا ہو کہ خود ان کی رائے صائب تھی اور اچھی صلاح اور مشورہ کے مطابق قائم ہوا کرتی تھیں۔

اب یہ بالکل قرین عقل ہے کہ جو اہم ترین سیاسی امور کو انجام دینے کے لائق ہو سکتا ہو وہ بدرجہ اولی چھوٹے چھوٹے سیاسی مسئلوں میں بھی دخل دینے کے لائق ہو سکتا ہے۔ کیا اس کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی مائیں اور بہنیں جب اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے فرایض انجام دینے میں کامیاب ہوئی ہیں تو دنیا کے بڑے بڑے سیاسی لوگوں، باسلیقہ حاکموں، کمپنیوں کے کارکنوں وغیرہ کے گھرانوں کی عورتیں اپنے مردوں کا کام کرنے سے یکسر قاصر رہیں گی؟ اگر ایسا ہو بھی تو اُس کا اصلی سبب ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ شاہی خاندانوں کو جو برتری عوام پر حاصل ہوتی ہے اُس کا مقتضا یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ اُن میں مردوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت میں نسبتاً زیادہ فرق نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ اُن میں عورتوں کو اکثر ان فرایض کے انجام دینے کا موقع ملا کرتا ہے۔ ان کو سیاست سے چنداں دور نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ نہ معلوم کونسا وقت آ جائے کہ اُنھیں اپنے خاندان کی کوئی سیاسی خدمت انجام دینا پڑے یا تختِ سلطنت پر متمکن ہونے کی دعوت دے دی جائے۔ اور غالباً یہی وہ طبقہ ہے جس میں زن و مرد میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی اور یہی وجہ ہے کہ امور سلطنت میں کسی خاندان کی شہزادیاں شہزادوں سے کم نہیں ثابت ہوتیں

عورتوں میں کارپردازی کی صلاحیت

دنیا میں جو کچھ تجربہ بتاتا ہے وہ تو یہی ہے، اور یہی صورت اُن کی قایم رہے گی یا نہیں، یہ میں کچھ نہیں کہتا البتہ یہ ضرور کہتا ہوں اور بار بار کہہ چکا ہوں کہ عورتیں جو کچھ اب ہیں یا ہوسکتی ہیں وہ محض اس لئے نہیں کہ ان کی فطرت میں کوئی خاص کمزوری ہے۔ اب تک تو فی الجملہ اُن کا وجود ایک غیر فطری فضا میں رہا ہے جس سے اُن کی ہر قسم کی باڑھ مرتی رہی۔ اور میرا خیال یہی ہے کہ اگر اُن پر سوائے اُن پابندیوں کے جو معاشرت انسانی کے حالات کے لحاظ سے بالکل ناگزیر ہیں، پابندیاں عاید نہ ہوں تو جہاں تک عمل کا تعلق ہے فی الجملہ ان میں اور مردوں میں کوئی اہم فرق بالآخر نہ پایا جائے گا۔ میں آگے چل کر اس کا کچھ اور ثبوت بھی دوں گا، مگر میرے نزدیک یہ بھی کافی تیقن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی افتاد طبع بہ نسبت مردوں کے زیادہ عاملانہ اور اُن میں کارپردازی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بات صرف روزمرہ کے تجربہ سے نہیں بلکہ تواریخ سے بھی ثابت ہوتی ہے کسی ہوشیار عورت کی خصوصیات اور اُس کی دماغی قابلیت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایسی سب عورتیں بہت کام کی اور بڑی کارپرداز ہوتی ہیں۔ عام لوگ جس چیز کو "عورتوں کا علم غیب" کہتے ہیں، یعنے کسی بات کا پہلے سے از خود معلوم کرلینا یا اندازہ سے پتہ لگا لینا، یہ اصل میں عورت کی حاضر دماغی اور قوت فیصلہ کی صحت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے کیونکہ عورت کی نظر ہمیشہ سامنے کی باتوں پر نسبتاً زیادہ رہا کرتی ہے۔ دنیا میں کسی شخص نے سائنس کا کوئی کلیہ اس طریقہ پر تو کبھی نہ معلوم کرلیا۔ نہ کبھی کسی نے فرض شناسی اور دوراندیشی کا کوئی قضیہ اس طرح سے دریافت کیا۔ یہ تو وہ چیزیں ہیں جو آہستہ آہستہ عام تجربہ اور احتیاط کی بدولت انسان پر منکشف ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے عورتوں کا "علم غیب"، صرف اُن تجربات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے جو اُنھیں اپنی ذاتی نظر اور مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر عورتوں کو دوسروں کے تجربوں سے اسی طرح بغیر روک ٹوک کے نفع پہنچنے لگے جیسے مردوں کو پہنچتا ہے تو اُن کی حاضر دماغی اور سامنے کی باتوں پر نظر رکھنے کی طینت اُن کو وہ فائدہ پہنچائے جو عموماً مردوں کو بھی میسر نہیں۔ اور یہ چیز اُن کو دنیائے عمل میں واقعی ممتاز کردے۔ مردجن کی اس قدر تعلیم و تربیت ہو رہی ہے امور حاضرہ پر نظر

رکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ اُن کو ہمیشہ دور ہی کی سوجھا کرتی ہے اور سامنے کی چیزیں گویا دکھائی ہی نہیں دیتیں۔ ان کو ہر چیز اُس توقع کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے جو اُنہیں اُن کے علم وتجربہ کی رو سے قایم ہوئی ہو۔ لیکن عورتیں اس کے بالکل برعکس ہیں۔ اگر وہ علم وتجربہ میں مردوں کے برابر ہوں تو پیش بینی میں وہ عموماً مردوں سے بازی لے جاتی ہیں۔ اور ان کی یہی صلاحیت ہے جو اُن سے بجائے دور و دراز کے نظریئے قائم کرانے کے اُنھیں عملی معاملات میں زیادہ کامیاب بناتی ہے۔ کلیات وضع کرنے میں (یعنے عام باتیں سوچنے میں) فکر کی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور جزئیات پر کلیات کو منطبق کرنا (یعنے عام باتوں کو خاص خاص چیزوں کے مطابق کرکے دیکھنا) اور خاص موقعوں کو پہچاننا (یعنے موقع محل ہر بات کا دیکھنا) عمل کی صلاحیت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ بات بحالات موجودہ عورتوں میں فی الجملہ زیادہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ عمل اُسی وقت ٹھیک ہوتا ہے جب اصول (یعنے عام باتوں اور قاعدوں) پر صحیح رائے قائم ہو اور عورتوں کو نظر کی تیزی میں جو خصوصیت حاصل ہے اُسی کی وجہ سے وہ اکثر صرف ذاتی مشاہدہ پر جلد بازی کے ساتھ کوئی سرسری رائے قائم کرکے ایک کلیہ تراش لیا کرتی ہیں۔ اور اُسی جلد بازی کے ساتھ اُس پر عمل بھی کر بیٹھتی ہیں۔ گو اُن کا ذاتی مشاہدہ نسبتاً وسیع ہوا کرتا ہے مگر اُن کو اُس پر اکثر ضرورت سے زیادہ بھروسہ ہو جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے یعنے عام معلومات کا بڑھانا۔ عورتوں کی غلطیاں اُسی قسم کی ہوتی ہیں جیسے کسی عالم بے پیر سے سرزد ہوں۔ جس شخص کو اپنی تربیت تمامتر خود ہی کرنا پڑتی ہے اُسے اکثر وہ چیزیں نظر آجاتی ہیں جو ہوتی تو ہیں بالکل معمولی مگر بڑے بڑے فاضلوں کی نظر اُن پر نہیں پڑتی۔

عورت کی حقیقت پسندی عورت کا فطرتاً حاضر دماغ ہونا اور اصلیت اور واقعیت کی طرف عجلت کے ساتھ رجوع کرنے کی عادت یہ ایسی باتیں ہیں کہ بجائے خود ان سے غلطی میں پڑنے کا کافی اندیشہ ہو سکتا ہے۔ تاہم یہی وہ باتیں ہیں جن میں لوگ مدت سے مبتلا ہیں۔ جن لوگوں کو ہمیشہ دور کی سوجھا کرتی ہے اور جو منصوبے باندھنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اکثر ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں کہ گویا اُنھیں سامنے کی بات بھی نہیں سوجھتی۔ یہاں تک کہ کبھی تو وہ ایسی باتیں بگھارنے لگتے ہیں

کہ جن کی تردید روزمرہ کے واقعات سے کوئی بچہ بھی کر دے۔ اور بعض اوقات ایسی پر کٹی اُڑاتے ہیں کہ آدمی اُن کا منہ تکتا رہ جائے۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں۔ نہ یہ فقط ادنیٰ دماغ کے لوگوں کا ذکر ہے۔ بلکہ دنیا کے اُن بڑے بڑے فلسفیوں کی تصانیف میں اس قسم کی عجوبہ اور بے تکی باتیں مل سکتی ہیں جن کے نظریے فلسفیانہ تخیلات کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ غرض کہ بڑے بڑے وسیع النظر لوگوں کی قوت متخیلہ سے کام لینے کے ساتھ ساتھ دنیا میں اگر ان خواص انسانی سے بھی کام لیا جانے لگے جو عورتوں میں اس طرح نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں تو یہ علمی دنیا کے لئے کس قدر مفید ہو، اور فلسفہ اور سائنس میں یگانگت کے آثار کتنی خوبی سے پیدا ہونے لگیں؟ اس نقطہ نظر سے تو فلسفی لوگوں کو چاہئے کہ اپنے خیالات فطرت نسوانی کے واقعیت نگار قلم اصلاح کے آگے پیش کریں اور اُس کی تنقیدی قوت سے فائدہ اٹھائیں تاکہ اُن کی پرواز خیال حقیقت اور واقعیت کے دائرہ سے باہر نہ ہونے پائے۔ عورت زیادہ تر باتوں کی طرف نہیں دوڑتی نہ زیادہ اصول اور قاعدوں کی پروا کرتی ہے۔ اُس کا دماغ بہت سی چیزوں کو ایک ساتھ نہیں بلکہ ہر چیز کو الگ الگ مگر تیزی کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ پھر یہ کہ اُسے اس بات کا بڑا دھیان رہتا ہے کہ فلاں بات کا اثر کسی شخص پر فوراً کیا ہوگا اُسے دوسروں کے ذہنی احساسات کی بڑی جستجو رہتی ہے جس سے وہ اپنے ہر فعل میں مدد لینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی دو باتیں ہیں جن سے وہ ایسے اصول اور عام باتوں پر توجہ نہیں کرنا چاہتی جن میں جزئیات کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ نہ ایسی باتوں سے اسے رغبت ہوتی ہے جن کا اثر بظاہر لوگوں کے جذبات اور احساسات پر نہ ہو اور جو محض تخیل یا فرضی امور پر مبنی ہوں، یعنے جن سے کسی کو نہ نفع پہنچتا ہو نہ نقصان۔ چنانچہ عورتوں کی رائے متخیل مردوں کے خیالات کو واقعیت سے متعلق کرنے میں اُسی حد تک مدد دے سکتی ہے جیسے مردوں کے خیالات عورت کی رائے کو وسعت نظر پر مبنی کرتے ہیں۔ اور یہ بھی پیش نظر رہے کہ عورتوں کی باتیں جتنی گہری ہوتی ہیں اکثر مرد اُس گہرائی کو پہنچ بھی نہیں سکتے۔

عورت کی صلاحیت عمل اور زود فہمی

دوسری بات جو عورتوں کو مردوں پر فوقیت دیتی ہے وہ عورتوں

کی عام زود فہمی ہے ۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے یہ انسان کے لئے بہت بڑی خوبی ہے۔ جب کوئی کام آن پڑتا ہے تو یہی چیز کام آتی ہے کہ انسان اُسے انجام دینے کے لئے فوراً آمادہ ہو جائے اور جلد از جلد کام کا طریقہ طے کرے۔ جو شخص خیال آرائیوں کا عادی ہے اُسے تو سوچنے کا کافی موقع ملتا ہے اور اُس کو عجلت کا سوال پریشان نہیں کرتا۔ خواہ وقت نکل ہی کیوں نہ جائے لیکن وہ بغیر "اگر مگر" کے نہیں مانتا۔ علمی دنیا میں بھی ناکافی مواد کی بنا پر کسی نظریہ کا قائم کرلینا علمی ضروریات کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے کیونکہ اکثر اس میں وقت بچ جاتا ہے اور نظریہ کی تصدیق بعد کو ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ جلد کسی نتیجہ پر پہنچنا یا عجلت میں رائے قائم کرلینا یہ لامحالہ کوئی عیب نہیں بلکہ یہ ایک کارآمد طریقہ کار بھی شمار ہوسکتا ہے کیا فلسفہ اور کیا سائنس، سب کہیں یہ طریقہ کسی نہ کسی حد تک رائج ہے۔ اور ارباب فلسفہ کے لئے اگر نہ ہو تو سائنس والوں کے لئے اکثر یہی طریقہ کارآمد ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ اُن کا مطلب منفرد اشیاء اور جزئی واقعات عالم کا حل کرنا ہوتا ہے اور اُن کو زیادہ ضرورت رہتی ہے کہ ہر موقع پر عمل کا طریقہ جلد طے کریں اور اپنے خیال کو تیزی کے ساتھ دوڑائیں۔ ان کے یہاں "اگر مگر" کی اُتنی گنجائش نہیں جتنی فلسفہ والوں کے لئے ہوتی ہے۔ خیال کی تیزی میں ہی ان کی قوت متخیلہ صرف ہوا کرتی ہے۔ فلسفی خواہ جیسی بھی تنقید کرے لیکن عمل میں اُس کا قدم اُتنا تیز نہیں پڑتا۔ اور فی الجملہ یہی فرق مرد اور عورت کی سرشت میں ہے جو فلسفی اور سائنس داں میں نظر آتا ہے۔ مرد تو سست روی کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ جن کاموں میں مہارت رکھتا ہے انمیں بھی وہ کچھوے کی چال چلنا چاہتا ہے اور اسے خواہ مخواہ کوئی خوبی نہ سمجھنا چاہئے۔

عورت کی تنک مزاجی اور اُس کا اثر عمل پر

شاید یہ کہا جائے کہ عورت جیسی ذکی الحس ہے ویسی ہی تند خو بھی ہے۔ یہ بات اُس کی عام صلاحیت کارگزاری میں حائل خیال کی جائے گی۔ کیونکہ خانگی معاملات کے علاوہ اُس کی تنک مزاجی نباہی نہیں جاسکتی۔ اور اس عیب کی وجہ سے نہ تو وہ کسی بات پر قائم رہتی ہے نہ موقع محل دیکھتی ہے۔ بلکہ اپنی برافروختگی میں عقل کے استعمال سے بھی معذور ہوتی ہے۔ اور بدیں وجہ اُس کو کسی سنجیدہ کاروبار کے لائق نہ سمجھنا چاہئے۔ میرے خیال میں محرور المزاجی کے یہ دورے جو عورتوں

ہیں دیکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر اعصاب کی بے مصرف قوت کے سیلان کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔ اگر ان کی قوت کسی معین مقصد کی جانب مرکوز ہوا کرے تو یہ کیفیت نہ پیدا ہو آپ نے غور کیا ہوگا کہ پرانے زمانہ میں جو بات بات پر عورتوں کو غش آجایا کرتے تھے اُس کا گویا اب رواج ہی اُٹھ گیا۔ کچھ بات یہ بھی ہے کہ اچھے گھرانوں میں عورتوں کی پرورش اس طرح ہوا کرتی ہے جیسے کسی شیشہ خانہ میں کوئی پودا پرورش کیا جائے۔ اُنھیں نہ نوصاف ہوا میسر آتی ہے نہ قدرتی حرارت جس سے ان کے قوئی فطری طور پر نشو نما پائیں نہ انھیں کسی جسمانی مشقت یا کاروبار کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ ان کے اعصاب میں قدرتی حرکت پیدا ہو اور ان کا دل ودماغ قوی ہو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے جذبات بس اشتعال کے منتظر رہا کرتے ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے اگر اُنھیں دق نہیں ہو جاتی ؟ اندرونی اور بیرونی اثرات سے اُن کے حواس اتنے برافروختہ رہتے ہیں کہ وہ مسلسل نہ کوئی کام کرسکتی ہیں نہ کسی خیال میں مستقل رہ سکتی ہیں۔ اُن عورتوں کو دیکھئے جنھیں اپنی روزی آپ کمانا ہوتی ہے۔ ان کی سرشت پر اس قسم کے اختلاجات عاید کرنا آسان نہیں۔ کیونکہ اُس طبقہ کی عورتیں اپنے بھائیوں کی سی تربیت پاتی ہیں اور تقریباً یکساں آزاد فضا میں اُن کی پرورش ہوتی ہے۔ چنانچہ فی الجملہ نہ وہ محرورالمزاج ہوتی ہیں نہ ان میں کاروبار کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے۔ یہ بات اور ہے کہ کسی مرد کی طرح کسی عورت کو اعصاب کی کمزوری کی شکایت پیدائشی ہو جو اکثر موروثی اثرات سے بھی ہوا کرتی ہے لیکن اگر یوں بھی مان لیا جائے کہ لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے ایسے امراض ورثتاً زیادہ قبول کرتی ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ جو لڑکا کوئی پیدائشی مرض لے کر جوان ہوا ہو کیا وہ بھی کسی کاروبار کے لائق نہیں سمجھا جاتا ؟ دنیا میں ایسے لوگ ہمیشہ گنائے جا سکتے ہیں جو باوجود اس قسم کے خلقی نقائص کے جن کا اثر اعصاب اور مزاجی کیفیت پر ہا اپنے زمانہ میں از حد کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ اعصابی ہیجان بھی ایک ایسی چیز ہے جو اکثر لوگوں میں محض وقتی ہوتا ہے جس کا اثر بعد کو مزاج پر بالکل نہیں رہتا۔ نہ کسی طرح کسی تفحص یا تجسس میں مخل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ہیجان بعض اوقات کام کے جوش وخروش سے تعبیر ہوتا ہے اور یہ وہی جوش ہی جو گھوڑدوڑ کے گھوڑے کو اتنا تیز دوڑا دیتا ہے کہ منزل مقصود پر پہنچتے ہی بعض اوقات اُس کا دم ٹوٹ جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے بہت سی نازک ہستیوں کو استقلال کے مقدس ترین مدارج

طے کرا دئے اور جس کی بدولت ان کو سخت سے سخت جسمانی اور روحانی تکالیف کی پروا نہ ہوئی۔ یہ خصوصیت اکثر اُن لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے جو اپنی علمی خدمات کے ذریعہ سے نوع انسان کے رہنما بنتے ہیں۔ اور یہی بات ہے جو بڑے بڑے مقرروں اور واعظوں کو اور علمی درس اخلاق دینے والوں کو کامیاب کرتی ہے اگرچہ ان میں وہ خواص نہ بھی ہوں جو کسی رکن وزارت یا کسی حاکم عدالت کے لئے اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ جن لوگوں کا مزاج زیادہ اشتعال پذیر ہوتا ہے وہ ہر وقت حالت اشتعال میں اپنی جان گھلایا کرتے ہیں۔ پھر یہ بات تو بہت کچھ تربیت پر منحصر ہے۔ نفس پر قابو پیدا کرنا بغیر کسی زبردست جذبہ کسی لاگ اور کسی خاص احساس کے ممکن نہیں، البتہ یہ بات تربیت اور مشق سے حاصل ہوتی ہے، پہلوان کبھی تو جذبات سے مغلوب ہوکر پہلوان بن جاتا ہے اور کبھی جذبات کو مغلوب کرنے سے۔ تاریخ اور تجربہ دونوں ثابت کرتے ہیں کہ زبردست جذبات کے لوگوں کو فرض کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے بشرطیکہ اُن کے جذبات کسی ڈھرے پر لگا دئے گئے ہوں۔ حاکم عدالت اپنا منصفانہ فیصلہ صادر کرتے وقت جب اپنے جذبات ہمدردی پر فتح حاصل کرتا ہے تو اُسی احساس فرض کی بدولت جو بجائے خود ایک جذبہ ہے جس کی تقویت تربیت سے ہوتی ہے یہی وہ صلاحیت ہے جو انسان کو روزمرہ کی زندگی کے ادنیٰ اثرات سے بالاتر بنا کر پھر اُسی روزمرہ کی زندگی یعنی انسان کی سیرت کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وہ جوش ہے جس کے کیف میں انسان اُس مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال اور محسوسات کو تول سکے، اور جانچ کر دیکھے کہ وہ اُس کے نصب العین اور معیار خلق سے گرے ہوئے تو نہیں ہیں۔ اگرچہ انسان کی جسمانی کیفیات ہمیشہ بدلا کرتی ہیں لیکن اُس کی عادتوں میں جو مقاصد سرایت کئے ہوئے ہیں وہ مستقل ہوتے ہیں، اور وہ نتیجہ ہیں اُسی جوشیلی کیفیت کا جو اُس کے لئے معیار عمل قائم کرتی ہے۔ دوسری قوموں کے حالات مطالعہ کرنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ طبیعت کا زیادہ اشتعال پذیر ہونا انسان کو ناکارہ نہیں کر دیتا۔ اور جن لوگوں کو دیر میں اشتعال ہوتا ہے وہ دوسرے لوگوں سے کچھ زیادہ کارپرداز نہیں ثابت ہوتے۔ یورپ کی بعض دیگر اقوام کے مقابلہ میں فرانسیسی اور اطالوی لوگ یقیناً بہت زیادہ محرور المزاج واقع ہوئے ہیں۔ اور روزمرہ کی زندگی میں وہ انگریزوں کے مقابلہ میں تو بہرکیف نہایت مشتعل مزاج

ہیں. لیکن کیا وہ سائنس میں یا عام کاروبار میں قانونی اور عدالتی معاملات میں یا سپہ گری میں کسی قوم سے پیچھے ہیں؟ ضرورت سے زیادہ شہادت اس امر کی موجود ہے کہ قدیم یونان والے حال کے یونانیوں کی طرح از حد مشتعل مزاج لوگ تھے. لیکن اُن کی حکمت مشہور ہے اور دنیا کا کوئی فن نہ تھا جس میں اُنھوں نے کمال نہ حاصل کیا ہو. اہل رومہ بھی اُسی نواح جنوب کے لوگ تھے جو ابتداءً ویسا ہی مزاج رکھتے تھے لیکن اُن کے زبردست قومی نظام نے اُن کو اُن کی ابتدائی حالت کے بالکل برعکس بنا دیا اور وہی چیز جو ابتدا میں اُن کے جوش کی ایک صورت تھی اُس سے اُن کی تربیت نے ان کے طبایع کو ایک برعکس حالت پہ کر دیا. آئرستان کی سیلٹ قوم بھی اسی تربیت کی ایک مثال پیش کرتی ہے. غرضکہ جس طرح فرانسیسی انگریزوں کے مقابلہ میں آئرلینڈ والے سوئیزرلینڈ والوں کے مقابلہ میں یونانی اور اطالوی لوگ جرمن قوم کے مقابلہ میں رکھے جا سکتے تھے اُسی طرح عورتیں مردوں کے مقابلہ میں. اور دونوں کی قابلیت صلاحیت عمل میں بالآخر مزاجی کیفیت کی بنا پر کوئی فرق نہ پایا جائے گا بشرطیکہ ان کی تربیت کا کافی لحاظ رکھا جائے۔

عورت کے ذہن کی جزرسی اور دوسری صفتیں

اگر کہا جائے کہ عورتوں میں کسی ایک کوشش کو برابر جاری رکھنے کے لئے کافی استقلال نہیں ہوتا تو میں کہہ چکا ہوں کہ یہ اُن کی تربیت کی خامی ہے نہ کہ اُن کی فطرت کی. تاہم اگر یہ مان بھی لیا جائے تو اس سے ممکن ہے کہ اُن کے کام کی خوبی اُس پایہ کی نہ ہو لیکن یہ کہ وہ کوئی خوبی اپنے کام میں نہ پیدا کر سکیں یہ لائق یقین نہیں ہے. دماغ کا کسی کام پر جمنا گو ایک قابل تعریف بات ہے مگر عملی ضروریات کے لئے یہ عادت بعض اوقات مضر بھی ثابت ہوتی ہے. کیونکہ میری قطعی رائے یہ ہے کہ کسی اہم مسئلہ میں مسلسل انہماک اُتنا مفید نہیں جس قدر بار بار اُس کی طرف دماغ کو رجوع کرنا. اور جب آدمی ایک چیز کی طرف خوب متوجہ ہو تو اُس چیز کو دفعتاً چھوڑ کر دوسری چیز کی طرف اُسی قدر متوجہ ہو سکے تو یہ بڑی بات ہے. یہ عادت مردوں کو بہت کم ہوتی ہے لیکن عورتوں کے لئے یہ کچھ دشوار بات نہیں. ممکن ہے کہ یہ اُن کے لئے کوئی فطری بات ہو لیکن اُن کو اس کی مشق تو بہرکیف زیادہ ہوتی ہے. کیونکہ عورتیں جن کاموں میں مصروف رہا کرتی ہیں اُن میں ہر آن جزئیات پر نظر رکھنا ہوتی ہے۔

اور کسی ایک چیز پر ان کو شاید ہی کبھی ایک منٹ سے زیادہ غور کرنے کا اتفاق ہوتا ہو۔ ان کو ذرا ذراسی بات کی پوری فکر رہتی ہے اور جو بات زیادہ غور کے لایق ہوتی ہے اُسے سوچنے کے لئے کھینچ تان کر موقع نکالا جاتا ہے تب نکلتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جس طرح عورتیں کسی بات پر غور کرنے کا موقع پیدا کر لیتی ہیں مرد ویسے موقع کو موقع ہی نہیں سمجھتا۔ اور گو عورت کے دماغ میں چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں لیکن اُس کا دماغ کسی وقت خالی نہیں رہتا۔ برخلاف اس کے مرد کا دماغ بجز اُس وقت کے کہ جب وہ اپنے مقاصد زندگانی پر غور کر رہا ہو اکثر افکار سے خالی رہتا ہے۔ عورت کے لئے کار زندگی میں عام طور پر سب چیزیں مفید مطلب ہیں اور اُن کا سلسلہ اُس کے ذہن میں اُسی طرح جاری اور قایم رہتا ہے جیسے کرۂ زمین کا دور مسلسل فضائے عالم میں۔

برطانوی مزدوروں کی بیداری
صنعتی انقلاب کے دور میں

اٹھارہویں صدی عیسوی میں برطانیہ ایک عجیب و غریب انقلاب کے دور سے گذر رہا تھا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب سرمایہ داری حدِ کمال کو پہونچ چکی تھی۔ ملک اور حکومت کے نزدیک طاقت ان ہی کی تھی جو دولتمند تھے۔ جو دولت کو تجارت اور کاروبار میں صرف کرکے اپنی مالی حالت کو بے پایاں فروغ دے رہے تھے۔ برطانیہ میں گویا سرمایہ داروں کی ایک فوج تھی جس نے ملک کے رؤسا اور سلطنت کے اراکین پر فتح حاصل کرکے غریب مزدور پیشہ طبقے کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔

مزدور کا افلاس ایک امر مسلّمہ ہے۔ اس بکیس کا سہارا محنت اور مشقت سے حاصل کی ہوئی چند روٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر بھلا اس کا سننے والا کون ہوتا۔ کسے غرض تھی جو اس کے طرزِ بود و ماند، اس کی صحت، اور اس کی خوش حالی کا خیال کرتا۔ بیچارے قلیل اجرت پر دن بھر محنت کرتے۔ راتوں کو تنگ و تاریک کوٹھریوں میں جاکر پڑ رہتے۔ آدھا پیٹ کھاتے اور چیتھڑوں سے بدن ڈھانکتے۔

مگر زمانہ رنگ بدل رہا تھا۔ دنیا ترقی کر رہی تھی سائنس اپنے کرشمے ظہور میں لا رہی تھی۔ اب مشین کا دور آیا۔ قدم قدم پر مشینیں دیکھئے۔ کپڑا بنانے کے لئے مشین آٹا پیسنے کے لئے مشین۔ لوہے کے سامان تیار کرنے کے لئے مشین۔ لکڑی کاٹنے کے لئے مشین۔ غرض ہر طرف مشین ہی کی حکومت تھی۔

اس تبدیلی نے یکایک کاروبار کا نقشہ بدل دیا۔ چیزیں بکثرت تیار ہوکر ارزاں فروخت ہونے لگیں۔ غیر صنعتی اور غیر تربیت یافتہ مزدوروں کو خیرباد کہا گیا۔ ہنرمندوں کے دن چمکے۔ کاروبار میں اضافہ ہوا۔ وقت کی کفایت کے ساتھ ساتھ پیداوار میں زیادتی ہوئی۔ بازار میں گرماگرمی پیدا ہوئی مشین کی

تیار کردہ چیزیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگیں۔ غریب اور معمولی طبقے کے لوگ بھی وہ چیزیں استعمال کرنے لگے جو پہلے صرف رؤسا اور بڑے بڑے دولتمندوں کے احاطہ قدرت میں تھیں۔ گو اس تبدیلی سے مستفید ہونے والا سرمایہ دار ساہوکار سے زیادہ کوئی نہ تھا، پھر بھی اس کا اثر شہر کے محلات اور تجار کی عالیشان دوکانوں سے گذر کر ان غریب مزدوروں اور کسانوں تک پہونچا جو اپنے جھونپڑوں میں مست اور کھیتوں کی پیداوار پر قانع تھے۔ نئے دور زندگی نے ان کے خیالات میں ہیجان پیدا کیا۔ وہ شہر کی مشینوں اور فیکٹریوں کے خواب دیکھنے لگے۔ دیہات کی سادہ اور خوشگوار زندگی سے وہ بیزار ہو چکے تھے۔ انہوں نے شہر کی کال کوٹھریوں اور مشینوں کی بھیانک انگیٹھیوں کو اپنے کچے مکانوں اور دلفریب قدرتی مناظر پر ترجیح دی۔

مشینوں کے اردگرد غیر معمولی اجتماع شروع ہو گیا۔ اور دیہاتی معاشرت کی بجائے "فیکٹری ٹاؤن" نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی۔ آمدنی کی کمی جگہ کی قلت، ضروریات کی کثرت اور سرمایہ داروں کی عدم توجہی نے مزدوروں میں جذبہ انقلاب پیدا کر دیا۔ ان میں بیداری کی لہر دوڑنے لگی۔ وہ "حقوق" کے نام پر خون بہانے اور جانیں دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کے کچھ مطالبات تھے جن کے حاصل کرنے پر وہ مُصر تھے۔ اُنہیں اوقات کار میں تعین کرانا تھا۔ رہنے کے لئے بہتر مکانات حاصل کرنا تھے۔ اُجرت میں اضافہ کی ضرورت تھی وغیرہ وغیرہ۔ ان کے حصول کے لئے اُنہوں نے یکجہتی کے ساتھ شور وغل مچانا شروع کیا۔ وہ اتحاد کے مسلک پر عمل پیرا ہوئے۔ اور جابجا مجالس قائم کر کے مالکان کاروبار کے خلاف متفقہ طور پر صدائے احتجاج بلند کرنے لگے۔

یہ شور وغوغا سرمایہ داروں کو کب بھانے والا تھا۔ اُنہوں نے گربہ کشتن روز اوّل، کے اصول پر نوجوان مزدور اور ان کی مجالس کو کچل دینے کا ارادہ کیا۔ جلد ہی ان کی تمام مجالس خلاف قانون قرار دی گئیں۔ پے در پے گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اور کچھ عرصہ کے لئے ان کا تدارک ہو گیا۔ مگر یہ آگ بجھنے والی نہ تھی۔ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ پھر بھڑک اُٹھی۔ بغاوت کے عَلَم اُٹھنا شروع ہوئے۔ ہڑتالوں کا زور شور ہوا۔ مشینوں اور عمارتوں پر حملے کئے گئے۔ لیکن بیچارے مزدوروں کی

طاقت ہی کیا تھی ۔ آخر کار سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اب سوائے اس کے کوئی صورت نہ رہی کہ خود حکومت سے چارہ جوئی کی جائے۔ اراکین پارلیمنٹ کو اپنا ہمنوا بنایا جائے اور ان سے مدد لی جائے۔ لہٰذا "تعین معاوضہ" کے لئے ایک مسودہ پیش کیا گیا۔ لیکن مجلس قانون ساز نے اس کو منظور کرنے سے قطعی انکار کیا۔ مزدوروں کا دل ٹوٹ گیا۔ حکومت کی طرف سے مدد یا انصاف کی توقع اٹھ گئی۔

اب دوسری صورت یہی تھی کہ پھر ہڑتالوں سے کام لیا جائے۔ مشینوں کو بیک وقت بیکار کرکے سرمایہ داروں کو خواب غفلت سے جگایا جائے۔ بالآخر اس تحریک کو عملی جامہ پہنانا ہی پڑا۔ اور ۱۸۰۸ء میں ہڑتالوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کی ابتدا لنکاشائر سے ہوئی۔ ۱۸۱۰ء میں نارتھمبرلینڈ کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے ہڑتال کا اعلان کیا۔ ۱۸۱۲ء میں اسکاٹلینڈ کے جلاہے برسر پیکار ہوئے۔ اس وبا نے جس کی طاقت دن بدن بڑھ رہی تھی ملک میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اور حکومت اور سرمایہ دار دونوں اس اٹھتی ہوئی طاقت کو دبانے کی فکر کرنے لگے۔

اب تک انقلابی تحریک غیر منظم اور صرف ایک جذبہ کے ماتحت تھی۔ اس کا تعلق اقتصادی یا معاشی اصولوں پر نہ تھا۔ اس کے کارکن اور علمبردار راہ عمل پر گامزن ضرور تھے۔ مگر بے علمی اور بے اصولی کے باعث جابجا ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اسی زمانہ میں لیوڈائٹ نے ۱۸۱۱ء میں ایک نئی تحریک شروع کی جس کو تمام طور پر اسی کے نام سے منسوب کرکے "لیوڈیٹز کی تحریک" کہتے ہیں۔ یہ وسطی ممالک کے مزدوروں کی ایک باضابطہ اور منظم تحریک تھی۔ ضروریات وقت اور اصول معاشیات پر اس کی بنیاد تھی۔ جلد ہی اس کو مقبولیت عام حاصل ہوئی۔ اور وہ اپنے حدود سے نکل کر لنکاشائر اور یارک شائر تک پہونچی اس تحریک کو بیباک کرنے کے لئے جو صورتیں اور تدبیریں ہو سکتی تھیں اختیار کی گئیں مگر لیوڈزم روز بروز ہر دل عزیز ہی ہوتا گیا۔ اور جابجا مزدوروں کی مجالس اس کے بنائے ہوئے طریقوں پر کاربند ہونے لگیں۔

لیکن قضا و قدر کو ابھی کچھ اور ہی منظور تھا۔ جنگ نپولین آ پہونچی۔ اور ترقی کی سد راہ بنی۔

خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ جذبات کی راہ بدل گئی۔ مال و دولت، ملک کے نام پر نثار ہونے لگے۔ اور ایسی کساد بازاری پھیلی کہ کاروبار کی فراوانی اور تجارتی منافع خواب وخیال ہوکر رہ گئے۔ خود سرمایہ داروں کی حالت تباہ تھی۔ کارخانے بند ہورہے تھے۔ ملازمین برطرف کئے جارہے تھے۔ بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ایسی حالت میں مزدوروں کی کسی تحریک کا کامیاب ہونا اصولاً ناممکن تھا۔

خدا خدا کرکے ۱۹۱۸ء میں لڑائی کا خاتمہ ہوا۔ اور صلح کا زمانہ آیا۔ صورت حال تبدیل ہونا شروع ہوئی بازاروں میں کچھ کچھ جان آئی۔ تجارت کو کچھ فروغ ہوا لیکن ابھی اطمینان کا پورا جھونکا بھی نہ چلنے پایا تھا کہ زراعتی کساد بازاری نے پھر نقشہ بدل دیا۔ کاشتکار بھوکے مرنے لگے۔ ساہوکاروں اور بنکوں کا دیوالہ نکلنے لگا۔ کارخانوں میں مزدوروں کی کثرت ہوگئی۔ اور کثرت کے ساتھ معاوضوں میں قلت، اور اسامیوں میں کمی۔ اس وقت انقلاب پسندوں کو پھر موقع ہاتھ آیا۔ کاروباری مصائب کو دور کرنے کے لئے انھوں نے "اصلاحی تحریک" پیش کی۔ وہ ملازموں اور مزدوروں کی حالت کو بہتر کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کے خیال سے کاروباری مصائب کے دور کرنے کا اصلاح کے علاوہ کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ لیکن ان کے مسودے روک گئے۔ اُن کے عذرات کو سننے سے انکار کیا گیا۔ ان کو حکومت اور سرمایہ داروں کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہ تھا۔ اور یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ مطیع اور فرمانبردار ملازم کی طرح صبر و شکر کے ساتھ اپنی زندگی گذاردیں گے۔

مگر اب جمہوریت کا رنگ جم چلا تھا۔ مدنیت کے حقوق پامال نہیں کئے جا سکتے تھے۔ سرمایہ داری کے خلاف یورش تھی۔ مزدوروں میں بیداری، اتحاد، تعلیم، سب کچھ آچکے تھے۔ پھر وہ غلامی کیوں کرتے مصیبتیں کیوں جھیلتے "اصلاحی بل" کا رد ہونا تھا کہ ایک آگ بھڑک اٹھی۔ لڑائیاں، جھگڑے، ہڑتال، اور بغاوت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اہل ملک و دول کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک زور و شور کے ساتھ قائم رہا۔ اور وہ زمانہ آپہونچا جب سرمایہ دار اور حکومت دونوں کو مزدوروں کے عذرات سننے اور ان کی تکالیف کا ازالہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اب مزدور با اقتدار تھے۔ وہ مطالبات پیش کر سکتے تھے، مشورے دے سکتے تھے۔ اپنی ضروریات

کو پورا کرانے کے لئے حکومت کو مجبور کر سکتے تھے۔ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۳۰ء تک دس برس کا وہ زمانہ تھا جب مزدوروں کی طاقت کی ابتدا ہوئی۔ اور ملک میں ان کا اقتدار پھیلا۔ ۱۸۲۴ء میں ان کی اتحادی مجالس کے خلاف جو قانون وضع کیا گیا تھا واپس لیا گیا اور ان کو بلا خوف و خطر اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ اصلاحات کا بل بھی تین بار رد ہونے کے بعد بالآخر ۱۸۳۲ء میں پاس ہی ہوگیا۔

اب مجموعی طور پر مزدوروں کی حالت ایک گونہ سنبھل چکی تھی۔ ان کی مجالس کو قانونی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اصلاح کے لئے احکامات صادر ہو چکے تھے۔ مگر اب بھی ارکین پارلیمنٹ سرمایہ داروں کی طاقت اور دولت سے متاثر اور مرعوب تھے اور کوئی قانون ان کے خلاف وضع کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ مزدور طبقے سے نہ ان کو کوئی ہمدردی تھی۔ اور نہ ان میں کوئی ان کا ہم خیال تھا۔ لیکن ان غریبوں کو اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے بہر نوع حکومت ہی کی مدد درکار تھی۔ اور مجلس قانون ساز کی مخالفت کے باوجود ان کو ان ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ ابھی فضا بدلی نہیں تھی کہ ان کی قومی مجلس کے لیڈران نے اپنے مطالبات کی ایک فہرست جو "چارٹر" کے نام سے مشہور ہے۔ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی۔ اس کے نکات حسب ذیل تھے :۔

۱۔ تمام بالغ مردوں کو رائے اور ووٹ دینے کا حق دیا جائے۔

۲۔ ہر شخص کو اپنی رائے پوشیدہ طور پر دینے کا حق حاصل ہو۔

۳۔ پارلیمنٹ کے ارکین کا سالانہ انتخاب عمل میں لایا جائے۔

۴۔ پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے جائداد کی قید اٹھادی جائے۔

۵۔ ممبروں کو معاوضہ دیا جائے۔

۶۔ انتخابی اضلاع کے حدود ہر دو سال کی آبادی کے لحاظ سے قائم کئے جایا کریں۔

۱۸۳۹ء میں اس تحریک کے حامیوں کی ایک مجلس قائم ہوئی جس نے گورنمنٹ سے یہ درخواست کی کہ ان کے مطالبات کو قانونی شکل میں پاس کر دیا جائے۔ اور مزید برآں ایک ایسی مجلس قائم کی جائے جو عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر انقلابی تحریک پر پوری طرح عمل درآمد کرے۔ لیکن یہ درخواست نامنظور کی

گئی۔ اور مزدور طبقے کو پھر چیخ و پکار کا موقع ملا۔ انہوں نے فوراً ہی ایک زبردست ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اور اس پر قومی رنگ چڑھا کر تمام ملک میں مزدوروں کی تعطیل کرا دی۔ اس ہڑتال کا نام "قومی تعطیل" رکھا گیا۔ اب مزدوروں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی۔ اور وہ اپنے مطالبات کے حصول کے لئے آئے دن کوئی نہ کوئی نئی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں نیو پورٹ میں مزدوروں کا زور شروع ہوا۔ وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ مینمتھ کی طرف بڑھے اور اپنے ان لیڈروں کو جو جیل میں زندگی کے دن کاٹ رہے تھے رہا کرانے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن یہ حملہ ناکامیاب رہا۔ سرکاری فوج نے ان کو پسپا کر دیا۔

۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۲ء تک متوسط طبقے کے لوگوں نے "قانون گندم" کے خلاف ایک تحریک پیش کی اس تحریک نے جلد ہی گیہوں کے تجار اور دیگر لوگوں میں مقبولیت حاصل کی۔ جوزف اسٹرج اور کوبڈن اس کے روح رواں تھے ۱۸۴۲ء میں بالغ مردوں کو رائے دینے کا حق حاصل کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں اسٹرج اور اس کے ساتھیوں نے بھی حصہ لیا۔ اور ان چھ نکات کو جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، منظور کیا۔ لیکن بالآخر اس کانفرنس کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لاوٹ اور اس کے ساتھی اپنے اصولوں سے ہٹنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے مطالبات کی فہرست بجنسہ منظور کی جائے ایسی صورت میں کسی کامیابی کا حاصل کرنا مشکل تھا۔ مگر ۱۸۴۲ء میں اس کانفرنس کا اجلاس ایک بار پھر منعقد ہوا۔ ابکی لاوٹ اور اس کے ساتھی کمزور ہو چکے تھے۔ اور ان کی تعداد میں کمی ہو گئی تھی۔ مگر چارٹسٹ پورے عروج پر تھے۔ انہوں نے اپنے مطالبات منظور کرا لئے اور موجودہ حکومت پر اثر ڈال کر اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے کی کوششیں کرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کاروبار تجارت کو فروغ ہو چلا تھا۔ اور سرمایہ داروں کی مالی حالت اس قابل ہو گئی تھی کہ مزدوروں کے اکثر مطالبات کو پورا کر سکتے۔ مگر یہ دن گنتی کے تھے۔ جلد ہی تجارت میں پھر گھاٹا شروع ہو گیا۔ اور چارٹسٹ کی تمام امیدیں فنا ہو گئیں۔ اس وقت ہڑتال یا بغاوت کے حربے بیکار تھے۔ مگر یہ بات ناسمجھ چارٹسٹ کی سمجھ سے باہر تھی اس نے اس وقت بھی اپنی معمولی طاقت سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ لیکن سب کے سب گرفتار ہوئے اور جو باقی بچے تھے۔ بھاگ گئے۔

گو چارٹسٹ تحریک "ختم ہوگئی اور ۱۸۴۸ء کے بعد اس کا نام لیوا کوئی باقی نہیں رہا مگر مزدوروں کی حالت اور اقتدار میں فرق پیدا ہو چکا تھا۔ ان کی طاقت اور اہمیت ناقابل انکار تھی۔ وہ اپنے اکثر مطالبات میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ان کی اتحادی مجالس کے خلاف قانونی روک تھام ختم ہو چکی تھی۔ اصلاحی قوانین پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا "قانون گندم" واپس لیا جا چکا تھا غرض کہ غلامی اور بے بسی کا زمانہ گذر چکا تھا گو کہ مزدوروں کو مدنیت کے تمام حقوق حاصل نہیں تھے۔ مگر ان کے حصول کے لئے شاہراہ کھل چکی تھی۔ اب ضرورت یہ تھی کہ عنانِ سلطنت فوراً ہاتھ میں لی جائے۔ سیاسی مجالس اور پارٹیاں قائم کی جائیں مجلس قانون ساز میں حصہ لیا جائے۔ اور جس طرح ممکن ہو اپنے حقوق کو منوایا جائے۔

تھوڑے ہی دنوں بعد مزدوروں کی یہ مجلسیں جواب تک سیاسی میدان سے بالکل الگ تھیں، ملک کے سیاسی شعبوں میں پوری طرح حصہ لینے لگیں۔ ان کے عروج کی حد یہاں تک پہونچی کہ پارلیامنٹ میں ان کی وزارت مسٹر ریمزے مکڈانلڈ کے تحت میں قائم ہوئی۔ اب وہ اپنے حقوق کے لئے بلا خوف وخطر لڑ سکتے ہیں اب سرمایہ دار، حکومت، اور ماہرین معاشیات سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ کامیاب کاروبار اور تجارت کو فروغ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا ہے، جب تک مزدوروں کی مالی، ذہنی، تمدنی، غرض کہ جملہ معاشی حالت قابل اطمینان نہ ہو اور وہ فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر نہ کر رہے ہوں۔

"کہ مزدورِ خوش دل کند کار بیش"

جرمنی کا سفرنامہ

برلن | بداپسٹ سے روانہ ہوکر ہم برلن پہنچے جو جرمنی کا دارالخلافہ ہے۔ اور رات کو ایک ہوٹل میں ٹھیر گئے اگلے دن صبح کو دس بجے ہمیں سرکاری افسر سے ملنا تھا جنہوں نے مہربانی فرماکر ہمارے اِدھر اُدھر جانے کا انتظام کیا تھا۔ ناظرین کو تعجب ہوگا کہ جرمنی کی حکومت نے اس قسم کی مدد ہم کو دینا کیوں منظور کی؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے جو ممالک یہ جانتے ہیں کہ دوسرے ممالک سے روپیہ اُسی وقت کمایا جاسکتا ہے جبکہ دوسرے ممالک کے باشندوں کو خوش رکھا جائے اور جہاں تک ہوسکے ان کو سہولتیں دی جائیں وہ ہی تجارت کی دوڑ میں آگے نکلتے ہیں دوکاندار کی دوکانداری ہی یہ ہے کہ وہ اپنی اشیا کے خریدار کی خاطر تواضع کرے۔ ان حکومتوں کے اندر رعونت۔ غرور اور تکبر نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو انسان سے بالا تر نہیں سمجھتے اور نہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اعلیٰ افسر ہیں معمولی آدمی کی کیوں فکر کریں۔ ہم نے آتے ہی فرانس۔ جرمنی۔ اور زیکوسلوکو کی حکومت کو اپنا منشا لکھدیا تھا اور خواہش کی تھی کہ وہ ہماری مدد کریں۔ کیونکہ ہم نہ ملک سے واقف ہیں اور نہ ان کے ملک کی زبان جانتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے اپنی سرکار کو بھی ولایت میں لکھدیا تھا کہ وہ ہماری مدد کرے۔ مگر ہماری سرکار کے جواب پہونچنے سے پہلے ہی جرمنی کی سرکار نے ہم کو لکھا کہ ہم کس قدر عرصہ وہاں گذارنا چاہتے ہیں اور کیا کیا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ پروگرام بناکر بھیج سکیں۔ اُنہوں نے یہ بھی لکھا کہ وہ اپنا ایک آدمی مفت دیں گے جو ہمیں تمام چیزیں دکھا دے گا۔ ہم نے اپنا منشا لکھ بھیجا اور سرکار نے دس روز کا جرمنی کا پروگرام بناکر بھیجدیا اور ہم کو لکھا کہ آیا ہم اس میں کوئی ترمیم تو نہیں چاہتے؟ ہماری سرکار کا جواب صرف اس قدر تھا کہ ہم کو چاہئے کہ ہم سرکاری افسر سے جو ہر ملک میں رہتا ہے جاکر ملیں اور اس کی نصیحت پر عمل کریں وہ ہماری مدد کرے گا۔ ہم نے جب یہ دیکھا کہ جرمنی سرکار نے اس قدر تکلیف ہمارے لئے برداشت کی ہے اور پورا پورا پروگرام ہمارے سفر کا دیدیا ہے تو ہمیں اپنے مشغول افسر کو تکلیف دینا مناسب نہ معلوم ہوا کیونکہ ممکن ہے ان کی ہدایات اور نصیحتوں پر ہم عمل نہ کرسکیں ممکن ہے وہ ویسی ہی ہدایات اور نصائح

ہوں جیسی کہ ہمارے یہاں ہندوستان میں دیا کرتے ہیں۔ ہمارے پروگرام میں یہ درج تھا کہ ہم ۱۰ بجے صبح سرکاری دفتر میں جاکر اس محکمہ کے بڑے افسر سے مل کر زبانی گفتگو کریں تاکہ اگر کسی اور ترمیم کی ضرورت ہو تو پروگرام میں کی جاسکے چنانچہ ہم ۱۰ بجے پہونچ گئے اور ہم نے دیکھا کہ یہ اعلیٰ افسر جو زراعتی محکمہ کے سب سے بڑے افسر تھے مع اپنے چند ماتحتوں کے ہمارا انتظار کر رہے ہیں ہم پہونچے اور انہوں نے بڑی آؤ بھگت سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم نے ان سب عنایتوں کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا انہوں نے کہا کہ ہم اب دوسرے ملک میں ہیں جہاں کے لوگ شکریہ کے لئے نہیں بلکہ ہر انسان کی اپنا بھائی سمجھ کر مدد کرنا فرض سمجھتے ہیں اور وہ ہر طرح کی مدد ہم کو دینے کو تیار رہیں۔ اگر ہم کو کسی قسم کی اور ضرورت ہو یا تکلیف ہو تو ہم فوراً اُن کو آئندہ اطلاع دے سکتے ہیں اور ضروری مدد حاصل کر سکتے ہیں سب سے پہلی بات جو ہم کو اس جگہ دکھائی دی یہ تھی کہ چپراسی سے لے کر اعلیٰ افسر تک ہر شخص کے اندر بھائی بندی کا برتاؤ تھا۔ یعنی وہ حکومت وہ رعب و داب غائب تھا۔ ہمارے ملک میں اگر ایک اعلیٰ افسر کے سامنے اس کا ماتحت جو خود بھی ایک بڑا افسر ہو پہونچتا ہے تو نہایت عاجزی اور انکساری کا برتاؤ کرتا ہے اور ہر شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ شخص ماتحت ہوگا مگر یہاں خواہ چپراسی ہی کیوں نہ ہو افسران اپنے ماتحتوں کے ساتھ نہایت خوش خلقی کے ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں گویا وہ ان کے سگے بھائی ہیں چھوٹے اور بڑے افسر آپس میں خوب گرم جوشی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں وقتاً فوقتاً مذاق کرتے ہیں خوب ہنستے ہیں ہم کو افسوس ہے کہ ہم کو جرمن زبان نہیں آتی جو ہم ان کی گفتگو کا پورا پورا لطف لے سکتے۔ مگر ہم نے بعد کو بھی جس جگہ جاکر دیکھا یہی بات نظر آئی۔ ایک افسر جب ایک ماتحت کے کمرے میں یا محض مزدور کے کمرے میں جاتا ہے تو سب کو سلام کرتا ہے۔ مزدوروں کو بار بار اٹھنے اور جھک جھک کر سلام کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بدستور پیشتر کی طرح اپنے کام میں لگے رہ سکتے ہیں جو ضرورت اس افسر کو ہوگی وہ بیان کر دے گا اور جس شخص کا وہ کام ہوگا وہ افسر کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ ایک فیکٹری کے مزدور تاش کھیل رہے تھے کچھ گانا بجانا کر رہے تھے افسر اس جگہ گیا تو یہ لوگ اپنا کام بدستور کرتے رہے۔ افسر نے ان کو سلام کیا اور مزدوروں نے خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیا جس شخص کا یہ فرض تھا کہ وہ افسر کے حکم کی تعمیل کرے اس نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس طرح ہم نے ایک اور مقام پر دیکھا افسر کے آنے پر مزدور برابر اپنے

کام پر لگے ہیں اور آپس میں باتیں کرتے اور ہنستے کھیلتے ہیں گویا کوئی بڑا افسران کے پاس ہے ہی نہیں۔ یہ بھائی بندی کا سبق واقعی ایک بڑا دلکش منظر ہے۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے واقعی جرمنی کہاں تک ایک تعجب خیز ملک ہے اور اُس نے کیوں اور کس طرح اس قدر جلد اپنی بگڑی ہوئی اور تباہ شدہ حالت کو اس قدر قلیل عرصہ میں درست کر لیا ہے۔

جرمنی کے علاقہ میں داخل ہوتے ہی آپ کو ہر طرف چمنیوں کی بھرمار ملے گی اور ہر طرف کوئی نہ کوئی چیز بنتی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ مشکل کیا بلکہ ناممکن ہے کہ آپ مختلف قسم کے کارخانوں کو آسانی سے دیکھ سکیں کیونکہ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس لئے ہم نے صرف چند قسم کے کارخانے اور زراعتی ادارے دیکھنے پر اکتفا کی اور ہم صرف انہیں کا حال ناظرین کے روبرو پیش کریں گے۔ ناظرین کے لئے غالباً یہ بات دلچسپی کی ہوگی کہ جرمنی ان عجیب ممالک میں سے ہے جہاں ہر چیز سے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو اشیاء ہمارے ملک میں آتی ہیں وہ اکثر ایسی چیزوں سے بنی ہوتی ہیں کہ ان کا خواب و خیال بھی ہم کو نہیں ہو سکتا۔ ایک سرکاری اعلیٰ افسر سے ایک روز گفتگو ہو رہی تھی تو میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کوئی ایسی فیکٹری دیکھنا چاہتا ہوں جہاں پر آلو وغیرہ ترکاریوں سے بٹن بنائے جاتے ہیں انہوں نے کہا کہ جرمنی میں ایسی مختلف چیزوں سے اشیاء بنائی جا سکتی ہیں کہ ان کا پتہ لگنا مشکل ہوتا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ خود جرمن ہیں ان کو بھی بہت سی اشیاء کے متعلق یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس چیز سے بنائی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر خون سے بٹن بنائے جاتے ہیں اور دیگر مختلف اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ ہڈیوں سے سینکڑوں قسم کی اشیاء بنتی ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ کسی ایسی فیکٹری کو دیکھیں جہاں پر ہڈیوں سے کھاد بنایا جاتا ہو۔ مگر ہم کو بتایا گیا کہ جرمنی میں ہڈی ایسی بیش قیمت چیز ہے کہ اس کو کھاد کے کام میں بہت کم لایا جاتا ہے۔ ہم نے ایک فیکٹری کو دور سے دیکھا جو مصنوعی کارک بناتی ہے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کارک عموماً لکڑیوں کی چھال سے بنائے جاتے ہیں۔ دودھ کے اندر سے ایک چیز نکلتی ہے جس کو انگریزی میں CASEIN کیسین کہتے ہیں اس سے ہزاروں نہایت رنگین اور خوشنما اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ جرمنی میں یہ کوشش کائی ہے کہ جو چیز قدرت نے پیدا کی ہے اس سے کوئی نہ کوئی کارآمد شے ضرور بالضرور بنائی جا سکے۔ اور جرمنی کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضروریات کو مصیبت آنے پر

ہزاروں قسم کی چیزوں کے بنانے میں ضرور بدل سکیں گے لڑائی کے زمانہ کا اگر ہم حال لکھیں کہ جرمنی میں کون کون اشیاء ایسی تھیں جن سے کھانے اور مویشیوں کے چارہ کا کام لیا گیا تھا تو لوگوں کو تعجب ہوگا مگر ہم ان پر تفصیلی بحث کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

برلن ایک بہت بڑا شہر ہے اور میلوں کے اندر آباد ہے اس میں ہزاروں قسم کی اشیا بنتی ہیں اور قریب قریب ہر حصہ ملک کے اندر جو اشیا بنتی ہیں ان سب کارخانوں کے دفتر اس شہر میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے لئے سرکار کی طرف سے دو افسر تعینات تھے دونوں ڈاکٹر کی ڈگری لے چکے تھے اور نوجوان تھے ان میں سے ایک زراعتی واقفیت رکھتا تھا مگر انگریزی نہ بول سکتا تھا اور دوسرا افسر انگریزی بہت عمدہ بولتا تھا مگر اس کی زراعتی واقفیت اس قدر زیادہ نہ تھی۔ اسی وجہ سے دو افسروں کے لینے کی ضرورت ہوئی۔ سب سے پہلے ہم نے ایک زراعتی فارم کو دیکھا جہاں پر پوٹاش کی کانیں ہیں اور کافی تعداد میں سلفیٹ آف پوٹاس اور کلورائڈ آف پوٹاش جرمنی سے باہر دیگر ممالک کو جاتی ہے۔ جرمنی کی طرف سے قریب قریب سب ممالک کے اندر اس کی ضرورت بتانے کے لئے آدمی رہتے ہیں اور اس جگہ پر مختلف قسم کے پودوں پر پوٹاش اور دیگر کھادوں کے تجربات کئے جاتے ہیں کہ کس کھاد کا کس پودہ پر ڈالنے سے کیا اثر ہوگا۔ دنیا بھر کے اندر جس قدر فصل پیدا ہوتی ہے وہ سب کی سب یہاں موجود ہے اور اس پر تجربات کئے جاتے ہیں۔ ہم کو تعجب تھا کہ کس طرح جرمنی کے لوگ ہمارے ملک کے پودوں پر جن کو بہت گرمی کی ضرورت ہو تجربات کرتے ہوں گے افسر زراعت ہم کو یہ دکھانے کے لئے ایک مکان کے اندر لے گئے اور وہاں اُنھوں نے ایک مشین دکھائی جس سے ہر ملک کے پودے کو اس ملک کی آب و ہوا اور ٹمپریچر کے مطابق سردی گرمی اور رطوبت پہنچائی جا سکتی تھی۔ عموماً ہندوستان اور دوسرے ممالک کے اندر اس کام کے لئے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ یا تو نیچے آگ جلا کر پودوں کو مصنوعی گرمی پہونچائی جاتی ہے یا ان کو کسی طرح گرم پانی پہنچا کر گرم رکھا جاتا ہے یا سورج کی گرمی زیادہ کر کے مصنوعی گرمی دیتے ہیں مگر اس ذریعہ سے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوتی۔ اس جگہ اس مشین کے ذریعہ اب سرد سے سرد اور گرم سے گرم اور خشک سے خشک اور مرطوب سے مرطوب آب و ہوا پیدا کر سکتے ہیں اور اس وجہ سے جو پودے اس جگہ اُگائے جاتے اور

جو تجربات ان پر کئے جاتے ہیں وہ زیادہ اعتبار کے قابل کہے جا سکتے ہیں۔ بہت سے عالم اس جگہ مختلف پودوں کے متعلق تحقیقات کر رہے تھے جن کے ایک ایک اوزار کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ صرف یہ بات معلوم کرنے کے لئے کہ ایک پودوں مثلاً گیہوں کی نالی کے حصہ کے اندر کی کوٹھڑیاں کس قسم کا کھاد دئے جانے پر یا کس کھاد کے کم ہو جانے سے پھٹتی ہیں ایک نہایت نازک مشین بنائی گئی ہے۔ جو نالی کو نہایت باریک کاٹ دیتی ہے اور اس کو خوردبین میں تین سو گنا بڑھا کر دیکھا جا سکتا ہے اور اس کی صحیح تصویر بن سکتی ہے۔ اب تک بہت ملکوں میں یہ طریقہ ہے کہ خوردبین میں پودہ کو دیکھتے جاتے ہیں اور اس کی تصویر ہاتھ سے بناتے جاتے ہیں جس سے نہ تو اسکیل ٹھیک رہ سکتی ہے اور نہ تفصیل آ سکتی ہے مگر اس جگہ ایک آلہ ہے جو کہ اس کی بالکل ہو بہو تصویر تین سو گنی بڑھا کے سکتا ہے۔ جو لوگ کام کرتے ہیں اگر ان سے آپ بات کریں تو وہ یہ فرض نہیں سمجھتے کہ ہر وقت جا اور بیجا طور پر پوٹاش کے کھاد کی تعریف کریں۔ بلکہ جو چیز ان کے نزدیک جیسی ثابت ہوتی ہے وہ اس کو ویسا ہی بیان کریں گے۔ جس پودے کے اندر ان کے خیال میں پوٹاش سے کوئی خاص فائدہ نہیں دیکھا گیا ہے وہ کہدیں گے کہ ان کے تجربہ میں ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ پھل دار پودوں کے لئے یہاں خاص تحقیقات جاری تھی کہ کس طرح بونے سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں کسی درخت کو بہت زیادہ بڑھتے رہنے دیا جائے تو پودہ بہت زیادہ خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے اور اس پر پھل کم آتے ہیں۔ ان کے خیال میں پودہ کو قلم کر دینا چاہیئے کیونکہ صرف پودوں کے اس حصہ پر پھل آتے ہیں جس کی کونپلیں نئی پھوٹی ہوں۔ ایسا کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پودے کے نیچے کوئی چیز پیدا کی جا سکتی ہے اور اس کو سایہ سے نقصان نہیں پہونچتا۔ چنانچہ ہم نے سیب کے درخت پھلوں سے لدے ہوئے دیکھے اور ان کے نیچے مختلف قسم کی ترکاریاں نہایت عمدہ حالت میں اُگی ہوئی تھیں۔ اس انسٹی ٹیوشن کا یہ بھی کام ہے کہ وہ نئی نئی فصلوں کے متعلق تجربات کرے کہ ملک کے اندر کونسی فصل رائج کی جا سکتی ہے۔ غرض ہر طرح سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکے۔

ایک جگہ ہم نے اس فارم کو دیکھا جہاں پر کہ شہر کا تمام گندہ پانی جمع ہوتا ہے اور اس سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ برلن بمبئی سے دوگنا شہر ہے شاید اس سے بھی زاید ہو۔ اس شہر کا تمام غلیظ پانی ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں

کس قدر زیادہ ہو گا۔ مگر اس کو فضول دریا میں نہیں بہایا جاتا۔ کیونکہ جرمن جانتے ہیں کہ اس سے دریا کے پانی کو گندہ کرنے کے علاوہ جب ہزاروں من اجناس اس سے پیدا کی جاسکتی ہیں تو کیوں اس کو یہ مفید کام لیا جائے ہمارے ملک کے شہری ممبران کی طرح وہ اس پانی کو فضول پھینکنے کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ تمام شہر کے پانی کو ایک جگہ لا کر بڑے بڑے تالابوں میں جمع کر دیا جاتا ہے ۔ تاکہ تمام مٹی وغیرہ نیچے بیٹھ جائے اور صرف پانی رہ جائے ۔ ایک بہت بڑے رقبہ اراضی کے لئے جس میں پہلے کچھ بھی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ اس پانی کو بطور آب پاشی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس سے چارہ وغیرہ دیگر اجناس پیدا کی جاتی ہیں اس رقبہ زمین کو مختلف کاشتکاران کو دے دیا گیا ہے جو کھیتی کرتے ہیں اور میونسپلٹی کو لگان ادا کرتے ہیں زیادہ تر اس جگہ چارہ ، آلو اور چقندر بویا جاتا ہے۔ کبھی کبھی مکئی کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ ہم نے دریافت کیا کہ ترکاریاں آلو چقندر اس سے پیدا کرنا صحت کے لئے مضر کیوں نہیں سمجھا جاتا تو ہم کو بتایا گیا کہ یہاں کی اراضی میں جو سبزی پیدا ہوتی ہے اس میں کوئی مضر صحت بات نہیں پائی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری جگہ پائی جاتی ہو۔

اس کے بعد ہم ایک کسان کا فارم دیکھنے کے لئے گئے اس کے پاس پچاس بیگہ اراضی ہو گی. اور یہ خاندان اسی جگہ دو سو سال سے کھیتی کرتا ہے۔ سارے گاؤں کا یہی کھیا تھا۔ اس کا مکان ہم نے دیکھا تو ہمارے ہوش باختہ ہو گئے۔ نہایت آراستہ و پیراستہ مکان۔ سامان جو مکان کے اندر تھا وہ بہت قیمتی تھا۔ نہایت صاف ستھرا۔ مکان میں کھانا پکانے کے دو کمرے تھے ایک میں گرمی کے موسم کے لئے اور دوسرا جاڑے کے لیے۔ اس وقت کھانا پک رہا تھا۔ ہم اندر گئے تو دیکھا دھوئیں کا نام نہیں ہم کو خیال ہوا کہ بجلی یا گیس سے کھانا بن رہا ہو گا مگر دیکھا کہ کوئلہ اور لکڑی جلائی جا رہی ہے۔ مکان میں ۵۰۰ گائیں تین گھوڑے ۵ سور اور مرغیاں تھیں۔ اور ایک بہت بڑا گودام سامان رکھنے کا تھا۔ ٹریکٹر چلانے کے لئے موجود تھا جو اس کی اراضی اور دیگر کاشتکاران کی بھی اراضی جوتتا تھا کٹی کاٹنے کے لئے مشین علیحدہ تھی۔ غرض ہر طرح سے یہ جگہ ایک رئیس آدمی کی معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے مذاقاً دریافت کیا کہ کیا وہ خود ہی ہل چلاتا اور کھیتی باڑی کے دوسرے کام کرتا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ سب کام خود کرتا ہے مگر وہ چونکہ اکیلا ہے اور بچے چھوٹے ہیں اس وجہ سے چند

ملازم بھی رہتے ہیں جن کو فی کس تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور کھانا اور کپڑا دیا جاتا ہے۔ اس کے مکان میں ایک خاص تعداد میں کتابوں کا مجموعہ تھا۔ مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے بہت عمدہ ڈرائنگ روم تھا۔ مکان کے پیچھے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جس میں پھلدار درخت تھے اور سبزیاں گھر کے خرچ کے لئے پیدا ہوتی تھیں

اگلے روز ہم نے ڈیری دیکھی جو شہر کو دودھ مہیا کرتی تھی۔ شہر میں صرف ۲ ڈیریاں تھیں جن سے سارے شہر کو دودھ مہیا ہوتا تھا۔ یہ بہت بڑا مکان تھا جس میں ہزاروں آدمی ملازم ہونگے۔ تمام دودھ ٹین میں بھر بھر کر یہاں لایا جاتا تھا اور ایک سنٹیریفیوگل مشین سے چھان کر صاف کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دودھ کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا۔ اور وہاں اس کو گرم کرکے تمام جراثیم مار دئیے جاتے تھے اور پھر اس کو ٹھنڈا کرکے فروخت کرنے کے لئے بوتلوں میں بھر کر باہر بھیج دیا جاتا تھا۔ جو باقی بچتا تھا اس کا مکھن اور مکھن کے دودھ کا پنیر بنا یا جاتا تھا۔ یہ جگہ نہایت صاف رکھی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ سب کام ایک کمیٹی کرتی ہے مگر اس کمپنی کے اندر کافی حصہ داروں کی تعداد دودھ بہم پہونچانے والوں کی تھی۔ نرخ دودھ کا سرکار کی طرف سے مقرر تھا تا کہ کوئی شخص زیادہ روپیہ وصول نہ کرلے۔ تمام جرمنی کے اندر ہر بوتل دودھ کے اوپر یہ تحریر کرنا پڑتا ہے کہ وہ بوتل کس کارخانہ کی ہے اس میں کتنا دودھ ہے اور کس روز وہ بوتل بھری گئی ہے اور یہ بھی لکھنا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی پانی وغیرہ کی ملاوٹ نہیں ہے اور اس کے جراثیم ہلاک کئے گئے مگر اس پر بھی اکتفا نہ کرکے سرکار کی جانب سے کافی نگرانی ہوتی ہے اور اگر کسی شخص کے متعلق کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو اس کو کڑی سزا دی جاتی ہے اور اُس کا لائسنس ضبط کرلیا جاتا ہے۔ ایک بات ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے بتا دینی ضروری سمجھتے ہیں کہ جرمنی کی حکومت اس بات میں یقین نہیں رکھتی کہ قانون کو وضع کرنے کے بعد اس کی تعمیل وعدم تعمیل کی پرواہ نہ کی جا ے بلکہ اس کی پابندی اس طرح کی جاتی ہے کہ کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرہی نہیں سکتا۔ جرمنی میں لوگوں کے اخلاق کی بلندی ایک سرکاری فرض ہے اس لئے ہمیشہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے جس سے لوگ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے بھائی بندوں کو نقصان پہونچے یا دھوکہ ہو اور اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس کو کڑی سزا دی جاتی ہے تاکہ دیگر لوگوں کو عبرت ہو۔ ہم نے ایک شخص سے چند سوالات ایسے کئے جس سے اس کو یہ معلوم ہوا کہ ہم کو یہ شبہ ہے کہ جرمنی میں لوگ آمیزش کرنے کی کوشش کرتے ہونگے

اور ضرور کچھ نہ کچھ ملاوٹ دودھ وغیرہ میں کرتے ہوں گے اس نے نہایت پُرجوش لہجہ میں جواب دیا کہ جرمنی کے اندر حکومت ہوتی ہے اور کوئی شخص ایسی حکومت میں قانون کی خلاف ورزی کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا ہمارے ملک میں بھی حکومت ہوتی ہے اور آئے دن ہزاروں نوجوان جیل کے اندر بلا مقدمات چلائے مہینوں اور برسوں کے لئے بند کردئے جاتے ہیں مگر کیا مجال کہ اس قسم کے جرایم کے انسداد کے لئے سرکار کے کانوں پر جوں بھی چل جائے۔ البتہ اگر کوئی میونسپل بورڈ اس کام میں زیادہ دلچسپی لے تو اس کے راستہ میں روڑا اٹکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس کے بعد ہم نے ایک اور سرکاری زراعتی تجربہ کے فارم کو دیکھا جس کے اندر بہت سی باتیں قابل ذکر ہیں مگر ناظرین کی دلچسپی کے لئے صرف ایک بات کا ذکر کردینا کافی ہے۔ اس فارم میں چند سال سے کامیاب تجربات کئے جارہے ہیں کہ گیہوں۔ جو چنے کی فصل کو بونے کے بعد ایک ماہ کے جب فصل اُگ آئے تو ان کھیتوں میں گاجر۔ رزقہ کلوور وغیرہ کوئی فصل بو دی جائے اور جب فصل گیہوں کی کٹ جائے تو کلٹی ویٹر سے اس کو اچھی طرح ملا کر ٹھیک کردیا جائے تو اس طرح ایک فصل کی بجائے دو فصلیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ یہ طریقہ نہایت کامیاب ثابت ہوا ہے اور اب چند کاشتکار بھی اس پر عمل کر رہے ہیں ناظرین کو یاد رکھنا چاہئے کہ تمام جرمنی میں تمام اجناس ہمیشہ قطاروں کے اندر بوئی جاتی ہیں اور اس وجہ سے اس قسم کے تجربات میں آسانی ہوتی ہے۔

پھر ہم نے مذبح خانہ کو دیکھا۔ جہاں سے تمام شہر کو گوشت بہم پہونچایا جاتا ہے۔ اس جگہ پر ہزاروں گائے۔ بچھڑے۔ سور۔ بھیڑ۔ وغیرہ ذبح ہونے کے لئے کاشتکاران لاتے ہیں اور اس خیال سے کہ کاشتکاروں کے ساتھ بے ایمانی نہ ہو سرکاری ملازمین پہلے مویشیوں کی جانچ کرکے کم سے کم قیمت مقرر کردیتے ہیں۔ اس سے زاید قیمت پر ہی مویشی قصابوں کو خرید کرنے ہوں گے۔ بہت سے قصاب وہاں جمع رہتے ہیں اور اگر یہ لوگ آپس میں مل کر خرید کرنا شروع کردیں تو ان کو کڑی سزا دی جاتی ہے یعنی اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ہر روز کسانوں کی طرف سے ایک ہوشیار مکھیا یا زائد آدمی سرکار کی طرف سے اس بات کی دیکھ بھال کے لئے رکھے جاتے ہیں کہ کوئی شخص بے ایمانی کرکے یا آپس میں

مل کر کسان کو نقصان نہ پہونچا سکے۔ ہر مویشی کی قیمت کے ساتھ ساتھ اُس کے بیمہ کی فیس ادا کرنی ہوتی ہے۔ جب جانور فروخت ہو چکتا ہے تو اس کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی جانور ذبح کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کی قیمت بیمہ کمپنی ادا کر دیتی ہے اور اس جانور کو دوسرے کام کے لئے ذبح کیا جاتا ہے۔ ذبح کرنے کا کام مشینری سے کیا جاتا ہے جس سے کھال گوشت وغیرہ تمام اجزاء ایک دم الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر ایک قصاب کا گوشت، گوشت کے بازار میں بھیجا جاتا ہے جہاں اس کو برف کے اندر ٹھنڈا رکھا جاتا ہے اور وہاں سے یہ بازاروں میں جاکر فروخت ہوتا ہے۔

اس جگہ ایک بہت بڑا انسٹی ٹیوٹ کھانڈ کے متعلق ہے جہاں شیرہ۔ کھویہ۔ کھانڈ وغیرہ کی تحقیقات ہوتی ہے اس کو بھی ہم نے دیکھا اس کے کارکنان سے بات چیت کی اُنہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے ہماری باتوں کے جوابات دئے اور فرمایا کہ اگر ہم اپنا شیرہ وغیرہ وہاں روانہ کریں گے تو وہ لوگ نہایت خوشی کے ساتھ اس کے متعلق واقفیت بہم پہونچانے کا کام کریں گے۔ جرمنی کے اندر جس قدر شیرہ پیدا ہوتا ہے وہ سب کا سب مختلف اشیاء کے بنانے میں کام آجاتا ہے۔

شام کو ہم دوبارہ سرکاری افسر سے ملے کیونکہ اگلے دن ہمارے وہاں سے چلے جانے کا پروگرام تھا۔ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمارے سفر کا حال دریافت کیا اور پھر ہر طرح کی سہولت بہم پہونچانے کے لئے کہا۔ ہم نے خواہش ظاہر کی کہ اگر ممکن ہو تو ہم دو روز اور جرمن کے اندر رہ کر اپنا دورہ شروع کریں مگر اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہوگا کیونکہ تمام افسران کو اطلاع دے دی گئی ہے اس لئے وہاں سے ہم اگلے دن لیپزگ اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گئے۔

<u>لیپزگ</u> | لیپزگ کے اسٹیشن پر ہم ٹھیک وقت پر پہونچ گئے مگر بدقسمتی سے جن لوگوں سے ہم کو ملنا تھا ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ وہ اتفاق سے ہماری تلاش میں رہے اور ہم ان کی تلاش میں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں آخر ہم نے سوچا کہ ہم نمایش کے دفتر میں جن لوگوں سے پہلے سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ اور جن سے ملنا ضروری تھا مل لیں۔ چنانچہ ہم ایک موٹر لے کر اس مقام پر گئے۔ لیپزگ ایک بہت بڑا شہر جرمنی میں ہے اور یہاں تمام قسم کی مشنری کی سال میں دوبار نمائش ہوا کرتی ہے۔ نمائش کے لئے پختہ مکانات اور تمام سامان کی

دوکانیں وغیرہ مستقل طور سے بنی رہتی ہے۔ سب سے بڑی نمائش تو مارچ میں ہوتی ہے۔ دوسری اگست میں۔ ان لوگوں سے جاکے ملے تو دیکھا ایک عالیشان عمارت میں سینکڑوں آدمی یہ ہی کام کر رہے ہیں کہ کس طرح اس نمائش کی زیادہ سے زیادہ شہرت کی جا سکے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ دوسرے ممالک سے یہاں آکر جرمنی شین کو دیکھیں اور ان کی فروخت میں سہولت ہو۔ اس نمائش کے نظام کو اشیاء کی فروختگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم ان لوگوں کے پاس پہونچے اور ہم نے سب سے پہلے اپنی مصیبت بیان کی۔ انہوں نے فوراً ریل کو فون کیا کہ ان لوگوں کو تلاش کر کے ہمارے پاس بھیج دیا جاوے۔ ریل والوں نے فوراً تلاش شروع کر دی اور چند منٹ کے اندر اندر ہی ہم کو جواب ملا کہ وہ تشریف لا رہے ہیں اور ہم کو کسی تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات معلوم کر کے جان میں جان آئی اور ان لوگوں سے بات چیت شروع ہوئی۔ انہوں نے اس بات پہ بڑا زور دیا کہ ہم کو یہ موقعہ ہاتھ سے نہ کھونا چاہئے کیونکہ اس موقعہ پر تمام جرمنی کے بڑے بڑے مشین بنانے والے اپنی مشینیں اس جگہ لاتے ہیں اور ان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہماری مطلب براری کا اس سے زیادہ اچھا طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے طے کیا کہ واپسی بھی اسی راستے سے ہو۔

اس عرصہ میں یہ لوگ آگئے اور ہم سیدھے اس جگہ کی سب سے بڑی زراعتی ہل بنانے والی فیکٹری میں جس کا نام رود سیک ہے گئے۔ یہ قریب ساٹھ سال کی پرانی فیکٹری ہے اور تمام قسم کے ہل ہیرو کلٹی ویٹر اور ٹریکٹر جوتی کے بیل سے چلتے ہیں بناتی ہے کارخانہ کافی لمبا چوڑا ہے اور سینکڑوں قسم کے ہل اس جگہ بنائے جاتے ہیں۔ کارخانہ کو دیکھ کر واقعی آدمی کی عقل چکرا جاتی ہے۔

اس شہر میں یوں تو سینکڑوں اشیاء بنائی جاتی ہیں مگر اس وقت جرمن لوگ اس کوشش میں ہیں کہ انگریزی کی کتابیں سستی سے سستی قیمت میں نہایت خوبصورت شائع کی جائیں اور ان کو بہت سستی قیمت پر دوسرے ممالک میں فروخت کیا جائے۔ دوپہر بعد ہم اس جگہ سے اسٹٹ گارٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم کو بتایا گیا تھا کہ صبح کی گاڑی سے روانہ ہو کر ہم اس جگہ رات کے ۹ بجے پہونچ جائیں گے۔ مگر ہم کو راستہ میں معلوم ہوا کہ ہم کو ایک جگہ گاڑی بدلنی ہوگی۔ راستہ میں کوئی آدمی انگریزی جاننے والا نہ ملا مگر کسی نہ کسی طرح سے گاڑی بدل کر جان میں جان آئی اب امید ہوئی کہ ہم ضرور اپنی منزل مقصود پر پہونچ جائیں گے۔ مگر

تھوڑی دور چل کر معلوم ہوا کہ یہ گاڑی بھی آگے ایک اور مقام پر بدلنی ہوگی۔ اب بڑی پریشانی میں پڑ گئے۔ اتفاق سے ہماری مشکل حل ہونے کے لئے ایک صاحب ہمارے کمرہ میں سوار ہو گئے جو سوئٹزرلینڈ کے رہنے والے تھے اور بڑی اچھی انگریزی جانتے تھے جس غلطی میں ہم مبتلا تھے انہوں نے بھی ٹھیک وہی غلطی کی تھی۔ اور وہ بھی اس جگہ جانے کے لئے اس گاڑی سے سوار ہوئے تھے مگر چونکہ وہ جرمنی جانتے تھے اس لئے انہوں نے گارڈ سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ ہم اس گاڑی سے نورن برگ جاسکیں گے اور اس کے بعد ہم کو دوسرے روز صبح گاڑی ملے گی۔ اور وہ گاڑی اگلے دن دس بجے ہم کو پہونچائے گی۔ اس جگہ ہم کو ۹ بجے دوسرے مقامات دیکھنے کے لئے چلا جانا تھا اس لئے بڑی مصیبت کا سامنا معلوم ہوتا تھا۔ اس شریف آدمی نے ہم کو صلاح دی کہ ہم رات کو ایک مقام نوان برگ پر جو اسٹیشن کے بہت قریب ہے ٹھیر جائیں اور وہاں سے اسٹٹ گارٹ کے ہوٹل کو فون کر دیں تاکہ ہوٹل والا سرکاری افسروں کو ہمارے وقت کی اطلاع دے دیوے۔ اور وہ بخوشی اس سب کام کو انجام دیویں گے کیونکہ ان کی گاڑی ایک گھنٹہ بعد جائے گی۔ وہ بخوشی ہمارے ساتھ آئے اور انہوں نے اسٹٹ گارٹ کے ہوٹل کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ہمیں لینے کے لئے آئے تھے اور اگلے دن پھر ۹ بجے صبح آئیں گے ہم نے سب قصہ ان کو بتا دیا اور اس طرح رات بھر پریشانی میں کٹی۔ اگلے دن صبح کو دس بجے اسٹٹ گارٹ پہونچے اور خوش قسمتی سے ہم کو یہ لوگ ریل پر مل گئے اور ہم کو مختلف فارموں کے دکھانے کے لئے لے گئے۔ جہاں مختلف فصلوں پر نہایت دلچسپ تجربات کئے جا رہے تھے۔ اور سرکاری دلچسپی زراعت کے کاموں میں بخوبی دکھائی دیتی تھی۔

اس کے بعد ہم ڈیری دیکھنے کے لئے گئے۔ اس شہر کی آبادی تین لاکھ سے زائد ہے مگر دودھ کا انتظام صرف ایک کارخانہ کے سپرد ہے جس میں کچھ میونسپلٹی کے حصص ہیں اور کچھ حصص کسانوں کے۔ اور کچھ دوسرے لوگوں کے ہیں۔ برلن کی طرح دودھ کا نرخ سرکار مقرر کرتی ہے۔ اس جگہ تمام دودھ مختلف مواضعات سے آتا ہے جن کا فاصلہ ۴۰ میل تک پہونچتا ہے۔ کچھ دودھ بذریعہ موٹر لاری کے ٹین کے کنستروں میں آتا ہے اور کچھ بذریعہ ریل آتا ہے۔ اس تمام علاقہ کے دودھ میں مکھن کی تعداد زیادہ ہوتی ہے

اور معمولی دودھ کے اندر ۳۶ء۳ فیصدی گھی کی مقدار ہوتی ہے ۲۰۰۰۰ میٹر دودھ روزانہ اس جگہ پر آکر اکٹھا ہوتا ہے۔ انتظام کی خوبی اس بات سے ظاہر ہوگی کہ باوجود اس کے کہ چالیس میل تک سے دودھ لایا جاتا ہے مگر زیادہ سے زیادہ گرمیوں کے دنوں میں صرف دو ہزار میٹر یعنی ایک فیصدی سے بھی کم کھٹا ہونے پاتا ہے اور جاڑے کے دنوں میں صرف دوسو میٹر کھٹا ہوتا ہے۔ کھٹے دودھ کو الگ مکھن بنانے کے کام کے لئے رکھ دیا جاتا ہے اور صرف عمدہ دودھ فروخت ہوتا ہے۔ دودھ کے انتظام کے لئے ہر گاؤں کے اندر ایک پنچایت ہے جو ہر شخص کا دودھ دیکھتی ہے اور اس بات پر نظر رکھتی ہے کہ کوئی شخص خراب دودھ فروخت نہ کرے۔ کسی قسم کی ملاوٹ نہ کرے اور نہایت صفائی کے ساتھ دودھ کو دوہے۔ عمدہ دودھ کی قیمت یہ پنچایت کچھ زائد ادا کرتی ہے۔ دودھ کا تمام انتظام نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے کسی جگہ مٹی گرد کا نام نہیں۔ ہر ایک جگہ اور ہر ایک برتن، مشین وغیرہ نہایت صاف رکھی جاتی ہے۔ میونسپلٹی کی طرف سے اس جگہ ملازمین کے رہنے کے لئے مکانات بنے ہوئے ہیں جو نہایت خوب صورت ہیں اور بہت سستے کرایہ پر ملازمین کو دیئے جاتے ہیں ان کے کپڑوں کے دھونے کے لئے علیحدہ مشین ہے۔ کھانا پکانے۔ کھانا کھانے کے کمرے علیحدہ ہیں اور طرح طرح کا سامان جدا لگا ہے غرضکہ ہر طرح سے مزدوروں کی رہائش کا نہایت عمدہ انتظام کیا گیا ہے۔ مزدوروں کے مکانات۔ ان کے کپڑے۔ رہنے کی جگہ بھی نہایت صاف ستھری رکھی جاتی ہے

تمام دودھ معائنہ ہو کر چھانا جاتا ہے اور اس طرح گرم ٹھنڈا کرکے بوتلوں کے اندر بھر دیا جاتا ہے ہم کو بتایا گیا کہ جو مشین اس جگہ کام کرتی ہے وہ جرمنی میں سب سے نئی قسم کی ہے۔ اور نہایت عمدہ کام کرتی ہے اس کارخانہ میں زیادہ تر کام مشین سے کیا جاتا ہے۔ دودھ اسٹور میں پہنچ جانے کے بعد بوتلوں میں بند ہوجانے تک ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ اس کا مکھن بنانے میں ہاتھ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ مکھن کو بنا کر ایک روز رکھ دیا جاتا ہے اور اس کی ٹکیاں چونکہ دوسرے روز بنتی ہیں اس وجہ سے مکھن اسٹور میں لیجانے اور لانے کے لئے مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مکھن کی ٹکیہ بنانے۔ اس کے صحیح وزن کاٹنے اور اس پر کاغذ چپکانے وغیرہ میں بھی ہاتھ نہیں لگتا صرف انسان کی ضرورت یہ ہے کہ ٹکیوں کو بکس میں بند کردے اور ان کو جہاں لکھا ہو بھیجدے۔ مکھن بننے کے بعد جو دودھ بچتا ہے اس کی

دہی جماکر اسے بوریوں میں دبا دیا جاتا ہے اور اس سے جو ملائم پنیر حاصل ہوتا ہے اس کو پنیر بنانے کی فیکٹریوں میں روانہ کر دیا جاتا ہے اس کو کبھی خشک کرکے فیکٹریوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے اور اس سے ہزاروں قسم کی چیزیں کھلونے۔ لکھنے کے قلم۔ چاقو کے دستے۔ کنگھے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ اس جگہ دودھ کو سفوف بنانے کا کام بھی ہم نے دیکھا جو نہایت دلچسپ طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ دودھ کو خواہ تازہ ہو یا مکھن نکلا ہوا ایک جگہ پہلے ویکویم پین کے اندر ابالا جاتا ہے تاکہ اُس کا دو تہائی پانی خشک ہو جائے اور اس کے بعد ایک رولر جس کے اندر گرمی پہونچائی جاتی ہے اس کو نہایت باریک کاغذ کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے اور پھر اِس کو مشین سے پیس کر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے یہ مشین جرمنی میں اول قسم کی ہے۔

اس کے بعد ہم نے ایک کھانڈ بنانے کی مشین دیکھی۔ جو چقندر کا موسم نہ ہونے کی وجہ سے چقندر سے کھانڈ نہ بنا رہی تھی۔۔ اس کارخانہ کے ماتحت بہت سے کارخانے قرب و جوار میں ہیں جو صرف لال کھانڈ بنا کر اس کارخانہ کو بھیجدیتے ہیں اور یہاں اس سے سفید کھانڈ اور چائے میں ڈالنے کی ٹکیاں بنائی جاتی ہیں ... ... یہ بہت زبردست کارخانہ ہے اور کئی سو من کھانڈ کی ٹکیاں ایک دن میں اس جگہ تیار ہوتی ہیں - زیادہ تر کام مشین سے ہوتا ہے۔ کھانڈ کی کٹائی اور ڈبوں کے بنانے کی مشین وغیرہ پر تمام عورتیں کام کرتی ہیں جن کی تعداد سینکڑوں کی ہوگی۔

اس کے بعد ہم نے یہاں کا زراعتی ہائی اسکول دیکھا۔ اس جگہ سب سے عجیب رواج یہ ہے کہ صرف وہ طلباء لئے جاتے ہیں جو بارہ سال معمولی مدرسوں میں تعلیم پا چکے ہوں اور اس کے بعد کم سے کم دو سال کھیت پر کھیتی اپنے ہاتھ سے کر چکے ہوں۔ اعلیٰ افسران سے گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا یہ خیال ہے کہ جب تک لڑکے کھیتی کرنے کے بعد اسکول یا کالج میں نہیں آتے ان کو کھیتی کرنے کی طرف رغبت نہیں ہوتی اور ان کا کام صرف کتابی ہوتا ہے جس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ہی وہ کسان بننا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اس خیال کو پسند نہیں کرتے کہ تعلیم ختم کر دینے کے بعد کسان کا کام کرنے کے لئے لڑکوں کو مجبور کیا جائے۔ انھوں نے اپنی یہ رائے تجربہ کی بنا پر قائم کی ہے۔

کہ زراعت کی اعلیٰ تعلیم سے پہلے کھیت پر کام کر لینا ضروری ہے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ جب سے یہ طریقہ رائج کیا گیا ہے کافی تعداد ان کے طلبا، کی کسان کا کام کرتی ہے۔ اور کسان کے کام میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں ہندوستان کی سرکار کو بھی اس تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے تاکہ صرف نوکری کی تلاش کرنے والے طلبا زراعتی کالجوں سے نہ پیدا کئے جائیں فصل اس جگہ نہایت عمدہ تھی، اور سینکڑوں قسم کے نئے نئے بیج پیدا کرکے ان پر تجربات کئے جا رہے ہیں۔

اسٹٹ گارٹ عجیب قسم کا شہر ہے۔ چاروں طرف پہاڑیاں ہیں اور بالکل وادی میں واقع ہے۔ شہر نہایت دلکش ہے اور اس کے چاروں طرف گھومنے سے سارا شہر جگہ بہ جگہ نظر آتا ہے اور نہایت دلکش نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس شہر میں ایک بہت پرانا قلعہ ہے جو بہت عمدہ جگہ اونچائی پر واقع ہے۔ اس کے سامنے سے ایک پرانی سڑک دوسرے قلعہ کو جاتی ہے جو اب بطور جیل خانہ کے استعمال ہوتا ہے۔ اس قلعہ میں بہت پرانی کرسیاں اور ایک پلنگ موجود ہے۔ جو ڈیڑھ سو سال سے زائد بنا ہوا بتایا جاتا ہے اس پر بچھانے کا سامان ریشمی کپڑے کا ہے اور اس پر نہایت خوبصورت زر دوزی کا کام کیا گیا ہے یہ سامان ابھی تک بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔ عمارت میں کئی جگہ نہایت خوبصورت پچی کاری کی تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ اور بحیثیت مجموعی عمارت میں ایک خاص شان پائی جاتی ہے آج کل اس جگہ شام کے وقت لوگ کافی تعداد میں تفریح کے لئے آتے ہیں۔

اسٹٹ گارٹ میں ایک نہایت عالیشان عمارت تیراکی سکھانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ جس میں عجیب طرح کی مشین لگائی ہے جو پانی کو مختلف درجہ حرارت پر رکھتی ہے۔ اگر پانی میں گندگی ہو تو اس کو صاف کرتی ہے۔ ایک طرف بیسیوں مکانات ایک ایک آدمی کے نہانے کے لئے بنے ہوئے ہیں جہاں پر اگر کوئی صاحب چاہیں تو گرم یا ٹھنڈے پانی سے نہا سکتے ہیں یا فوارہ سے پانی لے سکتے ہیں۔ ایک بہت بڑے مکان میں دو تالاب بنائے گئے ہیں جن کے بیچ میں صرف اوپر کی طرف ایک پل نما پگ ڈنڈی بنا دی گئی ہے۔ ایک طرف پگ ڈنڈی کے عورتیں تیرتی ہیں اور دوسری طرف مرد تیرنے کا کام سکھانے کے لئے ہر وقت آدمی رہتا ہے اور سینکڑوں آدمیوں کا جمگھٹا ہر وقت رہتا ہے۔ اس تالاب کا پانی ہر وقت

ایک طرف سے آتا اور دوسری طرف سے خارج ہوتا رہتا ہے تاکہ پانی خراب نہ ہونے پائے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنی میں یہ چیز صرف اس جگہ ہے۔ یوں تو تیرنے کے تالاب اور بھی بہت سی جگہوں پر ہیں۔ مگر خوبصورتی کے ساتھ ایسی عمارت اور عمدہ انتظام کسی جگہ نہیں ہے۔ انتظام کے لئے افسر رہتے ہیں۔ چھوٹا سا مکان کھانے پینے کی اشیا بہم پہونچانے کے لئے موجود ہے۔ غرضکہ نہایت تفریح کی اور کارآمد جگہ ہے۔

اس کے بعد ہم کارلزرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ زراعتی محکمہ کے افسر جو انگریزی بخوبی جانتے تھے۔ ہم کو اسٹیشن پر مل گئے اور ہوٹل میں ہمراہ لے گئے۔ ایک صاحب جرمنی کے رہنے والے ہیں۔ کینیڈا میں کھیتی کرتے تھے وہاں چونکہ نقصان ہونا شروع ہوا۔ اس لئے سب اراضی فروخت کرکے واپس چلے آئے اور اب سرکاری ملازمت کرلی۔ انہوں نے زراعتی ڈپلوما پہلے ہی حاصل کرلیا تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زراعتی اسکولوں کے طلبا اکثر کھیتی کرتے ہوں گے۔ کارلزرہ اگرچہ چھوٹا مگر پرانا شہر ہے۔ رات کو ہم ہوٹل میں ٹھہر گئے اور صبح کو تمباکو کے فارم میں پہونچ گئے۔ وہاں کے افسر نے ہم کو تمام قسم کے تمباکو دکھائے۔ شاید ہی دنیا کے اندر کوئی خطہ ایسا ہوگا جہاں کا تمباکو یہاں موجود نہ ہو۔ پانچ سو سے زائد اقسام تو باہر کے تمباکو کی اس جگہ تھیں اور ہزاروں قسم کے تمباکو انہوں نے خود پیدا کئے تھے جس پر یہ لوگ اپنے تجربات کر رہے تھے۔ اس اسٹیشن کے ذمہ دار افسر جرمن ہیں جو سن رسیدہ ہیں اور عرصہ تک مصر میں کپاس کی تحقیقات پر کام کرتے رہے ہیں۔ اور اب اس جگہ کام کرتے ہیں۔ انگریزی نہایت عمدہ بولتے ہیں اور نہایت خوش خلق آدمی ہیں۔ انہوں نے بہت سی کتابیں بھی تمباکو۔ کپاس وغیرہ اجناس پر لکھی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے یہ سب جرمنی زبان میں ہیں۔ اس لئے ہم ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ تمباکو کے متعلق جس قدر طریقے ترقی کے ہم سوچ سکتے تھے وہ سب یہاں کئے جا رہے ہیں اور ان کا اثر دیکھا جا رہا ہے۔ تمباکو کے پودوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہئے۔ کس قسم کی اراضی پر کون سا تمباکو اچھا ہوگا۔ پانی دینے اور نہ دینے کا کیا کیا اثر تمباکو کی مقدار اور خاصیت پر پڑتا ہے۔ کون سا کھاد ڈالنا مفید ہوگا کس موسم میں تمباکو بونا کس علاقہ جرمنی میں ٹھیک ہے۔ تمباکو کے سکھانے اور اس کو رچانے کا عمدہ طریقہ کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

غرضکہ یہ ایک بہت بڑا فارم ہے اور ہر طریقے پر تمباکو کی تحقیقات جاری ہے۔ یہ لوگ اس تحقیقات کے پیچھے پاگل سے معلوم ہوتے ہیں۔ ہم نے کئی بار چاہا کہ زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھیریں کیونکہ دوسری جگہ جانے کا پہلے سے پروگرام تھا اور ان لوگوں کا انتظار کرنا برا معلوم ہوتا تھا مگر ان لوگوں کی دلچسپ کہانی اور نئے نئے طریقوں کا بیان ہم کو جانے نہ دیتے تھے۔ ناظرین کو تعجب ہوگا کہ ان لوگوں نے ایسا تمباکو پیدا کیا ہے جس میں وہ چیز جس سے نشہ ہوتا ہے یعنی نکوٹین بالکل نہیں ہے اور اس تمباکو کی کاشت چند کاشتکاروں سے ان کو بلا بتلائے ہوئے کرائی گئی ہے جس میں بڑی کامیابی ہوئی یعنی پیداوار میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اب اس کے مزید تجربات کرنے کے بعد امید ہے جرمنی یہ تمباکو بہت جلد بازار میں بھیج سکے گا۔ اس کی طبی تحقیقات باقی ہے۔ اس کا بیج ہم حاصل کرنا چاہتے تھے مگر انہوں نے کہا کہ چونکہ ابھی تجربہ ختم نہیں ہوا ہے اس لئے اس کا بیج نہیں مل سکتا۔ اور بہت سی اقسام کے بیج ان لوگوں نے ہم کو دئے جن کے لئے ان کے مشکور ہیں۔ دوسری عجیب چیز جو ہم نے دیکھی وہ یہ تھی کہ ایک کھیت میں برابر سال بہ سال تمباکو اگایا جارہا ہے۔ سات سال ہو چکے ہیں مگر تمباکو کی خاصیت اور پیداوار پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ بلکہ پیداوار بڑھ رہی ہے اور قسم عمدہ ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے مبصر اگر اس ملک کے اندر ہوتے تو ایسے سب لوگوں کو جو اس قسم کے تجربات کرکے ارضی کا ستیاناس کررہے ہیں اور نئی نئی بیماریاں ان کے خیال کے بموجب پیدا کررہے ہیں جیل خانہ کے اندر ٹھونس دیتے ان کو ایکھ کی کاشت دو سال تک بھی کھیتوں میں کرنا ناگوار گذرتی ہے یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو کیا ہو کہ ہمارے ہندوستانی مبصر نہ تو خود کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہ دوسرے لوگوں کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔ جس ملک کے اندر بچہ سے لے کر بڑھے تک میں اپنے ملک کی ترقی کی لگن ہو وہ ملک اگر ترقی نہ کرے گا تو کون کرے گا۔

اس وقت ایک بہت بڑی عمارت نہایت عجلت کے ساتھ تعمیر کی جارہی ہے جس میں اس سال کی فصل جو ۱۵ روز کے بعد ٹوٹنی شروع ہو جائے گی سکھائی جائے گی اس کے اندر جو مشین لگائی جارہی ہے وہ نہایت عجیب قسم کی ہے ہم نے اس کو دیکھا ہے کیونکہ وہ لگائی جا چکی ہے۔ اگر کسی درجہ حرارت یا درجہ

رطوبت کو کچھ دنوں تک قایم رکھنا ہو تو یہ طریقہ کام میں لایا جائے گا۔ اس مشین کے ذریعہ ایک بار سب چیزیں ٹھیک کر دینے پر از خود گرمی سردی۔ رطوبت اور خشکی ایک درجہ پر رکھی جا سکتی ہیں۔ نہ صرف سارے مکان میں بلکہ ہر ایک کمرہ میں مختلف درجہ حرارت و درجہ رطوبت قائم رکھے جا سکتے ہیں۔ جب کبھی گرمی بڑھ گھٹ جائے گی یا رطوبت میں کمی بیشی ہوگی تو ایک دم ایک پرزہ اپنی جگہ تبدیل کرکے اس سب کو ٹھیک کر دے گا۔ یہ مشین یہاں کے مبصرین کی نئی ایجاد ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی مشین آج تک کسی جگہ نہیں لگائی گئی ہے ہمارے ملک کے مبصر تو مشین منگا کر اس کا استعمال کرنا بھی نہیں جانتے مگر یہ لوگ ہیں کہ نئی مشینیں اختراع کرتے اور اس سے کام لیتے ہیں صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ سب سے زیادہ معرکہ کی بات یہ ہے کہ آپ کوئی قسم تمباکو کی ان لوگوں کو دے دیں اور دریافت کریں کہ وہ کس قسم کا تمباکو ہے تو یہ اس کو بلا سونگھے اور چھوئے یعنی انسانی حواس سے بلا کسی قسم کا کام لئے بتا دیں گے کہ وہ پینے میں کیسا ہے سونگھنے میں کیسا ہے اور اس کی دیگر خاصیتیں کیا ہیں۔ عموماً تین چار قسم کے تمباکو زیادہ تر بوئے جاتے ہیں۔ اول وہ تمباکو جس سے عمدہ سگرٹ بنائے جا سکیں۔ دوئم وہ جو پائپ کے اندر پینے کے لائق ہو۔ سوئم ایسے تمباکو جو سگار کے کام آسکیں۔ چہارم وہ جو تینوں یا دونوں باتوں کے لئے کارآمد ہو سکیں۔ اس وقت اس بات پر خاص توجہ دی جا رہی ہے کہ تمباکو میں پتوں کی تعداد بڑھائی جائے تاکہ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ اس بات میں بڑی کامیابی ہوئی ہے اور ناظرین یہ جان کر تعجب کریں گے کہ ہم نے خود ایسے پیڑ دیکھے ہیں جن پر ساٹھ ساٹھ پتے پائے گئے ہیں ڈنٹھل پر پتوں کے درمیان جگہ کم کر دی گئی ہے۔ اگرچہ ایسا کرنے سے پتہ کچھ چھوٹا ضرور ہو گیا ہے مگر ان لوگوں کی رائے میں یہ تمباکو سگرٹ اور پائپ کے لئے خصوصیت کے ساتھ عمدہ ہے۔ چونکہ یہ تجربہ بھی ابھی مکمل نہیں ہوا ہے اس لئے ہم کو اس کا بیج نہ مل سکا۔ ہم یقین کرتے ہیں جس وقت یہ تجربات مکمل ہوں گے۔ دنیا میں چکا چوند پیدا کر دیں گے۔ اور لوگوں کی سمجھ میں آجائے گا کہ جو شخص لگن کے ساتھ کام کرتا ہے وہ کیا نہیں کر سکتا؟

مختلف طریقہ پر پتوں کو سکھانے کے تجربات اس جگہ کئے جا رہے ہیں مگر کسانوں کے لئے صرف دو طریقہ یہ لوگ بتاتے ہیں اول طریقہ یہ ہے کہ پتوں کو توڑ کر ان کی اقسام کرنے کے بعد ایک ڈورے

میں پھیلا دیا جائے اور ان کو چھت کی کڑیوں میں کیل لگا کر لٹکا دیا جائے تاکہ وہ دھیرے دھیرے سوکھتا رہے اور جب تمباکو کے پتے اس طرح سوکھ جائیں تو ان کو سرکاری ڈپو کے ہاتھ فروخت کر دیا جاوے جہاں اس کے انتخاب اور بار بار الٹ پلٹ سے اس کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ سرکار کی طرف سے تمباکو کی قیمت مقرر ہے اور سوسائٹی کے اس نظام کے کاشتکار بھی ممبران ہیں۔

اس کے بعد ہم نے مشہور و معروف فیکٹری دیکھی مان ہائم کے اندر ہے جہاں بُل ڈوگ یا لیتہ قسم کے نوے من کے تیل سے چلنے والے ٹریکٹر بنائے جاتے ہیں۔ یہ فیکٹری میلوں کے اندر واقع ہے اور ساٹھ ستر سال پرانی ہے۔ اس وقت یہ لوگ ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ،
صرف ٹریکٹر اور بھوسہ اڑانے اور گاہنے کی مشینیں زیادہ تر بناتے ہیں۔ ابھی ایک قسم کا ٹریکٹر ان لوگوں نے بنایا ہے جس میں چھ قسم کی چال ہوگی اور اس کو نہ صرف کھیتوں کے اندر استعمال کیا جائے گا بلکہ سڑکوں پر بھی عام لاریوں کی طرح ۱۱ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دس ٹن سامان لے کر چل سکے گا۔ جرمنی ان ممالک میں نہیں ہے۔ جہاں پی ڈبلیو ڈی کے حکام یا دیگر ضلع کے حاکم یہ کہہ سکیں کہ ۲½ دو ٹن سے زیادہ وزن کی لاریاں سڑک خراب کر دیں گی یہاں ایک انجن سے تین تین لاریاں ایک ساتھ ہانکی جاتی ہیں اور دو کا تو عام رواج ہے اور یہ سب لاریاں تین تین اور چار چار بڑے سے بڑے شہروں کے اندر سے جہاں موٹر وغیرہ کی بکثرت آمدورفت ہے مال سے ٹھسا ٹھس بھری ہوئی برابر دوڑتی رہتی ہیں۔ نہ یہاں کے پل خراب ہوتے ہیں اور نہ سڑکیں گھستی ہیں دراصل کسی کی تجارت و زراعت کی ترقی کا دارومدار زیادہ تر اس ملک کی باربرداری کے نظام پر ہے۔ ہمارے یہاں باربرداری کا ذریعہ ریل ہے اور یہ تجارتی سامان سستے داموں پر ڈھونے اور جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے سے قاصر ہے پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی اور قسم کی باربرداری کو بھی ہندوستان میں پنپنے نہیں دیتی ہمارے خیال میں زمانہ آگیا ہے کہ ہمارے بھائیوں کو اسمبلی و کاونسلوں میں اس بات کی زبردست کوشش کرنی چاہیئے کہ بڑی بڑی لاریاں اور دوسری قسم کی باربرداری کی مشینیں ریل کے مقابلہ میں چلائی جا سکیں۔ اگر ریل کا محکمہ اپنی آمدنی کا انتظام کرنا یا خرچ کی پڑتال کرنا نہیں جانتا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کسی اور قسم کی باربرداری کو ہندوستان کے اندر نہ پنپنے دے۔ غالباً ہمارے تجارت پیشہ لوگ اس بات کی طرف کم توجہ کرتے ہیں اور ہمارے

ممبران اسمبلی و کاونسل تو اس سے واقفیت حاصل ہی نہیں کر سکتے جب تک وہ اس طرف خاص طور پر متوجہ نہ ہوں زراعت پیشہ لوگ تو بیچارے جاہل ہی ٹھہرے۔ پھر اس میں تبدیلی ہو تو کیسے ہو؟ ہم کو سب زیادہ زور اس بات پر دینا واجب ہے کہ معمولی بہانہ سازی سے سرکاری حکام ہم کو سستی قسم کی باربرداری سے باز نہ رکھ سکیں اگر واقعی پل اچھے نہیں ہیں اس کی صحت میں ہم کو شبہ ہے۔ تو ان کو توڑ کر ٹھیک بنایا جائے بجائے اس کے کہ باربرداری کی سستی قسم کو کام کرنے سے روکا جاوے۔ اس طرح لاکھوں آدمیوں کو روزگار مل سکے گا۔ اور سامان و مسافر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچنے کی وجہ سے بازاروں کی حالت عمدہ ہو سکے گی اور تجارت و زراعت کو فروغ ہوگا جس قدر زور اس بات پر دیا جاوے اسی قدر تھوڑا ہی۔ ہم امید کرتے ہیں ہمارے بھائی اس ضرورت کو محسوس کریں گے۔

اس کارخانہ نے ایک ایسا ٹریکٹر بنایا ہے جس سے بھوسہ اس قسم کا باریک ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم لوگ بیلوں کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اناج صاف ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کا ٹریکٹر اس وقت موجود نہ تھا کیونکہ جرمنی میں یہ فصل کٹنے کے دن ہیں اور ان لوگوں کی تمام توجہ جرمنی کی ضرورت کی مشینیں بنانے کی طرف تھی۔ مگر اس قسم کے ٹریکٹر کافی تعداد میں اس وقت اسی کارخانہ کے بنائے مصر میں کام کر رہے ہیں جہاں کے لوگ بھوسہ کو مویشیوں کے چارہ کے لئے کام میں لاتے ہیں۔

ہم نے اپنے ٹریکٹروں کے متعلق چند شکایات کیں کیونکہ ہم بھی اس کارخانہ کے ٹریکٹر استعمال کر رہے ہیں انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہم سے تفصیل دریافت کی اور اس کی خرابی کی وجوہات بتائیں اور کہا کہ ہم چاہے جس وقت ان کو مفصل حالات لکھ کر ان کی رائے دریافت کر سکتے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ خوشی سے ہم کو اس کا جواب دیں گے۔

جرمنی میں انگریزی سکہ کی دو قیمتیں ہیں ایک وہ جو معمولی بازار کی قیمت ہے اور اس وقت ۱۱ مارک کے قریب ہے۔ دوسری ان لوگوں کے لئے جو دوسرے ممالک سے جرمنی میں آتے ہیں اگر وہ چھ روز سے زائد کے لئے آنا چاہیں تو ان کو پونڈ کے بدلہ میں قریب ۱۸ مارک دے دئے جاتے ہیں اور مسافر ان مارکوں کو بھنا کر اپنا خرچ چلا سکتے ہیں۔ مگر قاعدہ یہ ہے کہ ایک دن میں صرف پچاس مارک خرچ کئے جا سکتے

ہیں اور یہ مارک بھی صرف دو رونہ کے لئے مل سکتے ہیں اور صرف بنک سے بُھنائے جا سکتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص ساٹھ مارک روزانہ خرچ کرے گا تو اس کو پونڈ کے بدلے میں صرف ۱۲ مارک ملیں گے لیکن اگر روزانہ خرچ کے لئے پچاس مارک چاہیے گا تو ۱۸ مارک ملیں گے۔ یعنی مسافروں کے لئے مارک کی قیمت دو تہائی کر دی گئی ہے۔ ہم نے بھی بیس دن کے مارک خرید کر لئے تھے جب ہم کاسرو پہونچے تو ہمارے پاس بہت کم مارک رہ گئے تھے اور ہم چاہتے تھے کہ اس دن کے پچاس مارک اور اگلے دن کے پچاس مارک بنک سے لے لیں مگر جب بنک میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں مسافروں کو صرف پچیس مارک مل سکتے ہیں پچاس نہیں۔ اب ہم بڑی چہ میگنم میں پڑ گئے کیونکہ ہم کو ہوٹل کے دام ادا کرنے تھے۔ جو افسر زراعت کے ہمارے ساتھ تھے انہوں نے کہا کہ یہ معمولی بات ہے ہم ہوٹل کا بل ادا کر دیں گے اور ہیڈل برگ جہاں ہم کو دوسرے روز جانا تھا اور جہاں پچاس مارک مسافر کو مل سکتے ہیں وہاں ہم مارک بُھنا سکتے ہیں۔ مگر معلوم ہوا کہ اس دن جمعہ ہے اور اگلے روز صرف دوپہر تک بنک کے دفتر کھلے رہیں گے اور اس سے اگلے دن اتوار ہونے کی وجہ سے دفتر بالکل بند رہیں گے۔ موجودہ نظام کے بموجب ہم صرف رات کو ہیڈلبرگ پہونچتے تھے۔ اس لئے پروگرام کو تبدیل کرنا پڑا اور میں نے یہ طے کیا کہ ہیلڈلبرگ جا کر پہلے روپیہ لے لیا جاوے اور اس کے بعد اور کسی جگہ کو دیکھا جاوے۔ چنانچہ ہم ہیلڈلبرگ گئے اور ہم نے ڈیڑھ سو مارک تین دن کے لئے لے لئے کیونکہ ایک دن ہمارا پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب ہم کو تسلی ہوئی اور روپیہ کی فکر دور ہوئی۔

جرمنی کی مشہور و معروف کمپنی بے ڈی شن انیلین سوڈا فیکٹری کا نام ہر تاجر نے سنا ہوگا یہ کمپنی سب قسم کے رنگ لڑائی سے پہلے بنایا کرتی تھی اب بھی یہ رنگ بناتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے مختلف قسم کے مصنوعی کھاد بنانے شروع کر دئیے ہیں۔ ہر دو کارخانہ اب ایک ٹرسٹ کے ماتحت ہیں جو جرمنی کی تمام کارخانوں کی کیمیاوی پیداوار کو فروخت کرنے کا ذمہ وار ہے اور اب اس کا نام بھی بدل دیا گیا ہے۔ رائن ندی کے کنارے پر یہ کارخانہ قریب ۵ میل لمبا ہے اور اس میں بیسیوں چمنیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ سارے کارخانے میں محض چکر لگانے کے لئے ہم کو کئی دن چاہییں تھے۔ اس لئے ہم نے صرف کھاد بنانے کے حصہ کو دیکھنا چاہا۔ یہ کارخانہ بھی بہت دور تک چلا گیا تھا اور اس کی

کھاد کے بنے ہوئے ڈھیر کارخانہ میں چھوٹے چھوٹے پہاڑ معلوم ہوتے تھے عموماً کارخانے میں یہ طریقہ ہے کہ ریل کی ویگن آکر نس کے باہر کھڑی ہو جاتی ہے، اور تمام تیار سامان اُس ویگن کے اندر بھرتا رہتا ہے جب یہ بھر جاتی ہے تو دوسری اُس کی جگہ آجاتی ہے، اس وقت میں بھی اسٹور میں کافی مقدار کھاد کی موجود تھی۔ اتنے لمبے کارخانہ کے کاموں کی تفصیل جہاں سینکڑوں قسم کے کھاد اور دوسری چیزیں بنائی جاتی ہوں ناممکن ہے۔ اس لئے ہم صرف چند باتیں بتانے پر اکتفا کریں گے۔ یہ کارخانہ بجلی سے کھادیں بناتا ہے۔ ہندوستانی بعضوں سے گفتگو ہوتی ہے تو وہ بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں سستی بجلی نہیں ملتی۔ اس وجہ سے ہوا کی نائٹروجن سے مصنوعی کھاد نہیں بنایا جاسکتا۔

یہ بات بالکل غلط ہے، کیونکہ بجلی جرمنی میں بھی سستی نہیں ہے۔ اور ہر کارخانہ ہوا کی نائٹروجن کو کام میں لانے کے لئے بجلی کا استعمال نہیں کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے بعضوں کسی کام کو کرنا نہ چاہیں یا اُن کو واقفیت نہ ہو مگر اُن کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ہمیں گمراہ کریں ناظرین کی واقفیت کے لئے ہم اس طریقہ کو بھی بتا دینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اس کی تفصیل وار کیمسٹری سے متعلق ہماری واقفیت بھی قطعی محدود ہے اور اس قلیل عرصہ میں ہم پوری واقفیت پیدا بھی نہیں کر سکتے۔

پانی کی بھاپ کو جس میں ہائیڈروجن اور آکسیجن آمیز ہوتی ہے کوئلہ پر سے گزارا جاتا ہے تاکہ پانی پھٹ کر اُس کی ہائیڈروجن الگ ہوجائے اور اسی طرح ہوا کو جس میں نائیٹروجن زیادہ مقدار میں ہے گزارا جاتا ہے اور خالص نائٹروجن الگ کر لی جاتی ہے۔ جو لقیہ اجزا اور پانی سے بچ رہتی ہے وہ دوسری چیزوں کے کام آتی ہے۔ اس طرح ہائیڈروجن اور نائٹروجن دو گیسیں الگ الگ بن کر ایک انجن کے پائپ میں آنی شروع ہوتی ہیں۔ ان ملی ہوئی گیسوں پر بہت زیادہ ہوا کا دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ تاکہ ان کے آیندہ ملنے میں سہولت ہو۔ ان "دبی ہوئی" گیسوں کی مخلوط چیز کو ایک بہت بڑے اور مضبوط چولھے کے اندر سے گزارا جاتا ہے جس میں ایک قسم کی کیمیکل چیز موجود رہتی ہے۔ جو اس کارخانہ کا بھید ہے۔ جب اُس میں سے گزارتے ہیں تو یہ دونوں گیسیں مل کر امونیا بنا دیتی ہیں۔ جس سے اور دوسری

کھادیں جن میں نائیٹروجن ہوتی ہے بنتی ہیں کئی قسم کی کھادیں جن میں۔ نائٹروجن ہوتی ہے اس کارخانہ میں تیار ہوتی ہیں مگر صرف دو مشہور کھادوں کا ہم ذکر کریں گے۔ کیونکہ بقیہ قسم کے کھاد ہندوستان کے اندر انگریزی کارخانے اس وقت فروخت کر رہے ہیں۔ اول کھاد کی قسم نائیٹروفوس ہے

جس میں نائیٹروجن بارہ فیصدی واسفورس بارہ فیصدی پوٹاش ۱۲ فیصدی اور چونا ہ سے ۱۰ فیصدی تک ہوتا ہے یعنی نصف سے زائد اشیا رپودہ کے کام آنے والی ہوتی ہیں۔ یہ کھاد سب سے زیادہ کارآمد سمجھا جاتا ہے دوسرا کھاد یوریا کہلاتا ہے جس میں ۴۶ فیصدی نائیٹروجن ہوتی ہے۔ یہ دونوں کھاد ہندوستان میں بہت مفید ہوں گے مگر معلوم ہوا ہے کہ تمام دنیا کے کھاد بنانے والوں نے یہ طے کر دیا ہے کہ کس ملک کے ہاتھ کون ملک کھاد فروخت کرے اس لئے یہ کارخانہ ہم کو نہ بتا سکا کہ آیا ان کا فروخت کرنا ہندوستان میں ممکن ہے یا نہیں برلن سے اس بات کا پتہ لگ سکے گا۔ جو مصنوعی کھاد اس وقت ہندوستان کے اندر آتے ہیں اُن میں کوئی کھاد بھی ایسا نہیں ہے جس میں چاروں جز ایک جگہ پائے جاتے ہوں اور نہ کوئی کھاد ایسا ہے جس میں نایٹروجن کی مقدار اس قدر زیادہ ہو۔ ہندوستان میں یہ دونوں کھاد استعمال کئے جائیں تو یقین ہے کہ بہت مفید ثابت ہوں گے۔ اس کارخانہ کی ایک بہت بڑی فارم بھی ہے جس میں پودوں پر ان کھادوں کا تجربہ کیا جاتا ہے ہم بھی اسے دیکھنے گئے۔ ہزاروں قسم کے پودے اور فصلیں اس جگہ موجود ہیں بلکہ دنیا بھر کی سب مشہور مشہور فصلوں پر تجربہ کیا جاتا ہے اول پودوں کو معمولی۔ بہت کے اندر گملوں میں اُگا کر تجربات کئے جاتے ہیں۔ پھر جو بات گملوں میں صحیح ثابت ہوتی ہے اُس کے تجربات مختلف کھیتوں میں کئے جاتے ہیں۔ بعض بعض جگہوں کی مٹی منگا کر اُس میں بھی پودوں کو بویا گیا ہے۔ چاول۔ گنا۔ جو یہاں بالکل نہیں ہوتے وہ بھی نہایت عمدگی کے ساتھ اس جگہ اُگے ہوتے تھے۔ البتہ اس مکان کی آب و ہوا کو مصنوعی طور پر بنایا گیا تھا۔

جیسا کہ ہم پیشتر لکھ چکے ہیں جرمنی میں ہر شخص کو جس کی عمر ۲۵ سال سے زائد نہ ہو چھ ماہ کے لئے ایک مرتبہ ضرور مزدوری کا کام کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کام عموماً مٹی کھودنے سڑک بنانے اور نہریں نکال کر زمینوں کو ٹھیک کرنے کا ہوتا ہے۔ ہر وقت اس طرح سینکڑوں کی تعداد میں نوجوان آدمی یہ کام کرتے

رہتے ہیں انہیں معمولی مزدوری ملتی ہے۔ قیام کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ ہمیں بڑی خواہش تھی کہ اُن لوگوں کے کیمپ کو کسی نہ کسی جگہ کام کرتا ہوا دیکھیں۔ چنانچہ راستہ میں ایک جگہ اس قسم کا ایک کیمپ دیکھنے کا موقع ملا۔ لکڑی کا بنا ہوا ایک نہایت خوش نما کیمپ دو سو پچاس مزدور نما طالب علموں کے لیے بنایا گیا ہے۔ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے صرف دو دو دروازے رکھے گئے ہیں۔ بیچ میں ایک لگا ہے۔ دونوں دروازوں پر ان ہی مزدوروں میں سے دو لڑکے چوکیدار کی حیثیت سے پہرا دیتے ہیں۔ ان کے پاس ایک شوول مٹی کھودنے کا اور ایک لنبا اوزار پہرا دینے کے لئے ہے جو اس بات کی نشانی ہے کہ یہ مزدوروں کا کیمپ ہے۔ اور مزدوری کرنا جرمنی میں شان کی بات ہے۔ اس چوکیدار سے اجازت لے کر اندر گئے تو ایک طالب علم جو اُس جگہ سارجنٹ کا عہدہ رکھتا تھا ملا۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے سب چیزیں ہم کو دکھائیں۔ یہ کالج تک پڑھا ہوا تھا۔ قریب ۱۵ سال کے اسکول میں تعلیم پا چکا تھا۔ عمر لگ بھگ ۲۰ سال کے ہوگی۔ نہایت تندرست و توانا اور نہایت ذہین اور ہوشیار معلوم ہوتا تھا اس وقت صرف دس بارہ لڑکے اندر موجود تھے جو کھانا پکا رہے تھے اور اسی قسم کے دوسرے کام کر رہے تھے۔ ایک طرف نہایت عمدہ باورچی خانہ تھا جہاں اگرچہ لکڑی اور کوئلہ جلایا جا رہا تھا لیکن دھوئیں کا پتہ نہ تھا۔ سب سامان نہایت صاف مگر بہت سادہ تھا۔ اس کے آگے ایک نہانے اور حجامت وغیرہ بنانے کی جگہ تھی۔ اس کے بعد رہنے کے کمرے تھے ہر کمرے میں سولہ سولہ لڑکے رہتے ہیں۔ چار پلنگ نیچے تھے اور چار ان کے اوپر تھے۔ کمرے نہایت صاف اور بستر قرینہ سے لگے ہوئے۔ پلنگ سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے کیمپ نہایت صاف ستھرا تھا اور اس طرح بنایا گیا تھا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے منتقل ہوسکتا تھا۔ راستے میں ہم نے اُن لڑکوں کو ایک جھیل کے اندر گہری نالی کھودتے دیکھا تاکہ جھیل کا پانی نکل جائے اور کھیت قابل کاشت ہوجائیں۔ واقعی دیکھنے کے لائق نظارہ تھا، تعلیم یافتہ نوجوان جن میں کئی ڈگری حاصل کئے ہوئے تھے، کدال، پھاوڑا لئے مٹی کھود رہے تھے، اور اپنے ملک کی حالت درست کرنے میں لگے ہوئے تھے، ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور ہم نے سوچا کہ کیا ہندوستان میں بھی وہ زمانہ کبھی آئے گا جب اُن میں یہ شریفانہ جذبات بیدار

ہوں گے جب مزدوری کا یہی سبق انہیں سکھایا جا سکے گا ، جس ملک کے نوجوان اس طرح سے مزدوری کا سبق اسکولوں میں نہیں بلکہ مٹی کے ساتھ کشتی کرکے اور پسینے پسینے ہوکر پڑھتے ہوں اس ملک کے نوجوانوں میں وطن کی دوستی کا جذبہ ، خدمت کا جذبہ ، اور مزدوروں کی محبت کا جذبہ پیدا نہ ہوگا تو کیا ہمارے نوجوانوں میں ہوگا جن کو زمین سے نیچے پیر رکھنے میں عار ہے آج اگر ہندوستانی نوجوانوں میں یہ احساس پیدا ہوجائے تو ہزاروں نوجوان جو آج جوتیاں چٹخاتے اور ایک طرف سے دوسری طرف دھکے کھاتے پھرتے ہیں افسروں کی خدمت میں گڑگڑاکر نوکریاں مانگتے ہیں اور ذلیل ہوتے ہیں آن کی آن میں ملک کی حالت تبدیل کرسکتے ہیں ، کیا حکومت کی طرف سے زبردستی لوگوں کو مزدوری کرنے کی تعلیم دینے کا سبق سکھایا جائے گا ،

آہ ہم کیا کر رہے ہیں ہندوستان آخر ہندوستان اور جرمنی جرمنی رسی جل گئی مگر بل نہ گئے ، ہماری شان و شوکت کا بیچارا جرمنی کیا مقابلہ کرے گا ، ہم لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے ٹھیرے اور جرمنی کے باشندے محنت پر یقین رکھنے والے ہمارا اُن سے کیا مقابلہ ، ایک طرف ملکیش اور پون ، دوسری طرف مہاتما اور سادھو ، ایک طرف دنیا کے پیچھے پڑنے والے ، دنیاوی سکھوں کے لئے جان دینے والے دوسری طرف زندگی سے ہاتھ دھوکر عقبیٰ کی فکر کرنے والے ! آہ ! ہندوستانیو تم ہمیشہ قلاش ہی بنے رہوگے . ہندو اور مسلمان کی تفریق قائم رکھ کر زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہنا . اور ہمیشہ بھوکے مرنا تمھیں گوارا ہے اگر تم میں غیرت و احساس کا شائبہ بھی باقی ہے تو برہمن ، چمار ، عیسائی ، مسلمان ، ہندو ، نوجوان . بوڑھے کمزور کندھے سے کندھا ملاکر ضعیف اور کمزور بھارت ورش کے سر کو اونچا کرنے کی کوشش کرو جرمنی جیسے ناہموار ملک کو دیکھو آج سونا اُگل رہا ہے اور اپنے زرخیز ملک کو دیکھو دھول اڑتی ہے ، انگلستان کے باشندے آکر تمھارے ملک کو خوبصورت نہ بنائیں گے یہ سب کچھ تم ہی کو کرنا ہوگا . ملک کی خوشحالی اور بدحالی تمھارے ہاتھ میں ہے نوجوانو ! کیا تم ہندو مسلمان کی بیہودہ . بے معنی اور مصنوعی تفریق کو چھوڑکر مزدوری کا سبق پڑھوگے کاش کہ تم خود ہی یہ سبق پڑھنے پر راضی ہوجاؤ ، ورنہ زمانہ کی ٹھوکریں ذلتیں اور رسوائیاں تمھاری کجی اور گمراہی کو دور کریں گی . آہ ! کیا ہماری نحوست کے دن ختم نہیں ہوئے ہیں . اور کیا ابھی ہمارے نصیب میں اور بھی ذلتیں دیکھنی ہیں .

ذرا خیال تو کرو یہ وہی جرمنی ہے جسے تباہ کرنے کے لئے دنیا کی تمام طاقتوں نے مل کر کوشش کی اور ہر طرح سے اس کی تباہی پر کمر باندھی، صلح کی شرائط کیا تھیں، صرف تباہی کے آثار تھے، مگر جس طرح ایک دبی ہوئی لکڑی بوجھ اترتے ہی اچھل کر پانی پر سوار ہو جاتی ہے۔ جرمنی آج پھر اپنی تباہی کے اوپر سوار ہو چکی ہے اس میں وہی پرانی چہل پہل جاری ہے اس کے لوگ ویسے ہی خوش حال آج نظر آتے ہیں اس کی چمنیاں آج پھر چاروں طرف دھواں اگل رہی ہیں۔ جو لوگ اپنے دلوں میں یقین کی نعمت رکھتے ہیں جنھیں اپنے اوپر بھروسہ ہو اپنے ملک کے لئے قربانی کر سکتے ہیں وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں دنیا کی کوئی طاقت ان کو نیست و نابود نہیں کر سکتی مگر جو لوگ اپنی تمام امیدوں، حوصلوں اور ارادوں سے منہ موڑ کر نوکری کی مالا جپ رہے ہوں جو دن پھر دوسروں کی غلامی ہی اپنی آزادی سمجھتے ہوں ان کی زندگی ایک غلام کی زندگی کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔ ہندوستانی نوجوانو! آؤ اپنی عقل، اپنی طاقت اپنے علم کو، اپنے ملک کو بہتر بنانے اور اپنے ملک کو اونچا اٹھانے میں صرف کریں خدا ہماری مدد کرے گا اور ضرور کرے گا۔

گھومتے گھومتے ہم ہینڈنبرگ پہونچے، اور ہم کو ایک پہاڑ کی اونچی چوٹی پر جو ہینڈنبرگ سے قریب آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہوگی لے جایا گیا، یہاں ایک بڑا زبردست میدان تھا، اور پتھر کی سیڑھیاں تھیٹر کی شکل میں اوپر نیچے بنی ہوئی تھیں جن پر کم سے کم پندرہ ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے، چاروں طرف لاؤڈ اسپیکر لگے تھے اور جھنڈے لگائے جا رہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ تمام سڑک جنگل کو کاٹ کر زمین ہموار کر کے پتھر چن کر قرینے سے کوٹ کر ان ہی نوجوان مزدوروں نے بنائی ہے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں پتھر کی سیڑھیاں بھی ان ہی نوجوانوں کا کارنامہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے لوگوں کو تفریح کا سامان بہم پہونچ سکے اور پہاڑ کے ٹکڑے آسانی کے ساتھ شہر میں پہونچ سکیں اور اس کی قیمت میں اضافہ ہو سکے، کل اس جگہ رات کو ایک جلسہ ہوگا اس میں تمام طلبا جمع ہوں گے، اور سب لوگ، رؤسا، امیر و غریب ان کے کام کی داد دینے کے لئے بلا کسی فرق کے زمین پر بلا کسی امتیاز کے ایک ساتھ بیٹھیں گے آہ! کیا دلکش نظارہ ہوگا، ہم چاہتے ہیں کہ ان جوانوں کے درشن کریں جنھوں نے یہ نیک کام کر کے اپنے ملک کی سچی خدمت کی ہے مگر بدقسمتی سے ہمارا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ اور ہم اگلی رات کو نہ ٹھہر سکتے تھے، مجبوراً اس جلسے کی زیارت سے محروم رہے۔

کلام جگر

عشق ہے نصف الحقیقت کیوں پریشاں کیجئے
یعنی ہم پر رحم کرکے، خود پر احساں کیجئے

کب تک آخر مشکلات شوق آساں کیجئے
اب محبت کو محبت ہی پہ قرباں کیجئے

ایک اک ذرے سے حاصل درسِ عرفاں کیجئے
یعنی خود کھو جائیے، ان کو نمایاں کیجئے

پھر جنون بیخودی میں کچھ کمی سی آچلی
آج پھر برہم مزاج حسن جاناں کیجئے

اللہ اللہ سنتے ہیں تم ہو رگِ جاں سے قریب
اب تو ہر نشتر کو پیوست رگ جاں کیجئے

حسن کی رسوائیاں بھی حسن سے کچھ کم نہیں
ہو سکے۔ تو مثل بوئے گل پریشاں کیجئے

ہم نے تو دکھلا دیا خود بن کے محروم وصال
آپ سے ممکن جو ہو ناکامِ ہجراں کیجئے

سر سے پا تک اک نگاہ بے محابا ڈال کر
عمر بھر کے واسطے ممنونِ احساں کیجئے

آپ کو شرمائیے کیا؟ آپ کا دامن ہے پاک
ہم گنہگارِ محبت ہیں پشیماں کیجئے

آپ کے دشمن رہیں وقف خلش صرف تپش
آپ کیوں غمخواری بیمار ہجراں کیجئے

دل پہ جو گذرے سو گذرے عشق کی ضد ہے یہی
آج اتنا چھیڑئے اُن کو کہ گریاں کیجئے

شانِ رحمت کو نہیں درکار کوئی پیشکش
احتیاطاً اکتساب کفر و ایماں کیجئے

نیرنگ حیات

مضطرب ہے ذرہ ذرہ عالمِ تعمیر کا
خواب ہی میں منتظر ہے خواب کی تعبیر کا

اک حجاب اٹھا تو حائل ہو گئے صد ہا حجاب
راز افشا ہو سکا کب حسنِ عالمگیر کا

جتنے آئینے بنے تھے وہ تو ریزے ہو گئے
دیکھئے اب اور کیا عنوان ہو تشہیر کا

کھل نہیں سکتا کبھی رازِ نقوشِ کائنات
ہے بہت دھندلا سا منظر ہر اک تصویر کا

ہر نفس اک عقدۂ لاحل ہے اے ذوقِ خلش
بس نہیں چلتا یہاں کچھ ناخنِ تدبیر کا

صفحۂ ہستی پر آتے ہیں نظر کتنے حروف
ہے مگر معدوم اب تک مدعا تحریر کا

زندگی کی ابتدا کیوں کر ہوئی کیسے ہوئی
سانس کا یہ سلسلہ ٹکڑا ہے کس زنجیر کا

ہر نفس پر لغزشیں ہیں ہر قدم پر ٹھوکریں
روئیے رونا کہاں تک عقل کی تقصیر کا

دور باش اے حسِ محرومی کہ ذوقِ بیخودی
ماحصل ہے عمر بھر کی کاوشِ تفسیر کا

غزل

کوئی باتوں باتوں میں "با وفا" جو کہہ گیا — مرا زخم خوردہ دل دھک سے ہو کے رہ گیا
ضبط اس نے کیا تھا کہ راز ہو نہ فاش — اب میں اس کو کیا کروں دل میں درد رہ گیا
میری بے زبانیاں کام آگئیں کہ میں — غم کی ساری داستان اک نظر میں کہہ گیا
میرے دل کے ولولے آہ بن کے اڑ گئے — میرا جذبۂ جنوں آنسوؤں میں بہہ گیا

خون کے بدلے آنکھوں میں ایک لالی رہ گئی
دل میں درد کی جگہ ایک داغ رہ گیا

"نغمۂ روح"

میں نے شعر و سخن کے سانچے میں — اپنی آہ و فغاں کو ڈھالا ہے
دوستو! میرے پاس نغمہ کہاں — "نغمۂ روح" ایک نالہ ہے

دنیا کی رفتار

(۱) ممالک غیر

حبش | قوت کا طلسم بھی نظر بندی کے کیا کیا کھیل دکھاتا ہے۔ اس کی تاثیر سے عیب ہنر معلوم ہونے لگتا ہے اور ظلم انصاف۔ اور یہی نہیں کہ دوسرے ایسا سمجھنے لگتے ہوں، خود صاحب قوت اس آسیب کے اثر سے اپنی حرص و غضب کو مقصد کائنات سے ہم آہنگ جاننے لگتا ہے۔ اگر کوئی سحر زدہ ہونے سے بچ رہتا ہے تو وہ غصہ یا حیرت کے ساتھ تماشہ دیکھتا ہے، مگر اس مجنون کے پاس جانے اور اس کے سر سے اس بھوت کو اتارنے کی ہمت کون کرتا ہے؟

اٹلی اپنے نئے تاجور مسولینی کے عہد میں اسی حالت سے گذر رہا ہے۔ اس میں کیا کلام ہے کہ اٹلی میں سیاسی سازشوں کی جگہ ایک متحدہ قومی عزم کی تخلیق اسی کا کارنامہ ہے، اس نے یورپ کی سیاست میں اپنی قوم کے درجہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے، اور ایک کاہل قوم کے دل میں سرداری کا ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ مگر یہ پرستش کرتا ہے صرف قوت کی۔ توپ اس کا خدا ہے! اور اقبال کا "فلارنس دہی باطل پرست" میکاولی اس کا پیغمبر۔ جب اپنے ملک کے غیر آباد علاقوں کو قابل کاشت بنا کر اس میں پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ سے گیہوں بوتا ہے تو بھی اس امن کے کام میں اپنی ہر حرکت کا اعلان توپوں کی باڑھ سے کراتا ہے تاکہ معاملات انسانی میں قوت کے تصرفات کو اپنی قوم کے ذہن نشین کرا دے۔

اسی قوت کے بھروسہ پر اور دوسری دول کی باہمی رقابتوں کے سہارے مسولینی چاہتا ہے کہ حبش کے قدیم ملک کو سلطنت اطالیہ میں شامل کرے۔ وجہ کیا ہے؟ یہ کہ حبش کے سپاہیوں نے ہماری فوج کے ساتھ زیادتی کی، ایک غیر متمدن قوم کی یہ گستاخی ایک ایسی قوم کے ساتھ جس نے "تاریخ بنائی ہے" ناقابل معافی ہے، نتیجہ صاف ہے حبش پر اٹلی کا تسلط ہونا چاہیے۔ قوت کی منطق کا یہی انداز ہوتا ہے۔

اب گستاخی کی حقیقت سنئے۔ حبش اور برطانیہ کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن سرحدی علاقہ میں حدبندی

سکا کام کر رہا ہے ۔ اس کمیشن کے ساتھ کچھ حبشی سپاہی ہیں ۔ ۵ ر دسمبر ۳۴ئ کو ولوال کے کنوؤں کے قریب جو معتدہ معاہدوں کی روسے کوئی سو میل حبش کی سرحد کے اندر ہیں ، اطالوی فوج کا سردار کپتان سمارودتا ان حبشی سپاہیوں پر بلا کسی اطلاع کے حملہ بول دیتا ہے حملہ کی کمک کے لیے ٹینک اور ہوائی جہاز بھی آتے ہیں ۔ حملہ کے وقت حبشی سپاہی اپنے خیموں میں بے خبر بیٹھے ہیں ۔ گھبرا کر نکلتے ہیں تو فوراً ہی ان کا سردار مارا جاتا ہے ، کوئی ۱۰۰ سپاہی کام آتے ہیں ، ۴۵ زخمی ہوتے ہیں ۔



یہ بیان حکومت حبش کا ہی نہیں ہے ۔ واقعہ کے پانچ برطانوی شاہد بھی موجود ہیں ۔ خود برطانوی کمشنر کرنل کلفورڈ کی تصدیق موجود ہے ۔ جس اطالوی فوج کے ساتھ گستاخی کی پاداش میں قریب قریب سارے ملک حبش کو سلطنت روما کا جزو بنانے کی تجویزیں ہیں اگر اس فوج کے مزاج کا اندازہ لگانا ہو تو مذکورہ صدر کپتان سمارودتا کی تقریر کا ایک

اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو اس "گت نی" کے ارتکاب سے پہلے انھوں نے ۲۳ نومبر کو اپنے کرایہ کے افریقی سپاہیوں کے سامنے فرمائی تھی:- "اس وقت تو وَلوَل پر حبشیوں کے ساتھ انگریز بھی ہیں۔ مگر تم سومالی لوگ شیر نر ہو۔ شیر جب شکار کو دیکھتا ہے تو بس اس کی گردن دبا تا ہے اور اُسے ختم کر دیتا ہے۔ تم بھی یہی کروگے . . . . . ابھی تو میرے ہوائی جہاز ہی آئے ہیں۔ مگر مسلح کاریں بھی پہنچنے والی ہیں۔ ہر ایک میں تین تین توپیں ہوں گی۔ یہ آجائیں تو پھر تمھیں ان حبشیوں سے جنگ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ یہ مشینیں جو زمین پر چلتی ہیں اور ہوا میں اڑتی ہیں، کافی ہوں گی۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میں ان حبشیوں کو قہوہ کی طرح پیس ڈالوں گا"

ادیس ابابا میں ولول کے واقعہ سے ارباب حکومت کو جس قدر تکلیف ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ مگر یہ بیچارے ایک غیر متمدن افریقی حکومت کے ارکان تھے، کیا کرتے؟ طرفہ یہ کہ تین چار روز بعد ان کے متمدن حریف کے سفیر نے سخت احتجاج کیا اور الٹا انھیں مورد الزام بنایا۔ "مسلح حبشیوں نے ہم پر بلا اطلاع حملہ کیا۔ ہمارے مقتولین و مجروحین کی تعداد ابھی معلوم نہیں ہے، مگر میں اس واقعہ پر شدید احتجاج کرنا چاہتا ہوں اور مطلع کرتا ہوں کہ ہماری شاہی حکومت معافی اور تاوان کا مطالبہ کرے گی"۔ حبش کے وزیر خارجہ نے اس کے جواب میں ۱۹۲۸ء کے معاہدۂ ثالثی کا ذکر کیا تو جواب ملا کہ "یہ بات شبہ سے بالکل خالی ہے کہ ولول اور وردیر اطالوی سومالی لینڈ میں شامل ہیں۔ . . . اور حالات اس درجہ واضح ہیں کہ ۱۹۲۸ء کے معاہدہ کا اطلاق اس واقعہ پر نہیں ہو سکتا۔ تاوان اور معافی کا مطالبہ فوراً پورا ہونا چاہیے"۔ مطالبہ یہ تھا کہ حبشی گورنر، ولول آکر، جو حبش علاقہ میں ہے لیکن جس پر اطالوی غاصبانہ قابض ہیں، معافی چاہے، اور اس کی فوج اطالوی جھنڈے کو سلامی دے، دو لاکھ پونڈ بطور تاوان ادا کیے جائیں، تمام اشخاص جن کا اس واقعہ سے تعلق تھا گرفتار اور اپنی خدمات سے سبکدوش کیے جائیں یہ سب جھنڈے کی سلامی میں شریک ہوں اور اس کے بعد سب کو مناسب سزائیں دی جائیں۔

کمزور حکومت حبش سوائے اس کے اور کیا کر سکتی تھی کہ جمعیۃ اقوام سے، جس میں یہ شریک ہے، اپیل کرے۔ چوروں کے سامنے چوری کا مقدمہ پیش، مہینے گذر گئے اور وہ کچھ طے نہ کر سکے کہ کیا کرنا چاہیے باہمی رقابتوں کی وجہ سے اگر کوئی رکن اٹلی کو اس دراز دستی سے روکنا چاہتا ہے تو اٹلی، جاپان اور جرمنی کی طرح، جمعیۃ سے علیحدہ ہونے کی دھمکی دیتا ہے جس سے ڈر ہے کہ جمعیۃ کا سارا ڈھونگ ہی ختم ہو جائے گا۔ دوسرے لوگ جن کے اغراض

خود حبش سے وابستہ ہیں۔ کبھی اٹلی کو دبانا چاہتے ہیں کبھی حبش کی مصیبت سے فائدہ اٹھانے کی سوچتے ہیں اور اصل یہ ہے کہ اپنے معاملہ میں اٹلی سے سودا کرنے کی فکر میں ہیں۔ حال میں جمعیۃ اقوام کی آخری قرار داد یہی ہے کہ ۱۹۰۶ء کے معاہدہ کے مطابق فرانس، برطانیہ اور اٹلی معاملہ کو سلجھائیں۔ اس معاہدہ کی تمہید میں اس کی غرض یوں ظاہر کی گئی ہے: "فرانس، برطانیہ اور اٹلی تینوں کے مشترک اغراض کا اقتضا ہے کہ حبش کی ملکی خودمختاری کو قائم رکھا جائے
بہرحال تینوں حکومتوں میں سے کوئی بھی اس ملک میں اس وقت تک مداخلت نہ کرے گی جب تک بقیہ دو سے اس باب میں سمجھوتہ نہ ہو جائے۔" اس سے اہل بصیرت اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جمعیۃ کے یہ تینوں ممتاز رکن باہمی مشورہ کے بعد ملک حبش کے ساتھ کیا انصاف کریں گے۔

یہ تینوں اپنی اپنی غرض رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان میں باہمی رقابت بھی ہے لیکن مشترک چیز یہ ہے کہ ملک حبش کا کوئی نہ کوئی علاقہ یا کوئی۔ کوئی حق غصب کر لیں۔ انگلستان اس فکر میں ہے کہ نیل ازرق ان کے قبضہ میں آجائے تاکہ سوڈان اور مصر کی آبپاشی میں کسی طرح کا رخنہ کبھی نہ پڑنے پائے۔ انگریز چاہتے ہیں کہ اس پانی کو بند باندھ کر قابو میں رکھیں۔ ۱۹۰۲ء سے برابر اس کی کوشش ہو رہی ہے لیکن ہنوز معاملہ جہاں کا تہاں ہے۔ فرانس کو اپنی ریلوے بڑھانے اور اس ذریعہ سے ملک کے کاروبار کو ترقی دینے کی فکر ہے۔ فرانسیسی بندرگاہ جبوتی سے ادیس ابابا تک کوئی ۵۰۰ میل کی ریل فرانسیسیوں نے بنائی ہے۔ اٹلی ہمیشہ سے اس گھات میں ہے کہ اپنی دونوں نوآبادیوں اریٹریا اور سومالی لینڈ کے درمیان ریل بنا کر انھیں ملا لے اور اب تو یہ پورے ملک حبش کو اپنی ملک بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ افریقہ کے کوئی سوا کروڑ مربع میل کے رقبہ میں اس کو جو حصہ اب تک ملا ہے وہ سب کا سب ریگستانی اور بے کار ہے اور اگر اب کہیں کچھ مل سکتا ہے تو یہیں ملک حبش میں۔

اس وقت بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کی رائے عامہ اٹلی کے غاصبانہ اقدام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی مگر یہ رائے عامہ مدبروں کی سیاسی چالاکیوں سے ایسی گڑھ گئی ہے کہ باہر والے اس سے اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔

اسی اٹلی سے انگلستان ابھی ۱۹۲۵ء میں یہ ساز باز کر رہا تھا کہ تم نیل ازرق پر بند باندھنے کی تجویز کو حبشی حکومت سے منوا دو تو ہم اریٹریا اور سومالیہ کے درمیان اطالوی ریل کی تجویز کی حمایت کریں گے۔ اٹلی چاہتا تھا

کہ مغربی حبش کو صرف اس کے حلقۂ اثر میں تسلیم کر لیا جائے لیکن فرانس کی مخالفت کے ڈر سے معاملہ ٹلتا رہا۔ ۱۹۲۴ء میں پھر بات چیت شروع ہوئی ۱۹۲۵ء میں تو انگلستان اور اٹلی میں ایک خفیہ معاہدہ بھی ہو گیا، جس کی خبر فرانس کو لگ گئی۔ اُدھر فرانس بگڑا، ادھر حبش نے معاملہ کو جمعیۃ اقوام میں پیش کرنا چاہا۔ تو لندن اور روم کے شاطران سیاست نے جیسے تیسے معاملہ کو دبا دیا اور حبش کو راضی کرنے کے لیے ۱۹۲۸ء میں اٹلی نے اس سے ایک معاہدہ کیا اور ادیس ابابا سے عصب تک موٹر کی سڑک بنا دینے کا وعدہ بھی کیا اور یہ بھی کہ اٹلی کے اس بندرگاہ میں حبش کو آزاد آمد و رفت کا حق حاصل ہو گا۔

غرض جمعیۃ اقوام کے یہ تینوں ممتاز رکن جو حق و انصاف کے ضامن بنے ہیں دراصل اپنی اپنی گھات میں ہیں۔ اور اگر مال کی تقسیم پر آپس میں سمجھوتہ ہو گیا تو معلوم ہے کہ حبش کے حق میں ان کا فیصلہ کیا ہو گا۔ البتہ دوسری قومیں جن کے قدم یہاں پہلے سے جمے ہوئے نہیں ہیں وہ بھی اس بانٹ میں حصہ تاک رہی ہیں چنانچہ امریکہ نے اپنے ایک نہایت قابل سیاسی کو جو ماسکو میں سفیر تھے اب اس پسماندہ ملک میں سفیر بنا کر بھیجا ہے۔ جاپان کے تعلقات تو اور بھی زیادہ تیزی سے بڑھ رہے ہیں شہزادہ ماریہ عربہ جو شاہ حبش کا بھتیجا ہے نہ معلوم پر جاپان گیا تھا وہاں ایک جاپانی امیرزادی یعنی وای کونٹ کرودا کی بیٹی پر عاشق ہو گیا نسبت ہونے والا تھا کہ کہتے ہیں مسولینی نے مداخلت کر کے اسے روکا۔ اُدھر جاپانی ماہرین تجارت جوق جوق اس ملک میں پہنچ رہے ہیں۔ ۲۰ لاکھ ایکڑ زمین انھیں روئی کی کاشت کے لیے دی گئی ہے۔

جاپانی مال نے اٹلی کی تجارت کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ جرمنی اور بلجیم سے اسلحہ پہنچ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ترکی بھی فوج کی تعلیم کے لیے اپنے ماہر بھیج رہا ہے اس لیے جمعیۃ اقوام کی ملی بھگت کے لیے بھی معاملہ کچھ بہت آسان نہیں ہے۔ اور باہر کی کمک سے قطع نظر خود یہ حبشی غیر متمدن سہی لیکن شجاع ہیں اور آزادی کی قدر جانتے ہیں اور اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ ابھی کوئی ۴۰ ہی سال تو ہوئے ہیں کہ انھوں نے اٹلی کی فوجوں کو شکست فاش دی تھی چار لشکر تہ تیغ کر ڈالے تھے، ہزاروں قیدی پکڑے تھے۔ روم میں مفرور اطالوی سپہ سالار کا کورٹ مارشل، کرسپی کی وزارت کا ٹوٹنا، چار لاکھ پونڈ کا تاوان جو متمدن رومیوں نے اس غیر متمدن ملک کو ادا کیا تھا، ابھی سب کو یاد ہے۔ اس لیے ابھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مسولینی کے اس اقدام غاصبانہ کا حشر کیا ہو گا۔ بہرحال مسولینی نے

لئے ایک بڑا جوا کھیلا ہے اگر یانسہ پڑگیا تو وہ اطالوی تاریخ میں جولیس سیزر کا ہمدوش ہوگا اور ناکام رہا تو شاید اطالوی سیاست کا نقشہ یکسر بدل جائے۔ اس کی کامیابی سے حق کی شکستوں کی طویل فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہوگا۔ قوت کے پرستاروں کے لئے تقویت ایمان کے لئے ایک اور معجزہ ہاتھ آئے گا۔ لیکن اگر اہل حبش نے اپنی آزادی کی خاطر اپنا خون مردانہ وار بہایا تو ضمیر انسانیت کے لئے ایک اور تازیانہ بھی ہوگا جو کہ بیدار رہنے پر حق تلفیوں کے اس قرض کو دمڑی دمڑی چکانے کی تدابیر نکال لے گا۔

عقبہ جہاں قوی اس فکر میں ہیں کہ دوسروں کے ملکوں کا انتظام کریں اور غیر متمدن قوموں کو تمدن اور تہذیب کا سبق دینے کے لئے مجبوراً ان کے علاقوں پر قابض ہوں وہاں ایسے کمزور بھی ہیں جو اپنے گھر کا انتظام دوسروں کے سپرد کردینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ شرق اردن کے فرمانروا امیر عبداللہ نے برطانوی جنرل اسٹاف کے افسر اعلیٰ سر آرچیبلڈ مانٹگومری مسم برگ سے ایک معاہدہ کیا ہے کہ آئندہ عقبہ کے تحفظ کی ذمہ داری برطانوی افواج اور برطانوی بیڑہ کے سپرد ہوگی۔



عقبہ بظاہر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن یہ نہایت اہم بندرگاہ بن سکتا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں کرنل لارنس اور امیر فیصل نے یہیں سے دمشق اور مدینہ والی سڑک پر حملے کئے تھے۔ اور یہی ترکی فوج کے مشرقی بازو اور شام

کے خلاف فوجی کارروائیوں کا مرکز تھا۔ کہتے ہیں کہ مشرق قریب میں اگر فوجی اہمیت کے اعتبار سے دو تین مقامات منتخب کئے جائیں تو ان میں سے ایک یہ بھی ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امیر عبداللہ سے اس کی حفاظت کا بارگراں نہ اُٹھ سکا اور انھوں نے یہ فرض برطانوی افواج کو تفویض فرمادیا!

ترکی — ترکی جو برابر اسلامی رواداری کی روایات کو قائم رکھنے میں کوشاں ہے جس طرح پہلے بارہا کسی ملکوں سے نکالے ہوئے یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے اب بھی جرمنی کے بہت سے نامور یہودی فاضلوں کو بلاکر اپنی درسگاہوں میں کام لے رہا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی حال میں اس نے جمعیۃ اقوام کی درخواست پر کوئی دو ہزار روسیوں کو جو روسی انقلاب کے باعث اپنے وطن سے ہجرت کرکے ترکی میں آبسے تھے شہریت کے پورے پورے حقوق عطا کر دے ہیں۔ ترکی نے حال میں اپنے کارخانوں اور تجارتی کاروبار سے پردیسیوں کو مجبوراً ہٹایا تھا۔ اس کی وجہ سے ان روسی مہاجرین میں سے بھی بہت سے بارروزگار ہوگئے تھے۔ مگر چونکہ یہ اپنے وطن کو واپس نہ جاسکتے تھے ترکی نے انھیں اپنا لیا۔ انھیں ترکوں کے سے حقوق دئے گئے اور ترکوں کے سے فرائض بھی ان پر عائد کئے گئے ہیں۔

... ...

آزادی ایسی جنس نہیں کہ ایک دفعہ حاصل کرلی جائے۔ اسے روز حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہی اسے رکھ سکتا ہے جو روز اس کے حصول میں ساعی رہے۔ اس لئے آزاد قومیں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے آنے والی نسلوں کو اس کے برتنے کی مشق کراتی ہیں۔ اکثر ممالک میں یہ کام مدارس میں کیا جاتا ہے۔ ترکی نے پچھلے دنوں ایک نیا تجربہ اس سلسلہ میں کیا یعنی ایک ہفتہ کے لئے اپنے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کا انتظام اپنے ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بچوں کے سپرد کردیا تھا۔ بچوں کی عمر دس اور پندرہ سال کے درمیان تھی۔ صرف اتنی نگرانی تھی کہ ان کے احکام معقول ہوں، عمال کو ان کی بجاآوری کی تاکید تھی۔ یہ تجربہ ان بچوں کے لئے مدنیات کے سیکڑوں اسباق سے زیادہ موثر ثابت ہوا ہوگا۔

... ...

یہ بات تو معلوم ہے کہ ترکی پارلیمنٹ میں بس ایک ہی جماعت ہے یعنی وہ جماعت جسے صدر جمہوریہ کمال اتاترک کی قیادت کا شرف حاصل ہے۔ اس لئے پارلیمنٹ سے باہر اس جماعت کے جو اجلاس ہوتے ہیں ان کی قراردادیں پارلیمنٹ کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس جماعت نے اپنے گذشتہ سالانہ اجلاس میں اس بات کی کوشش کی کہ اپنے پروگرام کو وضاحت کے ساتھ چند دفعات کی شکل میں پیش کر دے۔ یہ پروگرام کمالی پروگرام کہلائے گا یا مذہب کمالیت۔ یہ ۶ دفعات ذیل پر مشتمل ہے :۔

(۱) اقتدار اعلیٰ پارلیمنٹ کی وساطت سے قوم کو حاصل ہے۔

(۲) طبقات کی تمیز مٹائی جاتی ہے اور مرد اور عورت کے حقوق مساوی تسلیم کئے جاتے ہیں۔

(۳) فلاح عام کے کاروبار اور وہ صنعتیں جن کا تعلق تحفظ قومی سے ہے حکومت کی ملک ہوں گی اور حکومت بقیہ صنعتی کاروبار کی بھی نگرانی رکھے گی اور جب ضرورت سمجھے گی اسے خرید لے گی۔

(۴) مذہب افراد کا نجی معاملہ ہے۔ اس میں حکومت مداخلت نہ کرے گی سوائے اس حالت کے کہ مذہب کو رجعت پسندی کا بہانہ بنا کر جمہوریت کے وجود کو خطرہ میں ڈالنے کی کوشش کی جائے۔

(۵) ملکیت شخصی اور حریت شخصی کی ضمانت کی جاتی ہے بشرطیکہ یہ مفاد عامہ سے متصادم نہ ہوں۔

(۶) ملک کے جملہ وسائل، انسانی اور مادی، اس کے تحفظ کے لئے کام میں لائے جائیں گے۔

... ...

اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ ترکی عورتوں کے لئے نقاب کا استعمال قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔ مگر جلسہ نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ عورتیں خود ہی نقاب کو ترک کر رہی ہیں، جو اب تک ترک نہیں کر چکی ہیں وہ دوسری بہنوں کی مثال سے متاثر ہو کر خود ترک کر دیں گی۔ اس میں جبر سے کام لینا بے سود ہے۔

... ...

ساری دنیا میں جنگ کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے اور مختلف ممالک جس طرح اپنے نوجوانوں میں جنگی روح پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی ایک مثال ترکی میں بھی ملتی ہے۔ ترکی وزارت نے طے کیا ہے کہ فوج میں داخل ہونے کی عمر سے پہلے ہی تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو کچھ فوجی تعلیم دینی چاہئے۔ اس کا مفصل نصاب

جنرل اسٹاف تیار کر رہا ہے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ ہوائی جہازوں کی تعداد دوگنی کر دی جائے۔ تقریباً ۲ کروڑ روپیہ سالانہ کم سے کم ۵۰۰ ہوائی جہازوں کے بیڑہ کی خریداری اور مرمت وغیرہ کے لئے صرف کیا جائے گا۔

... ...

ازمر (سمرنا) سے ایدین کو جو ریل انگریزی سرمایہ سے تیار ہوئی تھی اسے ترکی حکومت نے ۵۰ لاکھ ڈالر میں خرید لیا ہے۔

عراق و ایران عراق اور ایران میں اپنے سرحدی دریا شط العرب کے متعلق جھگڑا ہے۔ معاملہ جمعیۃ الاقوام کے سامنے پیش تھا۔ اٹلی کے مندوب بیرن الواسی ثالث مقرر ہوئے تھے۔ جمعیۃ کی کونسل کے گذشتہ اجلاس میں انھوں نے یہ اطلاع دی کہ فریقین سمجھوتہ پر رضامند نہیں ہوئے لیکن ان کا خیال ہے کہ دونوں کو براہ راست گفت و شنید پر آمادہ کیا جا سکتا ہے اور چونکہ معاملہ بہت زیادہ اہم نہیں ہے اس لئے زیادہ کشیدگی کا اندیشہ نہیں ہے۔

معاملہ یہ ہے کہ ۱۸۴۷ء کے معاہدہ ارض روم اور ۱۹۱۴ء کے ایک پروٹوکول کی رو سے شط العرب پر اقتدار اعلیٰ تمامتر ترکی کو حاصل تھی۔ جنگ کے بعد چونکہ عراق کو ترکی حکومت کے تمام حقوق وراثت میں ملے اس لئے اب شط العرب پر کامل اقتدار کا دعویدار ہے۔ ایران اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے عراق نے جمعیۃ اقوام میں مرافعہ کیا ہے کہ میرا اقتدار تسلیم کرایا جائے۔

حکومت عراق کا کہنا یہ ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا قانونی حق کے یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ ایران کے پاس تو ہزاروں میل کا سمندری ساحل ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہمارے لئے سمندر تک پہنچنے کا راستہ بس اسی شط العرب کے ذریعہ ہے۔ اس لئے ہم اپنے قانونی اقتدار میں کسی کو شریک نہیں بنانا چاہتے۔ ہاں اگر ہمارا قانونی حق تسلیم کرلیا جائے تو ہم ایران سے گفتگو کر کے یہ کر سکتے ہیں کہ اس دریا میں جہازرانی کی نگرانی کے لئے ایک ایرانی عراقی مشترکہ بورڈ مقرر کر دیں اور کسی غیر جانبدار ثالث کو صدر مقرر کر دیا جائے۔

ایران کی دلیل یہ ہے کہ ۱۸۴۷ء کا معاہدہ اور ۱۹۱۳ء کا پروٹوکول اس معاملہ میں اس وجہ سے معتبر نہیں کہ ایرانی مجلس نے ان دونوں کی تصدیق نہیں کی ہے۔ ایرانیوں کو موجودہ انتظامات سے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے البتہ

وہ چاہتے ہیں کہ اگر قانونی حق اقتدار بھی تسلیم ہو جائے تو اچھا ہے۔ داشتہ آید بکار۔ لیکن ایران کا مقدمہ کمزور ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ عراق کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے گا۔

روس | روسی انقلاب کے بانی اسے قومی انقلاب نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک عالمی انقلاب کا آغاز۔ اس گروہ کی ساری ذہنیت پر بین الاقوامی تعاون کا تصور غالب تھا وہ قومیت اور وطنیت کو "بورژوا" سرمایہ داری کا فریب جانتے تھے اور ملکی اور سیاسی حقوق کے مٹ جانے اور دنیا کے ایک کارخانہ کی طرح منظم ہو جانے پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اسی رجحان کی وجہ سے وہ کسان سے گھبراتے تھے اور صنعتی مزدور کو اپنا سب سے بڑا مددگار جانتے تھے۔ اس لئے کہ زراعت پابند مقام ہے، صنعت کے لئے ساری دنیا ایک منڈی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ کسان ہر جگہ وطنی اور قومی تحریکوں کا حامل ہے اور مزدور بین الاقوامی تحریکوں کا۔

لیکن روس کا یہ انقلابی اور بین الاقوامی رجحان واقعات سے دوچار ہو کر رفتہ رفتہ بدل رہا ہے خود لینن کی جدید معاشی سیاست گویا اس تبدیلی کا پہلا قدم تھا۔ لینن نے بروقت بھانپا کہ اگر روسی انقلاب کو کامل ناکامی سے بچانا ہے تو کسان کو ساتھ لینا ہوگا اور ایک حد تک اس کے تعصبات کا پاس کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد سیاسی ضرورتوں نے روس کو اکثر سرمایہ دار قوموں سے معاہدے کرنے پر مجبور کیا۔ ایشیا میں جاپان کے ڈر سے اس نے یورپ میں سرمایہ دار ملکوں سے دوستی شروع کی اور اب رفتہ رفتہ عالمی انقلاب کی جگہ ایک منظم حیات قومی نے لے لی ہے۔ کسان جسے مارکس سے لے کر آج تک تمام اشتراکی مفکر نہایت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں اور جسے ہمیشہ ۲
رجعت پسندی کا مجسمہ سمجھتے رہے ہیں اس منظم حیات قومی کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ جو بدسلوکی روا رکھی جاتی تھی وہ برابر کم ہو رہی ہے۔ پرانے راسخ العقیدہ اشتراکی اس پر ناخوش ہیں مگر حقائق سے دست وگریباں نئے اشتراکی عالمی انقلاب کے خیال کو پس پشت ڈال کر قومی زندگی کو کسان کی مدد سے اشتراکی اصولوں پر منظم کرنے کی فکر میں ہیں اور اس کوشش میں اپنے نظری عقائد کا کچھ حصہ چھوڑ کر کسان سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں۔

حال میں جو خبریں روس سے آئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عالمی انقلاب کی جگہ قومی تنظیم نے بڑی حد تک لے لی ہے۔ یکم مئی کو جب تمام مغربی ممالک میں مزدور انقلابی مظاہرے کرتے ہیں۔ جس تاریخ کو روس میں

یوں سمجھئے کہ عالمی انقلاب کی آمد کا جشن منایا جاتا تھا، اس مرتبہ رنگ بالکل بدلا ہوا تھا۔ عالمی انقلاب کا تذکرہ بھی نہ تھا۔ نہ مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کا اتنا چرچا تھا جتنا کہ اس موقع پر پہلے ہوا کرتا تھا۔ اس کی جگہ ایک شدید جذبہ وطن پرستی کا مظاہرہ تھا۔ خاص طور پر اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ دوسرے ملکوں کے جو لوگ موجود تھے ان پر روسی فوجی قوت کا اثر ڈالا جائے۔ "کمیونسٹ انٹرنیشنل" کی طرف سے جو پیام اس موقع پر دنیا کے مزدوروں کو جاتا ہے وہ بھی اس مرتبہ بہت روکھا پھیکا تھا۔ پہلے کی طرح اس میں سرمایہ داری کے دیو سے نبرد آزمائی کی دعوت نہ تھی۔ بس یہ مشورہ تھا شرح اجرت بڑھانے اور کام کا وقت گھٹانے کی تدبیریں کرنی چاہئیں!

پرانی روایات انقلابی سے اپنے کو آزاد کرنے کے خیال ہی سے غالباً اسٹالین نے حال ہی میں قدیم بولشویکوں کی جماعت کو منتشر کرنے کا حکم دلوا دیا۔ یہ جماعت ان اشتراکیوں پر مشتمل تھی جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے کمیونسٹ تھے اور اس زمانہ میں جب اس سے زندگی خطرہ میں پڑتی تھی ان اصولوں کی حمایت کرتے رہتے تھے۔ پہلے تو اسٹالین نے اس جماعت کے ممتاز اراکین کو مثلاً ٹروٹسکی، کامینو، زینوویف، تومسکی وغیرہم کو ختم کیا اور اب کل جماعت کو منتشر کرا دیا۔ ایک طرف قدیم نظریین کی مخالفت کو یوں ختم کیا دوسری طرف کسانوں کی "رجعت پسند" جماعت کے ساتھ بہم رعایتیں کیں مثلاً اسی سال کے اندر اندر متعدد تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ اجناس حاصل کرنے کے جو کارڈ مزدوروں کو ملا کرتے تھے اور جن سے صنعتی مزدوروں کو دوسرے تمام طبقات آبادی پر خاص فوقیت حاصل تھی ان کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ فروری میں نظام انتخابات کو اس طرح بدلا گیا کہ کسانوں کے خلاف جو باتیں پڑتی تھیں وہ ہٹ گئیں نئے نظام کے ماتحت آئندہ انتخابات میں کسانوں کی رائے کو غلبہ حاصل ہوگا۔ پرانے نظام کی رو سے شہری آبادی کو بمقابلہ کسانوں کے اپنی تعداد سے سہ چند نیابت کا حق تھا۔ یہ حق اب باقی نہیں رہا۔ بالواسطہ انتخاب کے طریقہ سے بھی کسانوں کا اثر گھٹتا تھا، یہ طریقہ بھی اب ختم کر دیا گیا ہے۔ اب رائے دہی بلاواسطہ ہوگی اور خفیہ۔ ۱۸ برس سے اوپر کا ہر شہری بلالحاظ پیشہ اور سکونت رائے دینے کا حق دار ہوگا۔ کسانوں کی تعداد چونکہ ساڑھے بارہ کروڑ سے اوپر ہے اور شہری آبادی صرف ۴ کروڑ، اس لئے ظاہر ہے کہ غلبہ کسانوں کا ہوگا۔

کسانوں کے ساتھ معاشی رعایتیں بھی کی گئی ہیں مثلاً جو کسان مشترک کھیتوں میں کام کرتے ہیں انھیں اپنی نجی زمین رکھنے کا جو حق تھا اس کے رقبہ میں معتد بہ اضافہ کر دیا گیا ہے، اپنی شخصی ملکیت میں جتنے جانور رکھنے کی اجازت

تھی ان کی تعداد بھی بڑھا دی گئی ہے ان نجی جانوروں کی خریداری میں حکومت نے امداد کا وعدہ بھی کیا ہے۔ کسان کے ساتھ ان رعایتوں کی بڑی وجہ تو وہی ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی عالمی انقلاب کی جگہ قومی تنظیم کے خیال کی تقویت اور جنگ کے وقت کسانوں کی وفاداری کی ضرورت کا احساس لیکن اگر اس سے کوئی یہ سمجھے کہ یہ روسی انقلاب کی ناکامی کے آثار ہیں تو یہ غلط ہوگا۔ اس کے برعکس اشتراکی معیشت کی کامیابی ہی نے کسانوں کے ساتھ اس جدید رویہ کا امکان پیدا کیا ہے۔ اب کسان پہلے کی طرح بے قابو نہیں اور شہری آبادی کے لئے غذا کی فراہمی کا مسئلہ طے ہو چکا ہے' اب اس فراہمی کے لئے کسان پر ظلم کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ صنعت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس کا کام چلانے کے لئے' یعنی اس کے لئے پردیس سے کلیں اور سامان خریدنے کے لئے کسانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو چھین چھین کر باہر بھیجنے کی مجبوری باقی نہیں رہی' اور خود زراعت میں اشتراکی طریقۂ کاشت کو اتنا فروغ ہو گیا ہے کہ اب خالص انفرادی نظام کے دوبارہ رائج ہونے کا اندیشہ پہلے کی طرح باقی نہیں رہا۔ دنیا میں اکثر ہوا ہے کہ کامیابی کی خاطر اور کامیابی کی وجہ سے ذہنی اور فکری تجاویز میں زمین آسمان کا تغیر ہو جاتا ہے۔ روس میں بھی پہلے لینن نے کامیابی کی خاطر خالص اشتراکی پروگرام میں تبدیلی کی' اب اسٹالین اس میں کامیابی کی وجہ سے کسانوں کے ساتھ اور رعایتیں کر رہا ہے اور کر سکتا ہے۔ لیکن اس تغیر نے روسی انقلاب کی بین الاقوامی حیثیت کو بہت بدل دیا ہے۔ خیال ہے کہ روس بھی رفتہ رفتہ قومی اشتراکیت کا نمونہ ہو جائے گا اور دوسری اشتراکی قومیتوں سے تصادم کے بعد شاید بین الاقوامی انقلاب کی باری آئے گی۔

(ب) ہندوستان

نوجوانوں کی بے روزگاری | یونائیٹڈ پریس کے ایک پیغام مورخہ پٹنہ ۱۴ اگست ۱۹۳۸ء سے معلوم ہوا کہ پولیس کے سپاہیوں کی سات خالی جگہوں کے لئے تقریباً تین ہزار نوجوان صوبہ کے مختلف حصوں سے شہر کی کوتوالی کے سامنے انٹرویو کے لئے جمع ہوئے۔ یہ امیدوار انتخاب کرنے والے افسر کی نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس درجہ مضطرب تھے کہ ان میں سے ہر شخص دوسرے کو دھکا دے کر افسر کے سامنے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے جو بدانتظامی پیدا ہوئی اس کا سدباب کرنے کے لئے پولیس کانسٹبلوں کو بلانا پڑا اور انھوں نے اس مجمع کو قوت کا

استعمال کرکے پیچھے ڈھکیل دیا۔

پولیس کے سپاہیوں کو شاید پندرہ روپیے تنخواہ ملتی ہے۔ ان کے فرائض بڑی جفاکشی، مستعدی اور دلیری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی انھیں سیاسی اور مذہبی مجمعوں پر لاٹھیاں اور گولیاں چلانا پڑتی ہیں، محکمہ سی آئی ڈی کے مخبر ہونے کی حیثیت سے بعض وقت نہایت ناخوشگوار بلکہ شرمناک رپورٹیں دینا پڑتی ہیں، مقدموں کی تیاری میں ضمیر فروشی سے کام لینا پڑتا ہے لیکن ان تمام مواقع کے باوجود سات سپاہیوں کی جگہوں کے لئے تین ہزار امیدوار دور دراز مقامات سے سفر کرکے پٹنہ میں جمع ہوئے تاکہ پولیس کی انتظامی لاٹھیوں سے امن و انصاف اور قانون کے علمبرداران کی تواضع و مدارات کرسکیں۔

اس منظر کی دردناک عبرت خیزی کسی تبصرہ کی محتاج نہیں ہے!

یونائیٹڈ پریس کی اس اطلاع سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان لوگوں میں کتنے تعلیمیافتہ نوجوان تھے، کتنے میٹرک اور ایف اے پاس اور گریجویٹ تھے اور کتنے ایسے تھے جو معمولی طور پر خواندہ تھے لیکن اس کمی کی تلافی دوسری اطلاعوں، سرکاری رپورٹوں اور بے روزگاری کے متعلق مختلف صوبوں میں جو تحقیقاتی کمیٹیاں بٹھائی گئی تھیں ان کی جمع کی ہوئی معلومات سے ہوجاتی ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں درج ہے کہ ۱۹۱۶-۱۷ء میں گریجویٹوں کی تعداد ۹ ہزار تھی جو ۱۹۳۰-۳۱ء میں بڑھ کر ۱۱ ہزار ہوگئی۔ اور انڈر گریجویٹوں کی تعداد جو ۱۹۱۶-۱۷ء میں ۴۴ ہزار تھی ۱۹۳۰-۳۱ء میں ۶۶ ہزار ہوگئی۔ صوبہ مدراس میں بے روزگاری کا تخمینہ کرنے کے لئے دو جگہوں کے واسطے آزمائشی اشتہار دیے گئے۔ ایک جگہ پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے محکمہ میں ایک منشی کی تھی جس کی تنخواہ ۳۵ روپیے ماہوار تھی اور دوسری ایک تجارتی فرم میں اتنی ہی تنخواہ کے ایک محرر کی تھی۔ پہلی کی لئے ۶۶۶ اور دوسری کے لئے ۷۰۰ درخواستیں آئیں۔ مدراس میں ہنچ کے ایک منشی کی جگہ کے لئے شہر مدراس اور مضافات کے ۵۰۰ وکیلوں نے درخواستیں دیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مدراس میں معمولی پولیس کے سپاہیوں کی جگہ کے لئے بہت سے گریجویٹوں نے درخواستیں دی تھیں۔ اسی قسم کی اطلاعیں پنجاب سے بھی موصول ہوئی ہیں۔ سندھ میں ایک گریجویٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جوتوں کی مرمت اور پالش کرکے اپنی بقائے حیات کے وسائل فراہم کررہا ہے۔

بے روزگاری کے متعلق افراد یا کمیٹیوں نے جو اظہار رائے کیا ہے ان کے چند اقتباسات بھی نمونہ

کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

"ہمارا نظام تعلیم ایک بانس کے درخت کے مانند ہے جس کا ہر جوڑ گویا ایک امتحان ہے اور جس کا قطر جڑ سے لے کر پھننگ تک تقریباً یکساں رہتا ہے اس کی شاخیں نہیں ہوتیں اور پھننگ پر جو پتیوں کی چھتری ہوتی ہے وہ بہت مختصر رقبہ کو ڈھک سکتی ہے ضرورت جس چیز کی ہے وہ ایک پھیلا ہوا درخت ہے جس کی شاخوں کو تنے کے متعدد مقامات سے پھوٹ کر جس قدر زیادہ سمتوں میں ممکن ہو پھیلنا چاہئے اور محض پھننگ پر اپنا پھیلاؤ محدود نہ رکھنا چاہیئے" (بنگال بے روزگاری کمیٹی کی رپورٹ)

"ہمارے ہائی اسکولوں اور کالجوں کی خرابی یہ نہیں ہے کہ ان میں پیشہ کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک خاص لیکن بہت زیادہ محدود پیشہ کی تربیت کے لئے پوری توجہ مرکوز کردی جاتی ہے۔ علمی اور افادی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں کوشش یہ کی جاتی ہے کہ طلبہ کو اس طرح تربیت دی جائے کہ وہ فارغ التحصیل ہوکر سرکاری افسر، وکیل، ڈاکٹر اور کاروباری محرر بن سکیں" (ایجوکیشن آف انڈیا مصنفہ مے ہیو)

پنجاب کمیٹی کی تحقیقات کے سلسلہ میں سرجارج انڈرسن ایک میٹرکولیٹ کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ "یہ ایک لاوارث ہے جو تمام دنیا میں خدائی خوار پھرتا ہے اور جو اس لئے بے روزگار رہتا ہے کہ اس میں کسی حیلہ سے لگنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی" سرجارج ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم کی مذمت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ لڑکوں کو خارجی امتحان کے لئے تیار کیا جائے جن میں کامیاب ہونے کے بعد اکثر طالب علم ایک اور دامِ فریب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مدرسوں میں لڑکے منشی گیری کے پیشہ کے لئے تیار کئے جاتے ہیں جو اس وقت ضرورت سے زیادہ بھرا ہوا ہے اور ہزاروں آدمیوں کو روزگار مہیا کرنے سے قاصر ہے"

"موجودہ طریقۂ تعلیم کے مصنف لارڈ مکالے نے لکھا تھا کہ "ہمیں موجودہ حالات میں پوری کوشش کرنا چاہئے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جو ہمارے اور کروڑوں کی اس آبادی کے درمیان جس پر ہم حکومت کرتے ہیں ایک مترجم کا کام کرے۔ ایسے اشخاص کا طبقہ جو رنگ اور خون کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں لیکن ذوق، رائے، اخلاق اور ذہن کے لحاظ سے انگریز ہوں" لیکن اس کا دردناک پہلو یہ ہے کہ مترجموں اور منشیوں کے پیدا کرنے کا کام ابھی تک جاری ہے اور مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کسی قسم کی تبدیلی سے آئندہ

بہت سے سالوں تک کوئی خوشگوار نتیجہ پیدا ہو سکے گا" (بنگال کمیٹی کی رپورٹ)

اوپر جو کچھ لکھا گیا یہ ہماری تعلیمی کوششوں کا ماحصل ہے۔ جن پودوں کو والدین نے اپنے خون سے سینچا، ان کا یہ انجام ہے۔ جن کی خاطر بہت کچھ ایثار کیا، ہزاروں تکلیفیں اٹھائیں، سینکڑوں ارمانوں اور حوصلوں کی پرورش کی کہ بڑھاپے میں یہ ہمارا سہارا ثابت ہوں گے ان کے آرام و آسایش اور فارغ البالی سے ہمارے دل کو سکھ اور چین نصیب ہوگا یہ ان کا حسرتناک حشر ہے۔

اس کا کون جوابدہ ہے۔ کس کی غیر ذمہ دارانہ امید پروری اس مایوسی کا سبب ہے۔ کیا نوجوانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں سے بازپرس کریں جنھوں نے مجرمانہ غفلت سے کام لے کر ان کی زندگیوں کو برباد کیا ہے۔ نوجوانوں نے اپنی عمر اور ان کے والدین نے اپنا سرمایہ کالج کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کیوں ضائع کیا؟ درسگاہوں کے فریب میں وہ کیسے پھنسے؟ حکومت نے تعلیمی اداروں کی دھوکہ دہی سے ان بے وقوفوں کو کیوں نہیں بچایا؟ کمشنروں، گورنروں، وائسرایوں اور جماعت عاملہ کے ارکان نے کیوں ایسے اداروں کی امداد اور سرپرستی کی، انھیں تعلیم کی آزادی کے چارٹر دیئے جنھیں وہ جانتے تھے یا جن کے متعلق انھیں جاننا چاہئے تھا کہ وہ ملک میں تعلیمیافتہ بے روزگاروں کی ایک فوج بنا ڈالیں گے؟ تمام دنیا میں حکومتیں بے روزگاری کے انسداد کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔ لوگوں کے معیار حیات کی کمی کے الزام کے لئے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتی ہیں اپنی رعایا کی محنت اور اس کے سرمایہ کو بربادی سے محفوظ رکھنے کی سعی کرتی ہیں اور اگر ان کی کوششوں کے باوجود لوگوں میں بے روزگاری پھیلنے لگتی ہے تو ہر قسم کی امداد دینا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہیں۔ وہ سر جارج اینڈرسن کی طرح بے گناہ، بے تعلق اور بے درد ہو کر صرف خرابیوں کے مبالغہ آمیز اظہار پر قناعت نہیں کرتیں۔ وہ حل سوچتی ہیں اور حل نہیں سوچ سکتیں تو انھیں اس کے نتائج اور عواقب کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ہماری غیر ذمہ دار حکومت بے روزگاری کو رفع کرنے کے لئے کیا کام کر رہی ہے۔ کیا وہ اس بات پر خوش ہے کہ جو منشی پہلے اُسے دو سو اور ڈھائی سو کی تنخواہ پر رکھنے پڑتے تھے اب بیس پچیس میں اپنا دین و ایمان اس کے ہاتھ پر فروخت کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ کیا صورت حال کی یہ روش اس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ لوگوں کو ذلیل خوار اور خودداری سے معرا دیکھ کر صرف کمینے، خودغرض اور حاسد لوگ خوش ہو سکتے ہیں۔ کیا حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔ کیا وہ بالکل بے بس

ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسے اعتراف شکست کرکے حکومت سے دست بردار ہو جانا چاہئے کیونکہ دنیا کی دوسری حکومتیں ان مسائل کا حل سوچ رہی ہیں اور ان کے یہاں بے روزگاری میں برابر کمی ہو رہی ہے۔ روس میں بے روزگاری میں نمایاں کمی ہو گئی ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ وہاں بے روزگاری کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ورلڈ اکانومک سروے ۳۴-۱۹۳۳ء میں درج ہے "بے روزگاری کسی ایسے ملک میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی جہاں ہر کام کرنے والے کو کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے۔ جہاں نہ صرف پیدائش دولت بلکہ اجرتیں قیمتیں اور معاشی زندگی کا ہر عامل ایک ایسے پہلے سے سوچے ہوئے منصوبہ کا پابند ہے جو کل قوم کے مشاغل پر بصورت مجموعی حاوی ہے۔ امریکہ میں پریسیڈنٹ روزولٹ کی باقاعدہ کوششوں سے گذشتہ سال روزگار کے اعداد کا تناسب بڑھ کر ۵۶ : ۶۷ ہو گیا۔ سلطنت متحدہ برطانیہ میں ۹۲ : ۹۹ ہو گیا اور جرمنی میں ۶۸ : ۸۴ ہو گیا (اعداد انٹرنیشنل لیبر ریویو)۔ ہندوستان کے متعلق اس قسم کے اعداد نہیں دئے گئے ہیں اس لئے صحیح موازنہ ممکن نہیں ہے لیکن اس کے ماننے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا کہ یہاں اس قسم کی کوئی منظم کوشش ابھی تک نہیں کی گئی ہے۔ ہندوستان کی قدرتی دولت سے بہت کم فایدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہاں صنعت، زراعت اور تجارت کو ترقی دینے کا ابھی بے انتہا امکان موجود ہے۔ نئے روزگار نہ صرف موجودہ بلکہ اس سے بھی زیادہ آبادی کے لئے فراہم کئے جا سکتے ہیں اور معیار حیات بلند سے بلند تر ہو سکتا ہے۔ روس اگر سترہ اٹھارہ سال کے عرصہ میں اپنے ملکی وسائل دولت کو ناقابل یقین حد تک ترقی دے سکتا ہے تو ہندوستان کے لئے بھی یہ ممکن ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ صحیح جذبۂ عمل پیدا ہو، ایمان دار کارکن اس کام کو ہاتھ میں لیں اور کسی خاص دستور العمل کے مطابق کام کیا جائے۔

حکومت ہند کا قانون | ۲ اگست ۳۵ء کو ملک معظم نے حکومت ہند کے نئے قانون کو منظور کر لیا یعنی ہندوستان کو سوراج عطا کر دیا گیا۔ خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے! اس طرح رضا و رغبت کے ساتھ اور پرامن طریقہ پر حق حکومت سے دست بردار ہونے کی مثالیں دنیا میں کم نظر آتی ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ ہندوستان کے لینے والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا رپ وان ونکل کی طرح یہ کسی گہرے خواب میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے سوراج کے حصول کے لئے ہندوستان کے ہر شہر و قریہ میں ایک

طوفان بے تمیزی برپا تھا یا اب سوراج مل گیا تو وہ سکوت طاری ہے جس سے مردے بھی عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ کس شہر خموشاں میں ہیں؟ یہ شادیانے کیوں نہیں بجاتے، چراغاں کیوں نہیں کرتے، جشن کیوں نہیں مناتے، ایک دوسرے کو مبارکباد کیوں نہیں دیتے؟ سوراج اب کیا اس قدر بے حقیقت ہو گیا کہ اس کے لئے قوم کے کسی فرقہ اور طبقہ کے منہ سے تحسین و مرحبا کا لفظ نہیں نکلتا۔ کیا سوراج یوں ہی ملا کرتے ہیں اور جب مل جاتا ہے تو ایسے ہی گونگے اور بہرے بنے بیٹھے رہتے ہیں!

آیئے یہ بھی دیکھیں سوراج میں ملا کیا ہے؟ مرکز میں وفاقی مجلس قانون ساز، جس کے ایوان اعلیٰ کو مالی اختیارات ایوان ادنیٰ کے مساوی حاصل ہوں گے۔ وفاقی بجٹ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں منظور ہوا کرے گا۔ اس مشترکہ اجلاس کے ۶۰۵ ارکان ہوں گے جن میں سے ۲۲۹ کو ہندوستانی ریاستیں نامزد کر کے بھیجیں گی اور ۱۵۶ ایوان اعلیٰ کے رکن ہوں گے جنھیں امرا کی ایک نہایت مختصر اقلیت براہ راست انتخاب کر کے بھیجے گی۔ ان ۶۰۵ ارکان کی جس تعداد سے ترقی پسند ہونے کی توقع وابستہ کی جا سکتی ہے وہ تقریباً ۲۵۰ ہوگی۔ لیکن یہ ۲۵۰ ارکان بھی براہ راست منتخب نہیں ہوں گے بلکہ صوبوں کی مجالس قانون ساز سے منتخب ہو کر آئیں گی۔ صوبوں کی جن مجالس میں قوم پرستوں کی اکثریت ہوگی وہاں سے تو ممکن ہے سب کانگریسی رکن منتخب ہو جائیں ورنہ رجعت پسند جماعتوں کے ارکان منتخب ہوں گے۔ بجٹ کے اسّی فی صدی حصہ پر اراکین کو کوئی اختیار نہ ہوگا، صرف بیسؔ فیصدی پر انھیں اختیار حاصل ہوگا اور یہاں بھی گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی کی پخ موجود رہے گی۔ ریلوے کا انتظام ایک ایسے بورڈ کے ماتحت ہوگا جس پر مجلس قانون ساز کو کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔ زر رونبک پر بھی مجلس کا کوئی اختیار نہیں ہوگا یعنی سکہ اور شرح مبادلہ بھی ان کی دسترس سے باہر ہوگا۔ گویا روپیہ میں دوانی ملی اور وہ بھی کھوٹی!

صوبوں کو نام کے لئے صوبہ جاتی خود مختاری عطا کی گئی ہے لیکن ثانوی ایوانوں کے قیام سے رجعت پسند جماعت کو زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے۔ انڈین سول سروس کے جو سکریٹری وزرا کو ملیں گے وہ عموماً وزرا کے احکام اور ان کی نگرانی قبول نہ کریں گے۔ تمام امپیریل سروسیں وزرا کے اقتدار سے باہر ہوں گی۔ ان کی تنخواہ، ترقی، سزا کسی بات کا وزیروں کو اختیار نہ ہوگا۔ وزرا دراصل اپنے محکمہ کے ملازموں کے غلام ہوں گے۔ گورنر کے

الی اختیارات بہت وسیع ہوں گے۔ گورنر اپنے قانون تو مجلس قانون ساز سے آزاد رہ کر بنا سکے گا لیکن مجلس قانون ساز اپنا کوئی قانون گورنر کی مرضی کے بغیر نہ بنا سکے گی۔

حکومت کی طرف سے یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تحفظات محض نام کے لئے ہیں اور جب حکومت منتقل کی جاتی ہے تو عارضی طور پر بعض اختیارات کا انتقال ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تجارتی اور فرقہ وارانہ امتیازات بھی ہمیشہ کی رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ اگر ہندوستانیوں نے نیک نیتی سے دستور کو چلانا چاہا تو ان تحفظات کے استعمال کی کبھی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی اور یہ بے کاری کی وجہ سے آپ ہی آپ فنا ہو جائیں گے۔ لیکن ہندوستانیوں کے گذشتہ تجربے بہت تلخ ہیں۔ وہ اب آسانی سے اس ابلہ فریبی کے شکار نہ ہوں گے۔

رسالہ:-

مصحف | مصحف ماہوار مدیر مسئول جناب ثنا کرناطکی۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۴۰ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر۔ قیمت سالانہ ؎ مقام اشاعت عمرآباد (مدراس)

صوبہ مدراس کے مسلمانوں کو اردو سے ہمیشہ سے شغف رہا ہے اور اس زبان کے بہت اچھے اچھے شاعر اور ادیب یہاں پیدا ہو چکے ہیں۔ اخبارات و رسائل بھی اکثر اسی زبان میں نکلتے رہے ہیں اب جناب ثنا کرناطکی صاحب عمرآباد نے ایک نیا رسالہ مصحف جاری کیا ہے۔ جو مضامین، ترتیب، لکھائی چھپائی غرض ہر حیثیت سے شمالی ہند کے کسی رسالے سے کم نہیں ہے۔ مضمون نگاروں میں مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا محوی لکھنوی۔ جناب یاس عظیم آبادی، حضرت احسن مارہروی۔ جناب نوح ناروی حضرت امجد حیدرآبادی۔ جناب نصیر الدین ہاشمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اردو کے قدرداں اس کی بیش از بیش قدر دانی فرمائیں گے۔

(ع۔ح)

تنقید و تبصرہ

کتب

نغمۂ روح ۔ تسکار ۔ خیالات مہاتما گاندھی۔

نغمۂ روح | اختر انصاری صاحب کے اشعار کا مجموعہ مع مقدمہ ۔ بڑی سائز، حجم ۸۰ صفحہ، کتابت، طباعت، کاغذ معمولی، قیمت عہ

ایک مختصر سے مقدمے میں اختر انصاری صاحب نے اپنے اور دوسروں کے چند ملفوظات جن میں آرٹ اور اس کے مختلف شعبوں کی تعریف ہے، جمع کر دئے ہیں ۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ آرٹ زندگی سے بے تعلق اور آزاد ہے ۔ اس نظریے کے اگر کچھ معنی ہو سکتے ہیں تو یہ ہیں کہ آرٹ کا کام فرد کی شخصیت کا اظہار ہے اور اس میں وہ اجتماعی زندگی کے مقاصد کا پابند نہیں ۔ واقعے کی حیثیت سے یہ صحیح ہے کہ اجتماعی روح کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے زندگی کے اور شعبوں کی طرح آرٹ کا رشتہ بھی زندگی سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ مشرق میں یہ حالت عرصے سے ہے اور مغرب میں بھی کچھ دن سے پیدا ہوگئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ نے مسخ ہو کر وہ صورت اختیار کی ہے جو اب ہمارے سامنے ہے ۔ خیر اس بحث کا یہاں موقع نہیں مقصود تو اختر انصاری صاحب کے کلام کی تنقید ہے اور وہ بھی مروجہ معیار کے مطابق ۔

اختر صاحب اپنے اکثر ہمعصروں کی طرح صرف جذبات انسانی، خصوصاً درد و الم یاس و حرماں کے مصور ہیں :-

تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں　　　اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں
کوئی نغموں میں، کوئی شعر میں، کوئی سُر میں　　　درد اپنا کوئی نالوں میں کہا کرتا ہے

ان کے انبساط کی حد یہ ہے :-

میرے مایوس دل میں لے اختر — اس طرح سے اُمید آتی ہے
جس طرح اک اداس چہرے پر — مسکراہٹ سی کھیل جاتی ہے

کبھی کبھی فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں مگر وہ بھی انھیں اپنی طرح مغموم نظر آتی ہے۔ آپ رواں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

کس قیامت کا بھرا ہے سوز تیرے ساز میں

جنت میں اور بہار میں انھیں فطرت کے طرب و نشاط کا احساس ہوتا ہے مگر اتنا نہیں کہ ان کی دل تنگی اور دل گیری کو دور کر دے۔

نزہت فصل بہاری عیش کی بنیاد ہے

لیکن اسے دیکھ کر انھیں حسرت ہوتی ہے۔

مرے دل کی اجڑی دنیا میں بھی آجائے بہار

بہ تقاضائے عمران کے دل میں امنگ اٹھتی ہے۔

ابل رہا ہے نشاط و سرور کا دریا — رواں جگر سے نظر تک ہے نور کا دریا

اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

مے نشاط کا تو ایک جام ہے گویا — مجھے حیات ابد کا پیام ہے گویا

"گویا سے" اندازہ کر لیجیے کہ اس امنگ کی بساط کتنی ہے۔

اختر صاحب نغمے کے عاشق ہیں مگر اکثر نغمے سے زیادہ مغنیہ ان کے دل کو کھینچتی ہے۔

زمزمہ سنج مطربہ جس دم — طرب افزا سروں میں گاتی ہے
زندگی کی اندھیری راتوں میں — ایک بجلی سی کوند جاتی ہے

"طاعت" میں "بے دانگیں" کی لاگ نہ ہوتی تو اچھا تھا۔

اختر صاحب اگر اپنے موضوع کلام کو اپنے مشاہدے اور احساس کو اس سے زیادہ وسیع نہیں کرنا چاہتے

تو وہ جانیں مگر انھیں الفاظ کی مناسبت اور بندش کی چستی کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ نئی پود کے اکثر شاعروں کی سہل نگاری شاعری کا خون کر رہی ہے۔ کسی نے شاعر کی تعریف میں کہا ہے۔

برائے پاکیٔ لفظے شبے بروز آرد　　　　که مرغ و ماہی باشند خفتہ او بیدار

ہمارے سخنوروں کی شب بیداری سینما اور تھیٹر تک محدود ہے۔ شعر کہنے کے لئے انھیں اس کی ضرورت نہیں۔ رسالے کے اڈیٹر کا تقاضا صبح کی ڈاک سے آتا ہے سہ پہر کی ڈاک سے غزل یا نظم سانچے میں ڈھل کر چلی جاتی ہے۔

ہم اختر صاحب کے سلیس اور بے لطف اشعار کے نمونے دکھا چکے۔ اب کچھ مثالیں ان نامناسب الفاظ، غلط ترکیبوں اور سست بندشوں کی پیش کرتے ہیں جو اس مجموعے میں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

اے دنیوی شکوہ و زر وجاہ کے خیال　　　　مجھ سے نہ بول عرش پہ میرا دماغ ہے

"مجھ سے نہ بول" خفگی کے موقع پر کہا جاتا ہے "مجھ کو نہ چھیڑ" کہئے۔

کم زور اور سست تھی کاغذ پہ وہ غزل　　　　گائی گئی تو چیز ہی کچھ اور ہوگئی

الفاظ تیر بن کے دلوں میں اتر گئے　　　　لفظوں میں روح نغمہ کچھ اس طرح کھوگئی

تیر دل میں اترتا نہیں چبھتا ہے "لفظوں میں روح نغمہ کچھ اس طرح کھوگئی" یہ گانے کی تعریف ہے یا غزل کی مذمت۔

تیری نازک اور پتلی انگلیاں　　　　ساز کے تاروں کو جب کرتی ہیں مس

کانپنے لگتی ہے زہرہ عرش پر　　　　دل پکار اٹھتا ہے "بس اللہ بس"

یہ بھی ہجو ملیح معلوم ہوتی ہے۔ "کانپنے" کے لفظ نے یہ خرابی پیدا کی ہے۔

صدقے جاؤں بہار ساون کے

"بہار ساون" کی ترکیب غلط ہے خواہ حضرت دتا تریہ کیفی کچھ بھی فرمائیں۔

اب قوم کا تنفس محتاج ہے تپش کا　　　　تیری جلن سے اس میں چنگاریاں ہوں بند

تنفس کا لفظ اردو میں دم کے معنی میں نہیں دم چڑھنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس شعر کو پڑھ کر ایک

علامۂ عصر کا قول یاد آگیا "فلاں انجمن میں کیا رکھا ہے چند نفس بیٹھے اونگھا کرتے ہیں"
مجموعی طور پر احقر صاحب کا کلام بہت اچھا ہے اور وہ نوجوان شاعروں کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔
(ع - ح)

شکار | از جناب قطب یار جنگ مرحوم اول تعلقہ دار سرکار نظام۔ حجم ... ۵ صفحات تقطیع بڑی کتابت و طباعت عمدہ، کاغذ نفیس قیمت مجلد عـــہ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد (دکن)

انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں شکار پر اور ہندوستان کی بعض بہترین شکارگاہوں پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں ہمارے ملک میں باوجودیکہ شکار کا ذوق عام ہے اور شکار کی بھی کثرت ہے لیکن تعجب کا مقام ہے کہ اردو زبان میں اس موضوع پر ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا تھا اس لئے نوآموز اور انگریزی زبان سے ناواقف شکاریوں کے لئے سوائے پرانے اور غلط سلط تجربات کے کوئی چیز راہ نما نہ تھی۔ اس کتاب کی تالیف و اشاعت نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔

شروع میں انساب کے بعد نواب قطب یار جنگ مرحوم کے مختصر حالات زندگی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کو زمانۂ طالبعلمی سے ورزش اور شکار کا شوق تھا، تعلیم سے فارغ ہو کر حیدرآباد محکمۂ فوج میں ملازم ہوئے پھر اول تعلقہ دار (ڈپٹی کمشنر) ہو گئے۔ تقریباً ایسے اضلاع میں ہوا جو شکار کا مشہور مرکز ہیں اس لئے اس شوق کو پورا کرنے کا خوب موقع ملا اور گویا ملازمت کا اکثر حصہ شکار میں گزرا۔

سوانح حیات کے بعد خود مصنف کا طویل مقدمہ ہے۔ اس میں انھوں نے شکار کو دوسرے ورزشی کھیلوں (Sports) سے افضل بتایا ہے۔ پھر نشانہ اندازی کا طریقہ بتایا ہے۔ بندوق اور اس کے سامان کے متعلق مفید اور قیمتی ہدایات درج کی ہیں۔ شکار کے سامان کی پوری تفصیل لکھی ہے اور یہ بتایا ہے کہ شکاری کے ساتھ کس قسم کے آدمی ہونا چاہئیں۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے اس میں انھوں نے شکار کی قسمیں بتائی ہیں مثلاً چیتے سے ہرن کو شکار کرنا۔ مچھلی پکڑنا۔ جال لگا کر پرندوں کو پکڑنا۔ کسی آلۂ جارحہ یا بندوق سے جانوروں کا شکار کرنا وغیرہ۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب بندوق کے شکار کے متعلق ہے۔

بندوق کے شکار کی انھوں نے دو قسمیں کی ہیں، اسمال گیم (چھوٹا شکار) اور بگ گیم (بڑا شکار یا بڑے جانوروں کا شکار)۔ اسمال گیم میں انھوں نے سنائپ، بٹیر، ہریل، تیتر، تلیر، کبوتر، مور، آبی پرندوں اور خرگوش کا ذکر کیا ہے۔ بگ گیم میں تمام چرندوں اور درندوں کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ہرن، چکارہ، جنگلی بکری، جنگلی مینڈھی، چیتل، نیل گائے، بارہ سنگھے اور سانبھر کا حال لکھا ہے۔ سانبھر کے بیان پر کتاب کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔

بعد میں درندوں اور ان جانوروں کا حال ہے جو انسان کے لئے درندوں کی طرح خطرناک ہیں مثلاً جنگلی بھینسا، بیل، گینڈا، ہاتھی وغیرہ۔ دوسرے حصہ میں پہلے شیر کا بیان ہے اور ۲۲۲ صفحے پر ختم ہوا ہے۔ اس کے بعد تیندوا یا گلدار، چیتے، بھیڑئے، جنگلی کتے، سیاہ گوش سیہی، ریچھ، سؤر، گور، یا بائسن، جنگلی بھینسے اور گینڈے اور سب سے آخر میں شیر ببر کا حال ہے۔ فاضل مؤلف نے ان جانوروں کے شکار کے طریقے ہی نہیں بتائے ہیں، بلکہ ہر جانور کی پیدائش، زمانہ پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور عادات و خصوصیات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

یہ مواد انھوں نے انگریزی کی مستند تصانیف اور خود اپنے تجربے کی مدد سے فراہم کیا ہے۔ کتاب کی دلچسپی قائم رکھنے اور مختلف باتوں کو سمجھانے کے لئے انھوں نے بیشتر اپنے اور کمتر دوسرے شکاریوں کے شکار کے واقعات درج کئے ہیں۔ شیر کے بیان میں انھوں نے خاص طور پر اس کا التزام رکھا ہے۔ یہ واقعات اس قدر دلچسپ اور بعض اوقات اس قدر حیرت انگیز ہیں کہ پڑھنے والا ہمہ تن محو ہو جاتا ہے۔ یہ موضوع بجائے خود دلچسپ ہے لیکن مؤلف کے طرز تحریر نے اسے دلچسپ تر بنا دیا ہے۔ روانی بیان، صفائی و سلاست کو دیکھ کر اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مصنف کو سیف و قلم پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

یہ کتاب وقت کے بہترین شکاری کے تجربات اور مشہور و مستند مغربی مصنفین کی کتابوں کا نچوڑ ہے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہے تو صرف تصویروں کی۔ تصویروں سے کتاب اور بھی دلچسپ اور مفید ہو جاتی۔ ناشر صاحب کا وعدہ ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں وہ تصویروں کا اضافہ کر دیں گے۔

ہمارے خیال میں یہ کتاب تجربہ کار شکاریوں کے لئے بہترین مشیر اور نو آموز شوقینوں کے لئے مستند رہنما کا کام دے گی۔ (ح۔ح)

خیالات مہاتما گاندھی (دو حصے) | از پادری سی۔ اف۔ اینڈریوز۔ حجم ہر دو حصہ ۱۲۵ صفحات تقطیع چھوٹی کتابت وطباعت اور کاغذ متوسط۔ دونوں حصوں کی قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ: رفعت یار خاں۔ حکیم بلڈنگ۔ تیسری منزل موسن پورہ بمبئی نمبر ۱۱۔

اس کتاب میں پادری سی۔ اف۔ اینڈریوز نے مہاتما گاندھی کے اصول وخیالات اور ان کی خودنوشت سوانح حیات کے منتخب حصوں کو جمع کر دیا ہے۔ کتاب کا مقصد خود ان کے الفاظ میں ان بڑے بڑے اصولوں اور خیالات کی جو مہاتما گاندھی کی پُر از واقعات زندگی کا طرۂ امتیاز رہے ہیں تحریری شہادت کی امداد سے تشریح کرنا ہے۔

کتاب میں علاوہ خاتمے اور ضمیموں کے بیس باب ہیں پہلے ۹ بابوں میں مہاتما گاندھی کے اصول اور خیالات ہیں اور دوسرے حصہ میں ان کی سوانح حیات کا انتخاب۔ پادری صاحب کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ پہلے تو مہاتما گاندھی کے خیالات واصول کی اپنے الفاظ میں تشریح کرتے یا اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہیں پھر مزید تشریح یا ثبوت کے لئے خود گاندھی جی کی تحریروں سے اقتباسات پیش کرتے ہیں اور یہ طریقہ شروع سے آخر تک رہا ہے۔ مہاتما گاندھی کی زندگی اور ان کے اصول وعقائد پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکیں۔ یہ کتاب ان میں ایک مفید اضافہ ہے پادری صاحب نے اسے بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا ہے اور بہت سے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا اردو ترجمہ بھی بہت صاف سلیس اور رواں ہے۔

(ح۔ ح)

رسائل:۔

کنول (ماہوار) مدیر جناب منظر صدیقی اکبرآبادی۔ تقطیع متوسط۔ حجم ۴۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر کاغذ اوسط درجے کا قیمت سالانہ ۳؍ فی پرچہ ۵؍ مقام اشاعت آگرہ۔

جناب منظر صدیقی نے یہ رسالہ جاری کیا ہے۔ پہلا پرچہ محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ رسالے میں علمی وادبی مضامین۔ افسانے، نظمیں، غزلیں۔ غرض ہر طرح کا سامان موجود ہے شعرا اور مضمون نگاروں میں بھی بعض اچھے اچھے نام نظر آتے ہیں۔ بلاک کی بھی تین تصاویر ہیں۔ اگر منظر صاحب اسی محنت ودلچسپی سے کام کرتے رہے تو رسالہ بہت جلد مقبولیت حاصل کرے گا۔

(ح۔ ح)

شذرات

اپریل کے مہینہ میں اندور میں ایک ہندی کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ اس میں ہندی کی ترقی کے لئے بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں منجملہ ان کے ایک تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی زبانوں اور ادبوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی جائے اور ہندی زبان کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان ہونے کی حیثیت سے ملک کی تمام زبانوں کے ادب کی نمایندگی کا موقع دیا جائے۔ اس غرض کے حصول کے لئے فی الحال تین آدمیوں کی ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے اور اس کمیٹی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ارکان کی تعداد میں اضافہ کر سکتی ہے۔ کمیٹی نے اس سمت میں ابتدائی قدم اس طرح اٹھایا ہے کہ ہندی زبان میں ایک رسالہ "ہنس" جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور صوبوں کی مختلف زبانوں میں جو مضامین مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت چھپتے رہتے ہیں ان کا ترجمہ اس رسالہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۱) مختلف صوبوں کے ادبی اور تمدنی واقعات پر مختصر نوٹ۔

(۲) صوبوں کے ادبیات کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ جس میں خاص زور ان کی جدید ترقی اور قومی رجحانات پر دیا گیا ہو۔

(۳) صوبوں کے ادب کی بہترین غزلیں۔

(۴) صوبوں کے ادب کے بہترین افسانے۔

(۵) ایک مسلسل مضمون۔

(۶) مختلف صوبوں کے عوام میں جو ادب رائج ہو۔

(۷) مختلف زبانوں کے بہترین ڈرامے۔

(۸) صوبوں کے ادبوں میں جن نثر نگاروں اور شاعروں کا درجہ بلند و ممتاز ہے ان کی سیرۃ نگاری کے نمونے اور ادبی تنقیدیں۔

(۹) مختلف صوبوں کے ممتاز لوگوں کی لفظی تصویریں۔

(۱۰) صوبوں کے ادبوں اور تمدنوں کا باہمی مقابلہ۔

(۱۱) مختلف زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر تبصرہ۔

(۱۲) مختلف رسالوں میں جو قیمتی ادب شائع ہوتا ہے اس کی اشاعت ہندی ترجمہ کے ساتھ۔

(۱۳) غیر ملکی ادب پر مختصر نوٹ۔

(۱۴) صوبہ جاتی زبانوں کے بہترین ناولوں کے خلاصے۔

(۱۵) ہندوستان کے لئے مشترک رسم الخط پر بحث و مباحثہ۔

اس کمیٹی کے ارکان نے اردو کا شمار بھی صوبہ جاتی زبانوں میں کیا ہے اور ہمارے پاس اشتراک عمل کے لئے اپنا لٹریچر روانہ کیا ہے۔ کیا اردو واقعی ایک فرقہ اور صوبہ کی زبان ہے؟ اس کا جواب باتوں سے نہیں کاموں سے دیا جا سکتا ہے۔ جو کام کرے گا وہ آہستہ آہستہ نکموں اور ناکاروں پر حاوی ہو جائے گا۔ کام کی منطق تمام لفظی منطقوں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی نے ہمارے پاس ایک اپیل اشاعت کے لئے بھیجی ہے۔ وہ ایک رسالہ "کاخ بلند" دہلی سے نکالنا چاہتے ہیں جوش صاحب نے زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان سے اردو داں طبقہ بخوبی واقف ہے۔ اس رسالہ کے ذریعہ سے ان کا ارادہ یہ ہے کہ اپنے میدان عمل کو اور وسیع کریں اور اپنی باقی زندگی ملک میں بیداری پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیں۔ ان کا ارادہ نہایت مستحسن ہے اور ان کا مطالبہ بھی کچھ بہت زیادہ نہیں۔ چندہ دس روپیہ ہے اور وہ رسالہ کے اجراء سے پہلے چاہتے ہیں کہ ایک ہزار خریدار اس چندہ کو پیشگی منی آرڈر کر دیں۔ ہم ان کی اپیل بجنسہ دوسرے صفحہ پر درج کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے جناب جوش کے قدرداں انھیں مایوس نہ کریں گے۔

بڑی چھٹیوں کے بعد جامعہ کھل گئی ہے۔ داخلہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں پچھلے سال سے اچھا رہا ہے۔

نئے دارالاقامہ بھی خوب آرام دہ اور وسیع ہیں۔ پڑھائی کا کام شروع ہو گیا ہے۔

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو بنارس کی قومی جامعہ نے تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ صاحب موصوف نے وہاں جو خطبہ پڑھا اُسے ہم جامعہ کی آیندہ اشاعت میں پیش کریں گے۔

مولوی شفیق الرحمٰن صاحب ناظم ہمدردان جامعہ کو ضلع بارہ بنکی میں عمارات جامعہ کے لئے چندہ کی فراہمی میں اچھی کامیابی ہوئی۔ اس ضلع سے تقریباً تیرہ سو روپیہ جمع ہو گیا۔ آج کل وہ ضلع الہ آباد کا دورہ کر رہے ہیں۔

دہلی سے

ایک انقلابی اور معیاری ماہ نامے کا اجرا

"کارِ خِ بلند"

زیرِ ادارت جوشؔ ملیح آبادی

سائز کلاں	۱۸×۲۲ / ۸	طباعت وکتابت	روشن
صفحات	۱۰۸	ٹائیٹل	دورنگی
سالانہ چندہ	لعہ	کاغذ	قسم اعلیٰ

تصاویر ۸ صفحوں پر (آرٹ پیپر)

مدت دراز سے میری تمنا تھی کہ ہندوستانی علم و ادب اور ہندوستانی ذہن و فکر کو عصر حاضر کی سطح تک بلند کرنے کی خاطر ایک ایسا ماہ نامہ جاری کروں جو اپنے تمام ظاہری و باطنی محاسن کے لحاظ سے زندہ اقوام کے جدید ترین معیارِ صحافت پر پورا اتر سکے۔

اس ذوقِ حقیقی معیارِ ادب انشوار آراء ی فکر اور صحیح انتقاد کی رو سے ہمارا علمی افلاس اس قدر شرمناک ہے کہ ہم دوسری قوموں کو منہ نہیں دکھا سکتے۔

جب تک جمود و جہل کا یہ عالم رہے گا اور جس وقت تک ملک کے ادبیات میں ایک ناقابلِ مقابلہ عظیم انقلاب نہ پیدا کر دیا جائیگا کسی ذہنی برتری، سیاسی بیداری اور مادی ترقی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

اس لئے اب، جب کہ حیدرآباد سے پنشن ہو جانے کے باعث میرے پاس کافی وقت ہے اور مفکرین کی ایک جماعت بھی مجھ سے تعاون پر تیار ہے، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی باقی زندگی اسی جد و جہد میں صرف کر دوں گا۔

لیکن ظاہر ہے کوئی کام سرمایے کے بغیر نہیں چل سکتا اور میرے واسطے یہ بھی ناممکن ہے کہ سرمایے کی خاطر میں اربابِ دولت کی آستاں بوسی کرتا پھروں۔ ان حالات میں صرف یہی ایک صورت قابلِ عمل نظر آتی ہے کہ اگر اپنی قوم سے مجھے ایک ہزار خریدار مل جائیں جو اپنا پیشگی چندہ منی آرڈر کر دیں تو میں فوراً رسالہ جاری کر دوں۔

میں دو ماہ تک انتظار کروں گا کہ میرے برادرانِ وطن میری اس مخلصانہ تجویز کا کیونکر خیر مقدم کرتے ہیں۔

میں نے اب تک جس خلوص و بے لوثی سے ملک کی خدمت کی ہے اُس سے مجھے توقع ہے کہ میری قوم مجھ پر اعتماد کر کے مجھے اپنی خدمت کا ضرور موقع دیگی۔

آخر میں نہایت صاف صاف یہ عرض کر دینا بھی مناسب خیال کرتا ہوں کہ اپنی قوم سے میری یہ پہلی اپیل کسی نوع کے تاجرانہ تخیل سے آلودہ نہیں ہے۔ میری ذاتی معاش کے واسطے میری تصانیف، میری پنشن اور میری آبائی جائداد کافی ہے۔

سرِ دست میں دھولپور میں ہوں اور میرا پتہ صرف "دھول پور (راجپوتانہ)" کافی ہے۔

جوشؔ

۳ اگست ۱۹۳۶ء

انقلاب فرانس

مصنفہ

مولوی عبدالقادر صاحب بی۔ اے (جامعہ)

مکتبہ جامعہ سے دنیا کے مختلف ممالک کے انقلابات پر مختصر کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اٹلی، روس، امریکہ، آئرلینڈ وغیرہ کے انقلابات کے حالات زیر ترتیب ہیں۔ ناظرین کیلئے یہ بہت ہی دلچسپ اور پُر از معلومات سلسلہ ہے خصوصاً پہلی کتاب اُردو زبان میں اس موضوع پر ایک خاص حیثیت کی حامل ہے۔ فوراً طلب فرمائیے۔ قیمت صرف ۱۲؍

انجام (ڈراما)

مصنفہ

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن)

یہ ڈراما رسالہ جامعہ میں شائع ہوکر بیحد پسند کیا جا چکا ہے اور جامعہ کے طلبا نے اسٹیج بھی کیا تھا۔ اس میں انسان کی خود فریبی کا ایک نمونہ اور جھوٹی مذہبیت کی پردہ دری اس انداز میں کی گئی ہے کہ پڑھنے والے حیرت سے دنگ رہ جاتے ہیں اور وہ اثر لے کر اٹھتے ہیں کہ انکی روح ایک عرصہ تک بےچین رہتی ہے۔

مزاحیہ پارٹ بھی بڑا خوشگوار ہے۔ کتاب الہ آباد کے خوشنما ٹائپ میں نہایت اچھی چھپی ہے۔ قیمت صرف ۱۲؍

کسان

مترجمہ

جناب محمود علی خانصاحب جامعی

اس کتاب میں کسان کے افلاس کے اسباب اور ان کے علاج پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا ہے کہ قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اسکو خوشحال سے محتاج بنایا گیا؟ اور اب کیا صورتیں اختیار کی جائیں کہ دوبارہ اس کے دن پھر جائیں۔

کسانوں کے غریب طبقہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ضرور پڑھیں۔ قیمت عہ

دو خدائی خدمتگار

مترجمہ

جناب محمود علی خانصاحب جامعی

ڈاکٹر خانصاحب اور خان عبدالغفار خاں کے حالات زندگی انگریزی زبان میں مہاتما گاندھی کے ارشاد پر مہادیو ڈیسائی نے لکھے تھے۔ یہ کتاب ان ہی حالات کا نہایت سلیس اور نفیس اُردو ترجمہ ہے۔ اسے پڑھکر آپ صوبہ سرحد کی سیاسی تحریک سے ابتدائی واقفیت حاصل کرسکتے ہیں۔

کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ اور آٹھ تصویریں بھی ہیں۔ قیمت صرف ۱۲؍

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سالنامہ پیام تعلیم دہلی

(تاسیس نمبر ۱۹۳۵ء)

نہایت خوشی کی بات ہے کہ پیام تعلیم کا تاسیس نمبر ۲۹ اکتوبر ۳۵ء کو بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوگا۔ رنگی تصویریں، ہاف ٹون اور لائن بلاک اس غیر معمولی تعداد میں دیئے جائیں گے کہ بچوں کے کسی پرچے میں آج تک شائع نہ ہوئے ہوں گے۔ یہ لاجواب تحفہ بچوں کے لئے ایک ایسی چیز ہوگی کہ عرصے تک وہ اسے اپنے پاس رکھ کر خدمت خلق اور قوم پرستی کا سبق سیکھیں گے ۳۴ء کے سالنامہ کے مقابلہ میں یہ نمبر اسی قدر بہتر ہوگا جس قدر ۳۵ء میں پیام تعلیم سال گذشتہ کے مقابلہ میں ترقی کر گیا ہے۔ جو بچے اس سب سے اچھے باتصویر رسالے کے خریدار نہیں ہیں فوراً چار روپئے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر خریدار بن جائیں۔ یا اگر صرف یہ شاندار پرچہ خریدنا چاہتے ہوں تو ۸ر کے ٹکٹ بھیجدیں۔ پرچہ ۲۹ اکتوبر کو انھیں مل جائے گا۔

منیجر "پیام تعلیم"۔ قرولباغ۔ دہلی

اِل-۱۸۹۲ رجسٹرڈ نمبر

جامعہ

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

فی پرچہ ۸ر مطبع جامعہ دہلی قیمت سالانہ صہر

نقش چغتائی

یعنی

عبدالرحمن چغتائی کا دوسرا کارنامہ

اس میں رنگین اور سادہ اُنیس تصاویر ہیں جو مرقع چغتائی سے الگ اور مختلف اشعار پر ہیں۔ کتاب کی تقطیع کسی قدر چھوٹی یعنی ۲۷×۱۷ سائز کی ہے۔ کاغذ نفیس، طباعت عمدہ، جلد بہت چمکدار، ضخامت دو سو صفحات اور ہر صفحہ دو رنگ میں چھپا ہوا ہے۔

احباب کی خدمت میں یہ ایک اچھا تحفہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ قیمت صرف پانچ روپے۔ (صہ)

خطبات خالدہ خانم

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے وہ آٹھ خطبات جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مرکزی ہال میں تقریباً ایک ماہ تک دیئے۔ لایق خاتون کی تقریروں کا موضوع بھی بڑا ہی دلچسپ تھا یعنی "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" یہ سب خطبات کتابی صورت میں شائع ہوگئے ہیں جلد طلب کیجیے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت اُردو صرف عہ، انگریزی سے

اصول تعلیم

از

خواجہ غلام السیدین صاحب ایم۔اے۔ ایڈ

اُردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اب اچھے تعلیم یافتہ حضرات اس جانب متوجہ ہوگئے ہیں اور اسے خالص علمی مضامین کیلئے بھی اظہار خیال کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ خواجہ صاحب ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے پرنسپل ہیں اور اس لئے اس موضوع پر لکھنے کا پورا حق رکھتے ہیں کتاب اساتذہ اور تعلیمی طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہے اور ہر اسکول اور کالج کے کتب خانہ میں ضرور ہونی چاہیے قیمت ستہ

نیم شب (ڈراما)

از

جناب اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم۔اے

اس ڈرامے کا زمانہ ۱۹۸۵ء ہے مصنف نے یہ مان کر کہ اُس وقت ہندوستان میں اشتراکیت کا زور ہوگا فنی حیثیت سے وہ جد و جہد، دشواریاں، مصائب کامیابیاں اور ناکامیاں دکھائی ہیں جو ہر بڑی تحریک کا خاصہ ہیں۔

قیمت صرف ہر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

جلد ۲۴	ستمبر ۱۹۳۵ء	نمبر ۹

فہرست مضامین

(محمد مجیب صاحب بی-اے (آکسن) پروفیسر جامعہ)

قومی تعلیم کا نصب العین

(ذیل میں ہم ناظرین جامعہ کے مطالعے کے لئے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا وہ خطبہ درج کرتے ہیں جو صاحب موصوف نے کاشی ودیا پیٹھ (بنارس کی قومی جامعہ) کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں سنایا تھا۔ مدیر)۔

میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے اس جلسہ میں بلا کر اور تقریر کرنے کی اجازت دے کر میری بڑی ہی عزت افزائی فرمائی۔ میرا کام چونکہ مجھے برابر طالب علموں کے ساتھ رکھتا ہے اس لئے اپنی طالب علمی کے اور آجکل کے زمانہ میں مجھے کبھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ میں اپنے کو آج بھی اسی طرح طالب علم سمجھتا ہوں جیسا کہ آج سے ۱۵-۲۰ سال پہلے سمجھتا تھا۔ اس لئے جب مجھے آپ کے کل پتی جی 'ہم سب کے بزرگ اور مخدوم' ڈاکٹر بھگوان داس صاحب کا تار ملا کہ تم کاشی ودیا پیٹھ کے کنووکیشن کے جلسہ میں آکر کچھ کہو تو مجھے بہت ہی اچنبھا ہوا۔ ایسا ہی اچنبھا جیسا کہ آپ کے کسی کم عمر طالب علم کو یہ تار پاکر ہو کہ تم آکر جامعہ ملیہ کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں خاص تقریر کرو۔ اسی وجہ سے میں نے جواب میں بھی ذرا دیر کی' اور میرا پہلا خیال یہی تھا کہ میں ڈاکٹر صاحب سے معافی چاہوں اور یہ لکھوں کہ شاید آپ نے تار میں غلط آدمی کا پتہ لکھ دیا ہے۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ شاید اس بلاوے میں ایک اور بات چھپی ہے یعنی یہ کہ جامعہ ملیہ میں میرے ساتھی قومی تعلیم کا جو کام بڑے کٹھن حالات میں کر رہے ہیں اس میں کاشی ودیا پیٹھ کے بھائی اور ساتھی جو خود اسی قسم کے کام میں لگے ہوئے ہیں ہماری ہمت بڑھانا اور اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنی ذات کی طرف سے تو معافی مانگ لیتا مگر میرے دل میں آپ کے کام اور آپ کے کام کرنے والوں کی جو عزت ہے اس نے اجازت نہ دی کہ ان کی اس ہمت افزا دعوت کو رد کروں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت آپ کے سامنے حاضر ہوں۔

آج سے کوئی ۱۵ سال پہلے جب اس ودیا پیٹھ کی بنیاد رکھی گئی تھی تو وہ زمانہ ہماری قوم کے لئے

بڑی بے چینی کا زمانہ تھا۔ اس بے چینی کا سلسلہ ابتک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ کبھی ابھر آتی ہے، کبھی دب جاتی ہے۔ اس بے چینی نے ہماری قوم میں بڑی بیداری پیدا کی ہے اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں نے اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب اس بیداری کی تاریخ لکھی جائیگی تو اس زمانہ میں قومی تعلیمگاہوں کا قیام ہماری قومی زندگی کے لئے شاید سب سے زیادہ اہم واقعہ تسلیم کیا جائے گا۔

جس طرح سخت بیماری کی حالت میں جسم اپنے روگ کو دور کرنے کے لئے قدرتی طور پر کچھ نہ کچھ کرتا ہے۔ اور اس میں سوچ وچار کو زیادہ دخل نہیں ہوتا اسی طرح ہماری قوم نے بھی قومی تعلیم کے معاملہ کو کچھ بہت زیادہ سوچا تو نہ تھا، لیکن جب دکھ بڑھا تو اس نے اسے رفع کرنے کے لئے اور تدبیروں کے ساتھ آپ ہی آپ یہ تدبیر بھی کی کہ قومی تعلیم کا کچھ انتظام کرے۔ جب بیمار بہت کمزور ہوجاتا ہے تو مرض کو دفع کرنے کی کوششیں بھی کمزور ہی ہوتی ہیں۔ ہماری دوسری کوششوں کی طرح یہ قومی تعلیم کی کوشش بھی بہت کمزور کوشش ہے۔ بلکہ خود ہماری قوم میں اچھے سمجھدار آدمیوں کا خاصا بڑا گروہ ہے جو اس کوشش کی ضرورت ہی کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے فائدوں سے بالکل بے خبر ہے۔

یہ لوگ اکثر وہ ہیں جو انگریزی پڑھ لکھ لینے، یا کوئی ہنر سیکھ لینے کا نام تعلیم جانتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی ضرورت اور حیثیت کے مطابق جو اور جتنا لکھنا پڑھنا چاہتا ہے اور جو اور جتنا سیکھنا چاہتا ہے لکھ پڑھ لیتا اور سیکھ لیتا ہے۔ اگر ان لوگوں کے خیال کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک گروہ، یا جماعت، یا سماج اپنی جگہ پر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ الگ الگ آدمیوں کے ملنے سے بن جاتی ہے۔ جیسے پتھروں کا کوئی ڈھیر کہ اس میں اصلی چیز تو الگ الگ پتھر ہیں، یکجا ہونے سے ڈھیر بن گیا ہے۔ سماج بھی ان کے خیال میں فرد، اکیلا آدمی، ہی اصلی اور پہلی چیز ہے، سماج بس اکیلوں کے مل جانے کا نام ہے۔ ذہنی زندگی کا سرچشمہ فرد یا اکیلا آدمی ہی ہے۔ وہی سوچتا ہے، وہی سمجھتا ہے، وہی سب ذہنی چیزیں پیدا کرتا ہے اور سوائے اس کے کہ زندگی کو سہل بنانے کے لئے دوسروں کو کچھ مدد دے لے یا ان کی کچھ مدد کردے، خیالات اور ذہن کے لحاظ سے وہ اپنی دنیا آپ ہے۔ ہمارے تعلیمیافتہ لوگ جمہوریت کے لبرل فلسفہ کو پڑھ پڑھ کر اور ہرکلیس، پرامتھیس اور رابنسن کے ناموں اور کاموں اور

افسانوں سے متاثر ہو ہو کر اکیلے آدمی کو سماجی زندگی کی اصلی حقیقت اور سماج کو ان اکیلوں کا بس ایک ڈھیر یا انبوہ ماننے لگے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا خیال بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی زیادہ صحیح بھی ہے۔ یعنی یہ کہ اصلی چیز اور ابتدائی چیز سماج ہے اور اکیلا آدمی، فرد اسی کے سہارے اور اسی کے لئے ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ سماج کی حیثیت جسم کی ہے اور اکیلا آدمی یا چھوٹے چھوٹے سماجی گروہ اس جسم کے حصے ہوتے ہیں۔ جسم کے حصوں کو جسم سے اور پتھروں کے ڈھیر کو پتھروں سے جو تعلق ہے اس کا فرق ظاہر ہے۔ اس خیال کے مطابق میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں۔ اکیلا آدمی بطور جانور کے سمجھ میں آ سکتا ہے مگر پورے انسان کی حیثیت سے جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے اس کا تصور بھی ممکن نہیں ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہوتی ہے، یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جا سکتا ہے، ذہنی زندگی میں "تو" نہ ہو تو "میں" کا وجود بھی نہ ہو۔ اس لئے ذہنی زندگی کے لئے جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود لازمی ہے۔ بدن میں ہر حصہ کی کچھ الگ الگ حیثیت بھی ضرور ہوتی ہے مگر اس حد تک کہ وہ کل جسم سے وابستہ ہے اور اس کے اندر اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایک حصہ کے کٹ جانے سے جسم میں کمی آجاتی ہے مگر وہ باقی رہ سکتا ہے، مگر حصہ جسم سے الگ ہو کر باقی بھی نہیں رہ سکتا۔ درخت میں ہر ڈالی اور پتی بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے لیکن ڈال یا پتی کے ٹوٹ جانے سے درخت ختم نہیں ہوتا درخت سے الگ ہو کر البتہ ڈال اور پتی کے لئے سوائے فنا کے اور کچھ نہیں۔

جس طرح کچھ عرصہ میں جسم کا ایک ایک ذرہ بدل جاتا ہے مگر جسم کی زندگی برابر جاری رہتی ہے، جس طرح درختوں کی پتیاں بدل جاتی ہیں مگر درخت وہی رہتا ہے، اسی طرح سماج کے افراد بھی برابر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ مگر سماجی زندگی باقی رہتی ہے۔ ہر زندہ چیز کی طرح سماج میں بھی دو کام برابر ہوتے رہتے ہیں، ایک تو بدلتے رہنے کا اور ایک اپنے حال پر قایم رہنے کا۔ ان میں سے کوئی ایک کام بھی رُک جائے تو موت کا سامنا ہوتا ہے جو جسم اپنے کو قایم نہیں رکھ سکتا وہ تو فنا ہوتا ہی ہے، پر جس میں اپنے کو بدلتے رہنے کی طاقت نہ رہے وہ بھی موت ہی کے گھاٹ اترتا ہے۔ سماج میں افراد کے وجود کی غرض بس یہ ہے

کہ وہ اس بقا اور فنا، تحفظ، اور تغیر، ستقی اور پیمان کا ذریعہ بنیں۔ اور انھیں اس قابل بنانے کے لئے سماج کی تدبیر اور اس کا فرض نئی نسلوں کی تعلیم ہے۔ تعلیم دراصل کسی سماج کی اس جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لئے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی کر سکیں۔ قومی زندگی میں تعلیم اس طرح گذرے ہوئے زمانہ سے موجودہ زمانہ کو ملاتی ہے جیسے اکیلے آدمی کی زندگی میں اس کا حافظہ۔ جو سماج اپنی تعلیم کا نظام درست نہیں رکھتی وہ اپنے وجود کو خطرہ میں ڈالتی ہے اور جس طرح حافظہ کے ختم ہو جانے سے اکیلی زندگی کا سلسلہ باقی نہیں رہتا اسی طرح قومی تعلیم نہ ہونے سے قومی زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا کی سماجوں میں ہندوستانی سماج کو اپنی علیحدہ حیثیت قائم رکھنی ہے اور دوسری سماجوں کے مقابلہ میں اس کے پاس کچھ ہے جو اسے دوسروں سے الگ کرتا ہے اور وہ اس قابل ہے کہ باقی رہے اور دنیا کی زندگی اس سے مالامال ہو، تو ہماری سماج کا فرض ہے کہ اپنی تعلیم میں ان خاص چیزوں کا خیال رکھے جنھیں وہ خاص اپنا سمجھتی ہے یا اپنے گذرے ہوئے زمانہ کو اپنی آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا انتظام کرے، اس لئے کہ صرف کتابوں میں لکھے رہنے سے ہماری تاریخ زندہ نہیں رہ سکتی، اس کی زندگی کی بس ایک صورت ہے کہ وہ سماج کے ہر فرد کے دل اور دماغ کے ریشہ ریشہ میں زندہ ہو۔

مگر بہت سے روشن خیال لوگ ایسے بھی ہیں جو کہیں گے کہ یہ سب قدامت پسندی کی دقیانوسی باتیں ہیں۔ پرانی روایات تو اکثر قوم کی راہ میں رکاوٹ ہی ہوتی ہیں اور ماضی کا بوجھ گردن پر اٹھا کر قوم کے لئے آگے چلنا کٹھن ہو جاتا ہے۔ ان خام خیالیوں سے آزاد ہونا چاہیے اور موجودہ ضرورتوں کا خیال کرکے اور آنے والی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر اپنی نئی نسلوں کو سکھانا پڑھانا چاہیے۔ بس یہی قومی تعلیم ہے اور باقی سب ڈھکوسلے ہیں۔ ایسی باتیں وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو دل سے قوم کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اور جن کے دل میں اس بات کی لگن ہے کہ ان کی قوم جلد سے جلد ترقی کرے اور جتنی تیزی سے آگے بڑھ سکتی ہے بڑھے۔ یعنی خود قوم کی خاطر وہ قومی تعلیم کے اس خیال کو پسند نہیں کرتے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ میں ان لوگوں کی نیک نیتی پر ایک لمحہ کے لئے شبہ نہیں کرتا۔ مگر مجھے گمان ہوتا ہے کہ یہ تعلیم کی ماہیت سے واقف نہیں ہیں ورنہ شاید ایسی بات نہ کہتے۔

(۱)

تعلیم بس کچھ بول رٹ لینے یا چند باتیں جان جانے کا نام تو نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم اسے کہتے ہیں کہ آدمی جو دماغی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرے۔ تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے۔ جس طرح انسان کا جسم ایک چھوٹے سے تخم سے شروع ہوتا ہے، پھر مناسب غذا پاکر حرکت اور کام اور سکون و آرام سے طبیعیات اور کیمیا کے قانونوں کے مطابق کمال کے درجہ کو پہنچتا ہے اسی طرح ذہن کا نشو و نما بھی ذہنی غذا پاکر ذہنی قانونوں کے مطابق ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ ذہن کو یہ غذا کن چیزوں سے پہنچ سکتی ہے اور اس کے اثر کے قانون کیا ہیں۔ تو گذارش ہے کہ ذہنی غذا ملتی ہے تمدن سے، تمدن کی مادی اور غیر مادی چیزوں سے، مثلاً سماج کے علمی نظام سے، سماج کے فنون سے، سماج کے مذہب سے، سماج کی صنعت سے، سماج کے اخلاق کے اصولوں سے، سماج کے قانون سے، سماج کے رسم و رواج سے، سماج کی بڑی بڑی شخصیتوں کی زندگی سے، سماج میں خاندانی زندگی کے نمونہ سے، سماج کے گاؤں، قصبوں اور شہروں کی زندگی سے، سماج کی حکومت سے، فوج سے، عدالتوں سے، سماج کے مدرسوں سے۔

اب یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ سماج کی تمام مادی اور غیر مادی چیزیں سب ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انسان کا ذہن اپنے کو ان چیزوں میں ظاہر کرتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ذہن اپنے کو اپنے سے باہر یہ شکلیں دیتا ہے۔ ان چیزوں میں اس شخصیت کے ذہن کا اثر بھی ہوتا ہے جس نے انھیں بنایا، اس قوم یا نسل کا اثر بھی ہوتا ہے جس سے بنانے والا وابستہ تھا، اس وقت اور جگہ کے حالات کا اثر بھی ہوتا ہے جن میں اس نے یہ تمدنی چیز بنائی تھی ان سب کا اثر یوں کہیے کہ اس چیز میں آکر چھپ رہتا ہے، سو جاتا ہے۔ کوئی نیا ذہن جب انھیں اپنے اندر قبول کرتا ہے تو یہ چھپی ہوئی قوتیں اُبھرتی ہیں، سوتی ہوئی قوتیں جاگتی ہیں۔ تمدنی چیزوں کی ان سوئی ہوئی قوتوں کو پھر سے کسی انسان کے ذہن میں جگانے سے اس ذہن کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور کسی چیز سے ذہن کی تربیت اسی حد تک سمجھنی چاہیے جس حد تک اس کی سوئی ہوئی قوتیں قبول کرنے والے کے ذہن میں جاگی ہیں۔ مثلاً اچھے سے اچھے شعر کو کوئی رٹتے جائے ذہن کی کوئی تربیت نہ ہوگی اگر پڑھنے والے کے ذہن میں پوری طرح یا کچھ نہ کچھ وہ کیفیات پیدا نہ ہوں جو کہنے والے پر طاری تھیں اور جنھیں اس نے اپنے کلام میں گویا لاکر چھپایا تھا، سلایا تھا۔ کوئی شخص اگر دوسروں کی مذہبی زندگی کا حال عمر بھر پڑھتا

یا ستارتھ لیکن اس کے ذہن میں اس ذکر سے مذہب کی سچی کیفیت بیدار نہ ہو تو عمر بھر کے تعلق کے باوجود اس کے ذہن کی اس مذہبی تذکرہ سے کوئی تربیت نہ ہوگی۔ اور یہی حال تمام دوسری تمدنی چیزوں کا ہے۔

تعلیم کے کام سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر ذہن کی تربیت تمدن کی ہر چیز سے نہیں ہوتی۔ جس طرح ہر جسم کو ایک غذا نہیں بھاتی، اس سے کہیں زیادہ ہر ذہن کو بھی ہر ذہنی غذا نہیں پچتی۔ بچہ جس سماج میں پیدا ہوتا ہے اس کے تمدن سے نسلی تعلق کی وجہ سے ہی اس کے ذہن میں کچھ مناسبتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اس لئے خود اپنی سماج کے تمدن کی چیزوں سے اس کے ذہن کی بہتر تربیت ہو سکتی ہے تربیت پا جانے، ترقی کرنے کے بعد ذہن دوسری سماجوں کی چیزوں کو بھی اپنا سکتا اور ان سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر شروع میں اپنی موروثی مناسبت کی وجہ سے ایک صورت میں بڑی آسانی اور دوسری میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر وہ شخص جو تعلیم کے صحیح مقصد کو سمجھتا ہے اس بات پر مجبور ہے کہ بڑی حد تک ذہن کی تربیت کے لئے خود اس سماج کی تمدنی چیزوں سے کام لے جس سے طالب علم کا تعلق ہے ورنہ اس کی کوشش کے اکارت جانے کا ڈر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود تعلیم کی ماہیت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم قومی تعلیم کا نظام قایم کریں۔

اس لئے باوجودیکہ خود ہماری قوم کے بہت سے سمجھدار لوگ ابھی اس بات کو صحیح نہیں مانتے، ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ قومی تعلیم کے چند ادارے تو ملک میں قایم ہو چکے ہیں۔ ان اداروں کا، جن میں آپ کے ودیا پیٹھ کو بڑی اہم حیثیت ہے، فرض یہی نہیں کہ وہ ان طالب علموں کی تعلیم کا انتظام کردیں جو ان کے یہاں ۵ آتے ہیں، یا کچھ عام معلومات کی اور کچھ خاص تحقیقات کی کتابیں شایع کردیں۔ بلکہ باوجود وسائل کی کمی اور کام کی دشواریوں کے جن سے میں بخوبی واقف ہوں، ان اداروں کا بڑا ضروری فرض یہ بھی ہے کہ ان کے کام کرنے والے اور ان کے استاد اپنے دیس کی قومی تعلیم کا ایک پورا نظام بنائیں۔ میں جانتا ہوں یہ نظام ابھی بہت کچھ خیالی ہوگا اور اسے رائج کرنے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ مگر رائج کرنے کے موقعے کہہ کر نہیں آتے۔ پھر جب آتے ہیں تو ایسے حالات میں آتے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کا بہت موقع نہیں ہوتا اور وقت کے وقت جو بن پڑتا ہے کر لیا جاتا ہے اور اس میں اکثر بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں جن کا نقصان صدیوں تک جاری رہتا ہے۔ اس فرض کو ابھی سے انجام

دینے کی ضرورت اس وجہ سے اور بھی ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی ہی نہیں، علمی اور تعلیمی جماعتوں نے بھی قومی تعلیم کے مسئلہ پر بہت کم غور کیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کیا ہے تو بس یہی کہ موجودہ نظام بہت برا ہے اور اس میں جو ترمیمیں تجویز کی ہیں وہ اکثر بہت جزوی۔ اس لئے کہ ہمارے نظام تعلیم میں بس اتنی تبدیلی سے کام نہیں چلے گا کہ اس میں دیسی زبان کے لئے کوئی اچھی جگہ نکل آئے اور تاریخ کی کتابیں بدل دی جائیں! ہماری قومی تعلیم کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ مثلاً ہمارے دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علیحدہ علیحدہ ہیں قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور ایک متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولہ میں ان تفریقوں کو بالکل پس پشت نہ ڈال دیں گے یا ہر صوبہ اور ہر گروہ کو، جس کا تمدنی اساسہ اتنا ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہیں نکالے۔ اگر آپ کے نزدیک تعلیم کا وہ نظریہ صحیح ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو غالباً اپنے شہریوں کے ان مختلف گروہوں کو اپنے اپنے تمدن سے تعلیمی کام لینے کا موقع دینا سیاسی دانشمندی کا تقاضا ہی نہ سمجھا جائیگا بلکہ خود صحیح تعلیم کے لئے لازمی مانا جائے گا۔

مثال کے طور پر آپ ہندی مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ ہی کو لے لیجئے۔ کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم ان مسلمانوں کو اس بات کا موقع دیگا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنالیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لئے کتنا اہم ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لئے مضر ہو۔ مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں۔ کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دانوں کا یہی تقاضا ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قایم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس تند بدشبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے

ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما ‌‌ ‌ ‌ گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات، اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لئے بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے۔ ہندوستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے، ان کے لئے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب مسلمان سیاست کے میدان میں دوسری تمام ہندی آبادی کے پہلو بہ پہلو ہوں گے، جداگانہ اور مشترکہ انتخابات کے جھگڑے ٹنٹے بھی بھلائے جا چکے ہوں گے اور غالباً ملازمتوں کے حصول میں بھی مسلمان ایک خود دار گروہ کی طرح بجائے تحفظ کے مقابلہ پر اصرار کرتے ہوں گے، اس وقت بھی وہ یہ ضرور چاہیں گے کہ ان کی تعلیم کے نظام میں ان کی تمدنی چیزوں کو پورا پورا دخل ہو اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی دانشمند ہندوستانی حکومت ان کے اس مطالبہ کو پورا کرکے مسلمانوں کی ترقی اور ان کی ترقی سے خود اپنی مضبوطی کا سامان کریگی۔

بات ذرا دور جا پڑی، میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ہمارے ماہرین تعلیم کو ملک کی مختلف مذہبی اور جغرافی جماعتوں کے علیحدہ علیحدہ یا بالکل ایک سے نظام کے متعلق غور کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ان کا فیصلہ یہی ہو جس کی

طرف میں نے اشارہ کیا ہے تو ایک اور مشکل سوال کا حل انھیں سوچنا پڑیگا یعنی اس طرح اجزار کو تمدنی آزادی دیکر وہ متحدہ قوم اور اس کی ریاست کو کمزور تو نہیں کر دیں گے۔ اس لئے کہ اگر اجزار کی اس آزادی کے ساتھ ہی کل کے ساتھ محبت کا نہایت مضبوط رشتہ قایم نہ ہوا تو بیشک یہ آزادی کل قوم کے لئے کمزوری اور بعض حالتوں میں ہلاکت کا باعث ہوسکتی ہے۔ اس لئے ہمارے قومی نظام تعلیم کو اس مرکزی خیال کی ترویج کرنا ہوگی کہ جس طرح افراد کی ذہنی نشو ونما اور شخصیت کی تکمیل کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنے کو اپنی سماج کے تمدن سے نشو ونما دیں اور اس کی سیوا کو اپنی ترقی کا ذریعہ جانیں اس طرح ہماری بڑی ہندوستانی سماج میں جو جو جماعتیں اور چھوٹی سماجیں ہیں ان میں بھی یہ عقیدہ نہایت پختہ ہونا چاہیئے کہ وہ بھی بہ حیثیت جماعت اس وقت پوری ترقی کر سکتی ہیں جبکہ بڑی سماج کا اپنے کو خادم جانیں اُس کی بھلائی میں اپنی بھلائی اور اس کی برائی میں اپنی برائی دیکھیں۔ اس عقیدہ کا پیدا کرنا اگر نظام سیاسی کی خوبی پر منحصر ہے تو نظام تعلیم پر بھی بہت کچھ مبنی ہے۔

اور یہی کیا۔ ایسے بے شمار سوال ہیں جن پر ہندوستان کے بہترین دماغوں کو غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مثلاً اگر ہمارا تعلیمی نظام ہمارے ہاتھ میں ہو تو اس وقت بھی کیا مدرسے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لئے قایم ہوا کریں گے اور ان کا مقصد بھی تندرست اچھے سچے آدمی پیدا کرنے کی جگہ چلتے پھرتے کتب خانے پیدا کرنا ہوگا؟ کیا اس وقت بھی بچوں کی قدرتی صلاحیتوں کا خیال کئے بغیر سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جایا کرے گا اور اس طرح قوم کی ذہنی قوت کو کہ اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے برباد کیا جائیگا؟ یا مختلف صلاحیت والوں کے لئے مختلف قسم کے مدرسے ہوں گے جس میں ابتدائی تعلیم کے بعد بچے بھیجے جا سکیں گے اور اپنے خاص رجحان ذہنی کے مطابق تعلیم پائیں گے؟ کیا اس وقت بھی مدرسہ اور قوم کی زندگی میں اتنا ہی کم تعلق ہوگا جیسا کہ اس وقت ہے یا بچپن ہی سے ایسے موقعے بھی ملا کریں گے جن سے ہر ہندوستانی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ قوم کی سیوا کر کے ہی وہ اپنی ترقی کی راہ نکال سکتا ہے؟ کیا اس وقت بھی ہمارے مدرسے خودغرضی اور شخصی مقابلہ ہی کے عملی سبق دیا کریں گے اور دوسروں کی خدمت اور مدد کے موقعے ان میں ناپید ہوں گے؟ کیا اس وقت بھی مدرسوں کو بس اس سے سروکار ہوگا کہ علم

سکھا دیا لیکن علم برتنے اور سیرت پر اثر انداز ہونے کا کوئی ساماں نہ ہوگا ؟ کیا اس وقت بھی ہمارا نصاب ایسا ہی چوچوں کا مربّا ہوگا جیسا کہ اب ہے یعنی کیا اس وقت بھی ہر چیز کو مضمون بنا کر اور نصاب میں شامل کر کر کے بچہ کے لئے مصیبت اور اس کی تعلیم کے لئے بے اثری کا ساماں کیا جائیگا - یا ایک یا تھوڑی سی چیزوں میں اچھی مہارت پیدا کرکے ایسی قابلیت پیدا کر دی جائے گی جس سے وہ دوسری چیزوں کو ضرورت کے وقت خود حاصل کر سکے ہم کیا اس وقت بھی پیشہ اور عام تعلیم کو بالکل الگ الگ رکھا جائے گا - یا پیشہ کی تعلیم کا ایسا انتظام ہو سکے گا کہ وہی عام تعلیم کی مضبوط بنیاد ثابت ہو ؟ غرض یہ اور ان جیسے ان گنت مسائل ہیں جن کا ذکر کرکے میں آپ کا وقت ضایع نہیں کرنا چاہتا - اتنا بھی صرف اس لئے ذکر کیا کہ یہاں ایک بڑے قومی ودیا پیٹھ کے کارکن جمع ہیں، انھیں اس طرف توجہ دلانے سے شاید اس بات کا موقع نکل سکے کہ ہمارے تعلیمی کام کرنے والے ان مسئلوں پر غور کریں اور اپنی تحقیق کے نتائج کو قومی تعلیم کے کسی ادارے کی طرف سے شایع کر سکیں تا کہ ہوتے ہوتے سب کے سوچ وچار سے قومی تعلیم کا ایک صحیح پروگرام تو تیار ہو جائے اور اگر کل نظام کو ناموافق حالات کی وجہ سے رائج نہ کیا جا سکے تو کم سے کم ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کو طے کرنے کے بعد نمونہ کے مدرسے قایم کئے جائیں اور کم سے کم تعلیم کی اس بنیادی منزل کو میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں ہی کے ذریعہ درست کرنے کی تدبیر کی جائے -

کل پتی جی ! میں نے آپ کی دعوت اور اس جلسہ سے فائدہ اٹھا کر بعض تعلیمی مسائل کا ذکر کر دیا کہ شاید اس سے اس تحقیق کا دروازہ کھلے جس کی میں نے درخواست کی ہے - لیکن مجھے یقین نہیں کہ میں نے یہ ٹھیک بھی کیا یا نہیں - اس وقت تو مجھ سے یہ توقع ہوگی کہ میں ان نوجوانوں سے کچھ کہوں گا جو آپ کے ودیا پیٹھ سے تعلیم ختم کرکے جا رہے ہیں - اب آپ کی اجازت سے ان طلبہ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں -

عزیزو ! تم علم کے اس شہر کاشی سے یہاں کے اس مشہور ودیا پیٹھ میں اچھے اچھے اور لائق استادوں سے تعلیم پاکر اب دنیا میں قدم رکھتے ہو - مجھے معلوم نہیں کہ اس دنیا میں جو ودیا پیٹھ سے بہت زیادہ سخت اور بے رحم جگہ ہے تم کیا کرنا چاہتے ہو - ہو سکتا ہے کہ تمہارا حوصلہ ہو کہ تجارت اور کاروبار، بیوپار یا نوکری سے بہت سی دھن دولت کماؤ اور چین سے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی گذارنے کا ساماں کرو - اگر ایسا ہے

تو خدا تمھارے ارادوں میں برکت دے، مگر مجھے تم سے پھر کچھ بہت کہنا نہیں ہے۔ تم اپنی کامیابی کے لئے خود راہیں تلاش کر لوگے، اگر ٹھیک راستہ پر پڑے تو زیادہ تر اپنا فائدہ کروگے، اگر غلط پر پڑے تو سزا بھگتوگے مگر دوسروں کا کچھ بہت نقصان نہ ہوگا۔ لیکن چاہے تم دھن دولت کی فکر ہی میں لگ جاؤ کم سے کم کاشی ودیا پیٹھ کے سناتک ہوکر تم کبھی اپنی قوم کی راہ میں روک نہ بننا۔ اپنی کامیابی کے لئے بہتیرے لوگ قوم کا نقصان کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ تم اس کا دھیان رکھنا کہ کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنے فرائض کو ترک کرکے اور اپنی ساری اچھی خواہشوں کو پیروں تلے روند کر اس تک پہنچا جائے۔ جو اپنی غرض کے لئے اتنا اندھا ہو جائے کہ اپنے دیس اور قوم کو نقصان پہنچانے سے بھی نہ چوکے وہ آدمی نہیں جانور ہے۔

اور اگر کاشی ودیا پیٹھ میں پڑھے ہوئے ہونے کی وجہ سے تم اپنی زندگی دیس کی سیوا میں لگانا چاہتے ہو تو تو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔

تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا بدنصیب ملک ہے۔ وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بے انصافیوں کا ملک ہے، بے رحمیوں کا ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی موت کا ملک ہے، افلاس اور ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے۔ غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجئے، تمھارا اور ہمارا ملک ہے، اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے۔ اس لئے یہ ملک تمھاری ہمتوں کے امتحان، تمھاری قوتوں کے استعمال، اور تمھاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے۔

ممکن ہے کہ اپنے چاروں طرف اتنی تباہی، اتنی مصیبت، اتنا ظلم دیکھ کر تم بے صبری میں یہ چاہو کہ جیسے بہت سے نوجوان چاہنے لگتے ہیں، کہ اس میں بسنے والی سماج ہی کو ختم کر دو اور برباد کر ڈالو، اس لئے کہ اس میں سدھار کی کوئی صورت نہیں۔ تمھیں اختیار ہے، مگر اپنے ایک بھائی کی رائے سن لینے میں بھی کیا نقصان ہے۔ سو میرا خیال یہ ہے کہ تباہی سے ہمارا کام کچھ سہل نہیں ہوگا۔ تباہی تو پہلے ہی سے کافی موجود ہے۔ قومی زندگی کا کون شعبہ ہے جس میں پہلے سے تباہی کا دور دورہ نہیں۔ لیکن ہماری بے شمار بیماریوں اور ان گنت مصیبتوں میں سے ایسی بہت کم ہیں کہ ہم یکایک گرما کر تھوڑی سی دیر میں انھیں ختم کر ڈالیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بگاڑنا اتنا نہیں ہے جتنا کہ بنانا ہے ۔ ہمارے دیس کو ہماری گردنوں سے اُبلتے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینہ کا بارہ ماسی بہنے والا دریا درکار ہے ۔ ضرورت ہے کام کی' خاموش اور سچے کام کی ۔ ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی' کاریگر کی دھویں سے کالی چھت' اور دیہاتی مدرسہ کے پھوس کے چھپر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے ۔ سیاسی جھگڑوں کانفرنسوں اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے قصوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے ۔ لیکن جن جگھوں کا نام میں نے لیا ان میں صدیوں تک کے لئے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا ۔ اور ان جگھوں کا کام صبر چاہتا ہے اور استقلال ۔ اس میں تھکن بھی زیادہ ہے اور قدر بھی کم ہوتی ہے ۔ جلدی نتیجہ بھی نہیں نکلتا ، ہاں' کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ملتا ہے ۔

عزیزو ! اس نئے ہندوستان کے بنانے کے کام میں تم سے جہاں تک بن پڑے ہاتھ بٹانا ۔ مگر یاد رہے کہ اگر مزاج میں بے صبری ہے تو تم اس کام کو اچھی طرح نہیں کر سکتے ۔ یہ بڑا دیر طلب کام ہے ۔ اگر طبیعت میں جلد بازی ہے تو بھی تم کام بگاڑ دوگے کہ یہ بڑا پتہ مارنے کا کام ہے ۔ اگر جوش میں بہت سا کام کرنے کی عادت ہے اور اس کے بعد ڈھیلے پڑ جاتے ہو تو بھی شاید یہ کٹھن کام تم سے نہ بن پڑیگا' اس لئے کہ اس میں عرصہ تک ایک سی محنت اور توجہ درکار ہے ۔ اگر ناکامی سے مایوس ہو جاتے ہو تو اس کام کو نہ چھونا کہ اس میں ناکامیاں ضروری ہیں' بہت ناکامیاں اور بار بار ناکامیاں ۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے ہر ناکامی اور زیادہ محنت کرنے پر اُبھارتی ہو ۔ اس دیس کی سیوا میں قدم قدم پر خود دیس کے لوگ تمھاری مخالفت کریں گے ۔ وہ لوگ مخالفت کریں گے جنھیں ہر تبدیلی سے نقصان ہوتا ہے' وہ جو اس وقت چین سے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ شاید حالات بدلے تو وہ اس طرح دوسروں کی محنت کے پھلوں سے اپنی جھولیاں نہ بھر پائیں گے ۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ سب تھک جانے والے ہیں' ان سب کا دم پھول جائے گا ، تم تازہ دم ہو' جوان ہو ۔ تمھارے دل میں اگر شبہ اور بے اعتمادی ہوگی تو اس کام میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی ۔ اس لئے کہ شبہ سے وہ قوت پیدا نہیں ہوتی جو اس کٹھن کام کے لئے ضروری ہے ۔ گندے ہاتھ اور میلے دل لیکر بھی تم اس کام کو انجام کو نہ پہنچا سکوگے کہ یہ مقدس اور پاک کام ہے ۔ نفرت اور بدگمانی بھی اس کام میں کچھ اچھے ساتھی ثابت نہ ہونگے'

کہ تمھاری قومیت کی عمارت کی بنیادیں محبت اور بھروسہ کی چٹانوں ہی پر مضبوط بن سکیں گی۔

مختصر یہ کہ تمھارے سامنے اپنے جوہر دکھانے کا عجیب و غریب موقع ہے مگر اس موقع سے کام لینے کے لئے بڑی زبردست اخلاقی قوت کی ضرورت ہے۔ جیسے معمار ہوں گے ویسے ہی عمارت ہوگی۔ اور کام چونکہ بڑا ہے ایک کی یا تھوڑے سے آدمیوں کی چند دن کی محنت سے پورا نہ ہوگا۔ دوسروں سے مدد لینا ہوگی اور دوسروں کی مدد کرنا ہوگی۔ تمھاری نسل کے سارے ہندی نوجوان اگر اپنی ساری زندگی اسی ایک دھن میں کاٹ دیں تب شاید یہ ناؤ پار لگے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم مدد کرنے اور مدد لینے کے قابل ہوگے یا نہیں اور دوسرے مدد دینے کے لئے آمادہ ہوں گے یا نہیں۔

جب ذات پات، مذہب، زبانوں کے فرق سے ہمارا دیس ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے، جس ملک میں اسٹیشنوں پر مسلمان پانی اور ہندو دودھ ملتا ہے، جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں بستی ہیں، جہاں بالکل مختلف انداز کے تمدن ساتھ ساتھ رائج ہیں، جہاں ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے، جہاں بت پرست اور بت شکن کو قدرت نے ساتھ ساتھ دکھ سکھ کے لئے، ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے لئے یکجا کر رکھا ہے، اس ملک میں نوجوانوں سے ایسے ملکر کام کرنے کی آس ذرا مشکل ہے۔ مگر دل یہی گواہی دیتا ہے کہ تھوڑے دن اور دھکے کھانے کے بعد اس ملک کے نوجوان دیس کی سیوا کے لئے یکدل ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی قسمت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے کہ یہاں بالکل مخالف قسم کے انسانی نمونے ایک دوسرے سے ملکر ایک ایسا آدم تیار کریں جو تہذیب اور تمدن کی ایک نئی تشکیل کرسکے۔ قدرت کے اس تجربہ اور قدرت کے اس ارادہ میں اس کی مدد کرنا تمھارا کام ہے۔ اور اس مدد کے لئے اپنے آپ کو اچھا آدمی بنانا اور اپنے دل کو کینہ کپٹ سے خالی کرنا لازمی ہے۔ قربانیوں کے لئے تیار رہنے کی ضرورت ہے، اپنے ارادہ کو مضبوط کرنے اور اپنی نفس کی خواہشوں پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ اگر تم میں اور تمھارے ساتھی نوجوانوں میں یہ صفتیں نہ ہوئیں اور آج ہی تمھیں کسی مہاتما کی کرامت سے سیاسی اور تمدنی زندگی کے اچھے اچھے ادارے میٹھے میٹھائے مفت میں قدرت کی طرف سے تحفہ میں مل گئے تو بھی یاد رکھو کہ یہ تحفہ بے سود ہوگا۔ یہ ادارے سب کے سب نیچے ہوتے ہوتے اسی سطح پر پہنچ جائیں گے جس پر کہ تمھاری اخلاقی

قوت ہوگی اور ان کی شکل ایسی بگڑ جائے گی کہ مشکل سے کوئی انھیں پہچان بھی سکے گا ۔ قوم اپنے اداروں کو اور خود اپنے مرتبہ کو اسی درجہ پر قایم رکھ سکتی ہے جس پر وہ خود انھیں اپنے زور بازو سے پہنچانے کے قابل ہو۔ اس لئے ہندوستان کی بڑائی تمھاری خوبیوں پر منحصر ہے ۔ اپنی ذات کی تمام قوتوں کو ترقی دے کر ایک ایسی اخلاقی شخصیت بناؤ جسے بھارت ماتا کے سامنے بھینٹ پیش کرنے جاؤ تو تمھیں خود شرم نہ آئے اور وہ خوش ہوکر اسے قبول کرلے ۔

سیوا کے اس راستہ میں جس کا ذکر کر رہا ہوں ظاہر ہے کہ بڑی دشواریاں ہیں ۔ اس لئے ایسے وقت بھی آئیں گے کہ تم تھک کر شل ہو جاؤ گے ، بےدم سے ہو جاؤ گے ، اور تمھارے دل میں یہ شبہ بھی پیدا ہونے لگے گا کہ یہ ۔ کچھ کیا سب بیکار تو نہ تھا ۔ اس وقت مادّی اور امکانی طور پر آزاد بھارت ماتا کی اس تصویر کی طرف دھیان لگانا جو تمھارے دل میں ہمیشہ رہنی چاہیئے یا اس دیس کی تصویر پر جس میں سچائی کی حکومت ہوگی ، جس میں سب کے ساتھ انصاف ہوگا ، جہاں امیر غریب کا فرق نہ ہوگا بلکہ سب کو اپنی اپنی صلاحیتوں کو پوری پوری ترقی دینے کا موقع ملیگا ، جس میں لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں گے اور ایک دوسرے کی مدد ، جس میں مذہب اس کام میں نہ لایا جائے گا کہ جھوٹی باتیں منوائے اور خود غرضیوں کی آڑ بنے بلکہ زندگی کو سدھارنے اور اس کو بامعنی بنانے کا ذریعہ ہوگا ۔ اس تصویر پر نظر ڈالوگے تو تمھاری تھکن دور ہو جائے گی اور تم نئے سرے سے اپنے کام میں لگ جاؤ گے ۔ پھر بھی اگر چاروں طرف کمینہ پن اور خود غرضی ، مکاری اور حیلہ بازی ، غلامی اور غلامی پر رضامندی پاؤ تو سمجھنا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے ، مورچہ سر نہیں ہوا ، اس لئے جنگ جاری رکھنی چاہیئے ۔ اور جب وہ وقت آئے جو سب کو آنا ہے اور اس میدان کو چھوڑنا پڑے تو یہ تسلی تمھارے لئے بس ہوگی کہ تم نے اپنے بس بھر اس سماج کو آزاد کرنے اور اچھا بنانے میں کوشش کی جس نے تمھیں آدمی بنایا تھا ۔ تم چلے جاؤ گے ، دوسرے تمھارے کام کو جاری رکھیں گے ۔ اس لئے کہ یہ کام کبھی ختم ہونے والا کام نہیں ۔ سماج کی آزادی اور سماج کی صحت ایسی چیزیں نہیں جو بس ایک دفعہ حاصل کرلی جائیں ۔ یہ اسی سماج کو ملتی ہیں اور اسی کے پاس رہتی ہیں جس کے سپوت انھیں روزانہ نئے سرے سے حاصل کرسکیں ۔

بس، اب رخصت۔ تمھیں تمھاری تعلیم کی سند مبارک ہو۔ تم سے بہت سی اُمیدیں ہیں
خدا کرے کہ مایوس نہ کرو۔

ہندستان کی تاریخ میں اصول جنگ کی اہمیت

قوموں کا ایک، دوسرے سے لڑنا ایسی بات نہیں ہے جس کا خوشی یا فخر سے ذکر کیا جائے۔ لڑائی سے کوئی مسئلہ طے نہیں ہوتا۔ جو لوگ مارے جاتے ہیں یا زخمی ہوتے ہیں وہ جسمانی اعتبار سے بہترین ہوتے ہیں، بستیاں اجڑتی ہیں، گھرانے کے گھرانے تباہ ہو جاتے ہیں۔ فوجیں ملکوں کو ویران کر سکتی ہیں، آباد نہیں کر سکتیں، وہ ایک عرصے کے لئے مخالفوں کو بے بس اور مجبور کر سکتی ہیں، مگر خالی جبر و تشدد سے کوئی مضبوط سیاسی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں جو جنگیں ہوئی ہیں ان کی اہمیت کا سبب یہ نہیں ہے کہ فلاں فریق جیتا اور فلاں ہارا، ان کا مطالعہ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ جنگ میں قوموں کی صحیح اخلاقی حالت ظاہر ہو جاتی ہے۔ امن کے زمانہ میں قوموں کے بہت سے عیب چھپے رہتے ہیں جنگ تمام راز فاش کر دیتی ہے۔ سیرت کی کمزوریاں، آپس کی بے اعتباری، صبر اور استقلال اور قوت برداشت کی کمی، ذہنی اور اخلاقی بے مائگی۔ یہ اور ان کے علاوہ بہت سی خامیاں ہیں جو اس وقت اپنی اصل صورت میں نظر آتی ہیں جب کسی جماعت کو اپنی حفاظت کرنے یا کسی دوسری جماعت پر غالب آنے کے لئے اپنی پوری جسمانی اور اخلاقی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ جنگ میں کامیابی چند افراد کے کمالات سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ان اوصاف کی بدولت نصیب ہوتی ہے جو جماعت میں ربط، ہم آہنگی، اور اتحاد عمل پیدا کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی قریب قریب ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ہتھیار اور دوسرا سامان جنگ، صف آرائی کے قاعدے اور لڑنے کے طریقے پر عام ذہنیت اور خیالات کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے یہاں تک یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر قوم کا اصول جنگ اس کے اصول حیات کا آئینہ ہوتا ہے۔

اصول جنگ کے دو پہلو ہیں، لشکر کشی[۱] اور جنگ۔ لشکر کشی کے مفہوم میں فوج کی نقل و حرکت،

---

[۱] STRATEGY

یعنی کوچ کے رستے، جنگ کے مقام، حملے کے وقت اور موقعے، حفاظت کے مقام، قلعے اور لشکر گاہ کا انتخاب اور واپسی کے رستے کو محفوظ رکھنے کا انتظام سب شامل ہے۔ جنگ سے مراد ایک میدان میں دو فوجوں کا مقابلہ ہے۔ چونکہ فوجیں نقل و حرکت میں ہر طرح سے زمین کے نقشے کی پابند ہوتی ہیں، ہم کو اصول جنگ کی اہمیت ذہن نشین کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنے ملک کی سرحد پر غور کرنا چاہیئے۔

لشکر کشی کے مسلمہ اصولوں کے مطابق شمال مغرب میں ہندوستان کی صحیح سرحد یا تو دریائے سندھ ہے یا پھر افغانستان اور بلوچستان کے پہاڑوں کا مغربی حصہ۔ اگر ہرات، قندھار، بلخ اور بدخشاں ہندوستانیوں کے قبضے میں ہوں تو مغرب کی طرف سے کسی دشمن کا حملہ کرنا مشکل ہے، لیکن تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم ان مقامات پر مستقل قبضہ رکھ نہیں سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ موریا بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان کی ریاست نے یہ کر دکھایا، لیکن اس زمانے کے حالات کا اندازہ ہم صرف قیاس سے لگاتے ہیں، اور یہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مغل بادشاہ قندھار اور بلخ کو قابو میں نہیں رکھ سکے، اور انگریز بھی اس کوشش میں ناکامیاب ہوئے۔ ہمارے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم سندھ کے دونوں کناروں کو محفوظ کرلیں، اور دشمن کا مقابلہ پہاڑوں پر چڑھ کر نہ کریں بلکہ میدان میں، جہاں ہمارے سپاہی زیادہ اطمینان سے لڑ سکتے ہیں اور ضرورت ہو تو قلعوں کی آڑ لے سکتے ہیں۔ سندھ کی وادی کا مغربی حصہ اتنا آباد نہیں ہے کہ وہاں ایک بڑی فوج کے لئے سامان رسد مہیا کیا جا سکے، اور اس میں جو قبیلے آباد ہیں ان سے ہندوستانی حکومت کے دوستانہ تعلقات رکھے جائیں تو دشمن کو کبھی اس کا یقین نہ ہو سکے گا کہ اس کی واپسی کا رستہ محفوظ ہے۔ وہ دشمن بڑا ہی بیباک یا بیوقوف ہوگا جو ان دشواریوں کے باوجود حملہ کرنے کا حوصلہ کرے۔

لیکن ہندوستانی ریاستوں نے سرحد کی حفاظت کا ایسا معقول انتظام کہ حملہ آوروں کو سندھ سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو، بہت کم کیا۔ ہندوستان کی سرحد کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ہندوستان ایک متحدہ ریاست ہو، اور ایسا اتحاد جب کبھی ہوا تو اس ہمت اور استقلال کی بدولت جو کسی خاص وجہ سے عارضی طور پر ظہور پذیر ہوا اور کوئی قومی اور دائمی وصف نہیں تھا۔ موریا ریاست کے قائم ہونے



تک ہندوستان کا سیاسی وجود ہی نہ تھا۔ گپت ریاست اپنے سیاسی فرائض سے غافل رہی اور اس کے عروج کے زمانے میں بھی ستلج شمال مغربی سرحد سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے ہُون قوم کے حملے روکے نہیں جا سکے۔ اور ان وحشیوں نے ملک کے اندر گھس کر گپت ریاست اور اس کے اعلیٰ تمدن کو نیست و نابود کر دیا۔ راجپوتوں میں بھی کوئی ایسا دور اندیش مدبر نہیں تھا جس کی نظر شمال مغربی سرحد تک پہنچتی۔ محمود غزنوی کے زمانے میں سرحد پر جے پال کا راج تھا۔ اسے رستے سے ہٹانے کے بعد پھر کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی اور محمود نے لاہور پر قبضہ کر کے کھلے دروازے میں تیاں بھی لگا دیں کہ اسے کوئی اتفاقی جھونکا بند نہ کر سکے۔ یہ دروازہ شہاب الدین غوری نے قریب ڈیڑھ صدی بعد اسی طرح کھلا پایا۔

شہاب الدین غوری کی ہندوستانی مقبوضات کو شمس الدین ایلتمش نے ایک ریاست کی شکل دینے کا ارادہ کیا، اور بلبن نے اس کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ لاہور، دیبال پور اور ملتان محافظ فوج کی مرکزی چھاؤنیاں بنائی گئیں اور سندھ کے دونوں کناروں پر پہرہ دیا جانے لگا۔ علاء الدین نے جب ایک مستقل فوج کا انتظام کر لیا تو اس کے سردار بجائے اس کے کہ سرحد پر دشمن کی تاک میں بیٹھے رہیں خود بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے، اور افغانستان کے تاتار صوبہ داروں کے دانت کھٹے کر دئے کہ پھر انھیں ہندوستان پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن چودھویں صدی کے آخر میں جب امیر تیمور نے لشکر کشی کی تو سرحد کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا، اور اندرونی فساد کی بدولت بابر کو بھی رستہ صاف ملا۔

مغل بادشاہوں کو افغانستان اور خراسان کا مشرقی حصہ ورثے میں ملا تھا، اور اس وجہ سے وہ جنوب میں ہرات اور شمال میں بدخشاں اور بلخ کو اپنی سرحد بنانے کا حوصلہ کر سکتے تھے۔ مگر ان قلعوں تک فوج اور سامان جنگ پہنچانا اتنا دشوار تھا کہ وہ اپنا حوصلہ پورا نہ کر سکے اور انھیں کابل کی وادی پر قناعت کرنی پڑی۔ چونکہ ہمسایہ ریاستیں ان کی طاقت اور دولت سے واقف تھیں، اس لئے ان کا کابل پر قابض رہنا ہی سرحد کی حفاظت کے لئے کافی ثابت ہوا۔ اس وقت انگریزی حکومت نے سرحد وہیں پر قائم کی ہے جہاں پہلے ترک بادشاہوں نے کی تھی۔

ناکہ بندی اور فوج کے انتظام کے علاوہ ہماری سرحدی حکمت عملی کا ایک پیچیدہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ

ان قبائل کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے جو سندھ کے اس پار کے پہاڑوں میں آباد ہیں۔ وہ کسی قسم کی اطاعت گوارا نہیں کرتے، آباد ایسی سرزمین پر ہیں جو مستقل حکومت کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی، اور سپاہی اس غضب کے ہیں کہ انھیں شکست دینا ممکن بھی ہو تو قابو میں رکھنا ممکن نہیں۔ ان کو رام کرنے کے لئے ہر طرح کی تدبیریں کی جا چکی ہیں، شہاب الدین غوری نے ان کو مسلمان کر کے درہ خیبر اور درہ خرم کو رہزنی سے محفوظ کرنا چاہا، غیاث الدین بلبن نے عاجز آکر ان کی نسل کو مٹا دینے کی کوشش کی، مغلوں نے سمجھا کہ تھانے اور چھاؤنیاں قایم کر کے انھیں مرعوب کر لیں گے، لیکن ان تدبیروں میں سے کوئی کارگر نہیں ہوئی اس وقت کی حکومت کا طرز عمل وہی ہے جو مغلوں نے بالآخر اختیار کیا تھا۔ سرحدی قبیلے روپیہ دے کر خوش رکھے جاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ بھی جتا دیا جاتا ہے کہ وہ زیادتیاں کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ امن کے زمانے میں یہ صورت حال کچھ زیادہ ناقابل اطمینان نہیں، لیکن ان قبائل کی دوستی کا کوئی اور خریدار پیدا ہو جائے تو معاملہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔

سرحد کی حفاظت کا معقول انتظام کرنے کے لئے اس علاقے کے نقشے پر غور کرنا کافی نہیں ہے جسے ہم اپنی سرحد ٹھہرائیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ فن جنگ کے ان ماہروں نے جو ہندوستان پر حملہ آور ہوئے کون سا رستہ اختیار کیا، آگے کیونکر بڑھے اور واپسی کے رستے کو کیسے محفوظ کیا۔ مسئلے کے اس پہلو پر نظر ڈالتے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ بڑی فوجیں ہندوستان میں صرف ایک رستے سے داخل ہو سکتی ہیں، اور وہ درہ خیبر ہے۔ مشرق میں برہم پتر کی وادی بہت ہی دشوار گذار ہے، پھر یہاں سے اس مقام تک جہاں دریائے سندھ ہمالیہ کو چھوڑ کر جنوب کی طرف مڑتا ہے کوئی درہ ایسا نہیں ہے جو قابل گذر کہا جا سکے۔ کابل کی وادی سے جنوب کی سمت میں پہاڑوں کا جو سلسلہ چلتا ہے اس میں بہت سے چھوٹے بڑے درے ہیں، لیکن بلوچستان اور مکران کی جانب سے وہی فوج حملہ کر سکتی ہے جو چھ سات مہینے کا کھانے پینے کا سامان اپنے ساتھ رکھے، ان دروں سے نکل کر فوج صوبہ سندھ میں داخل ہوتی ہے اور اس صوبے کے متعلق ایک عرب سیاح نے حضرت عثمان کو جو رائے دی تھی کہ اگر وہاں کوئی بڑی فوج بھیجی گئی تو وہ بھوکوں مر جائے گی اور چھوٹی فوج کو وہاں کے باشندے کھا جائیں گے بالکل صحیح ہے۔

سندھ کے جنوب مشرق میں دلدل اور ویرانے ہیں، مشرق میں تھار کا ریگستان ہے، اس لئے اس طرف سے فوج صرف دریائے سندھ کے کنارے کنارے چل کر اور ملتان کے قریب مشرق کی طرف مڑ کر مقابلتاً زرخیز علاقوں میں داخل ہو سکتی ہے۔ واپسی کے لئے پھر یہی رستہ اختیار کرنا ہوگا، اور فتحیاب ہونے پر بھی رسد فراہم کرنے میں دشواریاں پیش آتی رہیں گی۔ اس وجہ سے کوئی حملہ آور جو خیبر کی طرف سے داخل ہو سکتا ہو سندھ کے رستے نہ آئے گا۔ تاریخ میں ہم کو سندھ پر مغرب سے صرف ایک حملے کی مثال ملتی ہے، اور وہ محمد ابن قاسم کی لشکر کشی ہے۔ لیکن محمد ابن قاسم کا مقصد سندھ فتح کرنا تھا۔ اس نے ملتان پر قبضہ کر کے شمالی سندھ کی ناکہ بندی کر لی، پنجاب پر حاوی ہونے کا اسے موقعہ نہیں ملا اور غالباً اس کا ارادہ بھی نہیں تھا کہ پنجاب پر حملہ کرے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے پاس تھوڑی سی فوج تھی، اور اگر سندھیوں میں ذرا بھی اتحاد ہوتا تو وہ اسے آسانی سے دکھا جاتے۔

ہندوستان فتح کرنے کے ارادے سے جتنے حملے کئے گئے وہ سب خیبر کی طرف سے تھے۔ کبھی کبھی فوجیں غزنین سے ملتان، اور پھر سرہند ہوتی ہوئی دہلی کی طرف بڑھی ہیں۔ سکندر کابل کی وادی سے ہو کر آیا، اور بیاس کے کنارے تک پہنچا۔ اس کی لشکر کشی کو انگریز مورخ ایک بڑا کارنامہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، اور اگر ہم صرف اس ہمت اور بیباکی کو مدنظر رکھیں جس کے بل پر سکندر انجان علاقوں میں گھستا ہوا چلا گیا تو بے شک اس کی لشکر کشی ایک کارنامہ تھی۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ سکندر کو کسی ایک جنگ میں ناکامیابی ہوتی تو اس کی فوج یقیناً نیست و نابود ہو جاتی، اور ایسی چال جو ساری بازی کو خطرے میں ڈال دے ہرگز صحیح اور مناسب نہیں۔ سکندر کے مقابلے میں محمود غزنوی کے حملے فنی اعتبار سے لشکر کشی کے بہت بہتر نمونے ہیں۔ محمود نے پہلے پشاور فتح کیا، پھر بھیرا اور ملتان پر قبضہ کر کے اپنے ایک بازو کو محفوظ کیا، اور شمال میں سوات اور باجوڑ کی دلویوں میں جا کر وہاں ایسا رعب جمایا کہ بایاں بازو بھی محفوظ ہو گیا، اور وہ اطمینان سے جتنے عرصے کے لئے اور جتنی دور تک ہندوستان کے اندر بڑھ جاتا، واپسی میں کسی مزاحمت کا اندیشہ نہیں تھا۔

لیکن جو مقصد محمود غزنوی اور اس کے بعد شہاب الدین نے کئی حملوں میں پورا کیا وہ امیر تیمور نے ایک ہی چال میں حاصل کر لیا، اور اس کی لشکر کشی میں فن جنگ کا ہر کمال نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت

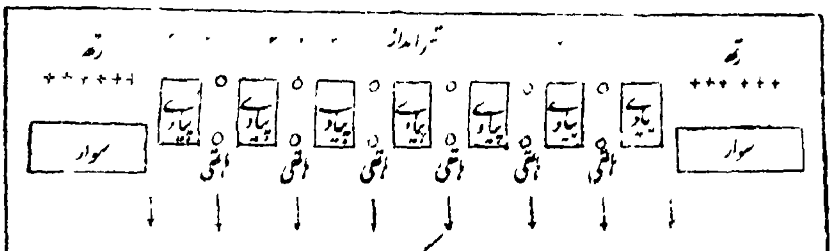
مدافعت کرنے والا کوئی نہ تھا، ورنہ یہ ظاہر ہو جاتا کہ امیر تیمور نے کس ہوشیاری سے مقابلے کی ہر امکانی صورت پر غور کر لیا تھا اور ہر چال کی پیش بندی کر لی تھی۔ اس نے پہلے اپنے پوتے پیر محمد کو ایک بڑی فوج کے ساتھ غزنی سے ملتان کا محاصرہ کرنے کو بھیجا، اور خود خیبر کے رستے سے ہندوستان میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ اگر پیر محمد کے مقابلے پر کوئی بڑی فوج بھیجی جاتی جس سے اس کے شکست کھانے کا اندیشہ ہوتا تو تیمور لاہور پر تیزی سے بڑھ کر دشمن کو اپنی دونوں فوجوں کے درمیان گھیر لینے کی کوشش کرتا۔ اگر ہندوستانیوں کو معلوم ہو جاتا کہ امیر تیمور درہ خیبر سے داخل ہونے والا ہے اور وہ مدافعت کے لئے دو فوجیں بھیجتے، ایک ملتان اور دوسری پشاور، تب بھی ان کی بازی کمزور رہتی۔ تیمور کی دونوں فوجیں شکست کھاتیں تو ان کی واپسی کا رستہ کھلا ہوا تھا، لیکن ان میں سے ایک بھی فتحیاب ہوتی تو ہندوستان کی دونوں فوجوں کو پسپا ہونا پڑتا، کیونکہ تیمور لاہور کی طرف بڑھ کر یا پیر محمد سرہند کی طرف کوچ کر کے ہندوستانیوں کی کامیاب فوج کو گھیرنے کی دھمکی دے سکتا تھا، اور دشمن کے پیچھے ہٹنے سے تیمور کی دونوں فوجیں ایک دوسرے سے مل کر دوبارہ مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اس وقت بھی اگر شکست ہوتی تو واپسی کا رستہ محفوظ رہتا۔ اگر تیمور کو فتح پانے کا پورا یقین نہ ہوتا اور اس کی فوجیں دنیا کی بہترین فوجیں نہ ہوتیں، تب بھی اس کی تدبیریں ایسی تھیں کہ اچھے اچھے سپہ سالاروں کو عاجز کر دیتیں۔

ہندوستان کے ہندو مسلمان سپہ سالاروں میں لشکر کشی کے ماہر بہت کم ملتے ہیں، اور ان میں سب سے اعلیٰ درجہ شیر شاہ اور میر جملہ اورنگ زیب کے سپہ سالار کو دینا چاہئے۔ سوا ان تدبیروں کے جو سرحد کی حفاظت کے لئے اختیار کی گئیں، ہماری تاریخ میں ایسے موقعے بھی بہت کم ہوئے ہیں جب لشکر کشی نے کسی فوج کی قسمت کا فیصلہ کیا ہو۔ ہندوستان کے سپاٹ میدان اور سست آدمی فن لشکر کو ترقی دینے کے لئے موزوں نہیں ہیں، اور ہم نے ہمیشہ سے نظریاً لشکر کشی کے مقابلے میں فوج کی تعداد، سپاہیوں کی دلیری اور ہتھیاروں کی خوبی کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اسی وجہ سے جو فوجیں باہر سے آئیں اور ہندوستانی فوج کی تعداد، اس کے ہتھیار اور ساز و سامان کا جنگ کے طریقے میں جدتیں کر کے مقابلہ کیا وہ کامیاب ہوئیں۔ فن جنگ کی جدتوں اور امکانی ترتیبوں سے بے خبر رہنا ہندوستان کی کسی ایک قوم کی خصوصیت نہیں بلکہ

ہندوستانی آب وہوا کی تاثیر معلوم ہوتی ہے۔ جو قوم یہاں آئی ایک نیا اور کارگر اصول لیکر آئی، مگر کامیاب ہوتے ہی وہ ملک کے فرسودہ رواج کی پیرو ہوگئی اور اپنی روش بھول گئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے سپہ گری ایک خاص ذات کا پیشہ تھی۔ یہاں کی لڑائیاں زیادہ تر عزت اور حیثیت بڑھانے کے لئے لڑی جاتی تھیں، اور معلوم ہوتا ہے یہاں ملک گیری کی ہوس دوسری قوموں کے مقابلے میں کم تھی، کیونکہ منو کے دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ اگر ایک راجہ دوسرے راجہ کو میدان میں شکست دے تو اسے اپنے حریف کے ملک کو ضبط نہ کرلینا چاہئے، بلکہ اسے یا اس کے خاندان کے کسی اور قابل آدمی کو اپنے ماتحت کی حیثیت سے گدی پر بٹھا دینا چاہئے۔ اس وجہ سے ہمیں تعجب نہ ہونا چاہئے کہ منو کے دھرم شاستر اور کوٹلیا کے ارتھ شاستر میں یہ بھی لکھا ہے کہ فوج کی تنظیم اور میدان جنگ میں اس کی ترتیب کیسی ہونی چاہئے۔ ہندوستان کے سپاہی بے شک اپنے فن میں ماہر اور بہت بہادر ہوتے تھے، لیکن رسم کی پابندی نے ان میں ترقی کرنے اور نئے اصول ایجاد کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ یہ بھی سمجھ نہ سکے کہ جنگ کا اصل مقصد جیتنا ہوتا ہے، بہادری، جاں بازی اور فنی کمالات محض ضمنی اور اکثر غیر ضروری اوصاف ثابت ہوتے ہیں۔ تمام ناکامیوں کے باوجود ہندوستانی سپاہی اور سپہ سالار رسم ورواج اور اپنی پرانی ذہنیت کو بدل نہ سکے۔ یہ وہی رسم کی غلامی ہے جو ہمیں ان کی زندگی کے اور اصولوں میں نظر آتی ہے۔

قدیم ہندوؤں اور راجپوتوں کا اصول جنگ یہ تھا کہ فوجیں خاص ترتیب سے میدان میں کھڑی ہوں، ایک مقررہ قاعدے کے مطابق لڑیں، ہر شخص کو اپنے جوہر دکھلانے کا موقعہ ملے اور پھر جس فوج کے سپاہی زیادہ طاقتور، بہادر اور مشاق ہوں وہ ان اوصاف کے بل پر جیت جائے۔ اس قاعدے میں وہ تمام باتیں جو فن جنگ کی بنیاد ہیں نظر انداز کی گئی تھیں؛ اور جب باہر کی قوموں نے جو دوسرے طریقے سے لڑتی تھیں ہندوستان پر لشکر کشی کی تو دیسی اصول جنگ کی تمام خامیاں واضح ہوگئیں۔



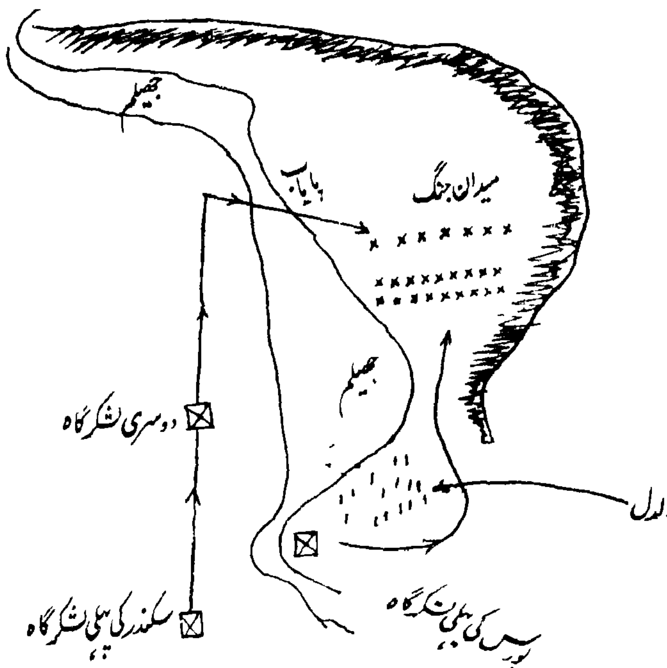
ہاتھیوں اور پیادوں کی متعدد قطاریں

ہندوستانی فوجوں کی ترتیب کم و بیش اسی طرح ہوتی تھی جیسی کہ مندرجہ بالا نقشے میں دکھائی گئی ہے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ترتیب کے ذریعے سے فوج میں قلعہ کا سا استحکام پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، اس کا ایک رفتار عنصر بس سواروں کے دستے ہوتے تھے، لیکن ہاتھیوں اور پیادوں کے ساتھ اتحاد عمل قائم رکھنے کی صورت ایسی تھی کہ ان کی سبک روی سے کافی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ اگر جم کر لڑائی ہو تو یہ ترتیب بہت مفید ہو سکتی ہے، اور دیکھنے میں ایسی چست معلوم ہوتی ہے کہ دشمن کے دل دہلا دے، مگر اس ترتیب کے ساتھ حملہ کرنا بہت مشکل ہے اور اگر وہ ایک دفعہ بگڑ جائے تو اس کا درست کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ترتیب کی خامیوں کے علاوہ قدیم ہندو اور راجپوت سپاہی اس سبب سے بھی نقصان میں رہتے تھے کہ ان کے ہتھیار بہت بھاری تھے۔ کسی مورخ نے کہا ہے کہ رومانے ایک عالم گیر سلطنت اپنی تلوار کی بدولت قائم کی جو ہلکی، چھوٹی، دو دھاری اور نکیلی ہوتی تھی، اور جس سے کاٹنے کی بہ نسبت بھونکنے کا کام زیادہ لیا جاتا تھا۔ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے۔ ہتھیار کے استعمال میں سپاہی کی قوت جتنی کم صرف ہو اچھا ہے، کیونکہ لڑائیاں اکثر گھنٹوں تک جاری رہتی ہیں، اور سپاہیوں کا تھکنا فوج کی شکست کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دوسری اور اتنی ہی اہم بات یہ ہے کہ گھمسان کی لڑائیوں میں لمبے ہتھیار بیکار ہو جاتے ہیں، اور اگلے زمانے میں جب توپیں نہیں تھیں تو لڑائی کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی کہ صفیں ایک دوسرے سے گتھ جائیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں کئی معرکے ایسے ہوئے ہیں جو مختلف اصول جنگ کے مثالی نمونے ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ پہلا معرکہ یونانی سپہ سالار سکندر اعظم اور شمال مغربی پنجاب کے راجہ پورس کے درمیان ہوا،

جس میں پورس نے بری طرح شکست کھائی۔ پورس نے اصول کے مطابق فوج کو ترتیب دی اور بہت بہادری سے لڑا۔ سکندر نے موقعے اور محل کے مناسب طریقہ جنگ اختیار کیا، اپنے سپاہیوں کے اوصاف اور دشمن کی کمزوریوں سے پورا فائدہ اٹھایا، جیتنے کے ارادے سے لڑا اور ارادے میں کامیاب ہوا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتا ہے، سکندر کو ایک مرتب فوج کے مقابلے میں دریا پار کرنا تھا اور پار کرکے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دینا تھا کہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرسکے۔ فوجوں کی نقل و حرکت نقشے میں دکھائی گئی ہے۔ سکندر نے پہلی چالاکی تو یہ کی کہ میدان کا انتخاب خود کیا، اور لڑائی ایسے وقت چھیڑی جب دشمن کو اس کا موقعہ نہیں ملا تھا کہ میدان میں پوری طرح پھیل کر کثرت تعداد کا فائدہ اُٹھائے۔ ہندوستانیوں کو نیچا دکھانے میں ایک حد تک ان کی تقدیر بھی شریک تھی، کیونکہ رات کو بارش ہوچکی تھی، زمین پر پیر پھسلتا تھا اور ہندوستانی تیر انداز، جو اپنی کمانوں کو زمین میں گاڑ کر اور پیر کی ٹیک لگا کر تیر چلاتے تھے سکندر کے ایرانی تیر اندازوں کا جواب نہ دے سکے۔ یونانیوں کا بیان ہے کہ ہندوستانیوں کے تیر موٹی سے موٹی ڈھال اور زرہ کو پار کرجاتے تھے، لیکن جب تیر چلانے میں اتنا اہتمام کرنا پڑتا ہو کہ دشمن کو تیر انداز کا خاتمہ کردینے کا موقعہ مل جائے تو پھر تیر کی تیزی سے کیا حاصل ہوسکتا ہے۔ سکندر نے اپنے لئے زیادہ اور دشمن کے لئے کم میدان اس نیت سے خالی چھوڑا تھا کہ امکان ہو تو دشمن کو گھیر لے، اس نے زیادہ زور کے حملے پورس کے دونوں بازوؤں پر کئے، اور جب وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو پھر لڑائی نہیں رہی بلکہ قتل عام شروع ہوگیا۔ پورس کی پشت پر پہاڑیوں اور دریا کے درمیان ایک تنگ رستہ تھا، اور میدان سے قدم اکھڑنے کے بعد پورس کی فوج کا اس طرف سے سلامت گذرنا محال تھا۔ اسی سبب سے اس کی فوج کا بہت حقیر حصہ بچ سکا، اور وہ خود گرفتار ہوگیا۔

اس لڑائی سے منجملہ اور باتوں کے ہندوستانی یہ سبق بھی سیکھ سکتے تھے کہ فوج میں ہاتھی فائدے سے زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ یونانیوں کو اس سے پہلے بھی ہاتھیوں سے سابقہ پڑچکا تھا، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہاتھی ڈر کر یا زخمی ہوکر بھاگتا ہے تو دوست دشمن کا فرق نہیں کرتا۔ انھوں نے پورس کے ہاتھیوں کو نفتے کے گولوں سے ڈرا کر بھگا دیا، اور بھاگنے میں انھوں نے پیادوں کو ایسا روند ڈالا کہ پھر وہ کسی مصرف کے نہیں رہے۔

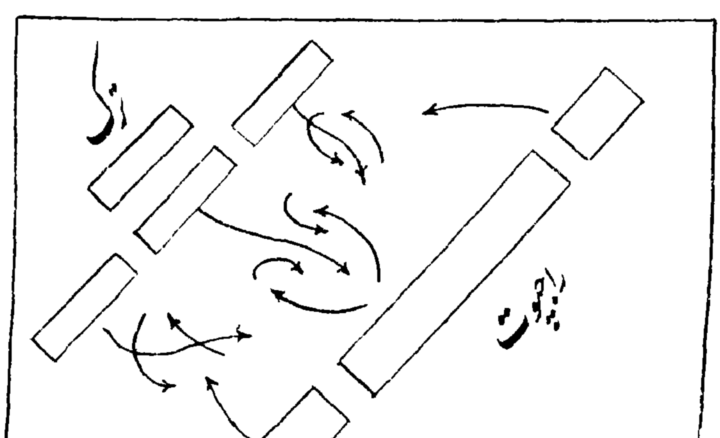


(یہ نقشہ ونسنٹ سمتھ کی کتاب "ہندستان کی قدیم تاریخ" سے نقل کیا گیا ہے۔)

سکندر کے بعد دوسرا سپہ سالار جس نے ہندستانیوں کی کمزوری کو سمجھ لیا اور اس سے فائدہ اٹھایا محمود غزنوی تھا۔ ہندستانی فوج ایک قلعہ کی طرح تھی جو مشکل سے تیار ہوتا ہے اور جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ محمود کی لشکرکشی نے ہندستانیوں کو بالکل عاجز کر دیا، کیونکہ اس کی فوجیں نہایت سبک رفتار تھیں، اور اگرچہ وہ بہت دور سے آتا تھا، راجپوت فوجیں کبھی مقابلے کے لئے اچھی طرح تیار نہیں ہو پاتی تھیں محمود کا ہمیشہ ایک خاص مقصد ہوتا تھا جو لڑے بغیر حاصل ہو جاتا تو اس کے نزدیک اور بھی اچھا تھا، جب پہلی چار لڑائیوں کے بعد اس نے دیکھا کہ راجپوت بہت مرعوب ہو گئے ہیں تو اس نے اپنی فوجوں کی بہادری اور سپہ گری کے کمالات کی نمائش نہیں کی اور حتی الامکان جم کر لڑنے سے پرہیز کرتا رہا۔ یہ مصلحت بھی

اس کے راجپوت حریفوں کی سمجھ میں نہ آئی۔

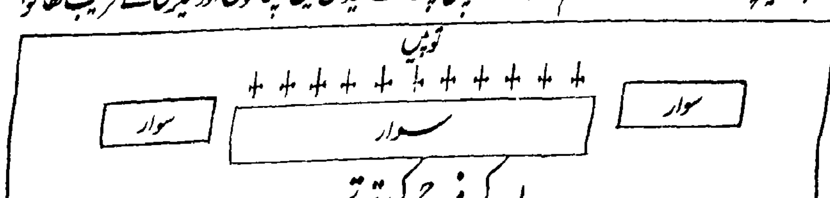
محمود کی لشکر کشی اتنی کامیاب تھی اور اس کے پاس آزمودہ کار سپاہیوں کی ایسی افراط تھی کہ فن جنگ میں جدتیں کرنے کی اسے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ سکندر اور پورس کی لڑائی کے بعد دوسرا معرکہ جس میں ہندستانی اصول جنگ کا تازہ امتحان ہوا پرتھوی راج اور شہاب الدین غوری کے درمیان ترائن کی دوسری جنگ تھی۔ شہاب الدین ایک مرتبہ سپاہیوں کے لالچ اور نافرماں برداری کی بدولت ذلیل ہوا اور گرفتار ہوتے ہوتے رہ گیا، دوسرے مقابلے کے لئے اس کے سپاہی اور سردار تیار ہوکر آئے تھے، لیکن فوج کی تعداد سولہ سترہ ہزار سے زیادہ نہ تھی اور پرتھوی راج پچاس ہزار سے اوپر لشکر لے کر آیا تھا۔ اسی سبب سے شہاب الدین اس سے بھڑتے ہوئے ہچکچایا، اور ایک روایت ہے کہ اس نے راجپوتوں کو غافل رکھنے کے لئے صلح کی گفتگو چھیڑی۔ بہرحال لڑائی کے دن جو تدبیر اس کے کام آئی اس کا مکرو فریب سے کوئی تعلق نہیں تھا، وہ محض دشمن کی ترتیب بگاڑنے کی ایک ترکیب تھی جو بہت کارآمد ثابت ہوئی شہاب الدین نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا، جس میں سے ایک اس کے ماتحت محفوظ دستے کے طور پر رہا، اور تین باری باری سے راجپوتوں پر حملہ کرکے بھاگتے اور پلٹ کر لڑتے رہے، یہاں تک کہ راجپوت فوج کے پیادے، سوار اور ہاتھی سب تتر بتر ہوگئے جب آخری مرتبہ محفوظ دستے کا سہارا لیکر شہاب الدین کی پوری فوج نے حملہ کیا تو راجپوتوں کے پیر اکھڑ گئے اور ان کی فوج کٹ مری۔ شہاب الدین اگر راجپوتوں کی



قلعہ نما صفوں پر پوری طاقت سے حملہ کرتا تو اس کی فوج پاش پاش ہو جاتی، جو تدبیر اس نے اختیار کی وہ اس سبب سے کارآمد ہوئی کہ اس نے دشمن کو ایسے طریقے سے لڑنے پر مجبور کیا جس میں اس کے سپاہی ماہر تھے اور دشمن بالکل ناواقف، اور اس طرح وہی صفت جس پر راجپوت بھروسا کرتے تھے ان پر تباہی لائی۔

ترکوں نے ہندستانی اصول جنگ میں جو اضافہ کیا وہ سواروں کا استعمال تھا، لیکن ملک میں آباد ہونے کے بعد سے اس میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی، بلکہ اس اعتبار سے تنزل ہوا۔ کہ انھیں بھی ہاتھیوں نے لبھا لیا۔ پھر بھی ان کی فوجی قابلیت اور مستقل مزاجی کا ایک نمایاں ثبوت یہ ہے کہ وہ ۱۰۰ برس تک مسلسل تاتاروں کے حملے پسپا کرتے رہے، یہاں تک کہ یہ خطرہ خود ہی جاتا رہا، ترکوں کے جانشین پٹھان ہوئے جو شاید ان سے بھی بہتر سپاہی تھے، مگر اصول جنگ اور ہتھیاروں میں انھوں نے بھی کوئی ترمیم یا جدت نہیں کی۔ جب مغل ایک نیا ہتھیار، یعنی توپ لے کر آئے تو ان کے سامنے نہ راجپوتوں کے قدم جم سکے نہ پٹھانوں کے۔

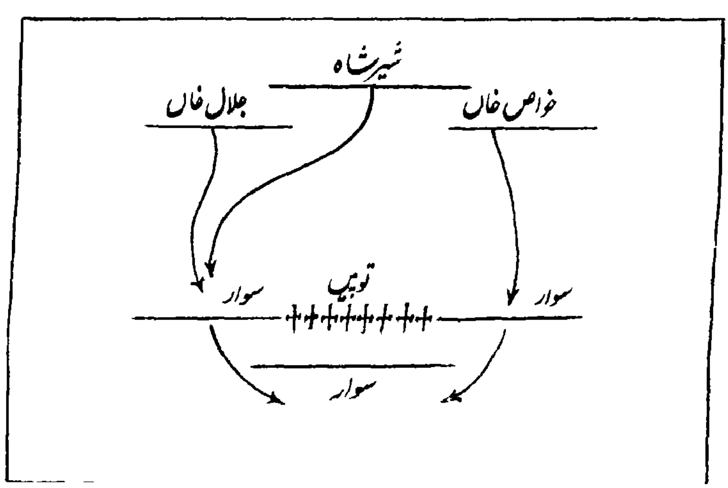
بابر توپوں کو تھوڑے تھوڑے فاصلے سے فوج کے قلب میں رکھتا تھا، اور انھیں زنجیروں سے باندھ دیتا تھا۔ توپوں کے پیچھے منتخب سواروں کے دستے ہوا کرتے تھے، جب دشمن حملہ کرتا تو پہلے توپیں چھوڑی جاتیں، پھر جب اس کی صفیں توپوں سے ٹکراتیں یا یہ دیکھا جاتا کہ لوگوں نے دشمن کو پریشان یا بے ترتیب کر دیا ہے تو بابر کے سوار توپوں کے درمیان سے نکل کر حملہ کرتے، اگر پہلا حملہ ناکامیاب رہتا تو وہ پھر توپوں کے پیچھے آجاتے اور توپچیوں کو، جو اس دوران میں گولہ باری کے لئے تیار ہو جاتے تھے، توپیں چلانے کا موقعہ دیتے۔ دائیں اور بائیں بازوؤں پر سواروں کے جو دستے ہوتے تھے وہ حسب ضرورت دشمن کے بازو یا پشت مارنے کے لئے کام آتے تھے۔ پانی پت کے میدان میں پٹھانوں اور سیکری کے قریب کھانوا



بابر کی فوج کی ترتیب

یں راجپوتوں کو ہارنے اسی ترکیب سے شکست دی - اس ترتیب کو اختیار کرنے کا خاص سبب یہ تھا کہ بابر کی فوج دشمن کے مقابلے میں بہت کم تھی، اور جب تک اسے آڑ لینے کا موقعہ نہ ملتا وہ پٹھانوں اور راجپوتوں کے ٹڈی دل کے سامنے کسی طرح ٹھہر نہیں سکتی تھی - اگر صورت حال کچھ اور ہوتی تو بابر یقیناً دوسری تدبیر اختیار کرتا کیونکہ موقعہ شناس سپہ سالار قاعدہ کی خاطر اپنی عقل کو معطل نہیں کر دیتا - بابر کو غالباً یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کی ترتیب حملہ کرنے کے لئے بالکل ناموزوں ہے، اور دشمن اس کی ترتیب کا گر سمجھ کر چوکس ہو جائے تو وہ بہت نقصان پہنچا سکتا ہے - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ پانی پت کے پندرہ سال بعد شیرشاہ نے اس ترتیب کو ایسا بگاڑا کہ مغل فوج نیست و نابود ہو گئی -

چوسا کی شکست کے بعد ہمایوں نے دلی آ کر ایک خاصی بڑی فوج جمع کی، اور ۱۵۴۰ میں بلگرام کے قریب گنگا کے کنارے شیر شاہ سے اس کا دوسرا معرکہ ہوا - ہمایوں کے سپاہی بہت اچھے اور آزمودہ کار تو نہیں تھے لیکن ان کی تعداد دشمن سے کچھ زیادہ تھی، اور ہمایوں کو بہت سی توپیں اور کئی مشہور توپچی ورثے میں ملے تھے - شیرشاہ کے پاس ایک توپ بھی نہیں تھی، اور اس سبب سے اس نے ایک طریق جنگ اختیار کیا جس سے مغلوں کی توپیں اور ان کے بہترین سپاہی جو توپوں کی آڑ میں رہتے تھے بیکار رہے - اس نے اپنی فوج کے تین حصے کر دئے، جس میں سے ایک نے مغلوں کے دائیں اور دوسرے نے ان کے بائیں بازو پر حملہ کیا، اور تیسرا توپوں کی زد سے باہر کھڑا رہا، تاکہ ضرورت کے وقت باقی دونوں حصوں کو مدد کرے - خواص خاں



نے مغلوں کے دائیں بازو کو توڑ کر پیچھے ہٹا دیا، جلال خاں پس پا ہونے والا تھا کہ شیر شاہ نے کمک پہنچائی اور مغلوں کا یہ بازو بھی ٹوٹ گیا۔ جو سوار اس وقت دشمن کا مقابلہ کر سکتے تھے وہ بھاگنے والوں اور توپوں کے بیچ میں پھنسے ہوئے تھے، اور انھیں ایک حملہ کرنے کا موقع بھی نصیب نہ ہوا۔

ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کے بعد ترکوں کی طرح مغلوں نے بھی فن جنگ پر جیسا کہ چاہئے توجہ نہیں کی، اگرچہ وہ پہلے کی بہ نسبت بہت بہتر توپیں بنانے لگے، اور بندوقوں کا بھی رواج ہو گیا۔ جب اورنگ زیب کے زمانے میں مرہٹوں سے لڑنا پڑا تو معلوم ہوا کہ مغل فوج میں وہ تمام عیب پیدا ہو گئے ہیں جو قدیم ہندو اور راجپوت فوجوں میں تھے، یعنی اسے یکجا کرنا مشکل ہے، اس کے ساتھ ساز و سامان بیحد ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ بہت سست ہو گئی ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں ملک عنبر، وزیر احمد نگر نے مغل فوج کی کمزوریوں کو تاڑ لیا اور مرہٹوں کو قزاقانہ جنگ کے لئے تیار کر کے مغلوں کے مقابلے پر چھوڑ دیا۔ مرہٹے کبھی جم کر نہیں لڑتے تھے، بلکہ موقعہ پا کر لشکر گاہ پر شبخون یا چھاپے مارتے، یا ان چھوٹے چھوٹے دستوں کا صفایا کر دیتے جو سامان مہیا کرنے کے لئے ادھر ادھر بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح مغلوں کو کوئی نمایاں شکست تو نہیں ہوئی، مگر ان کی ہمت پست ہو گئی۔ اورنگ زیب کے عہد میں اور اس کے بعد بھی مرہٹے اپنے اس طریقہ پر عمل کرتے رہے، مگر جب انھیں ملک اور دولت حاصل ہوئی تو وہ بھی بھاری فوجیں تیار کر کے جم کر لڑنے کا حوصلہ کرنے لگے۔ اس کے لئے وہ موزوں نہیں تھے اور پانی پت کی آخری لڑائی میں ان کی فوج کی کمر ٹوٹ گئی۔

یورپی قومیں جب ہندوستان آئیں تو ہمارے دیسی اصول جنگ پھر بالکل فرسودہ اور بے کار ثابت ہوئے۔ علاوہ اس کے کہ ہماری توپیں اور بندوقیں بہت ناقص تھیں ہم اپنے سپاہیوں کی تربیت اور قواعد پر کافی توجہ نہیں کرتے تھے اور یورپ کی پیادہ فوج اور سنگینوں کے جواب میں ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ مختلف والیان ملک نے اپنی کمزوری دیکھ کر اپنے سپاہیوں کو نئے اصولوں کے مطابق قواعد کرانے کی بہت کوشش کی، مگر افسوس ہے یہ وہ زمانہ تھا جب باہمی عداوتوں اور غداری کا ایسا زور تھا کہ ہندوستان کا شیرازہ خود بخود بکھر گیا اور ہم میں کبھی اتنا اتحاد عمل اور اعتماد اس حد تک قائم نہیں ہو سکا کہ دشمن کا کہیں پر جم کر مقابلہ کریں۔

ہتھیار اور اصول جنگ کی جدتوں کی جو اہمیت دکھلائی گئی   س سے یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ یہی اصل چیز ہیں۔ دنیا کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ لڑائی میں آزاد قومیں غلاموں پر ہمیشہ غالب آتی ہیں اور آزاد قوموں میں سب سے زیادہ کامیاب وہ ہوتی ہیں جن کے افراد کی ذہنی نشوونما میں رکاوٹیں نہ ڈالی جائیں، جن کا اتحاد عمل قومی ارادے کی یکسوئی اور یک جہتی کا نتیجہ ہو اور جن میں حکم چلانے اور بجا لانے کا یکساں مادہ ہو۔ یہ اوصاف لڑنے سے نہیں پیدا ہوتے، یہ سپاہیوں کے لئے مخصوص نہیں ہیں، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھیں پیدا کرنا اور ترقی دینا تعلیم گاہوں کا خاص وظیفہ ہے۔ ہر قوم کے بہترین سپاہی وہ نہیں ہوتے جو وردی پہنتے اور چھاونیوں میں رہتے ہیں، بلکہ وہ نوجوان جو صحیح تربیت پاتے ہیں اور تربیت سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

کامیابی

سلیم بی اے کے امتحان سے فارغ ہو کر سیدھا گھر آیا۔ گھر کے نام سے دل میں سکون، آرام محبت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ مگر سلیم کا گھر ٹھیکہ پہ بنا ہوا، کرایہ کا مکان تھا۔ جس کے مستقل مکین دو تھے۔ ایک سلیم کے محرور المزاج والد دوسرے اُن کا مخبوط الحواس نوکر۔ ان میں سے والد بزرگوار حج اور زیارت کو گئے ہوئے تھے البتہ نوکر نقد موجود تھا۔ سلیم کو اس مکان کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔ مگر کرتا کیا، اس کے سوا اور کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ وہ غریب باپ کا غیور بیٹا تھا۔ اس کے دوست بہت کم تھے، اور وہ بھی اسی کی طرح غریب تھے۔ ان میں سے کسی میں یہ مقدرت نہ تھی کہ اسے زیادہ دن اپنے یہاں مہمان رکھ سکتے اور اگر ہوتی بھی تو وہ خود اسے کب گوارا کرتا۔ غرض امتحان کا آخری پرچہ کرتے ہی، اس نے بستر باندھا اور آغاز مئی کی دھوپ میں تپتا، اور لو میں جھلستا ہوا وہ اپنے اس مامن میں پہنچا۔ میاں بدھو نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا شربت پلایا۔ پنکھا جھلا، اور ایک ایک لفظ کے کئی جملوں میں اس کی خیریت پوچھی۔ جب کبھی وہ تعطیل میں گھر آتا تھا، میاں بدھو ازراہ محبت یہ کہا کرتے تھے کہ تم دبلے ہوگئے ہو۔ اس کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ کالج میں ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا نہیں ملتا اور دوسری یہ کہ "مولوی صاحب" یا "میاں جی" "بچے" کو ٹھونکتے بہت ہیں۔

دو رات تو سلیم کو سونے میں گذر گئے۔ نیم خوابی کی حالت میں وہ منہ ہاتھ دھوتے اور کھانا کھانے کو اٹھتا تھا اور پھر سو جاتا تھا۔ تیسرے دن سے "وکاوکا وخت جانی اے تنہائی" کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس شہر میں اس کے والد تھوڑے ہی دن پہلے آئے تھے۔ اس لئے اس کا جاننے والا دو چار آدمیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس کے ایک رشتہ کے خالو تحصیل میں سیاہہ نویس تھے ان کے گھر، روز شام کو جایا کرتا تھا۔ خالہ سے اپنی والدہ مرحومہ کی تعریف اور اپنے والد مدظلہ کی برائیاں سنتا تھا۔ خالو کے سیاہے کی میزان جوڑتا تھا۔ ان کے بڑے لڑکے کو سبق پڑھاتا تھا اور چھوٹے بچے کو کھلانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک پرانے ہم سبق کے یہاں

چلا جاتا تھا جو اپنے خاندان کی لڑائیوں کے قصّے سنایا کرتے تھے اور کبھی ایک نئے واقف کار کے یہاں، جو اپنی نوکر کی نمک حرامی کی شکایت کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اس کے شناساؤں میں ایک مرزا صاحب اور تھے، ان کی صحبت کسی قدر دلچسپ تھی، مگر ایک تو ان کا گھر دور تھا۔ دوسرے وہ اس قدر قوی ہیکل ورزشی آدمی تھے کہ سلیم کو ان کے سامنے اپنے نحیف جثہ پر شرم آتی تھی۔ مصیبت اور یہ تھی کہ اوپر سے وہ نصیحت کے ردّے جماتے تھے۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت تھا، وہ تلقین سے آگے بڑھ کر تعلیم شروع کر دیتے تھے اور سلیم کو ان کے ساتھ جسم کو عجیب عجیب مضحک طریقوں سے توڑنے مروڑنے کی مشق کرنی پڑتی تھی، جس سے اس کا پلیتھن نکل جاتا تھا اور کئی کئی روز تک بدن میں درد رہتا تھا اس لئے ان سے ملنے سے اس کی طبیعت رُکتی تھی۔ زیادہ وقت وہ کتب بینی میں اور خیالی پلاؤ پکانے میں صرف کرتا تھا۔

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ اب امتحان کا نتیجہ نکلنے والا تھا اور سلیم اس کے انتظار میں بے چین رہتا تھا۔ وہ بڑا ذہین اور محنتی طالب علم تھا۔ انٹرنس، اور ایف اے اوّل درجے میں پاس کیا تھا۔ بی اے میں بھی اس کے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے۔ اور قاعدے سے اسے اوّل درجہ ملنا چاہیئے تھا۔ مگر ممتحنوں کی نسبت اس نے سُنا تھا کہ وہ امتحان کے پرچے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے دیوان حافظ میں فال دیکھی جاتی ہے۔ اس لئے نتیجہ کی طرف سے اسے پورا اطمینان نہیں تھا۔ نوجوانی کا ناہموار تخیل اور تلاطم اسے امید و یاس کی اٹھتی گرتی لہروں میں بہائے لئے جا رہا تھا۔ مگر انتظار یوں ہی کیا کم سخت ہے پھر جب اس کے ساتھ بے اطمینانی بھی شامل ہو جائے، تو اس کی شدت کا کیا پوچھنا۔ سلیم کے ایک دوست نے جو الہ آباد میں رہتے تھے، وعدہ کیا تھا کہ جب نتیجہ معلوم ہوگا تو اسے تار دے دیں گے۔ کئی روز سے وہ سوتے جاگتے ہر وقت اس تار کی فکر میں رہا کرتا تھا۔ خدا جانے کتنے چکّر اس نے تار گھر کے لگائے۔ اس کے والد اُسی ڈاکخانہ میں ملازم تھے جس کے ساتھ یہ تار گھر تھا۔

اس لئے تار بابو اور چپراسی اسے پہچانتے تھے۔ پھر بھی اسے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کے نام کا کوئی تار آیا ہے۔ وہ سامنے سڑک پر بے پروائی کے انداز سے ٹہلتا رہتا تھا۔ اور جب کوئی چپراسی سرخ بائیسکل پر نکلتا تو اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا تھا کہ شاید اس کے پاس میرا تار ہو، اور

یہ مجھے مخاطب کرے۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ بڑی حسرت سے اپنے دل میں کہتا تھا کہ تار پر تار چلا آتا ہے، مگر میرے نام کا ایک بھی نہیں "تار آتا ہے پر نہیں آتا :۔

آج صبح سے اس نے نقشہ بدل دیا تھا۔ بجائے تار گھر کے سامنے سعی کرنے کے وہ معتکف ہو کر گھر پر بیٹھ گیا اور کتب بینی میں وقت گزارنے لگا۔ مگر دل اسی طرف لگا ہوا تھا۔ ایک بجے کے قریب وہ کھانا کھانے بیٹھا۔ کھانے میں صرف ماش کی دال اور روٹی تھی اس لئے کہ گوشت بقول بدھو کے بلی کھا گئی تھی۔ یہ حادثہ اکثر پیش آیا کرتا تھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ بلی گوشت اسی دن کھاتی تھی جس دن میاں بدھو کی افیم ختم ہو جائے۔ بدگمانی بری چیز ہے۔ اس لئے ہم اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ افیون ان کے ہوش کی کنجی تھی، جس دن چسکی نہ ہو اس دن وہ غافل ہو جاتے تھے اور حریف جو ہر وقت گھات میں رہتا تھا۔ اپنا کام کر جاتا تھا۔ گوشت کے نہ ہونے کی تلافی میاں بدھو نے یہ کی تھی کہ دال کو بگھار کر اوپر سے کتری ہوئی ادرک، پیاز، ہری مرچ کی تہہ جما دی تھی بدھو کھانا رکھ کر بیٹھے تھے اور سلیم نے نوالہ توڑنے کو ہاتھ بڑھایا تھا کہ باہر سے آواز آئی "تار لے جاؤ" تڑپ کر اٹھنا، جھپٹ کر دروازہ پر پہنچنا، سنبھل کر اپنے اضطراب کو چھپانا، تار لے کر رسید کے فارم پر دستخط کرنا، چپراسی نے جو کچھ کہا اسے نہ سننا کمرہ میں آکر لفافہ چاک کرنا، یہ سب کچھ بےخبری کے عالم میں چند لمحے کے اندر ہو گیا۔ "اوّل درجہ، دلی مبارکباد" یہ چار لفظ آنکھوں کے رستے دماغ میں پہونچے اور بجلی کی رو کی طرح رگ و پے میں دوڑ گئے۔ خوشی کا ایک ہیجان تھا جس نے قوت خیال کو قریب قریب معطل کر دیا تھا۔ مگر تار والے کی آواز نے اس طلسم کو توڑ دیا "ہمارا انعام مل جائے" بابو صاحب" سلیم چونک پڑا، اس نے اٹھ کر جیب سے ایک روپیہ نکالا اور باہر جا کر چپکے سے چپراسی کے ہاتھ میں دے دیا۔ چپراسی نے سلام کیا۔ اور بائیسکل پر بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔ اندر آکر سلیم کی نظر کھانے پر پڑی مگر اب اس کی اشتہا کافور ہو چکی تھی اور صرف ایک خواہش دل پر مسلط تھی۔ کہ اپنی کامیابی کی خوشخبری کسی کو سنائے اور اس سے داد لے۔ اس نے سوچا کہ بدھو غالباً چسکی پینے گیا ہے۔ اور کوئی دم میں آیا ہی چاہتا ہے اس کے آنے کے بعد۔ کھانا کھائے بغیر چھٹکارا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھی شیروانی پہن اور بٹن لگاتا ہوا دروازہ سے باہر نکل گیا۔ سڑک پر پہنچ کر خیال آیا کہ جوتا نہیں بدلا ہے۔ مگر

اب واپس جانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس لئے دو سال کی پرانی گرگابی پہنے سٹر پٹر کرتا خالہ کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

راہ میں تصور نے۔ اس کی بیوی کی تصویر نظر کے سامنے پیش کردی۔ یہ نیک بخت ابھی تعین کی اکثر قیود سے آزاد تھی مگر یہ مسلم تھا کہ وہ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کی تمام صفات سے آراستہ ہے ایک مدت سے وہ تنہائی کی گھڑیوں میں سلیم کی ہمدم اور ہمساز رہا کرتی تھی)۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس یادگار موقع پر اسے مبارکباد دینے نہ آتی لیجئے' وہ آگئی' سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے۔ اس کا حسین چہرہ فخر و مسرت سے دمک رہا ہے۔ حجاب کی سرخی عارض تاباں پر دوڑی ہوئی ہے۔ سرمہ آلود آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلک رہے ہیں ؎

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

دونوں کی نظریں ایک لمحہ کے لئے ملتی ہیں۔ اور پھر شرم سے جھک جاتی ہیں۔ سلیم ہمہ تن گوش ہو کر وہ کچھ کہے اسے انتظار ہے کہ یہ پہل کرے۔ دونوں کو بہت کچھ کہنا ہے۔ مگر سوچتے ہیں یہ کہ آخر ابتدا کیونکر کریں ... . خالہ کا گھر آگیا۔ سلیم کو اس واقعے نے جھنجوڑ کرا خواب شیریں سے بیدار کردیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا خالہ کے گھر میں داخل ہوا۔ وہ معظمہ سامنے والان میں بچے کو لئے بیٹھی تھیں۔ سلیم کو دیکھتے ہی کہنے لگیں' بیٹا سلیم اس وقت تمھیں خدا نے بھیجا ہے اس کی کارسازی کے صدقے۔ نھارات سے بخار میں تپ رہا ہے۔ محمود نے جا کر ڈاکٹر سے نسخہ لکھوایا اور دوا کے انتظار میں کھڑا رہا مگر اتنا ہجوم تھا کہ اسکول کا وقت آگیا اور اس کی باری نہیں آئی وہ نسخہ یہاں پھینک' کتابیں لے اسکول چلدیا۔ اب میں دوا کس سے منگواتی نصیباً تو جب سے بوڑھی ہوئی ہیں اُنھیں مردوؤں میں جاتے شرم آتی ہے۔ بیٹا ذرا تم ہی تکلیف کرو اور یہ نسخہ لیکے دوا لادو۔ اور ہاں لوٹتے میں عطار کی دکان سے آدھ پاؤ بید مشک کا عرق۔ اور تولہ بھر کھٹے میٹھے انار کا شربت لیتے آنا مجھے صبح سے دھڑکن نے ستا رکھا ہے"۔

سلیم نے بچے کے پاس جاکر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو آگ کی طرح پھک رہا تھا گر خالہ کو تسکین

دینے کے لئے اس نے کہا "بخار تو اب کم معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی دوا لاتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو پیتے ہی اتر جائیگا" نسخہ لیکر وہ ہسپتال میں گیا، جو قریب تھا۔ کمپونڈر بنچ پر پاؤں پھیلائے سو رہا تھا اس کے اُٹھنے اور دوا کے لینے میں کچھ دیر لگی عطار کے یہاں سے اس نے عرق اور شربت لیا۔ سیب کا مربہ چاندی کے ورق خالہ کے لئے اور پیپرمنٹ کی ٹکیاں ننھے کے لئے خریدیں۔ گھر آیا تو خالہ نے بہت سی دعائیں دیں۔ اگر اختلاج سے بےچین نہ ہوتیں تو بلائیں بھی لے تیں۔ دونوں مریضوں کو دوا پلا کر وہ کچھ دیر ننھے کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں سہلاتا رہا خالہ اپنی اور بچے کی بیماری اور اپنے شوہر کی بے پروائی اور بے مہری کا دکھڑا روتی رہیں۔ تھوڑی دیر میں بچے کو نیند آگئی اور خالہ بھی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگیں اس لئے وہ شام کا وعدہ کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے دل پر افسردگی سی چھاگئی تھی مگر کامیابی کا نشہ ایسا نہ تھا کہ اتنی جلدی اتر جاتا یہاں سے وہ اپنے پرانے ہم سبق کے یہاں پہنچا دیکھا کہ وہ اپنی بیٹھک میں منہ ڈھانپے پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ سلیم سمجھا کہ سو رہے ہیں مگر وہ اس کے پیروں کی آہٹ سے اُٹھ بیٹھے اور مری ہوئی آواز میں کہنے لگے "تم خوب آگئے میں تو سہ پہر کو تمہارے یہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا" سلیم نے دیکھا کہ ان کے چہرہ کا رنگ اڑا ہوا ہے۔ آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے ہونٹ خشک ہیں۔ اس نے گھبرا کر پوچھا "خیر تو ہے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں" کہنے لگے "سلیم کیا بتاؤں میں تو زندگی سے عاجز آگیا ہوں اس روز روز کی مصیبت سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے والد کے انتقال کے بعد گھر بار سنبھالنے کے لئے میں نے پڑھنا چھوڑا مگر اس بوجھ نے میری کمر توڑ دی۔ میرا جیسا رنجا رنج آدمی اور سابقہ اس کنبے سے جس میں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ مردوں کو تو میں کسی نہ کسی طرح ٹھیک کر لیتا ہوں مگر عورتوں کا کیا علاج کروں آج کا قصہ سنو۔ میری بیوی سے اور والدہ صاحبہ سے مدت سے لڑائی ٹھنی ہوئی ہے بات چیت ترک تھی آج کو ذرا سی بات پر دونوں آپے سے باہر ہوگئیں وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ یا اللہ تیری پناہ مختصر یہ کہ بیوی ڈولی منگا کر میکے چلی گئیں والدہ کوٹھری کی کنڈی لگا کر بیٹھ رہیں۔ گھر میں آگ تک نہیں لگی۔ بچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں میں چاہتا ہوں [illegible] صاحب کو گاؤں سے بلوا لیا جائے کہ والدہ کو سمجھائیں یہ قصہ طے ہو جائے تو میں بیوی کے

یہاں جاؤں۔ وہاں جو کچھ پیش آئے گا اس کے خیال سے دل لرزتا ہے۔ خیر خدا مالک ہے" ہر سر اولادِ آدم ہر چہ آید بگزرد" سلیم بڑی دلسوزی سے اولادِ آدم کے درد کی داستان سنتا رہا وہ ان معاملات میں بالکل ناتجربہ کار تھا۔ والدہ اس کے چھٹ پنے میں انتقال کر چکی تھیں۔ رہی اس کی بیوی سو اس سے ابھی تک لڑائی تو ایک طرف خفیف سی رنجش کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ کن الفاظ میں تعزیت کرے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا تقدیر نے اس کی مدد کی اور عین اسی وقت ایک بیل گاڑی ٹھیک کے سامنے آکر رکی جس میں اولادِ آدم کے چچا کی سفید داڑھی نظر پڑی اس کے حق میں وہ اس وقت رجال غیب سے کم نہیں تھے۔ موقع کو غنیمت سمجھ کر وہ جلدی سے اٹھا اور چچا کو سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

خوشی کی جگہ اسے غصہ آرہا تھا۔ اور وہ سیدھا گھر جانے کا قصد کر رہا تھا۔ مگر اس کے نئے دوست کا مکان رستے میں پڑتا تھا۔ اس نے سوچا۔ چلو انھیں بھی دیکھتے چلیں۔ شاید انھیں سے دل کی بات کہنے کا موقع مل جائے اس نے ان کی گلی میں قدم رکھا تھا کہ وہ حضرت خود لمبے لمبے ڈگ بھرتے اسی طرف آتے نظر آئے سلیم وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ قریب آکر صاحب سلامت کے بعد انھوں نے انتہائی سراسیمگی کے انداز میں فرمایا "سلیم صاحب معاف کیجیے گا میں اس وقت بڑی جلدی میں ہوں نوکر مردود نے مجھے لوٹ لیا۔ کیش بکس توڑ کر ساری رقم اڑا لے گیا۔ بیس گڈیاں تو دس' دس کے نوٹوں کی تھیں۔ روپیہ کی تعداد ٹھیک یاد نہیں میں ابھی گھر میں آیا تو معلوم ہوا۔ تھانہ پر رپٹ لکھوانے جا رہا ہوں آپ چل کر بیٹھیے میں پانچ منٹ میں حاضر ہوتا ہوں آپ کو سارا قصہ تفصیل سے سناؤں گا۔"

اب سلیم کو ضبط کی تاب نہیں رہی اور وہ دل ہی دل میں برس پڑا" لعنت ہے اس ملک پر جس میں غم کا شریک تو ایک طرف، کوئی خوشی کا ساتھی بھی نہیں ملتا۔ اور پھر کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ مصیبت کو ہنسی میں ٹال دے یا چپ چاپ سہہ لے۔ جہاں دیکھیے شکوہ و شکایت' آہ و زاری' نالہ و فریاد' سب زخمی اور سب کو اپنے زخموں کی نمائش کا شوق۔ سب درد میں مبتلا اور سب کو کراہنے کی عادت۔ اس ہر وقت کی ہائے ہائے میں کوئی شخص جس کے دل میں دوسروں کا درد ہو کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔ انسان اپنی تکلیفوں پر صبر کرے مگر دوسروں کی تکلیفوں پر کیسے صبر کرے۔ غم و غصہ کی اس فضا میں ہمت' اولوالعزمی' بلند خیالات

اعلیٰ مقاصد کیونکر پنپ سکتے ہیں ۔ کہنے والا کہتا ہے :" خو گر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی " فرض کا احساس خدمت کی لگن ۔ پیدا کرو تو کلفت میں راحت ، درد میں لذت پاؤ گے ۔ زندگی کی تلخیاں شربت کے گھونٹ بن جائیں گی مگر ۔

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

اس عمر میں جسے جوانی کہتے ہیں تھوڑی سی نشاط طبع تھوڑی سی خوش دلی ، ذرا سی ہمت افزائی ، ذرا سی دلدہی کے بغیر محنت و ترقی ناممکن ہے ۔ میں نے جن جن مصیبتوں سے بی اے تک پڑھا انھیں میں جانتا ہوں یا خدا جانتا ہے ۔ آج اس محنت کا ثمر حاصل ہوا اتنی بڑی خوشی کو میں تنہا کیونکر سمیٹتا کیا میں اس کا مستحق نہیں تھا کہ کوئی اس خوش خبری کو سن کر مجھے مبارک باد دیتا ۔ مگر جن سے اس کی امید تھی ان سے سخت مایوسی ہوئی کسی نے میری خوشی کا بوجھ نہیں بٹایا سب نے اپنے رنج کا بوجھ مجھ پر لاد دیا ۔ ایک مرزا صاحب رہ گئے ہیں ان کے یہاں جاؤں تو خدا جانے کیا منظر دیکھنے میں آئے شاید ان کو کسی نے قتل کر دیا ہو یا زیادہ قرین قیاس ہے کہ انھوں نے کسی کی گردن مروڑ دی ہو ۔ نہیں اس شہر میں ، اس ملک میں خوش ہونا جرم ہے اسے ظاہر نہیں کرنا چاہئے بلکہ چھپانا چاہئے ، انگریزی مثل ہے " ہنسنے والے کے ساتھ دنیا ہنستی ہے ۔ رونے والا اکیلا روتا ہے " مگر ہماری دنیا الٹی ہے ۔ رونے والے کے ساتھ روتی ہے ہنسنے والے کے پاس نہیں پھٹکتی روئے جا اے بدنصیب ہندوستان ، تیری قسمت میں رونا ہی لکھا ہے .... "

ان خیالات میں غرق سلیم اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا ۔ یکا یک اسے اسکول کے بچوں کی ایک ٹولی نظر آئی جن میں اس کا خالہ زاد بھائی محمود بھی تھا ۔ محمود نے اسے دیکھکر سلام کیا اور اس کی طرف بڑھا سلیم اس سے کہہ چکا تھا کہ نتیجہ کا تار آنے والا ہے ۔ قریب آکر اس نے اشتیاق کے لہجے میں پوچھا " کہئے بھائی جان تار آگیا ؟"

سلیم نے کسی قدر تامل کے بعد جواب دیا " ہاں دوپہر کو تار آیا میں پاس ہوگیا ...... اول درجہ میں "

محمود کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا " مبارک ہو بھائی جان ۔ لائیے مٹھائی کھلوائیے ۔ اچھا آپ کو کس درجہ میں

ترقی ملے گی؟" سلیم اس بھولے پن کے سوال پر مسکرایا" ترقی؟ بھئی بی اے کے بعد تعلیم کی ایک منزل ختم ہو جاتی ہے کوئی چاہے تو ایم۔ اے' یا قانون کے درجہ میں داخل ہو جائے۔ میں نے ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کیا خیر اب تم گھر جاؤ خالہ انتظار میں ہونگی۔ میں شام کو تمھارے لئے مٹھائی لے کر آؤں گا" محمود خوش خوش اپنے ساتھیوں میں جا کر مل گیا۔ شاید اس نے ان پر رعب گانٹھنے کے لئے اپنے بھائی کی کامیابی کی خبر سنائی ہوگی سلیم کے کان میں ایک ٹھٹکے کی آواز آئی" اجی یہ فقرے کسی اور کو دو۔ بی۔ اے میں اوّل آنے والے کی ایسی ہی صورت ہوتی ہے" سب لوگوں نے سلیم کی طرف غور سے دیکھا اور منہ پھیر کر زور سے قہقہہ لگایا سلیم کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی مگر اب اس کی طبیعت کی لے بدل چکی تھی۔ جذبۂ مسرت جو کچھ دیر کے لئے غصہ کے جوش میں دب گیا تھا ابھر آیا۔ اس کے دل میں خاموش خطایت کا طوفان پھر اٹھا۔ مگر اب ہوا کا رُخ اور تھا" شکر ہے نوجوان ہندوستان ابھی غم اور غم پرستی کے زہر سے محفوظ ہے۔ اس کی رگوں میں شوخی اور زندہ دلی کا خون دوڑتا ہے۔ اس میں ہنسنے کا ذوق اور ہنسنے کی قوت باقی ہے۔ اسے دیکھ کر کچھ اُمید ہوتی ہے کہ یہ زندگی کی کڑیاں ہنس کھیل کر سہے گا۔ مشکلوں کا مقابلہ مردانہ وار کرے گا۔ ایسے رفیق کے بل پر انسان کارزار حیات میں قدم رکھ سکتا ہے ؎

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم"

سلسلہ خیال یہاں تک پہنچا تھا کہ اس کی نظر حلوائی کی دکان پر جا پڑی اسے محمود کا مٹھائی کا تقاضا یاد آگیا اور بھوک کی شدت بھی محسوس ہوئی کیونکہ اس نے دوپہر کو کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک روپیہ کی گرما گرم جلیبیاں خریدے کچھ خود کھائے کچھ میاں بدھو کی نذر کرے۔ اور باقی شام کو محمود کے لئے لے جائے۔ وہ حلوائی کی دکان کی طرف بڑھا اور ہندوستان کے مستقبل کے فکر جلیبیوں کے پیچ میں غائب ہو گئے۔

ہندوستان کا زر روبنک

پچھلے دنوں زر روبنک کا سارے ہندوستان میں بڑا چرچا رہا۔ اسمبلی میں کئی سال تک اس کے مسودہ قانون پر گرماگرم بحثیں ہوئیں۔ جو لوگ ہندوستان کے دستور میں اصلاح کی تجویزوں پر غور کر رہے تھے اُنھوں نے پہلی گول میز کانفرنس میں کہا کہ زر روبنک کا قائم ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے بین الاقوامی منڈیوں میں ہندوستان کا ساکھ قائم نہ ہوسکے گا اور بے ساکھ کے نئی حکومت کے مالیہ میں توازن قائم ہونا دشوار ہوجائے گا۔ آخر کار زر روبنک ایکٹ منظور ہوا۔ سر سکندر حیات خاں سابق گورنر پنجاب اس کے ڈپٹی گورنر بنائے گئے۔ نواب مزمل اللہ خاں اور آدم حاجی محمد سیٹھ اور دوسرے ہندوستانی اس کے مرکزی بورڈ کے رکن ہوئے اس کے حصے فروخت ہوئے۔ اُن بنکوں میں جہاں حصوں کی خریداری کے لئے درخواستیں لی گئیں لوگ ٹوٹ پڑے۔ بنک کو جتنے روپیہ کی ضرورت تھی اس سے زیادہ کی درخواستیں آگئیں۔ اخباروں میں ہر ہفتہ پچھلے جمعہ تک کا جمع قرض کا چٹھا نکلنے لگا جو اور بنکوں کے جمع قرض کے چٹھوں سے اس اعتبار سے مختلف ہوتا ہے کہ عام بنکوں کا صرف ایک یکجائی چٹھا ہوتا ہے لیکن اس کا چٹھا دو علیحدہ علیحدہ شعبوں میں منقسم ہوتا ہے۔ اول اجرائے سکہ کا شعبہ اور دوسرا ساہوکارے کا شعبہ۔ دوسرا تو تقریباً ایسا ہی ہوتا ہے جیسا اور تمام بنکوں کا لیکن پہلے کے علیحدہ دینے کی کیا ضرورت ہے اور زر روبنک کا سکہ کے اجراء سے کیا تعلق ہے۔ ہندوستان میں تو سکہ سازی کا کام صرف حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ اس بنک کو یہ خدمت کیوں سپرد کردی گئی۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوال پیدا ہوتے ہیں اور طبیعت میں جستجو ہوتی ہے کہ معلوم کیا جائے کہ زر روبنک کسے کہتے ہیں۔ اس کی عام طور پر کیا خصوصیات ہوتی ہیں اور ہندوستان کے زر روبنک کی کیا امتیازی خصوصیات ہوں گی۔ ہندوستانی قوم پرستوں کا کیا مطالبہ تھا اور حکومت نے کس قسم کا بنک قائم کیا ہے۔ حکومت سے اس کا کیا تعلق ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ صفحات مابعد میں کوشش کی جائے گی کہ اس قسم کے تمام مسائل کے متعلق بحث کی جائے اور زر روبنک کا ایک صحیح تخیل پیش کیا جائے۔

ریزرو بنک کسے کہتے ہیں "ریزرو" کے معنی انگریزی میں محفوظ کے ہیں۔ مثلاً "ریزرو" پولس یا "ریزرو" فوج سے مراد یہ ہے کہ ایسی پولس یا فوج جو کسی آڑے وقت کے لئے محفوظ رکھی جاتی ہے۔ جب معمولی پولس یا فوج سے کام نہیں چلتا تو جو پولس یا فوج محفوظ ہوتی ہے اُسے بلا یا جاتا ہے۔ اسی طرح افراد، کمپنیاں، بنک اور انجمنیں اپنا تمام سرمایہ کاروبار میں نہیں لگا دیتیں بلکہ کچھ "محفوظ" رکھتی ہیں تاکہ تنگی اور مشکل کے وقت جب روزانہ کی آمدنی سے مطالبات پورے نہ کئے جا سکیں اس محفوظ سرمایہ کو کام میں لائیں اور اپنا ساکھ قائم رکھ سکیں۔

عہد جدید کے کاروبار اور مبادلہ کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں سونے یا چاندی کے استعمال میں بہت کفایت سے کام لیا جاتا ہے۔ سونا چاندی چونکہ ہر شخص کے لئے قابل قبول ہے اس لئے بہترین ذریعہ مبادلہ ہے۔ خرید و فروخت میں اس کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کاروباری لوگ جہاں تک ہو سکتا ہے سونے چاندی کی شکل میں ادائگی کو ملتوی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاندی سونے کا ذرا سا ٹکڑا اگر اپنے پاس ہوتا ہے تو اُسے مختلف آدمیوں کو دکھا دکھا کر اُن کا اعتبار و اعتماد حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کم وزن ٹکڑے سے اس اعتبار کی بنیاد پر اُتنا ہی کام نکالتے ہیں جتنا عدم اعتبار کی صورت میں اس سے کئی گنے زیادہ وزنی ٹکڑوں سے لیا جاتا۔ مطالبوں کی ادائگی جلد یا بدیر بہر حال کرنا ہی پڑتی ہے۔ لیکن اعتبار کی وجہ سے وقتی طور پر زبانی یا تحریری وعدوں سے کام چل جاتا ہے اور کاروبار کو سہولت کے ساتھ وسیع کیا جا سکتا ہے۔ پھر کاروبار کا یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ روپیہ کی وصولیابی اور ادائگی کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ ایک کو مال قرض دیا جاتا ہے تو دوسرے سے وصول کیا جاتا ہے۔ ایک کا قرض چکتا یا جاتا ہے تو دوسرے سے لیا جاتا ہے۔ ایسے مواقع کم یا بالکل نہیں ہوتے کہ ادا تو سب کو کرنا ہو لیکن وصول کسی سے نہ ہوتا ہو۔ ہر روز، ہر مہینہ، اور ہر سال کے لئے ایک رقم اپنے اور دوسرے کاروباری لوگوں کے تجربہ سے ایسی متعین کر لی جاتی ہے (مثلاً پانچ فیصدی، دس فیصدی، پندرہ فیصدی) جس کی موجودگی میں اطمینان ہوتا ہے کہ سب مطالبے آسانی سے نبٹ جا سکیں گے۔ بس اس رقم کے برابر سونا چاندی یا ایسا سکہ جو سونے چاندی کے ساوی سمجھا جاتا ہو محفوظ

رکھ لیا جاتا ہے اور بے فکری سے کاروبار کو جاری رکھا جاتا ہے۔ اب جب تک تخمینہ غلط ثابت نہ ہو یا غیر معمولی حالات کی وجہ سے ایک دم مطالبوں میں خلاف توقع اضافہ نہ ہو جائے کاروبار ٹھیک چلتا رہے گا ورنہ کسی ایک شخص کا مطالبہ بھی اگر وقت پر ادا نہ ہوا تو ہوا اُکھڑ جائے گی۔ ٹاٹ اُلٹنا پڑے گا اور سارا کاروبار بیٹھ جائے گا۔

کم سونے چاندی اور پونجی سے زیادہ رقموں کے کاروبار چلانے کا لالچ ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ پھر تجارت و صنعت کی دوڑ میں لوگ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں کچھ ایسے لگے رہتے ہیں کہ ہر طرح کی چوکسی اور آگے کا خیال چھوڑ دیتے ہیں۔ سرمایہ محفوظ کا تناسب گھٹتے گھٹتے خطرناک حد تک پہنچ جاتا ہے اور جہاں ایک کا دوالا نکلا سارے بازار والوں کا دوالہ نکل جاتا ہے لوگ جلد باز ہوتے ہیں اُنھیں اس بات کے معلوم کرنے کی فرصت اور پروا نہیں ہوتی کہ قرض دار میں قرض کے ادا کرنے کی اہلیت ہے یا نہیں۔ اگر انتظار کیا جائے گا تو اس سے روپیہ وصول ہو سکے گا یا نہیں پھر اُنھیں خود اپنے قرضوں کی ادائیگی کی فکر سوار ہوتی ہے اور جو ہلڑ مچتا ہے اور آپا دھاپی ہوتی ہے وہ قیامت سے کم نہیں ہوتی۔ کسی کو کسی کا اعتبار نہیں رہتا۔ سارا کاروبار ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہزاروں خاندان برباد، گھر اور کارخانے ویران اور لوگ بے روزگار ہو جاتے ہیں۔

جس طرح افراد، فرداً فرداً اس طرح کی بے احتیاطیاں کرتے ہیں۔ کمپنیاں اور بنک مشترکہ طور پر کرتے ہیں اور حکومتیں بھی اس قسم کی ناعاقبت اندیشیوں سے باز نہیں رہتیں۔ افراد کی بے احتیاطیوں کا انجام جب اس قدر زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے تو بڑے دلالوں، کمپنیوں، بنکوں اور حکومتوں کی بے احتیاطیوں کا خمیازہ تو کل ملک بلکہ ساری دنیا کو بھگتنا پڑتا ہے۔

اس لئے ضرورت اس بات کی محسوس کی جاتی ہے کہ ہر ملک میں ایک بنک کم از کم ایسا ہو جس کو اپنے ذاتی نفع سے زیادہ اجتماعی مفاد کا خیال ہو اور جو وقتی فایدہ کے لالچ میں حزم و احتیاط کے اصول کو ہاتھ سے نہ دے اور تمام ملک کی منڈیوں، کاروباری لوگوں، بنکوں، کمپنیوں اور نیز حکومت کے لین دین پر اتنا اثر و اقتدار رکھے اور انھیں کبھی حدود احتیاط سے متجاوز نہ ہونے دے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی

کل ہونا چاہئے کہ جیسے جہاں ذرا سا مروڑا اور فوراً ملک کے تمام اعتبار و اعتماد کی وزنی گاڑی تیز یا آہستہ ہو گئی ۔ یہ کام رزرو بنک کا ہے اور یہ رزرو بنک اس لئے کہلاتا ہے کہ ملک کے تمام بنکوں اور حکومت کا سرمایہ محفوظ اس کے پاس جمع ہوتا ہے ۔ اس کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں ۔ یہ نیا کاغذی سکہ بنا سکتا ہے ۔ غیر ملکوں سے اپنے اعلیٰ اعتبار پر بڑی بڑی رقموں کے قرض لے سکتا ہے اور اپنے ان زبردست وسائل کی بنا پر پوری اہلیت رکھتا ہے کہ جب حکومت اور ملکی بنک ضغطے میں پڑے ہوں تو انھیں سہارا دے اور ان کی مشکل آسان کر سکے ۔

سرکار، غیر ملکی سرمایہ دار اور قوم پرست ہندوستانی کو رزرو بنک سے فائدہ

رزرو بنک کا مطالبہ ہندوستانی قوم پرستوں، برطانوی رجعت پسندوں اور سرکار تینوں کی طرف سے کیا جا رہا تھا ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ترقی اور رجعت دونوں پہلو شامل تھے ۔ ہندوستانی قوم پرست موجودہ حکومت کے انتظام سے مطمئن نہیں تھے اس لئے وہ حکومت کی جگہ رزرو بنک سے ملکی سکہ، مبادلہ اور سرکاری لین دین کا کام کرانا چاہتے تھے ۔ برطانوی سرمایہ داروں کو مستقبل کی ہندوستانی قومی حکومت کی طرف سے خطرہ تھا اس لئے وہ ان کاموں کو حکومت کے ہاتھ سے نکال کر ایک آزاد، محفوظ اور لائق اعتماد ادارے کو سپرد کرنا چاہتے تھے جس پر سیاسی جماعتوں کے وقتی عروج و زوال کا کوئی اثر نہ پڑ سکے ۔ موجودہ ہندوستانی حکومت جب یہ کہتی تھی کہ مجھے بین الاقوامی منڈیوں میں ہندوستان کے ساکھ اور اعتبار کی فکر ہے تو اس کے دل میں بھی ہندوستانی قوم پرستوں کی طرف سے اندیشہ پایا جاتا تھا ۔ قوم پرستوں نے اکثر کہا ہے کہ موجودہ سرکار کے تمام قرضے ادا کرنے کے لئے ہندوستان پابند نہیں ہے ۔ کانگریس نے سرکاری قرضوں کی تحقیقات کے لئے کمیٹی مقرر کر کے اس بات کو بھی اشارتاً بتا دیا تھا کہ کس قسم کے قرضوں کی ادائگی سے آئندہ کی قومی حکومت منحرف ہو جائے گی ۔ اس قسم کی گفتگوؤں سے غیر ملکی قرضخواہوں کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ سرکاری قرضے کی دستاویزوں کو بازار میں بیچنا شروع کرتے ہیں جس سے ان دستاویزوں کی قیمت گھٹنا شروع ہوتی ہے اور سرکار کی آبروریزی ہوتی ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باہر کے لوگ ہمارے رقعہ اور دستاویز کو ٹکے دمڑی کے بھاؤ بھی نہ خریدیں اور ہمارا شمار دوالیہ حکومتوں میں ہونے لگے ۔

انتقال حکومت کے زمانہ میں یہ چیز خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ فرض کیجئے سرکار اور مجلس مقننہ کی قوم پرست جماعت میں کسی بات پر اختلاف رائے ہو جائے۔ بات اس قدر بڑھے کہ دستور کو معطل کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ قوم پرست جواب کے طور پر عدم ادائیگی محاصل کی تحریک شروع کر دیں۔ سرکار کو مالی دشواری ہو اور ان غیر معمولی حالات میں وہ باہر سے قرض لینا چاہے اور اس موقع پر قوم پرست تمام سرکاری قرضوں سے اپنی بریت کا اعلان کر دیں تو سرکار کے لئے یہ ایک بڑی آزمائش کا وقت ہو جائے اس میں شک نہیں کہ قوم پرستوں کی اس حرکت سے صرف سرکار ہی کے اعتبار کو نہیں بلکہ کل ملک کے اعتبار کو سخت نقصان پہنچے گا اور آیندہ قوم پرستوں کی حکومت کو بھی اپنے مشکل کے وقت قرضہ لینا چاہے گی تو اسے بھی نہ ملے گا لیکن چونکہ انتہا پسند کانگریسی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کا خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں اس لئے وہ اس حرف سے لاپروا ہیں۔ لیکن سرکار اور قدامت پرستوں کی جیت چونکہ چیزوں کو اپنی حالت پر قائم و برقرار رکھنے میں ہے لہذا وہ ایک ایسے ادارے کا قیام نہایت ضروری سمجھتے تھے جو وقتی سیاسی شورشوں اور ہنگاموں سے غیر متاثر رہ کر ملکی اور غیر ملکی ساکھ اور اعتبار کے کام کو چلا سکے۔

اس لئے سرکار کے نزدیک تو زر و بنک کو زیادہ اہمیت صرف اس لئے حاصل ہے کہ اس کے ذریعہ ہی ہندوستان کے سکہ مبادلہ اور قرض کے انتظام کو قوم پرست جماعتوں کی مداخلت سے محفوظ رکھا جا سکیگا۔ اس کے دوسرے فوائد اس کے نزدیک ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں مگر قوم پرست ان ضمنی فواید کو ہی اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ وہ زر و بنک سے ملک کی تجارتی، صنعتی اور زراعتی ترقی کا کام لینا چاہتے ہیں۔ تجارت، صنعت و زراعت کو آج کل ضرورت کے وقت کم شرح سود پر روپیہ نہیں ملتا۔ اس لئے ترقی کے بہت سے کام شروع نہیں کئے جا سکتے۔ ملک میں بنک کا کاروبار بہت کم پھیلا ہوا ہے دیسی ساہوکار انفرادی طور پر گراں شرح سود کے ساتھ زیادہ تر غیر دولت آفریں اغراض کے لئے قرضے دیتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ منتشر ہیں اور ایک شیرازہ میں باہم منسلک نہیں ہیں اس لئے کم سونے چاندی سے (اعتبار کے سہارے پر) زیادہ سرمایہ کا کام نہیں لے سکتے اور ایک ہی روپیہ کو چار مختلف کاموں میں بہ یک وقت نہیں لگا سکتے۔ انجمن ہائے امداد باہمی اور دیہی بنکوں کی توسیع

میں بھی سرمایہ کی کمی کی وجہ سے دشواریاں ہیں۔ پھر جو بنک کسی نہ کسی طرح قائم ہوتے ہیں وہ مشکل کے وقت سہارا نہ ملنے کی وجہ سے ختم ہو جاتے ہیں۔ قوم پرست ایک تو اس خرابی کو رفع کرنا چاہتے ہیں دوسرے وہ حکومت کی مبادلہ اور سکہ سازی کی پالیسی کو ہندوستان کی تجارت وصنعت کے لئے سخت مضر سمجھتے ہیں۔ وہ حکومت پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ گذشتہ تیں چالیس سال سے اُس نے دانستہ طور پر ہندوستانی سکۂ مبادلہ باہر سے روپیہ قرض لینے اور تمام بیرونی مطالبات کی ادائیگی کا انتظام اس طرح کیا ہے جس سے ملکی صنعتوں، تجارتوں اور محصول ادا کرنے والوں کو تو نقصان پہنچا ہے۔ مگر برطانیہ کے کاروبار کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ انھیں موجودہ حکومت پر بالکل بھروسہ نہیں ہے اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ جو کام اب حکومت کر رہی ہے وہ رزرو بنک کو سپرد کر دیا جائے۔

القصہ جہاں تک رزرو بنک کے محض مطالبہ کا تعلق ہے غیر ملکی سرکار اور سرمایہ دار اور ہندوستانی قوم پرست دونوں متحد الخیال ہیں۔ لیکن جب سوال یہ پیش ہوتا ہے کہ رزرو بنک کس طرح کا ہو تو اس میں رائے کا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کچھ کام تو ایسے ہیں جن سے دونوں کا مفاد وابستہ ہے اور کیسا ہی رزرو بنک کیوں نہ بنایا جائے اس میں نسبتی اہمیت کے اختلاف کے ساتھ وہ کام بہرحال کئے جائیں گے لیکن بہت سے ایسے اہم کام ہوں گے جن میں دونوں کے اغراض ومفاد میں بُعد المشرقین پایا جائے گا اور کسی قسم کی مفاہمت اور مصالحت کی گنجایش نہ ہوگی۔ جو چیز ایک طبقہ کے لئے غذا کا کام دے گی، دوسرے کے لئے زہر کی تاثیر رکھے گی۔ اس لئے جو دستورالعمل اور افسران وعملہ ایک طبقہ کے لئے پسندیدہ ہوگا دوسرے کے لئے اس کا پسندیدہ ہونا لازمی نہیں ہے۔ نئے قائم شدہ رزرو بنک کے دستورالعمل پر تو بعد میں بحث کی جائیگی یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے بنیادی مسائل سے واقفیت پیدا کرادی جائے جن کے بغیر رزرو بنک کے اغراض ومقاصد کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔

ساکھ کے کاروبار اور اجرائے سکہ میں باہمی ربط

ہم بیان کر چکے ہیں کہ عہد جدید کے کاروبار میں اعتبار کا عنصر بہت غالب ہے یعنی لوگوں کے زبانی وتحریری وعدوں کو کچھ عرصہ کے لئے اتنا ہی وقیع سمجھا جاتا ہے جتنا ٹھوس سونے اور چاندی کو۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ذرا سے شک وشبہ سے ساکھ کا سارا

کاروبار بیٹھ جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی بہت زیادہ محسوس کی جاتی ہے کہ اعتبار کی یہ عظیم الشان عمارت کسی مستحکم بنیاد پر قائم ہو تاکہ بے اعتماری کے معمولی جھکولوں کا تو کم سے کم بالکل اثر قبول نہ کرے۔ یہ مستحکم بنیاد کیا ہوسکتی ہے؟

سب سے زیادہ مستحکم تو وہ بنیاد ہوگی جو ہر جگہ، ہر وقت اور ہر حالت میں لوگوں کے اعتماد کو قائم رکھ سکے۔ ظاہر ہے اس حیثیت سے سب سے زیادہ مکمل سونا چاندی اور اس کے خالص اور بے میل سکے ہیں جو ہر ملک اور ہر زمانہ میں اپنی قدرذاتی کی وجہ سے عام طور پر ہر شخص کے لئے لائق قبول ہوتے ہیں۔ یہ تو سب سے زیادہ مستحکم بنیاد تمام ساکھ کی ہوسکتے ہیں۔ لیکن چونکہ سونے چاندی کی مقدار محدود ہے اور یہ دھاتیں قیمتی ہوتی ہیں اس لئے ان کے استعمال میں کفایت ضروری ہوتی ہے اور محض ان کی بنیاد پر کاروبار کو زیادہ وسیع نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی دوسری چیز اور تلاش کی جائے جس کی عام مقبولیت ملک سے باہر اگر نہیں تو کم از کم ملک کے اندر سونے چاندی کے قریب قریب ہو۔ تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سرکار یا مرکزی بنک کے نوٹوں کے قبول کرنے میں بھی عام طور پر لوگوں کو کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اور ملک میں یا جہاں جہاں ملکی سرکار اور اس کے مرکزی بنک کا ساکھ زیادہ ہے کاغذی نوٹ اپنی اعتباری قیمت پر چلتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ کاغذی نوٹ محض سونے چاندی کی نمایندگی کرتے ہیں اور ان کی مساوی قیمت کا سونا چاندی ہمیشہ سرکاری خزانوں یا بنکوں میں محفوظ ہوتا ہے ورنہ عموماً ان کی مساوی قیمت کا سونا چاندی سرکاری خزانوں اور بنکوں میں نہیں ہوتا۔ لیکن اتنا کافی سرمایہ محفوظ ان کی پشت پناہی کے لئے ضرور ہوتا ہے کہ انھیں بھی تقریباً سونے چاندی کی نمایندگی حاصل ہوتی ہے اور چونکہ سب آدمی بہ یک وقت اپنے کاغذی سکوں کے معاوضہ میں سونا چاندی طلب نہیں کرتے اس لئے سب اپنی ضرورت کے وقت ہمیشہ آسانی سے انھیں سونے چاندی میں منتقل کرسکتے ہیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ کاغذی سکوں کے جس حصہ کے لئے مساوی قیمت کا سونا چاندی خزانہ میں موجود نہیں ہوتا اس کی مقدار میں اضافہ حکومت یا بنک من مانے طریقہ پر کرسکتے ہیں کیونکہ اگر ایسا کریں تو ان کا کاغذی سکہ بازار میں کبھی بھی اُس نرخ پر نہ چل سکے جس پر سونے چاندی کے سکے چلتے ہیں۔ پبلک کی نگاہ میں جتنا اپنا ساکھ دیکھا جاتا ہے اتنا ہی نیا کاغذی

(اعتباری) سکہ جاری کیا جاتا ہے۔ پبلک کے ساکھ کا اندازہ سرکاری تمسکات کی فروخت سے کیا جاتا ہے جتنے تمسکات پبلک خریدتی ہے۔ اجرائے سکہ کے جمع قرض کے حساب میں ان کا شمار "جمع" میں اور نئے کاغذی نوٹوں کا "قرض" میں کیا جاتا ہے۔ جمع قرض کے حساب میں توازن رہنا نہایت ضروری ہے ورنہ نوٹوں کی کوئی قیمت نہ رہیگی۔ پھر چونکہ سرکار کا ساکھ عموناً بازار میں تمام دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے تمسکات کو سونے چاندی کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے اور انھیں "طلائی حاشیہ والے تمسکات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لئے جو نوٹ ان تمسکات کی ضمانت پر جاری کئے جاتے ہیں وہ ہر شخص کے لئے ایسے ہی قابل قبول ہوتے ہیں گویا ان کی پشت پناہی پر سونا چاندی موجود ہیں۔ غرضکہ یوں ساکھ کے کاروبار کی پوری عمارت سونے چاندی اور کاغذ کے سکوں پر کھڑی ہو جاتی ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ "ساکھ کی عمارت" کا کیا مفہوم ہے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ کاروباری لوگ جہاں تک ممکن ہے اپنا روپیہ پھنسانا نہیں چاہتے بلکہ اُسے گردش میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر کسی کو مال فروخت کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ کسی طرح فوراً نقد دام وصول کرلیں۔ اگر خریدار سے نقد دام فوراً وصول ہونے کا امکان نہیں دیکھتے تو کوشش کرتے ہیں کہ اس سودے کی ضمانت پر کسی تیسرے آدمی سے نقد روپیہ فوراً لے لیں یا کم از کم بازار میں اپنا اتنا اعتبار پیدا کرلیں کہ انھیں مال ادھار ملتا رہے تاکہ خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہے۔ یہ نہ ہو کہ ایک دو سودوں پر ہی انحصار کرکے کئی دن تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیکار بیٹھنا پڑے، مال کے روانہ کرنے، پہنچنے، وصول کرنے اور اس کے دام ادا کرنے میں وقت لگتا ہے۔ اگر اس وقت کا خیال کرکے فروشندہ منافع کی شرح میں اضافہ کرتا ہے تو خریدار مال خریدنے میں پس و پیش کرنے لگتا ہے اور اگر اضافہ نہیں کرتا ہے تو اپنی محنت اور روپیہ کے اتنے عرصہ تک بے کار رہنے کا فروشندہ کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے وہ اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اگر اپنے روانہ کئے ہوئے مال کی قیمت اُسے فوراً مل جائے یا اُس قیمت کے برابر بازار والوں میں اس کا ساکھ قائم ہو جائے تو وہ اپنے پورے مطالبہ میں تھوڑی سی کتر بیونت یعنی کٹوتی کو بھی گوارا کرے گا۔ اس سے

جو خفیف نقصان ہوگا اُس کی بہت زیادہ تلافی نئے خریداروں کو مال روانہ کرنے اور ایک ہی روپیہ سے اتنی مدت میں کئی سودے کرنے سے ہو جائے گی اور اس کے منافع کی مجموعی شرح بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ مطالبوں کی ادائیگی میں جو دیر لگتی ہے اور اس کی وجہ سے جو روپیہ ایک ہی سودے میں پھنس کر رہ جاتا ہے اُسے گردش میں لانے کی تدبیر ہر کاروباری شخص اپنی جگہ پر سوچتا ہے اور اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ مگر جو طریقہ عام طور پر ہر جگہ اختیار کیا گیا ہے وہ "ہنڈیوں کی کٹوتی" کا ہے۔ مقروض کے نام قرضخواہ کی جانب سے مطالبہ کی ادائیگی کے لئے جو تحریر لکھی جاتی ہے اس کا نام ہنڈی ہوتا ہے۔ ہنڈیاں "درشنی" اور "میعادی" دو طرح کی ہوتی ہیں۔ اگر مطالبہ کی ادائیگی فرمائش دیکھتے ہی کرائی جاتی ہے تو وہ "درشنی ہنڈی" کہلاتی ہے اور جو تین، چھ یا نو مہینے بعد کرائی جائے تو وہ "میعادی" کہلاتی ہے قرضخواہ یا ان کے دلال وغیرہ اپنی ہنڈیاں لے کر نکلتے ہیں اور ساہوکاروں یا بنکوں سے کہتے ہیں کہ اپنی کٹوتی کا حق کاٹ کر ہنڈی کے برابر نقد روپیہ انھیں دیدیں یا اس قدر روپیہ کا ہمارا ساکھ تسلیم کریں۔ بنک عموماً دوسری صورت اختیار کرتے ہیں۔ بنکوں کے یہاں قرضخواہوں کی امانتیں عموماً جمع ہوتی ہیں۔ ان کی امانت کے حساب میں اس رقم کا بھی اضافہ کر لیا جاتا ہے اور اس کے برابر مزید چیک جاری کرنے کی اجازت دیدی جاتی ہے قرضخواہوں کی ہنڈی جب بنک خرید لیتے ہیں تو فوراً اقرار ادائیگی کے لئے مقروض کے پاس روانہ کر دیتے ہیں اور جب مقروض اپنے دستخط کر کے اقرار کر لیتا ہے تو اگر ان کے پاس روپیہ فاضل ہوتا ہے تو تین، چھ یا نو مہینے تک جتنی ہنڈی کی میعاد ہوتی ہے خود انتظار کرتے رہتے ہیں ورنہ بڑے ساہوکاروں اور بنکوں کے ہاتھ جن کے پاس روپیہ فاضل ہوتا ہے اپنی شرح کٹوتی سے کم شرح پر کٹوتی کرا کے اس ہنڈی کو فروخت کر ڈالتے ہیں۔ لیکن ان بڑے بنکوں کے یہاں سے بھی عموماً نقد ادائیگی نہیں ہوتی بلکہ فروخت کرنے والوں کے امانت کے حساب میں یہ رقم درج کر لی جاتی ہے اور انھیں چیک جاری کرنے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تا آنکہ نوبت سب سے بڑے بنک تک پہنچتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ہنڈیوں کی کٹوتی کرنے کے بعد ان کی قیمت کی ادائیگی کے لئے چھوٹے بنکوں سے لے کر بڑے سے بڑے بنک عموماً ایک ہی طریقہ اختیار کرتے ہیں یعنی فروشندہ کو اپنے نام ہنڈی

کی رقم کے برابر چکوں کے جاری کرنے کی اجازت دیدیتے ہیں۔ اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فروشندہ کو تمام رقم کی فوراً ضرورت پیش نہیں آتی۔ رفتہ رفتہ وہ بنک کے نام چک جاری کرکے اس رقم کو وصول کرتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن کو چک دئے جائیں ان کا حساب بھی بنک میں ہو، اس لئے بنک کو انھیں نقد روپیہ ادا نہ کرنا پڑے اور ایک شخص کے حساب میں سے دوسرے کے حساب میں رقموں کے منتقل کرنے سے کام چل جائے پھر یہ بھی ہوسکتا ہو کہ لوگوں کو بنک پر اعتماد ہو اور اس کے نام جو چک ہو اُسے سرکاری نوٹ کے برابر وقیع سمجھتے ہوں اور اُسے فوراً نقد میں منتقل کرانا ضروری نہ سمجھتے ہوں بلکہ باہمی مطالبات کی ادائیگی کے لئے تھوڑے عرصہ کے واسطے آپس میں منتقل کرتے رہیں۔ ان تمام صورتوں میں بنک کو اپنے چک کے معاوضہ میں فوراً چاندی سونے کے سکّے یا نوٹ دینا نہ پڑیں گے اور وقتی طور پر خود اُس کے چک سکّوں کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن جلد یا بہ دیر لوگ سونے چاندی کے سکوں یا نوٹوں میں اپنے مطالبات کی ادائیگی کے خواہش مند ہوں گے۔ اب اگر بنک کے پاس سرمایہ محفوظ اتنا کافی ہوگا کہ وہ لوگوں کے مطالبات کو آسانی سے ادا کرسکے تو خود ادا کرے گا۔ ورنہ جو ہنڈیاں، دستاویزیں اور تمسکات وغیرہ اس کے پاس " جمع " کے طور پر ہوں گے اُن کے رہن، فروخت یا کٹوتی کرانے کی فکر کرے گا۔ اس کام کے لئے چھوٹے بنک عموماً بڑے بنکوں کے پاس جاتے ہیں۔ اب اگر ان کا اعتبار بڑے بنک کے یہاں اچھا ہے اور بڑے بنک کو روپیہ کی خود زیادہ ضرورت نہیں ہے تو انھیں سونے چاندی کے سکّے یا نوٹ مل جائیں گے ورنہ اُنھیں اپنی کٹوتی کی شرح میں اضافہ کرکے اپنے کاروبار کو محدود کرنا پڑے گا اور بہت سے ایسے لوگ جو نفع بخش اور معقول کاروبار میں روپیہ لگانا چاہتے ہوں گے اپنی ہنڈیاں فروخت نہ کرسکیں گے۔ ان تاجروں اور کاروباری لوگوں کے حوصلے دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جائیں گے۔ وہ کام پھیلانا اور بڑھانا چاہیں گے۔ ان کے پاس ضمانت معقول ہوگی لیکن نہ بڑھا سکیں گے۔ ان حالات میں اگر بنک اصول حزم واحتیاط کو چھوڑ کر، اپنے سرمایہ محفوظ کے تناسب کا خیال کئے بغیر ہنڈیاں کم شرح پر خریدنا جاری رکھیں گے اور ان کے ذمہ مطالبے بڑھتے جائیں گے اور جب ان سے نقد روپیہ طلب کیا جائے گا یہ نہ دے سکیں گے تو ان پر مصیبت کا وقت آجائے گا اور دوالہ نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہوجائے گا

یہی حال درجہ بہ درجہ نسبتی فرق مراتب کے ساتھ تمام بنکوں کا ہوگا۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوا کہ ہنڈیوں کے کٹوتی کے سلسلہ کو عافیت اور اطمینان سے اُسی وقت توسیع دی جاسکتی ہے جب سونے چاندی کے سکوں اور نوٹوں کی مقدار میں جن پر اعتبار کی پوری عمارت کھڑی کی جاتی ہے اضافہ کیا جائے۔ سونے چاندی کے سکوں کی مقدار میں تو مالی دشواری کی وجہ سے وقت کے وقت آسانی سے اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن نوٹوں کی مقدار میں اگر سرکار یا نوٹ جاری کرنے والا ادارہ منڈی کی ضرورت کی طرف توجہ کرے تو سہولت کے ساتھ اضافہ ممکن ہے۔

گھبراہٹ اور تجارتی بحران کے دنوں میں جب بے اعتباری کی وبا پھیلتی ہے اور ہر شخص سونے چاندی یا نوٹوں کی شکل میں ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے اس وقت تو نوٹ جاری کرنے والے ادارے کا اگر اُسے یہ معلوم ہو کہ ساہوکاروں اور بنکوں کا روپیہ معقول کاروبار میں پھنسا ہوا ہے یہ ایک اخلاقی فرض ہو جاتا ہے کہ ان کی ہنڈیوں کو خریدے اور ان کی ضمانت پر نئے کاغذی سکہ کو جاری کرے کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو ہزاروں تاجروں اور بنکوں کا دوالہ نکل جائے گا اور ملک کے اعتباری کاروبار کو سخت صدمہ پہنچے گا۔

اس لئے اعتبار کی عمارت کو صحیح بنیاد پر قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اجرائے سکہ اور ساہوکارے میں یکجہتی اور ہم آہنگی ہو۔ سکہ جاری کرنے والے ادارے کو منڈی سے قریبی تعلق اور وابستگی ہو۔ وہ اُس کی ضروریات کا اندازہ اور تخمینہ کرسکے اور سکہ کی مقدار میں حسب ضرورت کمی بیشی کرسکے۔ یہ اُس وقت ہی ممکن ہے جب ایک ہی ادارے کے ذمہ دونوں انتظام سپرد کئے جائیں یعنی ایک ہی مرکزی بنک ساہوکارے کے اعلیٰ کام اور اجرائے سکہ کے فرائض کو انجام دے۔

اس سے ایک دوسرا بڑا فایدہ اور بھی ہوگا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ساہوکارے کے کام کو اطمینان سے کرنے کے لئے سرمایہ محفوظ جمع رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اعتباری سکہ کے لئے بھی سرمایہ محفوظ جمع رکھا جاتا ہے۔ اگر یہ دونوں سرمایہ ہائے محفوظ ایک مرکزی جگہ پر رہیں گے تو دونوں کو ایک

دوسرے سے تقویت ہوگی اور ساہوکارے اور اجرائے سکہ کے کام زیادہ مستحکم بنیاد پہ کئے جاسکیں گے۔
ساکھ کے کاروبار اور اجرائے سکہ کے کام میں باہمی ربط دکھانے کے بعد اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ ہندوستان میں اب تک صورت حال کیا رہ چکی ہے۔ یہاں ان دونوں کاموں میں کس قدر یکجہتی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے کن اداروں کو یہ کام اب تک سپرد رہے ہیں اور یہاں کے انتظام میں کس قسم کی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے ایک نئے ادارے یعنی رزرو بنک کا قیام بہت ضروری ہوگیا ہے۔ (باقی)

انقلابی جماعت اور عوام

۱۷۸۹ء اور ۱۸۷۰ء کی درمیانی مدت میں، فرانس کی حکومت سخت انقلاب انگیز دور سے گذرتی رہی متعدد خانہ جنگیاں ہوئیں، کبھی کسی طبقہ کو عروج نصیب ہوا کبھی کسی کو۔ الغرض جو قتل و غارتگری، تباہی و بربادی، اس عہد میں حریت فکر، اصلاح نوع انسانی اور امن و سکون عالم کا نام لے لے کر محارب فریقین نے جایز رکھی وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ پیرس کے لوگ فطرتاً جلد مشتعل اور جنگ کے لئے فوراً طیار ہو جانے والے واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے پیرس کے چوراہوں، سڑکوں اور گلیوں پر، اینٹ پتھر، لوہا لکڑی، خاک دھول وغیرہ وغیرہ کے انبار لگا لگا کر متعدد مار مضبوط سدیں (BARRICADES) بنائی گئیں اور باقاعدہ فوجی طریقہ پر محصور ہو کر، حکومت وقت کی فوجوں سے، انقلاب پسند جماعتوں نے جنگ کی۔ ہرچند اکثر دفعہ ان کو ناکامی ہوئی لیکن جب وہ کامیاب ہوئیں تو انھوں نے حکومتوں کو درہم برہم کر ڈالا۔

وکٹر ہیوگو فرانس کا ایک نہایت مشہور فلسفی ادیب ہوا ہے۔ اُس نے اسی انقلابی دور کے ماحول میں اپنی زندگی کے بہت سے ایام بسر کئے تھے اور اس وقت کی بعض تحریکوں میں بھی عملی حصہ لینے کا اُسے موقع ملا تھا۔ اُس نے اس انقلابی عہد کے بعض واقعات کا نقشہ اپنے ناولوں میں کھینچا ہے۔ اس کے ایک ناول لامزرایبل کے بعض انتخابات کو ہم اس جگہ درج کرتے ہیں تاکہ اس دور کی انقلابی ذہنیت اور دیگر خصوصیات کا اندازہ، ایک فلسفی ادیب کے نقطۂ نگاہ سے ناظرین جامعہ بھی کرسکیں۔

جون ۱۸۳۲ء میں، پیرس کی شنواری سڑک پر باغی جن کی تعداد ۲۰ تھی ایک سد بنائے ہوئے محصور ہیں۔ حکومت وقت کی فوجیں ان کی سرکوبی کے لئے مستعد ہیں۔ رات ختم ہوگئی ہے۔ صبح نمودار ہونے والی ہے۔ اندرون حصار کی فضا کا نقشہ کھینچتے ہوئے، وکٹر ہیوگو ایک جگہ لکھتا ہے:-

انقلاب پسند جماعت کے دل امیدوں سے لبریز تھے کیونکہ رات کے حملہ کی جس طرح انھوں نے

مدافعت کی تھی اس سے ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں اور دن نکلتے ہی جو حملہ ہونے والا تھا اس کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے ۔ وہ حملہ کا انتظار کر رہے تھے اور مسکرا رہے تھے ۔ انھیں اپنی کامیابی کا اتنا ہی یقین تھا جتنا کہ اپنے مقصد کی صداقت کا ۔ علاوہ ازیں، انھیں کمک کے آنے کی بھی امید تھی اور اس امید سے انھیں بہت تقویت حاصل تھی ۔ فرانس کی خصوصیت ہے کہ جب وہ مصروف پیکار ہوتی ہے تو صدور جہ خوش دلی کے ساتھ اپنی کامیابی کی بھی پیشین گوئی کر لیتی ہے، چنانچہ انھوں نے بھی آنے والے دن کو، تین حصوں میں تقسیم کر کے سمجھ لیا تھا کہ صبح چھ بجے وہ رجمنٹ آ جائیگی جسے انقلاب میں شریک ہونے کے لئے ہموار کیا جا چکا تھا ۔ دو پہر کو تمام پیرس میں شورش برپا ہو جائے گی اور غروب آفتاب کے وقت تک انقلاب مکمل ہو جائے گا سینٹ میری کے گھنٹے کی آواز انھیں سنائی دے رہی تھی جو اس بات کا قطعی ثبوت تھی کہ دوسری سد، (جین کی) جو نسبتاً بڑی بھی تھی، ابھی تک مقابلہ کرنے میں کامیاب تھی ۔

یہ نیک فالیں ایک گروہ سے دوسرے گروہ تک، نہایت خوشی اور مسرت کے ساتھ پہنچائی جا رہی تھیں کہ انجولراس باغیوں کا سردار نمودار ہوا ۔ وہ حصار سے باہر، اندھیرے میں گھوم پھر کر واپس آیا تھا ۔ تھوڑی دیر تک، وہ اپنے ساتھیوں کی پُرمسرت گفتگو کو سنتا رہا ۔ پھر طلوع آفتاب کی بڑھتی ہوئی روشنی میں، جس نے اس کے چہرے کو سرخ و شاداب بنا دیا تھا اس نے کہا:۔

"پیرس کی تمام فوج باہر آگئی ہے ۔ اس فوج کا ایک تہائی حصہ، اس سد پر حملہ کرنے کی طیاری کر رہا ہے جس کے پیچھے تم ہو ۔ قومی محافظ دستہ بھی موجود ہے ۔ ایک گھنٹہ میں تمھارے اوپر حملہ کیا جائیگا عوام جو کل تک پورے جوش سے کام لے رہے تھے آج صبح سے بالکل سرد ہیں ۔ انتظار اور امید کی کوئی صورت نہیں ۔ نہ کوئی رجمنٹ مدد کو آئیگی اور نہ کوئی راہ مفر کی دکھائی دے گی ۔ تم سے سب نے منہ موڑ لیا ہے ۔

یہ سن کر آپس کی گفتگو سے جو ایک بھنبھناہٹ سی فضا میں پائی جاتی تھی وہ دفعتہً بند ہو گئی ۔ سب پر ایک سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی ۔ ایک ناقابل بیان خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا موت کا فرشتہ ابھی یہاں سے اڑ کر گیا ہے ۔ لیکن یہ حالت صرف ایک لمحہ تک قائم رہی اور اس کے

بعد ایک نہایت معمولی اور ناقابل التفات گروہ میں سے ایک آواز نے، انجولراس کو مخاطب کرکے کہا :-

" ایسا ہے تو یہی سہی۔ بھائیو! ہمیں زبان سے نہیں بلکہ اپنے بے جان جسموں سے احتجاج کرنا چاہئے اور دنیا پر یہ ظاہر کردینا چاہئے کہ اگر عوام نے ہم سے منہ موڑ لیا ہے تو خیر، احرار عوام سے کبھی منہ نہیں موڑ سکتے۔

ان الفاظ نے انفرادی تفکرات کے تکلیف دہ بادل کو یکقلم فنا کردیا اور ایک پُرجوش نعرہ کی ساتھ سب نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ اس آدمی کا نام کسی کو نہ معلوم ہوسکا جس نے یہ فیصلہ کن الفاظ کہے تھے وہ کوئی غیر معروف معمولی آدمی تھا، ایک فراموش کردہ انسان، ایک وقتی ہیرو، ایسا لامعلوم شخص جو انسانی نازک ترین لمحات پر، ایک خاص موقع پر، ایک خاص انداز بلند کے ساتھ، وقت کے مناسب حال جو فیصلہ کن نقطہ ہوتا ہے کہ گذرتا ہے اور اس کے بعد تاریکی میں غائب ہوجاتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے وہ بجلی کی طرح چمک کر خدا اور مخلوق کی نمایندگی کرتا ہے اور پھر فنا ہوجاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے اس قسم کا عزم راسخ، ۶ جون ۱۸۳۲ء کی فضا کے ذرہ ذرہ پر مسلط تھا۔ کیوں کہ ٹھیک اسی وقت سینٹ میری کی سد میں، وہاں کے محصور باغیوں نے، ایک ایسی ہی آواز بلند کی، جس نے تاریخی حیثیت اختیار کرلی۔ وہ آواز یہ تھی جسے باغیوں کے مقدمہ کی سماعت کے وقت شہادت کے طور پر قلمبند کیا گیا تھا۔" وہ ہماری مدد کو آئیں یا نہ آئیں، یہ ان کی خوشی ہے۔ ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہمارا راستہ کھلا ہوا ہے ہم سب کو ایک ایک کرکے یہیں فنا ہوجانا ہے ؟"

اس واقعہ سے ہم کو پتہ چلتا ہے کہ گو بظاہر یہ دونوں سدیں، مادی طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کردی گئی تھیں لیکن پھر بھی ان میں روحانی گفت وشنید جاری تھی ؟

سد کی کیفیت نزع شروع ہونے والی تھی۔ اس موقع کے المناک تجمل وشوکت کو ہر چیز بڑھا رہی تھی۔ ہوا کی ہزاروں پُراسرار صدائیں، جو سڑک پر، اس مسلح ہجوم کی آمد ورفت سے پیدا ہوتی تھیں جسے سد کے اندر سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں جو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد صاف سنائی

دیتی تھیں۔ توپخانہ کی بھاری گڑگڑاہٹ، پلٹن کی بندوقوں کی آوازیں اور توپوں کے دغنے کی صدائیں جو شہر پیرس کی بھول بھلیوں میں گونجتی تھیں۔ جنگ کے دھوئیں کا اٹھنا جو چھتوں کے اوپر بالکل سنہرا نظر آتا تھا۔ پُراسرار چیخیں جو دور سے صاف سنائی نہ دیتی تھیں اور اس لئے اور زیادہ بھیانک معلوم ہوتی تھیں۔ خطرات کا، بجلی کی چمک کی طرح تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد نمودار ہونا۔ سینٹ میری کے الارم سگنل کی آواز جواب بالکل ایک سسکی کی طرح سنائی دیتی تھی۔ موسم کا اعتدال، آسمان کا، دھوپ اور بادلوں کی وجہ سے ایک دلفریب شان سے نظر آنا۔ دن کا حسن اور مکانوں کی وحشت زا خاموشی، ان سب سے ایک شاندار ٹریجڈی کی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا۔

مکانوں کی وحشت زا خاموشی کا سبب یہ تھا کہ گذشتہ شام سے شنواری سڑک کے دونوں کناروں پر جو مکانوں کی قطاریں تھیں وہ بالکل دور ندہ صفت دیواریں بن گئی تھیں۔ ان کے دروازے، کھڑکیاں اور روشندان سب بالکل بند کر لئے گئے تھے۔ وہ دن اس دن سے مختلف تھا جس میں کہ ہم زندگی گذار رہے ہیں۔ ہمارے سامنے جو انقلاب ہوا، اس کے لئے وقت آگیا تھا۔ اس لئے جب لوگ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے اٹھے جو ضرورت سے زیادہ عرصہ تک قائم رہ چکی تھی اور جسے "عطا شدہ پروانہ آزادی" اور "دستوری حکومت" کے منافقت آمیز ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا تو اس وقت فضایں عالمگیر غیظ و غضب پھیلا ہوا تھا۔ سڑکیں جب کھودی گئیں، شہر والوں نے اظہار رضامندی کیا۔ تجارت پیشہ طبقہ نے مسکرا مسکرا کر آزادی کا ترانہ، دبی زبان سے گایا۔ باشندوں نے جن کے رگ و ریشہ میں بغاوت کا نشہ سرایت کر گیا تھا، باغیوں کو پناہ دی اور مکانوں نے ان وقتی اور عارضی قلعہ نما سدوں کے ساتھ، جو ان کے سہارے سے تعمیر کی گئی تھیں، اظہار اخوت کیا۔ لیکن جس وقت کا اس جگہ ہم ذکر کر رہے ہیں، اس وقت زمانہ کا میلان انقلاب کی طرف نہیں تھا اس لئے بغاوت فیصلہ کن طریقہ پر اختیار نہیں کی گئی۔ عوام نے تحریک سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور باغیوں کی جماعت بے یار و مددگار رہ گئی۔ باغیوں کے چاروں طرف جو گنجان آبادی بسی ہوئی تھی وہ ایک سنسان ریگزار کی مانند ہوگئی۔ دلوں میں سردی پیدا ہوگئی۔ مکانوں کے دروازے اس طرح مقفل ہوئے کہ دیوار بن گئے۔ اور سڑک ایک ایسی وادی بن گئی جس کی پُرسکون اور ہموار سطح سے گذر کر، فوج

اطمینان سے، سد پر حملہ آور ہوسکی۔

عوام کو اچانک اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش سے زیادہ اپنی رفتار میں تیزی پیدا کریں۔ جو کوئی بھی اس قسم کا قصد کرے گا اس کا انجام عبرتناک ہوگا۔ عوام اس کے کبھی روادار نہیں ہوسکتے۔ ایسی صورت میں وہ باغیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور خود بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ باغی کوڑھیوں کی مانند ہو جاتے ہیں جن سے ہر شخص گھن کرنے لگتا ہے۔ ان کے لئے مکانات، ساحل کی مضبوط چٹانیں بن جاتے ہیں۔ دروازے، انکار کی مجسم تصویریں سڑک کی طرف مکان کا جو رخ ہوتا ہے وہ ایک ٹھوس دیوار نظر آتا ہے۔ یہ دیوار دیکھتی ہے، سنتی ہے لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ یہ کھل سکتی ہے اور چاہے تو پناہ دے سکتی ہے، لیکن ایسا نہیں کرتی۔ یہ دیوار عدالت کا ایک جج بن جاتی ہے یہ دیکھتی ہے اور موت کا حکم سناتی ہے۔ یہ بند مکانات کس قدر ہوش ربا منظر پیش کرتے ہیں۔ وہ مردہ معلوم ہوتے ہیں درآنحالیکہ وہ زندہ ہوتے ہیں۔ زندگی، جو یہ معلوم ہوتا ہے، سکتہ کے عالم میں ہے ان سے لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ چوبیس گھنٹے گذر گئے ہیں کوئی ان مکانوں سے باہر نہیں نکلا۔ لیکن ان مکانوں سے کوئی غائب بھی نہیں ہوا۔ اس مکان کے اندرونی حصہ میں جو باہر سے بالکل ویران معلوم ہوتا ہے لوگ چلتے پھرتے ہیں، سوتے جاگتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں غرضکہ مکان کے اندر رہ کر جس قدر کام کئے جاتے ہیں، سب کرتے ہیں لیکن وہ سہمے ہوئے ہوتے ہیں جو بجائے خود ایک خوفناک چیز ہے۔ اپنی اس سنگین غیر مہمان نوازی کے لئے وہ خوف و دہشت کا ہی عذر پیش کرتے ہیں جس میں بزدلی بھی شامل ہے جو جرم کی نوعیت کو اور بھی زیادہ قابل معافی بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ خوف ایک جذبہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خوف کو اس طرح غضب میں تبدیل کر سکتے ہیں جیسے عاقبت اندیشی کو غصہ میں۔ اور اسی بنیاد پر "جنون اعتدال پسندی" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ انتہائی خوف کی بجلیوں میں سے بعض وقت غصہ کا جذبہ، ایک سوگوار دھوئیں کی مانند بلند ہوتا ہے اور عوام جواب طلب کرنے لگتے ہیں۔ "یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ انھیں کسی بات سے تسکین ہی نہیں ہوتی۔ یہ امن پسند آبادی کو بدنام کرتے ہیں۔ کیا اس قسم کے مہمل انقلابات دیکھتے دیکھتے ہم تھک نہیں گئے ہیں؟ یہ لوگ یہاں مرنے کیوں آئے ہیں؟ جس طرح آئے ہیں اگر ہمت ہے تو اسی طرح

نکل ہی جائیں ۔ یہ سب ان کا ہی تصور ہے جس سزا کے یہ مستحق ہیں وہ انھیں مل رہی ہے ۔ سڑکوں کو دیکھو کس طرح توپ کے گولوں سے چھلنی ہو گئی ہیں ۔ یہ سب کے سب متعفن اور امن شکن ہیں ۔ ہم کبھی ان کے لئے اپنے مکان کے دروازے نہ کھولیں گے ۔" مکان ایک مقبرہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ باغی سسک سسک کر دروازے کے سہارے دم توڑتے ہیں ۔ وہ گراب کی باڑھوں اور ننگے نیزوں کو اپنی سمت بڑھتے دیکھتے ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم چلائیں گے تو لوگ ہماری آواز سن سکیں گے لیکن ہماری مدد نہ کریں گے ۔ ایسی دیواریں ہیں جو اپنی آغوش میں انھیں پناہ دے سکتی ہیں ۔ ایسے آدمی ہیں جو انھیں بچا سکتے ہیں ۔ ان دیواروں میں گوشت کے کان بھی ہیں مگر ان مکانوں کے رہنے والوں کے جگر پتھر بن گئے ہیں ۔

ہم اس کے لئے الزام کسے دیں ؟ سب کو اور کسی کو بھی نہیں ۔ قابل الزام وہ نالائق عہد ہے جس میں ہم زندگی گذارنے پر مجبور ہیں ۔ وہ لوگ جو دنیا کو جنت بنا دینے کا خواب دیکھتے ہیں جب کبھی اپنے آپ کو بغاوت کے لئے آمادہ کرتے ہیں اور ان کا فلسفیانہ احتجاج ایک مسلح احتجاج کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ علم کی دیوی کی پوجا کرتے کرتے جب کبھی وہ جنگ کے دیوتا کے پجاری بن جاتے ہیں تو اس جدید صورت حال سے جس قدر خطرات پیدا ہوتے ہیں ان سب کی ذمہ داری انھیں پہ عاید کی جا سکتی ہے ۔ دنیا کو جنت بنانے کا حوصلہ رکھنے والے جب بے صبر ہو کر بغاوت کی راہ اختیار کرتے ہیں تو جانتے ہیں کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے تقریباً ہمیشہ یہ وقت سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں اور جب انھیں اس کا احساس ہوتا ہے تو سر تسلیم خم کر کے، خندہ پیشانی سے فتح کی جگہ تباہی و بربادی قبول کر لیتے ہیں ۔ بغیر شکایت کا حرف زبان پر لائے ہوئے یہ خدمت کرتے ہیں ۔ انھیں معاف کر دیتے ہیں جو ان سے انحراف کرتے ہیں اور ان کی بلندی و عظمت اسی میں ہے کہ بے یار و مددگار ہونے پر بھی راضی برضا ہیں ۔ یہ موانع کے مقابلہ میں سرکش ہیں اور احسان فراموشی کے سامنے مسکین و مہربان ۔

لیکن کیا ان کا ساتھ نہ دینا واقعی احسان فراموشی ہے ؟ اگر ہم نسل انسانی کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو جواب ہمیں اثبات میں دینا پڑے گا اور جو شخص ایک فرد کے نقطہ نگاہ سے تو نفی میں ۔

ترقی انسان کی امتیازی سرشت ہے ۔ نسل انسانی کی مشترکہ حیات اور نسل انسانی کا مجموعی

اقدام ترقی کہلاتا ہے۔ ترقی سفر کرتی ہے۔ اس کا عظیم الشان انسانی اور دنیاوی سفر، اعلیٰ علیین اور خالق کون ومکاں کی جانب ہے۔ یہ ٹھہرتی ہے تاکہ گم شدہ بھیڑوں کو یکجا جمع کرے۔ اس کے مقامات ہوتے ہیں جہاں وہ کنعاں کی طرح ایسے نظاروں کے مشاہدہ کے لئے رکتی ہے جو افق پر ملکیت نمودار ہوجاتے ہیں۔ اس کی راتیں ہوتی ہیں جب وہ سوجاتی ہے اور جب ترقی مصروف خواب ہوتی ہے اس وقت اہل فکر و نظر، روح انسانی کے ان تاریک سالوں کو دیکھ کر جانگسل تفکرات میں مبتلا رہتے ہیں اور پھیلی ہوئی تاریکی میں ٹٹولتے پھرتے ہیں کہ کسی طرح ترقی کو بیدار کریں لیکن ناکام رہتے ہیں۔

ایک دن گرارڈ دی نرول نے ان سطور کے مصنف سے کہا کہ "خدا شاید مرگیا ہے"۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر خدا اور ترقی کے فرق کو مخلوط کردیا اور اپنی ناوانستگی میں سلسلہ ترقی کے ٹوٹ جانے کو خدا کی موت سے تعبیر کیا۔ لیکن اس قسم کی مایوسی سخت غلطی ہے۔ ترقی ہمیشہ دوبارہ بیدار ہوتی ہے اور طولانی قصہ کو مختصر کرکے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سوتے سوتے بھی حرکت کرتی رہتی ہے۔ کیونکہ اس کے حجم میں ہمیں اضافہ نظر آتا ہے اور جب وہ بیدار ہوکر کھڑی ہوجاتی ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قد طویل ہوگیا ہے دریا کی طرح ترقی کو بھی ہم کبھی پُرسکون نہیں کہہ سکتے۔ ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کرو۔ ترقی کے سامنے کوئی چٹان کھڑی نہ کرو کیونکہ رکاوٹ سے پانی میں جھاگ پیدا ہونے لگتا ہے اور انسانیت موانع ترقی کے مقابلہ میں اُبلنا شروع کردیتی ہے۔ اسی وجہ سے فسادات رونما ہوتے ہیں۔ لیکن ان فسادات کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک راہ نکل آئی ہے۔ جب تک کہ امن وامان قائم نہ ہو اور یہ صرف عالمگیر امن سے ممکن ہے جب تک ہم آہنگی اور یکجہتی کا دور دورہ نہ ہو ترقی کے لئے برابر انقلابات ہی منازل کا کام دیتے رہیں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترقی کیا ہے۔ ہم نے ابھی کہا تھا کہ یہ جمہور کی حیات ابدی ہے۔ تو پھر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ افراد کی وقتی زندگی نسل انسانی کی اس دائمی حیات سے مقابلہ پر آمادہ ہوجاتی ہے لیکن ہمیں بلا کسی قسم کی تلخی کے اس بات کا اعتراف کرلینا چاہئے کہ افراد کے مفاد کو ایک امتیازی نوعیت حاصل ہے اور اس مفاد کے قیام و محافظت کا حق ان سے کسی طرح نہیں چھینا جاسکتا۔ عہد حاضر کی انانیت لائق عفو ہے۔ وقتی زندگی کے بھی ایسے مطالبات ہوسکتے ہیں جنھیں مستقبل کے لئے ہمیشہ قربان نہیں کیا جاسکتا۔

چونکہ اس وقت کرۂ ارض سے گذر رہی ہے اُسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ آیندہ نسلوں کے لئے جو رتبہ میں بہر حال اس کے مساوی ہیں اور جن کی باری کچھ عرصہ بعد آئیگی، اپنی زندگی کو مختصر کردے۔ وہ جس کا نام "ہر شخص" ہے شکایتانہ لہجہ میں کہتا ہے :- "میں زندہ ہوں، میں جوان ہوں، مجھے اپنے محبوب سے الفت ہے۔ میں بوڑھا ہوں مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ میں ایک خاندان کا سرپرست ہوں۔ میں محنت کرتا ہوں مجھے خوش حالی نصیب ہوتی ہے۔ میرا کاروبار کامیاب ہے۔ میرے مکان کرایہ پر اُٹھتے ہیں، میرا روپیہ گورنمنٹ کی دستاویزوں میں لگا ہوا ہے۔ میں خوش ہوں۔ میری بیوی ہے بچے ہیں۔ مجھے یہ سب چیزیں عزیز ہیں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے چین سے جینے دو" اور اس کے یہ کہنے سے نسل انسانی کے پُر شکوہ ہراول پر ایک سرد مہری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں دنیا میں جنت بنانے کا حوصلہ رکھنے والے، جنگ میں مصروف ہو کر، اپنے زریں ماحول سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ آنے والی صداقت، اپنے حصول، مقصد کے لئے، گذرے ہوئے از بس خونی جنگ میں اپنے ذرایع کامیابی تلاش کرتی ہے۔ مستقبل، ماضی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ پاک خیال، عمل کے موقع پر ناپاک ہٹ دہرمی اور زور و زبردستی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جنت بنانے کا خواب دیکھنے والے اپنی شجاعت اور مردانگی کو تشدد پسندی سے اس قدر پیچیدہ بنا لیتے ہیں کہ انھیں فساد برپا کرنے کے الزام کی جواب دہی کرنا پڑتی ہے۔ ہر چند یہ تشدد ان کے اصول کے خلاف ہوتا ہے لیکن پھر بھی موقع اور محل کی مناسبت سے اختیار کیا جاتا ہے اور اس کی جو مہلک ترین سزا ہے اُسے بھی انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دنیا میں جنت بنانے کا حوصلہ کرنے والے جب بغاوت کرتے ہیں تو لڑائی کے وقت قانون جنگ کی پرانی روایات کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ مخبروں کو وہ گولی سے اُڑا دیتے ہیں۔ دغابازوں کو وہ قتل کر دیتے ہیں۔ زندہ آدمیوں کو وہ دفن کر دیتے ہیں اور انھیں بے تھاہ تاریکیوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ وہ موت کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں جو بہت ہی سخت چیز ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ روشنی کی نشر و اشاعت سے دست بردار ہو گئے ہیں حالانکہ ان کی غیر محدود اور لازوال طاقت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ یہ تلوار سے ضرب کاری لگاتے ہیں لیکن تلوار ایک پیچیدہ ہتھیار ہے جس کی دو دھاریں ہوتی ہیں اگر ایک دھار سے

آدمی اپنے حریف کو زخمی کرتا ہے تو دوسرے سے خود بھی زخمی ہو جاتا ہے۔

بغاوت کے اس رخ کو دکھانے کے بعد جو کافی کریہ المنظر ہے اور جس کے ظاہر کرنے میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اب ہمارے لئے یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدح و ستائش نہ کریں جو مستقبل کے لئے لڑتے ہیں اور دنیوی جنت کو فضائے خیال سے عالم آب و گل میں منتقل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی فتح و شکست سے بحث نہیں ہے۔ ان کی شکست بھی لائق احترام ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ شکست میں ہی ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ جب ترقی کے نصب العین کے مطابق فتح حاصل ہوتی ہے تو وہ عوام کی تحسین و آفریں کی مستحق ہوتی ہے۔ لیکن شاندار مقابلہ کے بعد بہادرانہ شکست ان کی ہمدردی اور دلسوزی کی طلبگار ہوتی ہے۔ اول الذکر میں شان ہے مؤخر الذکر میں رفعت۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم شہادت کو فتح پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جان براؤن، واشنگٹن سے بہتر ہے اور پسا کین، گیری بالڈی سے۔ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہونا چاہیئے جو مفتوحوں کی طرفداری کر سکے۔ لوگ مستقبل کے ان معماروں کے ساتھ جب وہ ناکام رہتے ہیں سخت غیر منصفانہ سلوک کرتے ہیں۔

انقلاب پسندوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ خوف و دہشت کا بیج بوتے ہیں۔ ان کے نظریے لائق تعزیر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے مقاصد کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے ایسے خیالات کی طرف سے بھی اندیشہ کیا جاتا ہے جن کے پیدا ہو جانے کا بعد کو امکان ہے اور ان کے ضمیر کی سچائی کو کذب و ریاکاری سمجھا جاتا ہے۔ انہیں اس بات پہ ملامت کی جاتی ہے کہ وہ حکمراں اجتماعی حقیقت کے مقابلہ میں رنج و غم غصہ و مایوسی، ظلم و غیر انصافی کے انبار اور تودے کھڑے کر رہے ہیں اور تاریکی کی چٹانیں اکھاڑ اکھاڑ کر سدیں بناتے ہیں تاکہ ان کے پیچھے کھڑے ہو کر لڑ سکیں۔ لوگ ان سے چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ تم دوزخ کا منہ کھول رہے ہو۔ لیکن اس کا جواب وہ یہ دے سکتے ہیں کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بہترین صورت تو یہ ہے کہ معاملات کا تصفیہ پُرامن طریقہ پر کیا جائے۔ لیکن اس طریقہ کو قابل عمل بنانا بالکل ہیئت اجتماعی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ چاہے تو تشدد کو روک سکتی ہے اور پھر ایسے علاجوں کی لوگ جستجو نہ کریں جن میں قتل و خونریزی شامل ہوتی ہے۔ تلطف اور مہربانی سے اگر خرابی اور شکایت کا مطالعہ

اور تعین کیا جائے اور اس کے دفعیہ کی تدبیریں کی جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ لوگ امن شکن طریقے اختیار کریں ہئیت اجتماعی سے یہ ہماری پُرزور استدعا ہے کہ وہ اسی اصول پر عمل کرے۔

بہرکیف، ایسے سب لوگ اپنی شکست میں بھی بلکہ شکست میں خصوصیت کے ساتھ اور زیادہ، بزرگ و برتر ہیں۔

تمام اکناف عالم کے احرار فرانس پر نگاہ جمائے ہوئے ہیں۔ نصب العین کی اٹل منطق ان کے ساتھ ہے اور اپنی عظیم خدمت کو پورا کرنے میں وہ منہمک ہیں۔ وہ اپنی حیات کا پاک تحفہ ترقی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ خدائی مشیت پوری کرتے ہیں اور ایک مذہبی فریضہ انجام دیتے ہیں۔ وہ مقررہ وقت پر اسی لاپرواہی کے ساتھ جس طرح کہ تھیٹر کا ایک ایکٹر منیجر کے اشارہ پر کام کرتا ہے، یزدانی پس پردہ آواز پر لبیک کہتے ہوئے قبر میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس یاس افزا جنگ اور پُرسکون فنا کو وہ اس لئے قبول کرتے ہیں تاکہ جولائی ۱۷۸۹ء میں جو عالیشان بے پناہ انسانی تحریک شروع کی گئی تھی وہ شاندار، پُرشوکت اور عالمگیر انجام تک پہنچا دی جائے۔

گذشتہ ابواب میں جو مختلف امتیازی فرق ہم نے نمایاں کئے ہیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک اور کا بھی اضافہ کیا جائے۔ بغاوتیں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جو قبول عام کا شرف حاصل کرلیتی ہیں اور انقلاب کہلاتی ہیں اور دوسری وہ جو رد کردی جاتی ہیں اور فتنہ و فساد کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ بغاوت کا پھیلنا، انقلاب انگیز خیالات کا گویا ایسے امتحان میں کامیاب ہونا ہے جس میں کہ عوام ممتحن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر عوام بغاوت سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں تو بغاوت ایک مرجھائے ہوئے پھول کی مانند ہو جاتی ہے اور سڑک کے بلوہ کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

دنیا میں جنت بنانے کا حوصلہ رکھنے والے جب چاہیں اور جس وقت اپیل کریں یہ ضروری نہیں ہے کہ عوام اسی وقت بغاوت کے لئے طیار ہو جائیں۔ قوموں کی رگوں میں شہیدوں اور ہیروؤں کا خون ہر وقت موجزن نہیں رہتا۔ عوام حقیقت پرست ہوتے ہیں۔ ایسی بغاوتوں سے جن کی بنیاد خیالی نظریوں پر ہوتی ہے ان کی

طبیعت متنفر ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب اول تو یہ ہے کہ اس قسم کی بغاوتوں کا انجام اکثر شکست فاش ہوتا ہے اور دوم یہ کہ ان کی ابتدا جس نقطہ سے ہوتی ہے وہ محض خیالی ہوتا ہے جس کی طرف ان کا ذہن ذرا مشکل سے منتقل ہو سکتا ہے۔ لیکن بغاوت کرنے والے جس قدر سرگرمی اور مستعدی اپنے کام میں دکھلاتے ہیں وہ صرف اس خیالی نصب العین کی خاطر دکھلاتے ہیں۔ بغاوت ایک جذبۂ پرجوش کا نام ہے جذبۂ پرجوش بعض وقت غصہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اسی لئے ہتھیار اٹھائے جاتے ہیں۔ لیکن تمام بغاوتیں جو حکومتوں اور موجودہ طریقۂ انتظام کے خلاف کی جاتی ہیں ان کا مقصد اعلیٰ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۸۳۲ء کے واقعات کو لیجئے ۱۸۳۲ء میں جو جنگ باغیوں کے سرداروں اور خصوصیت کے ساتھ شنواری سڑک کے نوجوانوں نے کی وہ خاص طور پر لوئی فلپ کے خلاف نہیں کی گئی۔ اُن میں کی ایک کثیر جماعت ایمانداری کی بات یہ ہے بادشاہ کی صفات کی جو انقلاب اور مطلق العنانی کے درمیان کھڑا ہوا تھا معترف تھی۔ ان میں سے کسی ایک متنفس کو بھی اس سے نفرت نہ تھی۔ لیکن وہ جس بات کی مخالفت کر رہے تھے وہ وہی تھی جس کی مخالفت انھوں نے لوئی فلپ کے پیشرو چارلس دہم سے کی تھی یعنی اس نظریہ کی کہ بادشاہ کو سلطنت کرنے کا حق خدا نے دیا ہے۔ جیسا کہ ہم تفصیل کے ساتھ سمجھا چکے ہیں وہ جس چیز کو مٹانا چاہتے تھے وہ وہ امکانات تھے جن کی بنیاد پر تمام دنیا میں ایک آدمی کو دوسرے آدمیوں کے حقوق غصب کرنے کا موقع مل جاتا تھا اور جن کی وجہ سے چند اشخاص کو دوسروں کے خلاف خاص مراعات حاصل ہوتی تھیں۔ وہ پیرس کو بادشاہ سے اس لئے نجات دلانا چاہتے تھے تاکہ نتیجہ کے طور پر تمام دنیا سے استبدادیت فنا ہو جائے۔ ان کا طریقہ استدلال یہی تھا جو اوپر بیان کیا گیا۔ ان کا مطمح نظر اس میں شک نہیں، حصول کے لئے بہت طویل مدت چاہتا تھا اور بالکل صاف اور واضح بھی نہیں تھا جس کی وجہ سے سعی حصول کے وقت اس کی خامیاں ظاہر ہونا یقینی تھیں لیکن باوجود اس کے مقصد کی بلندی اور عظمت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔

یوں لوگ اپنے خواب و خیال کی خاطر قربان ہو جاتے ہیں۔ شہیدوں کے لئے بھی ان کے خیالات توہمات ہی ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ توہمات ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں انسانی حقائق کی آمیزش ہوتی ہے۔ باغی بغاوت پر

سونے کا پانی پھیر دیتا ہے اور اس کو شعریت میں رنگ دیتا ہے۔ وہ ایسے مقابلوں میں جن کا المناک انجام یقینی ہے اپنے آپ کو پھینک دیتا ہے لیکن یہ سب کچھ وہ اسی وقت کرتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو اس انجام کے نشہ سے مدہوش کر لیتا ہے۔ کیسے معلوم ہے کہ ایک صبح ایسی بھی طلوع ہو جب انھیں فتح نصیب ہوگی ان کی تعداد ایک حقیر اقلیت ہوتی ہے۔ ان کے خلاف ایک پوری فوج ہوتی ہے۔ لیکن وہ جس چیز کی مخالفت کے لئے لڑتے ہیں اسے ابتدائی حقوق انسانی، فطری قانون، انصاف، صداقت اور ہر شخص کی اپنی اور پرایسی بادشاہت کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو کسی دوسرے شخص کو منتقل نہیں کی جاسکتی اور ضرورت کے وقت وہ تیں سو اسپارٹن کی طرح مٹ جاتے ہیں۔ وہ لڑتے ہوئے اپنے آپ کو ڈان کوائکزوٹ (شیخ چلی) نہیں سمجھتے بلکہ لیونیڈاس خیال کرتے ہیں اور بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب ایک دفعہ لڑائی شروع ہو جاتی ہے وہ پیچھے نہیں ہٹتے۔ سر جھکا کر وہ جھپٹتے ہیں اور انھیں برابر غیر معمولی فتح کی امید رہتی ہے یعنی انقلاب کی تکمیل، ترقی کی راہ، نسل انسانی کا تسلط اور عالمگیر نجات اور یہ کچھ نہیں تو کم از کم تھرماپلی کا احیاء و تجدید۔

ترقی کے لئے اس قسم کی جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں، اکثر ناکام رہتی ہیں۔ اس کا سبب ہم نے اوپر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ شیخ چلیوں کی قیادت میں جن کے منصوبے بہت بلند ہوتے ہیں عوام آسانی سے چلنے کے لئے طیار نہیں ہوتے۔ عوام کا بہت وزنی جسم ہوتا ہے اور اس وزن کی وجہ سے ہی ان کی رفتار کمزور اور ناپائدار ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ کسی ایسی مہم میں شریک ہونا نہیں چاہتے جو پُرخطر ہو لیکن خیالی نصب العین کے حصول کے لئے ہمیشہ پُرخطر راہ اختیار کرنا پڑتی ہے۔

علاوہ ازیں ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہر تحریک میں ذاتی اغراض و مفاد بھی کام کرتے رہتے ہیں اور انھیں خیالی اور جذباتی انسانوں سے کچھ زیادہ ہمدردی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات جب معدہ کی محافظت کے لئے کوشش کی جاتی ہے تو دل پر فالج گر جاتا ہے۔

فرانس کی عظمت اور رعنائی اسی بات میں ہے کہ دوسری قوموں کی طرح اسے اپنے پیٹ پالنے کا خیال ذرا کم رہتا ہے۔ وہ اپنی کوکھ کے گرد رسی زیادہ آسانی سے باندھ سکتی ہے۔ وہ سب سے پہلے

جاگتی ہے اور سب سے آخر میں سوتی ہے ۔ وہ آگے بڑھتی ہے اور تلاش و جستجو کے لئے برابر مستعد رہتی ہے اور یہ سب کچھ وہ اس لئے کرتی ہے کہ وہ فطرتاً آرٹسٹ ہے ۔

جس طرح حقیقت کی انتہا یہ ہے کہ وہ حسن ہو جائے ۔ اسی طرح منطق کا جو منتہا ہے وہ مطمح نظر کی ابتدا ہے ۔ آرٹسٹ میں تضاد نہیں ہوتا ۔ حسن سے محبت کے معنی وہی ہیں جو نور کے مشاہدہ کے ہوتے ہیں ۔ اسی بنا پر یورپ کی شمع کو روشن رکھنے یعنی اس کی تہذیب کی علمبرداری کی خدمت پہلے یونان نے کی وہاں سے یہ خدمت روم کو منتقل ہوئی اور اب اس بات کا فخر فرانس کو حاصل ہے ۔ فرانس وہ قوم ہے جسے خدا نے روشنی پھیلانے کے لئے مامور کیا ہے ۔

یہ بات بہت موزوں و مناسب ہے کہ ایک قوم کی شاعری اس کی ترقی کا ایک اہم عنصر ہوتی ہے تہذیب کی ترقی کا تخمینہ ایک قوم کے تخیل کی فراوانی سے کیا جاتا ہے ۔ لیکن ایک تہذیب پھیلانے والے ملک کو مردانہ صفات رکھنا چاہئیں ۔ اسے کو تہ ہونا چاہئے سائبرس نہیں ۔ جس قوم میں زنانہ پن آجاتا ہے وہ پست و ذلیل ہو جاتی ہے ۔ تہذیب کے لئے نفاست کی ضرورت نہیں ہے بلکہ رفعت کی ضرورت ہے ۔ اس شرط کے ساتھ ہم مثالی نصب العین کو نسل انسانی کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔

جدید نصب العین کا نمونہ ہمیں آرٹ میں ملتا ہے اور اس کے حصول کے ذرائع سائنس میں ۔ شاعر کے اعلیٰ تخیل کو یعنی ہیئت اجتماعی کے حسن کو ہم سائنس کے ذریعہ سے حقیقت کا جامہ پہنا سکتے ہیں ۔ جنت عدن اگر دوبارہ تعمیر کرنا ہے تو یہ اب دو جمع دو کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے ۔ اس نقطہ پر جہاں کہ تہذیب اب پہنچ گئی ہے صحت و واقعیت حسن کا ایک لازمی جزو بن گئے ہیں ۔ سائنس کے آلات سے نہ صرف آرٹ کے جذبہ کو مدد ملنے لگی ہے بلکہ اس کی تکمیل کا واحد ذریعہ اب صرف یہی رہ گئے ہیں ۔ خواب حساب لگانے پر مجبور ہو گیا ہے ۔ آرٹ جو فاتح ہوتا ہے اُسے اب ضرورت ہے کہ وہ اس سائنس کا سہارا ڈھونڈے جو انبار کو حرکت دیتا ہے ۔ اور سہارے کی مضبوطی ہمیشہ بہت اہم چیز ہوا کرتی ہے ۔ عہد جدید کی روح یونانی ذہنیت کا شاہکار ہے اور اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والا ہندوستانی شاہ کار ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سکندر ہاتھی پر سوار ہے ۔

تہذیب کی راہبر بننے کے لئے وہ نسلیں غیر موزوں ہیں جو پرانے معتقدات کے بوجھ سے پتھر بن گئی ہیں یا جن کی اخلاقی عظمت کو مالی منفعت کے جذبہ نے فنا کر دیا ہے ۔ پتھر کے بت یا سونے کے سکّے اس عضو کو جو ہلتا ہے اور اس ارادہ کو جو اس کے ہلنے کا سبب ہوتا ہے برباد کر دیتے ہیں ۔ مذہبی یا تجارتی مشغولیت ایک قوم کی چمک کو زائل کر دیتی ہے ۔ اس کی سطح کو پست کر کے اس کے افق کو تنگ کر دیتی ہے اور اس عالمگیر مقصد کے احساس کو چھین لیتی ہے جسے بہ یک وقت انسانی اور ایزدی کہا جا سکتا ہے اور جس کی وجہ سے قومیں پیغمبری کے مرتبہ بلند تک پہنچ جاتی ہیں بابل کے سامنے کوئی مطمح نظر نہیں تھا ۔ کارتھیج کا کوئی نصب العین نہ تھا ۔ ایتھنس اور روم کے گرد البتہ تہذیب کا ایک مقدس حلقہ کھنچا ہوا تھا جو صدیوں کی تاریکی کے باوجود اب تک ان کے ساتھ وابستہ ہے ۔

فرانس بھی من حیث القوم اسی زمرہ میں شامل ہے جس میں کہ یونان اور روم ہیں ۔ وہ اپنے حسن کی وجہ سے یونانی ہے اور اپنی شوکت کی بنا پر رومی ۔ مزید برآں اس کا اخلاق بھی بلند ہے ۔ وہ ایثار کرنا جانتا ہے اور قوموں کے مقابلے میں اس میں محبت اور فدائیت کے جذبے بہت زیادہ کام کرتے رہتے ہیں مگر یہ جذبے کبھی اس پر طاری ہو جاتے ہیں اور کبھی غائب ہو جاتے ہیں ۔ اسی بنا پر ان لوگوں کے لئے جو اسے اس وقت دوڑنے کے لئے کہتے ہیں جب وہ محض چلنا چاہتا ہے یا اس وقت چلنے کو کہتے ہیں جب وہ ٹھہرنا چاہتا ہے بہت سے خطرات پوشیدہ ہیں ۔ فرانس پر بھی مادیت کا دورہ ہوتا ہے اور بعض اوقات جو خیالات اس کے اعلیٰ دماغ کو منتشر رکھتے ہیں ان میں فرانس کی اس عظمت و شوکت کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں ہوتا جو بسوئے یا ساوتھ کیرلینا کے شایان شان ہیں پھر ایسے وقت کیا کیا جا سکتا ہے ۔ دیو بونا بن جاتا ہے عظیم الجثہ فرانس چھوٹی حقیر چیزوں کے لئے تمنا کرنے لگتا ہے ۔

ایسے موقعوں پر کچھ نہیں کیا جا سکتا ۔ چاند اور تاروں کی طرح قوموں کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ گہن میں آجائیں اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے اگر روشنی واپس آجائے اور گہن ہمیشہ کے لئے رات میں منتقل نہ ہو جائے طلوع اور حیات بعد الموت ہم معنی الفاظ ہیں ۔ نور کا دوبارہ نمایاں ہونا نفس کے وجود کے مرادف ہے ۔

ہمیں ان واقعات کا بیان سکون کے ساتھ کرنا چاہئے - ایک سد کے اوپر موت یا حالت جلاوطنی میں قبرایک اراوت مند کے لئے نہایت مسرت بخش انجام ہیں - عقیدت و شیفتگی کا اصلی نام بے غرضی ہے جنھیں ان کے حال پر چھوڑا گیا انھیں اچھا ہوا ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا - جو جلاوطن کئے گئے خوب ہوا کہ وہ جلاوطن کئے گئے - لیکن ہم معزز اور برگزیدہ اقوام سے اس قدر التجا ضرور کریں گے کہ جب وہ پیچھے ہٹیں تو حد سے زیادہ پیچھے نہ ہٹا کریں - یہ مناسب نہیں ہے کہ معقولیت کی طرف واپس ہونے کا بہانہ کرکے پستی کی طرف ضرورت سے زیادہ نیچے اتر جائیں -

مادہ کا وجود ہے - وقتی مصلحت کا وجود ہے - ذاتی اغراض و مفاد کا وجود ہے - معدہ اور شکم کا وجود ہے - لیکن غرض صرف اس قدر ہے کہ معدہ کو ہی عقل و تمیز کی انتہا نہ تصور کرلینا چاہیئے - عارضی زندگی کے حقوق کا ہمیں اعتراف ہے لیکن دائمی زندگی کے بھی کچھ حقوق ہیں - افسوس ! ابھرنے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ گرنے سے بھی محفوظ ہو گئے - تاریخ میں ہمیں اس قسم کی مثالیں ہماری تمنا کے خلاف بہت زیادہ ملتی ہیں - ایک قوم برگزیدہ و سرفراز ہے - اس نے نصب العین کی فضائی لذت کا ذائقہ چکھا ہے - لیکن ایک وقت آتا ہے وہ کیچڑ میں لوٹنا شروع کر دیتی ہے اور اسے اپنے لئے اچھا سمجھتی ہے اور جب ہم اس سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ اس نے سقراط کو چھوڑ کر فالسٹاف کو اپنا رہنما کیوں بنالیا ؟ تو جواب یہ ملتا ہے کہ میں مدبرین کی زیادہ قدر کرتی ہوں ! -

---

جنگ کے بیان کو دوبارہ شروع کرنے سے پہلے ایک اور بات کہنا بھی ضروری ہے -

اس جنگ کو جس کا کہ ہم تذکرہ کر رہے ہیں مشابہت ان حرکات سے دی جاسکتی ہے جو تشنج کی حالت میں کی جاتی ہیں - پابہ زنجیر ترقی بیماروں کی مانند ہوتی ہے اور مرگی کے اس قسم کے افسوسناک دورے اس پر پڑتے رہتے ہیں - ترقی کی اس بیماری یعنی خانہ جنگی سے ہم برابر دوچار ہوتے رہتے ہیں - اس ڈرامہ کا جس کا محور ضمیر اجتماعی کی ملامت ہے اور جس کا صحیح عنوان ترقی ہے یہ ایک مہلک پہلو ہے جو بہ یک وقت کھیل بھی کہا جاسکتا ہے اور کھیل کے درمیان کا وقفہ بھی -

ترقی ! یہ آواز جو ہم اکثر بلند کرتے ہیں ہمارے تمام تخیل پر حاوی ہے اور اپنے ڈرامہ کے اس حصہ پر جہاں کہ ہم پہنچ گئے ہیں ہمیں اجازت ملنا چاہیئے کہ ہم اُس نقاب کو نہ اُٹھائیں جو اس پر پڑا ہوا ہے اور اس کی روشنی کو پوری طرح چمکنے دیں کیونکہ وہ تخیل جو اس میں موجود ہے اُسے ابھی بہت سی آزمائشوں سے گذرنا ہے۔ کتاب جو ناظر کے ہاتھ میں ہے شروع سے آخر تک اپنی مجموعی اور تفصیلی حیثیت کے ساتھ، چاہے اور جو بھی اس کی فروگذاشتیں، مستثنیات اور خامیاں ہوں ترقی کو ظاہر کرتی ہے اور یہ ترقی ہے بُرائی سے بھلائی کی طرف، ظلم سے انصاف کی طرف، جھوٹ سے سچائی کی طرف، رات سے دن کی طرف، بھوک سے ضمیر کی طرف، بدعنوانیوں سے زندگی کی طرف، بہیمیت سے احساس فرض کی طرف، دوزخ سے جنت کی طرف، نیستی سے خدا کی طرف۔ آغاز، نفس امارہ سے ہوتا ہے اور انجام نفس مطمئنہ پر۔ ابتدا میں شیطان ہے اور آخر میں فرشتہ ہو

محکومیت نسواں

عورت اور مرد کے دماغ اور ذہن کا فرق

کہا جاتا ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں جسمانی نقائص بھی موجود ہیں۔ مثلاً عورتوں کا بھیجہ ہلکا اور چھوٹا ہوتا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ بات ہی مشکوک ہے۔ کیونکہ اس کے لئے ابھی تک کافی شہادت نہیں پائی گئی۔ اور یہ محض اس بات سے قیاس کر لیا گیا ہے کہ مرد کا جسم بڑا اور بھاری نظر آتا ہے۔ اگر جسامت ہی اصل معیار ہو تو پھر عجیب وغریب نتائج پیدا ہو جائیں گے۔ کیونکہ پھر یہ ماننا ہوگا کہ ہر لمبے چوڑے آدمی کا دماغ بھی بڑا بھاری ہوگا اور وہ نحیف الجثہ لوگوں سے عقل میں بھی زیادہ ہوگا۔ پھر اس اصول پر ہاتھی اور وہیل کے سے جانوروں کو نوع انسان پر بوجہ عقل کے بھی ترجیح دینی ہوگی۔ علم تشریح کے ماہروں کے نزدیک انسان کی عقل کی بابت جسامت اور دماغ یا سر کی بڑائی چھوٹائی کی مناسبت سے کوئی معیار قائم کرنا ہرگز صحیح نہیں۔ خود مجھ سے ایک سائنس داں نے بیان کیا کہ اوس نے جو سب سے وزنی دماغ پایا وہ ایک عورت کا تھا۔ اُس سے بڑھ کر وزنی بھیجہ آج تک سننے میں نہیں آیا۔ اس کے ماسوا یہ امر بھی ہرگز مسلّم نہیں کہ دماغ کے وزن کا کوئی تعلق ذہن و عقل کی خوبیوں سے بھی ہے۔ گو یہ ضرور ہے کہ دماغ ہی تخیل اور تفکر کا جسمانی مرکز ہے لیکن ذہن کے مختلف شعبوں کا دماغ کے مختلف حصوں سے متعلق ہونا خود ایک مابہ النزاع مسئلہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ دماغ کی جسامت کو انسان کی عقلیت سے غیر متعلق ہونا ایک ایسی بات ہے جس کو جھٹلانا گویا دنیا کے بہت سے تجربوں کو رائگاں کر دینا ہے مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ دماغ کی جسامت ہی پر انسان کی عقل کی خوبی کا دارومدار نہیں ہو سکتا۔ جسم انسانی میں نظام اعصاب کے سے نفیس نظام میں فطرت جس نزاکت کے ساتھ کارفرما ہوتی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ہر محرک کے اثرات نہ صرف محرک کی کمی بیشی سے بلکہ محرک کی نوعیت اور قسم کے لحاظ سے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اگر کسی آلہ کی خوبی اُس کام کی نفاست اور نزاکت سے جانچی جا سکتی ہے جو اُس آلہ سے انجام پائے تو ہر بات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا

دماغ اور اُس کا نظام اعصاب جس نفاست اور نزاکت سے کام کرتا ہے وہ فی الجملہ مرد کو نصیب نہیں۔
مجرد ملحوظات سے قطع نظر، بالعموم کسی جسمانی عضو کی خوبی اُس کی جسامت پر نہیں بلکہ اس عضو کے فعل کی خوبی پر منحصر ہے جس کا تعلق دوران خون کی کمیت اور کیفیت سے ہوا کرتا ہے۔ اور فی زمانہ تجربات کی بنا پر ایک نظریہ یہ بھی قایم کیا گیا ہے کہ اگر مردوں کا بھیجہ زیادہ بڑا ہوتا ہے تو عورتوں کے دماغ میں تصورات کی دورانی کیفیت بہت بہتر ہوتی ہے۔ اور اگر اس پر کچھ اور بھی قیاسات قایم کئے جا سکیں تو یہ بھی تحقیق ہوتا ہے کہ مردوں کے ذہن کی رفتار میں وہ تیزی نہیں ہوتی جو عورتوں کے ذہن کی رفتار میں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ عورتیں نسبتاً زود حس اور تیز فہم ہوتی ہیں۔ جس طرح ہر بڑی چیز اپنی جگہ سے دیر میں جنبش کھاتی ہے اسی طرح مرد کا ذہن بھی حرکت کرنے میں سست ہے۔ لیکن جب حرکت شروع ہو جاتی ہے تو بھاری جسم کی حرکت کی طرح اُس کی حرکت بھی دیر تک قایم رہتی ہے اور بہت کچھ کر ڈالتی ہے۔ پھر اس کی سمت بھی اُسی طرح مشکل سے بدلتی ہے اور اُس کا زور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہم ہر آن یہی دیکھتے ہیں کہ جو کام جلدی کرنے کا ہوتا ہے اُس میں عورتیں ہمیشہ بازی مار لیجاتی ہیں۔ عورت تھکتی جلد ہے لیکن اس کی تھکن دور بھی جلد ہوتی ہے۔ الغرض جو کچھ عورت کی ذہنی استعداد کی بابت اوپر کہا گیا اُس کی بابت میں پھر یہی کہتا ہوں کہ محض قیاسات کو میں نے پیش نظر رکھ کر بحث کی ہے تب ان نتائج کو پہنچا ہوں کہ عورتوں کی ذہنیت اگر دوسری وضع سے خلق ہوئی ہے تب بھی عورت کسی نہ کسی طرح ایک کارآمد شریک حیات ہے۔ ورنہ ابھی تک قطعی یہ رائے قایم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورت کی ذہنیت فطرتاً مرد کی ذہنیت کے مقابلہ میں کسی طرح پست یا ادنیٰ ہے۔ یا دونوں میں کوئی حقیقی فرق بھی ہے۔ علم النفس کی تحقیقات ابھی اتنی مکمل نہیں ہوئی ہے کہ آسانی سے ان باتوں پر کوئی آخری رائے قایم کی جائے۔ لیکن جو کچھ سیرت انسانی کی بابت علوم نے بتایا ہے اُس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ صنف نسواں کی خلقی خامیاں درحقیقت خلقی نہیں بلکہ فرضی ہیں اور ان تعصبات پر محمول کی جا سکتی ہیں جو سوسائٹی میں عورتوں کے خلاف عام ہو رہے ہیں۔
چونکہ عورتوں کے حقیقی خواص پر فلاسفہ اور سائنس والوں نے کبھی بے لوث نظر نہیں ڈالی اس لئے اُن کی مفروضہ پیدائشی کمزوریوں کی بابت دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ اتفاق رائے رکھنے سے بھی بہت دور

ہیں اور جہاں کے لوگوں کو جیسی بن پڑتی ہے ویسی رائے ان کے متعلق قایم کر لیتے ہیں ۔ مثلاً ایشیائی لوگ عورتوں میں خواہش نفسانی زیادہ بتاتے ہیں ۔ چنانچہ اس وجہ سے ہندوؤں کی کتابوں میں عورتوں پر جو لعن طعن ہے اُس کی کوئی حد نہیں ۔ برخلاف اس کے انگریزوں میں عورت کو ازحد "سرد مزاج" قرار دیتے ہیں ۔ انگریزی کی وہ ضرب الامثال جو عورتوں کی غیر مستقل مزاجی ظاہر کرتی ہیں اکثر فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہیں ۔ بلکہ غیر مستقل مزاجی کے لئے عورتوں کو فرانس میں زیادہ اور انگلستان میں کم مطعون کرتے ہیں ۔ انگریز قوم کی عورتوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عورتوں یا مردوں کے فطری خواص کی بابت صحیح رائے نہیں قایم کر سکتیں جس کی وجہ فی الجملہ یہ ہے کہ انگلستان میں انسان کے باطنی خواص کے مجرد صورت میں ظاہر ہونے کی نوبت ہی بہت کم آتی ہے ۔ خواہ یہ بات اچھے معنوں میں کہی جائے یا بُرے معنوں میں لیکن واقعہ یہ ہے کہ زمانہ موجودہ کی قوموں میں انگریز ہی وہ ہیں جو فطری حالات سے بہت دور جا پڑے ہیں ۔ کیونکہ انگلستان وہ ملک ہے جہاں نظام معاشرت نہایت کامیاب اصول پر قایم ہے اور جو چیزیں اس کے خلاف پڑتی ہیں ان کو وہ اگر مغلوب نہیں کر سکتا تو دبا ضرور دیتا ہے ۔ انگریز قوم کی ضابطہ پسندی نہ صرف عمل میں بلکہ محسوسات میں بھی ظاہر ہے ۔ دوسری قوموں میں لوگ دوسروں سے اخذ کئے ہوئے خیالات پر بھی کاربند ہو جاتے ہیں ۔ اور سوسائٹی کی ضروریات کا بھی کافی لحاظ رکھتے ہیں ۔ ان کی دنیائے عمل میں اگرچہ فطرت انسانی سے مقابلہ ہی کیوں نہ کیا جاتا ہو لیکن فطرت انسانی کو بالکل بالائے طاق نہیں رکھ دیا جاتا ۔ یعنی ان میں ممکن ہے کہ ضابطہ پسندی کو اتباع فطرت پر عملاً ہمیشہ فوقیت ہی کیوں نہ دی جاتی ہو مگر فطرت سے بالکل بے پروائی نہیں برتی جاتی ۔ مگر انگلستان میں تو گویا ضابطہ نے بالکل ہی فطرت کی جگہ لے لی ہے ۔ یعنی زندگی کا بیشتر حصہ بجائے اس کے کہ رواجی ضوابط کے ماتحت میلان طبیعت کے مطابق بسر کیا جاتا میلان طبیعت سے بالکل بے نیاز ہو کر محض ضابطہ کی اتباع میں بسر کیا جاتا ہے ۔ اس صورت حال کے اچھے اور برے دونوں پہلو نکلتے ہیں اور بدترین پہلو اس کا یہ ہے کہ انگریز خاصکر فطرتِ انسانی کی حقیقت بہت مشکل سے پہچانتا ہے اور اس کی رائے اس موضوع پر درست نہیں ہو سکتی ۔ اور اس بارہ میں جیسی فاش غلطیاں انگریز کر جاتا ہے دوسرا نہ کرتا ہو گا ۔ انگریزوں میں جس طرح

یہ عیب ہے فرانسیسی تعصب کی بیماری میں مبتلا ہے۔ انگریزی کی غلطی میں ایک الٹا پن یہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کے تجربہ میں نہیں آتی وہ اُس کے وجود ہی سے انکار کرنے لگتا ہے۔ اور فرانسیسی کی غلطی میں یہ سیدھا پن ہے کہ جو چیز اُس کے تجربہ میں نہیں آتی اُسے وہ لامحالہ موجود خیال کرتا ہے۔ چنانچہ انگریز "فطرت" کو تو جانتا ہی نہیں کیونکہ وہ اس کے مشاہدہ میں آئی ہی نہیں۔ لیکن فرانسیسی عموماً اس کی بابت بہت کچھ جانتا ہے لیکن اس کی رائے فطرت کے بارہ میں اس لئے غلط ہوا کرتی ہے کہ اُس نے فطرت کو جب دیکھا بہت مصنوعی اور خود ساختہ وضع میں دیکھا۔ کیونکہ سوسائٹی نے ہر چیز کی فطرت پر جو رنگ چڑھایا ہے وہ کسی چیز کو اس کی اصلی حالت میں نہیں دیکھنے دیتا۔ پس معاشری دنیا میں کسی چیز کی حقیقت کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یا تو اُس کا فطری عنصر الگ کر دیا جائے یا اس کی حالت میں تغیر دے کر اُسے دیکھا جائے پہلی صورت میں تو فطرت کا کچھ نہ کچھ شائبہ ضرور ہی باقی رہ جاتا ہے جس پر انسان کی نظر پڑ سکتی ہے۔ اور دوسری صورت میں نظر تو بہت کچھ آجاتا ہے لیکن اس طرح زیر مطالعہ چیز کی قدرتی نشو نما کا صحیح طور پر نظر آنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

ایسے فرق پر غور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے

میں کہہ چکا ہوں کہ یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ مرد اور عورت کے ذہن کا فرق کس قدر حقیقی ہے اور کہاں تک مصنوعی ہے یا یہ کہ کوئی قدرتی فرق ہے بھی یا نہیں۔ لیکن اگر کوئی فرق ہے تو اس کے اسباب کا اوپر ایک بار حوالہ دیا جا چکا ہے اور اُن پر نظر کرنے کا صرف یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ ذہن پر خارجی اثرات کے فطری نتائج پر غور کیا جائے۔ چونکہ انسان کو اُس کے حالات سے بالکلیہ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اس لئے اُس کے سابقہ اور موجودہ حالات پر غور کرنے سے ہی اس کی حقیقت کا کچھ پتہ چل سکتا ہے۔

پس ہمیں یہی صورت پیش نظر رکھنا ہے کہ فی الحال مرد عورت سے کن باتوں میں بڑھا ہوا ہے۔ عورت کا جسم مرد سے کمزور ہے۔ فلسفہ سائنس یا فنون لطیفہ میں کسی عورت نے کوئی بڑا کارنامہ کبھی نہیں پیش کیا۔ کیا اس کا عورت کی قدرتی نااہلیت کے علاوہ اور بھی کوئی سبب خیال کیا جا سکتا ہے؟

علامہ عورتیں عورتوں کی ابھی تین پشتیں بھی نہیں گذری ہیں کہ اُنھوں نے فلسفہ اور سائنس کے میدان میں قدم

رکھنا شروع کیا ہے۔ انگلستان اور فرانس میں تو زمانہ حال تک اس طرف توجہ کرنے والی عورتیں شاذ ہی ہوتی تھیں۔ اس قلیل عرصہ میں اگر اس میدان میں کسی عورت نے کوئی کارنامہ دکھایا بھی ہوتا تو وہ معجزہ سے کم نہ ہوتا کیونکہ یہ مذاق اُن میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ البتہ جس مضمون میں مہارت حاصل کرنے کا ان میں کافی موقع ملتا آیا ہے۔ مثلاً ادبیات (نظم و نثر دونوں) میں کوئی انعام ایسا نہ تھا جو انھوں نے بھی نہ حاصل کیا ہو اور کوئی داد نہ تھی جو اُنھیں نہ ملی ہو۔ زمانۂ قدیم میں جب عورتوں کو شاذ ہی کسی فن میں حصہ لینے کا موقع ملتا تھا ایسی ایسی قابل عورتیں گذری ہیں کہ اُس زمانہ کے رنگ کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے۔ یونانیوں کے بڑے شعرا میں صَفّو کا نام لیا جاتا ہے جو ایک عورت تھی۔ اور اسی طرح مرٹس بھی تھی جو اپنے زمانہ کے بڑے بڑے شعراسے مقابلہ میں بار بار بازی لے گئی۔ اَسفیزیہ ایک فلسفیہ تھی جس نے تصانیف تو نہیں چھوڑیں لیکن یہ وہ تھی جس سے سقراط نے درس لیا تھا۔

عورتوں میں اجتہاد کی کمی مگر دوسرے اوصاف کی موجودگی

زمانۂ موجودہ میں مردوں اور عورتوں کی تصانیف کے مقابلہ سے عورتوں کی بس اتنی خامی ضرور نکلتی ہے کہ ان میں جدت کی کمی ہوتی ہے مگر جدت ناپید نہیں۔ کیونکہ ذہن کے فعل کا ہر نتیجہ اگر وہ کسی لائق ہوتا ہے تو وہ خود ہی طبیعت کی جدت پر دلالت کرتا ہے۔ ذہن کا ہر تصور ایک نئی چیز ہے۔ اسے کسی دوسری چیز کی نقل نہ سمجھنا چاہئے۔ جدت آمیز خیالات جو اس معنی میں جدت آمیز ہوں کہ کہیں سے اخذ یا نقل نہ کئے گئے ہوں وہ خیال کرنے والے کے ذاتی مشاہدہ اور تفکر کا نتیجہ ہوتے ہیں اور عورتوں کی تصانیف میں برابر پائے جاتے ہیں۔ لیکن ابھی تک جدت کے ایسے زبردست نمونے جو زمانہ میں انقلاب پیدا کردیں یا جن سے کسی عقلی مذہب کی بنا قایم ہو جائے عورتوں نے نہیں دکھائے ہیں۔ لیکن ان کے طرز ادا اور جزئیات کی ترتیب میں ان کا جوہر کسی سے کم نہیں رہا جیسا کہ زمانہ حال کی ناولوں میں عورتوں کی لکھی ہوئی ناولوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ ادبیات جدیدہ میں میڈم اسٹیل کی فصیح البیانی اور طرز ادا کو پہنچنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اور میڈم ساں کا مصورانہ طرز بیان تو وہ شے ہے جو بدن میں سنسنی پیدا کردیتا ہے۔ اب عورت میں البتہ جو خامی ظاہر ہو رہی ہے اس کی علت پر بھی نظر کرنا چاہئے۔

کیا عورتوں میں جدت کا مادہ مفقود ہے؟

دنیا کا وہ زمانہ جس میں عالم کے بڑے بڑے حقائق اور کارآمد راز انسان

کی محض خداداد قابلیت اور محض پرواز خیال سے بغیر علم کی خاص امداد کے جو منکشف ہوتے رہے ایسا زمانہ تھا جس میں عورت کو خیال آرائیوں سے کوئی لگاؤ ہی نہ تھا۔ اور پھر بھی دو ایک مثالیں عورتوں نے اس زمانہ میں ایسی قایم کیں جس پر وہ ناز کرسکتی ہیں۔ سچ پوچھیے تو عورتوں کے کسی گروہ میں ان چیزوں کا چرچا نہیں ہونے پایا جس سے ان کو اس قسم کی قدرت حاصل ہوتی اور یہی وہ زمانہ گذرا ہے جس میں جو کچھ بھی جدتیں پیدا ہونا تھیں لوز پرواز خیال کو جہاں تک پہنچنا تھا اس کی حد گویا پوری ہوگئی۔ اور جدت کے لئے جو کچھ میدان اب باقی رہا ہے اُسے طے کرنے کی اُمید آئندہ ہوسکتی ہے تو فی الجملہ اُنہی لوگوں سے جن کی تعلیم و تربیت خاص طریقوں سے ہوئی ہو۔ حال میں مارس صاحب نے موجودہ دور کی جدت تخیل پر بحث کرتے ہوئے خوب کہا ہے کہ یہ چیز اب تو صرف اُنہی لوگوں کو میسر آسکتی ہے جو پرانے لوگوں کے تخیلات پر عبور رکھتے ہوں۔ کیونکہ زینہ کا ہر نیا قدمچہ اب صرف پرانے قدمچوں کے اوپر ہی بنا ناہے۔ یعنی جب تک قدامت کی باتوں پر کسی کو عبور نہ ہو نئی بات پیدا کرنا مشکل ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ دنیا میں کتنی عورتیں ہیں جو قدما کے اقوال پر عبور رکھتی ہیں۔
آج کل شاید مسز سومرول کے علاوہ کوئی عورت نہیں جو ریاضی میں اتنی مہارت رکھتی ہو کہ کوئی نیا انکشاف اپنے مضمون میں کرسکے۔ کیا عورتوں کی قدرتی نااہلیت صرف اس وجہ سے مان لی گئی ہے کہ دو ایک جوان میں سے اس پایہ کو پہنچ سکی ہیں اُنھوں نے اپنے زمانہ میں کوئی کار نمایاں نہیں کیا؟ جب سے علم اقتصاد بطور ایک علم کے نمودار ہوا ہے اب تک صرف دو عورتیں ایسی گذری ہیں جنھیں اس علم پر قلم اُٹھانے کی نوبت آئی ہے اور اس اثنا میں کتنے مرد اس لائق ہوئے ہیں جنھوں نے اس موضوع پر کچھ لکھا ہے اور کوئی کمال دکھایا ہے یہ ایک لائق غور بات ہے۔ یہی حال دیگر علوم میں ہے کہ عورتوں کو اُن معلومات کے حاصل کرنے کے مواقع ہی نہیں دیئے گئے جن کی بنا پر ان کے ذہن میں وہ جولانی پیدا ہوتی جس کے بغیر خداداد قابلیت بھی آج کل کام نہیں آتی۔ جب وہ زمانہ آجائے گا کہ عورتیں ابتدائی معلومات سے کافی حد تک بہرہ اندوز ہوچکی ہونگی تب ہی یہ بھی طے ہوسکے گا کہ آیا ان میں جدت کا خلقی مادہ موجود ہے یا نہیں۔

عورتوں کے خیالات چرائے جاتے ہیں

بعض آدمی بغیر دوسروں کے خیالات پر عبور حاصل کئے ہوئے اپنے فطری ذوق اور خلقی جدت سے خاص خاص مسئلوں میں ایسی بات پیدا کرلیتا ہے کہ جس کی توجیہ خواہ وہ

خود نہ کر سکے لیکن وہ دنیائے علم میں گویا کارنامہ شمار ہو سکتی ہے بشرطیکہ بالآخر اس کی صداقت علمی یا عملی نقطۂ نظر سے مسلم ہو جائے۔ (لیکن جب تک ایسی بات جانچ نہیں لی جاتی اور فلسفہ یا سائنس کے حقائق میں اپنی جگہ نہیں پیدا کر لیتی اُس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی)۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا الہامی علم عورت کو کبھی نہیں ہوتا؟۔ میں کہتا ہوں کہ نہیں عورتوں میں سینکڑوں کو ہوتا ہے۔ مگر افسوس تو اس کا ہے کہ ان کو کوئی ایسا ہمدرد نہیں ملتا جو اس جوہر کو پرکھے اور دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اور اگر کوئی پیش بھی کرتا ہے تو وہ اُس پیش کرنے والے کی طرف منسوب ہو جاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مردوں نے جتنے خیالات اپنے بنا کر پیش کئے ہیں وہ سب دراصل اُنہی کے تھے؟ ان میں یقیناً بعض ایسے خیالات بھی تھے کہ (ان پر مردوں نے اپنی مہر تصدیق لگا کر) ان کو اپنی جانب منسوب ہو جانے دیا۔ میں اپنے ہی بارہ میں غور کرتا ہوں تو دیکھتا یہ ہوں کہ اپنے خیالات کے باب میں میں واقعی بہت کچھ عورتوں کی فراست کا احسان مند ہوں۔

عورتیں نقالی کیوں کرتی ہیں خاص ادبیات اور فنون لطیفہ کو لیجئے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میدان میں عورتیں مردوں کی نقالی کیوں کرتی ہیں؟ میں یہ پوچھتا ہوں کہ رومی ادبیات یونانی ادبیات کے متبع کیوں ہیں اور مبصرین ایک کو دوسرے کی نقل کیوں قرار دیتے ہیں؟۔ اس کی وجہ بس یہی ہے کہ اہل یونان دنیائے علم میں پہلے نمودار ہوئے تھے۔ اگر عورتیں مردوں سے جدا ہو کر کہیں اور رہتی ہوتیں (یا مردوں سے پہلے پیدا ہوئی ہوتیں) تو یقیناً وہ ادبیات میں ہرگز مردوں کی نقال نہ ہوتیں۔ عورتوں کے اس میدان میں آنے سے پہلے ہی وہ سب کچھ ہو چکا تھا جس کا خیال اُنھیں اب آیا ہے۔ پس لامحالہ اب جو ان کا سبق ہوگا وہ دوسروں کا آموختہ ہوگا۔ ان میں جدت کہاں سے آسکتی ہے۔ اور قابل الزام کیا بات ہے؟ فرانس اور اطالیہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ باوجود پرانے ادبیات کا اتباع ترک کر دینے کے کوئی مہتم بالشان جدت نئے ادبیات میں نہیں پیدا کی جا سکی۔ اور عورتیں تو ابھی صرف مردوں ہی کی شاگرد ہو رہی ہیں۔ ابھی سے وہ جدت کیسے پیدا کر لیں گی؟ اگر عورتیں مجموعی طور پر اپنا رنگ الگ اختیار کرنا چاہیں تو اس میں صدیاں گذر جائیں گی تب وہ بات حاصل ہوگی۔ کیونکہ عجلت میں تو صرف نقل ہی ہو سکتی ہے۔ اور نقل سے انسان اصل بھی اختیار کر سکتا ہے

مگر دیر میں ۔ کیونکہ جمہور کا رواج ترک کرنا ایک دن کا کام نہیں ۔ اگر عورتوں کو بحیثیت مجموعی اپنے فطری مذاق کا مطالعہ کرنا ہے اور ایک نیا رنگ ادبیات یا صنائع میں اختیار کرنا ہے تو اس کے لئے مدتوں کی کاوش درکار ہے ۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ چونکہ مرد اور عورت کے ذہنی رجحانات میں کوئی اصولی فرق بالآخر نہ پایا جائیگا اس لئے ان کا کوئی مخصوص رنگ قایم ہونے کی توقع نہیں ہوسکتی ۔ اب رہا اُن میں سے ہر ایک کے مذاق میں وجہ تمیز قایم ہونا اس میں ابھی کافی عرصہ لگے گا ۔ کیونکہ وہ سابق کے اثرات سے چھٹکارا آسانی سے نہیں پاسکیں ۔

فنون لطیفہ میں عورتیں کیوں پیچھے ہیں ؟

یہ سچ ہے کہ فنون لطیفہ میں عورتوں نے بہت کم کوئی جدت دکھائی ہے اور انہی فنون میں ان کی کم مائگی سب سے زیادہ نمایاں ہے ۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ فنون لطیفہ کو فی الجملہ عورتوں نے کبھی کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا اور ظاہر ہے کہ ان فنون میں پیشہ ور لوگوں نے اُن لوگوں کی کوئی قدر نہیں باقی رکھی جو ان کو شوقیہ حاصل کرتے ہیں ۔ عورتوں کو موسیقی تو ضرور پیشہ کی غرض سے بھی سکھائی جاتی ہے مگر وہ موسیقی کا برتنا سیکھتی ہیں نہ کہ وہ چیز جس سے ان میں واقعی جدت اور اختراع کا مادہ پیدا ہو ۔ لیکن ناٹک کی اداکاریوں میں وہ اگر مردوں سے زیادہ نہیں ہیں تو کسی طرح ان سے کم بھی نہیں اب جو پیشے مردوں کے لئے مخصوص ہیں ان میں عورتوں کا مقابلہ صرف ان ہی مردوں سے ہوسکتا ہے جو فن کو عورتوں کی طرح محض شوقیہ اختیار کئے ہوئے ہوں ۔ چنانچہ دھن اور راگنیوں کی تصنیف میں عورتیں کسی غیر پیشہ ور مرد سے ہرگز گھٹ کر نہیں رہتیں ۔ اور اسی امر کو ملحوظ خاطر رکھئے تو مصوری میں بھی عورتیں مردوں کی ہم پلہ ہی ثابت ہوں گی ۔ البتہ وہ ان پرانے مصوروں کا مقابلہ آج بھی نہیں کرسکتیں جن کے زمانہ میں اعلیٰ حیثیت کے لوگ بھی فن مصوری حاصل کیا کرتے تھے ۔ اور ان کا مقابلہ جہاں تک جدت کا تعلق ہے آج کل کے مرد مصور بھی بمشکل کرسکتے ہیں ۔ چودہویں اور پندرہویں صدی میں اٹلی کے مشہور مصور وہ لوگ تھے جو اپنے زمانہ کے بہترین تعلیم یافتہ اور مہذب لوگ سمجھے جاتے تھے ۔ بلکہ بعض تو وہ تھے جن کو یونان کے سے ہمدردان حکمار کے ہم پلہ خیال کرنا چاہئے ۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ فنون لطیفہ کو انسانی تخیل اور محسوسات کی بنا پر وہ درجہ دیا جائے کہ کوئی آدمی ان میں کمال حاصل کرکے دنیا کا

بہترین انسان مانا جا سکے ۔ اب تو وہ زمانہ ہے کہ انسان کی عظمت سیاسی یا فوجی قابلیت کے لحاظ سے دنیا میں قایم ہوتی ہے ۔ اور صرف ایسی ہی چیزیں رہ گئی ہیں جنھیں سیکھ کر آدمی کسی بادشاہ کا مقرب یا کسی رئیس کا ہم پلہ ہو سکتا ہے ۔ آج کل اگر کسی کو کسی فن میں اپنی شہرت یا کمال حاصل کرنے کے لئے سر سعزن کرنا ہو تو وہ مصوری (پینٹنگ) کی طرف توجہ ہی مشکل سے کرے گا کیونکہ ایسے فنون میں شہرت کوئی شہرت نہیں رہی ۔ البتہ موسیقی ایک دوسری ہی چیز ہے جس میں عام ذہانت کے علاوہ ذہن کی ایک خاص خداداد قابلیت بھی چاہیئے ۔ اور اسی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ عورتوں میں اب تک فن موسیقی کی کوئی جدت طراز مصنفہ کیوں نہیں پیدا ہوئی ۔ لیکن یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اس فن میں جس خاص ذہنی استعداد کی حاجت ہو اس کا ظہور بغیر مناسب تعلیم حاصل کئے ہوئے نہیں ہو سکتا جرمنی اور اٹلی وہ ممالک ہیں جہاں دنیا کے بہترین مصنف گذرے ہیں ۔ یہ مصنف سب مرد تھے مگر یہ وہ ممالک ہیں جہاں عورتیں ہر بات میں مردوں سے اب بھی بہت پیچھے ہیں ۔ چنانچہ ایسے ممالک کے باکمال مردوں سے وہاں کی یا کہیں کی عورتوں کا مقابلہ کرنا انصاف کے خلاف ہے ۔

اس لیں ماندگی کے مزید وجوہ جن مشاغل میں عورتیں اور مرد یکساں شریک ہیں اُن میں عورتوں کا پیچھے رہ جانا اور بھی متعدد وجوہ پر مبنی ہے ۔ اول تو عورت کو اُن مشاغل میں پڑنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی ۔ ان کا دماغ ہر وقت خانہ داری کے معاملات میں الجھا رہتا ہے کیونکہ تربیت کے لحاظ سے ان کا مآل زندگی گھر کے کاروبار کو سنبھالنا ہے ۔ اگر سب عورتوں کا یہ حال نہیں تو ہر خاندان میں کم از کم ایک عورت تو اس طرح کی ضرور ہوتی ہے ۔ بعض صورتوں میں ان فرایض کا انجام دینا بآسانی مشقت کے بغیر بھی ممکن ہے ۔ لیکن گھر کی فکر وہ چیز ہے جو ہر آن دماغ پر قبضہ کئے رہتی ہے ۔ کیونکہ خانہ داری میں ہر ہر لحظہ کی فکر اور ذرا ذرا سی بات پر نظر رکھنا پڑتی ہے ۔ بلکہ ہر آن ایسے سوال درپیش رہتے ہیں کہ پہلے سے ان کا کوئی خیال بھی نہیں ہوتا ۔ اس طرح ایک ایک بات کو سوچنا اور اُن کا خیال رکھنا ایسی ذمہ داری ہے جس سے دماغ کو دار ملنا ممکن ہی نہیں ۔ اگر کوئی عورت بڑی مالدار اور حیثیت دار ہوئی تو ممکن ہے کہ ایک حد تک

ان جھگڑوں سے بھاگ سکے لیکن پھر بھی کہاں تک ؟ سارے خاندان کے آرام کی ذمہ داری اور پھر دنیا کا رکھ رکھاؤ یہ اس کی جان کے لئے کیا کم عذاب ہے ۔ اگر خانہ داری کا وبال اس کے سر سے کم ہوتا ہے تو اس رکھ رکھاؤ اور تعلقات کے نباہنے کی فکر اور زیادہ ہو جاتی ہے ۔ دعوتوں میں جانا، گانے کی محفلوں میں شرکت، شام کے جلسوں میں پہنچنا، دن کو ملنے جلنے کے لئے جانا آنا، خطوط لکھنا یہ سب تعلقات کا نباہنا ہے ۔ اور اس سب سے بڑھ کر ایک فرض دنیا نے ان پر اور عاید کیا ہے ۔ یعنی اپنے کو دلکش بنانا ۔ اونچے طبقہ کی عورت کی ہشیاری سب سے زیادہ اپنی اداؤں کے سنجیدہ بنانے اور بات کا سلیقہ سیکھنے میں صرف ہوتی ہے ۔ اگر صرف اس کے ظاہری پہلو کو لیجئے تو خوش پوشی کا ذوق بغیر دماغ خرچ کئے ہوئے حاصل نہیں ہوتا ۔ خوش پوشی سے میری مراد لامحالہ پوشاک کو قیمتی بنانے سے نہیں بلکہ یہ آدمی کے مذاق کی بات ہے جو طبیعت کی نفاست پسندی سے تعلق رکھتی ہے ۔ یہ مذاق بغیر قوت متفکرہ کے مسلسل کام میں لائے ہوئے نہ پیدا ہو سکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے ۔ اور وہ ایک ہی قوت ہے جو اس مذاق کی ترقی میں بھی کام آتی ہے اور اسی سے علوم و فنون وغیرہ میں بڑے بڑے کام لئے جاتے ہیں ۔ [۵]

---

[۵] ”معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی ذوق سلیم ہے جو خواہ کسی علمی حقیقت کی دریافت میں کام آئے خواہ زیوروں کے انتخاب میں یا فنون کے اصول اخذ کرنے میں ۔ مثال میں لباس کے فیشن کو لے لیجئے جس میں اچھے برے مذاق کا برابر خیال رکھا جاتا ہے ۔ ہر زمانہ میں لباس کا فیشن بدلا کرتا ہے ۔ یعنی اس کا کوئی جزو کبھی چھانٹ کر چست کر دیا جاتا ہے اور کبھی بڑھا کر ڈھیلا کر دیا جاتا ہے لیکن فی الجملہ سراپا کی وضع وہی باقی رکھی جاتی ہے ۔ گویا لباس کی عام طرح ایک مقرر ہے جس پر ہر زمانہ کا فیشن کم و بیش مبنی ہوتا ہے ۔ اب جس شخص کی ایجاد و اختراع فیشن میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے یا جس شخص کی خوش پوشی اس کے ذوق سلیم کی داد دیتی ہے وہ درحقیقت اسی فراست سے کام لینے کا عادی ہے جو اگر کسی بڑے مقصد کیلئے صرف کی جائے تو فنون کے بڑے بڑے کارناموں کے ذکر میں اسکے نتائج کہیں تو کمال فن کے نام سے موسوم ہوں اور کبھی ذوق سلیم کی جلی ترین مثال کہلائیں “ (ماخوذ از مقالات سر جوشوا رینالڈس) ۔

غرضکہ فی الجملہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے پاس ایک ہی دماغ ہے جس کو وہ جدھر چاہے لگا دے۔ کیونکہ دنیا میں آدمی زیادہ تر ایک ہی کام میں لگ سکتا ہے اور ایک ہی طرف پورا دھیان رکھ سکتا ہے۔ عورت کو تو سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہر ایک اُسی کی ذات سے اپنی راحت ڈھونڈھتا ہے اور اس کو اپنا وقت اور اپنی زندگی بہتوں کی خدمت کے لئے وقف کرنا ہوتی ہے۔ اُس کی مخصوص ذمہ داریاں تو دوسری ہی چیز ہیں۔ اگر کوئی مرد فقط اپنا کار زندگی انجام دینے کے علاوہ کسی کو خوش کرنے کے لئے اپنا ایک منٹ بھی نہ صرف کرے تو کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنے روزگار یا پیشہ کا عذر کرکے ہمیشہ اس قسم کی توقعات کو بالائے طاق رکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی عورت اپنے لئے وجہ معاش پیدا کرتی ہے تو بھی سوسائٹی اُس کے اس قسم کے عذرات سننے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس کے گھر میں کسی کی علالت یا موت کا عذر کسی خوشی کے جلسہ سے اُس کی غیر حاضری کو معاف کرا دے لیکن جس مشغلہ سے وہ اپنا پیٹ پالنا چاہتی ہے وہ ایسی صحبتوں سے غیر حاضر ہونے کے لئے کوئی حیلہ نہیں ہو سکتا جہاں اس کی صنف کو زینت محفل اور ذریعہ تفریح بنانے کا دستور ہے۔ بالعموم عورتوں میں سے اگر کسی کو کوئی نمایاں کام کرنا ہو تو اُسے سب سے بڑی پریشانی اس کے لئے وقت نکالنے میں ہوتی ہے اور یہی صورت حال ہے جس کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک اگر چاہے بھی تو کسی ایک طرف متوجہ نہیں ہو سکتی۔ پھر کیا عجب ہے جو عورتوں نے دنیا کے بڑے بڑے کاموں میں حصہ نہیں لیا۔ سائنس اور فلسفہ تو الگ رہا فنون لطیفہ میں تو صرف دماغ ہی صرف کرنا نہیں بلکہ ہاتھ کی مشق بھی درکار ہوتی ہے۔

شہرت مرد کے لئے عیب نہیں مگر عورت کے لئے عیب ہے

ہر ذہنی مشغلہ اور ہر فن میں ایک تو مہارت وہ ہوتی ہے جس سے پیشہ ور آدمی اپنی روزی کماتا ہے اور ایک مہارت اس کمال کا درجہ رکھتی ہے جسے حاصل کرکے آدمی زندۂ جاوید بن جاتا ہے۔ مگر اس پایہ کی مہارت بغیر کسی ایسے غیر معمولی جوش اور ہمت کے نہیں حاصل ہو سکتی جو انسان کو دائمی مشقت اور مسلسل کوشش پر آمادہ نہ کر دے۔ محض طبعی میلان ایسی بے پایاں شہرت حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ اب خواہ اس کی علت کچھ ہی ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ عورتوں میں اس شدت کی شہرت پسندی نہیں ہوتی جو اس کو اتنی ہمت دلائے۔ کیونکہ ان کے مفاد کا دائرہ نہایت محدود ہے۔

وہ اپنا اثر صرف اپنے آس پاس کی مخلوق پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ اُن کی آرزو اُن کی تمنا جو کچھ ہے وہ صرف اس قدر کہ جن لوگوں کو وہ اپنی نظر سے دیکھ سکتی ہیں بس وہ ان کو پسند کریں اور محبوب رکھیں۔ اور مقصد کے لئے جس قدر علم و ہنر درکار ہے وہی ان کے نزدیک کافی بھی ہے۔ یہ سیرت نسوانی کا وہ پہلو ہے جو بحالت موجودہ اُن کے متعلق رائے قایم کرنے میں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کو میں ان کی خلقت کی کجی پر ہرگز نہیں محول کرتا۔ مردوں کو شہرت کی جو ہوس ہے وہ تعلیم اور رائے عامہ کے اثرات سے پیدا ہوئی ہے۔ دنیا کی لذتیں چھوڑ کر مشقت کی زندگی اختیار کرنا شرافت نفس کی دلیل کہلاتا ہے۔ اور شہرت وہ چیز ہے جو اس عالی ہمتی کو اور فروغ دیتی ہے۔ لیکن یہی شہرت کی خواہش عورت کے لئے دیدہ دلیری اور ان کی نسوانیت کے منافی خیال کی جاتی ہے۔ پھر جب عورت کا معاشری فرض یہ ٹھیرا کہ جس کسی سے اسے سابقہ پڑے اُس پر وہ اچھا اثر قایم کرنے کی کوشش کرتی رہے اور اپنی راحت کا ذریعہ اُنہی کو قرار دے تو اس کا مفاد زندگی اس دائرہ سے بڑھ کر شہرت پسندی کی حد تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اپنے ہم جنسوں کی نظر میں وقعت حاصل کرنے کی خواہش یقیناً عورت کو اسی قدر ہوتی ہے جتنی مرد کو۔ لیکن ہمارا نظام معاشرت کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ عورت کی عزت اور وقعت کا دار و مدار زیادہ تر اس کے شوہر یا باپ بھائی کی وجاہت پر ہوا کرتا ہے۔ بلکہ اگر وہ اپنی ہستی کو بغیر کسی مرد کے توسط کے بڑھانا چاہے یا مرد سے اپنا رشتہ توڑنا چاہے تو یہی بات اس کی ذاتی عزت کو مٹا دینے کے لئے کافی ہے۔ جس شخص کی نظر ہماری موجودہ زندگی کے خانگی اور معاشری پہلوؤں پر پہنچ سکتی ہے اس کے لئے مرد اور عورت کی ظاہرا اہلیت اور نا اہلیت کے اسباب کو سمجھنا کوئی بات نہیں۔

عورت کی اخلاقی برتری | باعتبار اخلاق کے مرد اور عورت میں جو فرق ہے اس میں عورت کی برتری مسلم ہے۔ لیکن یہ فقط زبانی تعریف عورت کی ہے جسے سن کر خوددار عورتیں جھنجھلا اُٹھیں گی۔ کیونکہ دنیا کے کسی اور معاملہ میں ایسا نہیں ہوا کرتا کہ اچھے اخلاق والے ادنیٰ اخلاق والوں کی حکومت سہیں۔ اگر اس قسم کی فضول سائنس سے کوئی سبق حاصل ہوتا ہے تو یہی کہ اقتدار سے بڑھ کر نفس کو ذلیل کرنے والی کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ غلامی آقا اور غلام دونوں کے اخلاق کو غارت کرتی ہے لیکن اس میں غلام اُتنا

خراب نہیں ہوتا جتنا کہ آقا۔ کیونکہ اخلاقی قوت آزادی کی کمی یعنی "روک ٹوک" سے اُس قدر تباہ نہیں ہوتی جتنی کہ بے پایاں اختیارات کے استعمال سے۔ کہا جاتا ہے کہ عورتیں اُتنے جرائم نہیں کرتیں جتنے مردوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہی بات پرانے زمانہ کے حبشی غلاموں کی بابت بھی اتنی ہی صداقت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے بس ہی میں نہیں وہ جرائم میں مبتلا ہونے کا موقع کہاں سے پائیں گے؟ سوائے اُس صورت کے کہ خود اُن کے آقا اُنھیں اس کی ترغیب دیں۔ دنیا کے اس اندھے پن کی اس سے بڑھ کر مثال نہیں مل سکتی کہ عورتوں کے معاشرتی حالات پر کوئی نظر نہیں کرتا اور بڑے بڑے لکھے پڑھے لوگ بھی عوام کی طرح ایک طرف تو عورتوں کی ذہنی کمزوریوں کا دکھڑا روتے ہیں اور دوسری طرف اُن کے اخلاق کی احمقانہ داد بھی دے رہے ہیں!

عورت اگر متعصب ہے تو کیوں ۔

عورتوں کی اخلاقی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے اس عیب پر بھی نظر پڑتی ہے کہ ان میں اخلاقی تعصب بھی بہت ہوتا ہے۔ اور یہ برابر کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی تعصبات پر بالکل قابو نہیں رکھتیں۔ بلکہ اُن کی قوت فیصلہ ہر بات میں ان کی رغبت و نفرت کے تابع ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ بات کچھ ثبوت کی محتاج ہے کہ مردوں کو جس قدر ان کا ذاتی مفاد گمراہ کرتا ہے اُس سے زیادہ عورتوں کو ان کے تعصبات گمراہ کرتے ہیں۔ دونوں کا اصل فرق زیادہ تر اس بات سے کھلے گا کہ مرد اگر اپنے ذاتی فرائض اور مفاد عامہ کے لحاظ کو ترک کرتا ہے تو محض اپنی ذات کے فائدہ کے لئے لیکن عورت اگر ایسا کرتی ہے تو (چونکہ اُس کی ذات کوئی ہستی ہی نہیں رکھتی نہ اس کے لئے ذاتی مفاد درحقیقت کوئی چیز ہے) کسی اور کے فائدہ کے لئے۔ سوسائٹی عورتوں کو صرف یہ احساس سکھاتی ہے کہ ان کے فرائض کا دائرہ بس اُن لوگوں تک محدود رہے جن سے اس کا تعلق ہے۔ اور صرف اُنہی کے مفاد کا لحاظ اُسے کرنا چاہئے۔ جہاں تک اس کی تعلیم کا تعلق ہے اُنھیں ان خیالات کا شائبہ بھی نہیں پیدا کرایا جاتا جو معمولی سمجھ کے لوگوں کے مقاصد اور اخلاق کو وسیع اور برتر بناتے ہیں۔ چنانچہ جو کچھ شکایت عورتوں کی بابت باقی رہتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ان کی زندگی کا جو ایک فرض مقرر کیا گیا ہے اُس کو وہ حد سے زیادہ وفاداری کے ساتھ پورا کرتی ہیں کیونکہ دوسرے فرائض کی طرف متوجہ ہونے کی اُن کو

چنداں اجازت ہی نہیں۔

مردوں کو کیوں عورتوں کی حمایت کرنا چاہیے

عورتوں کی موافقت میں جو کچھ کہا جاتا ہے اُس کو عموماً یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ عورتیں جس حال میں بھی ہیں مگر کسی بات کی شاکی نہیں ہیں۔ اس طرح ممکن ہے کہ مرد کچھ دن اور اُن رعایتوں سے فائدہ اُٹھالیں جو معاشرت نے اُن کے لئے ناجائز طور پر مخصوص کر رکھی ہیں لیکن یہ غیر منصفانہ بات زیادہ دنوں چلنے والی نہیں۔ مشرقی حرم سراؤں کی عورتیں بھی تو کسی سے گلہ کرنے نہیں جاتیں کہ ہم کو یورپ والیوں کی سی آزادی کیوں نہیں دی جاتی۔ بلکہ برخلاف اس کے وہ تو یورپ والیوں کو نہایت دیدہ دلیر اور بے شرم کہتی ہیں۔ خود مردوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی غلامی کو محسوس کرتے ہیں لیکن دنیا میں اگر کوئی آزادانہ طریق معاشرت دریافت ہو جائے تب بھی یہ لوگ یقین ہے کہ اپنی موجودہ پابندیوں کا کوئی گلہ ہرگز نہ کریں گے۔ عورتیں اپنی صنف کے لئے کوئی عام شکایت نہیں کرتیں۔ لیکن اُن کی تحریریں کم از کم ایسے درد بھرے دکھڑوں سے جن سے کوئی عملی نتیجہ نکلنے کا گمان نہیں ہو سکتا ہرگز خالی نہیں ہیں۔ سردست ان کا شکوہ بس اُسی طرح کا ہے جیسے مرد غم دنیا کا شکوہ کیا کرتے ہیں۔ ایسے شکوہ کا مقصد نہ تو کسی پر کوئی الزام رکھنا ہوتا ہے نہ حالات میں کوئی تغیر پیدا کرنا۔ عورتیں اگرچہ شوہروں کے اختیارات پر براہ راست کوئی رائے زنی نہیں کرتیں لیکن ہر عورت جب موقع پا جاتی ہے تو خاص کر اپنے شوہر (یا شاید اپنی جاننے والیوں کے شوہروں) کے خلاف شکایتوں کا طومار ضرور باندھنا چاہتی ہے۔ اور یہ وہ صورت ہے جو بجنسہ ہر قسم کی غلامی میں (خاصکر جبکہ غلاموں کو آزادی کے خواب دکھائی دینا شروع ہو چکے ہوں) پائی جاتی ہے۔ آزادی کی تمنا جب پیدا ہونے لگتی ہے تو محکوم لوگ اپنے حاکموں کے اختیارات سے نہیں بلکہ پہلے اُن کے ظلم سے نالاں ہوتے ہیں اور بڑبڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد اُن کو حاکموں کے بے جا اختیارات پر حملہ کی جرأت ہوتی ہے۔ انگلستان میں عوام نے سب سے پہلے صرف چند حقوق بلدیہ (میونسپلٹی کے حقوق) کا مطالبہ کیا تھا پھر انھوں نے یہ ضد شروع کی کہ جبتک انتظامات میں ہماری رائے نہ شامل کی جائے ہم سے ٹیکس نہ مانگے جائیں۔ کیا اُس زمانہ میں کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ بالآخر یہی عوام اپنے بادشاہ کے شاہی اختیارات بھی چھین لیں گے؟ اب نسوانی تحریک حریت ہی

وہ تحریک رہ گئی ہے جس میں پرانے قاعدوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اشخاص اُسی طرح مطعون ہوتے ہیں جیسے وہ لوگ جو پرانے زمانہ میں اپنے بادشاہ سے اپنا حق بغاوت تسلیم کرانا چاہتے تھے ۔ اور ہر دلع کی لعن طعن سنتے تھے ۔ جو عورت اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف کسی تحریک میں حصہ لینا چاہتی ہے قبل ازیں کہ وہ دوسروں کے لئے خود کو شمع ہدایت بنا سکے شہادت کا مرتبہ پہلے ہی پالیتی ہے ۔ کیونکہ جہاں اُس نے دوسروں کو ابھارنا شروع کیا اس کے شوہر نے اُس کو وہیں پر روک دیا ۔ پس عورتوں سے خود اپنی آزادی کے لئے کوشش کرنے کی چنداں توقع ہی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ مرد بھی بڑی تعداد میں اُن کا ہاتھ بٹانے پہ آمادہ نہ ہو جائیں ۔

غزل

کسی نے ابھی مجھ کو مانا نہیں ٭ موافق مرے یہ زمانہ نہیں
ابھی اور چمکیں گے جوہر مرے ٭ ابھی مجھ کو دنیا نے جانا نہیں
مری شاعری ہے تقاضائے ذوق ٭ مجھے زورِ فن آزمانا نہیں
مجھے خلق کے دل میں کرنا ہے گھر ٭ فقط رنگ اپنا جمانا نہیں
جو کہتا ہوں میں دل کی ہے واردات ٭ یہ کچھ شاعری یا فسانا نہیں
زمانا ہوا مجھ کو جیتے ہوئے ٭ مزا میں نے جینے کا جانا نہیں
نہیں ہے وہ، دل ہے کوئی اور شے ٭ اگر تیرِ غم کا نشانا نہیں
سمجھا یا میں نے بہت نیک و بد ٭ یہ دل میرا کم بخت مانا نہیں
مرا شیشۂ دل ہے نازک بہت ٭ نظر سے تم اس کو گرانا نہیں
خفا جس قدر چاہو مجھ سے رہو ٭ مگر دل سے مجھ کو بھلانا نہیں

میں ہنستا رہا زندگی بھر جلیل
کسی نے مرا درد جانا نہیں

۶۲ء

"کیفِ غم"

نہ اعتبار قفس کا نہ آشیانے کا
یہاں مقام نہیں کوئی دل لگانے کا

دلِ حزیں نہ رہا رنجِ ہجر اُٹھانے کا
کہاں سے لاؤں مگر حوصلہ بُھلانے کا

کبھی ملامتِ شکوہ کبھی شکایتِ شکر
بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں وہ روٹھ جانے کا

کوئی شہیدِ ستم ہے کوئی قتیلِ کرم
معین ایک طریقہ نہیں مِٹانے کا

کہیں سے سُنیئے کسی کی زبان سے سُنیئے
ہر اک فسانہ ہے ٹکڑا مرے فسانے کا

نہ وہ تڑپ ہے نہ ہیجانِ آرزو دل میں
مآل دیکھ لیا ــــ؟ صبر آزمانے کا

سمندِ عمر تو کچھ سُست رَو نہ تھا کوکبؔ
کہ برقِ غم نے کیا کام تازیانے کا

دنیا کی رفتار

(الف) غیر ممالک

حبش اور اٹلی حبش پر ان سطور کے لکھے جانے تک تو اٹلی نے حملہ نہیں کیا ہے۔ مگر تیاریاں مکمل ہیں۔ اور گذشتہ اشاعت میں برطانیہ اور فرانس کے اثر سے اٹلی کے باز رہ سکنے کا جو ذکر تھا وہ اثر بھی کارگر نہ ہوا۔ تینوں دول کی مشاورتی مجلس ناکام رہی۔ اور کیوں نہ رہتی۔ فرانس کا احتجاج محض رسمی اور دکھاوے کی بات تھی۔ اس لئے کہ فرانس تو کچھ عرصہ سے اٹلی کو ساتھ لینے کے لئے پوری کوشش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر اٹلی جرمنی کے ساتھ ہو گیا تو سیاسی اقتدار کا جو فرانسیسی جال تمام یورپ میں پھیلایا ہے وہ نابود ہو جائے گا۔ رہی انگلستان کی حبش دوستی اور انصاف پروری تو یہ بھی برطانوی اغراض کے میٹھے میٹھے نام ہیں۔ اور اٹلی والے ایسے نادان تو ہیں نہیں کہ ان باتوں کو نہ سمجھیں!

اٹلی کا ایک ممتاز جریدہ' ال جوزال واٹالیہ' لکھتا ہے:۔ "برطانوی سلطنت بہت دولتمند ہے' بہت آباد ہے اور بہت وسیع ہے' لیکن برطانیہ کی یہ وسیع سلطنت صرف اس کے شہریوں کی پرامن حوصلہ مندی کا نتیجہ نہیں بلکہ اخلاقی اصولوں سے یکقلم بے نیاز فوجی فتوحات کا ثمر بھی ہے۔ انگلستان کے پاس اس وقت بھی آدھا افریقہ ہے۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ اس کے پاس کیسے آیا۔ اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے مقبوضات میں تہذیب پھیلا کر ایک نیک کام کر رہا ہے تو اسے بھی ہمارے تہذیب پھیلانے کے حق کو تسلیم کرنا چاہیئے!"

جزیرہ سارڈینیا میں ان سپاہیوں کو مخاطب کر کے جو افریقی مہم پر بھیجے جا رہے تھے مسولینی نے کہا:۔ "کاگلیاری کے سیاہ پوش نوجوانو! ہمیں نئے پرانے بہت سے حساب چکانے ہیں اور وہ سب چکائے جائیں گے۔ ہمارے ملک سے باہر جو کہہ رہے ہیں اس پر کان نہ دھرو۔ ہم تو بس حرف بحرف

انھیں لوگوں کی نقل کریں گے جو اس وقت ہمارے استاد بن رہے ہیں۔ وہ ہمیں پہلے ہی اچھی طرح سکھا چکے ہیں کہ جب سلطنت بڑھانے یا اس کے تحفظ کا سوال آتا ہے وہ دنیا کی رائے کا ذرا لحاظ نہیں کرتے!"

ان بیانات کے ہلکے طعن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ کا یہ منہ تو نہیں کہ وہ کسی اخلاقی اصول کی حمایت کا نام لے کر اٹلی کو حبش پر قابض ہونے سے روکے۔ جمعیۃ اقوام کی رکنیت' آزادی اقوام' ایک قدیم عیسائی حکومت کی حمایت' پسماندہ قوموں کی حمایت یہ سب انچھر کہیں اور چل جائیں تو چل جائیں اس ملک پر کیسے چلتے جس سے برطانیہ مدتوں سے اسی حبش کے علاقہ کی بانٹ کے متعلق "ساز باز اور عہد و پیمان" کرتا رہا ہے۔ اٹلی اب اس برطانیہ اخلاقی تعلیم کو کیسے آسانی مان لے جس نے ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۴ء میں اسی اٹلی سے ۳ معاہدے کئے جن تینوں میں حبش کے تقریباً تمام علاقہ کو اٹلی کا حلقہ اثر تسلیم کیا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۸۹۶ء میں اٹلی نے اپنی شکست کے بعد حبش سے جو معاہدہ کیا اس میں حبش کی کامل خودمختاری تسلیم کی" مگر فرانس اور برطانیہ سے جب بھی اس باب میں گفت و شنید ہوئی تو یہ سارا علاقہ اٹلی ہی کے حلقہ اثر میں مانا گیا۔ ۱۹۰۶ء کے معاہدہ میں بھی پھر ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۴ء کے معاہدوں کے مسلمات کو مانا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں اٹلی کی افریقی سلطنت کے مسئلہ پر مفصل تبصرہ ہوا اور لندن میں جو خفیہ معاہدہ ہوا اس میں بھی اٹلی سے افریقی نوآبادیوں میں اضافہ کا وعدہ کیا گیا کہ اس وقت جرمن حلوائی کی دوکان پر ہر ایک کو فاتحہ پڑھنے کا موقع تھا مگر جب جرمنی کی شکست کے بعد اس کی افریقی نوآبادیاں فاتحوں میں تقسیم ہوئیں تو فرانس اور برطانیہ نے تو افریقہ میں اپنا نوآبادی رقبہ بڑھا لیا مگر اٹلی کو اس میں حصہ نہ ملا۔ پھر اٹلی نے ۱۹۱۹ء میں اپنی نوآبادیوں اریٹریا اور سومالیہ کے درمیان حبش کے بیچ میں سے ہو کر ریل نکالنے کی تجویز برطانیہ کے سامنے پیش کی اور اس کے عوض برطانیہ کی اس خواہش میں مدد کا وعدہ کیا کہ وہ نیل ازرق پر بند باندھ سکے اور وہاں سے سوڈان کو ایک سڑک لے جائے تو اس یادداشت میں بھی اٹلی نے صاف لکھا تھا کہ "جھیل تسانہ کا رقبہ (جہاں سے نیل ازرق نکلتا ہے) اطالوی حلقہ اثر میں ہے اور اطالوی حلقہ اثر میں تمام حقوق اعلیٰ بحق اٹلی محفوظ ہیں!"

شاید اس وقت یہی بات برطانیہ کو ناگوار ہوئی کہ یہ معاملہ آگے نہ بڑھنے دیا گیا۔ مگر آخر ۱۹۲۵ء میں برطانیہ نے اٹلی سے یہی معاہدہ کیا بشرطیکہ اٹلی نیل ازرق کے پانی کے معاملہ میں مداخلت سے احتراز کا وعدہ

کرے۔ اس معاہدہ میں بھی تو برطانیہ نے تسلیم کیا تھا کہ " مغربی حبش بلا شرکت غیرے اطالوی حلقۂ اثر میں ہو اس حلقہ میں جس قدر معاشی مراعات کا مطالبہ اٹلی کرے گا ہم اس کی حمایت کریں گے" اگر اس کے جواب میں برطانیہ یہ کہے کہ اس نے صرف معاشی حلقہ اثر تسلیم کیا تھا سیاسی نہیں تو اس کے جواب خود شاہ حبش کا یہ قول پیش کر دینا کافی ہے کہ " ہم اس حقیقت سے کیسے چشم پوشی کریں کہ معاشی اور سیاسی حلقہ اثر میں بہت قریب کا رشتہ ہوتا ہے "!

غرض یہ کہ برطانیہ کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ اٹلی پر کوئی اخلاقی اثر ڈال سکے۔ فرانس اٹلی کو جرمنی کا ساتھی نہیں بنانا چاہتا اس لئے برطانیہ کے اخلاقی راگ میں بہت دھیمے سُروں سے شریک ہے۔ بلکہ خیال تو یہ ہے کہ قیام روما کے زمانہ میں موسیو لاول فرانسیسی وزیر نے اٹلی کو اس معاملہ میں پوری آزادی کی بشارت دیدی ہے۔ حبش کا مسئلہ دراصل زور آوروں میں ایک کمزور کے مال کی تقسیم کا مسئلہ ہے۔ جاپان تک نے وہاں جو حقوق حاصل کرلئے ہیں ان کا ذکر ہم پچھلی اشاعت میں کرچکے ہیں۔ حبش کی ہمدردی نہیں بلکہ ان حقوق کا پاس ہے کہ اگر جاپانی سفیر متعینہ روما مسولینی کو یقین دلاتا ہے کہ جاپان کو حبش میں صرف اپنے معاشی اغراض سے سروکار ہے وہ کوئی سیاسی تعلق نہیں چاہتا تو جاپانی رائے عامہ کے دباؤ سے جاپان کی وزارت خارجہ یہ اعلان کرتی ہے کہ یہ بیان ہمارے ایما سے نہیں دیا گیا۔ انھیں حقوق کا پاس ہے کہ جاپان میں حبش کے مسائل کے مطالعہ کے لئے جمعیتوں پر جمعیتیں قائم ہو رہی ہیں اور ان کی طرف سے حبشی وزارت خارجہ کو ہمت افزائی کے پیام بھیجے جارہے ہیں اور یہ مشورہ دیا جارہا ہے کہ ملک کی آزادی کسی دام ہاتھ سے نہ دینا۔ امریکہ نے جو اپنا نہایت قابل سفیر اس دور افتادہ اور پسماندہ ملک میں بھیجا تھا تو وہ بھی کچھ یونہی نہیں۔ ایک امریکن اور برطانوی سرمایہ کی کمپنی نے آخر شاہ حبش کی موجودہ مصیبت سے فائدہ اٹھا کر آدھے ملک حبش کے تیل کا ٹھیکہ حاصل کرہی تو لیا۔ برطانیہ جو اخلاق سیاسی کی حمایت میں اٹلی کے خلاف قوت تک کے استعمال کو آمادہ معلوم ہوتا ہے اور جس کی بے غرضی کا یہ عالم ہے کہ اس مذکورہ بالا تیل کے ٹھیکہ کے متعلق اس نے حبشی حکومت کو خود اپنے اور امریکہ کے سرمایہ داروں کے مفاد کے خلاف یہ مشورہ دیا ہے کہ ٹھیکہ اس وقت نہ دیا جائے (اگرچہ اس یقین کا ذکر بھی خبروں میں آچکا ہے کہ حبشی حکومت یہ مشورہ قبول نہ

کرے گی !) وہ بھی اپنے اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کی تدبیروں سے غافل نہیں ہے جو تقریباً نصف صدی سے اس کے پیش نظر ہے یعنی جھیل تسانہ کے پاس نیل ارزق پر ایسا بند بنانا جس پر اس کا قابو ہو۔ سنا ہے کہ گذشتہ جون میں مصری، سوڈانی (برطانوی نہیں !) حکومتوں اور حبشی حکومت میں معاہدہ ہوا ہے کہ اس بند کی تعمیر جس کا ٹھیکہ نیو یارک کی وھائٹ کمپنی کو دیا جاچکا تھا مگر کام میں بوجوہ تعویق تھی، اب بہت جلد شروع ہو جائیگی ۔ اس خبر کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصری حکومت نے اواخر سنہ گذشتہ میں تعمیری کام کے جس پروگرام کا اعلان کیا تھا اس میں اس بند کے لئے بھی روپیہ کی گنجائش رکھی گئی ہے ۔ اس مذکورہ معاہدہ کی رو سے، کہتے ہیں کہ، کام کے مصارف ۹۰ فی صدی (تقریباً ۳ کروڑ روپیہ) مصری حکومت اور ۱۰ فیصد سوڈانی حکومت برداشت کرے گی ۔ تکمیل کے بعد محفوظ پانی میں سے ۱۰ فیصد سوڈان کو ملا کرے گا اور یہ حصہ ۲۵ سال بعد ۵۰ فیصد تک بڑھ سکتا ہے بشرطیکہ سوڈان مصارف میں بھی اس نسبت سے شریک ہو ۔ حبش کو معاہدہ کی تکمیل پر ۵۰ لاکھ روپیہ ملے گا اور بند کی تیاری کے بعد سے ہر سال ڈیڑھ لاکھ روپیہ بطور لگان ۔ اور اگر حبش کو روپیہ کی فوری ضرورت ہو تو اس لگان کی جگہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بند بن جانے پر ۵۰ لاکھ روپیہ نقد لے لے اور پھر دس سال تک ہر سال ۵۰ ہزار روپیہ ۔ بند کی تیاری میں حتی الوسع حبشی مزدوروں سے ہی کام لیا جائیگا ۔ جھیل تسانہ کے پانی کی سطح پانی کے روکنے کی وجہ سے اونچی نہ ہونے دی جائیگی اور اگر کبھی ایسا ہو اور اس سے آس پاس کی املاک کو نقصان پہنچے تو مصری حکومت مالکان کو تاوان ادا کریگی ۔ بند کی تعمیر کا کام شروع ہونے سے پہلے مصری اور سوڈانی حکومتوں کو ادیس ابابا سے اس جھیل تک ایک موٹر کی سڑک بنانی ہوگی اور اس کی مرمت کے مصارف برداشت کرنے ہوں گے ۔

مختصر یہ کہ جاپان، امریکہ، برطانیہ سب اپنی اپنی فکر میں ہیں ۔ اور حبش کی موجودہ مصیبت کے فائدے اٹھا رہے ہیں ۔ اٹلی چاہتا ہے کہ سب کچھ اسے ملے ۔ اور یہ اٹلی کے مخالف اس لئے ہیں کہ انھیں بھی کچھ مل رہے ۔ جمعیۃ اقوام سے بھی اس حالت میں کسی معقول مدد کی جو واقعی حبش کے فائدہ کے لئے ہو امید رکھنا عبث ہے ۔ اس کے متعلق بھی تو کہنے والے نے خوب کہا ہے ۔ " بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند "

لیکن خود غرضیوں کے اس معرکہ میں بہت سے اور اندیشے بھی ہیں۔ سب سے زیادہ اندیشہ تو یہ ہے کہ شاید اٹلی کو اس شان کی فتح نہ ہو اور اس قدر جلد نہ ہو جتنی کہ اس کی توقع ہے۔ اٹلی کی مالی حالت کچھ بہت اچھی نہیں ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اٹلی ایک طویل جنگ کے بار کو اچھی طرح اٹھا بھی سکیگا یا نہیں۔ ۳۶-۱۹۳۵ء کے میزانیہ میں اس جنگ کے مصارف کے لئے گنجائش نہ رکھنے کے باوجود ایک ارب ۷۰ کروڑ لیرا کا خسارہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری ریاستوں کے میزانیوں کا خیال کیجئے تو یہ خسارہ کچھ ایسا بہت نہیں۔ مگر اٹلی کے اپنے ملک میں نہ لوہا پیدا ہوتا ہے نہ کوئلہ، نہ تیل، نہ ربر، نہ کپاس اور یہ چیزیں صنعتی ترقی کی بنیاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار جتن کرلے کے باوجود اٹلی کا توازن تجارت اس کے خلاف ہے۔ ۱۹۳۴ء میں تجارت خارجہ میں ۴ فیصدی کی کمی ہوگئی اور وہ بھی اس ترتیب سے کہ برآمد میں تقریباً ۱۴ فیصدی کمی ہوئی اور درآمد میں ۴ فیصدی سے اوپر اضافہ۔ مجبوراً جون میں بہت سی چیزوں کی درآمد پر سابقہ اجازت نامہ کی قید لگائی گئی۔ اس لئے کہ درآمد کی قیمت ادا کرنے کے لئے ۱۰ دسمبر ۱۹۳۴ء سے ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء تک سرکاری بنک سے کوئی ۲ ارب لیرا نکالے جا چکے ہیں۔

مالی حالت کے قابل اطمینان نہ ہونے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر جنگ نے طول کھینچا تو اٹلی کی دشواریاں بہت بڑھ جائیں گی۔ اس کا اثر آسٹریا میں کمزور ہوگا تو دفاں توفی۔ اشتراکی جماعت جو پہلے سے خاصی قوی ہے اور جرمنی کے ساتھ آسٹریا کا الحاق چاہتی ہے اور قوت پکڑیگی اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر جرمنی نے آسٹریا کا رخ کیا تو فرانس کو لامحالہ میدان میں کودنا پڑے گا۔ اور ایک عالمگیر جنگ کا آغاز ہو جائیگا جسے ہر چند کہ سب ناگزیر سمجھتے ہیں مگر ہر ایک اسے کچھ اور ٹالنے کی فکر میں ضرور ہے۔

دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اگر اٹلی ان یورپی پیچیدگیوں کے باعث اور اپنی مالی کمزوری کی وجہ سے اس مہم میں ناکام ہوا تو مسولینی کا اقتدار اٹلی میں ختم ہو جائیگا۔ اور اس اقتدار کے خاتمہ کے معنی یہ ہیں کہ اٹلی میں بالشویک طرز کی حکومت قایم ہو جائے۔ کہ فاشستی انقلاب کے بعد تغیر کی صورت بالشویکی انقلاب ہی نظر آتی ہے۔ اور یہ بات روس کے علاوہ کسی مغربی حکومت کو پسند نہیں۔ اس لئے کہ مسولینی شورہ پشت سہی مگر پھر سرمایہ داری نظام کا محافظ ہے۔

ان پیچیدگیوں کے پیش نظر مختلف دول کے رویہ کے متعلق پیش گوئی کرنا بہت دشوار ہے، مگر انداز یہ ہے کہ اٹلی جنگ کریگا۔ فرانس بظاہر اور انگلستان دل سے اس میں مزاحم ہونے کی کوشش کریں گے لیکن اس طرح نہیں کہ ان کی مزاحمت موثر ثابت ہو سکے۔ اٹلی جلد سے جلد کوئی فوجی فتح حاصل کرنے کی تدبیر کرے گا۔ اور اس کے بعد جمعیۃ اقوام یا دول عظمیٰ کے کہنے پر سمجھوتہ کریگا۔ اس سمجھوتہ میں اسے اس سے تو بہتر شرائط حاصل ہو جائیں گے جیسے اس وقت تک پیش کئے گئے ہیں۔ مگر شاید وہ سب کچھ حاصل نہ ہو سکے جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس کے "حق" میں سے جاپان، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کو بھی حصہ رسدی مل جائے! اور کیا عجب ہے کہ شاطر حکومت کو باوجود ہمدردی انسانی اٹلی سے زیادہ ہی حصہ مل رہے!

مگر یہ سب عقلی قیاسات ہیں۔ تاریخ میں ایک نہایت موثر عنصر قسمت و اتفاق کا بھی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ چھوٹی فوجوں نے بڑی فوجوں پر اور کمزوروں نے زور آوروں پر غلبہ پایا ہے جبش کے حریت پسند مجاہد اگر مغربی استعمار کے مقابلہ پر اڑ گئے تو کیا عجب ہے کہ اس پسماندہ قوم کے ہاتھوں ہی یورپ کے سارے نظام معاشرت کا شیرازہ بکھر جائے!

<u>اسپین</u> گذشتہ چار برس میں اسپین کو مشکل ہی سے ایک دن کو بھی چین نصیب ہوا ہے۔ چار سال پہلے جس جمہوریہ کا قیام ہوا تھا اس کا سب کام نومبر ۱۹۳۳ء کے انتخابات نے ختم کر دیا۔ اس انتخاب میں قدامت پسند اور معتدل جماعتوں کی بہت بڑی اکثریت حکومت کے لئے منتخب ہوئی۔ اور اس نے سابقہ انتہا پسندوں کے کئے ہوئے کاموں کو مٹانے کی سب تدبیریں کیں۔ گذشتہ اکتوبر میں جب ان کارروائیوں کے خلاف بلوے ہوئے تو انھوں نے نہایت مضبوطی سے انھیں دبا یا اور اس وقت سے جتنی وزارتیں بنی ہیں سب نے ایک ایک کرکے انتہا پسندوں کو قومی کاموں سے الگ کر دیا ہے۔ موجودہ وزیر اعظم لیرو بہت مضبوط آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لئے مارشل لا کے زور پر حکومت کر رہے ہیں۔ جون میں پھر مارشل لا کی مدت میں توسیع کر دی گئی اور وجہ یہ بتائی گئی کہ پولیس کا دباؤ کم ہوتے ہی پھر بدامنی شروع

ہو گئی تھی۔ اسی زمانہ میں وزارت نے ہر قسم کے سیاسی جلسوں کو تا حکم ثانی ممنوع قرار دیدیا۔ لیکن ان تدابیر سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کے قدم کچھ بہت مضبوط نہیں ہیں۔ اور اس کے خلاف ناراضی کے جذبات عام ہیں۔ اس لئے کہ اس ممانعت سے چند ہی روز پہلے ویلنسیا میں سابق وزیر اعظم مانول ازانا کی تقریر سننے کے لئے ۸۰ ہزار آدمیوں کا مجمع ہوا تھا جس میں انھوں نے فرمایا " ہمیں جمہوریہ کے قیام کے لئے پھر سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی جمہوریہ جو ۱۴ اپریل ۱۹۳۱ء والی جمہوریہ سے بہت بہتر ہو۔ اسپین کو امن اور سکون درکار ہے، جماعتی انصاف کی ضرورت ہے۔ اور یہ صرف لفظوں میں نہیں واقعی "۔ قرائن ہیں کہ یہ مانول ازانا اور سابق وزیر عدل پریٹو تمام ان سیاسی جماعتوں کو جو قدامت پسند نہیں ہیں یکجا کر کے متحدہ کارروائی کا انتظام کر رہے ہیں۔

مالی حالت نازک ہے۔ پردیسی قرضوں اور درآمد کی قیمت کی ادائیگی کے لئے بہت بڑی رقم باہر بھیجنی ہے۔ قومی ساکھ گھٹ رہی ہے۔ اگر اسپین ان وجوہ سے باہر کے ملکوں سے مال نہیں خرید سکتا تو باہر کے ملک اسپین سے کیسے خریدیں۔ ڈر ہے کہ اگر تجارت یوں ہی بگڑتی گئی تو ملک میں نہایت سخت بیکاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صورت حال کو درست کرنے کے لئے ساکھ کی خرابی کے باعث باہر سے اور قرض لینا دشوار ہے اس لئے اندرون ملک ہی میں مصارف کم کرنے کی تدبیریں کرنی ہونگی۔ اور یہ کام سیاسی بے اطمینانی کے زمانہ میں بہت دشوار ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اسپین میں پھر حکومت کا کوئی انقلاب جلد رونما ہو۔

یوگوسلاویا گذشتہ مئی کے انتخابات کے بعد دنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ یوگوسلاویا میں امن چین ہے اور سربیوں اور کروئیوں کی باہمی مخالفت میں معتدبہ کمی ہو گئی ہے اور عنقریب یوگوسلاویا کو ایک متحدہ قوم سمجھا جا سکے گا۔ لیکن پچھلے چند ماہ کے حالات سے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی۔ شروع جون میں جب نئی یوگوسلاوی پارلیمنٹ (سکپشتنا) کا اجلاس ہوا تو صرف کروئی نمائندوں نے ہی شرکت سے انکار نہ کیا بلکہ حکومت کی مخالف دوسری سیاسی جماعتوں کے مندوب بھی اجلاس میں شریک نہ ہوئے۔ کروئی نمائندے تو

اپنے قائد اعظم اسٹیفن راڈچ کے قتل (۱۹۲۸ء) کے بعد سے پارلیمنٹ میں شریک نہیں ہوئے اور
انھوں نے اس انتخاب کے بعد بھی یہی اعلان کیا ہے کہ جب تک سیاسی انتخابات کسی بالکل غیر جانبدار
حکومت کی نگرانی میں عمل میں نہ آئیں ہم حکومت سے تعاون کرنا نہیں چاہتے - ۲ر جون کو ان کروٹی اور
دوسری مخالف جماعتوں کے قائدوں نے جو قرار دادیں منظور کیں ان کا منشا یہ ہے کہ (۱) ۱۹۱۸ء سے
برابر ملک میں ایک کشاکش ہے - جس میں ایک طرف کروٹ قوم کی یہ امید ہے کہ یوگوسلاوی حکومت انہیں
آزادی بخشے گی اور دوسری طرف یہ سربی حوصلہ ہے کہ یوگوسلاویہ کو بس ایک بڑا سرویا بنالیں - (۲)
موجودہ حکومت نے معاملہ کو اس درجہ بڑھا دیا ہے کہ سمجھوتہ کی توقع تقریباً کالعدم ہے - (۳) اگرچہ
پچھلے انتخابات میں سرکاری پولیس نے بے شمار کروٹی کسانوں کو قتل تک کر ڈالا مگر کروٹ قوم کا عزم
مصمم ہے کہ موجودہ مطلق العنان حکومت کی اس کوشش کا کہ کروٹ جماعت کو ملک میں ایک پست
جگہ دی جائے آخر دم تک مقابلہ کرے گی - (۴) یوگوسلاویا کی بقا اس پر منحصر ہے کہ کروٹ جماعت
کے مطالبات جلد از جلد پورے کئے جائیں ، موجودہ حکومت کے حامیوں نے پارلیمنٹ میں اپنی بریت
کے ثبوت دینے چاہے - اور اس میں کروٹ مخالفت کو بے حقیقت ثابت کرنا چاہا - اور جوش اتنا
بڑھا کہ ساری کروٹ قوم پر خاص لعن طعن شروع ہو گئی حتیٰ کہ شاہ اسکندر کے قتل کی سازش میں شمولیت کا
الزام بھی کروٹ قائدوں پر لگا دیا گیا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزارت کے پانچ اراکین نے جو اعتدال پسند
تھے استعفیٰ دیدیا اور اس طرح وزارت ٹوٹ گئی - شہزادہ پال نے بھی جو اس وقت ایجنٹ ہیں کچھ
نرمی کا ثبوت دیا - اور کروٹ جماعت کے قائد ڈاکٹر ماچک کو بلگریڈ بلایا گیا - ماچک کا یہ سفر
گویا ایک فاتح کا جلوس تھا - بلگریڈ میں شہزادہ پال کے سامنے ماچک نے اپنے مطالبات پیش کئے اور اس پر
آمادگی ظاہر کی کہ وہ کئی مہینہ انتظار کر سکتے ہیں تاکہ ایک غیر جانبدار حکومت عام انتخابات کا انتظام کردے
اس کے بعد ایک نئی وزارت ترتیب دی گئی - وزارت میں بہت سی ان جماعتوں کو شامل کیا گیا جو ملک
میں صلح و آشتی کے خواہاں ہیں - بوسنیا کے مسلمانوں کو بھی اس میں شریک کیا گیا - سابق وزیر اعظم
کو وزارت میں شریک نہیں کیا گیا - بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی وزارت کروٹ جماعت کے ساتھ

انصاف کریگی اور کرد ٹوں کے قائد ڈاکٹر ماچک کو جن کے مشورہ سے یہ قائم ہوئی ہے ضرور اس کا یقین ہے، لیکن غریب کروٹ پہلے بھی اس قسم کی بہت سی امیدیں خاک میں ملا چکے ہیں، اس لئے ابھی مشتبہ نظر سے اس سب تبدیلی کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن شہزادہ پال کا اثر غالباً اس مرتبہ کوئی معقول فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو جائے۔

رومانیا | بظاہر اس ملک میں امن ہے۔ مگر یہ سکون غالباً طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ سکون کے قایم رکھنے کے ذرایع ذرا مشتبہ قسم کے ہیں۔ اکثر بڑے شہروں میں فوجی قانون نافذ ہے۔ تقریر کی آزادی سلب کی جا چکی ہے۔ اخبارات پر سنسر متعین ہے، اور ہر شخص جس کو کوئی بھی سیاسی اہمیت حاصل ہے زیر نگرانی ہے۔ یہ سب اس لئے کہ موجودہ حکومت اور خاندان شاہی کا اقتدار قایم رہے جو اقتدار اپنے قیام کے لئے ان وسیلوں کا محتاج ہو اس کی بنیادیں ظاہر ہے کہ مضبوط نہیں ہوتیں۔ اور اس سارے ہنگامہ کی اصلی وجہ —— کون باور کریگا —— ایک مہ جبین یعنی شاہ کرول کی محبوبہ ماگدالوپسکو ہے! یہ عورت جب سے شاہ کرول کے دل پر قابض ہوئی ہے رومانیا کے ملک پر بھی حکومت کر رہی ہے اور اس کی خاطر حکومت اور خاندان شاہی ساری قوم سے برسرپیکار ہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے کہ کسانوں کی سیاسی جماعت نے جو ملک میں بڑی اہمیت رکھتی ہے ایک عظیم الشان جلسہ کیا جس میں تمام ملک سے نمائندے شریک ہوئے اور اس میں ان کے قائد ڈاکٹر جولیس مانیو نے شاہ کرول کو صاف صاف الفاظ میں متنبہ کیا کہ ابھی وقت ہے کہ میڈم لوپسکو کو ملک سے باہر بھیجدیا جائے ورنہ رومانیا کے کسان جو آبادی میں ۸۰ فیصد ہیں تخت شاہی کے خلاف بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ دوسرے مقرروں نے جتایا کہ میڈم لوپسکو کے تسلط کی وجہ سے اور محل کی سازشوں کے باعث ملک دنیا کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتا۔ دوسری سیاسی جماعتوں نے بھی اس قسم کے احتجاجی جلسے کئے ہیں۔ ایک طرف رومانی قوم ہے اور تخت شاہی، دوسری طرف —— میڈم لوپسکو! غریب کرول کے لئے فیصلہ واقعی مشکل ہوگا۔!!

یونان | یونان کا سب سے اہم سیاسی مسئلہ تقریباً دس سال سے یہی ہے کہ ملک میں حکومت خالص جمہوری ہو یا شاہی۔ مشہور سیاسی ونی زلوس جمہوری گروہ کا قائد تھا حکومت میں فوجی افسروں کے روزافزوں اثر نے اسے گذشتہ مارچ کی بغاوت پر آمادہ کیا۔ یہ بغاوت حکومت وقت نے نہایت آسانی سے دبا دی۔ خیال تھا کہ بغاوت کے بعد جو انتخابات ہونگے ان میں شاہ پسندوں کا پلہ بھاری رہیگا۔ مگر گذشتہ جون میں جب انتخابات ہوئے تو ۳۰۰ نشستوں میں سے صرف ، شاہ پسندوں کو ملیں۔ اور وزیر اعظم سلدارس اور فیلڈ مارشل کنڈ اٹلس کی جماعت ۲۸۰ نشستوں پر اپنے آدمی منتخب کرانے میں کامیاب ہوئی۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاہ پسندوں کی قوت بہت کم ہے اور یہ آسانی سے شاہی حکومت قایم نہیں کرا سکتے۔ مگر انتخاب کے بعد سے صورت حال کچھ ایسی بدل رہی ہے شاہ پسند تو کہتے ہیں کہ اگلے موسم سرما میں سابق شاہ جارج یونان کے تخت پر متمکن ہوں گے۔ اور قرائن بھی یہی بتاتے ہیں کہ اگر یہ توقع مبالغہ سے خالی نہیں تو بلاشبہ ملک اور اس کے اہل سیاست اس وقت شاہی حکومت کے قیام کے بہت زیادہ حامی ہیں، مثلاً یونان کے دو مشہور مدبر نکولاس پولیٹس نے، جو موجودہ نظام حکومت کے بانیوں میں سے ہے، خود بیان کیا ہے کہ قانونی شاہی مطلق جمہوری حکومت سے بلا شبہ ہزار گنی بہتر شکل حکومت کی ہے" خود وزیر اعظم سلدارس جو انتخابات سے پہلے شاہی یا جمہوریت کے مسئلہ پر قومی رائے حاصل کرنے کا مخالف تھا اب اس کا حامی ہوگیا ہے۔ اور وزیر جنگ مارشل کنڈ اٹلس نے آخر جون میں اس خیال کا اظہار کیا کہ انھیں سابق بادشاہ کے واپس بلانے کے خیال سے ہمدردی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں کی حمایت کے باعث اور خالص شاہ پسندوں کی کمزوری کے سبب سے بادشاہ اگر واپس آئیگا تو بھی حکومت کی شکل آئینی شاہی کی ہوگی مطلق العنان بادشاہت کی نہیں۔

چین | چین میں کیومن ٹانگ جماعت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو اٹلی میں فاشستی جماعت کو اور جرمنی میں نازیوں کو۔ مسولینی اور ہٹلر کی طرح اس جماعت کا قائد اعظم جنرل چیانگ کائی شیک ہے۔ چین کی بڑی ضرورت یہ ہے کہ ملک میں سیاسی وحدت پیدا کی جائے اور وسائل دولت کو ترقی دی جائے۔ سات

آٹھ سال سے یہ جماعت ان دونوں کاموں کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ لیکن بیرونی حکومتیں خصوصیت کے ساتھ جاپان اسے یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کی مہلت نہیں دیتیں۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں تانگو کے مقام پر التوائے جنگ کا جو معاہدہ ہوا تھا اس سے فائدہ اٹھا کر جنرل چیانگ نے مرکزی حکومت کو خاصا مضبوط بنا لیا اور اصلاح کے کاموں میں بھی اچھی ترقی کی۔ ۱۸ جون کے نیوز کرانکل میں سر سیموئل ہور نے لکھا تھا "امن و قیام کی ترقی کی علامات نظر آ رہی ہیں اور مرکزی حکومت کے حلقوں کی کامیابی سے اس کا اثر و اقتدار بڑھ رہا ہے" گذشتہ جنوری میں جاپان کی حکومت بھی چین سے صلح کرنے کے لئے آمادہ نظر آتی تھی اور اپریل میں اس نے چین کی ترقی کا اعتراف اس طریقہ پر کیا کہ اپنی چینی سفارت کو لیگیشن کی جگہ ایمبیسی کا مرتبہ دے دیا۔ لیکن پہلی جون کو عین اس وقت جب سفیروں کے تبادلہ کی خوشی میں دعوت ہو رہی تھی جاپانی فوج کا ایک نمائندہ تمام دنیا سے چین کی غداری، اشتعال انگیزی اور رشوہ دوانیوں کی شکایت کرنے لگا جس کی پاداش میں چین کے سامنے جاپانی فوج نے چودہ مطالبات پیش کئے اور ان مطالبات کے تسلیم کرانے کے لئے ہزاروں جاپانی سپاہیوں، ٹینکوں، مسلح موٹروں، توپوں اور دیگر اسلحہ جنگ کی نمائش کی گئی اور چودہ دن کے اندر جاپانیوں نے اپنے یہ تمام مطالبات چین کی قومی حکومت سے منظور کرا لئے۔

جاپان کو زمین کی جس بھوک نے بے چین کر رکھا ہے اس کی تسکین منچوکو جیسی آزاد ریاستوں کے قیام سے نہیں ہو سکتی چاہے ان میں اس کا اثر و اقتدار کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو جائے۔ وہ پھیلنا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے اور سرحدوں کی حد بندیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن جب تک جاپان تمام دنیا کو اپنے زیر نگیں نہ کر لے سرحدیں بہرحال باقی رہیں گی اور لوگ یہ کہیں گے کہ "بس جناب اس کے آگے آپ کا حکم نہیں چل سکتا" لیکن جاپان کی طاقتور اور منظم فوج اس گستاخی کی تاب نہیں لا سکتی اور تلوار کھینچ کر جواب طلب کرتی ہے "کیوں؟" اس کا جواب چین غریب کیا دے سکتا ہے۔ سہم کر پیچھے ہٹتا ہے۔ جاپانی تلوار نیام میں کر کے ایک قدم آگے بڑھا لیتا ہے۔ چین کہتا ہے "خیر یونہی سہی۔ آئندہ سے سرحد یہاں سے شروع ہوگی" جاپانی پھر بگڑ کر تلوار پر ہاتھ رکھتا ہے غرضکہ پیشقدمی اور پسپائی کا سلسلہ برابر جاری ہے،

برطانیہ، امریکہ، روس سب اپنی فکروں میں مبتلا ہیں ۔ خواہ مخواہ کی لڑائی مول لینا نہیں چاہتے رہی انجمن اقوام سو وہ ایسا ڈھونگ ہے جس کا فریب روز بروز کھلتا جا رہا ہے ۔

جاپانی فوج سے جھگڑا سرحد پر ہی ہو سکتا تھا ۔ منچوکو ریاست کے مغرب میں چہار اور جنوب میں ہوپی ای کے چینی صوبے ہیں ۔ ان دونوں صوبوں کے گورنروں سے جاپانی فوج کو شکایت پیدا ہوئی ۔ چہار کے صوبہ میں شکایت یہ تھی کہ جاپانی فوج کے چار خاص افسروں کو چانگ پی ای کے مقام پر کئی گھنٹہ تک روکے رکھا گیا ۔ ان لوگوں کے پاس نہ پاسپورٹ تھے اور نہ کوئی اور ایسا کاغذ جن سے ان کی شناخت کی جا سکتی ۔ ہوپی ای کے صوبہ میں شکایت یہ تھی کہ چین کے ایسے دو اخبار والوں کو کیوں قتل کیا گیا جنہیں جاپانی فوج اپنی موافقت میں پروپیگنڈا کرنے کے لئے تنخواہ دیتی تھی ۔ لیکن شہر ٹائنسٹین میں جہاں یہ چینی قتل ہوئے انتظام دراصل جاپانی پولس اور جاپانی فوج کا تھا اس لئے چینی حکومت اس الزام سے بالکل بری تھی ۔

جاپانی مطالبات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان صوبوں کے گورنر برطرف کر دئے گئے ۔ ان کی جگہ ایسے گورنروں کا تقرر کیا گیا جو قومی حکومت کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں ۔ قومی افواج ان علاقوں سے ہٹالی گئی ہیں ۔ تمام ایسے حکام جن پر جاپانی فوج کو بھروسہ نہیں تھا علیحدہ کر دئے گئے ہیں ۔ کیومن ٹانگ یعنی چینی قومی پارٹی کے تمام دفاتر ان علاقوں میں بند کر دئے گئے ہیں ۔ شمالی چین میں جتنی جماعتوں کے متعلق یہ شبہ تھا کہ یہ جاپان کی مخالف ہیں سب توڑ دی گئی ہیں ۔ جن درسگاہوں کے متعلق یہ خیال تھا کہ ان میں جاپان کے خلاف تعلیم دی جاتی ہے وہ بند کر دی گئی ہیں ۔ جن چینی کتابوں میں جاپان کے خلاف کہیں کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی وہ جلا دی گئی ہیں ۔

ان واقعات کے مطالعہ سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو رہی ہے کہ جاپان آہستہ آہستہ چین میں گھستا جا رہا ہے اور کسی مقام پر رکنے کا ارادہ نہیں رکھتا ۔ کیونکہ جب کسی نئے علاقہ پر قبضہ کرتا ہے تو اس کی مدافعت کے لئے اس کے قریب کے علاقوں پر اثر قائم کرنا ضروری ہو جاتا ہے ۔ یہ اثر بڑھتے بڑھتے قبضہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ پھر مجبوراً آگے کے علاقوں میں اثر قائم کرنے کی ضرورت درپیش

ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے ۔ جاپان نے پہلے جنوبی منچوریا پر قبضہ کیا۔ اس کی مدافعت کے لئے شمالی منچوریا میں اثر پیدا کرنا ضروری ہوگیا ۔ جب تمام منچوریا پر مکمل اقتدار حاصل ہوگیا تو اس کی مدافعت کے لئے جہول اور اندرونی منگولیا پر اثر قائم کرنا ضروری ہوگیا اندرونی منگولیا پر قبضہ ہونے کے بعد اس کی مدافعت کے لئے ہوپی ای اور چہار پر اثر قائم کرنا ضروری ہوا ۔ ان کے قبضہ میں آجانے کے بعد آگے کے اور علاقے ہیں تا آنکہ کل جمہوریت چین پر جاپان کا قبضہ ہو جائے گا ۔ جنرل چیانگ کائی شیک اور انکی قومی جماعت سیاسی وحدت اور ملکی ترقی دولت کے خواب دیکھتے رہیں گے اور تلخ حقایق ان کے ہاتھوں سے ان کا ملک چھین کر جاپانی امپیریلزم کے حوالے کر دیں گے چین کا ملک بھی ہندوستان سے کم بدنصیب نہیں ہے ۔ دیکھئے ان دونوں ستم زدوں کے نصیب کب پھرتے ہیں !

تنقید و تبصرہ

کتب:-

تزک والا جاہ مصنفہ برہان ابن حسن، حصہ اول، مترجمہ سید محمد حسین نینر" مدراس یونیورسٹی اسلامک سیریز، نمبر ۱۔ (انگریزی) تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$، حجم ۱۴۷ صفحہ۔ قیمت صہ

یہ ایک سلسلے کی پہلی قسط ہے جس کا مقصد کرناٹک کے نوابوں کی تاریخ کے فارسی ماخذ اہل علم کی خدمت میں پیش کرنا ہے۔ ہندستان کی تاریخ سے جو لوگ سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں وہ اس سلسلے کی اہمیت کا اندازہ کر سکیں گے۔ کرناٹک کے نواب ہندستانی والیان ملک میں پہلے لوگ تھے جنھوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو ملکی مسائل میں دخل دینے کی دعوت دی اور اس طرح ایک رسم قائم کی جس کی بدولت ہندوستان ایک غیر قوم کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ لیکن باوجود اس کے کہ کرناٹک کے نوابوں نے انگریزوں کی حمایت قبول کی اور ثابت قدمی سے ان کا ساتھ دیتے رہے، انگریز مورخ ان کی کمزوریوں اور غلطیوں ہی کو یاد کرتے ہیں۔ جو تصنیف اس وقت زیر نظر ہے اس میں صرف نواب انورالدین خاں کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس میں ایک جگہ وہ احسانات انگریز سپہ سالار سر آیر کوٹ کی زبانی بیان کئے گئے ہیں جو انورالدین خاں نے انگریزی کمپنی پر کئے، اور یہ بھی جتا دیا جاتا ہے کہ نواب ان پر مہربان نہ ہوتا تو فرانسیسی انھیں سمجھ لیتے۔ ہمیں اس بات پر خوشی ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ معلوم کرکے بہت کچھ تسکین ہوتی ہے کہ کرناٹک کے نوابوں میں شرافت اور خودداری کی کمی نہیں تھی، ان کا قصور جو کچھ ہے سیاسی ہے، طبعی بداندیشی کا نتیجہ نہیں۔ فاضل مترجم نے فارسی ترکیبوں اور لفظی صنعتوں کو انگریزی میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر بہت اندازکے ساتھ، اور ترجمے میں خاصی روانی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں دکنی تاریخ کے ماخذوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو حضرات تاریخ سے شوق رکھتے ہیں انھیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

م م

شذرات

مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم کی وفات اتنا بڑا قومی حادثہ ہے کہ اس کا داغ ہمارے دلوں سے مدّت تک نہیں مٹے گا۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا کوئی گھرانا ایسا نہ ہوگا جس میں مولوی صاحب کا ماتم نہ ہو رہا ہو۔ اخباروں میں جن تعزیتی جلسوں کی خبریں آتی ہیں ان میں ایک ذرا سا شائبہ اس غم والم کا نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا پورا اندازہ ان غیر رسمی صحبتوں کو دیکھ کر ہوتا ہے جن میں خاندان کے چھوٹے بڑے مل کر مرحوم کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ان کا کوئی قریبی عزیز دنیا سے اٹھ گیا۔ اتنے دلوں میں جگہ کر لینا ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ اہل دل ہی کے حصے میں آیا ہے۔

مرحوم ان چند بزرگوں میں سے تھے جن کے حساس قلب پر غدر کے بعد مسلمانوں کی پستی کو دیکھ کر چوٹ لگی، جن کی بلند ہمت نے انھیں اس پستی سے ابھارنے کا عزم کر لیا اور جن کی صائب تدبیر نے اس عزم کو حتی الامکان پورا کیا۔ ان بزرگوں میں سے ہر ایک نے قومی زندگی کو سدھارنے کا کوئی کام اپنے ذمے لے لیا اور اسی کے ہو رہے۔ مولوی صاحب مرحوم کا کام سب سے مشکل تھا۔ جہالت اور تعصب کی وجہ سے ہر اصلاحی کوشش کی مخالفت ہوتی تھی لیکن تعلیم نسواں، حقوق نسواں کا تو نام ہی لینا غضب تھا۔ سرسید مرحوم جیسے روشن خیال بزرگ جو تحریک اصلاح و ترقی کے روح رواں اور اس شعر کے حقیقی مصداق تھے[۵]

یک چراغےاست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

تعلیم نسواں کے بارے میں تاریک خیال نہیں تو تنگ خیال ضرور تھے، مولوی صاحب انھیں کے نظر کردہ تھے مگر ان کی نظر اس معاملے میں زیادہ وسیع اور زیادہ گہری تھی اور ان کی ہمت کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں جس نے قوم کی مخالفت کے علاوہ سردار قوم کی مخالفت کا ادب سے، خاموشی سے استقلال سے مقابلہ کیا اور کم و بیش چالیس سال کی مدت میں تعلیم نسواں کے پیام کو ہندوستان کے ایک ایک گوشے میں پہنچا دیا۔ اب زمانے کا رنگ اور قوم کا مذاق بہت کچھ بدل گیا ہے مگر ابھی تک تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کی

اہمیت جیسی چاہیئے نہیں سمجھی گئی ہے۔ جس دن یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آجائے گی اس دن مولوی ممتاز علی کی ذات اور ان کی خدمات کی حقیقی قدر ہوگی۔

ہم مرحوم کے صاحبزادوں اور دوسرے عزیزوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کے طلبہ اور اساتذہ اس درد میں جس کا کوئی درماں نہیں ان کے شریک ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کی مغفرت کرے ان کے اعقاب کو صبر عطا فرمائے۔ اس نے اپنے فضل سے مرحوم کو ایسے قابل بیٹے عطا فرمائے ہیں جو ان کے کام کو پہلے سے کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ہمیں اُمید ہے کہ سید امتیاز علی صاحب تاؔج مرحوم کی ایک مبسوط سوانح عمری مرتب فرمائیں گے جو خادمانِ ملت کے لئے شمع ہدایت ثابت ہوگی ؎

انقلاب فرانس

مصنفہ

مولوی عبدالقادر صاحب بی۔ اے۔ (جامعہ)

مکتبہ جامعہ سے دنیا کے مختلف ممالک کے انقلابات پر مختصر کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اٹلی، روس، امریکہ، آئرلینڈ وغیرہ کے انقلابات کے حالات زیر ترتیب ہیں۔ ناظرین کے لئے یہ بہت ہی دلچسپ اور پُر از معلومات سلسلہ ہے خصوصاً یہ پہلی کتاب اُردو زبان میں اس موضوع پر ایک خاص حیثیت کی حامل ہے۔ فوراً طلب فرمائیے۔ قیمت صرف ۱۲؍

انجام (ڈراما)

مصنفہ

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن)

یہ ڈراما رسالہ جامعہ میں شائع ہو کر بیحد پسند کیا جا چکا ہے اور جامعہ کے طلبا نے اسٹیج بھی کیا تھا۔ اس میں انسان کی خود فریبی کا ایک نمونہ اور جھوٹی مذہبیت کی پردہ داری اس انداز میں کی گئی ہے کہ پڑھنے والے حیرت سے دنگ رہ جاتے ہیں اور وہ اثر لے کر اٹھتے ہیں کہ انکی روح ایک عرصہ تک بیچین رہتی ہے۔

مزاحیہ پارٹ بھی بڑا خوشگوار ہے۔ کتاب الہ آباد کے خوشنما ٹائپ میں نہایت اچھی چھپی ہے قیمت صرف ۱۲؍

کسان

مترجمہ

جناب محمود علی خانصاحب جامعی

اس کتاب میں کسان کے افلاس کے اسباب اور ان کے علاج پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا ہے کہ قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اسکو خوشحال سے محتاج بنایا گیا؟ اور اب کیا صورتیں اختیار کی جائیں کہ دوبارہ اس کے دن پھر جائیں۔

کسانوں کے غریب طبقہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ضرور پڑھیں۔ قیمت ۸؍

دو خدائی خدمتگار

مترجمہ

جناب محمود علی خانصاحب جامعی

ڈاکٹر خانصاحب اور خان عبدالغفار خاں کے حالات زندگی انگریزی زبان میں مہاتما گاندھی کے ارشاد پر مہادیو ڈیسائی نے لکھے تھے۔ یہ کتاب ان ہی حالات کا نہایت سلیس اور نفیس اُردو ترجمہ ہے۔ اسے پڑھکر آپ صوبہ سرحد کی سیاسی تحریک سے ابتدائی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں

کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ اور آٹھ تصویریں بھی ہیں۔ قیمت صرف ۱۲؍

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سالنامہ پیام تعلیم دہلی

(تاسیس نمبر ۳۵ء)

نہایت خوشی کی بات ہے کہ پیام تعلیم کا تاسیس نمبر ۲۹ اکتوبر ۳۵ء کو بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوگا۔ دستی تصویریں، ہاف ٹون اور لائن بلاک اس غیر معمولی تعداد میں دئے جائیں گے کہ بچوں کے کسی پرچے میں آج تک شائع نہ ہوئے ہوں گے۔ یہ لاجواب تحفہ بچوں کے لئے ایک ایسی چیز ہوگی کہ عرصے تک وہ اسے اپنے پاس رکھ کر خدمت خلق اور قوم پرستی کا سبق سیکھیں گے۔ ۳۴ء کے سالنامہ کے مقابلہ میں یہ نمبر اسی قدر بہتر ہوگا جس قدر ۳۵ء میں پیام تعلیم سالگذشتہ کے مقابلہ میں ترقی کر گیا ہے۔ جو بچے اس سب سے اچھے باتصویر رسالے کے خریدار نہیں ہیں فوراً ۲ر روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر خریدار بن جائیں۔ یا اگر صرف یہ شاندار پرچہ خریدنا چاہتے ہوں تو ۸ر کے ٹکٹ بھیجدیں۔ پرچہ ۲۹ اکتوبر کو انہیں مل جائے گا۔

منیجر "پیام تعلیم" قرول باغ۔ دہلی

رجسٹرڈ نمبر

اکتوبر ۳۵ء

ال-۱۰۴۲

جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ عہ

مطبع جامعہ دہلی

فی پرچہ عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴	ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء	نمبر ۱۰

فہرست مضامین

(پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا)

خط مولانا حالی مرحوم

برخوردار — تمہارا خط پہنچا مگر اسکو پہنچے ہوئے اب بہت دن ہو گئے اب بہت جلد
اپنی اور متعلقین کی خیریت لکھو جبکہ بارش نہ ہونے [illegible] کو دیکھ [illegible]
نہ لکھا تھا اور بارش کا حال بھی لکھو کہ ہوئی یا نہیں یہاں ابھی بارش نہیں ہوئی مگر دلی [illegible]
سے بارش کی خبر آئی ہے — بمبئی میں مولوی محمد علی صاحب سخت بیمار ہو گئے تھے اور انکا [illegible]
پاس ہو گیا تھا اور علاج [illegible] [illegible] بہت [illegible] مگر [illegible] علاج [illegible]
انہیں کے پاس بمبئی میں ہیں — میں نہایت عدیم الفرصت ہوں اسی سبب سے دیوان اور
[illegible] وغیرہ نہیں بھیج سکا [illegible] دعا اور سلام [illegible] اطلاع کر دو راقم الطاف حسین حالی از علیگڑھ
۱۳ [illegible] ۱۹۰۳ء



مولانا حالی مرحوم

حالی

مولانا حالی مرحوم کی زندگی کے حالات یا تو اس مختصر یادداشت میں ملتے ہیں جو انھوں نے خود مرتب کی تھی اور جو مکتوبات حالی اور مقالات حالی کے ساتھ شائع ہوئی، یا اس چھوٹے سے رسالے میں جو محمد امین زبیری صاحب نے لکھا ہے۔ امید ہے کہ اس موقع پر جب حالی صدی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جارہا ہے، ہمارے اہل قلم میں سے کوئی مولانا حالی کی ایک مبسوط سیرت لکھنے کا ڈول ڈالے گا۔ ہماری آنکھیں مولوی عبدالحق صاحب کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

ہم اس مضمون میں ایک سرسری خاکہ مولانا حالی کی سیرت کا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک دھندلی سی، ادھوری تصویر ہے جو مولانا کی نظم و نثر کو پڑھ کر اور ان کے حالات ان کے عزیزوں سے سن کر، ذہن میں قائم ہو گئی ہے۔

اس تصویر میں ایک معلم، ایک نقاد، ایک مصلح قوم کے خط و خال بھی موجود ہیں لیکن دل کی کیفیت جو آنکھوں سے جھلکتی ہے صاف کہہ رہی ہے کہ یہ ایک شاعر کا چہرہ ہے۔

شاعر کا مفہوم ہمارے ملک میں بہت محدود ہو گیا ہے۔ ہم ایک عرصے سے ایک خاص کینڈے کے شاعر دیکھتے آئے ہیں اور ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ سب شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ شاعر کا ہیولےٰ ایک ہے مگر تربیت کے فرق سے اس کی صورتیں دو ہو جاتی ہیں۔ وہ جوہر جو سب شاعروں میں عام ہیں یہ ہیں: تخیل کی تیزی، نظر کی باریکی، حسن اور تناسب کی پرکھ، احساس کی شدت خصوصاً محبت اور خودی کے جذبات کی فراوانی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کس زمانے میں پیدا ہوتا ہے اور اسے ان جوہروں کی تربیت کے لئے کون سا میدان ملتا ہے۔

اگر زمانہ انتشار کا ہے، معاشرت کا شیرازہ بکھر چکا ہے، فرد کا رشتہ جماعت سے ٹوٹ گیا ہے، سب اپنے اپنے حال میں اور اپنی اپنی فکر میں ہیں تو شاعر بھی باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر کے اندر کی دنیا میں ڈوب جاتا ہے۔

اس کا تخیل اور اس کا مشاہدہ نفس کے دائرے کو اپنی جولانی کے لئے تنگ پاتا ہے تو اس واردات کو جو قلب پر گزرتی ہے بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس میں نئی نئی باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مشاہدے کی قید ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ محض خیال کے جادو سے وہ ایک طلسم حیات باندھتا ہے اور اسی میں مگن رہتا ہے۔ اس کی نظریں حسن اور تناسب کو ڈھونڈتی ہیں مگر وہ عالم فطرت اور عالم معاشرت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک خیالی پیکر حسن تراشتا ہے اور اس کی خفیف سی جھلک کسی انسان میں دیکھ کر اسے اپنا معشوق بنا لیتا ہے۔ محبت کا جذبہ جس کی وسعت نامحدود ہے سمٹ کر اسی ایک مرکز پر قائم ہو جاتا ہے اور اس کی شدت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اور تمام جذبات کو اپنے رنگ میں رنگنا اور شاعر کی ساری زندگی پر چھا جانا چاہتا ہے۔ مگر خودی کا جذبہ جو احساس داخلیت کی فضا میں پھیل کر خود پرستی کی حد تک پہنچتا ہے محبت یا عشق کا حریف مقابل بن جاتا ہے۔ عشق اور خودی کی اس کشمکش سے شاعر کی نفسی زندگی میں ایسے پیچ پڑ جاتے ہیں جو کھولے نہیں کھلتے۔ وہ وارفتہ مزاج، بے چین اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ وہ شدت سے محبت کرتا ہے اور اس سے زیادہ شدت سے شکایت کرتا ہے۔ جب معشوق اس پیکر خیال سے مختلف ثابت ہوتا ہے جو اس کے ذہن میں ہے، جب اصلی زندگی طلسمی زندگی سے ٹکراتی ہے، تو وہ کڑھتا ہے، مچلتا ہے، فریاد کرتا ہے۔ اس کی وضع نفسی کی پیچیدگی، اس کے جذبات کا انتشار اور شدت، اس کے اسلوب بیان میں پیچیدگی، مبالغہ اور بے ربطی پیدا کر دیتی ہے۔ اردو شاعری نے اگر پہلے نہیں تو انیسویں صدی کے شروع سے یہی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جو لوگ اس صدی میں پیدا ہوئے انھوں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو انھیں صرف اسی قسم کی شاعری اور اسی قسم کا شاعر نظر آیا۔ کسی اور طرز کے شاعر کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر زمانہ موافق ہو، روح اجتماعی زندہ ہو، افراد کا رابطہ حیات و کائنات سے قائم ہو، شاعر کی خلقی صفات کو نشو و نما کا موقع ملے تو وہ کچھ اور ہی چیز ہو جاتا ہے۔ تخیل کی تیزی مشاہدے کی وسعت کے ساتھ مل کر اسے خدا کی دنیا اور انسان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دکھاتی ہے، اس وسیع جلوہ گاہ میں اسے حسن و تناسب کا حقیقی جلوہ حسن صورت اور حسن معنی کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ فطرت کی ہم آہنگی اور معاشرت کے توازن سے آشنا ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں بھی ربط، ضبط اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کا جذبۂ محبت نوعی ہمدردی کے ساتھ مل کر اس قدر وسعت حاصل کرتا ہے کہ دوستی، صلۂ رحم، حب وطن، حب انسان سب پر حاوی ہو جاتا ہے اور اگر وہ حب الٰہی کا حوصلہ کرے تو اسے زیب دیتا ہے۔ شاعر کی خودی کو یہ عالمگیر محبت کاٹ چھانٹ کر سنوارتی ہے۔ انانیت کے کانٹے نکل جاتے ہیں۔ خودداری، غیرت، اغنائے نفس کے پھول باقی رہ جاتے ہیں۔ زندگی اور خیالات کی حقیقت اور ہم آہنگی اسلوب بیان سے سادگی اور سچائی بن کر ٹپکتی ہے۔ یہ شاعر متین، خود مزاج، منکسر اور بردبار ہوتا ہے۔ وہ نفس انسانی، عالم معاشرت، عالم فطرت کے حقائق کو ہمدردی کی نظر سے خود دیکھتا ہے اور دوسروں کو دکھاتا ہے۔ دردوسوز اسی کا حصہ ہے اس لئے کہ اسے صرف اپنا ہی غم نہیں سارے جہان کا غم ہوتا ہے۔ عاشقی کا دعویٰ اسی کو پھبتا ہے اس لئے کہ وہ اپنی خودی کا عکس معشوق کی ذات میں نہیں ڈھونڈھتا بلکہ معشوق کی حقیقی صفات کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی طرف کھنچتا ہے زندگی کی تلخیاں اسے بھی چکھنی پڑتی ہیں، محبت کی کڑیاں اسے بھی جھیلنی پڑتی ہیں مگر وہ ضبط اور متانت کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ زیادہ ہی کرتا ہے تو سادگی اور سچائی سے۔

شاعر کے اس تصور کو ذہن میں رکھ کر حالی کی زندگی پر نظر ڈالئے۔ خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ بھائی بہنوں کی سرپرستی میں اس دریتیم کی پرورش ہوئی حالی کو شروع سے "خود بخود تعلیم کا شوق حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔" پہلے پانی پت کے دستور کے مطابق کلام مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں اور عربی صرف و نحو پڑھی۔ ۱۷ برس کی عمر میں حالی کی شادی کردی گئی اور بہ ظاہر ان کی تعلیم کا دروازہ بند ہوگیا۔

"مگر علم کی لگن نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ حالی "گھر والوں سے روپوش ہو کر" دلی چلے آئے۔ اور ڈیڑھ برس وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی پڑھیں۔ یہاں انھیں غالب کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ مرزا کے فارسی اور اردو شعر جو سمجھ میں نہیں آتے تھے وہ ان سے حل کیا کرتے تھے اور ان کے چند فارسی قصیدے بھی ان سے پڑھے۔ شاعری کا جوہر جو فطرت نے حالی کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا غالب کے فیض تربیت سے ابھرنے لگا۔ ایک آدھ غزل اردو فارسی کی کہہ کر غالب کو دکھائی تو انھوں نے

کہا "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" سترہ اٹھارہ برس کی عمر کے لڑکے سے غالب جیسے جوہر شناس نے یہ بات کچھ دیکھ کر اور کچھ سمجھ کر کہی ہوگی۔

بزرگوں اور عزیزوں کے جبر سے حالی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پانی پت واپس جانا پڑا۔ حصار میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں داخل ہوئے مگر ۱۸۵۷ء کی بدامنی میں گھر چلے آئے۔ کوئی چھ برس تک وہیں رہ کر "بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر" پڑھتے رہے۔

۱۸۶۳ء میں نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رئیس جہانگیر آباد نے انھیں طلب کیا اور آٹھ برس تک نہایت شفقت اور محبت سے اپنے پاس رکھا۔ نواب صاحب اردو اور فارسی کے خوش گو شاعر تھے۔ ستھرا اور پاکیزہ مذاقِ سخن رکھتے تھے۔ ہم مذاق مربی کی صحبت سے حالی کی شاعری چمک اٹھی۔ اس عرصہ میں وہ غالب سے اصلاح لیتے رہے مگر اس سے اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا نواب صاحب کی صحبت سے۔ "وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور سیدھی سادی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔"

۱۸۶۹ء میں غالب نے وفات پائی۔ حالی نے اپنے شفیق استاد کا جو مرثیہ لکھا وہ ایک طرف ان کے کمالِ شاعری کا نمونہ ہے تو دوسری طرف ان کی احسان شناسی اور عقیدت مندی کو ظاہر کرتا ہے جو شاعروں کے یہاں بہت کم یاب جنس ہے۔ غالب کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے بہتر قلمی تصویر ہماری نظم و نثر میں نہیں ملتی۔ یونانیوں کے ذہن میں جو تصور "انسانیت" کا تھا اس کی جھلک حالی کو غالب کی ذات میں نظر آئی اور اسے انھوں نے شعر کا جامہ پہنا کر بقائے دوام بخش دی۔

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا   معنیِ لفظِ آدمیت تھا

یہ ایک شعر ایک قصیدے سے کم نہیں ہے۔

تھوڑے ہی دن کے بعد نواب شیفتہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حالی کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں جگہ مل گئی۔ یہاں ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوں ان کی عبارت کو درست کر دیا

کریں۔ لاہور کے اس چار برس کے قیام نے حالی کے مذاق ادب اور مذاق شعر کو بہت کچھ بدلا۔ انگریزی کتابوں کے ترجموں پر نظر ڈالنے سے حالی کی طبع سلیم نے وہ باتیں اخذ کرلیں جو لوگوں کو انگریزی ادب کی تحصیل میں عمریں کھپانے سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ "نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی" ادھر مولوی محمد حسین آزاد نے ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی "جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس عنوان پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔"

حالی نے اس مشاعرے کے لئے چار نظمیں "برکھارت" "نشاط امید" "مناظرۂ رحم و انصاف" اور "حب وطن" لکھیں۔ ۱۸۷۴ء یا ۱۸۷۵ء میں وہ لاہور سے دہلی اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آئے۔

یہ حالی کی زندگی اور ان کی شاعری کا پہلا دور ہے۔ ان کے اس زمانے کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ ان کے مکتوبات میں جو شائع ہوئے ہیں ۱۸۷۷ء سے پہلے کا کوئی خط نہیں۔ ان کی نظم و نثر سے سوائے اس کے کہ ان کے جذبات و خیالات کا اندازہ ہو زندگی کے واقعات کا کچھ پتہ نہیں چلتا اس لئے کہ خود نمائی اور خود فروشی ان کا شیوہ نہیں تھا۔ جو کوئی حالی کی سیرت لکھے گا اسے اس دور کے حالات معلوم کرنے میں بڑی کرید اور تلاش سے کام لینا پڑے گا۔

پھر بھی جو کچھ معلوم ہو سکا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی کی آدھی سے زیادہ عمر عسرت اور گمنامی میں کٹی۔ ان کی شادی خوش حال گھرانے میں ہوئی تھی مگر ان کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ گھر کی روٹیاں توڑیں۔ ان کے بزرگوں کو اپنے علم و فضل کی وجہ سے سلطنت مغلیہ سے مدد معاش ملتی تھی، سلطنت کے زوال کے بعد حالی کے والد کو اور خود ان کو انگریزی حکومت کی نوکری کرنی پڑی مگر زمانے کا رنگ بدل چکا تھا مشرقی علوم کی قدر نہیں رہی تھی۔ نئے حکمرانوں کے ہاں رسوخ حاصل کرنے کے لئے جن صفات کی ضرورت تھی ان سے حالی محروم تھے۔ اس لئے چھوٹے عہدوں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ مگر اس کے باوجود ان کے احباب میں چھوٹے بڑے سب ان کا احترام کرتے تھے۔

ان کے پاکیزہ اخلاق اور سیدھی سادی خاموش طبیعت میں کس غضب کا وقار ہوگا کہ غالب جیسا

شخص اپنے نوجوان شاگرد کے آگے جھکتا تھا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ حالی نے واعظانہ جوش میں "نماز پنجگانہ کی فرضیت پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا جس میں ان سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔" غالب کے پاس اس زمانے میں گم نام خط بہت آیا کرتے تھے جن میں لوگ "ان کے افعال و اعمال پر بہت نازیبا طریقے سے نفریں و ملامت کرتے تھے اور کھلم کھلا گالیاں تک لکھتے تھے۔" حالی کی تحریر پڑھ کر برس پڑے، اپنی گنہگاری کا اعتراف ایسے دل خراش الفاظ میں کیا جس سے انتہائی رنج و غصہ ظاہر ہوتا تھا۔ دوسرے روز انھوں نے حالی کو ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں ان کی نصیحت گری کا شکوہ تھا۔ حالی نے معذرت کے طور پر ایک قطعہ ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس کو پڑھ کر غالب نے ایک قطعہ شیفتہ کو بھیجا جن کے ساتھ حالی دلی میں مقیم تھے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ غالب اور شیفتہ دونوں حالی سے کس قدر محبت رکھتے تھے اور ان کی کتنی عزت کرتے تھے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری — ہمی بہ لطف تو خود را امید وار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید — تو گر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال — بر آں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عبادات عمر پیشینہ — دگر بہ پیشگہ حالی اعتذار کنم

۲ حالی نے پھر انتہائی ندامت کے ساتھ معذرت کا قطعہ لکھا۔ آخر غالب نے یہ کہہ کر کہ "بس بیت بحثی موقوف" اس قصے کو ختم کیا۔ اس واقعے سے حالی کے مذہبی جوش کا بھی پتہ چلتا ہے جو وہ اس عمر میں رکھتے تھے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کی رو میں ادب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے کا انھیں کتنا رنج ہوا۔

مگر زمانے کا اثر کس غضب کا ہوتا ہے کہ حالی جیسا جوان صالح شاعری کی محفل میں قدم رکھ کر وہی رنگیلا راگ گانے لگا جو وہاں چھڑا ہوا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ہندوستان میں تمدن و معاشرت کے انتہائی تنزل کے ساتھ شاعری بھی پستی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ انفرادیت اور داخلیت کا رنگ جس کا ذکر ہم نے اس مضمون کے ابتدا میں کیا ہے، چھایا ہوا تھا۔ اور وہ بھی ایسا بگڑا ہوا رنگ جس نے اخلاق کے ساتھ ادب کو بھی بگاڑ دیا۔ داخلیت

اور جذبات پرستی اشخاص میں ہو یا قوموں میں جوانی کے ساتھ کھپ جاتی ہے مگر خزاں عمر میں کسی طرح نہیں نبھ سکتی۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھے تو ایک بات ہے مگر کاتک کا اندھا ہرا ہی ہرا دیکھنا چاہے تو سمجھنا چاہیئے کہ عقل کی آنکھوں سے بھی معذور ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا شباب مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا۔ گردش روزگار نے ان کی کمر توڑ دی تھی مگر وہ جوان بننے کے شوق میں اکڑتے پھرتے تھے۔ ان کے دلولے سرد ہو چکے تھے مگر ٹھنڈی گرمیاں ابھی تک چلی جاتی تھیں۔ جوانی کے نشے میں انسان خود بخود اپنے نفس کی کیفیات میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے لیکن جوانی کے گزر جانے کے بعد وہ کوشش کر کے یہ بے خبری پیدا کرنی چاہے تو اس کے دو ہی طریقے ہیں یا تو وہ عیش و عشرت کے گرداب میں چکر کھاتا ہے یا ترک و تجرد کے سراب میں لوٹا کرتا ہے۔ خود پرستی کی یہ دونوں راہیں لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق اختیار کر رہے تھے۔ اکثر شعرا خرابات مغاں میں "بگیر و بنوش" کا شور مچا رہے تھے اور بعض گوشۂ خلوت میں "بگذار و بگذر" کا نعرہ لگا رہے تھے۔

حالی کی طبیعت بالقوۃ انفرادیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی، مگر زمانے کے طوفان اور جوانی کے ہیجان نے انھیں بھی اس چکر میں ڈال دیا۔ عنفوان شباب میں انسان کو پہلے پہل خودی اپنی جھلک دکھا کر چھپ جایا کرتی ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے پھر جب زمانے کی ہوا بھی اسی رخ چل رہی ہو تو اس کی سرگشتگی کا کیا ٹھکانا! تاہم حالی کی صلاحیت طبع نے اور غالب و شیفتہ کے فیض تربیت نے انھیں بہت کچھ سنبھالے رکھا۔ غالب سے انھوں نے حسن تخیل، ندرت فکر، شوخی گفتار سیکھی، اور شیفتہ سے بیان کی سادگی اور سلاست کا ذوق حاصل کیا۔ اردو اور فارسی کے قدیم استادوں میں سے یوں تو سبھی کے کلام کا مطالعہ انھوں نے کیا ہوگا مگر میر، درد اور سب سے زیادہ سعدی کا اثر ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ اسی کی برکت ہے کہ غزل کے اس رنگ میں بھی جو حالی نے محض عارضی محرکات کی بنا پر اختیار کیا تھا اور جس سے انھیں خلقی مناسبت نہیں تھی، ایسے ایسے شعر مل جاتے ہیں:-

قلق اور دل میں سوا ہو گیا — دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا ہمیں زخم دل — اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح　　لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
بیاں ہے لیجئے جب نام اس کا　　بہت وسعت ہے میری داستاں میں

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح　　کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

اس دور کا شاہکار غالب کا مرثیہ ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس کا مقابلہ حالی کی قدیم غزلوں سے کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ رسمی قافیہ پیمائی اور سچی شاعری میں کیا فرق ہے۔ جب شاعر کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور اسے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے میدان بھی وسیع ملتا ہے تو وہ کیا چیز کہہ جاتا ہے۔

لاہور کے طرز جدید کے مشاعرے کی نظمیں صاف کہہ رہی ہیں کہ حالی کی طبیعت پرانی شاعری کی کال کوٹھری سے نکل کر کھلے میدانوں میں جولانی دکھانے کے لئے بے چین تھی۔ بس ایک ذراسی چھیڑ کی ضرورت تھی ورنہ جو شخص آدھی عمر غزل گوئی میں صرف کر چکا ہو وہ پہلی کوشش میں "نشاط امید" اور "حب وطن" جیسی نظمیں کبھی نہیں کہہ سکتا۔

سنئے اور لطف اٹھائیے :۔

اے مری امید میری جاں نواز　　اے مری دل سوز میری کارساز

. . .

کاٹنے والی غم ایام کی　　تھامنے والی دلِ ناکام کی
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ　　تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ
تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ　　تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

.. ..

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس　　تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس

خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو   عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو

... .

ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب   مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

... - .....

عزم کو جب دیتی ہے تو میل جست   گنبد گردوں نظر آتا ہے پست
تو نے دیا آکے ابھار اجہاں   سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں

اے سپہر بریں کے سیارو   اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا   اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری   اے شب ماہتاب تاروں بھری
اے نسیم بہار کے جھوکو   دہر ناپائدار کے دھوکو
یوں تو ہر حال میں ہمیں ہو عزیز   تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

"حب وطن" کے آخری حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کے دل میں دردِ ملت کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے۔ ان کا دل اپنے تمدن و معاشرت کی بربادی پر کڑھتا ہے اور اسکی ترقی کی آرزو رکھتا ہے۔ لیکن ابھی تک اس میں مصلحانہ جوش پیدا نہیں ہوا ہے اور جوش پیدا ہوتا تو کیونکر؟ ملک کی جو حالت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ انتہا سے زیادہ مایوس کن تھی۔ ۱۸۵۷ء کے قہر و غضب کے بعد لوگوں کے دل پر خوف، ہیبت، مایوسی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ابنائے زمانہ اکثر نئے آقاؤں کی ہواداری میں مصروف تھے، پرانے وفادار پرانی خدمات کے صلے لے رہے تھے اور نئے خیر خواہ نئی خدمات انجام دینے کی فکریں کر رہے تھے۔ افراد کو چھوڑ کر مسلمان عام طور پر سہمے ہوئے، روٹھے ہوئے، اپنے گھروں میں بیٹھے تھے اور نئی حکومت، نئی تعلیم، نئی تہذیب سے کچھ واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔

۱۸۷۶ء میں دلی آنے کے بعد حالی کے دل پر انتہائی مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ جوانی کی ندی چڑھ کر اتر چکی تھی اور طبیعت سکون پر آ کر گزری ہوئی زندگی کا جائزہ لے رہی تھی۔ لاہور کے قیام میں حالی کا مذاق شعر بدل چکا تھا۔ اب انھیں اپنی پچھلی شاعری نکمی نظر آتی تھی اور اتنی عمر کے اکارت جانے کا بے حد قلق تھا۔ پھر یہ مشکل تھی کہ نئی آرزوئیں جوان کے دل میں ابھرنے کے لئے بیچین تھیں مایوسی کے بوجھ سے ابھرنے نہیں پاتی تھیں بلکہ سچ پوچھیے تو حالی کو ان کا پوری طرح احساس بھی نہ تھا۔

در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام است

اس یاس و بے دلی سے حالی کو نجات دینے والا وہی شخص تھا جس نے اس نازک وقت میں تمام مسلمانوں کی دستگیری کی۔ سرسید احمد خاں کو اس تدبر اور حکمت عملی کا بچا کھچا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس ہندوستان پر حکومت کی۔ انھوں نے دیکھا کہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا اب کوئی مرکز باقی نہیں رہا ہے اور ان کا انتشار انھیں ہلاکت کی طرف لے جا رہا ہے۔ مصلحت شناسی کی نظر سے زمانے کے رنگ کو پہچان کر انھوں نے ایک طرف تو تمدن و معاشرت کے بکھرے ہوئے اجزا کو "قوم" یا "ملت" کے شیرازہ میں باندھنے کی کوشش کی اور دوسری طرف حکومت وقت سے، جہاں تک اس ذلت و افتادگی کی حالت میں ممکن تھا، عزت کے ساتھ مصالحت کرنے کا ڈول ڈالا جسے آج ان کے موافقین و مخالفین دونوں اپنی کم نظری سے ابدی وفاداری کا عہد سمجھتے ہیں۔ سرسید کو یقین تھا کہ مغربی علوم حاصل کرنا اور ایک حد تک مغربی تہذیب اختیار کرنا نہ صرف مسلمانوں کی ترقی کے بلکہ ان کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے ایک علمی انجمن کی، پھر ایک تعلیم گاہ اور ایک تعلیمی کانفرنس کی بنا ڈالی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کریں۔

سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریک کا حالی پر عجیب و غریب اثر پڑا۔ انھیں وہ رہنما مل گیا، وہ راہ عمل نظر آ گئی، وہ مقصد حیات ہاتھ آ گیا جسے ان کا دل ڈھونڈھتا تھا۔ انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ اپنی زندگی اور اپنی شاعری کو اس کام میں صرف کریں گے کہ مسلمانوں کے ادب و شعر کے مذاق کو سنواریں، ان کے دل میں جذبۂ قومی کو بیدار کریں اور تعلیم و ترقی کا شوق پیدا کریں۔

۱۸۷۹ء میں سرسید کی فرمائش سے حالی نے مسدس مد و جزر اسلام لکھا جس میں ان کی نئی قوت اور نیا جوش پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاعر اپنا دکھڑا رونے کے بجائے ایک قوم کے عروج و زوال کی داستان سناتا ہے، خیال آرائی اور مبالغے کو ترک کرکے اصلیت کا نقشہ کھینچتا ہے، لفاظی کو چھوڑ کر سیدھی سادی زبان اختیار کرتا ہے، تو اس کے کلام میں اعجاز کا اثر پیدا ہوجاتا ہے۔ مسدس ان نظموں میں ہے جو مردہ قوموں کو جلا دیتی ہیں۔

سرسید کی بدولت شاعر کو قوم مل گئی اور قوم کو شاعر مل گیا۔ اب حالی کی زندگی قوم کی خدمت کے لئے وقف ہوگئی۔ چند سال تک وہ ملازمت کے سلسلے کو نبھاتے رہے عربک اسکول دہلی سے بدل کر ایچیسن کالج لاہور میں طلبہ کے اتالیق مقرر ہوئے اور تھوڑے دن بعد اپنی جگہ پر واپس آگئے۔ مگر اس عرصہ میں وہ برابر ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور اپنی نظموں سے حامیان تعلیم کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ۱۸۸۷ء میں جب سر آسماں جاہ نے دولت آصفیہ کی طرف سے ان کا وظیفہ مقرر کیا تو فکر معاش سے مطمئن ہوکر وہ علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔

حالی نے جو مقصد اپنی زندگی کے قرار دئے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ملک کے ادبی مذاق کی اصلاح کریں۔ اس کے دو طریقے ہوسکتے تھے۔ تنقید کے صحیح اصول مقرر کرنا اور عمدہ نمونے پیش کرنا۔ حالی نے ان دونوں طریقوں سے کام لیا۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے اپنی قدیم و جدید غزلوں کا مجموعہ ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا جس میں شعر و شاعری کے اصولوں سے حکیمانہ بحث کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ ان کے حسن ذوق، وسعت نظر اور جدت خیال کا آئینہ ہے۔ جب کوئی غیر شاعر شعر کی علمی تنقید پر قلم اٹھاتا ہے تو عموماً منطقی بحثوں میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر حالی خود شاعر ہیں اس لئے انھوں نے اصولی مسائل کے ساتھ ساتھ فن کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھا ہے اور خوب سمجھایا ہے۔ اردو میں حالی سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ لفظوں اور ترکیبوں کو اساتذہ کے کلام کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں۔ حالی نے پہلے پہل یہ بحث چھیڑی کہ شاعری کی روح کیا ہے اور وہ شعر میں کیوں کر پیدا ہوتی ہے۔

نثر میں تنقید شعر کے علاوہ حالی نے سیرت نگاری کی صنف کو اختیار کیا۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے "حیات سعدی"، ۱۸۹۷ء میں "یادگار غالب" اور ۱۹۰۱ء میں سرسید کی سیرت "حیات جاوید" کے نام سے شائع کی۔ یہ تینوں بزرگ وہ ہیں جنھوں نے مختلف حیثیتوں سے ان کی زندگی پر اثر ڈالا ہے غالب ان کے استاد تھے سعدی جگت استاد ہیں۔ مگر جس حد تک حالی نے ان سے کسب فیض کیا ہندوستان کے کسی شاعر نے نہ کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں سعدی کا رنگ اتنا صاف جھلکتا تھا کہ لوگ انھیں "سعدی ہند" کہنے لگے۔ اور سرسید تو ان کی زندگی کے دوسرے دور میں ان کے مرشد ہی تھے۔ حالی کی احسان شناسی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی اور روحانی رہنماؤں کی سیرت لکھ کر ان کو حیات جاوید بخش دی۔

سیرت نگاری میں بھی حالی نے وہی مجددانہ شان دکھائی جو شعر اور تنقید شعر میں دکھائی تھی۔ یہ تینوں کتابیں خصوصاً "حیات جاوید" محض واقعات کی پوٹ اور تعریفوں کا پشتارہ نہیں بلکہ جدید طرز کی سوانح عمری کا نمونہ ہیں جس میں انسان کی پوری زندگی پر اور اس کے عمل پر تبصرہ کیا جاتا ہے، اس کا تعلق اس زمانے سے دکھایا جاتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا۔ باوجود اس کے کہ حالی ان تینوں بزرگوں سے، جن کی سیرت انھوں نے لکھی، خصوصاً سرسید سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے مگر نہ تو انھوں نے ان کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے اور نہ جان بوجھ کر ان کی برائیوں کو چھپایا ہے۔

حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں۔ اس میں بھی پختگی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سلاست اور روانی میں نثر کبھی نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کیے جائیں۔ پھر بھی ان کا اسلوب بیان اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ علمی متانت و وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

ادب و شعر کی تہذیب و تجدید کے علاوہ دوسرا بڑا مقصد حالی کے سامنے یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں جذبۂ ملی اور حمیت قومی پیدا کریں اور ان کے اس جوش سے تعلیم کی ترقی اور اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام لیں۔ مسدس کے بعد انھوں نے "تعصب و انصاف" "کلمۃ الحق" "مناظرہ واعظ و شاعر" "پھوٹ اور

ایکلے کا مناظرہ" "شکوۂ ہند" "ننگ خدمت" کے ذریعے سے مسلمانوں کو ان کے اخلاقی عیوب پر غیرت دلائی، ان کے بزرگوں کے اوصاف یاد دلائے اور احتساب نفس اور تہذیب نفس کا سبق پڑھایا۔ "بیوہ کی مناجات" سے ایک شرمناک معاشرتی ظلم کی طرف متوجہ کیا اور "ترکیب بند بر مدرسۃ العلوم" "مسلمانوں کی تعلیم" اور اس قسم کی متعدد نظموں سے سرسید کی تعلیمی تحریک کی اہمیت سمجھائی اور اس کی مدد پر آمادہ کیا۔

عام طور پر شاعر، چاہے وہ اپنے کلام میں عمل کی کتنی ہی تلقین کرتے ہوں، خود عمل کے ہیٹے ہوتے ہیں۔ مگر حالی ان شاعروں میں سے نہیں تھے۔ انھوں نے جہاں تک ہو سکا سرسید کے کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ ان کے ساتھ ڈیپوٹیشن میں حیدر آباد گئے۔ اپنی ذاتی کوشش سے پانی پت اور کرنال میں چندہ کر کے ایک معقول رقم ان کی نذر کی اور اپنے کنبے کے لڑکوں کو علی گڑھ میں داخل کرا دیا۔ اس کے علاوہ اپنے طور پر تعلیم کی ترویج میں دل وجان سے کوشش کرتے رہتے تھے۔ کوئن وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے پانی پت میں ایک اسکول قائم کرنے کی کوشش کی مگر کافی چندہ نہ ہو سکا جتنی رقم جمع ہوئی تھی اس سے ایک کتب خانے کی عمارت بنوا کر وکٹوریہ لائبریری قائم کر دی جو اب میونسپل کمیٹی کے انتظام میں ہے۔ آخر عمر میں حالی مسلم اسکول اور ایک لڑکیوں کا اسکول قائم کیا جس کی وجہ سے پانی پت اور آس پاس کے علاقے کے مسلمانوں میں تعلیم کا چرچا ہو گیا۔ ان تعلیمی خدمات کے اعتراف میں وہ ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کراچی کے صدر منتخب ہوئے۔ جو خطبہ انھوں نے اس موقع پر پڑھا وہ کانفرنس کے نہایت مفید اور پر مغز خطبات میں سے ہے جن کی تعداد دو چار سے زیادہ نہ ہوگی۔

علی گڑھ کے ٹرسٹی کی حیثیت سے انھوں نے اس کے انتظامی امور میں بہت کچھ مدد دی اور جب کبھی کالج میں کوئی جھگڑا اٹھا انھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ انصاف کی حمایت اور ترقی پسند جماعت کی ہمنوائی کی۔ سرسید کی محبت ان کے دل میں بسی ہوئی تھی مگر حق کی محبت اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس لئے بعض موقعوں پر انھوں نے کھلم کھلا سرسید کی مخالفت کی مثلاً ۱۸۹۷ء میں جب یورپین اسٹاف کالج کے معاملات پر حاوی ہو گیا تھا انھوں نے اس کا زور توڑنے میں سرسید کی مخالف جماعت کا ساتھ دیا۔ اسی طرح مسٹر مارلین اور مسٹر آرچبولڈ سے جو اختلافات ہوئے اس میں بھی وہ آزاد پارٹی کے ساتھ تھے۔

اب ذرا ایک نظر حالی کی ذاتی زندگی پر بھی ڈالئے۔ ایک سن رسیدہ عالم، شاعر، حق پرست، حق گو، صاف دل، پاک باطن، حلیم، منکسر، خوددار، غیرت مند، محبت کا پتلا، اخلاق کا مجسمہ، دوستوں کا دوست، عزیزوں کا کفیل، غیروں کا ہمدرد، پانی پت میں رہتا ہے۔ اس کا دل محبت سے معمور ہے، اس کی زندگی خدمت کے لئے وقف ہے کس کی محبت اور خدمت؟ علم و ادب کی، ملک و قوم کی، خاندان کی، ہمسایوں کی۔ ادھر تصنیف و تالیف کا شغل جاری ہے ادھر لوگ اپنی نظمیں اور کتابیں اصلاح کے لئے بھیجتے ہیں، علمی کاموں میں مشورہ طلب کرتے ہیں، ادبی مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ یہ شخص سب کی فرمائشیں پوری کرتا ہے، سب کو جواب دیتا ہے اور اس عجز و انکسار کے ساتھ جیسے ان کے احسان کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ کوئی تعریف کرے تو شرمندہ ہوتا ہے، بجا اعتراض ہو تسلیم کر لیتا ہے، بیجا اعتراض ہو چپ ہو رہتا ہے۔ دشمن پھبتیاں کستے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، یہ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ دوستوں میں سے کوئی جواب دینا چاہے تو اسے منع کر دیتا ہے۔ بغض و حسد کے بادل برستے ہیں اور برس کر کھل جاتے ہیں، حلم کا دریا بہتا چلا جاتا ہے۔

کنبہ بہت بڑا ہے۔ اپنی اولاد، بھائی بہنوں کی اولاد، اولاد کی اولاد۔ مگر یہ مرد خدا آشنا بڑا دل رکھتا ہے جس میں ایک ایک کی گنجائش ہے۔ قریب کا عزیز ہو یا دور کا سب کے ساتھ ایک سی شفقت، ایک سا سلوک۔ محبت جب نامحدود ہو تو قریب اور بعید کا فرق باطل ہو جاتا ہے۔ اور اس شخص کی محبت بھی محض رقت قلب نہیں عملی محبت ہے۔ وہ سب کے دکھ سکھ میں شریک ہے، مشکلوں میں ہدایت کرتا ہے، ضرورت کے وقت دستگیری کرتا ہے، بیماری میں تیماردار ہے، مصیبت میں غمخوار ہے، خاندان بھر کے بچوں کی تعلیم کا کفیل اور تربیت کا نگراں ہے اور خاندان کے باہر بھی ہمسایوں کے ہونہار لڑکوں کو اپنی قلیل آمدنی میں سے وظیفے دے کر مدرسے میں پڑھنے بھجواتا ہے، جو پڑھ چکے ہیں ان کی معاش کی فکر کرتا ہے، جو برسر کار ہیں ان کی ترقی میں کوشاں ہے۔

وہ سچا دین دار ہے، مومن ہے، عابد ہے، زاہد ہے، احکام ظاہر کا پابند ہے، طریق باطن کا سالک ہے مگر اسے نہ دین کا گھمنڈ ہے، نہ ایمان کا، نہ عبادت کا، نہ زہد کا، نہ شریعت کا، نہ طریقت کا۔ وہ اپنی نجات کا وسیلہ دو چیزوں کو سمجھتا ہے جو اصل میں ایک ہیں۔ محبت اور خدمت۔

حالی کی سیرت کی یہ ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ آپ اسے صاف روشنی میں دیکھنا چاہیں تو ان کے

کلام کا مطالعہ کیجئے۔ ہم حالی کے دوسرے دور کے کلام کا تھوڑا سا نمونہ پیش کرکے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ طویل بہت ہو چکا ہے۔ تنقید اور تشریح کی گنجائش نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ حالی کا کلام آپ ہی اپنی تنقید اور آپ ہی اپنی شرح ہے۔

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا ۔۔۔ باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ ۔۔۔ ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی ؐ دگداہیں ہے طبیعی ۔۔۔ جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گو جی پر دل بندھے ہوئے ہیں ۔۔۔ ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ ۔۔۔ دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ
ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر ۔۔۔ سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی ۔۔۔ پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو ۔۔۔ نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

تذکرہ دلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ ۔۔۔ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب ۔۔۔ درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی ۔۔۔ کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح ۔۔۔ دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو ۔۔۔ اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر ۔۔۔ موج حائل ہے اور ہوا ناساز

یا تھپیڑے ہوا کے لے اُبھرے
یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک
ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرتے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک
بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ
جگر کے پار رہے اب تک تری نوا ایک ایک

آگے بڑھے نہ قصہ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم

یا رول کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

خواب راحت میں وہ لذت نیرے اپ پری نیر
جو جوانی میں مزہ دیتی تھیں شب بیداریاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں
ہم جب یہ مر رہے ہیں وہ بات ہی کچھ اور
تجھ سے جہاں میں لاکھ سہی تو مگر کہاں

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نیر

جی ڈھونڈھتا ہے بزم طرب میں انھیں مگر وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

در فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک واعظ بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ
یہ طبل تہی ہیں جو بکارتے ہیں جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سن مری الفت در و دیوار سے پوچھ
تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم وہ تصویر خیال یار سے پوچھ

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

یاد ایام کہ بے رنگ تھی تصویر جہاں دست مشاطہ نہ تھا محرم زلف دوراں
گل خود رو سے بسا تھا چمن کون و مکاں چار سو حسن خداداد کا سکہ تھا رواں
وضع عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خط قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک
طفل معصوم کے مانند تھا یہ عالم پیر تھے ہم اک صنعت بے چون و چرا کی تصویر
ملک فطرت میں نہ تھی سلطنت نفس شریر طبع نے مملکت روح نہ کی تھی تسخیر
خواب غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو

ہے ناگواری پہچان تیری　　الحق مُرّ ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے　　چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
خونخوار لشکر ہیں ساتھ تیرے　　رنگیں لہو میں ہیں ہاتھ تیرے
تیرے جلو میں رسوائیاں ہیں　　سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر　　دفتر بہت سے ہوتے ہیں اَبتر
پڑتی ہے ہلچل ہر مرحلے میں　　آتی ہے دنیا اک زلزلے میں

اے راست گوئی لے ابر رحمت　　ہے اس چمن میں تیری ہی برکت
گر تو نہ ہوتی یاں سایہ افگن　　برباد کب کا ہوتا یہ گلشن
عالم ہے سرسبز تیرے قدم سے　　آباد یہ گھر ہے تیرے دم سے
تو بے کسوں کی یاور رہی ہے　　تو گم رہوں کی رہبر رہی ہے
جن بستیوں میں تو چھائی　　کھیتی انھیں کی یاں لہلہائی
مشرق میں جب تھی تیری حکومت　　چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت
جب دور تیرا مغرب میں آیا　　مغرب کو تو نے مشرق بنایا

وہ مسلمانوں کی ہر بازی میں سبقت کیا ہوئی　　وہ حجازی غیرت اور ملکی حمیت کیا ہوئی
ہم مسلمانوں سے ہے لے منہ ننگ اسلام کو　　تھا لقب خیر الامم جس کا وہ امت کیا ہوئی
جی کسی کی عزت افزائی سے خوش ہوتا نہیں　　دل گواہی جس پہ دیتا تھا وہ عزت کیا ہوئی
دین و دولت، علم و دانش ہم میں کچھ باقی نہیں　　حق نے پوری کی تھی جو ہم پر وہ نعمت کیا ہوئی
ملک و مال و سلطنت اک آنی جانی چیز تھی　　جو ہمیشہ رہنے والی تھی وہ دولت کیا ہوئی

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا / ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں / راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لمپ سے / روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھئے / ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا

سرخ رو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اے مرے زور اور قدرت والے / حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری / دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن / جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری / میکے اور سسرال پہ بھاری
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں / دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پہ میرے داغ ہیں جتنے / منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے / لینے کے یاں پڑ گئے دینے

..

سیلانی جب باغ میں آئے / پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں / جا سوئے سیلانی بن میں
پیت نہ تھی جب پایا پیتم / جب ہوئی پیت گنوایا پیتم

... .

آنی جانی چیز ہیں خوشیاں / چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں
منگنی بیاہ برات اور رخصت / میل ملاپ سہاگ اور سنگت

۷۹۴
۵

ہیں وو دن کے سب بہلاوے — آگے چل کر ہیں پچھتاوے
ریت کی سی دیوار ہے دنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا

مولانا حالی کے آبا و اجداد

میں نے عرصۂ دراز کی تلاش و تحقیق اور بہت کچھ محنت و کاوش کے بعد شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کی ایک مبسوط سوانح عمری قلمبند کی ہے جو "تذکرۂ حالی" کے نام سے انشاء اللہ عنقریب شائع ہوگی۔ اپنے محترم دوست محمد عاقل صاحب ایم۔ اے نائب مدیر جامعہ کے ارشاد کی تعمیل میں اس تذکرہ کے اولین دو باب میں قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ حالی کے قدرداں جو ملک میں کافی موجود ہیں انھیں دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے۔

(محمد اسماعیل)

باب اوّل

مولانا کا نام و نسب اور خاندان

والد اور والدہ کی طرف سے مولانا کا شجرۂ نسب

آج اس بات کو پورے سو برس گذر چکے ہیں جبکہ شمالی ہند کے مشہور تاریخی شہر پانی پت میں نظم اردو کا بہترین نقاد، جدید اور نیچرل شاعری کا بانی اور قومی، اصلاحی اور اخلاقی نظموں کا زبردست مجدد پیدا ہوا۔ والدین نے الطاف حسین نام رکھا یہی وہ بچہ ہے جو بڑا ہو کر شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔

مولانا والدہ کی طرف سے سید ہیں اور والد کی جانب سے انصاریوں کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو مشہور اور جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں۔ مولانا کے دونوں شجرے یہاں درج کیے جاتے ہیں جو نہایت تلاش سے فراہم کیے گئے ہیں۔

والد کی طرف سے شجرۂ نسب

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی بن خواجہ ایزد بخش بن خواجہ بو علی بخش بن خواجہ محمد بخش بن خواجہ غلام محمد بن خواجہ عبد السبحان بن خواجہ عبد الکریم بن خواجہ مسلم بن خواجہ زین الدین احمد بن خواجہ عبد الکافی

بن خواجہ ضیاء الدین بن خواجہ ابو راشد بن خواجہ ابو حامد بن خواجہ ابو تراب بن خواجہ نصیر الدین محمود بن قاضی خواجہ ملک علی بن خواجہ میرک علی شاہ بن خواجہ مسعود بن خواجہ عمر بن خواجہ ابراہیم بن خواجہ عثمان بن خواجہ ابو طاہر بن خواجہ عتقہ بن خواجہ انفع بن شیخ نافع بن خواجہ ملک شرف الدین امیر محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجہ بن خواجہ محمد الملقب بہ امیر شیخ ابو اسحٰق بن خواجہ فضل اللہ بن خواجہ عبد اللہ بن اسعد انصاری بن شیخ محمد (ثانی) بن شیخ نصیر بن شیخ محمد (اول) بن شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل خواجہ عبد اللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات بن ابو المنصور محمد بن ابی معاذ انصاری بن محمد انصاری بن احمد انصاری بن علی انصاری بن جعفر انصاری بن ابو منصور مت الانصاری بن حضرت خالد ابو ایوب انصاری خزرجی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

شجرۂ نسب والدہ کی طرف سے	مولانا خواجہ الطاف حسین حالی بن ایزد بخش الرسول زوجہ خواجہ ایزد بخش بنت سید محمد شفیع بن سید محمد امین بن سید عبد الرحمٰن بن سید عبد الرحیم بن سید ابو القاسم بن سید علی بن سید منجھو

بن سید محمد بن سید امجد بن سید نعمت اللہ بن سید اخوند بن سید حسام الدین بن سید شمس الدین بن سید معظم بن سید مرتضیٰ بن سید نور الدین بن سید مغیث بن سید محمد بن سید موسیٰ بن سید ابی تمیم بن سید یحییٰ بن سید ابراہیم بن سید موسیٰ مکحول بن سید ابو جعفر بن حضرت سید اسماعیل شہید بن حضرت سید احمد بن حضرت امام ابو القاسم اسماعیل شہدا ابوری بن حضرت سید محمد ناطق بن حضرت اسماعیل ناطق بن حضرت امام جعفر صادق بن حضرت امام ابو جعفر محمد باقر بن حضرت امام علی زین العابدین بن حضرت سیدنا امام حسین بن حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت خاتم الانبیاء افضل الرسل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

باب دوم

آبا و اجداد

حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت ابو منصور مت الانصاری، شیخ الاسلام خواجہ عبد اللہ انصاری
ملک محمود شاہ انجو، خواجہ میرک علی شاہ، قاضی خواجہ ملک علی انصاری۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے مولانا، حضرت خواجہ ابو ایوب انصاری کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد

میں سے اکثر بزرگ نہایت نامور اور مشہور ہوئے ہیں۔ چند کا نہایت ہی مختصر تذکرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاری | آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ جب حضور نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی ہے تو یثرب پہنچ کر سب سے اول جس خوش قسمت انسان کو آنحضرت کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا وہ حضرت ابو ایوب ہی تھے۔ جب تک مسجد نبوی اور اہل بیت اطہار کے لئے حجرے نہ بن لیے آنحضورؐ آپ ہی کے مکان میں قیام پذیر رہے۔ دراصل یہ کوئی تھوڑا شرف نہیں ہے جو تمام انصار کے مقابلہ میں حضرت ابو ایوب کو حاصل ہوا۔ تمام صحابہ اسی شرف کی وجہ سے آپ کی نہایت تعظیم کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں آپ کا وظیفہ پانچ ہزار سے بڑھا کر بیس ہزار کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں چالیس غلام ان کا کاروبار کرنے کے لئے ان کو مرحمت فرمائے تھے۔

۵۲ھ میں آپ ایک لشکر میں شامل ہو کر شام میں جہاد کے لئے گئے۔ لشکر کا امیر یزید بن حضرت معاویہؓ تھا۔ مگر ابھی راستے ہی میں تھے کہ آپ ایسے شدید بیمار ہو گئے کہ زندگی کی آس نہ رہی۔ یزید عیادت کے لئے آیا تو آپ نے اسے وصیت کی کہ "اگر میں مر جاؤں تو میرے جنازے کو لے کر مع فوج کے روانہ ہونا اور کفار کی سرزمین میں جہاں تک جانا تمہارے لئے ممکن ہو سکے چلے جانا۔ جب دیکھو کہ آگے بڑھنا بالکل ناممکن ہے تو وہیں مجھے دفن کر دینا اور لوٹ آنا" اس بوڑھے صحابی رسولؐ کی ہمت، اولوالعزمی اور بلند خیالی پر غور کرو کہ کتنی عجیب و غریب ہے۔ اس وصیت سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس جوش میں فوج برابر آگے بڑھتی جائے گی اور دشمن کا ملک فتح ہوتا جائے گا۔ کتنا پاک جذبہ اور کتنا بہادرانہ خیال تھا۔ سچ ہے ؎

حق کو ہونا ہے جنھیں دنیا میں کرنا سربلند
خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا

یزید نے اس مقدس وصیت کی پوری پوری تعمیل کی۔ جب اس جلیل القدر صحابی کا انتقال ہو گیا تو یزید نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ جنازہ آگے آگے اور فوج پیچھے پیچھے لڑتی بھڑتی روانہ ہوئی یہاں تک کہ بالکل قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے جنازہ پہنچ گیا۔ آگے راستہ کہاں تھا۔ پس یزید نے جنازہ وہیں دفن کر دیا اور شاہ قسطنطنیہ کہلا بھیجا کہ ہم نے اپنے ایک محترم بزرگ کو یہاں دفن کیا ہے اگر تم نے دشمنی سے اگر ان کے مزار کی بے حرمتی کی

ارادہ کیا تو یاد رکھنا کہ شام میں عیسائیوں کے جس قدر گرجا ہیں فوراً سب کے سب زمین کے برابر کروا دوں گا۔

یہی خوف تھا جس کے باعث حضرت ابو ایوبؓ کا مزار باوجود غیر سلطنت اور دشمن کے ملک میں ہونے کے ہمیشہ محفوظ رہا۔ جب ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس نے آپ کے مزار کو پختہ اور عظیم الشان بنوا دیا اور وہ آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ترکی کے تمام سلاطین عثمانیہ کی رسم تاجپوشی آپ ہی کے پرانوار مزار پر عمل میں آتی رہی ہے۔

حضرت ابو منصور الانصاری | یہ حضرت ابو ایوبؓ کے لڑکے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مہم حضرت احنف بن قیسؓ صحابی کی زیر سرکردگی خراسان بھیجی تھی۔ حضرت ابو منصور اسی فوج میں شامل ہو کر مدینہ سے گئے تھے۔ خراسان پہنچ کر آپ نے مقام ہرات مستقل سکونت اختیار کر لی اور پھر واپس مدینہ نہ آئے۔ آپ نے اپنی شادی بھی ہرات ہی کی تھی اور غالباً یہی تعلق وہاں مستقل قیام کا باعث ہوا۔

شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری | حضرت ابو ایوبؓ کی اولاد میں یہ بزرگ نہایت زبردست عالم اور بے عدیل فاضل گزرے ہیں۔ تمام متقدمین ان کی بزرگی، علم، زہد و تقویٰ اور پاکیزگی و پرہیزگاری کے قائل ہیں۔ فن حدیث کے بہت بڑے امام اور صوفی کامل تھے۔ ان کے فضائل و مناقب سے کتب تصوف و سیر بھری پڑی ہیں۔ بہت سی کتب کے مصنف، بڑے ادیب اور اعلیٰ درجے کے خطیب تھے۔ ۸۵ سال کی عمر میں ۲ ربیع الاول ۴۸۱ھ کو ہرات میں وفات پائی۔ علمائے فرنگی محل لکھنؤ آپ کی اولاد سے ہیں۔

ملک شرف الدین محمود | خواجہ ملک شرف الدین امیر محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجہ غزنوی دور میں فارس و کرمان اور عراق عجم کا فرماں روا تھا۔ سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی کے ہاتھ سے شکست کھا کر ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ انجو فارسی میں امیر سامان کو کہتے ہیں اور ترکی میں موتیوں کو۔

میرک علی شاہ | ہرات کا فرماں روا اور نہایت دلیر، شجاع اور عقلمند تھا۔ علم دوست اور علماء کا قدرداں تھا۔ [illegible]ھ میں انتقال کیا۔

خواجہ ملک علی | یہ معلوم کیا وجوہات ہوئیں کہ اپنے باپ میرک علی شاہ فرماں روائے ہرات کے انتقال سے

بعد خواجہ ملک علی ہرات چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ہندوستان چلے آئے۔ مولانا حالی کے آباواجداد میں یہ سب سے پہلے شخص ہیں جو ہندوستان آئے ہیں۔ چنانچہ مولانا ان کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں:-

" ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ 'پیر ہرات' کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علمار، شعرار اور دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدرداں تھا اس لئے اکثر اہل علم اور خاندانی لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور بیرحاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی۔ اور منصب قضار و صدارت وتشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان کے متعلق کردی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔"

خواجہ ملک علی انصاری ۶۷۵ھ مطابق ۱۲۷۶ء میں مع اپنے دو بیٹوں خواجہ محمد مسعود اور خواجہ محمد نصیرالدین کے پانی پت میں وارد ہوئے تھے۔ اس وقت پانی پت علمار اور فضلار کا مرکز بنا ہوا تھا اور علم و تصوف کے دریا یہاں لہریں مار رہے تھے۔ خواجہ ملک علی نے جو یہ علمی صحبتیں اور مذہبی چرچے دیکھے تو یہیں کے ہو رہے اور ایسے رہے کہ آپ کی اولاد آج تک یہاں آباد ہے اور بڑے بڑے معزز اور نامور بزرگ ان میں ہو چکے ہیں۔

مولانا حالؔی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

شمس العلماء مولانا حالؔی کے پانی پت کے استادوں میں سے ایک بزرگ مولوی خواجہ ابراہیم حسین انصاری بھی تھے جن کا تذکرہ حضرت شمس العلماء نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں کیا ہے۔ مولوی خواجہ ابراہیم حسین صاحب کا جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء میں پانی پت میں انتقال ہوا تو ان کی قبر کا کتبہ لکھنے کے لئے لائق اور قابل شاگرد سے زیادہ اور کون شخص موزوں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مولانا نے اپنے واجب التعظیم استاد کی قبر کے کتبے کی جو عبارت لکھی وہ میں آج ۴۴ برس کے بعد تبرکاً شائع کر رہا ہوں اس سے جہاں آج پہلی مرتبہ مولانا کی ایک غیر مطبوعہ تحریر پبلک میں آ رہی ہے وہاں مولانا کے ایک ایسے استاد کے حالات زندگی پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے جن کے حالات اس وقت تک عام طور پر معلوم نہیں تھے۔ مولوی خواجہ ابراہیم صاحب کی قبر عیدگاہ پانی پت کے بالکل سامنے بجانب شمال واقع ہے اور قبر پر مندرجہ ذیل عبارت کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ مولوی ابراہیم حسین صاحب کے فرزند مخدومی جناب مولوی محمد علی حیدر صاحب نے میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ یہ عبارت مولانا حالؔی نے لکھی تھی اس کے علاوہ یہ تحریر مولانا کے اپنے ہاتھ کی تحریر کردہ میں نے خود ان کے مسودات میں دیکھی ہے۔

(محمد اسماعیل پانی پتی)

مرقد خواجہ ابراہیم حسین انصاری

ولادتِ ایشاں در ماہ رجب ۱۲۳۶ھ در پانی پت واقع شدہ۔ بعد از تعلیم ضروریات دین در آغاز شباب برائے تکمیل علم ترک وطن اختیار کردند و از مولانا فضل حق خیرآبادی در سہارنپور و از مولانا واجد علی در لکھنؤ علوم عقلیہ اخذ نمودند۔ باز از سید میرن صاحب قبلہ کتب دینیات از فقہ و تفسیر و کلام پرداختند و ہفت سالہ در لکھنؤ اقامت داشتہ سند اجتہاد و امامت مذہب اثنا عشریہ از جناب مجتہد العصر سید محمد صاحب لکھنوی غفرلہٗ حاصل کردہ بہ پانی پت مراجعت فرمودند و پنجاہ سال در درس و تدریس و وعظ و تذکیر مرجع انام و مقبول خاص و عام ماندہ۔ چہاردہم رجب ۱۳۰۸ھ داعی اجل را لبیک اجابت گفتند۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

فلسفۂ ترقی

اے عزیزو! تم بھی ہو آخر بنی نوعِ بشر
غل ہے کیا نوعِ بشر میں کچھ تمھیں بھی ہے خبر

کر رہا ہے خاک کا پتلا وہ جوہر آشکار
ہو رہی ہے جس سے شانِ کبریائی جلوہ گر

رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا ہے واں
طائرِ وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پَر

اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کر لیا
ابر و برق و باد سے تا بحر و بر و دشت و در

حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا
دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحر و بر

تھا ارسطو اور فلاطوں کو بہت کچھ جن پہ ناز
ہو گئے تقویمِ پارینہ وہ سب علم و ہنر

کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج
بڑھ رہا ہے دمبدم یوں آج کل علمِ بشر

قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر

ساز و ساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب
کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ دربدر

کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر

دوستو! شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر

رَو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر

دستکاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

ہند میں بھی یارو! آپہنچا ہے اس رَو کا قدم
جو ہیں ناقابل اب ان کا کھلنے والا ہے بھرم

ہے ترقی، پر تنزل بھی ہے اس کے ساتھ ساتھ
یہ کسی کے حق میں امرت ہے کسی کے حق میں سم

پست کو بالا یہ کر دیتی ہے اور بالا کو پست
کر دیا زیر و زبر اس نے، جہاں رکھا قدم

گل کھلایا اس نے جو اٹھائے مشرق میں ابھی — اس کے لکھتے وقت ہاتھوں میں لرزتے ہیں قلم
چین جو وسعت میں کم اک برِ اعظم سے نہ تھا — اک جزیرہ کی لپیٹ نے کر دیا اس کو بھسم
دیکھنا پیچھے نہ ہم حبشیوں سے رہ جانا کہیں — حق میں ہمسایہ کے ہمسایہ کا بڑھتا ہے ستم
جانتے ہو لے عزیزو اہے تنزل چیز کیا؟ — "اس پہ کر لینا قناعت مل گیا جو بیش و کم"
گو کہ ہے افراد کے حق میں یہ خصلت کیمیا — حق میں لیکن قوم کے یا رو یہی خصلت ہے سم
تن پہ تھا فاروقِ اعظم کے پھٹا کرتا، مگر — قوم کی خاطر بھری نیت نہ لے کر ملکِ جم
جیتے ہیں وہ دنیا میں کیڑے مکوڑوں کی طرح — جن کو بڑھنے کی تمنا اور نہ کچھ گھٹنے کا غم
جس طرح موری کا کیڑا خوش ہے اپنے حال پر — گذرے جو حالت اسی میں بس مگن رہتے ہیں ہم
یہ زمانہ کہہ رہا ہے یہ بہ آوازِ بلند — یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہ عدم

بے ترقی ملک میں جینا ہے دشوار آجکل
وحشیوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

ہو نہ ہمدردی کا عنصر قوم میں یارو جہاں — واں ترقی کے لئے سب کوششیں ہیں رائگاں
راس بیڑے کو ترقی کے نہیں کوئی ہوا — جوشِ ہمدردی سے ہوتا ہے جہاز اس کا رواں
قوم تھی یونان کی دنیا میں اک محدود قوم — ہو گئی حبِّ وطن سے فخرِ اقوامِ جہاں
ایک کو کچھ ایک کی پروا نہ ہو جب قوم میں — ہے حماقت قوم کی کثرت پہ ہونا شادماں
قوم کس گنتی میں ہے وہ دل نہ ہوں جس کے ملے — گو کہ وہ کثرت سے اپنی گھیر لے سارا جہاں
ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جن کے دل وہ قوم کیا؟ — ہے وہ اک تھل لہو روتا ہے جس پر آسماں
یاد رکھو پڑ گئی جس ملک یا ملت میں پھوٹ — ہیں وہ اس جہاں سرا میں کوئی دن کے میہماں
غزنوی، غوری، مغل، سادات، لودھی اور غلام — رہ گئے نوبت بہ نوبت ہند پر جو حکمراں
دن بُرے جب آئے اور باہم لگے سر پھوڑنے — صفحۂ ہستی سے ان کا مٹ گیا نام و نشاں
دین کہتے ہیں جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام — ہے مسلمانو! یہ ارشادِ رسولِ انس و جاں

ہیں نمازیں اور روزے اور حج بے کار سب — سوزِ امت کی نہ چنگاری ہو گر دل میں نہاں
جس کا تم بھرتے ہو کلمہ جس پہ پڑھتے ہو درود — نام پر جس کے عزیزو تم فدا کرتے ہو جاں
جیتے جی امت کی لَو دل کو رہی اس کے لگی — وقت آخر امت امت اس کے تھا وردِ زباں
بھائی بھائی ہو گئے ہو دین کی برکت سے تم — ہے غضب گر بھائیوں پر ہوں نہ بھائی مہرباں
کھول کر دیکھو کتاب اللہ کی کہتی ہے کیا؟ — "کلمہ پڑھ لینے سے کچھ حاصل نہیں بے امتحاں"

دین کا دعویٰ اور امت کی خبر لیتے نہیں
چاہتے ہو تم سند اور امتحاں دیتے نہیں

ان سے کہہ دو ہے مسلمانی کا جن کو ادعا — قوم کی خدمت میں پوشیدہ ہے بھید اسلام کا
وہ یہی خدمت ہی منصب ہے جس کے واسطے — آئے ہیں دنیا میں سب نوبت بہ نوبت انبیا
قوم کی خدمت میں کر دیں اپنی جب عمریں تمام — تب فرائض سے نبوت کے ہوئے عہدہ برآ
وہ رسول ہاشمیؐ وہ رحمۃ اللعالمینؐ — پیروی کا جس کی دم بھرتے ہو تم صبح و مسا
جانتے ہو قوم سے تھا اپنی کیا اس کا سلوک — اس طرف سے تھی جفا اور اس طرف سے تھی دعا
کون سی تکلیف تھی جو قوم نے اس کو نہ دی — پر کبھی چاہا نہ اس نے قوم کا اپنی بُرا
جب اُحد میں ہو گیا دندانِ پاک اس کا شہید — قوم کے حق میں نہ نکلا منہ سے کچھ اس کے سوا
"کر ہدایت قوم کو یا رب! کہ ہیں معذور یہ" — "ان کی عقلوں پر ہے پردہ جہل و غفلت کا پڑا"
قوم کے حملے رہے جب تک کہ اس کی ذات پر — خندہ پیشانی سے سب ان کے سہے جور و جفا
پر لگی جب قوم سب مل کر مٹانے نامِ حق — اور خدا کا پوجنا بندوں کو مشکل ہو گیا
غیرتِ حق نے نہ دی پھر مہلتِ صبر و شکیب — دین کی آخر حمایت پر کھڑا ہونا پڑا
لشکرِ حق سے مگر جب ہو گئی مغلوب قوم — پھر وہی شفقت، وہی رحمت، وہی احسان تھا
تھی یہی وہ قوم جس کے حق میں فرماتے تھے آپ — "ہے عرب کی دوستی جز دین اور ایمان کا"
تھی یہی وہ قوم تھا جس کے لئے ارشاد یہ — "قوم کا خادم ہے آقا سب کا بے چون و چرا"

قوم کے خادم رہے اور دوست جبتک اہلِ دیں　　دین اور دنیا میں بول اسلام کا بالا رہا
پڑ گئے خودغرضیوں سے جبکہ دل ایک اک کے پھاڑ　　حکم جو مالک کا تھا بندوں کو وہ پورا ہوا

حکم تھا اس کا کہ جھگڑوں سے رہو تم برکنار
ورنہ کھو بیٹھو گے سب اپنا وقار اور اعتبار

سچ کسی دانا نے تھا یہ قوم سے اپنی کہا　　"جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا"
دیکھ لو ممتاز دنیا میں وہی قومیں ہیں آج　　قوم پر قربان ہے جن کا ہر اک چھوٹا بڑا
یاں تلک پھیلا ہے اب قوموں میں قومیت کا درد　　اپنے ایک اک فرد پر قوموں کی جانیں ہیں فدا
ملک سارا چھین کر بھی ان کو چین آتا نہیں　　اپنے اک مقتول کا جب مانگتے ہیں خوں بہا
اختلافِ دین و مذہب گھل رہا تھا جس میں زہر　　جس نے ملکوں میں دئے تھے خون کے دریا بہا
دمبدم وہ اختلاف اب بن رہا ہے اتفاق　　زہر میں ہونے کو ہے پیدا اثر تریاق کا
کر رہا ہے جوش ہمدردی کی صورت میں ظہور　　وہ تعصب جس نے باپوں سے کئے بیٹے جدا
دیتے ہیں وہ اپنے ذاتی فائدوں پر خاک ڈال　　اپنے جب نقصان میں ہو قوم کا ان کی بھلا
وہ ہملٹن کی جواں مردی سنی ہوگی کہ جب　　ہوگئی فرخ سیر کو ہاتھ سے اس کے شفا
قوم پر قربان کردیں اپنی امیدیں تمام　　آپ کچھ لینا نہ چاہا اپنی خدمت کا صلا
ہے اسی حب وطن کا اس کی یہ سارا ظہور　　ہند پر ہے آج جو برطانیہ فرماں روا
ایک ماما جس کو دس ملتے ہیں ہفتہ میں شلنگ　　جس کے کنبے کا سب اس تنخواہ پر ہے آسرا
جا کے دے آتی ہے خوش خوش ایک ہفتہ کی طلب　　قوم کی خاطر کہیں سنتی ہے جب چندہ کھلا
ہے غرض چندہ کی کیا؟ اس سے نہیں کچھ اس کو کام　　قوم کا نام آیا اور قابو سے دل باہر ہوا
حق کو ہوتا ہے جنھیں دنیا میں کرنا سربلند　　خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا
ان کے مفلس قوم کی خاطر وہ کر جاتے ہیں کام　　پست قوموں میں نہیں کر سکتے جو کام اغنیا
ہے انھیں ہمدردیوں کا ان کی یہ ثمرہ کہ آج　　اس کرہ کے گرد ہیں چھائی ہوئی مثلِ ہوا

لوہا مقناطیس کی جانب ہے کھنچتا جس طرح
اس طرف کھنچتی چلی جاتی ہے دنیا اس طرح

ہے یہ قوموں کی ترقی اور تنزل سے عیاں — خود تنزل میں ہے سرچشمہ ترقی کا نہاں
ایک کا ہے جو تنزل، دوسرے کا ہے عروج — اس کا بکتا ہے مکاں تب اس کی چلتی ہے دکاں
کوئی یاں بنتا نہیں جبتک نہ بگڑے دوسرا — گھاس کھد جاتی ہے جب پٹتی ہے تب کھیتی یہاں
ہوتے ہوتے خشک جب دریا میں خاک اڑنے لگی — تب ہوئے نہروں سے جنگل غیرت باغ جناں
چھپے مرغ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب — کر چکا کیڑے مکوڑے جب ہزاروں نوش جاں
جان لو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب — جب سنو یارو! بگڑتا کوئی گھر یا خانداں
آسماں سے بن کے خزاں آتا نہیں اقبال کا — ہے وہی اک جنس کل تھا یاں یہاں تھی آج واں
میزباں کی دیکھتی ہے آنکھ جب بدلی ہوئی — واں سے اٹھ کر دوسرا جا ڈھونڈھتی ہے میزباں
جانے والا ہے مقرر ان کا گھر غیروں کے پاس — جو کمر باندھے ہوئے بیٹھے ہیں گھر کھونے پہ یاں
قصر و ایواں ہوں مبارک تم کو اے محنت کشو — عیش کے بندے بہت ہونے کو ہیں بےخانماں
یاد رکھو ہوں گے اب حقداران کے جانشیں — ہاتھ سے حق کھو دئے اپنے جنھوں نے رائگاں
ہوں گے مزدور اور رکیرے ان کے اب قائم مقام — پھرتے ہیں بے کار جن کے کودک و پیر و جواں
اے مسلمانو! فلک کی گردشوں سے غافلو! — تم کو رخصت ہے لٹاؤ وقت و دولت رائگاں
دیکھو جب غیروں کو تم بڑھتا کرو اپنے پہ ناز — ہیں تمھارے عیش و غفلت کی یہ سب فیاضیاں
مت کرو شکوہ مشیت کا خدا ظالم نہیں — بلکہ ظالم ہیں تمھاری اپنی بد اعمالیاں
ہے یہ قانون الٰہی جو کبھی ٹلتا نہیں — گو جگہ سے اپنی ٹل جائے زمین و آسماں

چھٹتی جائیں گی وہ قومیں جو بگڑتی جائیں گی
ٹہنیاں جو سوکھتی جائیں گی جھڑتی جائیں گی

"منقول از کلیات نظم حالی"
مرتبہ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی

کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں؟

جو قوم ترقی کے بعد تنزل کے درجے پر پہنچ جاتی ہے وہ ایک ایسی ابتر حالت میں ہوتی ہے کہ اس کے دوبارہ ترقی کرنے سے اکثر لوگ مایوس ہو جاتے ہیں' یا یوں کہو کہ اس کی قابلیت کا جوہر نظروں سے چھپ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ ترقی کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی سعی ایک حرکت مذبوحی سمجھی جاتی ہے اور اگر وہ سنبھلنا چاہتی ہے تو اس پر سنبھالے کا گمان کیا جاتا ہے یہی حال آج کل ہماری قوم کا ہے۔

اگرچہ بعضے مومن مسلمان جو کبھی اپنی نسبت براگمان نہیں کرتے مسلمانوں کی قوم کو اب بھی اعلیٰ درجے کی ترقی کے قابل سمجھتے ہیں لیکن امید ہے کہ وہ جس قدر زمانے کے حالات سے واقف ہو کر دنیا کی ترقیات کا اندازہ کریں گے اور جس قدر اپنی ترقی کے مواقع پر غور فرمائیں گے اسی قدر ان کی رائے کی غلطی ان پر ظاہر ہوتی جائے گی۔

البتہ جو لوگ مسلمانوں کی بہبودی سے بالکل مایوس ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ "ان میں کسی قسم کی ترقی کا مادہ باقی نہیں رہا اور ان کی اصلاح میں کوشش کرنے والے ایک محال بات کے پیچھے پڑے ہیں" ان کی رائے نہایت غور اور توجہ کے لائق ہے کیونکہ جن لوگوں کی یہ رائے ہے وہ ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کے لائق آدمی ہیں اور ہماری موجودہ حالت جس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہو سکتی سراسر انہیں کی رائے کی تائید کرتی ہے یعنی وہ ایک ایسا دعویٰ کرتے ہیں جس کا ثبوت خود ان کے دعوے ہی میں موجود ہے۔ ایک ایسے بیمار کی نسبت جس کی طاقت روز بروز زائل ہوتی جا رہی ہو جس کی غذا بالکل مفقود ہو' جو علاج معالجے سے سو سو کوس بھاگتا ہو یہ کہنا کہ "وہ چند روز کا مہمان ہے" ایک ایسا دعویٰ ہے کہ آپ ہی اپنی دلیل ہو سکتا ہے۔

وہ خیالات جو مسلمانوں کے ترقی نہ کر سکنے کے متعلق عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں

۱۔ پہلا خیال :۔ مذہب مانع ترقی ہے

وہ لوگ (جن کی رائے اوپر بیان کی گئی) مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شہادت کے سوا اور بھی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :۔

"مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ہی دنیوی ترقی کے لئے مانع ہے۔ پس تا وقتیکہ مسلمان مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس صورت میں وہ مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی بلکہ ایک ایسی قوم کی ترقی ہوگی جس سے اسلام کا کچھ تعلق نہ ہو۔"

ہمارے نزدیک یہ ایک دلچسپ فقرہ ہے جو مسلمانوں کی ترقی و تنزل کی بحث کے وقت ہمیشہ استعمال کیا جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم شائستہ یا ناشائستہ ایسی نہیں ہے جس کی مذہبی تعلیم اب یا کسی وقت دنیوی ترقیات کی مانع نہ خیال کی گئی ہو۔

اور سب قوموں کو جانے دو۔ عیسائی قومیں جو اس وقت دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے فائق ہیں اور جو علم و دولت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کو بھی ترقی دے رہی ہیں ان کا مذہب ہمارے مروجہ مذہب سے بھی زیادہ دنیوی ترقی کا منافی سمجھا جاتا تھا۔ جس وقت یورپ میں علم و حکمت کا ستارہ چمکا اور مذہبی خیالات اس کی روشنی میں مضمحل ہونے لگے اس وقت مذہبی پیشواؤں اور خود گورنمنٹ کی طرف سے کونسی مزاحمت تھی جو نہیں ہوئی۔ جن لوگوں نے مذہب کو حشو و زوائد سے پاک کرنا چاہا اور آزادانہ تحریر و تقریر کرنی شروع کی اس وقت ان کو کیسے کیسے سخت عذاب دیے گئے۔ ہزاروں آدمی جلائے گئے اور ہزاروں نہایت تکلیفیں اور اذیتیں پہنچا کر ہلاک کیے گئے۔

سنہ ۱۳۹۴ء میں وکلف جو عیسائی مذہب کا مصلح تھا اور جس نے کتب مقدسہ کو انگلستان کی زبان مروجہ میں ترجمہ کیا تھا، اس کے معتقدوں پر سخت عذاب کیا گیا۔

سنہ ۱۴۱۳ء میں آزادی مذہب کی بیخ کنی کے واسطے قانون جاری کیے گئے۔

سنہ ۱۵۳۹ء میں اسکاٹ لینڈ میں مصلحان مذہب پر انواع و اقسام کے ظلم کیے گئے اور ساٹھ آدمی بدعت

کے الزام پر جلتی آگ میں جلائے گئے۔

۱۵۵۵ء میں کئی رفارمر بدعتی ہونے کے الزام میں جلائے گئے اور تمام قید خانے اس قسم کے بدعتیوں سے بھر گئے۔

۱۶۴۱ء میں جبکہ آئرلینڈ میں بغاوت ہوئی تو چالیس ہزار پروٹسٹنٹ قتل کیے گئے۔

سترہویں صدی عیسوی کے اخیر تک ارسطو کی حجتوں نے تمام یورپ کے مدارس کو ایسا جکڑ بند کر رکھا تھا کہ وہ مذہب کی رکن رکین سمجھی جاتی تھیں اور یہ تمام بندشیں اس وقت تک نہ ٹوٹیں جب تک کہ لارڈ بیکن نے نہایت زور آور تحریروں سے ان کو نہ توڑا۔

کوپرنکس نے جس وقت سیارات کی نسبت اپنی تحقیقات ظاہر کی تو تمام کلیسا نے ایک زبان ہو کر اس کو مردود ٹھیرایا۔

گلیلیو نے ۱۶۰۹ء میں دوربینیں بنائیں اور سیارات کے متعلق بہت سے حالات مشاہدہ کیے مگر اس کو انعام یہ ملا کہ قید کیا گیا۔ اگرچہ ہر چند اس نے بہت زبردست اور صاف دلیلوں سے سمجھایا کہ یہ باتیں دین یا کتاب مقدس سے کچھ منافات نہیں رکھتیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔

غلامی کے موقوف کرنے میں یورپ کو بے شمار مزاحمتیں پیش آئیں۔

لوتھر کی کتاب جو پوپ لیو دہم کے برخلاف لکھی گئی تھی ۱۵۲۰ء میں جلائی گئی۔ اسی طرح کے اور بیشمار واقعات پیش آئے جن کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔

آخر تعلیم نے تمام الف و عادت اور تعصبات کو دبا لیا اور عیسائی مذہب بہ قدر ضرورت وقتاً فوقتاً حشو و زوائد سے پاک ہوتا رہا۔ اب وہی عیسائی قومیں ہیں کہ جس طرح دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے سبقت لے گئی ہیں اسی طرح اپنے مذہب کی اشاعت اور حمایت میں تمام عالم کی قوموں سے زیادہ سرگرم ہیں۔

پس یہ خیال کہ مسلمان جب تک اپنے مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب ایک مدت کے بعد اپنی اصلیت سے متجاوز ہوتے ہوتے ایک طومار طویل الذیل

ہوجاتا ہے اور جب تک کوئی سخت ضرورت داعی نہیں ہوتی وہ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن جب زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو شکنجے میں کھینچتی ہیں تو وہ مذہب کی اصلیت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بہت سے ملکی قوانین اور بہت سے قصے کہانیاں بہت سے رسم و رواج، بہت سے بیجا تعصبات اور بہت سے ظنون و اوہام جو امتداد ایام کے سبب مذہب کے عناصر و ارکان بن جاتے ہیں ان سے دست بردار ہو کر اصل مذہب پر قناعت کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ زمانہ کی ضرورتیں ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں مثلاً ہندوستان کا ایک شریف مسلمان جو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو خلاف شرافت ہی نہیں بلکہ خلاف شریعت بھی جانتا ہے جب اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرتا ہے تو اس کو مجبوراً پردہ نشینی کے وہ قاعدے توڑنے پڑتے ہیں جن کو وطن میں لازمۂ اسلام خیال کرتا تھا۔ ایک شیعی مسلمان جو مشرکین کے دودھ دہی اور مٹھائی وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے جب کوئی لمبا سفر کرتا ہے تو اس کو لاچار سب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جب محمود ثانی سلطان روم نے فوج کو فرنگستانی قواعد سکھانے کی نہایت سخت ضرورت سمجھی اور ینگچری فرقے نے جن کی فوج شجاعت اور استقلال میں بے مثل اور شمار میں ایک لاکھ سے زیادہ تھی کافروں کی قواعد سمجھ کر اس کے سیکھنے سے انکار کیا اور کسی طرح وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی تو آخر مجبور ہو کر اس فرقے کے ایک ایک متنفس کو قتل کرنا پڑا۔ اگرچہ اس فوج کے قتل ہونے سے سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا لیکن زمانے کی ضرورت نے سلطان کو اپنے قتل عام پر مجبور کر دیا۔ اور اس دن سے فرنگستانی قواعد روم میں جاری ہو گئی۔ بیشک ینگچری فرقے کی یہ بغاوت و سرکشی مذہبی خیالات کا نتیجہ تھی لیکن چونکہ حقیقت میں اس کی بنیاد محض تعصب پر تھی نہ کہ اصول مذہب پر اور زمانے کی ضرورتیں بھی مجبور کر رہی تھیں کہ بغیر نئے آلات جنگ سے مسلح ہوئے اور موجودہ طرز نبرد آزمائی سے واقف ہوئے بغیر چارہ نہیں، اس لئے تمام علماء نے متفق اللفظ ہو کر ایک لاکھ بہادر اور کارآزمودہ فوج کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔

الغرض مذہبی توہمات جب ہی تک مانع ترقی رہتے ہیں جب تک زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو مجبور نہیں کرتیں۔

آج سے تیس برس پہلے ہندوستان میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی زبان سیکھنے کو معصیت

نہ جانتا ہو لیکن اب برخلاف اس کے ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی سیکھنے کو ضروری نہ سمجھتا ہو۔

کیا وہ پہلا خیال ایک مذہبی خیال نہ تھا ؟ اور کیا اس خیال کے بدل جانے سے مسلمان اسلام سے دست بردار ہو گئے ؟ حاشا ثم حاشا۔

بس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جب تک مسلمان اسلام سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی ہرگز نہیں کر سکتے۔ البتہ جب تک کوئی ہم کو یہ نہ بتائے کہ کیا صورتیں درپیش ہیں تب تک نہ مذہبی توہمات ہمارے دل سے دور ہو سکتے ہیں اور نہ ترقی کا خیال ہمارے دل میں پیدا ہو سکتا ہے اور وہ تنقی تعلیم ہے جس کے پھیلانے میں چند بااثر لوگ کوشش کر رہے ہیں اگرچہ قوم ان کی چیخ و پکار سے بیدار نہیں ہوتی لیکن انصح المؤدبین (زمانہ) ان کو بسلد ہوشیار کر دے گا۔

۲۔ دوسرا خیال: ایک بار تنزل کے بعد دوبارہ ترقی نہیں ہو سکتی

دوسری دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں سنی گئی جس نے ایک بار تنزل کے درجہ کو پہنچ کر دوبارہ ترقی کی ہو۔

لیکن ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ دوبارہ ترقی کرنے سے کیا مطلب ہے ؟ اگر دوبارہ سلطنت حاصل کرنا مراد ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں (بلکہ ہمارے نزدیک اگر دنیا واقعی عالم اسباب ہے تو ممکن نہیں) کہ جو قومیں زمانہ موجودہ کے فنون جہانبانی و کشورکشائی میں اپنے بنی نوع سے پیچھے رہ گئی ہیں ان کو کبھی سلطنت اور حکومت میں استقلال کا درجہ حاصل ہو سکے یا جو مستقل نظر آتی ہیں ان کا استقلال قائم رہ سکے۔

زمانۂ قدیم اور دورِ متوسط میں جبکہ جنگی طاقتیں تمام قوموں کی تقریباً یکساں تھیں اس وقت ہر قوم سلطنت اور حکومت حاصل کرنے کی قابلیت رکھتی تھی اور خاص خاص اسباب سے کبھی یہ قوم اس قوم پر اور کبھی وہ قوم اس قوم پر غالب آجاتی تھی۔

لیکن زمانۂ حال میں قواعدِ جنگ و آلاتِ حرب کے لحاظ سے دنیا کی حالت دگرگوں ہے۔ ایک قوم آسمان پر ہے تو دوسری قوم تحت الثریٰ میں ہے۔ اور جو قومیں ترقی کر چکی ہیں ان کا فرض ہے کہ مغلوب قوموں کو کبھی ان وسائل میں اپنے برابر نہ ہونے دیں جن کے سبب سے ان کو غلبہ حاصل ہوا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ترقی یافتہ

قوموں کا غلبہ اور رعب داب روز بروز بڑھتا جائے اور جن قوموں نے اپنی حد سے آگے قدم نہیں بڑھایا وہ نوبت بہ نوبت مضمحل ہوتی جائیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے کوشش کرنا محض فضول ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہر قوم بلکہ ہر شخص کی ترقی کی ایک جداگانہ حد ہے اور اس حد تک پہنچنا اس کا ضروری فرض ہے۔ ایک شخص جس کے تمام اعضائے جسمانی درست اور مضبوط ہیں اور ذہن و حافظہ بھی عمدہ ہے بے شک ہر علم و ہنر میں ترقی کرسکتا ہے۔ وہ جس طرح ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ہو سکتا ہے ویسا ہی ایک اعلیٰ درجے کا سپاہی بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا شخص جس کا فہم، ذہن اور حافظہ عمدہ ہے مگر ایک ہاتھ سے بالکل اپاہج ہے وہ اگرچہ ایک عمدہ سپاہی نہیں بن سکتا لیکن ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ضرور ہوسکتا ہے اور اس لئے اس کا نہایت ضروری فرض ہے کہ علمی ترقیات میں جہاں تک ہو سکے کوشش کرے۔

اگر دوبارہ ترقی کرنے سے یہ مراد نہیں ہے جو اوپر ذکر کی گئی تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ کسی قوم نے تنزل کے بعد ترقی نہیں کی۔

اور ملکوں کو جانے دو۔ ہندوستان ہی میں ایسی قومیں موجود ہیں جو نہایت پست ہو کر دوبارہ بلند ہوئی ہیں مثلاً گجرات میں پارسی یا بنگالہ میں ہندو۔ ان دونوں قوموں کا حال جو دو سو برس پہلے تھا اور ان کی موجودہ حالت دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس قدر ترقی کی ہے۔

اس کے سوا کوئی روشن اور صاف دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ جب گورنمنٹ کی طرف سے ہماری تعلیم، ہماری تجارت اور ہماری صنعت و حرفت میں کوئی صریح مزاحمت نہ ہو تو بھی ہم ان شاخوں میں ترقی نہیں کرسکتے۔

یہودیوں پر جب تک یورپ میں ظلم و ستم ہوتا رہا اور وہ غلامی کی حالت میں رہے تب تک ان کی ترقیات جس قدر وہ رعیت ہونے کی حالت میں کر سکتے تھے رکی رہیں لیکن جب سے یورپ میں آزادی پھیلی اور ان کو رعیت کے پورے پورے حق دے گئے تب سے ان کی حالت پہلے کی نسبت نہایت بہتر ہے۔ بعض ملکوں میں تو انھوں نے حکمراں قوموں کے برابر حقوق حاصل کئے ہیں۔ عموماً ہر ملک میں ان کی حالت اچھی ہے۔ ان کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور ان کی دولت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ بعض دولتمند ان میں ایسے

ایسے ہیں کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ان کی قرضدار ہیں۔

۳۔ تیسرا خیال۔ موجودہ تعلیمی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا لہذا کوشش بے سود ہے

جو لوگ مسلمانوں کی ترقی سے بالکل مایوس ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:۔

"اس کوشش کا نتیجہ جو کہ مسلمانوں کے بعض خیر خواہ کر رہے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ چند آدمی کسی قدر امتیاز حاصل کر لیں۔ کیونکہ آج تک جتنے آدمیوں کو ترقی کا خیال ہوا ہے وہ اس قدر تھوڑے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ پس اگر سو دو سو برس میں ہزار دو ہزار مسلمان ممتاز ہو گئے تو اس کو قومی ترقی نہیں کہہ سکتے۔

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کے دن سے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہے؟ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس خیال کی عمر اور پرچہ تہذیب الاخلاق کی عمر برابر نکلے گی۔ پس جو کچھ اس قلیل عرصے میں ہوا وہ ترقی کی معمولی چال سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے سوا ترقی کی رفتار ابتدا میں ہمیشہ سست ہوتی ہے لیکن وہ جس قدر بڑھتی جاتی ہے اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے جو بیمار روز بروز بگڑتا جاتا ہے اس کا ادنیٰ افاقہ بھی نہایت تسلی بخش ہوتا ہے اور اگر پھر کوئی غلطی نہیں ہوتی تو اس کی صحت اور طاقت روز بروز ترقی کرتی ہے اور یہ ترقی بھی یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔

۴۔ چوتھا خیال۔ پہلے سے ترقی کن قوموں کے برابر چونکہ ہم نہیں ہو سکتے لہذا ترقی بے فائدہ ہے

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "جو قومیں پہلے سے ترقی کر رہی ہیں ان کے برابر ایک ایسی قوم ہرگز نہیں ہو سکتی جس کو سب سے پیچھے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہو۔ پس اگر بالفرض مسلمانوں نے اب ترقی کرنے کا پختہ ارادہ بھی کیا تو کچھ فائدہ نہیں ہے کیونکہ ایسی حالت میں ہم ان ترقی یافتہ قوموں سے ہمیشہ پیچھے ہی رہیں گے۔"

بے شک یہ بات صحیح ہے لیکن ہماری کوشش صرف اس بات میں ہونی چاہیے کہ ہم اپنی ہموطن قوموں سے جنھوں نے ہم سے بہت پہلے قدم آگے بڑھایا ہے کسی چیز میں کم نہ رہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم اس کوشش میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ محکوم قوموں کی ترقی ہمیشہ ایک خاص حد پر جا کر ہلکی ہو جاتی ہے جس سے آگے بڑھنے کا محل ان کے لئے باقی نہیں رہتا۔ پس اگر ان میں سے ایک قوم آگے بڑھ گئی ہے اور دوسری قوم پیچھے رہ گئی ہے تو پس ماندہ قوم کو مایوس نہ ہونا چاہیے کیونکہ اگر راہ میں نہیں تو اخیر منزل پر جا کر

دونوں مل جائیں گی۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ راہ ہی میں پچھلا قافلہ اگلے قافلہ سے جا ملے کیونکہ بعض اوقات ایسی اضطراری حالتیں پیش آتی ہیں کہ پچھلوں کو معمولی رفتار سے کسی قدر زیادہ جلد قدم اٹھانا پڑتا ہے یہانتک کہ وہ راہ ہی میں اگلوں سے جا ملتے ہیں۔

اصل مانع ترقی مایوسی اور ناامیدی ہے

بہرحال یہ تمام موانع جو اوپر ذکر کیے گئے ہم کو ترقی سے مایوس کرنے والے نہیں ہیں البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو تمام منصوبوں اور ارادوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور وہ ترقی کی طرف سے مایوسی اور ناامیدی ہے۔

جو قوم عام تعصب اور جہالت میں مبتلا ہوتی ہے وہ ہمیشہ چند ایسے روشن ضمیر آدمیوں کی ہمت اور کوشش سے رو براہ ہوتی ہے جو تعلیم کی بدولت تعصب اور جہالت کی اندھیری کوٹھری سے باہر نکل آتے ہیں اور قوم کی ابتر حالت دیکھ کر ان کے دل میں بے اختیار ایک ولولہ اٹھتا ہے اور قومی اصلاح و ترقی کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اسی بنا پر ہم کو یہ امید تھی کہ جو نوجوان ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پائیں گے وہ اس کام کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس قدر ایجوکیشن اور سویلزیشن (تعلیم و تہذیب) میں اعلیٰ درجہ حاصل کرتے ہیں اسی قدر قوم کی ترقی سے مایوس نظر آتے ہیں یہانتک کہ وہ جن نفوس مقدسہ کو قومی ترقی کے خیال میں سرگرم پاتے ہیں ان پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیوں کوشش کر رہے ہیں؟ اور کیوں کر کر رہے ہیں؟

ہائی ایجوکیشن (اعلیٰ تعلیم) کی بدولت ان کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جو اندھیری رات میں ایک نہایت روشن کمرے سے باہر نکلتا ہے اور باہر آکر اس کو در و دیوار کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ باہر چلنے پھرنے والوں کے پاؤں کی آہٹ سن کر تعجب کرتا ہے کہ یہ لوگ کیوں کر اس اندھیرے میں چل پھر رہے ہیں اور آخر گھبرا کر پھر اسی روشن کمرے میں گھس جاتا ہے۔ وہ اتنا توقف نہیں کرتا کہ روشنی کی چکاچوند جس نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے کم ہو جائے اور تاریکی میں اس کو بھی روشنی محسوس ہونے لگے اور وہ بھی اوروں کی طرح چل پھر سکے۔

اسی طرح ہماری قوم کے نوجوان ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) جنھوں نے یورپ کی سویلزیشن (تہذیب) کو اپنی

آنکھ سے دیکھا ہے یا تعلیم کے ذریعے سے اس کا اندازہ کیا ہے وہ جب مغربی قوموں کی حالت کو اپنی قوم کی موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں حالتوں میں وہ نسبت پاتے ہیں جو محض نور اور محض ظلمت میں ہے اور بیشک بادی النظر میں ایسی ہی نسبت معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا حال نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اندھیرے میں کچھ اجالا بھی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دو چار شخصوں کی کوشش سے چند روز میں وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کی کسی طرح توقع نہ تھی۔ پس اگر دس بیس با لیاقت آدمی توجہ اور کوشش کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

صرف دو چیزیں ہیں جن پر دنیا کی کامیابی اور ناکامی کا مدار رکھا گیا ہے۔

(۱) امید۔

(۲) ناامیدی۔

ہزاروں دشوار کام جو بالیقین محال بلکہ ناممکن سمجھے گئے تھے امید کی بدولت اور کوشش کے ذریعے نہ صرف ممکن بلکہ سرانجام پائے ہیں اور ہزاروں سہل اور آسان کام ناامیدی اور ہمت ہار دینے کی وجہ سے ناتمام اور ادھورے رہے ہیں دیکھو کلمبس نے صرف امید ہی کے بھروسے پر ایک ایسا کام سرانجام کیا جس کو تمام عالم محال سمجھتا تھا اور کلائو نے صرف امید ہی کے سہارے پلاسی میں وہ فتح حاصل کی جس کے نتائج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے ؏

بجز امید کہ ایمانِ عشق کیشاں است　　　کسے نداد تسلی دلِ زلیخا را

"منقول از مقالات حالی"
شائع کردہ انجمن ترقی اردو

دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

یہاں علم سے ہماری مراد مجرد علم ہے جو عمل سے بالکل خالی ہو۔ اور عمل سے مراد محض عمل ہے جس میں علم کو کچھ دخل نہ ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

اگر ہم کو یہ بات دریافت کرنا ہو کہ چراغ کی بتی کا اشتعال آکسیجن سے قائم رہتا ہے یا ہائیڈروجن سے یا دونوں سے، تو ہم کو چاہئے کہ ایک دفعہ بتی کو محض آکسیجن میں اور دوسری دفعہ محض ہائیڈروجن میں رکھ کر دیکھیں۔ اگر دونوں میں بجھ جائے تو سمجھنا چاہئے کہ ہوا کے دونوں جزوں کو اس کے اشتعال میں دخل ہے اور اگر ہائیڈروجن میں بجھ جائے اور آکسیجن میں نہ بجھے تو جاننا چاہئے کہ اس کے اشتعال کا باعث محض آکسیجن ہے نہ ہائیڈروجن۔

اسی طرح اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے تو ہم کو چاہئے کہ اول ایک ایسا ملک فرض کریں جس میں اہل علم و اہل تنظر کے سوا کوئی کام کرنے والا اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک کتنے دن آباد رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا ملک فرض کریں جس میں اَن پڑھ محنتی مزدوروں کے سوا اہل علم کا نام و نشان نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک آباد رہتا ہے یا نہیں۔

ہم اول ایک ایسا خطہ فرض کرتے ہیں جس کے باشندے جہاں عالم، فلسفی، ریاضی داں، مصنف، اور بیٹر (Orator)، شاعر اور بڑے بڑے فاضل ہیں مگر ان میں کوئی خدا کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو ان واجب التعظیم پابجوں کے کھانے پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے اور لکھنے پڑھنے وغیرہ کا سامان مہیا کرے۔ اول تو کسی ملک میں بغیر کارکن جماعتوں کے ایسی آبادی کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے لیکن اگر بفرض محال کسی خطہ میں ایسی ناشدنی کولونی (آبادی) چند روز کے لئے آباد ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ ممکن ہے کہ بعض کو مطالعہ کے ذوق و شوق میں ایک آدھ روز بھوک پیاس نہ لگے، بعض کو کسی مشکل مسئلے کے حل ہو جانے کی خوشی میں ایک دو وقت کھانے کی کچھ پرواہ نہ رہے یا بعض کو کسی مضمون کی دھن میں کچھ دیر تک خورونوش کا کچھ خیال نہ آئے مگر

بہت جلد وہ آپ کو ایک ایسی مخلوق پائیں گے جو بھوکی ہے مگر کوئی اس کا رازق نہیں ننگی ہے مگر کوئی اس کا ستار نہیں، حاجتمند ہے مگر کوئی اس کا قاضی الحاجات نہیں اب یا تو انھیں خود اپنے اعلیٰ اور اشرف ہاتھوں سے وہ تمام حقیر اور ذلیل کام سرانجام کرنے پڑیں گے جو عوام کالانعام کو کرنے چاہئیں یا فوراً اس ملک سے ہجرت کر کے کسی ایسے خطہ میں جا کر رہنا پڑے گا جہاں ان کے لئے فرمانبردار بندے یا بندہ پرور خدا موجود ہوں دونوں حالتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ " دنیا کی کل محض علم سے نہیں چل سکتی "

اس کے بعد ہم ایک دوسرا ملک فرض کرتے ہیں جس کے تمام باشندے اَن پڑھ اور بے علم ہیں مگر محنتی جفاکش اور اپنی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں نہایت سرگرم ہیں۔ گو انھوں نے زراعت یا تجارت یا صنعت و دستکاری کے اصول کتابوں میں نہیں پڑھے مگر وہ اپنی تمام ضروریات جن پر انسان کی زندگی موقوف ہے خود مہیا کرتے ہیں۔ قدرتی خواہشیں اور نیچرل ضرورتیں ان کو جس طرح سکھاتی گئیں اور متواتر تجربوں سے جس قدر ان کی سمجھ بوجھ بڑھتی گئی وہ اپنے تمام کام برابر سرانجام کرتے رہے۔ بونا، جوتنا، بیج بونا، سنعت اور دستکاری غرضکہ تمام اہم اور ضروری کام رفتہ رفتہ بقدر ضرورت انجام دینے لگے اب ان کی کوئی ضرورت بند نہیں رہتی اور کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ ایک اناج پیدا کر کے لاتا ہے، دوسرا پیستا ہے، تیسرا پکاتا ہے اور تینوں مل کر کھاتے ہیں۔ ایک کپاس بوتا ہے، دوسرا اُسے کاتتا ہے، تیسرا بنتا ہے، چوتھا سیتا ہے اور چاروں مل کر پہنتے ہیں اُن کو چوری یا ڈکیتی کا مطلق خوف نہیں کیونکہ ان کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کوئی دولت نہیں۔ ان کو غنیم کے حملہ کا کچھ ڈر نہیں کیونکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے چوکس اور غنیم کے مقابلے کے لئے مستعد اور تیار ہیں ان میں کوئی بدکار اور بدچلن نہیں کیونکہ ان کو اپنے کام دھندوں میں بدکاری اور بدچلنی کی فرصت ہی نہیں۔ ان میں کوئی روگی اور بیمار نہیں کیونکہ ان میں کوئی طبیب اور ڈاکٹر نہیں۔ ان میں کوئی مذہبی تکرار نہیں کیونکہ ان میں کوئی واعظ یا ملا نہیں۔ ان میں کوئی پولٹیکل اختلاف نہیں کیونکہ وہ سب کنسرویٹو (Conservative) ہیں۔ ان میں کوئی عدالتی جھگڑا نہیں کیونکہ ان میں کوئی اڈووکیٹ اور بیرسٹر نہیں ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ سویلائزڈ (مہذب و تعلیم یافتہ) نہیں۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل عمل سے چلتی ہے نہ علم سے۔

اب فرض کرو کہ اس ملک کے باشندوں کا میل جول کسی ایسے ملک والوں سے ہوگیا جن کے تمام کام

علمی اصولوں پر مبنی ہیں۔ انھوں نے زراعت، تجارت، صنعت و دستکاری اور تمام جنگی اور ملکی مہمات میں علم ہی کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ کیا معمار اور کیا بڑھئی، کیا لوہار اور کیا کمہار، کیا درزی اور کیا کفش دوز غرضکہ تمام پیشہ ور محض علم کی ہدایت سے اپنے تمام کام سرانجام کرتے ہیں۔

اس قسم کی باعلم و عمل قوم کے میل جول اور لین دین نے اس آباد ملک کے اَن پڑھ باشندوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کی تجارت نے ان کے اخراجات زندگی حد سے زیادہ بڑھا دئے، ان کی صنعت کے مقابلے میں ان کی صنعت ماند ہوگئی۔ ان کی دستکاری نے ان کی دستکاری کو اپنڈ کر دیا۔ مگر ایک مدت تک ان کو اس بات کی مطلق خبر نہ ہوئی کہ ہمارے پیشہ ور کیوں بے کار ہوگئے؟ ہماری کمائیوں میں کیوں برکت نہ رہی؟ ہمارے اخراجات روز بروز کیوں بڑھتے جاتے ہیں؟ اور ہماری آمدنی ہمارے اخراجات کو کیوں کفتی نہیں ہوتی؟

لیکن اس غیر قوم سے جوں جوں میل جول بڑھتا گیا اُن کو ان کی اور ان کو اُن کی زبان سیکھنے کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔ انھوں نے اول ان کی زبان سیکھی پھر رفتہ رفتہ ان کے علم بھی سیکھنے لگے۔ جن علموں کے ذریعے سے انھوں نے ہر فن میں ترقی کی تھی وہ علم بھی انھوں نے حاصل کئے مگر سوائے رٹ لینے کے کوئی عملی فائدہ ان کے علوں سے نہ اُٹھایا۔ وہ علم کو عمل کی غرض سے سیکھتے تھے، انھوں نے علم کو محض علم کے واسطے سیکھا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ علم آدمی کے لئے بنا ہے مگر یہ بمشکل ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ آدمی علم کے لئے بنا ہے۔ وہ علم سے خود بھی لذت اور فائدہ اٹھاتے تھے اور اپنے ملک اور قوم کو بھی اس کے فوائد پہنچاتے تھے۔ انھوں نے گونگے کی طرح گڑ کھایا اور کسی نے نہ جانا کہ کھٹا ہے یا میٹھا۔ وہ دنیا کی مختلف زبانیں اس لئے سیکھتے تھے کہ تمام عالم میں پھرتے تھے، غیر ملکوں کے آدمیوں سے ملتے تھے، مختلف قوموں کے علوم و فنون سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور ان کو اپنی زبان میں نقل کرتے تھے۔ انھوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی غیر ملکوں کی زبانیں اور غیر قوموں کی بولیاں سیکھیں مگر نہ اس لئے کہ غیر ملکوں میں سفر کریں اور غیر قوموں کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کریں بلکہ اس لئے کہ طوطے کی طرح کہیں "حق اللہ پاک ذات اللہ" اور کہیں "ست گورو دت داتا" بول اٹھیں۔ وہ لیمپ روشن کرنے کے لئے، میز لکھنے کے لئے، کرسی بیٹھنے کے لئے، گھنٹہ وقت دیکھنے کے لئے اور فرش بچھانے کے لئے خریدتے تھے۔ انھوں نے ان کی ریس سے یہ سب چیزیں فراہم توکیں مگر نہ لیمپ کو جلایا، نہ میز پر لکھا، نہ کرسی پر بیٹھے، نہ گھنٹے میں وقت دیکھا

اور نہ فرش کو بچھایا بلکہ کباڑی کی طرح سارا گھر اسباب سے بھر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی
گئی علم کے ذوق و شوق میں انھوں نے ہاتھ پاؤں ہلانے بالکل چھوڑ دئے اور علم کا ادب ان کو دنیا کے ذلیل کاموں
میں ہاتھ ڈالنے سے مانع ہوا۔ اب تاوقتیکہ وہ علم کو عمل کی غرض سے نہ پڑھیں اور اس سے عملی فائدے نہ اٹھائیں
تب تک ممکن نہیں کہ ان کی حالت درست ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل علم سے نہیں چلتی بلکہ عمل
سے چلتی ہے

اس تمثیل سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو علم کی ضرورت نہیں بلکہ ہم کو اس وقت علم کی نہایت ضرورت
ہے اور ایسی ضرورت ہے جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جس طرح ٹھنڈے پانی
کی کلیاں کرنے سے پیاس نہیں بجھتی بلکہ اور زیادہ بھڑک اٹھتی ہے اسی طرح سطحیوں کی مانند کتابوں کے الفاظ
اور علوم کی اصطلاحات یاد کرنے سے اور طوطے کی طرح علمی مسائل اور قواعد ازبر کرنے سے کوئی شخص نہ آپ کو
اور نہ ملک کو کوئی اصلی فائدہ نہیں پہنچا سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ ملک کے حق میں مضرت ہوں
جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ و شاداب
کرے نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قوی کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے۔ ایسے علم سے بے علمی سو درجے بہتر
ہے بقول شخصیکہ "بجھو بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا"

"منقول از مقالات حالی"
شائع کردہ انجمن ترقی اردو

ہم جیتے ہیں یا مر گئے ؟

عربی میں ایک مشہور مقولہ ہے کہ

یعنی کام کرنا زندوں کو شایاں ہے اور بے کار رہنا مردوں کو۔ اس قول کے موافق ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی ہے یا نہیں ؛ سچ یہ ہے کہ اگر مستثنیٰ مثالوں سے قطع نظر کی جائے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی نہیں رہی اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

[1]ایتھا النفس اجملی جزعا   ان الذی تحذرین قد وقعا

اس بات کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ ہر قوم کی ترقی کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ اُس کے افراد میں عموماً مستعدی، محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی عادت پائی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خاندان بلکہ کسی قوم میں اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں تو اس کی ذات سے تمام خاندان بلکہ تمام قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ پس جس قوم کے افراد میں عموماً یہ خصلتیں پائی جائیں گی ممکن نہیں کہ وہ قوم اپنی بساط کے موافق ترقی میں کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ کرے لیکن جہاں تک کہ ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں اس میں چاروں طرف ہم کو ایک سناٹا نظر آتا ہے اور وہ اسلام جو بحرِ قلزم کی طرح موجیں مارتا ہوا اٹھا تھا آج بحرِ منجمد کی طرح ساکن اور بے حس و حرکت معلوم ہوتا ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم   اب ہوئے خاک، انتہا ہے یہ

ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے اور امن و آزادی ترقی کے دو بڑے معاون ہیں۔

ہم کو اپنے تنزل کا پورا یقین ہو گیا ہے۔

امن و آزادی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کسی عہد اور کسی دور

---

[1] یعنی اے دل اپنی بیقراری کو کم کر (کیونکہ) جس بات کا تجھ کو ڈر تھا وہ تو ہو چکی۔

میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی۔

ترقی کے نمونے بھی اپنے ہم وطنوں میں رات دن اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

ترقی کی قابلیت بھی ہم میں اُسی قدر ہے یا ہونی چاہئے جس قدر کہ ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوم کو قدرت نے عطا کی ہے۔

باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی کی روح ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہئے لیکن کچھ کرتے نہیں۔

ہم کو بھوک شدت سے لگی ہوئی ہے مگر چاہتے ہیں کہ کہیں سے پکا پکایا ہاتھ لگ جائے تو کھالیں۔

ہم پیاس کے مارے مرے جاتے ہیں مگر منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہمارے حلق میں آکر پانی چواجائے۔

ہم توکل کو اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس میں خدا پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ توکل کی بدولت ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔

ہم تدبیر کو اس لئے بے سود خیال نہیں کرتے کہ وہ تقدیر الٰہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ اس لئے کہ تقدیر کے حیلے سے ہم کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔

ہم دنیا اور دنیا کے کاموں کو اکثر فانی اور حقیر بتاتے ہیں مگر نہ اس لئے کہ فی الحقیقت ہم دنیا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ ہم کو اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں۔

ہم اس حیلہ جو لومڑی کی طرح انگور کے خوشوں سے اس لئے ناک نہیں چڑھاتے کہ ان کو کھٹا سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کے توڑنے میں ہم کو دقت معلوم ہوتی ہے۔

ہم کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے کچھ نہیں ہماری حالت ہم کو جھٹلاتی ہے اور ہمارے افعال ہمارے قول کی تکذیب کرتے ہیں۔

ہم قدریہ اور جبریہ دونوں فرقوں کو گمراہ بتاتے ہیں مگر ہم خود قدری بھی ہیں اور جبری بھی۔ ہمارے دعوے قدریوں کے سے ہیں اور ہمارے کام جبریوں جیسے۔ ہماری زبان قدری ہے اور ہمارا دل جبری۔

مسلمانوں میں قوت عملی کا فقدان اور اس کی چند مثالیں

اگرچہ ہم میں لائق آدمیوں کا قحط ہے تاہم کم و بیش مصنف، لکچرار اور شاعر ہم میں موجود ہیں۔ ہمارے مصنفین کو یہ شکایت ہے کہ پڑھنے والوں میں قوت منفعلہ نہیں اور پڑھنے والوں کو یہ شکایت ہے کہ مصنفوں میں قوت فاعلہ نہیں۔ ہمارے اسپیکر اور لکچرار جب کچھ بولتے ہیں تو بعض اوقات ان میں قومی جوش کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا، ہمارے شاعر جب کچھ پڑھتے ہیں تو قومی ہمدردی ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے مگر فی الحقیقت ان کے کلام میں اور فونوگراف کی آواز میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ گویا ایک ہوا بھری ہوئی تھی جب وہ نکل گئی تو اب بالکل خالی ہیں۔

ہماری قوم میں انگریزی تعلیم [جو پریکٹیکل آدمی (عملی کام کرنے والے اشخاص) پیدا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے] چشم بددور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد میں ہر سال معقول اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر افسوس ہے کہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا عملی قوت اور سلیف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرنے) کا مادہ ان میں تعلیم کے بعد اتنا بھی باقی نہیں رہتا جتنا کہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی بڑی دوڑ بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہے کہ مڈل پاس کئے ہوئے طلبہ کی طرح سرکاری نوکری کے لئے ادھر ادھر سلسلہ جنبانی کرتا پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگردان و پریشان رہے۔ ان کو اپنے دست و بازو پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہوتا جتنا کہ چرندوں اور پرندوں کو اپنی قوت لایموت کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ وجہ معاش کو غلامی یعنی نوکری ہی پر منحصر جانتے ہیں۔ ان میں اور ایک غریب اورنیٹل اسکالر (عالم عربی یا فارسی) میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ انھوں نے زمانے کی ضرورت کے مطابق باقاعدہ غلامی کا پیشہ سیکھا ہے اور اس بیچارہ نے نہیں سیکھا۔ ان میں سے جن کو سرکاری نوکری مل جاتی ہے ان کو چارناچار کتاب بالائے طاق رکھنی پڑتی ہے اور لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی مثال بعینہ اس بدقسمت عربی گھوڑے کی سی ہے جس کو گھوڑ دوڑ کے لئے تیار کیا گیا ہو اور پھر بجائے گھوڑ دوڑ کے چھکڑے یا ہل میں جوتا گیا ہو۔

گروہ عالی ہمت گریجویٹ جو نوکری کو پسند نہیں کرتے یا نوکری ان کو پسند نہیں کرتی ان کا حال پہلوں

سے ہی گیا گذرا ہے۔ اگر وہ چھکڑے یا ہل میں جوت دیئے جاتے تو کچھ کام بھی آتے، لیکن اب وہ کسی کام کے نہیں۔ ان کی کوششیں اکثر بے مصرف ہوتی ہیں جن سے نہ ان کو اور نہ کسی اور کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کو رومن ایمپائر (سلطنت روم) کی تمام ہسٹری اور اس کے تنزل کے اسباب از بر ہوتے ہیں مگر اپنی ہستی کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ یورپ کے مصنفوں، موجدوں اور ریفارمروں کے کام نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن سوائے اس کے کہ ان کے کارنامے بیان کرکے اپنی واقفیت کی داد چاہیں خود کچھ نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کے حقوق جو گورنمنٹ کے ذمہ ہیں کمال ادب سے بیان کرتے ہیں مگر ان کے، ان کے خاندان کے اور ان کی قوم کے حقوق جو خود ان کے ذمہ ہیں ان پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنے میں آندھی ہیں مگر اپنے گھر کے انتظام سے محض بے پروا۔

ہمارے بہت سے نوجوان ولایت سے تعلیم پاکر آئے ہیں اور اس پارس کی پتھری کو چھو آئے ہیں جو مس کو طلا کر دیتی ہے۔ وہ اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ اس قوم میں بسر کر آئے ہیں جو حب وطن اور قومی ہمدردی کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہے۔ انھوں نے برسوں اس ملک کی ہوا کھائی ہے جہاں انسان علم و عمل کے سایہ میں پرورش پاتا ہے مگر جب وہ مع الخیر ہندوستان میں پہنچتے ہیں تو اکثر کی حالت بعینہٖ اس شعر کی مصداق ہوتی ہے۔

مکہ گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

حب وطن اور قومی ہمدردی ان میں اتنی بھی باقی نہیں رہتی جتنی کہ وہ یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جہاز میں سوار ہوئے تھے، قوم سے ان کو نفرت ہو جاتی ہے اور ہندوستانی سوسائٹی میں شریک ہونے سے ان کو شرم آنے لگتی ہے۔ جس حقارت سے کہ انگریز ہندوستانیوں کو دیکھتے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ حقارت کی نگاہ سے اپنے ہم وطنوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ انگریز ان کو ہاف سویلائزڈ (نیم وحشی) کہتے ہیں تو وہ ان کو اَن سویلائزڈ (وحشی مطلق) کا خطاب دیتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو ترقی اور اصلاح کے ناقابل بتاتے ہیں اور اس لئے ان کی بھلائی کے لیے مطلق کوشش نہیں کرتے بلکہ جو لوگ ایسے کاموں میں کوشش کرتے ہیں ان کی کوششوں پر ہنستے ہیں اور ان کو بے سود خیال کرتے ہیں۔ یہ تمام شہادتیں اس بات کی ہیں کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

کبھی کبھی ہمارے بھائیوں کے دل میں ایک غیر معمولی جوش دودھ کے ابال سے بھی زیادہ خود بخود اٹھتا ہے۔
کبھی وہ اپنے چند ہم خیال آدمیوں کو متفق کر کے ایک انجمن قوم کی بھلائی کے لئے منعقد کرتے ہیں۔
کبھی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کوئی اسلامی یا انگریزی مدرسہ قائم کرتے ہیں۔
کبھی کوئی رسالہ یا اخبار محض قوم کے فائدے کی غرض سے جاری کرتے ہیں۔

اسی طرح کبھی ایک تدبیر کبھی دوسری تدبیر خاص قوم کی بھلائی کے لئے کرتے ہیں اور اکثر ان تدبیروں کے محرک جہاں تک ہم کو معلوم ہے فی الواقع نہایت خلوص اور صدق دل سے ان کاموں کو شروع کرتے ہیں اور ان کا یہ دلی ارادہ ہوتا ہے کہ تا دم واپسیں ان کاموں میں کوشش کریں گے اور ان کو ترقی دیں گے۔ مگر درحقیقت ان کی حرکت ایک حرکت مذبوحی ہوتی ہے وہ ایک ہی دو جست کے بعد بالکل ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ ان کا کوئی منصوبہ (اِلّا ماشاء اللہ) پورا نہیں ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کر سکتے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم میں قوت عملی باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھدار آدمی موجود ہیں جو پرانی بیہودہ رسموں کو برا جانتے ہیں شادی اور غمی میں جو بے دریغ روپیہ صرف ہوتا ہے اس کو محض فضول اور لغو بلکہ گناہ اور معصیت سمجھتے ہیں۔ جو لوگ ایسے موقعوں پر سودی روپیہ قرض لے کر خرچ کرتے ہیں ان پر نہایت افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتے ہیں مگر جب ویسا ہی موقع خود ان کو پیش آتا ہے تو آنکھیں بند کر کے اسی اندھے کنوئیں میں آپ بھی کود پڑتے ہیں جس میں اوروں کو گرتے دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔ اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کی تعلیم کا کسی مناسب اور قابل اطمینان طریقے سے رستہ نکلے۔ اس باب میں لوگوں کی ترغیب اور تحریص کے لئے کتابیں اور رسالے تصنیف کرتے اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں مگر عملی طور پر کوئی کارروائی ان سے نہیں ہو سکتی اور زبانی جمع خرچ کے سوا وہ کوئی عملی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عملی قوت ہم میں باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے ہیں جو تنگی معاش کے سبب نہایت حیران و پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس حیلے سے روٹی میسر آئے وہ طریقہ اختیار کریں۔

بعضے بیوپار کرتے یا دوکان کھول کر بیٹھتے ہیں، اگر اپنے پاس کافی سرمایہ نہیں ہوتا تو چند اور اشخاص کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں لیکن سوا ان لوگوں کے جو قدیم سے تجارت پیشہ رہے ہیں باقی سب ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں، دوالہ نکالتے ہیں، مقروض ہوتے ہیں اور پھر کبھی بھول کر بیوپار یا دوکان کا نام نہیں لیتے۔ بعضے کھیتی میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ بعضے صیغہ تعمیرات سرکاری میں ٹھیکے لیتے ہیں۔ بعضے پریس جاری کرتے ہیں۔ بعضے اخبار نکالتے ہیں۔ مگر جہاں دیکھیے اخیر نتیجہ ہمیشہ ناکامی، خسارہ اور مایوسی ہوتی ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عملی قوت ہماری قوم میں باقی نہیں رہی۔

اگر کسی خاندان میں حسن اتفاق سے ایک کماؤ پیدا ہو جاتا ہے تو تمام خاندان اس کے سہارے پر فکر معاش سے فارغ البال ہو جاتا ہے۔ ایک کماتا ہے اور بیس کھاتے ہیں۔ ایک شکاری ہے اور بیس اس کے فضلہ خوار ہیں۔ وہ کماتے کماتے تھک جاتا ہے مگر یہ کھاتے کھاتے نہیں تھکتے۔ کھاتے ہیں اور غراتے ہیں۔ مرغی اپنی جان سے جاتی ہے اور کھانے والوں کو مزہ نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم میں قوت عمل باقی نہیں رہی۔

آٹھ برس سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں صرف اس لئے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی جو تدبیر کسی کے ذہن میں آئے وہ اس کو مجمع عام میں پیش کرے اور جو تجویز بعد بحث و مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے سے صائب اور معقول قرار پائے اس سے عام مسلمانوں کو مطلع کیا جائے تاکہ جو باتیں ان کے کرنے کی ہوں ان کو عمل میں لائیں لیکن آج تک کانفرنس کی ایک صلاح پر بھی غالباً کسی نے عمل نہیں کیا بلکہ بجائے اس کے کہ خود اپنے دل میں شرمندہ ہوں الٹے کانفرنس کی کارروائیوں پر نفریں کرتے ہیں اور اس کو محض لغو اور بے سود بتاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح ان میں قوت عمل باقی نہیں اسی طرح وہ اپنے فرائض کو بھی نہیں سمجھ سکتے اور مثل جمادات کے اپنے آپ کو کسی تکلیف کا مکلف نہیں جانتے۔

ہماری قوم میں جو اس قابل ہیں کہ ترقی و تنزل کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور دوسری ترقی یافتہ اقوام میں ان کو کم و بیش فرق محسوس ہوتا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں، یا پرانے خیال والے ہیں یا نئے خیال والے۔ جو پرانے خیالات رکھتے ہیں اور قومی تنزل کے اخیر نتائج کا بخوبی اندازہ نہیں کر سکتے وہ اس حیلے سے سعی و کوشش کو بے سود بتاتے ہیں کہ دنیوی تنزل اور دنیوی ترقی سب ہیچ ہے۔ انجام دونوں کا فنا ہے۔ ہم کو صرف وہاں

کی فکر کرنی چاہیئے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور بس۔

نئے خیال والے جو ترقی و تنزل کی ماہیت اور اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہیں اور دیگر اقوام کی ترقی اور اپنے تنزل میں جو نسبت ہے اس کو سمجھے ہوئے ہیں ان میں اکثر کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم ہرگز ابھرنے والی نہیں۔ اس کا ضعف کسی ایسے مرض کے سبب سے نہیں ہے جو رد ارت مادہ سے عارض ہوا ہو تاکہ اس کو قابل علاج سمجھا جائے بلکہ اس سبب سے ہے کہ اس میں حرارت غریزی باقی نہیں رہی اور اس لئے اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنی محض بے فائدہ ہے۔

الغرض کیا پرانے خیال والے اور کیا نئے خیال والے دونوں عموماً سعی و کوشش کو عبث اور رائیگاں خیال کرتے ہیں۔ پہلے اس لئے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اس لئے کہ ترقی ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمارے بعضے گروہ کچھ نہیں کر سکتے اور بعضے کچھ کرتے نہیں اور یہ بہت بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

عملی قوت والوں سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو محنت مزدوری اور پیشے یا حرفے کے ذریعے سے بُری بھلی طرح اپنا پیٹ پال لیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو مردہ سے مردہ قوم میں بھی جب تک کہ اس قوم کے تھوڑے بہت افراد دنیا میں موجود ہیں ضرور ہے کہ پائے جائیں کیونکہ ؎

این شکم بے ہنر پیچ پیچ   صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو زمانے کی رفتار کے موافق نہ صرف باتوں سے بلکہ کاموں سے قوم کے لئے خود نمونہ بن کر اس کو ترقی کی طرف مائل کریں مثلاً معاشرت میں جو خرابیاں ان کو نظر آئیں صرف ان کی برائی اور مذمت کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ خود ان کو ترک کر کے قوم کے لئے ایک مثال قائم کریں۔ معاش کے وہ جائز ذریعے جو قوم کی اکثر جماعتوں میں معیوب گنے جاتے ہیں جیسے دوکانداری یا صنعت و دستکاری' ان کو خود اختیار کر کے ان جماعتوں کی جھجک دور کریں۔ تجارت کے وہ اصول جن کے ذریعے سے کم مقدور آدمی بھی بڑی بڑی تجارتیں کر سکتے ہیں' ان پر خود کاربند ہو کر قوم میں تجارت کا چرچا پھیلائیں۔ اسی طرح ترقی کی ہر شاخ میں خود کچھ کر کے دکھائیں تاکہ اور لوگ بھی ان کی دیکھا دیکھی وہی رستہ اختیار کریں۔ تعلیم جو ترقی کی جڑ ہے اُس کی اشاعت میں دم سے' قدم سے' درم سے' قلم سے غرض ہر طرح کوشش کریں۔

مختصر یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان جن کو ترقی کا مقدمۃ الجیش کہنا چاہئے وہ اپنی اپنی قابلیت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ایسے کام اختیار کریں جو اولاً خود ان کے حق میں اور ثانیاً قوم اور ملک دونوں کے حق میں مفید ہوں۔

لیکن افسوس ہے کہ ایسے آدمی قوم میں نایاب ہیں اور اسی لئے ہم کو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے قوائے متحرکہ بالکل معطل اور بے کار ہو گئے ہیں۔ ہماری جرأت اور دلیری مفقود ہو گئی ہے۔ ہم میں ہمت اور اولو العزمی کا نام و نشان نہیں رہا۔ ہم کہنے کو انسان ہیں لیکن جمادات سے بدتر۔ ہم بظاہر زندہ ہیں، لیکن حقیقت میں مردہ۔

پس ہماری قوم میں جن بزرگوں کو ترقی کا خیال ہے ان کو غور کرنا چاہئے کہ یہ عام خاموشی اور سناٹا جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور یہ مردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے آیا یہ محض ایک اتفاقی بات ہے جس کا کچھ فکر نہیں کرنا چاہئے بلکہ ایک دوسرے اتفاق کا منتظر رہنا چاہئے جس سے تمام قوم کی حالت خود بخود بدل جائے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ یہ وبائے عام نہایت زبردست اور قوی اسباب سے تمام قوم میں پھیلی ہے اور جب تک کہ نہایت زبردست تدبیروں سے اس کا تدارک نہ کیا جائے گا اور آیندہ نسلوں کی تعلیم میں عملی تربیت کی روح نہ پھونکی جائے گی اس وقت تک مسلمانوں میں قومی زندگی پیدا ہونی دشوار ہے۔

"منقول از مقالات حالی"
شائع کردہ انجمن ترقی اردو

تحفۃ الاخوان

(اقتباسات)

نیند غفلت کی ہے سرتا سر مسلط قوم پر — سب کی آنکھیں ہیں کھلی سوتے ہیں لیکن بےخبر
مصر کی ممیاں ہیں سب گویا نہیں جن میں حیات — گو کہ جیتے جاگتے آتے ہیں ظاہر میں نظر
خاندانوں کو رہا ہے پیٹ دورِ روزگار — آج بگڑا یہ گھرانا، اور کل اجڑا وہ گھر
پر نگاہِ بد کی جو زد میں نہیں آئے ابھی — جانتے ہیں دورِ گردوں کا نہیں ہم تک گزر
بھیڑیا نوبت بہ نوبت گوسفندوں کو شکار — کر رہا ہے، اور نہیں کچھ گوسفندوں کو خبر
ہم جو بنتے بھی ہیں تو اکثر بگڑنے کے لئے — گرتے ہیں بانسوں ابھرتے ہیں اگر بالشت بھر
قوم کو اپنے تنزل سے ابھرنے کی امید — اہلِ علم و اہلِ دولت سے بہت کچھ تھی مگر
اہلِ دولت کا ہے اس عالم سے اک عالم جدا — عالمِ بالا سے بھی ہے جو کئی منزل ادھر
جن دعاؤں کی پہنچ ہے عالمِ بالا تلک — ان دعاؤں کا نہیں ڈیوڑھی تلک ان کی گزر
اب رہے عالم، سو آتنا سوق ان کو کہاں — دین کا پھر کون ہے دنیا میں وہ الجھیں اگر
کون جا کر چین میں پھر دین کی دعوت کرے؟ — کون گمراہوں کی لے جاپان میں جا کر خبر؟
حجتِ حق کون لندن میں کرے جا کر تمام؟ — کون برلن میں کرے تبلیغِ قرآن و خبر؟
کون ہے ان کے سوا اسلام کے فرقوں کو جو — مل کے آپس میں نہ ہونے دے کبھی شیر و شکر
ان کی غفلت کا وہ عالم، ان کی فرصت کا یہ حال — ہو یہ بیڑا کیوں نہ پھر منجدھار میں زیر و زبر

ہیں یہی گر قوم کے ساتھ آج بے پروائیاں
تو یہ سن لو غافلو کل ہیں کھڑی رسوائیاں

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ یار سب کھوئے کمر — جو مہم درپیش تھی وہ کر چکے گویا کہ سر

قوم میں تعلیم پھیلانی تھی سو پھیلا چکے
ہو گیا وہ بیج جو بویا تھا نخلِ بارور

پر جو سچ پوچھو تو ہم اب تک اسی منزل میں ہیں
باندھ کر اٹھے تھے جس منزل سے احرامِ سفر

روشنیِ تعلیم کی کچھ کچھ جو یاں پاتے ہو تم
سب یہ جگنو کے سے چمکارے ہیں اے اہلِ نظر

ہے جہالت کا اندھیرا ہم پہ جو چھایا ہوا
اس اندھیرے ہی میں آتے ہیں یہ سب جلوے نظر

سارے ہو جاتے ہیں چمکارے ابھی کافور یہ
اس اندھیرے سے ذرا نکلو اجالے میں اگر

ہم نے یہ مانا کہ تھے ہم جو زمیں پکڑے ہوئے
اس سے آگے کچھ قدم ہم نے بڑھایا ہے مگر

دیکھنا یہ ہے کہ اوروں سے ہے کیا نسبت ہمیں؟
اور بڑھتے ہیں گزوں اٹھتے ہیں ہم گر انچ بھر

جبکہ ٹھیری ہم میں اور اوروں میں یہ نسبت، تو ہم
اتنے ہی یاں گھٹ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں جس قدر

پست ہے ہمسر سے جو اپنے، یہ سمجھا دو اسے
خاک ہے وہ، گو کہ ہے پہونچا ہوا افلاک پر

اپنی پستی کے نشاں پاتے ہیں ہر منزل میں ہم
کیا تجارت کیا صناعت، اور کیا علم و ہنر

کھل رہے ہیں جو کلوں کے کارخانے ملک میں
جن کے مالک ہیں وطن کے اہلِ ہمت سربسر

جو کہ ہیں ملکی ترقی کے لئے اک فالِ نیک
جن میں امیدیں ہیں مثلِ روزِ روشن جلوہ گر

قوم کا حصہ نہ واں پاؤ گے تم اس کے سوا
شام کو قلیوں کی اک فوج آئے گی تم کو نظر

کون سا پستی کا حصہ اب رہا ہے اس کے بعد؟
یہ وہ پستی ہے کہ بس تحت الثریٰ ہے اس کے بعد

ہم نے مانا ہے موافق جن سے دورِ ماہ و سال
بھاگوان ایسے بھی ہیں اس قوم میں پر خال خال

چند جانیں بچ رہی تھیں جو کہ قومِ نوح میں
ساٹھ ملین میں ہے وہ ان بھاگوانوں کی مثال

ان کی کیا عزت ہے یارو؟ قوم ہے جن کی ذلیل
ان کو کیا راحت ہے؟ جن کی قوم ہے سب خستہ حال

ہے وہ ایسا غول میں قلیوں کے جیسے ایک میٹ
ہے ہزاروں مفلسوں میں ایک اگر آسودہ حال

شال گدڑی سے ہے واں سو مرتبہ بدتر جہاں
ہوں ہزاروں گدڑیاں اور ایک کے کاندھے پہ شال

یاد رکھو! ہے فراخ اسلام کا دامن بہت
دی ہے بنیادِ اخوت اس نے کل امت میں ڈال

ہیں اسی امت میں جو ڈھوتے ہیں دن بھر ٹوکری — ہیں اسی امت میں جو ہیں ڈھونکتے دن رات کھال
ہیں انھیں میں جن کے سینے میں نہیں آیا سماں — جب سے آنکھ ان کی کھلی دیکھا ہے گھر میں اپنے کال
ہیں انھیں میں جو کہ بہر نفقۂ فرزند و زن — سامنے ایک ایک کے پھیلاتے ہیں دست سوال
ان عزیزوں کی اخوت سے جنھیں آتا ہو ننگ — نام لیں فہرست سے اسلام کی اپنا نکال
ورنہ ذلت سے نکالیں ان کو اور یہ جان لیں — ان کی ذلت میں انھیں عزت سے رہنا ہے محال
گھر میں اپنے بیٹھ کر جو چاہے سو بن لے کوئی — غیر قوموں میں نہیں حاصل اسے جز انفعال
کہتے ہیں غیر اس کو، ہم جنسوں میں اجلا دیکھ کر — یہ وہی کوا ہے لیکن ہنس کی چلتا ہے چال

وہ یہی خطرہ ہے جس کے ڈر سے مال و جان سب
کر رہے ہیں اپنی اپنی قوم پر قربان سب

"منقول از کلیات نظم حالی"
مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی

روحِ مسحُور

فرانس کے شہرۂ آفاق سحر نگار روماں رولاں کی تازہ ترین تصنیف ایک مسلسل ناول ہے جو جستہ جستہ چھ جلدوں میں *The Soul Enchanted* ("روحِ مسحور") کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس معرکۃ الآرا ناول کی جان ایک عورت اینٹ ریویر کی سیرت کشی ہے جس میں فطرت انسانی کے اس رمز شناس نے اپنے آرٹ کا پورا اعجاز دکھا دیا ہے۔ اینٹ کا بچپن اور عہد شباب گھر کی محفوظ چار دیواری میں بسر نہیں ہوا بلکہ بہت سی شورشوں، طغیانیوں اور طوفانوں میں سے گذرا ہے۔ اگر وہ معمولی مٹی کی بنی ہوئی ہوتی تو اس بحرِ پرآشوب میں اس کی شخصیت تنکے کی طرح بہہ جاتی لیکن اس کو فطرت نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ہر تجربے سے خواہ وہ کتنا ہی تلخ اور ناگوار کیوں نہ ہو اپنی سیرت کی تعمیر کرتی ہے۔ اس کی نظر زیادہ وسیع، اس کا دل زیادہ حساس، اس کا دماغ زیادہ روشن ہوتا جاتا ہے۔ اپنی لغزشوں اور کمزوریوں کی بدولت اس کی نظر فطرت انسانی میں زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور اس کی نگاہ ان پردوں کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے جن میں ہم اپنی روح کی واردات کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کا عمل اس اصول پر ہے کہ

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

اس ارتقائے پیہم کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ زندگی کے نصف النہار سے گذر کر شام کی طرف مائل ہوتی ہے تو ہم اس کے دل اور دماغ کو ان غیر معمولی خوبیوں سے مالا مال پاتے ہیں جو عافیت کی زندگی کا ثمر نہیں ہوتیں بلکہ دنیا کے گرم و سرد اور تلخ و شیریں تجربات کو جھیلنے سے پیدا ہوتی ہیں اس کے دل میں اتنی وسعت ہے کہ سارے جہان کا دکھ درد اس میں سما جائے۔ اس کی روح میں انسانی آزادی کے لئے تڑپ ہے جس کی وجہ سے وہ تمام عمر ایک مجاہدانہ زندگی بسر کرتی ہے اور

ان تمام قوتوں اور تحریکوں کے خلاف جنگ کرتی ہے جو موجودہ یورپ میں انسانی ضمیر کی آزادی کا خون کر رہی ہیں اور حق پرستوں اور انصاف دوستوں کے لئے عرصۂ حیات کو تنگ کر رہی ہیں۔ مگر اس کی سیرت کی سب سے زبردست خصوصیت اس کی بے پناہ اثر آفرینی ہے۔ جو شخص، مرد، عورت، جوان، بوڑھا اس کے اثر میں آجاتا ہے اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ وہ نہ صرف سونے کو کندن بنا دیتی ہے بلکہ کچے لوہے کو بھی فولاد میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس سے ٹکرا کر پتھر سے شرارے نکلنے لگتے ہیں۔ اس کے خالق مجازی نے اس کی محبوب سیرت میں انسانیت اور قیادت کے بہترین جوہر جمع کر دئے ہیں :-

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

شاہراہ زندگی پر اس کو جو دوست اور عزیز ملتے ہیں وہ ان کی فطرت پر اپنی آزاد روح کے آتشیں نشان ثبت کرتی چلی جاتی ہے۔ انھیں میں سے ایک دوست ایک نامور سائنس داں جولین ہے جس کی سیرت کا ارتقا مختصر طور پر ذیل کے ترجمے میں دکھایا گیا ہے۔ تیس سال قبل اس کی نسبت اینٹ سے قرار پائی تھی لیکن اس وقت تک اس کا دل و دماغ سماجی بندشوں اور تعصبات کا غلام تھا۔ اس نے اپنی خوش نصیبی کو نہ پہچانا اور سوسائٹی کے اعتراضات اور ناراضگی کے خوف سے اینٹ کو ہاتھ سے کھو دیا لیکن اینٹ کے اس اثر کو کیا کرتا جو نہایت خاموشی کے ساتھ دن کی پھیلتی ہوئی روشنی کی طرح، بغیر اس کے علم کے، اس کی روح کے اندر سرایت کر گیا تھا۔ چونکہ زمین سنگلاخ تھی اور اس پر بہت کچھ خس و خاشاک اور اینٹوں پتھروں کا انبار تھا اس لئے ان بے باک بیجوں کو پھوٹنے اور اگنے میں عرصہ لگا جو اینٹ نے اس کی طبیعت میں بوئے تھے لیکن وہ رفتہ رفتہ ظاہر ہو کر رہے۔ مندرجہ ذیل صفحات سے کچھ اندازہ ہوگا کہ کس طرح یہ قدامت پرست، روایت پسند، کمزور دل کا سائنس داں اپنے زمانے کی ایک متحرک اور حرکت آفریں قوت بن گیا۔

جن حضرات نے روماں رولاں کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ اس کی تحریر میں ایک خاص انداز گریز ہے جس کی وجہ سے ترجمہ میں بہت دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جذبات خیالات اور واقعات کی طرف نہایت لطیف اور خفیف اشارے کرتا ہوا گذر جاتا ہے اور اکثر خیالات کے منطقی تسلسل کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ لہذا اس ترجمے کی خرابیوں اور نقائص کی ذمہ داری زیادہ تر تو میری ذاتی ناقابلیت پر ہے لیکن ایک حد تک اس کا سبب مصنف کا مخصوص انداز تحریر بھی ہے جس میں ایک شان دل آویزی ضرور ہے لیکن اس میں وضاحت سے زیادہ طائر خیال کی سبک رفتاری اور بظاہر بے راہ روی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ ترجمہ "روح مسحور" کی پانچویں جلد Combat (جنگ) میں سے کیا گیا ہے۔

خواجہ غلام السیدین

جولین نے کبھی آرام نہیں لیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھیں آرام لینا آتا ہی نہیں، کام کیے بغیر اس کا جینا محال تھا۔ روزی کمانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذہنی زندگی کی تشفی کے لیے اس کو کام کرنا لازم تھا۔ اس شدید دماغی محنت نے اس پر دوسرے خیالات کی راہیں بند کر دی تھیں مگر اچھی طرح بند نہ کی تھیں کیونکہ کبھی کبھی دروازہ کھل جاتا اور ہوا کے جھونکے اندر آ جاتے اور جولین اچھی طرح گرم نہ ہو پاتا تھا۔

لیکن اب وہ اپنے پرانے مکان میں آگ کے سامنے بیٹھا سردی سے نہیں کانپتا تھا جیسا اس زمانے میں اس کا حال تھا جب اس کی اینٹ سے راہ و رسم تھی۔ وہ ماضی کے گھر سے باہر نکل آیا تھا اور اس نے طبقۂ متوسط کے تمام تعصبات کو بھاری کپڑوں کی طرح اتار کر پھینک دیا تھا۔ اینٹ نے اس کی کتابوں کو پڑھا تھا اور اس کی حقیقت شناس آنکھوں کے سامنے اپنے اس پرانے دوست کی فطرت بے نقاب ہو گئی تھی۔

پینتیس سال کی عمر میں اس متوسط طبقہ کے فرانسیسی کے لیے، جو فطرتاً ڈرپوک اور بزدل تھا، جس کے بچپن پر اس کی سخت گیر اور مطلق العناں ماں کی حکومت مسلط رہی تھی جس کے خوش عقیدہ، قدامت پرست مذہبی خاندان کے صدیوں پرانے اخلاقی اور روحانی عقیدوں نے پرانے لباس کی طرح اس کے دماغ کو جکڑ دیا تھا،

اپنے نفس کا اس قدر مکمل اور بے رحمانہ محاسبہ کرنا بڑی جرأت کا کام تھا۔ مگر اس نے بغیر اپنے نفس کو دھوکا دیئے ایک ایک کر کے ان تمام چیزوں کو اتار پھینکا تھا جن پر اس کو پہلے عقیدہ تھا لیکن وہ اس امتحان میں باطل ثابت ہوئی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس حرکت کے بعد انسان کو اپنی عریانی کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ خود کو کس طرح ان لوگوں کو دکھائے جنھوں نے اسے انھیں جھوٹوں میں ملبوس دیکھا ہے جن میں وہ اپنی عریانی کو ڈھانپے رہتے ہیں، جو ساری دنیا کی عریانی دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے، جو اپنی روح کی اصلی صداقت کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور اسے شل پوشیدہ اعضا کے انجیر کے پتے سے ڈھانک لیتے ہیں۔

جولین کی حالت اس وجہ سے زیادہ نازک تھی کہ وہ ان کم مایہ تارکین مذہب میں سے نہیں تھا جو ایک عقیدہ کو آسانی سے ترک کر کے دوسرے کو آسانی سے اختیار کر لیتے ہیں اور "آزاد خیالی" اور لامذہبی کے جذبات کی خدمت کرنے لگتے ہیں۔ وہ بازار میں تنہا کھڑا تھا اور سرد ہوا کے جھونکوں میں اس کا جسم عریاں تھا۔ یہ بڑی کٹھن آزمائش تھی لیکن یہ شخص باوجود اپنی طبیعت کی کمزوری کے اپنے راستے سے نہیں ہٹا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے گھر والے ایسے تھے جنھیں اس کی ذہنی کشمکش میں کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ (یہ بڑی محرومی ہے کہ کسی شخص کو کوئی ایسا رفیق نہ ملے جس سے وہ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر تبادلۂ خیال کر سکے۔ لیکن اس میں آسودگی بھی ہے کیونکہ اس شخص کا کیا حال ہوگا جس کو اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں ایسے شخص کے ساتھ نباہنا پڑے جو اس کے خیالات اور عقائد سے دشمنی رکھتا ہو؟) اس کی ماں نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے اس کی شادی ایک تندرست "سلیم العقل" عورت سے کر دی تھی جو صاحب جائداد تھی، خاصی خوبصورت تھی، گھر کا انتظام اچھا کرتی تھی لیکن تپش نا آشنا بھی اور باتی ہر اعتبار سے ناقابل! اور اس کا دماغ ہر قسم کی کاوش اور جستجو سے اس درجہ بے نیاز تھا جو اس کی قسم کی عورتوں کے لئے بھی غیر معمولی بات تھی۔ وہ کبھی کتاب کو کھول کر نہ دیکھتی تھی۔ شادی سے پہلے نوجوانی کے زمانے میں اس نے خانقاہ کے مدرسے میں بہت سی کتابوں کو مجبوراً پڑھا تھا اور ان کو پڑھتے ہوئے بارہا جمائیاں لی تھیں۔ اب وہ ان سے اس درجہ اکتا گئی تھی کہ اس کے خیال میں شادی کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ اطمینان کے ساتھ انھیں مقفل کر سکتی تھی۔ اسے یہ شکایت نہ تھی کہ اس کا شوہر اپنی زندگی کاغذوں اور کتابوں میں بسر کرتا ہے۔ مردوں کے اپنے کاروبار ہوتے ہی ہیں، اسے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اسے نہ اپنے شوہر سے بہت محبت تھی نہ نفرت۔ اسے روز کھانے کی میز پر اور شب خوابی کے وقت اس کی صحبت ناگوار معلوم نہ ہوتی تھی لیکن خدانخواستہ زیادہ باعث مسرت بھی نہ تھی۔ وہ طبعاً کافی حریص تھی اور جولین میں حرص کا مادہ نہ تھا۔ مختصر یہ کہ اسے اپنے شوہر سے معمولی محبت تھی لیکن اتنی نہیں کہ اسے یہ کرید پیدا ہو کہ اس کے دل و دماغ پر کیا واردات گذر رہی ہیں۔ اس کے خانگی فرائض میں یہ چیز شامل نہ تھی کہ وہ اس سبد الساری کی جھاڑ پونچھ بھی کرے۔

اسے شاید اس روحانی زلزلے کی مطلق خبر نہ ہوتی جس نے اس کے شوہر کو پینتالیس سال کی عمر میں اُس قناعت شعار جمود سے جھنجوڑ کر بیدار کر دیا تھا جو "معقولیت پسند" لوگوں کے بنائے ہوئے نظام معاشرت و مذہب کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتا ہے لیکن اس کے نیک نیت دوستوں اور اس پادری نے جو اس کا اعتراف سنا کرتا تھا اس کو واضح طور پر یہ بتایا تھا کہ ایک نیک عیسائی بیوی کا کیا فرض ہونا چاہیے اگر اس کا شوہر اپنی مثال اور عمل سے اپنی جماعت کی روحانی رسوائی کا باعث ہو۔ اب بیوی نے میاں کے سامنے رقت وزاری اور بحث و احتجاج شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کا امن تو برباد ہو گیا لیکن نظام اخلاق کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا کیونکہ ظاہر ہے کہ بیچاری نیک نیت کانٹنس مطلق یہ نہ سمجھتی تھی کہ اس کے شوہر کا جرم کیا ہے۔ لہذا اس کی گفتگو کے ذریعے اس کی اصلاح ہونا ناممکن تھا۔ وہ لوگوں سے ان تمام معاملات میں بہت درشتی سے پیش آتا تھا جن کا تعلق اس کی آزاد خیالی سے ہو۔ اور اس عنوان پر اس کی بیوی کی حماقت اس قدر صراحت کے ساتھ ظاہر ہوتی تھی کہ وہ اس کی پردہ پوشی کرنے سے قاصر تھا۔ اسے خود بھی کبھی کبھی اپنی حماقت کا دھندلا سا احساس ہوتا تھا لیکن اور سب بیوقوفوں کی طرح اس کی حماقت نے اس کی ضد میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ خدا جانے اس معاملے کا کیا حشر ہوتا اگر اس کے پادری نے جو اس سے زیادہ مصلحت شناس تھا اُسے خاموشی کی ہدایت نہ کر دی ہوتی۔ کیوں کہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں ناعاقبت شناس طریقہ پر مذہب کی حمایت کر کے وہ کوئی تضیہ رسوائی پیدا نہ کرے۔ وہ اپنے حجرہ میں بیٹھا اس مصیبت زدہ بیوی کی رقت اور پریشاں بیانی کو سنتا تھا اور اس کی بے ربط شکایات اور اندیشہ ناک نیک نیتی کو روکنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس عورت کو جسے عمر میں پہلی دفعہ حوادث نے بے فکری کی جنت سے نکال دیا تھا، وہاں دوبارہ واپس پہنچانا ضروری تھا۔ اسے اس مقصد کی تحصیل میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی کیونکہ اس نے

آسانی سے یہ بات تسلیم کرلی کہ خدا اس کو اس کے شوہر کی بد اعمالیوں کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گا اور گمراہوں سے بحث و مباحثہ کرنے اور ان کی تردید کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ مبادا وہ اپنی ضد میں اور زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا ہو جائیں۔ اس کا سب سے زیادہ ضروری فرض یہی ہے کہ وہ خدا سے اس بدنصیب شخص کی نجات کے لئے دعا مانگے۔ باقی خدا کے اختیار کی بات ہے۔ (" باقی " کا مطلب یہ تھا کہ آیا خدا اس کو عذاب ابدی میں گرفتار کرے گا یا نہیں۔ کانشنس دل سے یہ چاہتی تھی کہ ایسا نہ ہو لیکن اگر ایسا ہونا ہی ہے .. .. تو بہتر ہے کہ اس کا خیال ہی نہ کیا جائے۔ انسان کی اپنی مصیبتیں کیا کم ہیں!)

جب اپنی بیوی کے مایوسی اور مظلومی کے انداز سے متاثر ہو کر جولین نے، جس کو اپنے فعل کے نتائج پر کسی قدر پشیمانی ضرور تھی، چاہا کہ اپنے خیالات کو بہت سادہ طریقے پر اسے سمجھائے جس طرح کوئی استاد کسی کم عمر اور کم سمجھ بچے کو کوئی بات سمجھاتا ہے تو اس نے اپنے سارے انداز سے خوف کا اظہار کیا گویا وہ کہتی ہو:۔

" نہیں نہیں کون اس بیکار جھگڑے میں پڑے۔ اور فرض کرو یہ بات اس کی سمجھ میں آجائے تو کیسا زبردست حادثہ ہو؟ جیسے کوئی شخص جو برف کے پہاڑ پر چڑھ رہا ہو کسی ایسے بیوقوف کے ساتھ رسی میں بندھ جائے جو نیچے پھسل رہا ہو۔ نہیں، آپ کی عنایت! میں اس کے ساتھ رسی میں بندھنے کو تیار نہیں۔ افسوس بچارے جولین کے حال پر!"

اس نے کہا کہ مجھے کیوں سمجھاتے ہو۔ میں بیوقوف کیا سمجھوں گی (وہ اپنے بیوقوف ہونے پر دل میں خوش تھی اور فخر کرتی تھی...... " مبارک ہیں وہ جن کی عقل مفلس اور ہمت پست ہے ") بےچارہ جولین! اور اس خیال سے کہ وہ غریب اکیلا تاریکی کے غار کی طرف پھسلا جا رہا ہے وہ اس بات کی انتہائی کوشش کرتی تھی کہ اس کے ساتھ عمدہ سلوک کرے، اس کی زندگی کو پرسکون اور خوشگوار بنائے، اسے اچھے اچھے کھانے کھلائے!

....

" اس دنیا کی زندگی میں تو غریب کو کچھ راحت مل جائے!"

جولین خوب سمجھتا تھا کہ اس کی رفیق زندگی کیوں اس کے ساتھ اس درجہ مہربانی کا سلوک کر رہی ہے لیکن اس کی بدولت اسے کم از کم اپنے گوشۂ تنہائی میں امن نصیب تھا۔ اس کے آتشدان کی آگ میں زیادہ

گرمی نہ تھی لیکن اپنے خیالات کے لبادے میں لپٹ کر وہ اپنا کام بغیر کسی دخل اندازی کے انجام دے سکتا تھا۔ اسے زندگی سے زیادہ توقعات رکھنے کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی کو تباہ کر دیا تھا بے شک تباہ کر دیا تھا۔ یہ بات اس کی ذہن کی گہرائیوں میں ایک مبہم عقیدہ کی طرح مسلط تھی۔ وہ اس بات کی احتیاط کرتا تھا کہ اس جذبے کی تہ کو نہ ٹٹولے۔ اب کیا فائدہ؟ اسے ایک موقع نصیب ہوا تھا مگر اس نے یہی نہیں کہ اسے ہاتھ سے کھو دیا ہو بلکہ اس کو صریحاً مسترد کر دیا تھا۔ اس نے خود کو اس عورت سے چھڑا لیا تھا جس میں اس کی سچی رفیق حیات بننے کی صلاحیت تھی۔ سولہ برس تک اس کی داخلی زندگی، جس پر اس غیر موجود دوست کی حکمرانی تھی، لوگوں کی نظر سے پوشیدہ اس کی خارجی زندگی، اس کی ازدواجی اور خانگی زندگی سے باہر (یا اس کے اندر) بسر ہوئی تھی۔ یہ محض اینٹ کے چہرے کی یاد یا اس کا جسمانی تصور نہ تھا (وہ بھی ضرور تھا لیکن یہ ذی فہم شخص دل کے معاملات میں کم نظر واقع ہوا تھا اور دوست کی جسمانی تصویر مدھم پڑ گئی تھی) جو اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا بلکہ وہ آتشیں نشان جو اس نے اس کے دماغ کی تہ میں چھوڑا تھا۔ جولین کی اندرونی زندگی میں اس کی وجہ سے انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مدت گذر چکی تھی یعنی ۱۹۰۵ء سے آج تک اس کی اینٹ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن اینٹ کا اثر اس کی روح میں کارفرما تھا۔ حسرت و افسوس نے اندر ہی اندر اس کی روح کو اس سانچے میں ڈھال دیا تھا جو وہ اس کے لئے پسند کرتی تھی یا جولین کا اپنا خیال تھا کہ وہ اس کے لئے پسند کرتی۔

لہٰذا اپنی زندگی کی اس عظیم الشان جدوجہد اور اپنی آزاد خیالی کے لئے وہ اینٹ کا مرہون منت تھا۔ اس پوشیدہ تخمیر نے پانی کو شراب بنا دیا اور اس دماغ کے اندر جو گھر کی چار دیواری میں محدود تھا سارے عالم کائنات کے بے باک بیج بو دئے۔ ان کو زمین سے پھوٹ نکلنے میں کافی عرصہ لگا لیکن وہ خود اپنے دوستوں، عزیزوں اور ساتھیوں سے بہت پیشتر محسوس کرنے لگا تھا کہ آزادی کے بیج اس کی روح میں مکین ہیں۔ اسے ان کی نقاب کشائی کرنے کی جلدی نہ تھی۔ اس ابتدائی زمانے میں اس نے جس قدر کتابیں لکھیں سب سائنس کے مضامین پر تھیں۔ ان سے اس کے اجتہاد فکر کا ضرور پتہ لگتا تھا لیکن وہ تمام تر اصلاحی مسائل تک محدود تھیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ مصلحت شناسی اور احتیاط؟ یا اپنے دوستوں اور عزیزوں

کالحاجن کو یقیناً اس کے بے باکانہ اظہار خیال سے تکلیف ہوگی؟ یا اعلان جنگ کے لئے آمادہ نہ ہوتا؟ یا اس کی فطری جھجک جو اس کو اپنی خودی کے پوشیدہ ترین رازوں کے متعلق اجازت گفتار نہ دیتی تھی؟ یا ممکن ہے کہ ان سب سے بڑھ کر اس کا باعث وہ رازداری کا جذبہ ہو جس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے دل کے تمام گہرے اور بیش بہا معاملات کو جو اس کے اور اس کی روحانی زندگی کی خیالی شاہد یعنی اس کی غیر موجود اینٹ کے درمیان مشترک تھے احتیاط کے ساتھ پردہ خفا میں رکھے؟

مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس نے اس درمیان میں اصلی اینٹ سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ اس کا پتہ لگاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اور یہ کوئی بڑی مردانگی کی بات نہ تھی یا اپنی پریشانی کے اندیشہ سے اس نے یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ اینٹ کو کسی مصیبت یا محتاجی کی وجہ سے امداد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسی بات تھی جیسے بعض "بہت کمزور دل کے لوگ" کسی جانور کو زخمی یا کچلا ہوا دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں کیونکہ وہ نظارہ ان کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے یا ممکن ہے تکلیف دہ ثابت ہو اور اسی سبب سے وہ اس کے زخم کی مرہم پٹی کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ ہم ایسے بے ہمت لوگوں کو خوب سمجھتے ہیں! وہ خود کو اس بات پر بہت ملامت بھی کرتا تھا کہ اس کا شمار ایسے لوگوں میں ہے۔ حالانکہ اُسے اپنی اس کمزوری کا علم ہے۔ لے اپنی ان پرانی کمزوریوں کو دور کرنے میں کافی مدت لگی بلکہ درحقیقت وہ کبھی بھی ان پر پوری طرح قابو نہ پاسکا۔ گلدان کی تہ میں ذرا سا زنگ باقی رہ گیا تھا اور اس کے ناخن برابر اس کو کھرچتے رہتے تھے۔

زنگ ہر کسی میں ہوتا ہے، اینٹ میں بھی تھا۔ لیکن روح کی نجات دراصل اس میں ہے کہ پانی بہتا رہے اور زندگی کی نالیاں بند نہ ہونے پائیں۔ تازہ پانی ہو، نیا پانی ہو...... بدترین روحانی فساد وہ ہے جو تالاب کے بند پانی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ بہتی ہوئی ندی تو اپنے برتن کو دھو کر صاف کر دیتی ہے۔ اینٹ کی ندی ہمیشہ بہتی رہی تھی۔ اس نے جولین کو جھنجوڑ کر اس کے مجہولانہ جمود سے نکالا تھا اور اس روحانی جہنم سے نجات دلائی تھی جس میں وہ قناعت کے ساتھ پناہ گزیں ہو گیا تھا اور جس میں ہزاروں انسانی کیڑے مکوڑے نباتات کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس نے خود دکھ اٹھا کر، اپنے جذبات کی شدت اور جوش سے اور اپنے تاریکی میں چمکتے ہوئے شعلے کے اثر سے اس میں حرکت پیدا کر دی تھی اور زندگی کے راز

اس پر کھول دیے تھے۔

علاوہ اس کے (یہ بات قابل افسوس ضرور ہے لیکن سچ ہے) اس کا روحانی ارتقا بہت کچھ اس صدمہ کی بدولت ہوا تھا جو اس کی ذات سے اینٹ کو پہنچا تھا جب ہم اپنے محبوب کو بے جا دکھ پہنچاتے ہیں اور ہم میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اس کو شدت کے ساتھ محسوس کریں تو یہ علم ہماری روح کے لئے ایک پیغام بیداری بن جاتا ہے۔ اس تجربے کے طفیل اور اپنی ندامت کی وجہ سے فطرت انسانی کو سمجھنے میں جولین کی نظر زیادہ گہری ہوگئی تھی، انصاف کا احساس قوی تر ہوگیا تھا۔ اس کی فطرت کا ہر وقت یہ تقاضا تھا کہ اس نے ایک کو جو تکلیف پہنچائی تھی اس کی تلافی دوسروں کی خدمت کے ذریعہ کرے۔ اینٹ نے اس کی طرف سے قرضہ ادا کیا تھا۔ (اب اسے اینٹ کا قرضہ ادا کرنا تھا۔)

جولین کا تعلق فرانس کے قدیم متوسط طبقے سے تھا جس میں بہت سی پرانی خرابیاں جڑ پکڑ گئی ہیں جو جمع کی ہوئی دولت کو بہت سختی کے ساتھ اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ ادائے قرض کو اپنا فریضۂ مذہبی سمجھتے ہیں اور انھیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ مرنے سے پہلے اسے ادا کر جائیں۔ جب وہ اپنے کھیتوں میں چلتے پھرتے ہیں تو پرندوں کے گیت ان کو موسم بہار اور کیف محبت کی یاد نہیں دلاتے۔ انھیں تو بٹیر کی آواز بھی یہی کہتی سنائی دیتی ہے:

"اپنے قرضے ادا کردو، اپنے قرضے ادا کردو۔"

جولین نے اپنا قرضہ ادا کردیا۔

کون اس کا یقین کرسکتا تھا؛ شاید اسے خود بھی اس کا علم نہ ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھیں قرضوں کو ادا کرنے کی وجہ سے اس نے خود کو جنگ عظیم کے زمانے میں، اپنی مرضی کے خلاف اس معاشرتی کشمکش میں گھرا ہوا پایا جس کے خیال سے بھی اس کا جسم اور روح دونوں گریز کرتے تھے۔ اس تہلکہ سے پیشتر جب اس کی غیر مفتوح روح اپنی خودی میں محصور اپنی قوتوں کو مجتمع کئے آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کررہی تھی، تو اینٹ، نظر سے پوشیدہ، ہر وقت اس کے ساتھ تھی۔ اس کو لب ہلانے کی ضرورت نہ تھی۔ اسے یہ دکھائی دیتا تھا کہ وہ اس کے سامنے چلی جارہی ہے اور وہ کبھی خود سے یہ سوال نہ کرتا تھا کہ

یہ راستہ اسے کہاں لے جائے گا۔ راستہ صرف ایک ہی تھا، وہ راستہ جس پر اس کے قریب ہی اینٹ کے سبک رفتار قدم اٹھ رہے تھے۔

اس کی تصانیف کا رجحان رفتہ رفتہ سائنس کی تاریخ اور فلسفہ کی طرف ہوتا جاتا تھا اور عمل اور ردعمل کے تسلسل سے اس کا دماغ ایک طرف تو خود کو دین مسیحی کی ان پیچ دار بیلوں سے رہا کرا رہا تھا جو اس کی نقل وحرکت کو روکتی تھیں اور دوسری طرف اسے خیالات کے ایک ایسے جنگل میں لے جاتا تھا جو نہ صرف مذہب کی حدود سے آگے نکل گیا تھا بلکہ اس کے زمانے کی سائنس اور عقلیت کی حدود سے بھی پرے تھا۔ یہ سفر ایسا ہی معرکہ خیز تھا جیسے واسکوڈے گاما کا سفر اور اس کے لئے بھی طوفان کی راس کا طواف کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ لنگر اٹھانے کے بعد قیام کے لئے کوئی بندرگاہ نہ تھی محض ابر و باد اور موجوں کے رحم پر بھروسہ تھا۔ خشکی کو خیرباد کہنے کے بعد انسان کا وطن یا تو سمندر کی سطح ہے یا اس کی تہ!

کیتھولک مذہب کا لاطینی پیرو ایک دفعہ اپنے عقیدوں کو ترک کرنے کے بعد شک کے سمندر میں کبھی لنگر نہیں ڈالتا۔ وہ ان جرمنوں اور انگریزوں کی طرح ایک جگہ پر قائم نہیں ہوتا جو محض احتجاج کرتے ہیں، یا جنھوں نے مدت ہوئی پراٹسٹنٹ بن کر احتجاج کیا تھا۔ وہ تو سیدھا تہ کو پہنچنا چاہتا ہے اور تہ ہوتی ہی نہیں! وہ پانی کے نیچے اپنے لئے کوئی لکڑی کا پُل نہیں بناتا جو تاریک گہرائیوں کے اوپر معلق ہو مثل "مصلحوں" کے جو ہمیشہ آدھے کو مسترد کرتے ہیں اور آدھے کو قبول کر لیتے ہیں! وہ تنہا ہوتا ہے اور عریاں اور تیرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو پانی پر سہارنے کے لئے صرف اس کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ڈوبنے کا وقت آنے والا ہے لیکن وہ بچاؤ کے لئے کسی کا سہارا نہیں تکتا۔ ......

جولین نے خود کو عقل کی سخت گیر اور حقیقت شناس راہبری کے سپرد کر دیا تھا جو ناحق سے کوئی مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ مثل ان لوگوں کے جو مروجہ عقائد اور سوسائٹی کی عائد کی ہوئی تمام بندشوں اور قیود کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دینے کے بعد ان سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ اسے دونوں سے ایسی شدید مخالفت پیدا ہو گئی تھی جو انصاف کی حدود سے بھی متجاوز تھی۔ وہ اس بات کو خود بھی سمجھتا تھا لیکن اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ اس انتقام سے دست بردار ہو جائے۔ وہ خود کو ملامت کے طور پر "مرتد جولین" کہتا تھا۔

اور اس آرزوئے انتقام میں جو جلد اس کی تحریروں میں ظاہر ہونے لگی وہ دراصل خود کو سزا دے رہا تھا یعنی اس شخص کو جو وہ پہلے تھا۔

یہ بات پہلی مرتبہ اس کے فلسفیانہ مضامین میں رونما ہوئی۔ مذہبی گروہ نے یہ محسوس کیا کہ ان میں مذہب پر حملہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس کے خلاف بہت شور و غوغا کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ چوٹ کاری لگی ہے۔ اس نے اور زیادہ چوٹیں کیں مگر چند تلخ اور شدید مقابلوں کے بعد ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مصلحت پسپائی اور خاموشی میں ہے (اس معاملے میں تمام "صحیح الخیال" اخباروں نے حیرت انگیز اتحاد عمل ظاہر کیا اور جولین کی تصانیف کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا) مگر جولین اور اس کے قدیم ساتھیوں میں صاف صاف تفرقہ پڑ گیا تھا۔ پرانے ملاقاتیوں سے سلام علیک اب بھی ہوتی تھی لیکن وہ کھلم کھلا ظاہر داری تھی۔ اس سے کسی کو دھوکا نہیں ہو سکتا تھا۔ پیشین گوئی کرنے والے کہا کرتے ہیں کہ "فوجوں کی تیاری جنگ نہیں ہے۔" لیکن وہ اس وقت ایک دوسرے کو دیکھ کر اطمینان کے ساتھ مسکراتے نہیں۔ جنگ ہونے والی ہے، جنگ آپہنچی، گھنٹہ بجنے کی دیر ہے.....

جولین کے مخالفوں نے غالباً خود جولین سے زیادہ واضح طور پر صورت حال کو سمجھ لیا تھا کیونکہ خود اسے ابھی پوری طرح اس انقلابی روح کا احساس نہیں ہوا تھا جو اس میں پوشیدہ تھی۔ جب موٹر کاریں ہر وقت سڑک کے کنارے کی عمارتوں کے بیچ میں سے شور مچاتی ہوئی گذرتی رہتی ہیں تو بغاوت کی "خود کلامی" پر خواب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسے مسوڑوں کی تکلیف وہ پھڑک۔ وہاں چیزیں کیا ہے جس پہ انسان اپنے دانت جمائے! لیکن یہ سکون فریب دہ ہے۔ جولین کو معلوم تھا کہ اس کی بے پناہ تنقید اس کے مردہ عقائد کی سطح کو توڑ کر سوسائٹی کے سڑے ہوئے خول تک پہنچ گئی ہے۔ اب اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے نشتر سے اس پیپ سے بھرے ہوئے زخم کو اندر تک ٹٹولے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس بات کو ثابت کرنے میں تاخیر کی کہ تمام نظام معاشرت اور اس کے بنیادی اخلاقی اصول بگڑ چکے ہیں اور تباہ ہونے والے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اسے اپنے لئے کوئی دوسرا امکان تلاش کرنا پڑتا اور چالیس سال تک ایک گھر کے اندر زندگی گذارنے کی وجہ سے اس کو نقل مکان کے خیال سے وحشت ہوتی تھی لیکن وہ

یہ بھی جانتا تھا کہ اسے پرانے مکان کو چھوڑنے کا نوٹس مل چکا ہے لیکن وہ تن بہ تقدیر اس مہلت کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا جب اسے مجبوراً وہاں سے جانا پڑے گا....... علاوہ بریں ماضی کی اس کارواں سرائے میں ایک بہت بڑا بازار ایسا بھی تھا جس کی کنجی واپس کرنے کو اس کا دل نہ مانتا تھا مگر وہ اس کو کھول کر دیکھنے کے لئے اندر بھی نہ جاتا تھا۔ وہاں صدیوں سے خاک جمی ہوئی تھی اور اس نے اس خاک آلود مکان کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔ اس میں دن کی روشنی لانا اور جھاڑو دینا کساں کی مصلحت ہے! وہ بڑا بازار وطن کا بازار تھا۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے فرانسیسیوں کا صرف یہی ایک دیوتا تھا جس کے آگے سب سر جھکاتے تھے اور تمام دیوتاؤں پر زندگی کے عام قانون کی حکمرانی تھی یعنی مجموعی اور انفرادی موت کی، بڑھاپے کی بیماری کی، کیڑے مکوڑوں کی جو منبر کو کھا جاتے ہیں۔ سوائے وطن کے اور کوئی دیوتا ایسا نہ رہا تھا جس پر حملہ نہ کیا گیا ہو۔ مگر اس بارے میں مذہبی لوگ اور 'آزاد خیال' سب ہی متفق تھے بالخصوص آزاد خیال لوگ کیونکہ اس کے علاوہ ان بچاروں کو کہیں قدم جمانے کی جگہ تک نہ تھی کیسی دردناک اور قابل رحم تھی یونیورسٹی کے استاد اعظم بوڑھے لیویس کی یہ فریاد: "اگر تم میرا وطن مجھ سے چھین لو تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟ پھر میں کاہے کے واسطے زندہ رہوں گا؟"

افسوس ان بوڑھے آدمیوں پر جو آخری دن تک اپنی پہاڑیوں کی پُرسکون مگر تنگ فضا میں بند رہے! ان کے لئے ضروری تھا کہ یہ زمین، جس میں ان کے تمام مردے پندرہ سو برس سے گڑے ہوئے تھے، ان کے قدموں کے نیچے ہو۔ ذرا ان کے "وطن" کو ہلاؤ اور انھیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ روئے زمین پر تہلکہ پڑ گیا۔ جن لوگوں کو کبھی زلزلے کا تجربہ ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے وقت میں تمام جانداروں پر کیسا عجیب اور ناقابل بیان کرب طاری ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ہی اٹل نقطہ ہے جس پر انسان نے سب کچھ بنایا ہے۔ جب وہی ہٹ جائے یا ہل جائے تو باقی کیا رہا؟ چونکہ جولین کی حس غیر معمولی طور پر تیز تھی اس لئے اس نے زمین کی خوفناک گڑگڑاہٹ کو قبل از وقت محسوس کیا اور اس کی روح کو جس کا پرانا آسرا معرض خطر میں تھا ایک خاص قسم کا مبہم سا درد محسوس ہوا جسے وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے ادھر سے اپنی نظریں اور زیادہ ہٹا لیں۔ وہ خاموش کھڑا اندر ہی اندر کڑھتا تھا اور اپنے آخری بت کو جو باقی رہ گیا

تھا ہاتھ لگاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ لیکن جن لوگوں سے اس نے قطع تعلق کر لیا تھا ان میں سے بعض ایسے تھے جو
پادریوں کی طرح ضمیر انسانی کو سمجھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ انھیں میں اس کا مرشد روحانی بھی تھا جو ایک ہوشیار
اور سمجھ شخص تھا، جس کے ہونٹ والٹیر کی طرح پتلے تھے (لیکن اس کی آنکھوں میں برخلاف والٹیر کے طنز کے
لئے گنجائش نہ تھی۔ وہ روح کے گھر میں کسی حیلہ سے یا ڈاکہ زنی کر کے گھس آتی تھیں۔) انھوں نے اس کی
بغاوت کی اٹھان ہی سے سمجھ لیا تھا کہ اس خودسر باغی میں اتنی مصلحت شناسی نہیں ہے کہ مناسب اور غیر مناسب
میں تمیز کر سکے اور وہ ضرور اس سب سے بڑے بت پر بھی ہاتھ ڈالے گا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اپنی لانبی آستینوں
میں ڈالے صبر کے ساتھ اس حادثہ کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ عطائی اتنے سمجھدار نہ تھے جنھوں نے جولین کو بھی اپنا
سا ایک قابل اعتبار آزاد خیال سمجھا جس نے ان کے خیال میں "عبادت خانے" کے ساتھ محض "جلسہ گاہ" کی
خاطر دغا کی تھی اور خود کو روایتی، قوم پرست، دنیا دار، واجب التعمیل اور متوسط طبقے کی ذہنیت کے ساتھ وابستہ
کر لیا تھا۔ انھوں نے اس کے لئے مدرستہ العلوم فرانس کے دروازے کھول دئے اور اس کو "علوم اخلاقی
اور سیاسی کی اکیڈمی" کا ممبر بنا لیا اور وہ اس کے لئے صرف اسی ایک چیز کے منتظر تھے جو سب سے بڑھ کر
ہے اور انسان کو "غیرفانی" بنا دیتی ہے (یعنی فرانسیسی اکیڈمی کی ممبری)، اس اعزاز کے لئے بعض ذی اثر
ممبران اکیڈمی کی نظر انتخاب اس پر پڑ چکی تھی اور اس کے پرانے استاد نے بھی، جس کا دردناک اور طفلانہ مقولہ
ہم نے اوپر نقل کیا ہے، اُسے یقین دلایا تھا کہ دو تین سال کے اندر اندر اس کا انتخاب یقینی ہے۔ وہ اس بات
کے لئے ذاتی طور پر کوشاں تھا۔ نہ معلوم کیوں اس بوڑھے آدمی کو جولین سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ اس نے
اپنی جماعت میں اس کا بچپن کا زمانہ دیکھا تھا، پھر اُسے یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت میں بھی دیکھا تھا۔ بغیر
اس کے خیالات کی گہرائیوں کو ٹٹولے ہوئے اُسے جولین کے چہرے سے انس پیدا ہو گیا تھا۔ جب وہ لکچر
دیتا ہوتا تو اس کی آنکھوں کو یہ چہرہ جس میں نوجوانی کی سنجیدگی اور وفاداری جھلکتی تھی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ استاد
اور شاگرد کی آنکھوں آنکھوں میں جو ایک دوسرے پر مسکراتی رہتی تھیں اس طویل رفاقت کے دوران میں ایسی
محبت کے مراسم پیدا ہو گئے تھے جیسی باپ بیٹے میں ہوتی ہے۔ بوڑھے استاد کو یقین تھا کہ جولین کی ذات
میں اسے اپنا روحانی وارث مل گیا ہے اور جولین نے جو اس کا احترام کرتا تھا اور اس کا شکرگذار تھا کبھی

خود سے یہ سوال نہیں پوچھا تھا کہ وہ اپنے استاد کی توقعات پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

جب جنگ شروع ہوئی تو ملک کے اہل علم یعنی یونیورسٹی کے سربرآوردہ اراکین نے خود کو برضا و رغبت اپنے ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ دفتری ذہانت کے ہراول یعنی یونیورسٹی کے افسر اعلیٰ نے اپنے مخصوص شاگرد کے لئے اس نئے نظام مدافعت میں جس کو وہ ترتیب دے رہا تھا ایک نمایاں جگہ تجویز کی۔ یعنی اہل علم کی ذہنی قوت جس کو پہلی مرتبہ فوجی لباس پہنایا جا رہا تھا اور جس کو عقلی گولہ بارود کے کارخانوں میں استعمال کرنا مقصود تھا۔ تاریخ، سائنس، قوت تقریر سب چیزیں اس کام میں مفید تھیں۔ اگر وہ جولین کو اسی معاملہ میں پس پشت ہی پڑا رہنے دیتا تو زیادہ قرین مصلحت تھا۔ وہ از خود محاذ جنگ پر نہ آتا اور غالباً اپنے بزرگوں، ہم چشموں اور معاصرین سے ان تمام نتائج پر بحث و مباحثہ نہ کرتا جو پڑھنے اور دستخط کرنے کے لئے وہ اس کے سامنے پیش کرتے۔ لیکن یہ کس قدر دوراندیشی کے خلاف تھا کہ اس سے یہ کہا جائے کہ تم ان سب دلائل اور نتائج کو گھڑنے میں شرکت کرو! یہ سچ ہے کہ وہ اپنے طور پر ایمانداری کا ثبوت دے رہے تھے۔ ان لوگوں کے جذبات قومیت اس قدر شدید اور مستحکم تھے اور انھیں اس قدر کامل یقین تھا کہ یہ جذبات حق کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں کہ اگر کبھی حق کا تقاضا یہ ہوتا کہ ان کے جذبات کی تردید کرے تو وہ بلا تامل حق کا گلا گھونٹ دیتے یا اس سے وہی کہلوا لیتے جو وہ چاہتے تھے۔ ضرورت صرف اتنی ہی تھی کہ شکنجہ پر کس کر اس کے اعضا کو ذرا کھینچ دیا جائے (اس بات کا کچھ تو اثر ہونا چاہئے کہ سوربون یونیورسٹی کے قائم کرنے والوں میں ایسے ماہرین علوم و فنون بھی تھے جو ان لوگوں پر سوالوں کی بوچھار کرتے تھے جن سے انھیں سچی بات قبول کرانی ہوتی تھی!)۔ جولین اس فن کا ماہر نہ تھا۔ وہ سچ کی آواز سنتا تھا اور یہ نہ جانتا تھا کہ اس پر "جرح" کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اس نے جرمنی کے جنگی مراسلات کا مطالعہ کر کے نہایت سادگی سے وہی رپورٹ لکھی جو ان سے مستنبط ہوتی تھی۔ بحث شروع ہوئی اور جب معلوم ہوا کہ اس کی رپورٹ اس کے ساتھیوں کے نتائج سے مختلف ہے تو ان کا باہمی اختلاف ظاہر ہو گیا۔ یہ اختلاف بہت صاف اور اچانک اور شدید تھا۔ جب بے احتیاطی سے کسی دماغی کام کرنے والے کی کوئی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی جائے تو اسے غصہ میں سرخ نہیں بلکہ سفید نظر آتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب حرارت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو آگ سرخ سے سفید ہو جاتی ہے۔ جب

بولین نے جنگ کے متعلق اپنے ایک دوست کے بیان کو سنا تو وہ ہونٹوں تک سفید پڑ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ زور سے میز پر مارا اور چلا کر کہا "مگر یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔"

اس پر کیسا زبردست ہنگامہ برپا ہوا! اس نے جس شخص کی ہتک کی تھی وہ اس کا ایک عزیز اور محترم دوست تھا۔ حیثیت پروفیسر کے اس کی بڑی شہرت تھی۔ لوگ اس کی علمی قابلیت اور دیانتداری کی بہت قدر کرتے تھے۔ جولین نے فوراً ہی معافی مانگی اور گھبراہٹ میں الجھے ہوئے طریقے پر اپنی رائے کو سمجھانے کی کوشش کی تاکہ وہ اس کے ساتھیوں کو زیادہ قابل اعتنا معلوم ہو۔ لیکن جس چہرے پر اس کا طمانچہ پڑا تھا اس پر اس کا نشان ثبت ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں نہ مٹنے والی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی علمی کام کرنے والا کبھی اپنے ایسے ساتھی کو معاف نہیں کرتا جو اس کی ذات میں ان چیزوں کو دیکھ لے جنھیں وہ خود اپنے سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہو کیونکہ اب خواہ وہ کچھ کرے اُسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جو چیز دیکھنے سے وہ بچنا چاہتا ہے، وہ اس میں موجود ہے۔ جولین پر اپنے اس حریف سے بھی زیادہ ہیبت طاری تھی جس پر اس نے یہ ضرب کاری لگائی تھی۔ وہ تمام راستے دل میں یہ کہتا رہا "اور غضب یہ ہے کہ وہ دیانتدار ہے!" جولین جانتا تھا کہ وہ دیانتدار ہے۔ وہ اس بات کی تصدیق کے لیے سولی پر چڑھنے کو تیار تھا۔ بے غرضی کی زندگی، حق کی پرستش...... اس نے زہرخند کیا اور کہا "واہ رے ایماندار لوگوں کی صداقت!"

اس تجربے نے اس کی دنیا کو بالکل ہی درہم و برہم کر دیا۔ اب اس کو اپنی سخت مذہبی تعلیم کے اثرات کا احساس ہوا۔ جو لوگ بہت زیادہ محتاط ہوتے ہیں وہی اکثر مذہب سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے ذوق میں ایسا کر رہے ہیں لیکن دراصل اس میں پاکیزگی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور تلاش حق کا وہ ذوق جو باطل کے ساتھ معاملہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کو خیال تھا کہ یہ چیز اُسے تہذیب سے باہر ذہنی آزادی کے مدعیوں میں مل جائے گی لیکن یہ وہاں بھی مفقود تھی۔ جولین نے اس لحاظ اور مروت کو دونوں ہاتھوں سے دھکیل دیا جس نے ابتک اس کے گرد و پیش کے ایماندار آدمیوں کی پردہ پوشی کی تھی اور معاملات پر بے لاگ طریقے سے تنقید شروع کر دی۔ اس زمانہ میں اس نے نہ معلوم اپنے کتنے ساتھیوں کو سپرد خاک کیا مگر اس میں اتنی جراٗت نہ تھی کہ ان پر تعزیتی تقریریں بھی کرتا۔ اس نے اب تک ان کو اسی

قدر عزت کی نظر سے دیکھا تھا کہ ان کی ذلت اس کی اپنی ذلت تھی۔

اس لئے اپنے استاد سے بگاڑ کرنا سب سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ کیونکہ یہ مفارقت بہت خاموشی کے ساتھ ہوئی جس طرح کوئی باپ بستہ مرگ پر اپنی جان دے اور مرتے وقت درد انگیز اور ملامت آمیز نظر سے چپ چاپ اپنے بیٹے کو دیکھے۔ اس نے بغیر کسی اظہار ناراضگی کے جولین کی تحریر کو پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ جب جولین اپنی مرضی کے خلاف ایک راستے پر ڈال دیا گیا تو وہ تلاش حق سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنی تحریر کو لے کر اپنے استاد کے پاس آیا۔ اس نے کہا "نہیں، میں اسے نہیں دیکھوں گا۔ بالکل بے کار بات ہے......" اس نے اپنے چوڑے ہاتھ کو جو بڑھاپے کی وجہ سے سوجا ہوا تھا جولین کے ہاتھ پر رکھا اور کہا:۔

"میرے دوست تم مجھے بہت رنج پہنچا رہے ہو۔ غور تو کرو۔ تم اپنے تمام مستقبل کو تباہ کر رہے ہو۔ ہماری توقعات کو باطل کر رہے ہو، ہمارے فرض مشترک کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہے ہو۔"

ان الفاظ نے جولین میں سختی پیدا کر دی۔

"ہم سب کا، تمام سائنس کے خادموں کا مشترکہ فرض صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ حق کی خدمت کریں خواہ اس کی قیمت کچھ بھی دینا پڑے۔ تم نے خود مجھے یہ سبق پڑھایا ہے۔"

بوڑھے آدمی نے اپنا بھاری سر ہلایا اور اس کی خون آشام آنکھوں میں شعلہ کی سی چمک پیدا ہوئی:

"حق کبھی ہمارے وطن سے جدا نہیں ہو سکتا۔ دونوں کا اقتضا ایک ہی ہے۔"

"یہ تسلیم ہے لیکن وطن کا فرض ہے کہ جادۂ حق سے منحرف نہ ہو۔" جواب ملا "وطن سب پر مقدم ہے۔ ہم سب اس کے خادم ہیں۔" سب ہیں لیکن ——" مگر استاد نے قطع کلام کر کے کہا "ہر چیز جو ہمارے پاس ہے بغیر استثنا کے۔" دونوں خاموش ہو گئے۔ بوڑھے آدمی کی آنکھوں کا شعلہ بجھ گیا تھا۔ اس نے جولین کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ منتظر تھا کہ جولین بولے اور وہ الفاظ کہے جن کی اس کو توقع تھی۔ جب یہ خاموشی طول پکڑ گئی تو اس نے اپنا سر اٹھایا جو ایک بیمار شیر کا سا تھا اور اپنے بھاری پپوٹوں کو کھولا جو تابوت کے ڈھکنے کی یاد دلاتے تھے اور اس کی بھاری نم آلود نگاہ نے محبت، خوف اور التجا

کے ساتھ جولین کی نگاہ کو تلاش کیا۔ جولین کے دل میں اس نگاہ نے تلاطم برپا کر دیا لیکن اس کے منہ سے اس
کے سوا کیا نکل سکتا تھا "میں حق کو کیسے ہاتھ سے دے سکتا ہوں جو میری ملکیت نہیں ، جس کی ملکیت
میں خود ہوں۔"
مگر اس نے اپنے منہ سے یہ نہیں کہا۔ بے فائدہ ایک اور زخم لگانے سے کیا حاصل! لیکن اس
کے استاد کے وہ زخم ضرور لگا کیونکہ اس نے جولین کی آنکھوں میں ان الفاظ کو پڑھا جو اس کے ہونٹوں سے
نہیں نکلے۔ بھاری پپوٹے بند ہو گئے اور اس کا سر اس کے سینہ پر جھک گیا۔ جب ذرا دیر کے لئے اس کا
سانس سمایا تو یہ زخم خوردہ بزرگ بدقت تمام اپنی کرسی سے اٹھا اور اس نے اپنے ہاتھوں کے بل میز کا سہارا
لیا۔ جولین اس کی مدد کرنے کے لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا لیکن جس طرح کوئی رعشے کا مریض بے ڈھنگے
پن سے اشارہ کرتا ہے اس نے بغیر جولین کی طرف نگاہ اٹھائے اس کو روک دیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی
طرف بھی نہیں دیکھا بلکہ سر اور کمر جھکائے اپنے بھاری قدموں سے کھٹ کھٹ کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ جولین کے
انکار سے اس پر ضرب کاری لگی تھی جس سے جانبر ہونا محال تھا۔
جولین کی طبیعت کے آدمی کے لئے وہ چوٹ جو کسی دوسرے کے لگے کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔
انسان اپنی چوٹ کی طرح اس کا علاج بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی تو کھال نئی پیدا ہو جاتی ہے اور زخم مندمل ہو جاتا
ہے مگر ہم دوسروں کے بجائے کیسے کھال پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے ان کے زخم ہمیں کھٹکتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔
مگر اس کے باوجود جولین جیسے شخص کو یہ تشویش پیہم ذہنی تحقیق اور جستجو سے باز نہیں رکھ سکتی تھی کیونکہ جذبہ تحقیق
اپنے مقتولوں اور مجروحوں کے اوپر سے ہوتا ہوا گذر جاتا ہے۔ جولین اپنے دماغ سے یہ نہ کہہ سکتا تھا۔
"ٹھیر جاؤ۔۔۔۔۔ اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ بھول جاؤ۔"
وہ کبھی کوئی چیز نہ بھولتا تھا۔ یہ اس کی ایک دماغی کمزوری تھی۔ وہ آگے بڑھا جاتا تھا۔ جہت و تکرار
کا طالب تھا۔ وہ اپنے طریقۂ عمل میں بہت احتیاط کرتا تھا۔ وہ محض اپنے لئے روشنی کا طالب تھا۔ اُسے
دوسروں کے راستے کو روشن کرنے کی جلدی نہ تھی۔ وہ ان لوگوں کو اچھی طرح پہچان گیا تھا اور جانتا تھا
کہ وہ روشنی کے جویا نہیں ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو محض اس خیال سے کوفت ہوتی تھی کہ وہ ان کے قریب

موجود ہے اور اس کے خاموش محاسبہ سے ان کی تردید ہوتی ہے گویا وہ ان پر محض اپنی خاموشی سے حکم لگا رہا ہے (کیونکہ اب وہ اُس کو نظر انداز نہ کر سکتے تھے اور ان کا غصہ اس کے تحمل اور ضبط سے اور بڑھ جاتا تھا) اندھی جبلت سے مجبور ہو کر انھوں نے اس کے ضبط اور خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی سب سے زیادہ اشتعال دلانے والا اس کا وہ دوست تھا جس کی دوستی اب جانی دشمنی میں تبدیل ہو گئی تھی (جس کے رخسار پر ہمیشہ کے لئے اس کے طمانچہ کا نشان ثبت ہو گیا تھا۔ جولین کو انھوں نے خاموش رہنے نہیں دیا خاموش رہنے اور آزادیِ فکر میں تو بڑا آرام ہے۔ لہذا انھوں نے اس کے سامنے ایک تحریری اعلان پیش کیا جس پر دستخط کرنے سے اس نے انکار کر دیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ اپنے وجوہات بتاؤ۔ جولین اپنے عقائد کا عام اعلان کرنے سے بہت گھبراتا تھا لیکن اس نے اپنے فرض کی ادائگی سے کوتاہی نہیں کی اور وجوہات کو بیان کر دیا۔ اس کا بیان اس قدر صریح اور واضح تھا کہ اس کو دیکھ کر وہ لوگ بہت زچ ہوئے جنھوں نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو اس تحریر پر مجبور کیا تھا اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ الفاظ واپس اس کے گلے میں اتار دیتے لیکن احمقانہ جوش میں وہ خود ہی نیچے آ رہے۔ انھوں نے دشمن کے لئے ایک جال لگایا تھا اور خود ہی اس میں پھنس گئے۔ اگر وہ اپنے غیض و غضب کو اندر ہی بند رکھتے تو شاید معاملہ زیادہ نہ بڑھتا مگر اخبار نویسوں کو اس کی اڑتی ہوئی خبر مل گئی اور ان میں سے ایک نے کسی طرح اس مرتد کے خطرناک بیان کی ایک نقل حاصل کر لی۔ سیاسی ناظر کی حماقت نے کریلے کو اور نیم پر چڑھا دیا۔ اس کے اعلان سے جہاں لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے اراکین نے کس طرح حب وطن کے جوش میں اپنے ایک نااہل رکن پر کلنک کا ٹیکہ لگایا ہے وہاں انھیں بارود خانہ کا راستہ بھی معلوم ہو گیا اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ مضمون میں سے بہت سے حصوں کو جن میں کوئی خاص بات نہ تھی جو نہ دوسروں سے زیادہ شورش انگیز تھے نہ کم، بھونڈے طریقہ پر حذف کر دیا گیا۔ اس سے عوام کے تخیل کو اور اشتعال ملا اور انھیں زیادہ سخت اور بے پناہ مضامین کی تلاش ہوئی چنانچہ جولین کو خود اپنا مضمون پڑھ کر تعجب ہوا اور اس کی فطری جھجک نے اس سے سوال کیا "مگر یہ باتیں کس نے کہیں؟ تم سے کس نے کہلائیں؟"

لیکن وہ خود سے یہ سوال کرتے ہی خاموش ہو گیا اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اینٹ اس کے برابر

کھڑی اس کی تحریر پڑھ رہی ہو۔ جولین بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں دو تین چکر لگائے۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور مسکرایا:۔

"اچھا جو اس عورت کی مرضی۔ ۔ ۔ جو ہونا ہے ہو جائے گا"

بالآخر "اس عورت" نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا جس طرح اس نے نو وِ نظام معاشرت کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں اسی طرح اب جولین سے بھی وہی کرا لیا۔ اب وہ تنہا تھا، اس کی صحبت میں تنہا تھا لیکن وہ ایسا خیال پرست نہ تھا کہ یہ نہ سمجھے کہ "وہ" دراصل اس کے اپنے دماغ کا عکس ہے۔ اسے زندہ جیتی جاگتی گوشت اور پوست کی اینٹ کی ضرورت تھی جو اس کے دوش بدوش اس دنیائے آب و گل میں جدوجہد کرے لیکن اب بھی اسے کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اس کی تلاش کرے۔ اب وقت گذر چکا تھا اور بازی ہاری جا چکی تھی۔ وہ ان تقدیر پرستوں میں سے تھا (خدا ان پر اپنی برکت نازل کرے میں ان کی تعظیم کرتا ہوں مگر ان کی ہانڈی پر رشک کی نظر نہیں ڈالتا انھیں ہی ان کے ٹھاٹ سے لینے مبارک ہوں!!) جو شکست سے خائف نہیں ہوتے اس کو قبول کر لیتے ہیں مگر اس کا کوئی تدارک نہیں کرتے۔ جولین خودداری کے ساتھ اپنے گھر کے صحرا میں زندگی بسر کرتا رہا جس میں اس کی خوش نصیبی سے ایک بچی کے شور و غل سے کچھ جان سی پڑ چلی تھی۔ گھر سے باہر کی تمام دنیا اس کے لئے ایسا ویران ماحول بن گئی تھی جو مخاصمت پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے علمی اور تعلیمی مشاغل منقطع ہو گئے۔ اکیڈمی کے معزز اراکین آیندہ احتیاط رکھیں گے کہ صرف اپنے ہم خیالوں کو اکیڈمی میں داخل کریں یعنی وزرا اور افسران اور ان کی اپنی قسم کے ارباب علم جنھوں نے وطن کے نیک مقصد کی خاطر حق کے ساتھ دغا کی تھی۔ جولین کے استاد اور مربی نے اس کے محبت آمیز خطوط کا جواب نہیں دیا اور اس رسالے کو بغیر پڑھے واپس کر دیا جس میں جولین نے اعتدال کے ساتھ اور مخالفین کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنا یہ مقالہ پیش کیا تھا کہ جنگ کی ذمہ داری تمام قوموں کی مشترکہ ہے اور تمام اہل علم کا فرض ہے کہ وہ جلد باہمی مصالحت کرانے میں کوشاں ہوں۔ فرانسیسی "جماعت عمال" کے سورماؤں نے جو خود ہر طرح سے محفوظ تھے لیکن گھر پر رہ جانے والے لوگوں کے محافظ بن بیٹھے تھے کئی مرتبہ اس کے یونیورسٹی کے لکچروں میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔۔

جولین نے اس کے بعد اور کوئی چیز ایسی نہیں لکھی جس سے عام رسوائی ہو لیکن اس میں اس کی مصلحت شناسی کو دخل نہ تھا۔ خیروں کا ناظر اب زیادہ ہوشیار ہو گیا تھا اور اُسکی لکھی ہوئی ایک سطر بھی شائع نہ ہو سکتی تھی یہاں تک کہ اس کے وہ رسائل بھی جو عمارات قدیمہ کے متعلق تھے شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے مگر اس کا دماغ بالکل بے خوف تھا۔ وہ جس راستے پر پڑ گیا تھا اس سے کوئی چیز اس کو ہٹا نہ سکتی تھی۔ اس کا جسم بغیر چون وچرا، بغیر کسی شکایت یا اظہار مسرت کے وفاداری کے ساتھ اس کے دماغ کی پیروی کر رہا تھا اور بوقت ضرورت اس کے اشارے پر گھمسان کی لڑائی میں کود جانے کو تیار تھا۔

لیکن ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان وہ اس مقام تک نہیں پہنچا تھا۔ اس عرصے میں وہ خاموشی اور یک سوئی کے ساتھ غور و فکر میں مصروف رہا۔ اس کے "ارتداد" کی وجہ سے اس کے گرد جو خلا قائم ہو گیا تھا اس کی وجہ سے اسے اور فرصت مل گئی اور اس ذہنی تنہائی کی بدولت اس کی جرأت میں اضافہ ہوا اور اس کی فطرت میں اور زیادہ گہرائی پیدا ہو گئی۔ اس نے دوسروں کے سہارے کے بغیر اپنا کام نکالنا سیکھ لیا۔ وہ لوگ جنھوں نے اس کو زمین کی ہوا سے محروم کر کے پہاڑ کی ہوا کھانے پر مجبور کیا تھا اپنی عداوت اور اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ سے اور زیادہ برافروختہ تھے کہ انھوں نے خواہ مخواہ اس فضیحت اور رسوائی کو دبایا کیونکہ ان کی کوششوں سے وہ دب تو گئی لیکن اس کا انسداد نہیں ہوا۔

جولین کے نقادانہ دماغ اور وجدان میں جو نادر توازن قائم ہو گیا تھا اس کا پختہ ثمر وہ تصنیف تھی جس کا نام اس نے "اونتین کے لوگوں کا مکالمہ" (Dialogues of the People on the Aventine.) رکھا تھا جس میں اہل روح، جو شہر سے اپنا رشتہ منقطع کر چکے ہیں آپس میں ہنگامہ خیز تبادلہ خیال کرتے ہیں اور اس مرتبہ اس شخص کو آخری لفظ کہنے کا موقع نہیں ملتا جو محض شکم پری کی نیابت کرتا ہے: "جو روٹی کھانا چاہتا ہے وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کام کر کے دکھلائے۔" "اپنے ہاتھوں کو سامنے کرو، اے عالمو، فاضلو، مصورو، مصنفو۔ اپنے اعمال کا دفتر پیش کرو۔ تم نے گذشتہ سو برس میں کیا خدمات انجام دی ہیں کہ تم رائے عامہ کے حاکم (یا غلام) بنے رہے ہو؟" یہ بڑی دلچسپ نمائش تھی۔ تمام قلم کے سورما اسٹیج پر لائے گئے تھے لیکن اصل ڈراما تماشائی کی روح میں تھا جس نے اس کو دیکھ کر

حقارت کے ساتھ منہ پھیر لیا۔ اس نے یہ دیکھا کہ لوگ شہر کے باہر خیمے لگائے رات کے وقت آگ کے گرد بیٹھے اس سرخ دھوئیں کو دیکھ رہے ہیں جو آسمان کی خلیج کی طرف بلند ہو رہا ہے جہاں ٹوٹتے ہوئے تاروں کی حیثیت چنگاریوں سے زیادہ نہیں۔ اس کا ذہن بغیر کسی خارجی رہنمائی کے اپنی ذات میں اس وقت ایک انقلاب پیدا کر رہا تھا جس وقت یورپ کے قلب میں قوموں کی شورہ پشتی انقلاب برپا کر رہی تھی لیکن اس کا دماغ خارجی واقعات سے بے خبر تھا اور اس نے دوسروں پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس زمانے میں جولین نے اپنے نتائج افکار کو شائع نہیں کیا بلکہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد بھی جب اشاعت کتب پر زیادہ روک تھام نہیں رہی تھی اور وہ آسانی سے اپنی کتابوں کی اشاعت کا انتظام کر سکتا تھا اس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے خیالات کی تشہیر سے اُسے تکلیف ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اگر وہ انھیں شائع کرتا تو دن کی تیز روشنی میں اسے خود اپنی روح کے پوشیدہ راز دیکھنے پڑتے اور جب باہر کی روشنی ایک مرتبہ اس کے گھر میں داخل ہو گئی تو وہ دوبارہ کیسے اپنا دروازہ بند کر سکے گا؟ تاریکی کا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ سایہ ڈھل چکا تھا لیکن شام کی وہ دھندلی سی روشنی باقی تھی جو اربابِ فکر کو طبعاً بہت مرغوب ہوتی ہے ....

لہٰذا جنگ کے فوراً بعد اس نے محض ان تمام تصانیف کو شائع کیا جو سائنس کی تاریخ سے متعلق تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی وہ تحریریں بالکل معروضی ہیں لیکن اس کی پرزور شخصیت نے جو عرصے تک جرأت آزما تنہائی میں پرورش پاتی رہی تھی اور جس کی کمان سالہا سال کے ضبط کی وجہ سے خوب تنی ہوئی تھی ان بے پناہ تیروں کی طرف خیال نہیں کیا جو وہ اپنی تصانیف کے ہر باب میں حال اور ماضی کی ریاکاریوں اور دروغ بافیوں کے خلاف چلا رہا تھا چونکہ ایک زمانے میں وہ سب خود اس کی ذات میں جمع رہی تھیں اس لئے دراصل وہ خود اپنے خلاف تیر چلا رہا تھا۔ پھر تیر چلانے والا کون رہا تھا؟ وہ خود، ہمارا یہ نیا جولین جس کی قلب ماہیت ہو گئی تھی۔ اس تبدیل شدہ انسان نے اپنے کو آزاد کرنے کی کوشش میں خون کا غسل کیا تھا۔ اس کے تیروں کی یہ بوچھار ایک پورے ذہنی عہد اور سوسائٹی کے ایک ایسے دور کے خلاف تھی جس کا انجام قریب تھا، جس کے جسم پر ان زخموں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔

یہ جری شخص، جو یکہ و تنہا نہایت آزادی اور بے جگری کے ساتھ اپنے اجتہادی خیالات کی ترتیب

میں مشغول تھا دراصل مستقبل کی تشکیل کر رہا تھا اگرچہ خود اسے اس کا مطلق شان گمان نہ تھا۔ وہ لاعلمی میں انسانوں اور قوموں کے اس عظیم الشان کارخانے میں کام کر رہا تھا جہاں اس جیسے بہت سے لوگ ایک نظام جدید، ایک دنیائے نو کی تعمیر میں کوشاں تھے۔ اور بعد میں جب اُسے اس کا احساس ہوا جب خارجی واقعات مزاحمانہ طور پر اس کے کتب خانے کے گوشہ عافیت میں گھس آئے تو اس نے خود کو انقلاب کی جماعت میں بھرتی پایا۔ اس وقت تک یہ "انجان انقلابی" مسلسل دس سال مخالفوں کی ذہنیت کے خلاف اپنے بے پناہ تیر چلا چکا تھا۔

اور ابھی اُسے اس بات کا پوری طرح احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اینٹ نے جو اس وقت کئی ہفتے کی علالت کے بعد روبصحت تھی اپنے بستر علالت ہی پر اس کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور ایک ہی نظر میں اس حقیقت کو، اس کی ذہنیت کے اس انقلاب عظیم کو پہچان لیا۔ مسرت نے اس کے سینے میں جوش مارا اور پرانی محبت جو ابھی تک زندہ تھی بیدار ہوگئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے بھی غلافی کی ہے — اس شخص کی، جو اس سے محبت کرتا تھا، اس کا جولین، تیر انداز!

تفاسیر القرآن

قرآن اللہ کا پیغام اور آسمانی نور ہے جو بنی نوع انسان کے لئے شمع ہدایت بنا کر اُتارا گیا۔ صحابہ کرام نے جن کی زبان میں قرآن اُترا تھا اور جو اس کے اولین مخاطب تھے بے تکلف اس کو سمجھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی ذات جو عمل بالقرآن کا نمونہ تھی ان کے لئے اسوۂ حسنہ تھی۔ انھوں نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر عمل کرتے دیکھا اسی طرح خود اس کی تعمیل کرتے لگے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے عمل کو اسی کے مطابق رکھا۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے مفصل اور نور مبین ہے۔ اس کی تعلیمات عمل کرنے اور نصیحت لینے کے لئے واضح اور روشن ہیں۔ صحابۂ کرام پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ یہ کتاب انسان کے ظاہری اور باطنی اعمال کو سنوارنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اسی کے مطابق اپنے اعمال کو رکھنا اس کے اتارنے والے کے نزدیک مقبولیت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے وہ نظری بحثوں میں زیادہ نہیں الجھے۔ انھوں نے اس کی آیات کی توضیح اور تشریح کے لئے سوالات بھی بہت کم کئے۔ کیونکہ ان چیزوں میں قومیں اس وقت پھنستی ہیں جب ان کے ایمان اور عمل میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور صحابۂ کرام کی قوت ایمان اور جذبۂ عمل کا وہ عالم تھا کہ ان کی ایک نگاہ سے بڑے بڑے فلسفیوں اور عالموں کے ذخیرے سوخت ہو سکتے تھے۔

عہد صحابہ کے بعد پہلی صدی ہجری کے اواخر میں جب دوسری قومیں بھی جو عرب نہ تھیں اسلام کے آغوش میں آچکی تھیں قرآن کریم کی تشریح اور توضیح کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اس وقت سے تفسیریں لکھی جانے لگیں بیان کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلی تفسیر خلیفہ عبدالملک کی فرمائش سے سعید بن جبیر نے مدون کی تھی لیکن وہ معدوم ہو گئی۔ تیسری صدی ہجری میں امام ابن جریر طبری نے اپنی مشہور تفسیر لکھی جو آج بھی موجود ہے اور اُم التفاسیر کہی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سے آج تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں بہ سلسلہ اسناد اس کل علم کو جمع کر دیا جو قرآن کے متعلق اس وقت تک مسلمانوں کے پاس تھا۔

طبری کے بعد علما ر اسلام نے اس قدر تفسیریں لکھیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا اور آج تک ان کا سلسلہ جاری ہے۔ جس طرح ہر زمانہ میں فقہا اور محدثین کی کثرت رہی اسی طرح مفسرین کی بھی جماعت ہر عہد میں رہی بعض بعض تفسیریں اس قدر مبسوط لکھی گئیں کہ دو دو سو اور تین تین سو جلدوں میں ختم ہوئیں۔ تفسیر حدائق البیان کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ پانسو جلدوں میں تھی۔ لیکن ان مفسروں نے جہانتک قرآن کی تشریح کا تعلق ہے طبری کی تفسیر پر کچھ زیادہ اضافہ نہیں کیا۔ صرف اسرائیلی قصوں، مجوسیوں کے افسانوں، علما رکے اختلافات اور اقوال کو درج کرکے اس کو بڑھانے کی کوشش کی بعض بعض مفسروں نے اپنے اپنے خاص خاص اعتقادات یا فنی زاویۂ نگاہ سے تفسیریں لکھیں اور قرآن کو اسی رنگ میں رنگنا شروع کیا۔ فلسفیوں نے فلسفیانہ بحثیں کیں۔ معتزلہ نے اعتزال اور صوفیہ نے تصوف کا رنگ بھرا۔ فقہا نے استنباط مسائل پر زیادہ رجحان رکھا اور مورخوں نے تاریخی تفصیلات لکھیں اور انھیں چیزوں کا نام تفسیر رکھا گیا۔ علامہ زمخشری نے تو کشاف میں اپنا سارا زور بدیع اور بیان پر صرف کر دیا ہے "تفسیر" محض نام کے لئے ہے۔ حقیقت میں امام رازی کی تفسیر کبیر کے متعلق جو فقرہ مشہور ہے کہ "اس میں سب کچھ ہے بجز تفسیر کے" وہ کشاف پر زیادہ چسپاں ہے اس لئے کہ امام رازی نے تو بہت کچھ قرآنی مسائل حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

الغرض آج ہزاروں تفسیروں کے لکھے جانے کے بعد بھی اگر کوئی تفسیر کارآمد ہے تو ابن جریر طبری ہی کی ہے۔ وہی پہلی تفسیر ہے اور اسی کو اب تک آخری تفسیر بھی سمجھنا چاہئے۔ اس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آغاز عہد اسلام میں صحابۂ کرام اور تابعین اعلام نے قرآنی آیات کو کس طرح سمجھا تھا اور قرآن فہمی میں ان کے اندر کس قسم کے اختلافات تھے۔

طبری کی یہ تفسیر قرآن فہمی کے لئے ایک ذخیرہ تھی۔ اس سے مدد لے کر قرآنی حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی لیکن مابعد کے مفسروں نے بجز نقل در نقل کے کوئی خاص ترقی نہیں کی اور یہ فن ذرا بھی آگے نہیں بڑھا۔ اب تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی ہیں ان میں غور کرنے سے بڑے بڑے نقائص نظر آتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) سب سے پہلی اور ابتدائی خرابی یہ ہے کہ ان مفسروں نے قرآن کی تشریح کے اصول نہیں مقرر کئے۔ زمانۂ مابعد میں اگرچہ علما ر اصول نے کچھ قواعد مرتب کئے ہیں لیکن وہ قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنائے گئے

ہیں بلکہ زیادہ تر الفاظ اور اس کے استعمال کے متعلق ہیں اور محض قیاسی ہیں جن سے ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش موجود ہے اور پھر بالکل ناکافی۔ علامہ ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے کچھ اصول لکھنے شروع کئے تھے مگر صرف تمہید ہی لکھ سکے۔ شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے بھی اصول تفسیر میں فوز الکبیر نامی ایک رسالہ لکھا مگر اس کو اصول کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔ وہ تو صرف ان کی قرآن فہمی کی نوعیت ہے اور بس۔

الغرض تفسیر قرآن کے اصول ابھی تک قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں۔ حالانکہ ایسے اہم علم کے لئے سب سے پہلا کام یہی تھا کہ اس کے اصول بنائے جاتے۔ اس لئے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔

(۲) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور آخر تک پہونچا دیتے ہیں۔ اس سے آیات اور الفاظ کے معنی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن نہیں سمجھ میں آتا یعنی اس کی کوئی تعلیم حل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں جس طرح انسانوں کی کتابوں میں ہوتی ہیں بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے تاوقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق اس کی تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے وہ مسئلہ ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا ان تفسیروں اور ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں قرآنی تعلیمات کی مطلق توضیح نہیں ہوتی۔ فہم قرآن کے لئے ایسے ترجموں اور تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو فن طب میں کتب مفردات کی ہے جن میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام، خواص اور بدل وغیرہ لکھ دئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہو سکتا بجنسہٖ ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی قرآن کا عالم نہیں ہو سکتا۔

(۳) ایک خاص عیب یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے، الا ماشاء اللہ۔ زیادہ تر اپنے سے پہلے مفسروں کے اقوال اور روایتیں درج کی ہیں۔ بہت سے مفسر تو اس قسم کے ہیں جنھوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں یعنی تقرباً الی اللہ خدام قرآن میں

داخل ہو گئے ہیں۔ بحالیکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی ہے جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لئے مغفرت کی دعا نکلے یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ اگر بعضوں نے دماغ سے کام بھی لیا ہے تو یہ کہ اپنے خاص نظریہ کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کرمانی کی تفسیر عجائب الغرائب اور وہ تفسیر جو شیخ محی الدین ابن عربی کی طرف منسوب ہے اسی قسم کی ہیں۔ یہ درحقیقت خالص تفسیر بالرائے ہیں جن سے سوائے انسانی خیالات کے آسمانی پیغام کی ماہیت نہیں سمجھی جا سکتی۔

(۴) عام طور پر ان تفاسیر میں آیات اور الفاظ قرآن کی تشریح روایات سے کی گئی ہے۔ روایت کا بجائے خود جو درجہ ہے وہ ظن سے زیادہ نہیں ہے۔ اس طرح پر قرآن کو جو بالکل یقینی ہے اور جس پر ہر مسلمان ایمان رکھتا ہے ان مفسروں نے مظنون تشریحوں میں ڈال دیا ہے اور اس کے مفہوم کی قطعیت کھو دی ہے۔

بالخصوص تفسیر میں جو روایات ہیں ان کا بڑا حصہ تو خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے اور اسرائیلیات تو بیشتر ناقابل اعتبار ہیں۔ قدیم مفسروں نے ان روایات کا سلسلۂ اسناد بھی لکھا تھا مگر متاخرین نے اس کو بھی حذف کر دیا جس کی وجہ سے بعد کی تفسیروں میں وہی قصے اور وہی روایتیں بلا اسناد کے منقول ہوئے اور عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہو گئی اور بہت سی آیات کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی اسی قدر مسلمانوں کو قرآن کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بعد ہوتا گیا۔

(۵) یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ اس لئے محکم اور یقینی آیات پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ آیات پر کتابیں لکھی ہیں ان کی تو کوشش یہی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیتیں منسوخ ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے زیادہ غور کیا تو ان کو صرف پانچ آیتیں ایسی مل سکیں جو منسوخ ہیں۔ مگر وہ بھی منسوخ نہیں ہیں جیسا کہ تفصیل کے ساتھ ہم نے ان پر اپنی کتاب تاریخ القرآن میں بحث کر دی ہے۔ غرض اس نسخ کے عقیدہ نے ان تفسیروں کے اندر ایک عجیب اہمال پیدا کر دیا ہے۔

(۶) ان مفسروں کو قرآن کریم کی صاف اور سیدھی تعلیم کم تر پسند آتی ہے۔ اس میں مختلف طریقہ سے ندرت اور غرابت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مقصد کو زیادہ تر موضوع اور مجہول روایتوں سے حاصل کرتے

ہیں قصص میں اس قسم کی عجیب وغریب باتیں جو بیان کی گئی ہیں ان کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ معمولی اور سیدھی باتوں میں بھی یہ اپنی جدت طرازی سے اضافے کرتے ہیں۔ "تنزل الملئکۃ والروح فیہا" میں 'روح' کی تفسیر کی گئی ہے کہ ایک فرشتہ ہے جو ساتوں آسمان کا ایک لقمہ بنا سکتا ہے۔ اس کا سر عرش کے تلے اور پاؤں زمین کے ساتویں طبق کے نیچے ہے۔ اس کے ایک ہزار سر ہیں اور ہر سر اس دنیا سے بڑا ہے اور ہر ہر سر میں ہزار ہزار منہ ہیں الی آخرہ۔ قوم ثمود کی آزمائش کے لئے اللہ نے جو اونٹنی نکالی تھی اس کی نسبت تفسیروں میں ہے کہ پہاڑ میں سے کراہنے کی آواز آئی اور وہ اس میں سے پیدا ہوئی۔ حالانکہ قرآن کے کسی حرف سے اس کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ "استوت علی الجودی" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت نوح کی کشتی پہلے کعبہ کے پاس آئی (یہ کعبہ ابراہیمی تو ہو نہیں سکتا جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ غالباً فرشتوں کا بنایا ہوا ہوگا اسی وجہ سے ڈوبا نہ تھا) اور سات بار اس کا طواف کیا، پھر یمن کی طرف گئی۔ وہاں سے پلٹ کر جودی پہاڑ پر جا کر دسویں رجب کو جو جمعہ کا دن تھا ٹھہر گئی۔ یہ ہے ہمارے مفسروں کی قرآن فہمی۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ روما کے کنیسہ میں کسی بزرگ کی سنگ مرمر کی مورت بنا کر رکھی ہے جہاں عقیدت مند حاجت طلبی کے لئے آتے ہیں اور اس کے نیچے شمعیں یا بتیاں روشن کرتے ہیں۔ مرور زمانہ سے ان چکنے پیچ دار دھوؤں سے وہ سفید مورت اس قدر سیاہ ہو گئی ہے کہ اب کوئی طاقت اس کو صاف نہیں کر سکتی۔ یہی کیفیت ہمارے ان مفسروں کی ہے جنھوں نے قرآن کو واضح کرنے کے لئے اپنی اپنی تفسیروں کی جو شمعیں روشن کیں ان سے اس کا نورانی چہرہ اس قدر رفتہ رفتہ سیاہیوں کے نیچے چھپ گیا کہ اب اللہ ہی اس کو دور کرے تو کرے۔

(۷) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے چلے جاتے ہیں مثلاً "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کی تفسیر میں بیسیوں قول ہیں۔ "والفجر ولیال عشر" کی متعدد تفسیریں ہیں۔ "وشاہد ومشہود" کی شرح میں کئی باتیں لکھی گئی ہیں۔ "اصحاب الاخدود" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے۔ الغرض سینکڑوں آیات ہیں جن کی تفسیر یا یا کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم ویقین کے ساتھ نہیں بیان کرتے۔ ان مختلف اقوال میں نہ اتفاق کی صورت ہوتی ہے نہ تطابق کی۔ اگر ایک بات کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں تو درایت سے کام نہیں لیتے بلکہ

قائل کی عظمت و شہرت کے اوپر اس کا معیار رکھتے ہیں۔ غرض ان مختلف اقوال میں صحیح فیصلہ کرنے کی قوت ان کے اندر مفقود ہوتی ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کا مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کا مفہوم واضح ہو اکثر گورکھ دھندا ہو کے رہ جاتا ہے کیونکہ مفسر خود کوئی مفہوم نہیں سمجھ سکا ہے۔

(۸) ان تفاسیر میں قرآنی حقایق کی جستجو کم ہوتی ہے اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں میں صفحوں کے صفحے سیاہ کئے جاتے ہیں جنت کا ذکر آئے گا تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد شمار کرنے لگیں گے اور حوض کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپنے لگیں گے۔ اصحاب کہف کے قصے میں ان کی تاریخی حقیقت لکھنے کے بجائے ان کے ناموں کی فہرست اور ان کے کتے کی نسل بیان کریں گے۔ اور جنگ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کی جگہ ان کی شکلوں، گھوڑوں، عماموں کا رنگ اور سواری اور قتل و حملہ کی کیفیت لکھیں گے۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہ ہوگا تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلائیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثیں کریں گے۔

یہ عیوب و اسقام جو میں نے بیان کئے موجودہ تفاسیر میں کوئی تفسیر بھی ان سے خالی نہیں ہے۔ اگر اسی کو قرآن کی خدمت سمجھا جاتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اب تک اس کی کوئی خدمت ہی نہیں ہوئی۔ ہمارے زمانہ کا ایک متلاشی حق ان تفاسیر کے متعلق لکھتا ہے:۔

"آج اگر کوئی طالب حقیقت اپنی بجھی ہوئی آگ سلگانے کی نیت سے کسی بڑی سے بڑی تفسیر کی طرف رجوع کرتا ہے تو پہلا ورق کھولتے ہی اس میں انسانی باطل آرائی اور غلط گوئی، داستان سرائی اور حقیقت پوشی، آسماں سوالی اور ریسیاں جوابی کی وہ حیا سوز بدعنوانیاں دیکھتا ہے کہ اس قصاب خانۂ عقل و فہم کو دیکھ کر روح کانپ اٹھتی ہے۔ کہیں اس کے اندر صرف و نحو کے مستقل مقالے ہیں، کہیں اعراب پر لمبی چوڑی بحثیں ہیں، کہیں اسالیب فصاحت پر جرح و قدح ہے، کہیں ظن و قیاس کے ظلمت انگیز مناظرے ہیں، کہیں حدثنا اور قال قال کا بے سرا راگ ہے، کہیں فرضی اور بے سند قصوں کا طومار

ہے، کہیں بے ربطیاں میلوں تک ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں، ہر آیت سیاق سے الگ سباق سے علیحدہ، اندر سے ٹکڑے ٹکڑے باہر سے بے مطلب اور بے نتیجہ بن گئی ہے۔ جہاں ربط روز روشن کی طرح عیاں ہے وہاں طفلانہ نمائش ہے۔ جہاں بے ربطی کی خلیج عظیم اور تدبر و علم کی ضرورت ہے وہاں آئیں بائیں شائیں ہے۔ نہ اصول مطلب سے بحث ہے، نہ نتائج پر نظر ہے، نہ علم کی تلاش ہے، نہ حکمت کی جستجو ہے، ......

کسی مفسر قرآن کی نظر آجتک اس بات پر نہیں رہی ہے کہ ناظر کا بڑا مدعا پیغام الٰہی کی ماہیت کو سمجھنا ہے کہ چند الفاظ میں اس کے اندر کیا لکھا ہے، چند جملوں میں وہ کیا اصول ہیں جن پر عمل چاہئے، ان کی حکمت الٰہی کیا ہے، ان کی دستوری سند کیا ہے، وہ کیوں ذکر للعالمین ہے، کیوں ھدیً اور رحمۃ ہیں۔ بعینہٖ یہی باتیں ہیں جو ہر تفسیر اور ترجمہ میں کالعدم ہیں۔ اسی مدعا کو ٹھان کر لوگ تفسیریں پڑھتے ہیں اور مایوس ہو کر رہ جاتے ہیں، کوئی مستقل اصول، کوئی گر، کوئی کارگر بات موجودہ تفاسیر سے ان کے پلے نہیں پڑتی۔ الغرض تفسیر یا ترجمۂ قرآن کا مطالعہ متلاشی علم کے لئے مدت مدید سے وہ بے نتیجہ اور ناموافق شے رہا ہے کہ ایمان کے شعلہ کو آسمان سائے کرنے کے بجائے معتقد کی اس سلگتی ہوئی چنگاری کو بھی بجھا دیتا ہے جو ہر مسلمان کے دل میں رسماً یا خلقاً موجود ہے۔" تذکرہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی ۔"

سب سے بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ متاخرین نے یہ طے کر لیا کہ قرآن فہمی میں عقل کو دخل نہیں دینا چاہیئے بلکہ جو کچھ متقدمین کہہ گئے ہیں اسی کو صحیح تفسیر یقین کرنا چاہئے۔ اس عقیدت نے قرآن فہمی کا دروازہ ہی بند کر دیا اور مسلمان بالعموم اسی ذخیرہ پر جو سلف سے چلا آتا تھا قانع ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود علماء اسلام کا طبقہ بھی قرآن سے محروم ہو گیا چہ جائیکہ عوام اور قرآن چھوڑنے کی جو سزا تھی وہ سب کو ملی لیکن وہ چشمۂ نور یعنی قرآن کریم اسی طرح زندہ اور زندگی بخش ہے وہ ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہمیشہ ایک نیا عالم پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایسی مکمل کتاب ہے جو واضح ہے مفصل ہے اپنے اصول اپنے اندر رکھتی ہے اور اپنی تفسیر خود ہے۔

علم سیاست اور اجتماعی تباہی

[ذیل میں ہم ایک مشہور اطالوی عالم سنیور موسکا (روما) کے ایک مضمون کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ یہ ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "سیاست بحیثیت علم" سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ جرمن زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ مدیر]

یہاں جس سوال پر بحث مقصود ہے وہ علمی حیثیت سے شاید ان تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے جن سے علم سیاست بحث کرتا ہے یا جن پر اسے بحث کرنا چاہئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس علم کی ترقیوں سے ایک دن وہ تباہ کن انتشارات یک قلم رک سکیں گے یا کم از کم ان کی تعداد اور شدت میں کمی ہو سکے گی یا نہیں جو بدفعات وقتاً فوقتاً پیدا ہو ہو کر تہذیب و تمدن کی ترقی کو روک دیتے ہیں اور ان قوموں تک کو، کچھ ہی عرصہ کے لئے سہی، مقابلۃً بربریت کی طرف لے جاتے ہیں جو انسانیت کی تاریخ میں ممتاز حیثیت حاصل کر چکی تھیں۔ میں یہاں بعض باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو شاید اس پیچیدہ مسئلہ کے حل میں کچھ مدد دے سکیں، مگر ان کے اظہار سے پہلے خود مسئلہ کو ذرا زیادہ صحت و وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ انتشارات عموماً اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوم بوڑھی ہو جاتی ہے اور اسی کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد مر جاتی ہے۔ مجھے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ جب لوگ قوموں کے بڑھاپے اور ان کی موت کا ذکر کرتے ہیں یہ بس ایک شاعرانہ استعارہ کا استعمال ہوتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور استعارہ بھی ایسا جس سے اس منظر کا پورا پورا تصور قائم نہیں ہو پاتا جس کی تحقیق منظور ہے، اور ان لوگوں کے ذہن میں تو یہ تصور اور بھی قائم نہیں ہو پاتا جنھوں نے تاریخ کا مطالعہ چنداں غور سے نہیں کیا ہے۔

فرد تو ضرور بڈھا ہوتا ہے اور مرتا ہے۔ یہ اس کی تقدیر کا تقاضا ہے، جب اس کی قوت حیات ختم ہو چکتی ہے، کوئی مرض یا کوئی شدید خارجی سبب اس کے کسی ایسے عضو کے فعل کو پوری طرح انجام نہیں ہونے

دیتا یا بالکل بند کر دیتا ہے جو حیات کے لئے لازمی ہے جماعت کے باب میں ایسا مادی بوڑھاپا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ ہر نئی نسل کے جوانوں میں پوری پوری قوت حیات موجود ہونی چاہئے۔ مادی موت بھی ناممکن سی معلوم ہوتی ہے' اس لئے کہ اس کے واسطے تو یہ ضروری ہوگا کہ ایک پوری نسل کی نسل اولاد پیدا کرنے سے محترز رہے۔

ہاں' لوگ ایسی قوموں کی مثالیں دے سکتے ہیں جو بالکل غائب ہوگئیں اور جن کے اخلاف کا آج پتہ بھی نہیں لگتا۔ مثلاً تسمانیہ کی دیسی آبادی غائب ہوگئی' آسٹریلیا کی اصلی آبادی بھی ختم ہوا چاہتی ہے' جزائر کناری کے گوانوں میں شاید کچھ گنتی کے آدمی بچے ہوں تو بچے ہوں۔ امریکہ کے بہترے اصلی قبائل بالکل مٹ چکے اور بہت عنقریب مٹنے کو ہیں۔ لیکن ان سب صورتوں میں ایک چھدری چھدری منتشر آبادی کا معاملہ تھا جو شکار یا ماہی گیری سے اپنا پیٹ پالتی تھی' جن کی روزی سفید آدمیوں کی نو آبادی نے ان سے چھین لی۔ جب سفیدوں سے ان کا تعلق ہوا تو ان کا تمدن اس قدر پست تھا کہ نہ یہ زراعت شروع کر سکے نہ ان سفیدوں سے دولت آفرینی کے اور طور طریقے سیکھ سکے۔

لیکن صورت حال بالکل اور ہوتی ہے جب ایسے لوگوں کا معاملہ ہو جو زراعت تک پہنچ چکے ہیں' کثیر التعداد منظم اور قوی قوموں کی شکل رکھتے ہیں اور اپنا مخصوص تمدن پیدا کر چکے ہیں۔ اس حال میں شاید کبھی بھی اخلاف کی کمی کے باعث کوئی نسل مادی طور پر نہیں مری ہے۔ اس منزل کو پہنچ چکنے کے بعد لوگ اپنی اصلی شکل کھو سکتے ہیں' دوسرے تمدنوں میں جذب ہو سکتے ہیں' اپنا مذہب اور کبھی کبھی اپنی زبان بھی بدل سکتے ہیں' ان میں کامل ذہنی اور اخلاقی تبدیلی ہو سکتی ہے' مگر مادی طور پر پھر بھی جیئے جاتے ہیں!

اس قسم کے قلب ماہیت کے باوجود جیئے جانے کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ قدیم گیلک اور قدیم آئبیرین قوموں کے اخلاف برابر لاطینی تمدن کے زیر سایہ زندگی گزارتے رہے جس نے ان کی تشکیل کی تھی۔ قدیم عراقی یا شامی اقوام آٹھویں صدی کی عربی فتوحات کے بعد عربوں کی زبان اور ان کا مذہب اختیار کرنے کے باوجود بھی آخر جیا ہی کیں۔ یہی مصر میں ہوا' جہاں نام نہاد عربی آبادی میں اب تک بھی اپنے ان اصلی اجداد کا ناک نقشہ محفوظ ہے جنھوں نے عہد فرعونی کا تمدن پیدا کر کے اسے چار ہزار سال کی عمر بخشی تھی۔

اٹلی کے موجودہ باشندے آج بھی زیادہ تر قدیم اطالوی نسل سے ہی ہیں اور موجودہ اہل یونان کی رگوں میں آج بھی پریکلیس یا ارسطو کے کسی ہم عصر کا یا نویں دسویں صدی کے کسی بازنتینی کا خون دوڑتا ہے۔

اگر ہم ان قوموں کو نظر انداز کر دیں جنھیں کسی بلند تر متمدن والی پردیسی حکومت نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے جیسے کہ گیلک، آئبیرین اور بہت سی اور کم و بیش بربریت میں رہنے والی قوموں کو رومائی اولوالعزمی نے ایک قومی شیرازہ میں منسلک کر لیا تھا، ہاں اگر ہم ایسی قوموں کو نظر انداز کر دیں تو یہ بات صاف ہے کہ جو قوم خود اپنا تمدن بنا سکتی اور اسے صدیوں تک قائم رکھ سکتی ہے اس کی موت بس دو وجوہ سے آسکتی ہے اور آتی بھی ہے۔ یہ وجوہ اسے اندر سے گھن کی طرح کھا کھا کر کھوکھلا کر دیتی ہیں اور پھر باہر سے ذرا سا دھکا انھیں ختم کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور تقدیر کا کرشمہ دیکھئے یہ دونوں وجہیں ایک دوسرے سے اکثر وابستہ ہوتی ہیں۔ قومیں واقعی مرتی اس وقت ہیں جب ان کے برسر اقتدار طبقہ میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ زمانہ کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ اپنی نئی تنظیم کر سکیں اور جماعت کی پست ترین گہرائیوں سے نئے عناصر کو ابھار کر اپنے خون کی تجدید کر سکیں۔ اور جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں موت ان قوموں کے لئے بھی مقدر ہے جن میں وہ اخلاقی قوتیں فنا ہو جائیں جو انھیں مجتمع کئے رہتی ہیں اور جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی مساعی کی ایک بڑی تعداد متفق و متحد و منظم ہو کر ایک ہی مشترک مقصد کی خادم بن جاتی ہے، بالفاظ دیگر، بڑھاپا جو موت کا پیش خیمہ ہے، ان سیاسی تنظیمات پر طاری ہوتا ہے جن میں وہ خیالات و جذبات اپنا تسلط کھو چکتے ہیں جو ان کی انفرادیت کے برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں اور ایسے نئے خیالات و جذبات پیدا نہیں ہوتے جو انھیں مشترک اور متحد سعی کے قابل بنا سکیں۔

اسی حقیقت سے روایات، رسم و رواج، اور بزرگوں کی ریت سے اس وابستگی کی توجیہہ ہوتی ہے جو عراق و مصر کی پرانی ریاستوں سے لے کر سلطنت روما کے عہد تک قدیم اقوام کے مذہب اور سیاسی ذہنیت کی بنیاد تھی۔ یہی وابستگی چند نسل پہلے تک چین و جاپان میں کارفرما رہی اور جس سے باوجود اس کے کہ ظاہر صورت اس کے خلاف ہے خود یورپ کی جدید اقوام بھی ناآشنا نہیں، خصوصاً اینگلو سیکسن نسل کی قومیں۔ قوم بظاہر جبلی طور پر محسوس کرتی ہے کہ اگر اسے مرنا نہیں ہے تو بعض اصولوں اور بعض بنیادی خصایص کا پابند رہنا ازبس ضروری ہے اور یہ اصول اور خیالات ان تمام اجزا میں جاری و ساری ہوتے ہیں جن سے قوم عبارت ہے۔ وہ محسوس کر لیتی ہے

کہ اس کی شخصیت اسی طرح قائم اور اس کی مخصوص اجتماعی ہیئت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے کہ اس سے ہی ہر الگ الگ پتھر کو وہ جوڑنا میسر ہوتا ہے جو ان سب کو باہم جوڑے رکھتا ہے۔

اگر ماضی کی پرستش میں مبالغہ ہو اور دوسری قومیں اس کی وجہ سے یک قلم اثر انداز نہ ہو سکیں تو پھر خوش قسمتی کہئیے یا بدقسمتی اس کا لازمی نتیجہ جمود ہوتا ہے۔ لیکن جمود و بلا یا داش لیس اسی رفت ممکن ہے کہ دوسری تمام قومیں بھی حرکت نہ کریں۔ چین و جاپان نے سترھویں، اٹھارویں اور کچھ کچھ انیسویں صدی میں یہ کوشش کی تھی کہ کامل سکون کی حالت میں زندگی گزاریں لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اور انھیں اس سکون سے نہایت سختی کے ساتھ جھنجھوڑ کر باہر گھسیٹا گیا۔ اور یہ بات ہے بھی قدرتی۔ اس لئے کہ کامل جمود انسانی جماعت کے لئے ایک مصنوعی سی کیفیت ہے۔ خیالات، جذبات اور رسوم کا دائمی تغیر فطری ہے اور اس تغیر کا اظہار سیاسی تنظیمات سے ہونا ضروری ہے۔ اگر اس بات کو روکنا منظور ہو تو ان تمام اثرات کو مٹانا ہوگا جو مشاہدہ و تحقیق، اشاعت علوم اور وسعت تجربہ سے رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی موجودگی میں تو نئی ذہنیت کا پیدا ہونا اور ان نئے جذبات کا نشو و نما پانا ناگزیر ہے جن سے اجداد کی تعلیمات پر یقین اور روایتی خیالات پر بھروسہ، جو سیاسی عمارت کی بنا ہے، اکثر اوقات اندر ہی اندر سے کمزور ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک یونانی جو فلاطون اور ارسطو کے ساتھ رہتا سہتا ہو ان دیوتاؤں پر مشکل ہی سے عقیدہ رکھ سکتا تھا جو ہومر نے انسانی شکلوں میں پیش کئے ہیں؛ اور اس بات کے تسلیم کرنے پر تو وہ اور بھی آمادہ نہ ہوتا کہ یہ دیوتا یونانی شہروں کے فرمانرواؤں کو جنھیں یونان کے سب سے بڑے شاعر نے مخلوق کا چرواہا قرار دیا ہے، برابر مشورہ دیتے رہتے ہیں اور ان کے پشت پناہ ہیں۔ والٹیر کا کوئی ہمعصر فرانسیسی مشکل ہی سے باور کر سکتا کہ لوئی پانزدہم کو خدا کی طرف سے فرانس پر حکومت کرنے کا فرض تفویض ہوا ہے۔ اور ایک چینی یا جاپانی جو کسی یورپی یا امریکی یونیورسٹی میں پڑھ آیا ہے بمشکل اس یقین کو محفوظ رکھ سکتا ہے کہ حکمت انسانی کا مکمل ترین و جامع ترین اظہار بس کنفوسیوس کی تصانیف میں ہے۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ ان سخت انتشارات اجتماعی کو جن سے تہذیب کا کوئی خاص نمونہ ختم ہوتا اور جس کے باعث متعلقہ نسلوں کو بے حساب مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یعنی اس چیز کو جسے ریاست یا قوم کی موت کہتے ہیں ٹالنے کی بس ایک تدبیر ہے۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ آہستہ آہستہ مگر مسلسل اخلاقی اتحاد عمل

کے نئے عناصر پیدا کیے جائیں جو پرانوں کی قایم مقامی کرسکیں۔ غالباً اس معاملہ میں بھی بہترین نتائج اسی طرح حاصل ہوسکتے ہیں کہ دو فطری طور پر متضاد رجحانات میں یعنی تحفظ و تجدید، بقا و تغیر کے رجحانات مخالف میں صحیح توازن قائم رکھا جائے۔ بالفاظ دیگر ایک سیاسی تنظیم، ایک قوم یا ایک تمدن صحیح معنوں میں غیر فانی ہوسکتے ہیں اگر وہ یہ کرسکیں کہ اپنے کو برابر بدلتے رہیں مگر کبھی منتشر نہ ہونے دیں۔

اور اگر واقعی قوموں کی موت، سیاسی تنظیمات کا مکمل انتشار، اور پیہم و شدید مصائب اجتماعی جن سے تمدن کی ترقی بالکل رک جاتی اور انسانیت پھر سے بربریت کے قعر میں جا پڑتی ہے، کبھی مٹائے جاسکیں گے تو اس میں یقیناً علم سیاست کی ترقی اور اثر کو بہت کچھ دخل ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ گذشتہ زمانہ میں بارہا محض سیاسی تجربہ نے ایسے انتشارات کو روکا تھا ما ہے بشرطیکہ اس تجربہ کو کسی غیر معمولی دماغ نے روشن کردیا ہو اور کسی غلط تعلیم نے اسے گمراہ نہ کردیا ہو۔ اس لئے مجھے یہ بات بالکل صاف معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان قوانین کا صحیح علم ہوجائے جو انسان کی اجتماعی فطرت میں کارفرما ہیں تو یقیناً یہ علم شخصی تجربہ سے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ اس علم سے کہیں کم سے کم اس میں تمیز کرنا آجائے گا کہ کن چیزوں کا وقوع ممکن اور کن کا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اس طرح کم از کم یہ تو نہ ہوا کرے گا کہ بہتیرے نیک ارادے اور بہت ساری خوش نیتی اس میں ضائع جائے بلکہ الٹی نقصان دہ ثابت ہو کہ آدمی خواہ مخواہ جماعتی زندگی میں اس تکمیل کی امید لگا بیٹھے جو کبھی حاصل ہی نہیں ہوسکتی، علاوہ بریں اس سے یہ بھی ممکن ہوجائے گا کہ سیاسی زندگی میں بھی وہی طریقے برتے جائیں جن کا استعمال انسانی ذہن قدرت کی قوتوں کو قابو میں لانے کے وقت کیا کرتا ہے۔ اور وہ طریقہ بس یہی تو ہے کہ آدمی ان قوتوں کے فعل کو توجہ سے مشاہدہ کرتا ہے، انھیں سمجھتا ہے، اور انھیں مسترد کئے بغیر ان کے عمل کو کم و بیش بدلتا رہتا ہے۔

میں کہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میری رائے میں انیسویں صدی میں اور بیسویں صدی کے اس ابتدائی زمانہ میں علم تاریخ کی ترقیات اور علوم اجتماعی کی تصریحات نے یقینی واقعات اور عملی معلومات کا ایسا ذخیرہ فراہم کردیا ہے کہ موجودہ اور آنے والی نسل کے لئے ایک واقعی علمی سیاست کی تدوین ممکن ہوگئی ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جو پہلی نسلوں کے لئے ناممکن نہ تھی۔ البتہ یہ بتلانا بہت دشوار ہے کہ یہ علم اپنے کو عمل کے لئے موثر کب بنا سکے گا۔ یہ ایک عنصر فعال کی حیثیت کب اختیار کرے گا جس سے دوسرے عناصر عمل کی تکمیل اور ان میں تغیر ممکن ہو تو صورت

کا کوئی نظام، علی سیاسی قوت اس وقت بن سکتا ہے جب وہ کم سے کم حکمراں طبقہ کی اکثریت کا جزو ذہن بن جائے اور ان کے خیالات و احساسات پر اسے غلبہ حاصل ہو جائے۔ مگر اس غرض کے لئے وہ خیالات سب سے کم موزوں ہو جاتے ہیں جو واقعی علمی ہوں، اس لئے کہ ان میں لوچ یا تطابق کی صلاحیت نہیں ہوتی اور اسی لئے ان میں بہت کم یہ قوت ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی کہ ان جذبات کا رخ موڑ سکیں جو کسی خاص وقت غلبہ پاتے ہیں یا کسی وقتی غرض کے پورا کرنے میں مدد دے سکیں۔

فاشزم

(ذیل میں ہم فاشستی مذہب کے بانی 'مسولینی' کا ایک مقالہ ترجمہ کر کے پیش کرتے ہیں۔ یہ مقالہ مسولینی نے ۱۹۳۲ء میں *Encyclopedia Italiana* کی چودھویں جلد کے لئے لکھا تھا۔ اس سے اس نئے سیاسی مذہب کی فلسفیانہ اساس اور بانی مذہب کی ذہنیت پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ مدیر)

---

(۱)

اب تو اس بات کو بہت زمانہ ہونے آیا۔ جب میں نے ۱۹۱۹ء میں میلان کے اندر پوپولو ڈاٹالیہ میں دعوت دے کر جنگ عظیم میں مداخلت کی حامی جماعت کے ان سب اراکین کو یکجا کیا تھا جو خود جنگ میں شریک ہو چکے تھے اور جنوری ۱۹۱۵ء میں فاشستی انقلابی جماعت کے قیام کے بعد سے برابر میرے ساتھ تھے۔ تو اس جلسہ کے وقت میرے ذہن میں کوئی خاص مسلک یا مذہب نہ تھا۔ مجھے ذاتی تجربہ صرف ایک مذہب کا تھا یعنی اشتراکیت کا کوئی دس برس کا تجربہ یعنی ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۴ء کے موسم سرما تک۔ لیکن اگرچہ میں اس تحریک میں پہلے ایک معمولی رکن کی حیثیت سے اور پھر بہ حیثیت قائد حصہ لیتا رہا مگر اشتراکی مذہب کا تجربہ عمل میں مجھے کبھی نہ ہوا تھا۔ اور میرا مسلک ذاتی اس زمانہ میں بھی عمل کا مسلک تھا۔

۱۹۰۵ء کے بعد سے اشتراکیت کا کوئی ایسا نظریہ نہ تھا جسے سب بلا اختلاف مانتے ہوں۔ اس لئے کہ مذہب اشتراک میں ترمیم کی تحریک برنشٹائن کی قیادت میں اٹھ چکی تھی۔ ادھر حالات وقت کے اثر سے ایک انتہا پسند انقلابی تحریک بھی رونما ہو چکی تھی جو اگرچہ اٹلی میں کبھی بھی باتوں سے آگے نہیں بڑھی، مگر روس میں اسی پر بولشویک مذہب کی بنیاد قائم ہوئی۔ غرض اصلاح، 'انقلاب' اور مرکزیت یہ وہ الفاظ تھے جن کی صدائے بازگشت بھی آج ختم سی ہو چکی ہے۔ مگر فاشستی تحریک کے بہتے دھارے میں ان خیالات کا پتہ چلتا ہے جو سوریل اور پگی سے شروع ہوئے تھے اور لاگردیل کی 'تحریک اشتراکی' *Mouvement Socialiste* سے 'یا اطالوی حزب العمال کی

تحریک سے جس نے ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک اطالوی اشتراکی حلقوں میں ایک نیا عنصر شامل کر دیا تھا، جسے گیولیٹی کی دغا نے بہت کچھ کمزور کر دیا۔

۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم کے بعد اشتراکیت بہ حیثیت ایک مسلک کے ختم ہو چکی تھی۔ بس ایک نفرت باقی تھی۔ عمل کا صرف ایک امکان اس کے لئے تھا، خصوصاً اٹلی میں یعنی ان لوگوں سے انتقام جنھوں نے جنگ کی حمایت کی تھی اور جنھیں اب اس کے نتائج کا کفارہ دینا چاہئے تھا۔ میرے اخبار 'پوپولو ڈاٹالیہ' کا دوسرا نام ان دنوں تھا "سابق سپاہیوں اور دولت آفریں جماعت کا اخبار"۔ اور یہ الفاظ "دولت آفریں جماعت" اسی وقت سے ایک ذہنی رجحان کا پتہ دے رہے تھے۔ فاشستی تحریک کسی ایسے مسلک کی پیداوار نہیں ہے جس کی پہلے سے مفصل طور پر تدوین ہو چکی ہو۔ اسے تو عمل کی ضرورت نے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے پہلے دن سے یہ اس قدر نظری نہیں ہے جس قدر عملی ہے۔ فاشزم محض ایک اور سیاسی جماعت کا نام نہیں ہے۔ یہ تو اپنی زندگی کے پہلے دو سال میں بھی سب سیاسی جماعتوں کا مخالف رہا۔ یہ تو بجائے خود ایک زندہ تحریک ہے۔

میں نے اس زمانہ میں اسے جو نام دیا اس سے گویا اس کی ماہیت متعین ہو گئی۔ پھر بھی اگر کوئی اس زمانہ کے اخباروں کی گرد آلود مسلیں الٹے پلٹے اور اس جلسہ کی کارروائی پڑھے جس میں *Fasci Italiani di combattimento* نامی جماعت کی تشکیل ہوئی تھی تو وہاں کسی مرتب مسلک کی تعلیمات نہ ملیں گی بلکہ کچھ جوامع الکلم ہوں گے، کچھ امیدیں اور کچھ حوصلے، جو اپنی اصل حالت سے تپ تپا کر ایک دن اس مسلک کے تصورات ترکیبی بننے والے تھے جسے فاشستی سیاسی مسلک کہتے ہیں اور جو حال و ماضی کے تمام اور مسلکوں سے جدا ہے۔

میں نے اس وقت کہا تھا کہ "اگر سرمایہ دار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ جو بجلی ان پر گرنے والی ہے اسے اپنے اندر سے گذار دیں تو وہ بہت دھوکے میں ہے۔ ہمیں تو اپنا کام فوراً شروع کر دینا چاہئے ...... ہم تو محنت کرنے والے گروہ کو حقیقی اور موثر قیادت کا عادی بنانا چاہتے ہیں۔ اور انھیں یقین دلانا کہ کسی صنعتی یا تجارتی کاروبار کو کامیابی سے چلانا سہل کام نہیں ہے۔ ...... ہم ہر رجعت پسندی کا مقابلہ کریں گے، چاہے وہ صنعتی ہو چاہے روحانی، ...... جب مسند حکومت پر جانشین کی جگہ خالی ہو تو ہمیں اس کے لئے لڑنے

کو بھی تیار رہنا چاہئے .... ہمیں عجلت کی ضرورت ہے' جب موجودہ حکومت ٹوٹے تو ہمیں اس کی جگہ لینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ جانشینی کا حق ہمیں تو پہنچتا ہے' اس لئے کہ ملک کو جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہمیں نے کیا تھا اور ہمیں نے اسے فتحیاب کرایا .... سیاسی نمائندگی کا موجودہ طریقہ بالکل ناکافی ہے' نمائندگی براہ راست افراد متعلقہ کی ہونی چاہئے .... اس لائحہ عمل کے خلاف یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ یہ تو اسی 'کارپوریشن' کے خیال کی طرف لوٹنا ہوا۔ اگر ایسا ہے تو بھی کیا مضائقہ ہے .... لہذا میری خواہش ہے کہ یہ جمعیتہ معاشی نقطہ نظر سے قومی حزب العمال کی حمایت کو از سر نو قبول کرے۔"

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس پہلے دن بھی پیاز اسان میولکر ... س لفظ "کارپوریشن" منہ پر آیا جو پھر بعد کو دوران انقلاب میں وہ ادارہ ثابت ہوا جسے جماعتی قانون سازی نے ترتیب دے کر ہمارے عہد کی بنیاد بنا دیا ہے۔

---

(۲)

روم پر چڑھائی سے پہلے کا زمانہ بڑی دشواریوں کا زمانہ تھا جس کی ضرورتوں میں تحقیق علمی اور تکمیل مسلک کی فرصت کہاں تھی؟ قصبوں اور گانووں میں جنگ کرنی تھی ۔بت کچھ بحث مباحثہ بھی ہوتا تھا مگر جو بات اہم تھی اور مقدس' وہ یہ کہ لوگ جانیں دے رہے تھے اور جانتے تھے کہ جان کیسے دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مسلک کی' خوبصورتی سے بیان کئے ہوئے اور اہتمام سے مکمل کئے ہوئے مسلک کی' موٹے موٹے عنوانات کی اور کٹے چھٹے دفعات کی کمی ہو' مگر اس کی جگہ ایک اور چیز لے رہی تھی جو اس سے زیادہ فیصلہ کن تھی یعنی یقین۔

پھر بھی اگر کوئی شخص جو تحقیق کرنا اور مواد سے کام لینا جانتا ہو' کتابوں اور مضمونوں' کم و بیش اہم کانگریسوں کی قراردادوں اور تقریروں سے اس زمانہ کے واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ پائے گا کہ فاشستی مسلک کے اساسی اصول اسی کشاکش کے زمانہ میں ڈھل گئے تھے۔ اسی زمانہ میں فاشستی تخیل نے اپنے کو خوب مسلح کرلیا تھا' اچھی طرح نکھار لیا تھا اور اپنی ذہنی تنظیم کا کام شروع کردیا تھا۔ انفرادی شہری اور

ریاست کے تعلق کا مسئلہ تھا، اس سے متعلق اقتدار اور آزادی کے مسائل تھے، سیاسی اور جماعتی مسائل بھی تھے اور مخصوص قومی مسائل بھی اور ان سب کے لئے حل کی تلاش تھی اُدھر لبرلزم، جمہوریت، اشتراکیت اور فری میسن جماعتوں سے مقابلہ بھی جاری تھا۔

لیکن چونکہ نظم و ترتیب کا نہ ہونا ان حالات میں ناگزیر تھا اس لئے فاشزم کے مخالفوں نے اس کی اس صلاحیت ہی سے انکار کیا ہے کہ وہ کوئی منظم مسلک پیش کر سکتا ہے۔ اگرچہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی یہ مسلک نشو و نما پاتا رہا اور مرتب ہوتا رہا ہے، پہلے جیسا کہ سب نئے خیالات کا حال ہوتا ہے کچھ شور و شغب کے ساتھ اور ایک شدید بے دلیل انکار کی صورت میں اور بعد کو مثبت تعمیری حیثیت سے اس نے ان قوانین اور اداروں کی شکل اختیار کی جو ۲۶ء، ۲۷ء اور ۲۸ء میں فاشستی حکومت نے نافذ کئے ہیں۔

اس وقت فاشزم ایک بالکل نرالی چیز ہے، بہ حیثیت عہد حکومت کے بھی اور بہ حیثیت مسلک سیاسی کے بھی۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آج فاشزم خود اپنے اوپر اور دوسروں پر اپنی تنقیدی استعداد سے کام لینے کے بعد ایک واضح اور مخصوص نقطۂ نظر قائم کر چکا ہے، جس کی طرف وہ رجوع کر سکتا ہے اور تمام معاملات میں جن سے دنیا اس وقت دوچار ہے، چاہے عملی ہوں یا ذہنی، یہ اس کی روشنی میں عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وقت کی سیاسی مصلحتوں سے قطع نظر فاشزم جس قدر انسانیت کے مستقبل اور اس کی نشو و نما پر نگاہ ڈالتا ہے تو نہ امن عام کا فائدہ سمجھ میں آتا ہے، نہ اس کے امکان پر یقین۔ لہذا یہ امن پرستی کے مسلک کو رد کرتا ہے، کہ یہ ترک سعی کا مسلک ہے اور قربانی و ایثار کے مقابلہ میں بزدلی کا مظاہرہ۔ جنگ ہی انسانی قوت کو بلند ترین درجہ تک پہنچا سکتی ہے اور جن قوموں میں اس کی صلاحیت ہے ان پر شرافت کی مہر ثبت کر دیتی ہے۔ باقی سب آزمائشیں بس بدل اور قائم مقام ہیں جن سے آدمی کبھی اس جگہ نہیں پہنچتا جہاں ایک عظیم الشان فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے یعنی زندگی اور موت میں فیصلہ۔ لہذا جو مسلک امن کے اس مفروضہ نظریہ پر مبنی ہو وہ فاشزم کا مخالف ہے۔ اسی طرح فاشزم کی روح کے منافی ہیں تمام بین الاقوامی جمعیتیں اور انجمنیں۔ ہر چند کہ مخصوص حالات سیاسی کی وجہ سے کبھی انھیں تسلیم ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور تاریخ بتا دیگی کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی محرک سے قومی جذبہ بیدار ہو گیا تو وہ جذباتی محرک ہو یا خیالی یا عملی، یہ سب جمعیتیں اور انجمنیں منتشر

ہوکر ہوائیں الٹی پھریں گی۔

یہ امن پرستی کی مخالف ذہنیت فاشزم نے افراد کی زندگی میں بھی شامل کر دی ہے۔ سکواڈرسٹا کا یہ پرغرور مقولہ Me ne frego جو زخم کی پٹیوں پر لکھا ہوتا ہے محض stoic فلسفہ نہیں، ایک سیاسی مسلک کا خلاصہ نہیں، بلکہ مقابلہ و مبارزت کی تعلیم ہے، مقابلہ کے خطروں کو اٹھانے کا درس ہے، اور اٹلی کے لئے زندگی کی ایک نئی راہ کی علامت ہے۔ غرض یہ کہ فاشسٹ زندگی کو قبول کرتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے، یہ خودکشی کا نام نہیں جانتا اور اسے بڑی حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک فریضہ ہے، ایک کشمکش اور ایک فتح۔ اس کے نزدیک زندگی بلند ہونی چاہئے اور یہ اپنی خاطر بھی زندہ رہنا چاہئے لیکن اس سے زیادہ دوسروں کے لئے، ان کے لئے جو قریب ہیں اور ان کے لئے جو دور ہیں، ان کے لئے جو اس وقت موجود ہیں اور ان کے لئے جو بعد کو آئیں گے۔ . . . . .

فاشسٹ واقعی اپنے ہمسایہ سے محبت کرتا ہے لیکن یہ ہمسایہ اس کے لئے کوئی غیر واضح اور دھندلا تصور نہیں ہوتا۔ اس ہمسایہ کی محبت کی وجہ سے ضروری تعلیمی و تادیبی سختی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، نہ یہ فرق مراتب میں حائل ہوتی ہے۔ فاشزم کسی "عالمگیر معانقہ" کا قائل نہیں۔ مہذب اقوام کی جمعیۃ میں اچھی طرح زندہ رہنے کے لئے وہ اپنے معاصرین پر نہایت تیز نگاہ رکھتا ہے، ان کی کیفیت دماغی کو اچھی طرح دیکھتا رہتا ہے، اور ان کے اغراض کے متغیر رجحانات میں کسی عارضی اور فریب دہ ظاہرداری سے دھوکا نہیں کھاتا۔

زندگی کے اس تصور نے فاشزم کو اس نظریہ کی ضد بنا دیا ہے جو نام نہاد علمی مارکسی اشتراکیت کی بنیاد ہے، یعنی تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ، جس کی رو سے تہذیب انسانی کی تاریخ کی تشریح بس مختلف جماعتی طبقوں کے اغراض کے تصادم سے اور وسائل و ذرائع دولت آفرینی میں تغیر و ترقی سے ہو سکتی ہے۔ اس بات سے بے شک کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معاشی زندگی کے تغیرات مثلاً نئے اجناس خام اور انھیں کارآمد بنانے کے نئے طریقوں کی دریافت اور سائنس کے نت نئے اختراعات سے بہت کچھ اثر پڑتا ہے لیکن یہ کہنا کہ تاریخ انسانیت کی تشریح ان سے ہو سکتی ہے اور دوسرے تمام عناصر کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے ایک دھوکا ہے۔ فاشزم آج بھی

اعتقاد رکھتا ہے اور ہمیشہ رکھیگا تقدس پر اور شجاعت پر یعنی ان اعمال پر جن میں براہ راست یا بالواسطہ کوئی اثر کارفرما نہیں ہوتا۔

اور اگر تاریخ کا یہ مادی تصور تسلیم نہ کیا جائے جس کی رو سے انسان بس کٹھ پتلیاں ہیں جنھیں بخت و اتفاق کی موجیں کبھی ادھر لا ڈالتی ہیں کبھی اُدھر کہ اصلی موثر قوتیں تو ان کے قابو سے باہر ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ طبقات کے تصور کے بھی منکر ہیں جو اس نظریۂ تاریخ کا ناگزیر نتیجہ ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ فاشزم اس بات کا منکر ہے کہ جماعتی زندگی کو بدلنے میں جنگ طبقات کی قوت ہی سب سے غالب قوت ہے۔

اشتراکیت کے ان دو بنیادی اصولوں کو رد کرنے کے بعد اس میں سوائے ان جذباتی آرزوؤں کے اور کیا رہ جاتا ہے کہ کوئی ایسا جماعتی نظم ہو جائے کہ انسانی رنج و تکلیف میں کمی ہو سکے اور یہ آرزو اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسانیت۔ لیکن اس میں بھی فاشزم ' معاشی مسرت ' کا منکر ہے جسے اشتراک پورا کرنا چاہتا ہے اور معاشی ارتقا کے ایک خاص لمحہ میں ہر ایک کو مادی خوشحالی کی زیادہ سے زیادہ مقدار فراہم کر دینے کی امید دلاتا ہے۔ فاشزم مسرت کے مادی تصور اور اس کے امکان سے بھی انکار کرتا ہے اور اسے اپنے مخترعین یعنی انیسویں صدی کے نصف اول کے معاشیین کے لئے چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ یعنی فاشزم اس حسابی مساوات کا منکر ہے جس کی رو سے مادی خوشحالی برابر ہوتی ہے مسرت کے کہ اگر یہ صحیح ہو تو انسان حیوانوں کی سطح پر اتر آئے جنھیں بس ایک ہی چیز کا دھیان ہوتا ہے کہ خوب کھائیں اور موٹے ہوں ' اور اس کی وجہ سے انسانیت خالص جسمانی وجود کی پستیوں میں پہنچ جاتی ہے۔

(باقی)

دنیا کی رفتار

جمعیۃ اقوام اور جنگ حبش

اٹلی اور حبش میں بالآخر جنگ شروع ہوگئی۔ بین الاقوامی مشوروں سے بس یہ کام نکلا کہ اٹلی نے پوری طرح تیاریاں کرلیں اور پھر وقت مقررہ پر فوجی اقدام شروع کردیا۔ جمعیۃ اقوام نے غالباً برطانوی اثر سے اٹلی پر نقض امن کا الزام لگا دیا ہے اور اب اپنے دستور کی مختلف دفعات کے ماتحت اٹلی کے خلاف مناسب کارروائیوں کا مسئلہ درپیش ہے۔

جمعیۃ کے دستور کی جن دفعات کا ذکر اس سلسلہ میں آیا ہے وہ دفعہ ۱۰، ۱۱، ۱۳ (شق ۴)، ۱۵ (شق ۶ و ۷) اور دفعہ ۱۶ ہیں۔ دفعہ ۱۰ کی رو سے ارکین جمعیۃ پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ باقی تمام ارکین جمعیۃ کی مملکت اور ان کی سیاسی خودمختاری کا احترام کریں اور انھیں خارجی حملوں سے محفوظ رکھیں۔ اور اسی دفعہ میں یہ عام اور غیر متعین سی شق ہے کہ اگر حملہ ہوجائے تو جمعیۃ کی کونسل ان تدابیر کے متعلق ہدایت کرے گی جن سے یہ فرض پورا کیا جاسکے۔

دفعہ ۱۱ کے الفاظ بھی بہت عام اور غیر واضح ہیں۔ اس کی رو سے "قوموں میں امن کے تحفظ کے لئے جمعیۃ ہر مناسب اور موثر تدبیر کیا کرے گی"۔

دفعہ ۱۳ (شق ۴) کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی ریاست کسی ثالثی یا عدالتی فیصلہ کو تسلیم نہ کرے تو جمعیۃ کی کونسل اس فیصلہ کو نافذ کرانے کی تدابیر تجویز کرے گی۔

دفعہ ۱۵ (شق ۶ و ۷) میں ارکین جمعیۃ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ کسی تنازع میں وہ اس فریق کے خلاف جنگ نہ کریں گے جس نے جمعیۃ کی کونسل کی سفارشات کو تسلیم کرلیا ہو بشرطیکہ یہ سفارشیں فریقین کو چھوڑ کر باقی سب ریاستوں نے باتفاق رائے منظور کی ہوں۔ اور اگر یہ اتفاق رائے نصیب نہ ہو تو پھر ہر ایک ریاست کا یہ حق محفوظ ہے کہ وہ حق وانصاف کے قیام کے لئے جو کارروائی مناسب سمجھے کرے۔

لیکن ان دفعات کی عدم وضاحت کے مقابلہ میں دفعہ ۱۶ بالکل واضح ہے اور اس میں حملہ آور کے خلاف کارروائیوں کی تفصیل ہے مگر ان کارروائیوں کے اختیار کرنے کی شرطیہ ہے کہ جمعیۃ کا کوئی رکن دستور کی دفعات ۱۲،

۱۴ اور ۱۵ کی خلاف ورزی کر کے جنگ شروع کر دے۔ ایسی صورت میں سمجھا جائے گا کہ اس نے تمام اراکین جمعیتہ کے خلاف ایک جنگی کارروائی کی ہے اس لئے وہ ذمہ داری لیتے ہیں کہ فوراً اس پر ایسا دباؤ ڈالیں گے کہ وہ قانون جمعیتہ کی پابندی پر مجبور ہو جائے۔ اور پھر اس کے بعد اسی دفعہ میں دباؤ ڈالنے کی تدابیر کی تفصیل ہے اس دفعہ میں اہم بات یہ ہے کہ جس ریاست کے خلاف یہ تدابیر اختیار کی جائیں اس نے واقعی جنگ شروع کر دی ہو۔ غالباً اسی خیال سے اٹلی نے جنگ تو شروع کر دی ہے مگر اعلان جنگ نہیں کیا!

اس سلسلہ میں دباؤ ڈالنے کی جو تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں ان کی چار قسمیں کر سکتے ہیں (۱) اخلاقی اور سیاسی تدابیر (۲) مالی اور معاشی تدابیر (۳) بین الاقوامی مقاطعہ (۴) فوجی تدابیر۔

اخلاقی اور خالص سیاسی تدابیر اسی وقت تک کارگر ہوتی ہیں کہ سابقہ کسی کمزور سے ہو۔ اسی وقت بین الاقوامی رائے عامہ کا پاس بھی ضروری ہوتا ہے اور سیاسی تعلقات کے انقطاع کا ڈر بھی کچھ کارگر ہوتا ہے ورنہ جب کوئی طاقتور ریاست شر پر آمادہ ہوتی ہے تو وہ رائے عامہ اور سیاسی تعلقات کی زیادہ پروا نہیں کرتی نہ اس کا خیال رکھتی ہے کہ اس کے اعمال کے نتائج کو باقی حکومتیں تسلیم کریں گی یا نہیں۔ جاپان نے چین میں جو کیا اس میں دنیا کی رائے عامہ کیا کر سکی؟ جمعیتہ اقوام نے جب منچوکو کی ریاست کو اپنی قرارداد مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ء کی رو سے تسلیم نہیں کیا تو کیا جاپان نے زبان حال سے یہ جواب نہ دیا کہ "کردم و شد"؛ لیکن بہرحال وضع داری کے سلسلہ میں یہ چیزیں بھی ابھی تک غاصب کو غصب سے روکنے کی تدابیر میں شمار ہوتی ہیں۔

مالی تدابیر میں طویل مدت کے لئے قرض اور تھوڑی مدت کے لئے ساہوکارہ اور تجارت میں ادھار کا انتظام کرنے سے انکار کرنا خاصی مؤثر تدبیر ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ دباؤ ضرورت پڑتے ہی ڈالا جا سکتا ہے اور اگر بروقت ڈالا جائے تو خاصا مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی دشواریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادھار اور اعتبار کا جال کچھ ایسا پیچیدہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس میں آسانی سے یہ پتہ چل سکے کہ ادھار کسے دیا گیا۔ بظاہر کسی کو دیا جا سکتا ہے اور استفادہ کوئی اور کر سکتا ہے۔ دوسرے جس کے خلاف یہ تدبیر اختیار کی جائے وہ بھی یہ کر سکتا ہے کہ اپنے تمام سابقہ قرضوں کی ادائگی سے انکار کر بیٹھے۔ البتہ مالی تدابیر کو بہت زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے اگر مظلوم قوم کے لئے زمانہ جنگ میں مالی آسانیوں کا انتظام کیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں مظلوم اقوام کی مالی امداد

کے متعلق ایک معاہدہ کا مسودہ بنا تھا اور اس پر بہت سی ریاستوں کے دستخط بھی ثبت ہو چکے تھے (جن میں اٹلی بھی شامل ہے!) لیکن اس معاہدہ کا نفاذ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اٹلی اور حبش کے قضیہ میں حبش کو مالی امداد پہنچانے کے متعلق اراکین جمعیۃ کا رویہ کیا رہتا ہے۔

معاشی تدابیر میں سب سے پہلے تو یہ ہو سکتا ہے کہ جمعیۃ ان اسلحہ اور ان تمام اشیاء خام کی برآمد ممنوع قرار دے جو جنگ کے لئے لابد ہیں۔ لیکن اگر تمام اراکین جمعیۃ عملاً ایسا کر بھی دیں تو بھی یہ تدبیر کارگر اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جو ملک جمعیۃ کے رکن نہیں ہیں (مثلاً امریکہ، جرمنی اور جاپان) وہ بھی اس پر عمل کریں۔ اگر یہ ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو جمعیۃ کو یہ طے کرنا ہوگا کہ بحری ناکہ بندی کی جائے یا نہیں۔ ناکہ بندی میں ان قوموں سے بھی جنگ کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

لیکن معاشی اعتبار سے اس سے زیادہ موثر چیز یہ ہے کہ اراکین جمعیۃ غاصب ملک کے مال کی درآمد اپنے یہاں روک دیں۔ اس میں عملی آسانیاں بھی ہیں اور ناکہ بندی کی ضرورت بھی نہیں۔ غاصب اس کی وجہ سے مبادلۂ خارجہ سے محروم ہو جاتا ہے، جس کے سبب وہ دوسرے ملکوں سے بھی بآسانی مال نہیں خرید سکتا۔

رہا مقاطعہ معاشی جو دفعہ ۱۶ کا منشا معلوم ہوتا ہے سو اس کی تاثیر میں کیا کلام۔ مگر اس کی عملی دشواریاں بھی بے حساب ہیں۔ اس دفعہ کی رو سے تمام اراکین جمعیۃ کا فرض ہے کہ فوراً غاصب ریاست سے تمام تعلقات تجارتی و مالی منقطع کر دیں، اپنی رعایا اور غاصب حکومت کی رعایا میں ہر قسم کا ربط ضبط روک دیں، اور غاصب حکومت کی رعایا اور تمام دوسری حکومتوں کی رعایا کے درمیان مالی، تجارتی اور شخصی روابط کو روکیں چاہے یہ دوسری حکومتیں جمعیۃ کی رکن ہوں یا نہ ہوں"۔ لیکن ایسی کارروائی کے امکانات بہت کم ہیں۔ مقاطعہ کرنے سے بعض حکومتوں کو کم اور بعض کو زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے جس کا انحصار غاصب سے سابقہ تعلقات پر ہے۔ پھر اس کے لئے ناکہ بندی ضروری ہو جاتی ہے جس میں صاف صاف جنگ کی صورت نکل آتی ہے، غاصب سے بھی اور دوسری ریاستوں سے بھی جو جمعیۃ کی رکن نہیں۔

اور جمعیۃ کے دستور میں غالباً انھیں دشواریوں کا خیال کر کے فوجی تدابیر کا ذکر بھی ہے چنانچہ اسی دفعہ ۱۶ میں ہے کہ "ایسے حالات میں کونسل کا فرض ہوگا کہ متعلقہ حکومتوں کو مشورہ دے کہ کس قدر بحری،

بحری یا ہوائی فوج ہر رکن جمعیۃ کو اس غرض سے فراہم کرنی ہو گی کہ دستور جمعیۃ کو برقرار رکھا جائے۔" لیکن مختلف اراکین میں فوجی فراہمی کا تناسب مقرر کرنے کی دشواری، کسی نئی بین الاقوامی فوج کے اجتماع کی دقتیں، پھر اس فوجی قوت کی قیادت کا مسئلہ اور ایسی ہی اور بہت سی باتیں اس سفارش پر عمل کرنے میں حائل ہوں گی۔

بلکہ اس وقت کہ اٹلی کے خلاف برطانیہ کے سخت اصرار پر بعض معاشی اور مالی تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا ہے اس پر سخت اختلاف رائے ہے کہ یہ تدابیر بھی کس انداز سے اختیار کی جائیں۔ ایک طرف تو وہ ہیں جو دفعہ ۱۶ سے اٹلی کا کامل مقاطعہ کرانے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ قومیں بھی جو جمعیۃ کی رکن نہیں کسی طرح اس بات پر مجبور کی جائیں کہ اٹلی کو مالی و معاشی مدد نہ دیں اور اگر دینا چاہیں تو انھیں روکا جائے۔ دوسری طرف وہ ہیں جو جتاتے ہیں کہ ایسا کیا گیا تو ان دوسری قوموں سے تصادم ہو جائے گا اور ہم معاہدۂ پیرس میں یہ عہد کر چکے ہیں کہ سوائے اپنی ملکی حفاظت کے کسی حال میں جنگ نہ کریں گے۔ لہذا دفعہ ۱۶ کے ماتحت بھی جو کارروائی کوئی ریاست کرے وہ بس اپنے ہی علاقہ میں محدود ہو، اپنے ملک سے باہر نکل کر کچھ کرنا ضروری نہ قرار دیا جائے۔

اس تذبذب اور اختلاف کی صورت میں ظاہر ہے کہ اٹلی کے خلاف معاشی اور مالی دباؤ کی تدابیر بھی کچھ بہت موثر طور پر کام میں نہ لائی جا سکیں گی۔ لیکن اخلاقی لحاظ سے اس میں شک نہیں کہ اٹلی کو جمعیۃ نے غاصب قرار دے کر بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ یوں ہی بڑوں کے جھگڑوں میں ایسی کارروائیاں چند بار ہو جائیں تو شاید بین الاقوامی معاہدوں کی وقعت میں تھوڑا بہت اضافہ ہو۔ فی الحال تو اٹلی نے اس معاشی دباؤ کے مقابلہ کا کچھ نہ کچھ انتظام کر ہی لیا ہے۔ چنانچہ اواخر اگست ہی میں مسولینی نے یہ بیان دیا تھا کہ "فاشستی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اطالوی قوم کو یہ بتا دے کہ ملک کے اعلیٰ ترین فوجی حکام نے دوسری قوموں کے دباؤ ڈالنے کے مسئلہ پر ہر پہلو سے غور کر لیا ہے اور جہاں تک جنگی دباؤ کا تعلق ہے ان کے مقابلہ کے لئے تمام ضروری فیصلے اور تدابیر کچھ عرصہ ہو چکا کی جا چکی ہیں۔ غذا کے مسئلہ پر بھی غور کیا جا چکا ہے اور اس سال ہماری فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ صنعتی مال کے متعلق حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ حال اور مستقبل کی فوجی ضروریات کے لئے شہری آبادی کو اپنے صرف میں کمی کرنی ہو گی۔ چنانچہ حکومت نے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ

کیا ہے :-

(۱) جس شخص کی پردیس میں کوئی رقم یافتنی ہو اُسے لازمی طور پر حکومت کے سپرد کر دے اور تمام پردیسی قرضوں کے تمسکات نیز اطالوی قرضوں کے تمسکات کو ۹ سال کے اطالوی تمسکات میں تحویل کرا دیا جائے جن پر ۵ فی صدی سود ملے گا۔

(۲) تمام تجارتی شراکتوں کا منافع عارضی طور پر ۶ فی صدی سے زیادہ نہ دیا جائے۔

(۳) منافع، سود اور تمسکات کی آمدنی پر ۱۰ فی صدی ٹکس لیا جائے۔

(۴) ۱۹۳۶ء کے ختم تک تمام موٹر سے چلنے والی گاڑیوں میں تیل کی جگہ اس کے بدل کا استعمال عام کر دیا جائے۔

ان تدابیر سے اٹلی کو امید ہے کہ وہ معاشی اور مالی دباؤ کو کچھ عرصہ آسانی جھیل لے گا اور اس عرصہ میں فرانس کسی نہ کسی نہج سے معاملے کرا ہی دے گا اور اس کے قرائن اسی وقت سے معلوم ہو رہے ہیں۔ رسالہ جامعہ میں شروع سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جنگ میں اٹلی زیادہ دن مبتلا نہیں رہنا چاہتا۔ اس کی مالی حالت کا تقاضا یہی ہو کہ جنگ طویل نہ ہو۔ مگر ملک کی اندرونی سیاسی حالت مجبور کرتی ہے کہ جنگ ہو اور اس میں فتح بھی حاصل ہو حبش کے ملک کو فتح کرنا بہت صبر آزما اور دشوار کام ہے مگر حبش کی غیر منظم افواج پر ابتدائی معرکوں میں فتح حاصل کرنا بہت سہل ہے۔ چنانچہ اٹلی یہ ابتدائی فتوحات حاصل کرنے کے بعد بخوشی مصالحت پر تیار ہو جائے گا۔ مصالحت کے وقت چونکہ جمعیۃ کے فیصلوں اور دنیا کی رائے عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کی اخلاقی حالت بہت قوی نہ ہوگی اس لئے حبش کی تقسیم میں دوسرے حصہ داروں کو بھی اپنا حق لینے میں آسانی ہوگی۔ غرض مختصر سی جنگ کے بعد معاملات کے طے ہو جانے میں سب کا فائدہ ہے۔ اس لئے شاید یہی صورت پیش آئے۔

جاپان اور حبش | اٹلی اور حبش کی جنگ کے سلسلہ میں حبش کے ساتھ جاپانی ہمدردی کی خبریں بار بار اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلے سامان جنگ بھیجنے کی اطلاعیں آئیں، پھر جاپانی فوجی افسروں کے وہاں پہنچنے کی

خبر آئی۔ ان خبروں کی تردید بھی کبھی کبھی شائع ہوئی لیکن یہ خبریں ایک ایک کر کے صحیح ہوں یا نہ ہوں اجمالی طور پر یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ جاپان ایشیائی اور افریقی اقوام کی سیادت کا خواب ضرور دیکھ رہا ہے کہ اس سیادت کے صلہ میں ہی اس کی روزافزوں صنعتی قوت کے لئے نئی نئی منڈیاں کھلیں گی جبش کے متعلق جن خبروں کا ذکر ہم نے کیا ان سے اس معاشی رابطہ کا جزوی اظہار ہوتا ہے جو پچھلے چند سال میں جاپان اور حبش کے درمیان قائم ہوگیا ہے۔

ابھی ۱۹۳۱ء تک حبش کی کل درآمد کا تقریباً ۸۰ فیصد ہندوستان سے جاتا تھا اور صرف ۱۲ فیصد جاپان سے۔ آج حبش کی کپڑے کی منڈی میں جاپانی مال ۸۰ فیصدی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ جاپانی فوجی انجینیروں کی جماعت بھی عرصہ سے وہاں گئی ہوئی ہے بہ ظاہر اس غرض سے ہوائی جہازوں کے مرکز قائم کرنے میں حکومت کو مشورہ دے ۱۹۳۳ء کے موسم سرما میں حبشی وزیر خارجہ نے قاہرہ میں یہ بیان دیا کہ جاپانی اثر حبش کی معاشی زندگی میں بہت اہم جزو بن گیا ہے۔ پھر حبشی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ روئی کی کاشت کے لئے حکومت نے ۴ لاکھ ہکٹار (ایک ہکٹار = ۲½ ایکڑ) زمین جاپان کو بلا کسی معاوضہ کے دی ہے اور اس کے بعد اور بھی دینے کا قصد ہے۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوا کہ یہ قصد پورا بھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ جاپانی تاجروں کو اور اہل صنعت کو ملک کے بعض علاقوں میں مستقل بود و باش اختیار کرنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ ایک جاپانی حبشی شراکت کو ۲½ لاکھ ہکٹار زمین کا ٹھیکہ دیا گیا ہے اس شرط پر کہ حکومت کو پیداوار کا ۱۰ فی صدی بطور مالگذاری دیا جائے گا۔ چونکہ یہ علاقہ غیر آباد ہے اور ذراتشیبی جس میں حبشی خوشی سے بستے نہیں اس لئے مارچ ۱۹۳۴ء میں حبش اور جاپان میں ایک اور معاہدہ ہوا کہ جاپانی کسان اس علاقہ میں آکر بس سکتے ہیں۔ چنانچہ جاپانیوں کی روزافزوں تعداد یہاں بسنے کے لئے برابر بھیجی جا رہی ہے۔ اس معاہدہ میں یہ قابل لحاظ دفعہ بھی ہے کہ دونوں حکومتیں اپنے باشندوں میں مناکحت کے تعلقات بڑھانے میں ساعی ہوں گی!

حبش نے جاپانی مال پر محصول درآمد میں بھی بہت کچھ کمی کر دی ہے جس سے برطانوی اور اطالوی تجارت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ مگر اب جاپانی 'غیر مہذب ایشیائی' تو رہے نہیں کہ جب چاہا دبا لیا 'ایک مضبوط حکومت کی قوت ان کے ساتھ ہے۔ ان کا یہ منصوبہ کہ افریقہ میں کپاس کی کاشت بڑے پیمانہ پر کر کے یورپ کی صنعت پارچہ بافی پر ایک اور ضرب کاری لگائیں سب پر عیاں ہے۔ مگر کوئی کرے تو کیا کرے۔

سچ ہے زبردست مارے اور رونے نہ دے۔

نہر سویز اور جنگ حبش | اٹلی کے خلاف تدابیر اختیار کرنے کا چرچا اب عرصہ سے ہے۔ ان میں ایک تدبیر شاید پہلی مرتبہ ۷ جون کو برطانوی ایوان عام میں مسٹر اٹلی اور مسٹر ہینڈرسن نے اپنی تقریروں میں یہ پیش کی اگر اٹلی اور حبش میں جنگ شروع ہو جائے تو نہر سویز کو اٹلی کے جہازوں کے لئے بند کر دیا جائے اس وقت سے اس مسئلہ پر بڑی دلچسپ بحث ہو رہی ہے جمعیۃ اقوام یا برطانیہ یا مصر کو اس کا حق بھی ہے کہ نہر سویز کو بند کرے۔

نہر سویز ایک کمپنی کی ملک ہے جسے ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۶ء میں خدیو مصر نے تعمیر نہر کے لئے کچھ مراعات عطا کیے تھے۔ اس شراکت پر فرانسیسی قانون کی دفعات نافذ ہیں اور اس کی آخری عدالت مرافعہ پیرس ہے۔ لیکن چونکہ کمپنی کا مقام اسکندریہ میں ہے اس لئے مقامی نوعیت کے معاملات میں مصری عدالتوں کو حق سماعت حاصل ہے کمپنی کا انتظام ۳۲ ڈائرکٹروں کے سپرد ہے جس میں سے ۲۱ فرانسیسی ہیں، ۱۰ برطانوی ہیں اور ایک ولندیزی۔ منجملہ ۴ لاکھ حصوں کے ۱۷۶۶۰۲ یعنی کوئی ۴۴ فی صدی برطانیہ کے ہاتھ میں ہیں۔

نہر ۱۸۶۹ء میں کھل گئی تھی۔ ۱۸۸۲ء میں عربی پاشا نے خدیو کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس وقت برطانوی فوجوں نے اس عذر پر کہ نہر خطرہ میں ہے اس پر قبضہ کر لیا اور نہر ۴ دن تک جہازوں کے لئے بند رہی۔ اسی وقت سے نہر کی بین الاقوامی حیثیت کا مسئلہ سامنے آیا اور ۱۸۸۸ء میں برطانیہ، جرمنی، آسٹریا ہنگری، اسپین، فرانس، اٹلی، ندرلینڈ، روس اور ترکی میں باہم ایک معاہدہ ہوا جس کا منشاء یہ تھا کہ نہر سویز جنگ اور صلح کے زمانہ میں یکساں بلا روک ٹوک سب جہازوں کے لئے کھلی رہے گی چاہے تجارتی ہوں چاہے جنگی۔ اس معاہدہ کی تصدیق برطانیہ نے مصری سیاست کی غیر یقینی حالت کی بنا پر ملتوی رکھی اور کہیں ۱۹۰۴ء میں جاکر اس معاہدہ کو قبول کیا۔ اس معاہدہ کی دفعہ ۹ کی رو سے مصری حکومت اس معاہدہ کو نافذ کرنے کے لئے مناسب کارروائی کرے گی اور اس کے وسائل کافی نہ ہوں گے تو سلطان ترکی سے مدد لے گی۔ مصر کی حفاظت کے لئے حکومت کو مناسب کارروائی کا اختیار ہے مگر پھر بھی نہر میں جہازوں کی آمد و رفت میں ہرج نہ واقع ہونا چاہیے۔ نہر اپنی تاریخ میں صرف دو دفعہ بند ہوئی ہے۔ ایک تو ۱۸۸۲ء میں خدیو کے حکم سے سر ولسلے نے

تین روز کے لئے اسے بند کیا، اور دوسرے جنگ عظیم کے زمانہ میں جبکہ ترکی افواج کی نقل و حرکت کے باعث مصر اور نہر کی حفاظت خطرہ میں تھی۔ مگر چند ہی روز بعد نہر پھر کھول دی گئی۔ اسپین اور امریکہ کی جنگ کے زمانہ میں اسپینی بیڑہ نہر میں سے گذرا (۱۸۹۸ء)۔ مصری حکومت نے اسپینی بیڑہ کو جو منیلا جا رہا تھا اس شرط پر کوئلہ لینے دیا کہ وہ اسپین کو واپس ہو جائے گا۔ روس اور جاپان کی جنگ میں (۱۹۰۴ء) برطانیہ نے باوجود جاپان کا حلیف ہونے کے روسی بیڑہ کو نہر میں سے گذرنے دیا۔

غرض سوائے اس کے خود نہر کا وجود خطرہ میں ہو یا مصری مملکت کا، نہر سویز کو بند کرنا اس معاہدہ کے خلاف ہوگا لیکن اٹلی کے خلاف اس حربہ کو استعمال کرنے کے موید کہتے ہیں کہ جمعیۃ اقوام اس بین الاقوامی معاہدہ کو اپنے دستور کی دفعہ ۲۰ کے ماتحت رد کر سکتی ہے جس میں سب اراکین جمعیۃ نے اس دستور کو قبول کرکے ان تمام معاہدوں کو رد کر دینے کا اقرار کیا ہے جو اس کی دفعات سے متصادم ہوں۔ لیکن قانونی تدبیر زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ خود صلحنامہ ورسائی میں اس معاہدہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور جس معاہدہ کو صلحنامہ صحیح تسلیم کرے اسے پھر اپنے سے متصادم قرار دے کر رد کیسے کرا سکتا ہے۔ اس ہیلو پر اٹلی کے رسالہ Affari Esteri نے اپنی جون کی اشاعت میں بڑی وضاحت سے بحث کی ہے۔ لہذا اگر جمعیۃ نہر سویز کو بند ہی کرانا چاہے تو اسے اپنی دفعہ ۱۹ کے تحت پہلے اس ۱۸۸۸ء والے معاہدہ کو غیر ضروری ہونے کی بنا پر منسوخ کرانا ہوگا اور اس معاہدہ پر خود اٹلی کے دستخط بھی ہیں!

لیکن سچ پوچھئے تو یہ قانونی بحثیں بے سود ہیں۔ اگر جمعیۃ صرف اعلان کرے گی کہ نہر بند ہے تو اٹلی نے اس کے دوسرے اعلانات کے ساتھ جو کیا ہے اس کے ساتھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر جمعیۃ یا جمعیۃ کا کوئی رکن اتنی قوت رکھتا ہے کہ اٹلی کو روک سکے اور اس قوت کے استعمال کے لئے بھی تیار رہے تو وہ بحر روم اور بحر احمر میں بحری ناکہ بندی کرکے اطالوی جہازوں کو سویز تک پہنچنے ہی کیوں دے گا کہ اس کے بلا روک ٹوک آزاد گذرگاہ ہونے کا مسئلہ زیر بحث آئے۔

مطبوعات جامعہ اردو اکیڈمی کی کتابیں

ادب، تاریخ، مذہب، سوانح عمریاں، ڈرامے اور بچوں کی کتابیں

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش:- نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے ان آٹھ خطبات کا مجموعہ جو موصوفہ نے جامعہ ملیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لاکر جامعہ میں پڑھے۔

پہلا خطبہ۔ عثمانی ترک بانیان سلطنت کی حیثیت سے۔ دوسرا خطبہ۔ عثمانیوں کا زوال۔ تیسرا خطبہ۔ انقلاب اور جنگ۔ چوتھا خطبہ۔ ترکی اور جنگ آزادی۔ پانچواں خطبہ۔ ادب و تہذیب نمبر ۱۔ چھٹا خطبہ۔ ادب و تہذیب نمبر ۲۔ ساتواں خطبہ۔ ترکی عورتیں۔ آٹھواں خطبہ۔ موجودہ حالت پر نظر اور مستقبل کی توقعات۔ یہ لیکچر اس درجہ پسند کیے گئے کہ ہر دفعہ جامعہ کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔

اصل لیکچر انگریزی زبان میں تھے۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے کیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کا نہایت جامع اور اہم مقدمہ ہے جو ترکی کی اجمالی تاریخ اور خود مصنفہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ شروع میں مصنفہ کی تازہ ترین تصویر بھی ہے۔ طباعت کتابت وغیرہ بہت اچھی، کاغذ سفید و چکنا، حجم تقریباً ۳۰۰ صفحات اور قیمت صرف عہ؍ انگریزی نسخے کی قیمت صرف للعہ

نجم السحر:- یہ ہندوستانی کے ان گرانقدر ناولوں میں سے ہے کہ ایسے پائے کے ناول ابتک ہماری زبان میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ یہ مشہور و مقبول ناول عذرا اور عذرا کی واپسی کے مشہور فرنگی مصنف رائڈر ہیگرڈ کا گویا تیسرا شہ پارہ ہے جو خوشی کی بات ہو کہ مولوی عنایت اللہ صاحب بی۔ اے دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ جیسے بزرگ کے قلم سے ہماری زبان کا سرمایہ نازبنا۔ جہاں مصنف کا کمال مسلمہ ہے مترجم کی خصوصیات ترجمہ بھی ستبرین تو قیمتی سبق دیتی ہیں۔ نہ اس میں کوئی کسر نہ اس میں انگلی رکھنے کی جا۔ یہ مصر قدیم کا ایک دلآویز افسانہ ہے اور بہت سی قیمتی معلومات اور دلچسپ چٹپٹی باتیں عشق و محبت کا ولولہ انگیز مرقع۔ طباعت کتابت کاغذ وغیرہ اعلیٰ ۲۲×۱۸ سائز ۳۸۴ صفحے اور قیمت صرف عہ

تسہیل العربیہ:- مدت سے عربی اردو کی ایک جامع لغت کی تلاش تھی خوشی کی بات ہے کہ اب ایک ایسا لغت تیار ہوگیا جس میں ۷ ہزار عربی الفاظ اور رائج اردو معانی ہیں نئے علمی الفاظ اور اصطلاحات بھی شامل ہیں نیز قرآن کے محاورات خاص والفاظ کے معانی بھی خصوصیت سے درج ہیں۔ حجم دیباچے کے علاوہ ۱۰۰۰ صفحے جلد مطلا قیمت صرف للعہ

سخنوران ایران در عصر حاضر:- ایران کی مردم خیز و شعر آفریں سرزمین شعر و ادب کا مرکز رہی ہے لیکن موجودہ انقلاب کے بعد وہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی پرانے ڈگر کو چھوڑ دیا ہے غرضکہ ایران جدید کی اب ہر چیز جدید ہے اس لئے اس تصنیف میں عصر حاضر کے ایرانی شعرا کے حالات ہیں اور ان کے کلام کا نمونہ جس سے کتاب بہت دلچسپ ہوگئی ہے۔ زبان بھی جدید فارسی ہے شعرا کی تصاویر کے اعلیٰ بلاک ہیں۔ ہندوستان میں کم کتابیں اس اہتمام سے شائع ہوئی ہیں از پروفیسر محمد اسحاق کلکتہ یونیورسٹی۔ کتاب مجلد ہے قیمت صرف (عہ/۱)

ناول

جویائے حق مولانا عبدالحلیم شرر دو حصے ۔۔۔ ۱۱عہ
زوال بغداد ۔ " " ۔۔۔ عہ/ہر
ایام عرب " " دو حصے ۔۔۔ عہ/ہر
حسن دسرور ۔ حکیم محمد علی ۔۔۔ للعہ ر
جعفر وعباسہ " " ۔۔۔ ۱۲ر
امراؤ جان ادا ۔ مرزا محمد ہادی رسوا مرحوم ۔۔۔ ۶ر
چوگان ہستی ۔ منشی پریم چند دو حصے ۔۔۔ للعہ
گوشۂ عافیت ۔ " " ۔۔۔ ۱۲ر
پردۂ مجاز ۔ " " ۔۔۔ عہ/ہر
عورت کی محبت ۔ مصنفہ سدرشن ۔۔۔ عہ ر
ایامیٰ ۔ مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم ۔۔۔ عہ/ہر
ابن الوقت " " ۔۔۔ عہ/ہر
منازل السائرہ ۔ مولانا راشد الخیری دو حصے ۔۔۔ عہ ر
تائیس ۔ مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ۔۔۔ عہ/ہر
نجم السحر " " ۔۔۔ عہ/ہر
شمیم ۔۔۔ للعہ ر
شوکت آرا بیگم ۔ ۔۔۔ ۶ر
خونبانۂ عشق ۔ سر آرتھر کانن ڈائل ۔۔۔ عہ ر
شاہد رعنا ۔ قاری سرفراز حسین عزمی ۔۔۔ عہ/ہر
جور فلک ۔ ایسٹ لن کا ترجمہ تین حصے ۔۔۔ صہ ر
خواب ہستی ۔ مرزا محمد سعید ۔۔۔ عہ ر
عذرا ۔ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب ۔۔۔ ۱۲ر
عذرا کی واپسی ۔ " " ۔۔۔ عہ ر

افسانے

کیمیاگر ۔ پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) ۔۔۔ عہ ر
نگارستان ۔ مولانا نیاز فتحپوری ۔۔۔ عہ ر
پریم پچیسی ۔ منشی پریم چند دو حصے مجلد اعلیٰ ۔۔۔ ۶ ر
پریم بتیسی ۔ " " ۔۔۔ عہ/ہر
پریم چالیسی ۔۔۔ عہ/ہر
دامن باغباں ۔ ڈاکٹر سعید احمد بریلوی ۔۔۔ عہ ر
بنگال کی تیسی ۔ مترجمہ سدرشن ۔ دو حصے ۔۔۔ عہ/ہر
حجاب زندگی ۔ سید عابد علی عابد بی اے ال ال بی ۔۔۔ ۱۲ر
دنیا کے بہترین افسانے ۔ ۔۔۔ عہ ر
قدیم افسانے ۔ عبدالقادر صاحب سروری ۔۔۔ عہ ر
دلگداز افسانے ۔ کوثر چاندپوری ۔۔۔ عہ ر
دلچسپ افسانے ۔ " " ۔۔۔ عہ/ہر
ہفت پیکر ۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری ۔ ۔۔۔ عہ/ہر
خیالستان ۔ سید سجاد حیدر یلدرم ۔۔۔ عہ/ہر
حکایات و احتساسات " " ۔۔۔ عہ/ہر
ہیبتناک افسانے ۔ مورس لیول مترجمہ امتیاز علی تاج ۔۔۔ عہ/ہر
رفیق تنہائی ۔ سید علی عباس حسینی ۔۔۔ عہ ر
چار چاند ۔ حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی ۔ ۔۔۔ عہ ر
پیغام سرکش ۔ ایم ۔ اسلم ۔۔۔ ۱۲ر
عروس غربت ۔ " " ۔۔۔ عہ/ہر
سیر گل ۔ جلیل احمد قدوائی ۔ ۔۔۔ عہ/ہر
افسانہائے عشق ۔ عابد علی عابد مع ہمایوں ۔ ۔۔۔ عہ/ہر
خواب وخیال ۔ مجنوں گورکھپوری ۔ ۔۔۔ عہ ر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ڈرامے

پردۂ غفلت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین	عہ؍
فاوسٹ۔ " " " "	للعہ؍
انجام۔ پروفیسر محمد مجیب۔	۱۲؍
کھیتی۔ " " "	۶؍
نفرت کا بیج۔ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی	۸؍
نیم شب۔ " " " "	۸؍
نقش آخر " " " "	۱۰؍
صیدِ زبوں۔ " " " "	۱۰؍
ہمزاد۔ " " " "	۶؍
گناہ کی دیوار۔ " " "	۸؍
جلال الدین خوارزم شاہ۔ سجاد حیدر یلدرم۔	۱۲؍
جنگ وجدال۔ " " "	۱۲؍
فریب عمل۔ جان گالزوردی۔	عکا؍
ناتن۔ لیسنگ۔	[illegible]
انارکلی۔ سید امتیاز علی تاج	[illegible]
ڈرامہ اکبر۔ مولوی محمد حسین آزاد	[illegible]
شہید وفا۔ مولانا عبد الحلیم شرر۔	۱۰؍
وکرم اروسی۔ کالیداس۔	[illegible]
سلمیٰ۔ آسکر وائلڈ۔ مترجمہ انصار علی۔	۵؍
آغاز ہستی۔ برنارڈ شا۔ مجنوں گورکھپوری	۱۲؍
حشرات الارض۔ محمد فضل الرحمٰن	[illegible]
پرواز خیال۔ حکیم یوسف حسن	۵؍
قزاق۔ محمد عمر نور الٰہی۔	[illegible]

مزاحیہ

انتخاب اودھ پنچ۔ منشی سجاد حسین	[illegible]
سرگذشت حاجی بغلول۔ " "	۸؍
ملفوظات حاجی بغلول ہمدردؔ کے مضامین۔	۸؍
مضامین فرحت۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب مکمل مجلد	عـلـہ
پطرس کے مضامین پروفیسر احمد شاہ بخاری۔	[illegible]
مرزا جنگی۔ ایم۔ اسلم۔	[illegible]
چٹکیاں گدگدیاں۔ خواجہ حسن نظامی۔	۱۲؍
ماہ پروین۔ میسر ولی اللہ صاحب	۱۲؍
غنچۂ تبسم۔ تمکین کاظمی۔	عکا؍
نکات رموزی۔ مجموعہ مضامین ملا رموزی	[illegible]
انتخاب نقیب جناب ملا بودھا مسولی۔	۸؍
نانی عشو۔ مولانا راشد الخیری۔	۱۰؍
موج تبسم۔ شوکت تھانوی مجلد مصور	عکا؍
سیلاب تبسم۔ " " "	عکا؍
طوفان تبسم۔ " " "	عکا؍
فل بوٹ۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔	[illegible]
کولتار۔ " "	عکا؍
روح لطافت " "	[illegible]
روح ظرافت۔ " "	[illegible]
منتخب لطائف۔ مرزا عبید زاکانی۔	[illegible]
نمکدان فصاحت۔ میر ولی اللہ صاحب	[illegible]
بزم خیال شعرائے اردو فارسی کی حاضر جوابی	عہ؍
لطائف عجیبہ۔ منشی بشیر الدین صاحب	۳؍

تاریخ وتنقید ادب

مقدمہ شعروشاعری۔ خواجہ الطاف حسین حالی	۱۴ر
آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد۔	ے ر
تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ۔	لعہ ر
سیر المصنفین۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا دو حصے۔	۸ر
تاریخ نثر اردو۔ احسن مارہروی۔	صہ ر
گل رعنا۔ مولوی سید عبدالحی مرحوم	صہ ر
شعر الہند۔ مولوی عبدالسلام ندوی مکمل مجلد	للے
مراۃ الشعر۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب۔	ے ر
دکن میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب۔	عکر
پنجاب میں اردو۔	عکر
محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ڈاکٹر محی الدین زور	۱۲ر
مخزن نکات (تذکرہ) مولوی عبدالحق صاحب	۸ر
تذکرہ ریختی۔ تمکین کاظمی۔	عہ ر
چمنستان شعراء	صہ ر
نکات الشعراء۔ میر محمد تقی میر	۸کر
ایشیائی شاعری۔ سید امجد علی اشہدی	عہ ر
ہندی شاعری۔	عکر
روح تنقید۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور	۱۲ر
تنقیدی مقالات ″ ″	۱۴ر
اردو کے اسالیب بیان ″ ″	۱۴ر
جدید اردو شاعری۔ عبدالقادر سروری	ے ر
موازنہ انیس و دبیر۔ مولانا شبلی۔	ے ر
تاریخ ادبیات ایران۔ پروفیسر براؤن	للعہ

مقالات ومکاتیب

انتخاب مضامین سرسید	۱۲ر
مقالات شبلی چار حصے۔	للعہ ۱۲ر
نیرنگ خیال۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ دو حصے۔	۸ر
مقدمات عبدالحق۔ دو حصے۔	صہ ر
افادات سلیم۔ مولانا وحید الدین سلیم۔	۸ر
افادات مہدی۔ ایم مہدی حسن	۸ر
مقالات نیاز۔ مولانا نیاز فتحپوری۔	۶ر
ادبستان۔ مولانا خلیقی دہلوی۔	۸کر
انتخاب مخزن۔ لاہور۔	للعہ ر
بقائے دوام۔ ایم۔ اسلم۔	۸ر
سیپارۂ دل۔ خواجہ حسن نظامی	عکر
مضامین چکبست۔ پنڈت برج نرائن چکبست	ے ر
مقالات حالی۔ خواجہ الطاف حسین حالی	۸ر
اردوئے معلی۔ خطوط غالب	۸کر
عود ہندی۔ ″	۱۲ر
خطوط سرسید	ے ر
مکتوبات آزاد۔ مولوی محمد حسین آزاد	عہ ر
موعظۂ حسنہ۔ مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم	۱۴ر
مکاتیب امیر مینائی۔	۸کر
مکاتیب محسن الملک و وقار الملک	۸ر
مکاتیب شبلی۔ دو حصے۔	ے ر
خطوط اکبر۔ دو حصے۔	۸کر
رقعات عالمگیر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر مجلد	للعہ ر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفینِ اُردو مثلاً میرزا غالبؔ، خواجہ حالیؔ، علامہ شبلیؔ، مولینا آزادؔ، مولینا شررؔ، علامہ اقبالؔ، منشی پریم چند وغیرہم اور اُردو کے جملہ مصنّفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، حیدر آباد، اورنگ آباد، اعظم گڈھ وغیرہ مقامات کی سب کتابیں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ شائقین فہرست طلب فرما کر اپنی پسندیدہ کتابیں منتخب فرمائیں +

رعایت

تمام مطبوعات جامعہ پر محصول ڈاک و پیکنگ معاف ہوسکتا ہے بشرطیکہ:-
(۱) فرمائش مبلغ دو روپے سے کم نہ ہو (۲) رقم بذریعہ منی آڈر پیشگی ارسال کیجائے

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ پانچ روپے سے کم نہ ہو اور رقم بھی پیشگی ارسال کر دیجائے، محصول ڈاک معاف کیا جائے گا + البتہ اُن کتابوں پر جو مکتبہ کو بھی رعایت سے دستیاب نہیں ہوسکتیں۔ یہ ممکن نہ ہو گا اور نہ اس سلسلہ میں کوئی خط و کتابت ہی کی جاسکے گی +

مندرجہ ذیل رسائل کے نمونے مفت طلب کیجیے:-

رسالہ جامعہ (ماہوار) سالانہ چندہ پانچ روپے	باتصویر پیامِ تعلیم (ماہوار) سالانہ چندہ ۸ ؍	کتاب نما (ماہوار) سالانہ چندہ آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی +

رجسٹرڈ نمبر ال-۱۸۹۲

جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے

قیمت سالانہ صہ مطبع جامعہ دہلی فی پرچہ ۸ر

اُردو اکادمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جدید مطبوعات اُردو:۔

سیرت النبی۔ (جلد پنجم) مولفہ جناب مولوی سید سلیمان صاحب ندوی۔ شائع کردہ دار المصنفین تقطیع کلاں
قیمت قسم اول صہ قسم دوم للعہ ر

چینی مسلمان۔ مصنفہ مولوی بدر الدین صاحب چینی بی۔ اے (جامعہ) شائع کردہ دار المصنفین۔ قیمت عہ ر

مسدس حالی۔ (صدی ایڈیشن) مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ شائع کردہ حالی پبلشنگ ہاؤس
قیمت قسم اول دو روپیہ قسم دوم ایک روپیہ

نقش چغتائی۔ یعنی مصور دیوان غالب از جناب محمد عبد الرحمن صاحب چغتائی قیمت پانچ روپیہ

نجم السحر۔ کا ترجمہ از جناب مولوی
محمد عنایت اللہ صاحب بی۔ اے سابق ناظم دار الترجمہ حیدرآباد قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

(نوٹ) مندرجہ بالا کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ اراکین اُردو اکادمی اپنے حساب میں طلب فرما سکتے ہیں۔

بسم اللہ

جامعہ

جلد ۲۴	نومبر ۱۹۳۵ء	نمبر ۱۱

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔

جوہر کی شاعری

(۱)

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہوگئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رام پور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے تارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق تھے۔ تمام گھر پر بار ہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی، ازراہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض کار بیکاران کی نذر نہو، یہ میرے مکان کے عقب میں تھا، اس لئے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) کہ

آیا دہلی سے ایک مشکی خر ؛ آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجئے ؎

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا ؛ خانہ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کہ کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں، میری عمر بہت ہی کم تھی، مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دئے تھے، جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کڑک کر پڑھا کرتا تھا، میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دئے، سُن کر پھڑک گئے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا، کہ اس بچہ کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعوی کروں، کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنئے، میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اُس کی توند پر کودا ہوں۔ اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۸۱ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری OFFICIAL BIOGRAPHY (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "اُمت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا۔ تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے، یا سیرۃ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہوگیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑے وٹے کی کہانی کو بھی (جو محض مزاحاً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چڑے وٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے، مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور دلّی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو، اور جواب دہی ہمارے سر آ پڑے؟ آپ نفسیات کے ماہر ہیں، کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچھنے والا سیرۃ نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا۔ کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور اُن اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالامال کردیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سُنئے کہ گیارہ برس

کی عمر میں علی گڈھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ "الماموں میز پر رکھا تھا" اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا۔ تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے"۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے پہلے ماموں کی اولاد کی فہرست مانگی۔ پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طرح اسی وقت دیا۔ اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر توجو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم النعمان میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی۔ اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج دیونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب، آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر "اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گذر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعدہٗ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی، کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح غزل میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

فرنس زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں ؛ لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڈھ کالج میں شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر "ذوق نظارۂ جمال" لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان

خلاف دستورِ عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے مکہ یا آزری حیال بن ہاضمت تھا اور محض حالات گردوپیش کا تقاضا اس کا محرک تھا جب ان سب تجربوں کے بعد "گھرے بھاگے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو عامل ضرور کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا۔ تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ غالب ہے اور تغزل کا زور ہے۔ یہ ایسی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اپنی فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں۔ جب جب یہ حور کسی بیرونی تحریک کا غصہ ہوتا ہے۔ تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو۔ اس لئے یہ لکھے بھیجتا ہوں (TOUCH STONE) کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں

A POOR THING BUT MINE OWN

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔

(غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہر حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لئے ہیں"

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی؟ یہ ٹکڑا ان کی کسی تصنیف کا نہیں، کسی اخباری مضمون کا نہیں، ایک خانگی مکتوب کا ہے۔ تاریخ اس پر ۲۹ اگست ۱۹۱۶ء کی پڑی ہے چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے۔ اس وقت کوئی جانتا بھی نہ تھا، کہ حضرت شاعر بھی ہیں ۱۹۱۶ء کے شروع میں، اسی نظر بندی کی حالت میں، ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی، پہلے انگریزی میں، اور پھر اردو میں۔ کسی والا نامہ میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دئے تھے۔ اس پر اس نیاز مند کا اشتیاق بڑھا عرض کیا، کہ کچھ اور عنایت ہو۔ عنایتیں مسلسل ہوئیں۔ دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب جا کر کھلے، ذرا کچھ

فرمایئے تو، کہ آپ نے یہ شعرگوئی کا فن کب سیکھا؟ کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا؟ جواب مفصل مرحمت ہوا، آپ اوپر پڑھ چکے، بالکل قلم برداشتہ ——— اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا میں کہیں سوچ بچار کرکے، ٹھہر ٹھہر کے، اور غور کرکرکے، لکھے جاتے ہیں؟ ——— بے چارہ کو خیال تک نہ ہوگا، کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپ کر، اور تصنیفوں کا جزو بن کر رہیں گی !

(۳)

محمد علیؒ کو دنیا نے اول اول جانا، تو اس حیثیت سے، کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں، بولتے خوب ہیں، علی گڑھ کے فدائی ہیں، "قوم" کے شیدائی ہیں، مخلص، امین، پرجوش ہیں۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کردیں۔ آکسفرڈ گئے، نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس "نورن" کے نام سے قائم کی، خود ہی صدر بنائے گئے۔ یا ("کانگریسی" اردو میں) "چنے گئے"۔ لوٹ کر آئے۔ بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے۔ ٹائمس آف انڈیا میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آگیا۔ کلکتہ سے کامریڈ نکالا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقہ میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری! واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی اور کلب میں بھی! شیکسپیر کے فلاں ڈراما پر تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! ۱۹۱۲ء آیا۔ کامریڈ کو دہلی لائے۔ یہیں سے ہمدرد بھی نکالا۔ اب محمد علیؒ ایڈیٹر نہ تھے، ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر، صحیح معنی میں لیڈر تھے، اب "قوم" اُن کی نہ تھی، وہ قوم کے تھے! جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی، اور محمد علیؒ، بیخودانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے! بلقانی اتحادیوں کی ہر ضرب ترکوں کے جسم پر نہیں، محمد علیؒ کے قلب پر پڑ رہی تھی! کچھ اور نہ بن پڑی، تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ٹرکی روانہ کردیا۔ چندہ کے لئے پکارا، تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونیں پیش آگیا، محمد علیؒ دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے! ——— اب ان کا شمار، ہوشیاروں میں، عاقلوں میں، تھا کب؟ اب وہ مستوں کے ست تھے! ہاں، مست الست'!

ولایت گئے اور آئے۔ گرجے، پیخے، چلائے۔ دم لینے نہ پائے تھے، کہ ۱۹۱۴ء کی محشرخیز

جنگ یورپ شروع ہوگئی ـــــــ خلافت اسلامیہ کی آخری جنگ! آہ، کہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم لہرایا ـــــــ محمد علیؒ اب اپنے عالم میں کہاں تھے! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی، تو نظر بند ہوئے نظر بندی بھی مہینہ دو مہینہ کی نہیں، اکٹھے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس، یہ زبان بندی معطلی کی مدر! شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے۔ مظلوم کی زبان بنکر، نالہ و فریاد کرتے ہیں، ساتھ ہی ترچھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہیں
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ!

جس کے دیوانے تھے، اس کے ہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ نہ کہاں، مہر ہی مہر، بلکہ حقیقت مہر کبھی کبھی صورت قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو ان کا معاملہ، سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا، پر ابتلاء ؎

عشق معشوقان نہان ست و ستیر
عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر!

محمد علی اس بھید کو پاگئے تھے اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے، سوچ سمجھ کر بولے، ؎

یہ نظر بندی تو نکلی ردّ سحر
دیدہائے ہوش اب جا کر کھُلے!

اور پھر اس سے بھی ترقی کرکے بولے۔ کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے، اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لئے تو نقد جان کا مطالبہ ہوتا تھا ؎

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسروں کو سمجھاتے ہیں، کہ بھائی، اس میں رشک کی کیا بات ہے، حصہ بقدر جثہ، یہ تو اپنے اپنے

ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؎

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر

"دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

آپ فرمائیں کہ، کیا خوب مصرعہ لگایا ہے، یہ خاک رعض کرے گا، کیا خوب اظہارِ حقیقت کر دیا ہے!

اسی نظر بندی کے زمانہ میں، ایک بار ملاقات ہوئی، پوچھا، رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا، ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہونچوں، اور گلی گلی گھر گھر تبلیغِ اسلام کروں!

نظر بندی اور اس کے بعد جیل! پانچ برس بعد چھوٹ کر آئے، تو ملک میں تلاطم برپا تھا، ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پینترے! ادھر ہندوستان کے اندر، حکومتِ پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع ۱۹۲۰ء تھا، کہ محمد علیؒ دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے، دوڑے دوڑے پھر یورپ پہونچے۔ اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں، وقت کی ضرورت ناگزیر، کہ موضوع صرف تحفظ خلافت ہی رہے، لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا، چپکے چپکے اور اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی!

اذاں حرم میں، کلیسا میں، دیر میں، ناقوس

کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا۔ "عدم تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے، لیکن حق گوئی کا جرم بہرحال جرم ہی بنا جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڑھ میں ڈال چکے تھے، اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے، اور ۱۹۲۳ء تک، کچھ کم دو برس، پھر چوروں اور رہزنوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے، ساتھ، سرکار دولتمدار کے مہمان! ——— اب سجدہ زمین ہی پر ہوتے تھے، لیکن سجدہ والی زمین، رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دوسری روئداد تو کان لگا کر سن ہی لیجئے ؎

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت

اک [illegible]

نکلے، تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، استقبال میں وہ بھی بیٹیں بیتیں، جن کے ہاں "وطن" "مذہب" سے عزیز تر "دنیا" "دین" پر مقدم۔ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اٹھا۔ محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ، سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر ——— وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا، اللہ اکبر!!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب، جیل ہی میں تھے، کہ منجھلی لڑکی، جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی ماں وں کی پالی، لخت جگر کے لئے یہ خبر سن کر کیا کچھ پھڑپھڑا یا ہوگا! دل پر کیا کچھ بیت کر رہی ہوگی! بیٹی سے، عالم خیال میں یہ کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پہ اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں

دوا درمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب، بے حوصلہ، والدین بھی کر ڈالتے ہیں۔ پھر وہ باپ، جس کا دل حوصلوں اور دلولوں سے بھرا ہوا ہو، وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور!

امتحاں سخت سہی، پر دل مومن ہی وہ کیا ؛ جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں!
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ ؛ اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں۔

پھر اپنے، اور اپنی نور نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر، اور گڑگڑا گڑگڑا کر عرض معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے، قرآں میں کیا ؛ تخرج الحی من المیت مذکور نہیں؟
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم ؛ آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں۔

اب اس کے بعد جو شعر ہے، اُس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے، اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے، لیکن اس کو ؛ نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

اللہ اللہ! جیل سے نکلے، تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اُسے قبر میں بھی اُتارا!

سنہ ۲۴ء کا وسط تھا، کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! ——— نہ پوچھئے

کہ محمد علیؒ پر کیا گزر کر رہ گئی! خلافت اسلامیہ کا مٹنا، قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی، خبر محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہی معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر پس کر جھلس کر رہ گئے۔ وسط ۱۹۲۴ء سے آغاز ۱۹۳۱ء تک زندہ ضرور رہے، اور بہت سے زندوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے، سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں، خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے، اور بچھڑے۔

۱۹۲۸ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی، اور سال ہی بھر بعد ۱۹۲۹ء میں اُسے بھی اپنے ہاتھوں کفنایا، دفنایا، کامریڈ نکالا، ہمدرد نکالا۔ مگر دونوں کو بند کرنا پڑا۔ کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے۔ یہ سب کچھ ہوا، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا، لیکن دل کی کلی جو الغاءِ خلافت سے مُرجھا چکی تھی، پھر نہ کھلنا تھی، نہ کھلی۔ محمد علی اب زندہ تھے کب؟ یوں کہئے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے، بس وہ پورے کر رہے تھے! ———
اب وہ انسان نہ تھے، صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر، دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لئے تھا، اور حقیقت میں سفر آخرت! بدبینوں نے کہا، کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے، تو انگریز اور ہندی، سب پکار اُٹھے، کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، یا ایک متحرک کوہ آتش فشاں! فاش و برملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے) کہ آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا، یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر"! مالک نے بندہ کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ، اور شعبان ۱۳۵۰ہجری کی پندرہویں شب میں، عین اس وقت جب روئے زمین کے مسلمان، اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی، مغفرت کی، نعمتیں مانگ رہے تھے، مشیت الٰہی نے نعمت عظمیٰ، دنیائے اسلام سے واپس لے لی! ——— شاید اس لئے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے! "آزادی" محمد علیؒ کے ملک کو کیا ملتی، محمد علیؒ کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل، لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہوگیا۔

موت لندن میں آئی۔ اور دفن کے لئے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں، قبلۂ اول، ہیکل سلیمان کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل! اقبال نے کہا، ذرا دیکھنا، محمد رسول اللہ کا غلام اور شیدائی، محمد علی، جاکس راستہ سے رہا ہے! ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت!

اس موت پر، اس مدفن پر، رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور و شور سے، تنہا لکھنؤ یا دلی یا کلکتہ یا بمبئی ہی میں نہیں، سارے ہندوستان میں ہوا، سارے عالم اسلام میں ہوا، اس کی نظیر تاریخ اسلام میں آسانی سے تو نہ ملے گی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں، کہ قدس شریف میں، مقبرہ ایک زیارت گاہ خلائق بن گیا ہے، زایروں کا ہجوم رہا کرتا ہے، مجاوروں کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے! خود کہہ بھی تو گئے تھے۔ ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اسکی دین ہے، جسے پروردگار دے!

وہ شک ہی کیا، جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔ اس کے لئے ضرورت نہ کسی تمہید کی، نہ دیباچہ کی، نہ پیش نامہ کی۔ ورق اُلٹیے، اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجیے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض، ضخیم دیوان ہو، کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں، جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی سی کتاب۔ جب جو حصہ چاہیے، کھول لیجیے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے رہرو کی زبان سے سُنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں، تو راہ شاید اور زیادہ سہولت و خوشگواری سے کٹ جائے۔

محمد علی ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے۔ اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو ؎

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلادیں ربع مسکوں کو ✲ مگر اے ہم نفس، دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے
یقیں آنے کو تو آجائے تیری عہد و پیماں کا ✲ تری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

قضا کس کو نہیں آتی ہے ؟ یوں تو سب ہی مرتے ہیں ؎ پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش ؎ تھی رات پاس اور دل ناصبور تھا

میں تیر اگھر سمجھ کے سرِ راہ گر پڑا ؎ دیکھا جو آنکھ اُٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں۔ زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں، انگریزی سنہ ۱۹۰۷ء ہے۔ علی گڈھ' محمد علی کے محبوب علی گڈھ میں، لڑکوں نے انگریز اُستادوں کے خلاف 'اسٹرائک' کر رکھی ہے۔ کالج بند' خدایان کالج حیران و پریشان! بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں، مگر اتنے عرصہ میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں، اتفاق سے وہی دن سرسید کی برسی کا ہے 'اولڈ بوائز' جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں، محمد علی اپنے 'نیچری پیر' سے ڈرنے لرزتے نہیں' ناز کرتے ہیں' ان کی خدمت میں' اپنے جیسے "بڈھے لڑکوں" کو سُنا سُنا کر کچھ عرض کرتے ہیں۔ معروضہ میں ناز بھی ہے' اور نیاز بھی، شوخی اور مستی بھی ہے اور درد و گداز بھی ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا' ہمارے ناخدا تم ہو
یہاں مانا کہ تاثیرِ دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی، مشغولِ دعا تم ہو
تمھیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڈھ میں
اور اس پر یہ تماشا' ہر طرف اور جابجا تم ہو
سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو
تم ہی ہو زندۂ جاوید' باقی جانے والے ہیں
نمونہ ہیں فنا کا ہم' تو تمثیلِ بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گزرا۔ اب محمد علی چھند واڑہ میں نظر بند ہیں۔ یک بیک خبر پہونچتی ہے، کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دست و بازو۔ انگریزی کے زبردست انشا پرداز کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان و تندرست۔ سرشام لکھنؤ میں، ایک پبلک جلسہ سے چلے آرہے تھے، کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی، اور یہ رونق صحافت و سیاست رخصت! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے، تو نالہ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں ؎

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین ٭ کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے ٭ ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
اے مرے رند، بادہ حق کے ٭ ابھی دو چار خم پئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی ٭ کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ ٭ ساتھ ہم کو بھی کر لئے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی۔ شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں، نہ کسی قسم کی تیاری، نہ کوئی اہتمام کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح نہ ترمیم، بس جو دل میں آگیا، جھٹ کہہ گذرے۔ یہی حال نثر کا، یہی حال نظم کا

زمانہ، حکومت کی اصطلاح میں "نظر بندی" کا تھا۔ لیکن احکم الحاکمین کے مدرسہ میں یہ وقت "نظر کشائی" کا قرار پایا! خوب خوب، پتہ پتہ کی کہنے لگے ؎

سوز دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو ٭ ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے تو اب ٭ اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سننے لگا۔ ؎

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے ٭ یہ کیا کہ مے سلال وہاں ہو یہاں نہ ہو
سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا ٭ جو ہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے ؎

دورِ حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد ٭ ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو ٭ باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

'حنا' کا قافیہ اس 'طرح' میں آسانی سے آسکتا تھا، لیکن ذرا دیکھئے، محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے ٭ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل ٭ ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب ٭ بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہرحال ایک مسلم استاد تھے، جوہر اُن کے مقابلہ میں مبتدی اور نوآموز محض۔ پھر بھی شعر کچھ ایسا ہیٹا نہیں رہا ؎

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں ٭ آتا ہے لطف جرمِ تمنا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے ٭ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا۔ جیل کے باہر، ہندوستان بھر کی سڑکوں پر، گلیوں میں، گھر گھر، زبانوں پر چرچا تھا، ؎

بولیں اماں محمد علی کی ٭ جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ کہنا تو محمد علی کی 'بی اماں' کا تھا، اور محمد علی خود، جیل کے اندر، کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے ٭ پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو ٭ خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے یا اپنی 'اٹوبیاگرفی' (خودنوشت سوانحعمری)" آپ بیتی" قلمبند فرما رہے تھے ؟

میں کھو کے تیری راہ میں سب دولت دنیا ۔۔ سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے ۔۔ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف ۔۔ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

اے شافع محشر جو کرے تو نہ شفاعت ۔۔ پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے

کیوں ایسے نبی پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے ۔۔ اچھے تو سبھی کے ہیں، برا میرے لئے ہے

اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے ۔۔ ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

بعد وفات جب ایک عالم، ماتم و شیون سے گونجنے لگا، تو صاحب معارف، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان ہی اسی دوسرے مصرعہ کو رکھا۔ ع

ماتم یہ زمانہ میں بپا تیرے لئے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا، یا تعزیت نگار کو! عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو۔

جسم قید فرنگ میں۔ دل ترکوں میں اٹکا ہوا۔ جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا۔ جیل خود آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور دراز سے "اللہ اکبر" کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو، ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بے خود، یہ قیدی گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی ۔۔ سن لی خدا نے قیدی گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلئے ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا ۔۔ تفسیر آج ہو گئی "کیدی متین" کی

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا ۔۔ اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی

اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے، اس کو باب میں ۔۔ کب ہو گی لامکاں سے مشیت مکین کی

تینوں حرم اسی کے جو ہے لا شریک لہ ۔۔ ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی

اسی "گھر" کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑا، اور جلا وطن بنا رکھا تھا۔ رام پور میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے،

بڑھے تھے، کھیلے تھے، چپہ چپہ دل میں بسا ہوا تھا۔ مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جاسکتے اکسی کو یہ مستقل جلا وطنی بھگتنی پڑے، جب قدر معلوم ہو۔ ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں، اور آبدیدہ ہو ہو کر کہتے جاتے ہیں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے ؛ ہم نہ تھے اُن کے آستانے کے
ایک ایک کرکے سب کے سب تنکے ؛ ہوئے برباد آشیانے کے
دیکھئے اب یہ گردشِ تقدیر ؛ کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال ؛ ہم ہیں باشندہ جیل خانے کے

قید اور وہ بھی قید تنہائی! بیجا پور جیل کی کال کوٹھری کے اندر، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا کیا نعمتیں نصیب میں آگئیں! سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا۔ کیا کچھ دکھا دیا گیا! راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان، درد خوانی پر آئی، تو کچھ اَتے پَتے اُس عالم کے بھی دیتی چلی گئی ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں ؛ اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلّی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے ؛ ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے ہیں وعدے ؛ ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت ؛ اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں ؛ بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قربان ہو جائیں اس "قید" پر ہزاروں آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانے پر ہزاروں آبادیاں! مشت خاک کا شمار اب عالم پاک میں تھا۔ لوہا، جب، تپ کر، دہک کر، لال انگارہ بن جائے، تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے۔ جو ہر اب عالم معانی و حقایق کی سیر کر رہے تھے، ان کی شاعری الفاظ و حروف کی اب رہ کہاں گئی تھی؟ ایک دیوانہ تھا دیوانہ، جسے ایک دوسرے دیوانے نے، بلا کسی ظاہری ملاقات و تعارف کے، خوب پہچانا، اور خوب ہی کہہ ڈالا ؎

بدینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی ؛ فدائے ملتِ جانانہ بودی

سیاست زنقاب چہرہ کردی ٭ وگرنہ عاشق مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشق پاکت ٭ زآئین خرد بیگانہ بودی
رسیدی از رہ اغیار تا یار ٭ عجب مستے عجب دیوانہ بودی

(از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، نظم کے باقی اشعار، سیرت محمد علی میں ہیں)

زبان پر آئی ہوئی 'واہ'، کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک، دل کی نکلی ہوئی 'آہ'، کی رسائی مالک عرش تک! رومی، اور حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ اس لئے کہ کلام 'فصیح' و 'بلیغ' ہوتا تھا؟ یا اس لئے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی روح بھی ہوتی تھی؟ فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہوگئے، محاورات تبدیل ہوگئے، ترکیبیں نئی ہوگئیں، لیکن حی و قیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں! خود بھی زندہ، اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جو ہر نے بھی اپنے کو اسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا، فنا کردیا تھا، عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی اُن کے نصیب میں بھی آجائے!

اخیلر[۱]

[محترمہ خالدہ ادیب خانم کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے بہ کمال مہربانی یہ مضمون رسالہ جامعہ کو اشاعت کے لئے روانہ فرمایا ہے۔ قارئین کو شاید یاد ہوگا کہ محترمہ موصوف نے "مشرق و مغرب کی کشمکش" کے عنوان سے گذشتہ جنوری اور فروری میں، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کئی لکچر مسلسل دیے تھے، جن کے اکثر مباحث بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے۔ پانچویں خطبہ میں اہل حرفہ کی ان انجمنوں کا اجمالی ذکر آیا تھا جو دوستوں کے حلقوں کی شکل میں قائم ہو گئی تھیں جنھیں اخیلر کہتے تھے اور جن سے اناطولیہ میں ایک معاشی تصوف کے سلسلہ کا آغاز ہوا تھا۔ یہ بحث اس قدر دلچسپ تھی کہ اس وقت اس تحریک کے متعلق جو کچھ ضمناً کہا گیا تھا اس سے عام طور پر لوگوں کی تسکین نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں امید ہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے بعد جو تشنگی اس وقت محسوس کی گئی تھی رفع ہو سکے گی۔]

جب ماضی اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتا، مستقبل میں جو ہونے والا ہے اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ہوتا اور حال ہزاروں متضاد قوتوں کا شکار رہتا ہے۔ کچھ لوگ مذہب سے تسکین حاصل کرنے کے لئے دنیا سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور کچھ موجودہ شورش و بے نظمی میں جو کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اسے غنیمت سمجھ کر اس

۱؎ ابھی کچھ عرصہ پیشتر تک "اخی" کے نام کی اصلیت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ عربی لفظ "اخی" ہے جس کے معنی بھائی کے ہیں لیکن پروفیسر جلین ڈینی نے اپنے ایک تازہ مضمون میں جو "سوسائٹی ایشیاٹک ڈی پیرس" میں شائع ہوا ہے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس لفظ کی اصل دراصل ترکی ہے۔ بہرحال اس کے ہجے ا۔ خ۔ ی۔ جو عام طور پر جرمن اور فرانسیسی مصنفوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں اس لفظ کے ترکی تلفظ کو صحت کے ساتھ ظاہر نہیں کرتے۔ ترکی تلفظ کا اظہار زیادہ بہتر طریقہ پر "اخی" اور "اخیلر" سے کیا جا سکتا ہے۔

کے جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب دنیا کی تماشا گاہ پر معاشرت کے نئے نظام کا مقدمۃ الجیش نمودار ہوتا ہے۔

اناطولیہ کی تاریخ میں تیرھویں صدی کا ابتدائی حصہ اسی قسم کا زمانہ تھا سلجوقوں کی ریاست کی بنیادیں ہل چکی تھیں اناطولیہ کے مسلمان ترک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم ہوگئے تھے۔ ملک کے باہر صلیبی جنگجوؤں کے حملہ کا خوف تھا اور ملک کے اندر ہر شخص کے حق پر دوسرے کی نظر تھی۔ ان قوتوں میں جو باہم دست و گریباں تھیں، کبھی آپس میں ٹکراتی تھیں اور کبھی ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی تھیں۔ حلقہ اخیلر کی قوت (جس کا دوسرا نام ارباب فتوت تھا) ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اس میں اس عہد کی تمام معاشرتی، معاشی اور تصوف کی قوتیں جمع ہو کر ایک ہم آہنگ رشتہ میں منسلک ہوگئی تھیں کیونکہ یہ زمانہ ایسا تھا جب کہ روحانی تسکین اور اخلاقی قوت کی ضرورت اتنی ہی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جتنی کہ امن و انتظام کی۔

پہلی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تصوف کی ایک تحریک موجود تھی جو اناطولیہ میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ارباب فتوت یا حلقۂ اخی پر اس کا جو اثر پڑا اسے بتانے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ تیرھویں صدی کی اس ممتاز تحریک کی اصلیت، تنظیم اور ادب کی وضاحت کے ساتھ تشریح کر دی جائے[1]۔

اس عہد کی تحریک تصوف کا آغاز تین بڑی شخصیتوں سے ہوتا ہے۔ تینوں کی تعلیمات کی بنیاد اسلام پر ہی رکھی گئی تھی لیکن ان کے عقاید پر ایک حد تک ایرانی، نوفلاطونی اور البیرونی کی معرفت ہندی فلسفہ اور دوسرے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات مثلاً مذہب عیسوی اور مذہب مانی وغیرہ کا بھی اثر پڑ رہا تھا۔

اناطولیہ کے خیالات پر جن تین صوفیوں کا اثر پڑ رہا تھا ان کے حالات زندگی ذیل میں درج

---

[1] جرمن اور روسی عالموں نے چند سال سے تحریک اخیلر سے بہت دلچسپی لینا شروع کی ہے۔ فرانس بھی پروفیسر جبین کی عنایت سے ان کی پیروی کر رہا ہے۔ چونکہ تیرھویں صدی میں اس جماعت کے اہم مرکز انقرہ میں تھے اور چونکہ انقرہ اب جدید ترکی کا دارالسلطنت بن گیا ہے اس لئے ترکی علما بھی اس مسئلہ سے بہت دلچسپی لے رہے ہیں اور اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کے لئے پرانے ماخذوں کو چھان رہے ہیں۔

کیے جاتے ہیں۔

(۱) مولانا جلال الدین رومی (۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۳ء) - ان کے والد بلخ کے ایک ترک تھے اور ان کی والدہ خوارزم کے شاہی خاندان کی ایک رکن تھیں۔ یہ اپنے والد کے ساتھ اناطولیہ آئے تھے اور اپنے عہدِ جوانی میں قونیہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور عالم مثنوی فارسی میں لکھی تھی۔ ان کی اس تصنیف سے مشرقی ممالک بہت متاثر ہوئے۔ ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی زندگی پر آج بھی یہ مثنوی اپنا اثر ڈال رہی ہے لیکن ترکی ذہن پر اس کا جو اثر پڑا وہ اور بھی زیادہ تھا۔ یہ ان کے ذہن پر چھ سو سال سے برابر حاوی ہے اور صوفیا کے جو سلسلے اس سے چلے[۱] (جو اب معدوم ہو گئے ہیں) ترکی کے بہترین شاعر اور ماہران موسیقی انھیں میں سے پیدا ہوئے۔ کچھ غالباً اس وجہ سے کہ فارسی سرکاری زبان تھی اور کچھ اس لئے کہ مولانا جلال الدین رومی کو ایرانی فلسفہ سے بڑی محبت تھی، انھوں نے اپنی اس عظیم المرتبت تصنیف کو فارسی زبان میں ہی لکھا لیکن وہ ترکی اور عربی زبانوں سے بھی خوب واقف تھے اور ان میں تصنیف و تالیف بھی کر سکتے تھے۔ ان کی فارسی تصنیفوں کے ترجمے اور شرحیں خود ان کے بیٹے نے کی ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے عہد میں اس بات کی ایک عام خواہش پائی جاتی تھی کہ مذہبی علوم کو سادہ ترکی زبان میں منتقل کیا جائے اور عوام میں پھیلایا جائے۔ مولانا کی تصنیف پر ترکی میں جو شرحیں لکھی گئی ہیں وہ بے شمار ہیں اور مثنوی کا ترکی میں جو ترجمہ تحیقی نے کیا ہے وہ ابھی تک بہترین سمجھا جاتا ہے۔

باایں ہمہ اپنے عہد میں مولانا کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ صرف خواص کے لئے لکھتے ہیں اور ان کی تعلیمات کے متعلق خیال تھا کہ ان کا خطاب عوام سے ہے مگر ان کی بین الاقوامیت نسل و مذہب کے حدود کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ان کا قول ہے "شاعر، ساقی اور شراب کو میں عالم مستی میں ایک ہی سمجھتا ہوں۔ میں وحدت کی مہر اسلام اور کفر دونوں پر لگاتا ہوں۔" حقیقت یہ ہے کہ اپنی تعلیمات میں انھوں نے کل انسانیت

---

[۱] ان کے سلسلۂ تصوف سے جو لوگ وابستہ تھے انھیں ترکی میں "مولوی" اور یورپ میں "رقصاں درویش" کہتے تھے۔

روحدت کی مہذب کردی۔ علاوہ ازیں اپنی صلح جوئی اور امن پسندی میں وہ کسی قسم کی پابندی گوارا نہ کرتے تھے۔ انھیں کسی ایسے جھگڑے سے جو آدمیوں کے درمیان تفرقہ ڈالے کبھی کوئی ہمدردی نہ ہوتی تھی اور ان کی فہم ان کے سمجھنے سے قاصر رہتی تھی۔ اس لئے ان کے فلسفہ سے انفرادی طور پر چاہے جس قدر بھی روحانی، خیالی اور جمالی تسکین کیوں نہ حاصل ہوتی ہو لیکن اس عہد کی منتشر اور غیر منظم معاشرت کی کوئی تنظیم بڑے پیمانہ پر نہ ہو سکتی تھی۔

(۲) محی الدین عربی (۱۱۶۲ء تا ۱۲۴۰ء) اس عہد کے دوسرے صوفی تھے جنھوں نے اناطولیہ میں تصوف کے خیالات کو پھیلایا۔ یہ اشبیلیہ کے رہنے والے تھے۔ اسپین پر جب حملہ ہوا اور مسلمانوں پر ظلم کئے جانے لگے اس وقت انھوں نے اپنا ملک چھوڑ دیا اور اناطولیہ میں آکر پناہ لی۔ ابتدا میں انھوں نے قونیہ میں سکونت اختیار کی اور وہاں ایک ترکی بیوہ سے شادی کی لیکن بعد کو وہ دمشق چلے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے فلسفہ کے متعدد پہلو ہیں اور ان کی تصانیف کے بیشتر حصہ میں پیشین گوئی کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ ان کے سوتیلے ترکی فرزند 'صدر الدین قونوی' نے ان کی تصانیف کے ترجمے اور شرحیں لکھیں اور ان کے خیالات کی اشاعت کی۔ ضیا حلمی اپنی تصنیف "ترکی خیالات کی تاریخ" میں ان کا شمار بھی ان لوگوں میں کرتا ہے جنھوں نے ترکی تصوف پر بہت اثر ڈالا ہے۔ لیکن عوام میں جس تصوف کو قبولیت حاصل ہوئی اور جس سے اس عہد کی معاشری، معاشی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صوفیوں کے حلقے پیدا ہوئے اس کا مبدا اور مرجع دراصل خواجہ احمد یوسفی ہیں۔

(۳) خواجہ احمد یوسفی سمرقند اور بخارا کے قرب وجوار میں پیدا اور فوت ہوئے۔ وہ کبھی اناطولیہ نہیں آئے۔ ان کی تعلیمات کو ان کے مرید تیرھویں صدی میں اناطولیہ لائے اور ان کی ایک وسیع رقبے میں اشاعت ہوئی۔ ان کی خاص تصنیف دیوان حکمت ہے۔ اگرچہ یہ دیوان پورا ان کا لکھا ہوا نہیں ہے لیکن اس کا اثر بہت گہرا اور وسیع ہے۔ یہ ترکی میں لکھتے تھے اور ان کی تعلیمات میں مابعد الطبیعیات کی کوئی پیچیدگی یا ایرانی تصوف کی موضوعیت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک مذہب اعمال اور کردار کا نام ہے۔ ان کے اور ان کے مریدوں کی تعلیم سے تمام اناطولیہ میں باعمل صوفیوں کے حلقے پیدا ہو گئے جن

میں بیک تاشی اور اخی حلقے بھی شامل تھے۔ اخیوں کا سلسلہ بیک تاشیوں کے سلسلے سے بعض باتوں میں مشابہ تھا۔ کم سے کم کپرولوزادے فواد کا یہی خیال ہے جو اپنی تصنیف "ترکی ادب کے ابتدائی صوفیا" میں اس بات پر خاص زور دیتے ہیں۔

ان صوفیوں کے حلقے میں ہر طبقہ کے لوگ شہزادے، سپاہی، تاجر سب ہی شامل ہوتے تھے۔ چونکہ اخیوں کو ارباب فتوت بھی کہا جاتا ہے اس لئے اس کے معاشی پہلو پر بحث کرنے سے پہلے جو غالباً اس کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت ہے یہ مناسب ہوگا کہ اس اصطلاح کا مفہوم تبلا دیا جائے۔

"فتوت" کے معنی ہیں اسلامی جذبہ شجاعت وجانبازی۔ اس کی ابتدا ان دو عظیم شخصیتوں سے ہوتی ہے جو دونوں عہد رسالت میں موجود تھیں یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت علی۔ بصورت مجموعی حضرت علی کا اقتدار زیادہ تھا۔ اس کا کچھ سبب تو یہ تھا کہ جاں بازوں کے تمام خراج مثلاً اژدہوں کا مارنا، کمزوروں کی حمایت کرنا وغیرہ وغیرہ خصوصیت کے ساتھ ان کے ساتھ ہی منسوب کیے جاتے تھے اور کچھ اس لئے کہ رسول اللہ نے ان کے متعلق کہا تھا کہ "لا فتیٰ الا علی۔ لا سیف الا ذوالفقار" یعنی علی کے مقابلہ کا کوئی جانباز نہیں ہے اور ذوالفقار کے ٹکر کی کوئی تلوار نہیں ہے۔" بغداد کے خلیفاؤں کے زمانہ میں فتوت نے عجیب عجیب شکلیں اختیار کرلی تھیں لیکن اناطولیہ میں ان کی شجاعت اور جانبازی ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ مشرق قریب کے مسلمان جانباز صلیبی افواج کے نائٹوں (عیسائی جانبازوں) کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ان میں بعض لوگ بہت مشہور رہتے تھے۔ صلاح الدین ایوبی، رچرڈ شیر دل کا فیاض دشمن (جس نے مغربی ادب اور خصوصیت کے ساتھ والٹر اسکاٹ کے "طلسمان" میں اپنے لیے ایک لازوال نام پیدا کرلیا ہے) ترکوں کے مسلمان جانبازوں کے لئے ایک نمونہ اور مثال تھا۔ ان لوگوں کا تعلق یا تو کسی نہ کسی زوال پذیر سلجوق ریاست سے ہوتا تھا یا ان جانبازوں سے جو ترکوں اور ترکمانوں اور خصوصیت کے ساتھ عثمانی قبائل کے ساتھ اناطولیہ میں آتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عثمانی سلطنت کا بانی عثمان خود بھی ایک اخی تھا اور جب وہ سلطان ہوا تو ایک مشہور اخی ہی نے تلوار کا پٹکا اس کی کمر سے باندھا تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام تاریخی مواد سے یہ بات ثابت ہے کہ حلقہ اخی کے فوجی اور جانباز عنصر کا سلطنت عثمانیہ کے قیام میں بہت بڑا حصہ ہے۔ "خونی خراج" کے نظام (یعنی عیسائی نوجوانوں کو فوج میں

بھرتی کرنے کے طریقہ) سے پہلے ینی چری، اخی اور بکتاشی ہی ہوا کرتے تھے۔ سپاہی اور سوار جو اناطولیہ کے ترک زمینداروں پر مشتمل ہوتے تھے سب سلسلہ اخی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ کا امتیازی نشان ایک خاص قسم کی شلوار (پاجامہ) ہوتی تھی۔

مگر اس کے برعکس یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ ان حلقوں کے لڑنے والے عناصر کو جذب کرنے کے بعد عثمانیہ حکومت نے اس کے سیاسی اقتدار کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ گو جہاں کہیں مرکزی حکومت کمزور ہوتی تھی اخی یا ارباب فتوت حکومت کیا کرتے تھے۔ انقرہ اور کرشیشر میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی تھی۔ جب عثمانیوں نے چودھویں صدی کے وسط میں انقرہ کو فتح کیا تو وسط اناطولیہ میں حلقہ اخی کی سیاسی اہمیت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے یہ لوگ اپنی معاشی قوت اور تنظیم کی بنا پر اٹھارویں صدی تک با اثر رہے بلکہ ان کی تجارتی انجمنیں جنگ عظیم کے آخری ایام تک باقی رہیں اگرچہ مغربی تجارتی طریقوں اور مشین کی بنی ہوئی اشیأ کے رواج سے ان کی حالت بہت زیادہ مائل بہ زوال ہو گئی تھی۔

چونکہ حلقہ ہائے اخی کا طویل ترین اور موثر ترین رخ ان کا معاشی رخ ہے۔ اس لئے ہمیں ان کا سراغ تیرھویں صدی تک جب اخی اور ارباب فتوت کا آغاز ہوا تھا لگانا چاہئے۔ اپنی کتاب "ترکی خیالات کی تاریخ" میں ضیا رعلمی خیالات کے اس رخ کو "تنظیمی تصوف" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

معاشی تنظیم کی ابتدا اخی ایوران سے ہوئی جو انھی برادریوں میں سے ایک کے رکن تھے اور ان کا پیشہ چمڑا رنگنا تھا انھوں نے چمڑا رنگنے والوں کی انجمن قائم کی اور خود اس کے پیر و مرشد بن گئے۔ دوسرے پیشے والوں نے بھی یکے بعد دیگرے ایوران کی انجمن کے نمونہ پر انجمنیں بنانا شروع کیں لیکن گذشتہ تمام صدیوں میں چمڑا رنگنے والوں کی انجمن کو برابر بزرگی و برتری حاصل رہی۔ یہ انجمنیں تمام اناطولیہ میں پھیلی ہوئی تھیں اور سترھویں صدی میں اولیا چلیبی نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ استنبول کے پیشوں کی تنظیم بھی اسی قاعدے کے ماتحت ہوئی تھی۔ سترھویں صدی تک اخی ایوران کی کرامات اور خرق عادات کے بہت سے افسانے زبان زد خلائق ہو گئے تھے۔ ان کا مقبرہ اگرچہ حقیقتاً کرشیشر میں تھا لیکن اس کے متعلق اناطولیہ کے متعدد شہر دعوے کرنے لگے تھے اور اخی ایوران مستقل طور پر ایک زبردست جانباز، پیر، شہید اور اس پیشہ کے

تنظیم دیے والے بن چکے تھے اور ان سے اژدہوں کے مارنے اور دوسری ان صفات کو جن کا الہی ذات میں اجتماع ضروری ہے منسوب کی جانے لگی تھیں۔

چودھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ[ا] کے تعلقات اخی کے حلقوں سے بہت گہرے تھے اور وہ ان کے طریقۂ زندگی کے متعلق بہت مفصل اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ ابن بطوطہ کے ورود کے وقت تک ان حلقوں میں معاشی خصوصیت کے ساتھ ساتھ جانبازی کی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ ان شہروں کے رواج کے مطابق جب کوئی سلطان نہ ہوتا تھا تو اخی حکمراں کے فرائض انجام دینے لگتا تھا۔ ابن بطوطہ کے قول کے مطابق "اس کا حکومت کا اقتدار، سزا کا حق اور شان وجلوس بادشاہوں سے کم نہیں ہوتا تھا"۔ علاوہ ازیں وہ اس بات کو بھی وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ ہر قسم کے ناجائز مطالبات کے خلاف جدوجہد کرتے تھے اور کس طرح نیچے سے چوری ڈکیتی اور اوپر سے ظلم وتعدی کا انسداد کرتے تھے۔ ابن بطوطہ کو اس قسم کی انجمنیں ہر جگہ شہر و دیہات میں جہاں جہاں ترکمان آباد تھے موجود ملیں۔ وہ انھیں تمام پیشوں اور حرفوں کے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ نوجوانوں کی انجمنیں کہتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ معاشی اور جانبازوں کی انجمنوں کے سردار کو اخی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کے مشترکہ دسترخوان، مشترکہ کام اور اجتماعی زندگی کو وہ نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برادریاں گلڈ سوشلزم دحزب العمال کی اشتراکیت کی ایک مکمل مثال تھیں۔

ابن بطوطہ کے بیان کے علاوہ ہمیں اخی یحییٰ بن خلیل کی تصنیف میں ان انجمنوں کا ایک نہایت

[ا] ابن بطوطہ کو اخی کے حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل تھی۔ شہر مدوک میں اخی سنان اور اخی نومان کے پیروؤں کو اس عرب سیاح کی ضیافت کے لئے قرعہ اندازی کرنا پڑی۔ عید دبیرم، کا دن تھا ابن بطوطہ کہتا ہے کہ "میں عید گاہ گیا۔ جس طرح سلطان اپنی افواج کے ہمراہ آتا ہے اسی طرح اخی کے حلقے بھی مسلح ہو کر آتے ہیں۔ ہر تجارتی انجمن کا ایک ڈھول، بگل اور جھنڈا ہوتا ہے اور ان میں اپنے پیرووں کی ظاہری زینت اور اسلحہ کی تکمیل کے لئے باہم مقابلہ ہوتا ہے"۔

سیر حاصل بیان ملتا ہے۔[1]

ان کی زندگی کے مکمل مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اخیوں کی یہ انجمنیں صحیح معنی میں ایک جمہوریت قائم کرنا چاہتی تھیں۔ یہ جمہوریت موجودہ عہد کی جمہوریت نہ تھی جس میں دیوانہ وار مسابقت اور انفرادی خودغرضی کا دور دورہ نظر آتا ہے بلکہ ایک ایسی جمہوریت تھی جس میں قناعت منصفانہ تقسیم دولت اور جماعت کی بہبودی کو سب سے زیادہ مقدم سمجھا جاتا ہے۔ حلقۂ اخی کا ایک سخت قانون یہ تھا کہ ان کی انجمن کا ہر آدمی اپنی ذاتی کوشش سے بنا ہو۔ اگر کسی کو اپنے نسب پر ناز ہو تو وہ اس دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان کا قول تھا "خواہ انسان پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اگر وہ جوہر ذاتی نہیں رکھتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔"

ان کے نزدیک سات کا عدد متبرک سمجھا جاتا تھا۔ جب کوئی امیدوار کسی انجمن میں شریک ہوتا تھا تو اسے داخلہ کی تقریب کے موقع پر سات قسمیں اس بات کی کھانا پڑتی تھیں کہ وہ سات نیکیوں پر عمل کرے گا اور سات برائیوں سے بچے گا۔ ان کے استعارے میں اسے سات دروازے کھولنا اور سات بند کرنا پڑتے تھے :-

(۱) بخل کا دروازہ بند کرنا اور سخاوت کا دروازہ کھولنا۔

(۲) ظلم و جور کا دروازہ بند کرنا اور لطف و کرم کا دروازہ کھولنا۔

(۳) حب جاہ کا دروازہ بند کرنا اور قناعت کا دروازہ کھولنا۔

---

[1] فتوت نامہ۔ ۱۰۹۔ واہج کتب خانہ۔ اخی کے حلقوں نے جو تصانیف چھوڑی ہیں انھیں فتوت نامہ کہتے ہیں۔ اس خاص فتوت نامہ کا مصنف جو ترکی زبان میں سب سے زیادہ قدیم ہے (ابن بطوطہ سے بھی ربع صدی پہلے کا) کہتا ہے: "میں اپنی نوجوانی میں پڑھا لکھا نہیں جانتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ اخی کی انجمن کاہل ہوتی جا رہی ہیں اور انھیں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا ہے کہ وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (ہم نے جتنے رسول بھیجے وہ سب اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرتے تھے) میں نے بھی اہل فتوت کو ان ہی کی زبان میں تعلیم دینی چاہیے۔ میں نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور کئی کتابیں پڑھ لیں اور اب میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں۔"

(۴) عیش کا دروازہ بند کرنا اور زہد و ریاضت کا دروازہ کھولنا۔

(۵) تالیف قلوب کا دروازہ بند کرنا اور عدل کا دروازہ کھولنا۔

(۶) "ہرزہ و ہذیان" کا دروازہ بند کرنا اور علم و حکمت کا دروازہ کھولنا۔

(۷) جھوٹ کا دروازہ بند کرنا اور سچ کا دروازہ کھولنا۔

جو لوگ اخی کے حلقے میں شامل نہیں کئے جاتے تھے ان کی فہرست حسب ذیل تھی:-

دروغ گو، غیر مومن، نجومی، بھاٹ، جراح، قصائی، محصل اور سود خوار۔

ہر انجمن کی عاملہ کے سات ارکان ہوتے تھے اور ان کے کاروبار میں جمہوریت اور مساوات کے اصول پر عمل کیا جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی اوصاف کی بنیاد پر فرق مراتب بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا اور درجہ بدرجہ حق حکومت تسلیم کیا جاتا تھا۔

ان انجمنوں میں جو نام رائج تھے وہ تجارت اور تفریح کی اصطلاحوں میں داخل ہو گئے تھے جو آج تک باقی ہیں۔ گارڈلیوسکیج[1] کا قول ہے کہ ان برادریوں کی بنیاد کاریگروں پر رکھی گئی تھی۔ اگرچہ ان کا سیاسی اقتدار عثمانی سلطنت کے قیام کے بعد کم ہو گیا تھا لیکن صنعت کی انجمنوں کی حیثیت سے انھوں نے اپنی اہمیت اور مشاغل کو باقی رکھا تھا۔

انجمن کا پہلا درجہ امیدوار کا ہوتا تھا۔ ایک نوجوان یا تو خود کسی انجمن میں شریک ہوتا تھا یا اس کے والدین امیدوار کی حیثیت سے اس کا داخلہ کراتے تھے۔ ایک ہزار ایک دن تک اسے کسی استاد کے ماتحت تربیت حاصل کرنا پڑتی تھی جس کے بعد اس کی امیدواری کا زمانہ ختم ہو جاتا تھا۔

اسی اثنا میں اس کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم زاویا (مذہبی مرکز) میں دو اخوان طریقت (یول کردشی)

Gordlevskij : "Les derviches de L'Ordre D'Ahi-Al evran et les corps de metier en Turquie." Bulletin de L'Academie des sciences de l'U.R.S.S. 1927 P.1172.

اور ایک پیرِ طریقت (یول آتاسی) کی نگرانی میں ہوتی رہتی تھی۔ امیدوار کو مزدوری نہیں ملتی تھی لیکن اس کا استاد اسے وظیفہ دیتا تھا جسے وہ اس دعوت کے لئے جمع کرتا رہتا تھا جس میں اس کا درجہ بڑھا کر استاد کر دیا جاتا تھا۔

امیدواری کا زمانہ ختم کرنے کے بعد اسے چھ مہینہ تک رفیقِ طریقت (جس کا نام کلفہ تھا) کے درجے میں رہنا پڑتا تھا بزرگوں کی پسندیدگی حاصل کرنے کے لئے اسے کوئی خاص کام کرنا پڑتا تھا۔ اگر بیہ کی اہلیت کے اس امتحان کا نتیجہ تسلی بخش ہوتا تھا تو اسے استاد کا خطاب دے دیا جاتا تھا اور دستارِ فضیلت باندھ دی جاتی تھی۔ اس کی انجمن کے بزرگ اس کے لئے اتنا سرمایہ فراہم کر دیتے تھے جو ذاتی طور پر کام شروع کرنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ درجہ بدرجہ ترقی کی ہر منزل پر ایک مذہبی تقریب منائی جاتی تھی۔

ہر انجمن کی جماعتِ عاملہ کی صدارت تاجروں کا سردار (اضاف باشی) کرتا تھا۔ صرف چمڑا رنگنے والوں کی انجمن کے سردار کو اخی بابا (اخیوں کا باپ) کہا جاتا تھا۔ اس کا حلقۂ اقتدار چمڑا رنگنے والوں تک محدود نہ ہوتا تھا بلکہ دو انجمنوں میں جتنے اختلافات ہوتے تھے ان میں حکم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کا قول تمام انجمنوں کے لئے قانون کا مرتبہ رکھتا تھا۔ وہ عموماً ان استادوں میں سے منتخب کیا جاتا تھا جن کے سامنے تین استادوں کی دستار بندی کی رسم ادا ہو چکی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ اس کی پاکبازی، وجاہت اور نیکی کی تمام انجمن معترف ہو۔ ہر دو ہفتہ کے بعد مجلس جمع ہوتی تھی۔ ہر انجمن آزادی سے اپنے معاشری بیت المال کی رقوم اور قہوہ کے مشترکہ ذخیرہ کو خرچ کر سکتی تھی۔ ہر جلسہ میں معاملات و مسائل کے متعلق فیصلے کیے جاتے تھے جن میں سزا کے فیصلے بھی شامل ہوتے تھے۔ مجلس کو چونکہ اپنی کام کی اعلیٰ نوعیت کا بہت پاس تھا اس لئے ہر ایسے کاریگر کو سزا دی جاتی تھی جو پیدائش اشیار کے معیار کو پست کرتا تھا۔ اس کی دوکان عارضی طور پر بند کر دی جاتی تھی اور اس کا خراب کام اس کے دروازے پر لٹکا دیا جاتا تھا اور وہ انجمن کی رکنیت سے بھی خارج کر دیا جاتا تھا۔ ترابیزانڈ میں اس تعزیری کارروائی کو افورِ زیعنی برادری سے اخراج کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

انجمن سال میں ایک مرتبہ کسی مقام پر ایک عام جلسہ کا بھی انتظام کرتی تھی جو تفریحی جلسہ (تفرج) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس میں تمام اختلافات دوستانہ طریقہ پر طے کر دیے جاتے تھے۔

مشین کی بنی ہوئی اشیاء کے سیلاب نے ترکی بازاروں پر قبضہ کرلیا اور ترکی حکومت نے تمام معاشی اداروں کو اپنی نگرانی میں لیلینے کا تہیہ کرلیا اور دستی صنعتیں ختم ہوگئیں تو ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ عظیم کے بعد ان انجمنوں میں سے جو انجمنیں آخری سانس توڑ رہی تھیں وہ بھی ختم ہوگئیں۔

ماخذ

(۱) م جودت ۔ اخی پر مختلف مضامین ۔ یوک مجموعہ استنبول ۱۹۱۰ (ترکی میں)

(۲) م جودت ۔ ذیل علی فصل الاخیۃ الفتیان الترکیۃ فی کتاب الرحلۃ لابن بطوطہ استنبول ۱۹۳۲ (عربی میں)

(۳) فواد کوپرولو ترکی ادب میں ابتدائی صوفیا استنبول ۱۹۱۹ (ترکی میں)

(۴) فواد کوپرولو عثمانی سلطنت کی بنیاد ترکیات مجموعاسی میں مضمون۔

Franz Taescher – "Die Futuwwa Bunde in der Turkie und ihre Literatur." Der Islam Vol. II. Fasc 3 (۵)

Franz Taescher – " Das Futuwwetname in Gulschehris Altosmanisches Baerbeitung." (۶)

Zia Hilmi – " History of Turkish Thought," (Turk Teffekur Tarihi) in two Volumes Istanbul 1933. (۷)

Georges Vajda – "Les corps de Metier en Turquie, d'apres deux publications de V Gordlevskij " (Revue des Etudes Islamiques 1934. (۸)

Franz Taescher – " Beitrage Zur Geschihte der Achis in Anatolien." Der Islam . Vol IV (۹)

روسی مسلمانوں کا ادب[1]

اگست ۱۹۳۴ء میں روس کی اشتراکی وفاقی ریاستوں کی ایک ادبی کانفرنس ماسکو میں منعقد ہوئی جس میں یورپ کے بعض ممتاز ادیب بھی بلائے گئے تھے۔ یورپ کے ادبی حلقوں میں اس کانفرنس کے سلسلے میں بہت چہ می گوئیاں ہوئیں، کیونکہ ادبی تخلیق ایک انفرادی چیز ہے، اور ایسی اشتراکی ریاست میں جو مطلق اقتدارات رکھنے کا دعوے کرتی ہو، اپنی مصلحت کے مقابلے میں کسی اور معیار کو نہ مانتی ہو اور عقیدے اور عمل میں یکرنگی اور تقلید پر سختی سے اصرار کرتی ہو انفرادیت کا وجود ہی ممکن نہیں۔ اس کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا کہ روس میں انسانی سرشت کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جارہی ہے، اور اس نئے انسان کے لئے نئے ادبی اسالیب اور نئے نصب العین پیدا کئے جارہے ہیں، اب روس میں ایک ادب کی بنا ڈالی گئی ہے جس کا ظاہر قومی اور باطن اشتراکی ہے۔ ایک مشہور فرانسیسی ادیب کی رائے تھی کہ اب "اشتراکی انفرادیت کا" دور دورہ ہوگا۔

لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے بہت دور ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم ان رودادوں اور مضامین پر غور کریں جو روس کی مسلمان آبادیوں کے نمائندوں نے پڑھے۔ یہ معاملے کی بات ہے۔ اس سے ہمیں پتہ چلے گا کہ روسی مسلمانوں کے ادب کی نشوونما کس ڈھنگ پر ہورہی ہے، ان کے ممتاز ادیب کون ہیں اور ان کی تصانیف کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ہم پہلے اس مسئلے کے خالص لسانی پہلو پر نظر ڈال لیں اور یہ دیکھیں کہ نئے خیالات اور تصورات کو ادا کرنے کے لئے کیا تدبیریں کی گئی ہیں تو ہمیں صحیح اندازہ لگانے میں بہت آسانی ہوگی۔

پچھلے سال لینن گراد سے مضامین کا ایک مجموعہ جس کا عنوان "زبان اور ذہنیت" ہے، شائع ہوا۔

---

[1] ماخوذ از رسالہ " REVUE DES ETUDES ISLAMIQUES

اس میں بوروکوف کا ایک مضمون "ازبکوں کی ادبی زبان" ہے۔ مصنف نے بحث اس اصول پر مبنی کی ہے کہ ادبی زبان کا معیار قائم کرنے کی کوشش دراصل ایسے تصورات کی باہمی جنگ ہے جو قومی یا ملکی تہذیب پر حاوی ہونا چاہتے ہیں۔ ہم ادبی زبان کو ایک مصنوعی چیز نہیں ٹھہرا سکتے۔ وہ بول چال کی زبان کی ایسی شکل ہے جو قواعد کے ذریعے سے منضبط کی گئی ہو۔ اور انھیں قواعد کی سختی اور پیچیدگی ادبی اور بول چال کی زبان کے درمیان تفاوت پیدا کر دیتی ہے۔ ازبکستان کی اب تک کوئی عام ادبی زبان نہیں تھی۔ اب اس کے قواعد آہستہ آہستہ بن رہے ہیں۔ لاطینی خط اختیار کر لیا گیا ہے، اور یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس میں ان تمام حروف علت کے لئے علامتیں مقرر کر لی جائیں۔ اسی بنا پر نوئے حروف علت کا اضافہ کیا گیا۔ لیکن پھر یہ طے پایا کہ مختلف ازبک بولیوں میں مفاہمت کی گنجائش نہیں اور اگر ہر صوت کے لئے ایک علامت رکھی گئی تو ابجد بہت پیچیدہ ہو جائے گی۔ اب آخری فیصلہ یہ ہوا ہے کہ صرف پانچ چھ حروف علت رکھے جائیں۔ اصطلاحات وضع کرنے کا کام ابھی شروع ہی کیا گیا ہے۔

بوروکوف کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ازبک یا کسی اور زبان کو جس کی نشو و نما معاشرتی حالات کے پہلو بہ پہلو نہ ہوئی ہو نئے خیالات کا حامل بنانے میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کے قواعد زبردستی گھڑے ہوئے ہوتے ہیں، اصطلاحیں معین نہیں ہوتی ہیں۔ ازبک زبان کے ساتھ ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ خط بدل دیا گیا ہے۔ فی الحال ہم کسی اعتبار سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ازبک ادیبوں کا کام سہولت سے چل رہا ہے یا ان کی زبان خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ کمی اشتراکی تعلیم کے مبلغ خود بھی محسوس کر رہے ہیں، اور اس کو طرح طرح سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُردو زبان میں نئے سیاسی اور معاشی نظام کے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب کے آخر میں ایک فرہنگ ہوتی ہے جس میں اصطلاحات کی توضیح کی جاتی ہے۔ لیکن اس تدبیر سے مشکل حل نہیں ہو جاتی۔

بوروکوف نے اسی مضمون میں آگے چل کر بتایا ہے کہ تعلیم یافتہ اور مہذب ازبکوں میں ادبی زبان کی نسبت دو طرح کے رجحانات مقابلے پر پائے جاتے ہیں۔ ایک جس کے علم بردار پروفیسر فکرت[۵۷] ہیں، یہ ہے کہ

[۵۷] اس سلسلے میں خالدہ ادیب کی "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" چھٹے باب "تہذیب اور ادب" پر نظر ڈال لینا مفید ہوگا (م)

ازبک ادب کے اس معیار اوران روایات کو زندہ کرنا چاہئیے جو چودھویں اور سولھویں صدیوں کے درمیان چغتائی ادب کی روح رواں تھیں۔ دوسرے خیال کے لوگ چغتائی کو امرا اورجاگیرداروں کی زبان سمجھتے تھے جسے کبھی عمومیت حاصل نہیں ہوئی، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں مختلف بول چال کی زبانوں کو نئے ادب کا سنگ بنیاد بنانا چاہئیے۔ بوروکوف کی رائے میں دونوں فریق غلط راہ پر ہیں۔ چغتائی کے حامی دراصل قومیت، جمہوریت اور ترکوں کے اتحاد کے نصب العین کو اس طرح مقبول عام کرنا چاہتے ہیں، اور یہ نصب العین صرف مردہ اور خیالی نہیں ہے بلکہ اشتراکی انقلاب کے مسلک کے خلاف ہے۔ مقامی زبانوں کے حامی خیالی گھوڑے تو نہیں دوڑاتے، مگر وہ ازبک زبان کی نشوونما کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں۔ ازبک زبان پر غور کرتے وقت اس کی تاریخ اور اس کی نشوونما کے دوروں کا یکساں لحاظ رکھنا چاہئیے، اور خاص ادبی تصانیف کے ساتھ سرکاری، عدالتی اور انتظامی احکامات کی لسانی حیثیت کا بھی مطالعہ کرنا چاہئیے۔ یہ کام ابھی تک نہیں ہوا ہے۔

ازبک زبان کی تاریخ کو بوروکوف کے مطابق ہم دراصل دو بڑے حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں، ایک انقلاب سے پہلے اور ایک اس کے بعد کا۔ چغتائی سے اس کا رشتہ جوڑنا مشکل ہے، کیونکہ چغتائی زبان کا ارتقا بالکل مختلف تاریخی حالات میں ہوا۔ جاگیرداری کے زمانے میں یہیں ہمیں ایسی جماعتیں ملتی ہیں جن کی معاشی زندگی حدود اور باقی دنیا سے علیحدہ تھی، اور وہ سب اپنی مقامی بولیاں بولتی تھیں۔ اوپر کے طبقے میں ہمیں اشراف کی ادبی زبان ملتی ہے، جس کا محرک مذہب تھا۔ یہ بالکل ہی کا قصہ ہے کہ ایک تاجروں کا طبقہ پیدا ہوا جس نے ایک قومی زبان کے ڈول ڈالے لیکن اگر سرمایہ داروں نے نئی زبان کی تحریک شروع کی تو انھوں نے اسے بالکل اپنے مقاصد کے لئے وقف بھی کردیا۔ یہ مختلف اسباب اور محرک اس طرح ایک دوسرے پر اثر ڈالتے اور مل کر نئی شکلیں اختیار کرتے رہے کہ ہم ازبک زبان کی تاریخ کا ایک سلجھا ہوا سلسلہ قائم نہیں کرسکتے۔ یہ بات تو قطعی اور یقینی ہے کہ اس وقت کی ازبک زبان پرولتاری انقلاب کی پیداوار ہے اور اسے چغتائی سے کوئی نسبت نہیں (بوروکوف یہاں پر یہ تو بیان کرتا ہے کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء تک اس کی ہر جگہ بہت کوشش کی گئی کہ تمام روسی مسلمانوں کی ایک متحدہ ترکی زبان ہو جائے، اور اسمٰعیل بک گسپرلی کے اخبار "ترجمان" اور سمرقند کے اخبار "آئینہ" نے اس مقصد کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا، مگر وہ یہ نہیں بتاتا ہے کہ اس تحریک کا

اشتراکی انقلاب کے بعد کی ادبی جدو جہد پر کیسا اثر پڑا۔)

انقلاب سے پہلے ازبک عربی حروف میں لکھی جاتی تھی، اور اس کے صرف و نحو قدیم اصول پر تھے۔ اس کا رخ اناتولیہ کے ترکوں کی طرف تھا، اگرچہ اس پر روسی زبان کے قواعد کا خفیف سا اثر معلوم ہوتا ہے۔ انقلاب کے بعد نئے اسالیب وجود میں آئے، خاص طور پر ایک نئی نثر، جو بالکل روسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے، کیونکہ اس کا خاص سرمایہ روسی ادب اور اشتراکی تعلیم کے شاہکاروں کے ترجمے ہیں۔ ازبک کے قواعد صرف و نحو بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں، اس لئے کہ نئے حالات کی وجہ سے ڈھیروں الفاظ دوسری زبانوں سے لیا پڑے ہیں جدید SYNTAX کی اصطلاحی پشت و پناہ لاطینی حروف اور اوقاف ہیں۔ ہم نئی انشا پردازی کی عجیب عجیب مثالیں دے سکتے ہیں، لیکن یہاں لینن کے ایک جملہ کے ازبک ترجمے پر اکتفا کریں گے۔ ناظرین خود ہی دیکھ لیں گے کہ ترجمہ اور اصل میں کتنا فرق ہے۔

"اگر کسی ایک ملک میں سرمایہ دار شکست کھا جائیں — اور یہ آپ سمجھئے ایک مثالی نمونہ ہے۔ کیونکہ کئی ملکوں میں ایک ساتھ انقلاب ہونا ایک بالکل نادر واقعہ ہوگا۔ تو اس کے باوجود وہ مزدوروں سے کم طاقت ور نہ ہو جائیں گے۔"

یہ جملہ لینن کا تھا۔ اس کا ازبک میں یوں ترجمہ کیا گیا ہے:۔

"اگر سرمایہ دار صرف کسی ایک ملک میں دیکھیں کہ وہ شکست کھا گئے ہیں، تو جہاں تک اس (ملک) کا تعلق ہے، یہ ایک مثالی نمونہ ہوگا۔ کئی ملکوں میں انقلاب کا ایک ساتھ نمودار ہونا ایسا واقعہ ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اس وقت سے وہ (یعنی سرمایہ دار) حسب سابق ان لوگوں سے زیادہ طاقت ور رہیں گے جو سرمایہ داروں کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔"

لیکن ان سب باتوں کے باوجود بوروکوف صاحب بزبان کومریڈ ستالن فرماتے ہیں:۔

"قومیں اب سرمایہ داری کے زیر سایہ نہیں بلکہ سوویٹ کی سرپرستی میں نشوونما پا رہی ہیں اور مستحکم ہو رہی ہیں۔ اپنا کام جاری رکھو، تاریخی نظیریں نہ ہوں تب بھی کام جاری رکھو!"

اب ہم کانگریس کی روداد پیش کرتے ہیں، اور یہ دیکھیں گے کہ ازبکوں کے ادبی ارتقا کا رنگ ڈھنگ کیا ہے۔

ازبکستان کا ادب

کومریڈ مجیدی، ازبکستان کے انشا پردازوں کے اتحاد کے صدر کی رپورٹ

(۱) سرمایہ داروں کی قومیت کے خلاف جنگ

ازبکستان نے صنعت اور زراعت میں جو ترقی کی ہے اس کا ملک کی تہذیبی نشوونما پر بہت مفید اثر پڑا کہ اس وقت آبادی میں ۲ء۵ فی صدی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ پانچ سال کا جو پروگرام بنایا گیا تھا اس کے سلسلے میں ثانوی تعلیم پانے والوں کی تعداد ۲۵۰۰۰ ر۲۳ سے بڑھ کر ۲۰۰۰۰ ر۵ اور اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی ۱۱۴ سے ۶۰۰۰ ہوگئی ہے۔ انقلاب کے بعد ہماری جمہوریہ کو جو فروغ ہوا ہے اس سے ہماری تہذیب کے اہم اجزا خصوصاً سوویٹ (یعنی اشتراکیت سے) ادب کو نئی قوت پرواز حاصل ہوئی ہے۔

اس میں شک نہیں اشتراکی اور پرولتاری ادب کے نقطۂ نظر سے وہی دور شمار میں آتا ہے جو اکتوبر ۱۹۱۷ کے بعد شروع ہوا۔ ازبکستان کے مزدوروں کو جنگ عظیم سے پہلے کے دور کی جو ادبی دولت ورثے میں ملی وہ بہت ہی حقیر تھی۔ اس مسئلے پر بہت وقت ضایع نہ کرنا چاہیے۔ ہم اس گروہ کی جو "جدید" کہلاتا ہے، ادبی کارگذاری کی ایک مختصر سی تشریح کئے دیتے ہیں، کیونکہ یہی ایک حلقہ ہے جس کی تصانیف ہمارے ملک کی ادبی زندگی پر اپنا نقش چھوڑ گئی ہیں، اگرچہ انھیں نے ان لوگوں کو جو پرولتاری اور اشتراکی ادب کے مخالف تھے لڑنے کے لئے ہتھیار بھی بہم پہنچائے۔

زار کی حکومت نے جب ازبکستان فتح کیا تو یہاں سرمایہ دار تاجروں اور کارخانہ داروں کا ایک طبقہ پیدا ہوا، جس نے بہت فروغ پایا، اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے جو روسی سرمایہ دار اور دوسرے ملکوں کے تاجران کے رستے میں ڈالتے تھے اُنھوں نے قومیت کا یہ نظریہ پیش کیا کہ اپنے ملک کی منڈیوں پر ہمارا قبضہ ہونا چاہیے۔ اسی زمانے سے ایک ذہنی اور معاشرتی تحریک شروع ہوئی جو ان سرمایہ داروں کے رجحانات اور حوصلوں کو صحیح طور پر ظاہر کرتی ہے۔ وہ گروہ جو "جدید" کہلاتا ہے عمل اور تصورات کے اعتبار سے اس تحریک کی نمائندگی کرتا تھا۔ قوم پرستوں نے اس گروہ اور اس تعلیم کو آسمان پر چڑھا دیا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء کے بعد انقلاب کے مخالف سرمایہ دار اور وہ لوگ جو ان کے خیالات کو ظاہر کرتے تھے اپنے عمل اور اپنی تصانیف کے ذریعے سے اسی قومیت کا چرچا کرتے رہے اور معلوم ہوتا تھا کہ پرولتاریہ اور سوویٹ ریاست کے دشمن ہیں۔

ازبکستان کی پہلی ادبی انجمن "چغتائی جماعت" تھی۔ اس کے بیشتر اراکین بورژوا (سرمایہ دار) طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ تھے جو سوویٹ اقتدار کی مخالفت اور ترک اتحاد کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس ادبی تحریک کے خاص عقائد معلوم کرنے کے لئے کافی ہے کہ ہم ان متعدد مضامین پر جو انہیں عقائد کے اثر میں لکھے گئے تھے ایک نظر ڈال لیں، اور ان کی علم نما تحقیقات کو جانچ لیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان، املاء اور ادب کے تمام مسائل پر چغتائی اور ترک اتحاد کے نقطۂ نظر سے غور کیا جانے لگا۔ انقلابی دور کے ابتدائی زمانے میں بھی قوم پرست اور بورژوا انشاپردازوں نے اپنے خیالات کو چھپایا نہیں، بلکہ اس بہانے سے کہ تہذیبی ورثے کے متعلق تحقیق کرنے سے ادبی بحث میں گہرائی پیدا کی جا رہی ہے ان کی تبلیغ کرتے رہے۔ اسی علمی تحقیق کی آڑ لے کر وہ احمد یسوی جیسے صوفی اور اسی قسم کے دوسرے پرولتاری مصنفوں کی نسبت دعوے کرتے ہیں کہ وہ غریبوں کے حامی تھے۔ اگر ہم اس کشمکش پر جو قوم پرستوں نے ان تصورات کی بدولت ۱۹۲۵، ۱۹۲۶ اور ۱۹۲۷ میں پیدا کی ایک نظر ڈالیں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ ان لوگوں کا مقصد گذشتہ زمانے کو ایک عینی شکل دینا ہے۔ دیکھئے توفیق فکرت یسوی کی نسبت کیا کہتا ہے:-

"ہمارے ادب کا بانی یسوی مظلوموں میں سے ایک مظلوم تھا۔ اس نے آہیں بھریں اور آنسو بہائے، کیونکہ مظلوموں کا دکھ اس کا اپنا دکھ تھا۔ یسوی ... اپنے زمانے کے حاکم طبقوں کی ملامت کرتا ہے اور ہم کو چاہیئے کہ اسے اس کا ایک وصف سمجھیں۔ اسی بنا پر ہم اسے ایک غریبوں کا شاعر ٹھہرا سکتے ہیں جس کے کانوں میں درد کی صدا آئی اور اس کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ (غریبوں کے) دشمنوں کی ملامت کرتا ہے اور ان کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔" (رسالہ "تعلیم و معلم"، نمبر ۶، ۱۹۲۷)

ان قوم پرستوں نے جو ادبی ورثے کے سرمائے سے تجارت کرتے، اپنی جد وجہد کو اب تک ختم نہیں کیا ہے۔ علی محمد نامی ایک انشاپرداز فکرت کے اسی خیال کی رسالہ "از ترسلوما" (یعنی "کتاب درانقلاب")

میں حمایت کرتا ہے ۔ چونکہ اس کا ارادہ ہے کہ قومیت پر ازبک ادب کی بنا در کھے، وہ اپنی تاریخ کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایسی نازیبا چالیں بھی چلتا ہے کہ ایرانی اور عرب شاعروں اور عالموں کو کہدے کہ وہ ازبک اور ترک تھے ۔

پرولتاریہ ادب کا ارتقا | غیر ملکی اثرات اور بورژوا انشا پردازوں سے جو کشمکش ہوئی اس سے ازبکستان کے سوویٹ ادب کو فروغ ہوا اور اشتراکی انشا پردازوں نے اپنی تنظیم کرلی ۔ انقلاب کے ابتدائی زمانہ ہی سے، اگرچہ بورژوا انشا پردازوں کا بہت چرچا تھا، چند شاعر جن میں انلیانی، صوفی زادہ، حمزہ، حکیم زادہ وغیرہ ممتاز تھے سوویٹ انقلاب کے متعلق گیت گانے لگے ... اور آہستہ آہستہ اشتراکی انشا پرداز اپنے حریفوں پر حاوی ہوتے گئے ۔ ۱۹۲۳-۲۴ میں پرولتاری ادب کو نئی دولت ملی یعنی غیرتی اور شمسی جیسے نوجوان شاعر نمودار ہوئے ۔ اس وقت جب کہ باسمچی گروہ فساد برپا کر رہے تھے اور بورژوا انشا پرداز علانیہ سوویٹ حکومت کی مخالفت کر رہے تھے، غیرتی کی یہ نظم سننے میں آئی جو اس نے مزدوروں اور کسانوں کے لئے لکھی تھی۔
"کسانوں اور مزدوروں کا اتحاد ہو گیا ہے، انھوں نے عظیم الشان سرخ جھنڈا لہرایا ہے، اپنے ہل اور کاشتکاری کے اوزار چھوڑ کر ایک فوج کی طرح آگے بڑھے ہیں" (ماخوذ از نظم "آج")۔ اس کے بعد جب بورژوا انشا پردازوں نے ازبکستان کے سب سے زرخیز علاقے فرغانہ کی نسبت مشہور کیا کہ وہ بالکل اُجڑ گیا ہے تو غیرتی نے اپنی نظم "فرغانہ" میں ان کو اس طرح سے جواب دیا: "وہ اندھیری راتیں ختم ہو گئی ہیں جب فرغانہ پر ظلم و ستم ڈھایا جا رہا تھا، جب اس کے ایک سرے سے دوسرے تک قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جب اس کا دل غم اور غصے اور تقدیر کی شکایتوں سے بھرا ہوا تھا اور جب وہ معصومانہ انداز سے ہر طرح کا ظلم سہتی تھی۔"

اشتراکیت کی تعمیری کوششوں میں جو کامیابی ہوئی اس کی بدولت پرانے انشا پردازوں میں اور بھی پھوٹ پڑ گئی ہے ۔ اب ان میں بعض ایسے ہیں جو سوویٹ کی حمایت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور سوویٹ کے مسائل اور کارگذاریوں پر مضامین لکھتے ہیں، اگرچہ انھوں نے سوویٹ کا رنگ پوری طرح اختیار نہیں کیا ہے ۔

پھر یہ محسوس کیا گیا کہ ایک ایسی ادبی انجمن قائم کرنا چاہئے جس کا مقصد انشا پردازی کو فروغ دینا ہو۔ ۱۹۲۶ء میں سمرقند میں ایک انجمن کی بنا ڈالی گئی جو "قزل قلم" (یعنی "سرخ قلم") کہلاتی ہے۔ سمرقند اس وقت ازبکستان کا دارالحکومت تھا، اور اس انجمن میں شہر کے تمام انشا پرداز اور بیشتر ازبک مصنف شامل تھے۔ لیکن انجمن کی شیرازہ بندی کے لئے کوئی اصول یا مقصد پیش نظر نہیں تھا۔ اس کے اراکین میں وُذل محمودی اور التائی با تو جیسے انقلاب کے چھپے دشمن اور غیرتی اشمسی، ادئی غون، ایڈن، ارگاش اور تاش پلت جیسے اشتراکیت پرست نوجوان شاعر شامل تھے۔ اسی میں چند ہمدرد، نقاد اور ایسے اشتراکی انشاپرداز تھے جو بعد کو بہت مشہور ہوئے، جیسے ضیا سعیدوف، الک بائی، ہاشمو وغیرہ۔ "قزل قلم" میں داخل ہونے کے بعد انشا پردازوں نے اپنے عقائد، تصورات اور مذاق کے مطابق مختلف حلقے بنائے، اور ازبکستان کی ادبی تاریخ میں "قزل قلم" کا دوران مختلف حلقوں کی "خونریزی" جنگ کی وجہ سے نمایاں ہے۔ یہ انجمن اپنے گرد ان انشا پردازوں کو جمع نہ کر سکی جو بین طور پر اشتراکی ہو گئے تھے، اس میں اتنی جان نہیں تھی کہ نوجوان انشا پردازوں کو جوش دلائے اور پرولتاری ادب کو فروغ دے، وہ بورژوا اور انقلاب کے دشمن بن کر اس انجمن میں شامل ہوئے تھے ان اشتراکیوں کی چشم پوشی اور رواداری سے جو اس انجمن کے نگران تھے فائدہ اٹھا کر قومیت کی تبلیغ کرتے رہے اور ان کا زہر نوجوانوں تک پھیل گیا۔ آخر کار ازبکستان کے مصنفوں کی ایک نئی انجمن بنائی گئی جو "اوزاپ" کہلاتی ہے، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ادبی تحریک کو تقویت پہنچائے اور عقائد اور اخلاق کو مستحکم کرے۔

"اُوزاپ" ہی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی کہ کارخانے کے مزدوروں کے لئے پڑھنے کو کچھ ہونا چاہیئے۔ انشا پردازوں کا بہت بڑا حصہ اشتراکی زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنے لگا، اور ایسی تصانیف کی تعداد بہت بڑھ گئی جن کا موضوع اشتراکیت کی تعمیری کوششیں تھیں۔ ضیا سعیدوف اور معروف نے اپنی تصنیف "تاریخ نے کہہ دیا ہے" شایع کی، اور اسی زمانے میں اسماعیلوف نے ایک کتاب لکھی جس میں کپاس بونے والوں کی جنگ آزادی کا سارا حال تھا۔ لیکن "اوزاپ" کے رہبروں نے کئی غلطیاں بھی کیں

[illegible]

ہوتی جاتی ہے، صنعت اور زراعت کو ایسا فروغ ہوا ہے جس کی مثال تاریخ عالم میں نہ ملے گی، اور نئی زندگی کی یہی صفات انشا پردازوں کی ذہنی محرک ہیں۔

سیاسی اور معاشی تغیرات کی بدولت معاشرتی حالات نے ایک بالکل نیا رنگ اختیار کیا ہے، اور اس اعتبار سے ازبکستان کے انشا پردازوں کو اپنے فرائض انجام دینے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس وقت ان کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ معاشرتی انقلاب کو سمجھیں اور اس کے اصولوں کو عوام کے ذہن نشین کرنے کے لئے اپنی شاعرانہ استعداد سے کام لیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں مارکس، انگلس، لینن، اور سٹالن کی تصانیف کا مطالعہ کرنا، انھیں اپنانا اور اپنے عقائد میں گہرائی پیدا کرنا ہے۔

ادب کے مختلف شعبے | تصانیف اور مصنفوں کی تعداد دیکھتے ہوئے ازبکستان کے اشتراکی ادب میں شاعری کو سب سے اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے۔ نوجوان انشا پرداز تقریباً ہمیشہ اسی سے ابتدا کرتے ہیں، اسی کا معیار بڑھانے اور اسی کو صحیح ڈھرے پر لانے کی خاص کوشش کی جاتی ہے۔ اس پر تنقیدی نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف ترقی ہی ترقی دکھائی دیتی ہے تو دوسری یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پرولتاری شاعروں میں زندگی کو سمجھنے کی استعداد کم ہے، اور اپنا کلام چھپوانے کا شوق ایسا زبردست ہے کہ شاعر خیالات کی قدر اور گہرائی کا جیسا کہ چاہئے خیال نہیں رکھتے۔ مغربی کی نظم "ماں کے نام خط" اوئی گان کی "زانتے میر" اور "اشتراکیت کے سرسبز باغ"، کا فور غلام کی "وکوکان محض ایک چال نہیں ہے"، حامد کی "وادیٔ مسرت" اور "قوت"، ایبک کی "دلبر، ہمارے زمانے کی ایک لڑکی"، الیک اور حسن پلات کی ایک دو نظمیں خاص ادبی کارنامے ہیں جو اشتراکیت اور اس کے سورماؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن یہ خامیوں سے پاک نہیں ہیں، خاص طور پر اس اعتبار سے کہ وہ زندگی اور مختلف طبقوں کے باہمی تعلقات کی نسبت اکثر غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔

پہلی صف کے ادیبوں میں بھی اسی طرح کے نقائص پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہم بے شک زندگی کی ایک تصویر دیکھتے ہیں اور مزدوروں کی فتوحات کا بیان پڑھتے ہیں، مگر ہمیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ مزدوروں نے اپنا مقصد کس طرح حاصل کیا۔ عملی جدوجہد، لڑائی کی اصل صورت، جیتے جاگتے سورما، یہ

چیزیں ہمیں نہیں ملتی ہیں۔ سورما یہ تو محسوس کرتا ہے کہ پرانی زندگی کو بدلنا اور نئی زندگی تعمیر کرنا ہے، پر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے، اور یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس میں اتنا مادہ ہے بھی کہ ماحول کو اپنے قابو میں کر لے ہمیں جنگ کا نقشہ نہیں دکھایا جاتا، ملاقاتوں اور ارادوں کی خبر سنائی جاتی ہے۔

وہ تصانیف جن کا موضوع روئی کا مسئلہ ہے بہت سطحی ہیں، اور اس کی کاشت پر اسی بے پروائی سے ایک خالص اصولی بحث کی گئی ہے جیسے کہ بورژوا طبقے کے ادنیٰ لوگ کرتے ہیں۔ معاملے کی بات کم ملتی ہے، روئی کی مدح سرائی میں انداز اور مناسبت کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ کوئی اسے "سفید سونا" کہتا ہے، کوئی "وجد"، کوئی "پھول" اور کوئی "مسرت"، اور اس طرح روئی ایک دیوتا بنا دی گئی ہے۔

اُن نظموں میں جو ایسے مزدوروں پر لکھی گئی تھیں جنھوں نے کسی بڑی صنعتی مہم میں شرکت کی تھی یہی خامیاں، ایسے ہی مصنوعی اور اعلیٰ انسانی صفات سے محروم کیرکٹر پائے جاتے ہیں۔ دوسری طرف صنعتی اور مزدوروں کی زندگی پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ یہاں پر ہمیں صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ ازبکستان کے ادیب مزدوروں کے طبقے کو ادبی حیثیت دینے کے اہل ہی نہیں ہیں۔

اسی طرح زبان کا حق بھی ادا نہیں کیا جاتا۔ اس میں ملکہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اور عوام کی بولی کا مطالعہ بھی نہیں کیا جاتا۔ روسی کے مقابلے میں ازبک زبان بہت کم نشوونما یافتہ ہے، اور اس کا مطالعہ صرف اکتوبر ۱۹۱۷ کے بعد اور خصوصاً پچھلے چند سالوں میں تھوڑا بہت کیا گیا۔ چونکہ ادبی اور بول چال کی زبان میں بڑا فرق ہے، اس لئے یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے باوجود ادیب اسے کیوں اس طرح نظر انداز کرتے ہیں۔

نظم کے مقابلے میں نثر کی ترقی اور بھی کم ہوئی ہے۔ انشا پردازوں نے نثر پر محنت کرنا ابھی حال ہی میں شروع کیا جب کہ حکومت نے ایک مقابلے کا اعلان کیا اور یہ کہا کہ بہترین نثر کی تصنیف پر انعام دیا جائے گا۔ عبداللہ قادری، جو روزمرہ میں استاد مانا جاتا ہے، غفور غلام، شمسی، غیرتی، عبداللہ قہر، صابر ودا اور دوسرے نوجوان ادیبوں نے جی توڑ کر ادب کے اس شعبے کو فروغ دینے اور اس میں ملکہ حاصل کرنے کی

کوشش شروع کردی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے مشہور انشا پرداز صدرالدین عینی نے "غلام" کے عنوان سے ایک ناول لکھا ہے اور اسے کانگریس کے نام معنون کیا ہے۔

باوجود اس کے کہ نثر کی طرف حال ہی میں توجہ کی گئی ہے۔ اشتراکی نثر کے مضامین اور اسلوب قوم پرست بورژوا انشا پردازوں کی نثر سے بالکل مختلف ہیں، بیشتر تصانیف میں ہم نئی زندگی کا اثر دیکھتے ہیں اور زبان اکثر بول چال کی زبان سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ مگر ہمیں اس کا بھی اقبال کر دینا چاہئے کہ نظم کی طرح نثر میں بھی اوچھا پن اور گھڑت بہت ہے۔ عبداللہ قادری، ایک مشہور اور کہنہ مشق انشا پرداز فرمان مذکور کے بعد نئی زندگی کے جاں بخش دریا میں کود پڑا ہے۔ اس کا مختصر سا مضمون، "میں سورج سے بھی لڑنے کو کھڑا ہو جاؤں گا" اور اس کا افسانہ "ماجد کمیں" اشتراکیت کی تعمیری کوششوں سے بحث کرتے ہیں اور نئے حوصلوں سے معمور ہیں۔ لیکن اگرچہ ان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مصنف نے نیا مذہب اختیار کر لیا ہے، ان میں بہت سے نقائص بھی ہیں۔ "میں سورج سے بھی لڑنے کو کھڑا ہو جاؤں گا" معاشرتی حوصلوں میں سے ایک کو بھی واضح تصور یا ارادے کی شکل میں پیش نہیں کرتا، اور اس لئے مزدوروں کی تعلیم و تربیت میں کام نہیں آسکتا۔ اس مضمون کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو نئے حوصلے پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ایک طرح سے جوا کھیل رہے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرتی حوصلوں کا حلیہ ہی بگاڑ دیا گیا ہے۔

اپریل ۱۹۳۲ء سے بعد کی نثر میں ہمیں جو خامیاں نظر آتی ہیں ان کا سبب انشا پردازوں کی کمسنی مشق کی کمی اور زبان پر حاوی ہونے کی دشواریاں ہیں، اور چونکہ یہ ادب کے شباب کا زمانہ ہے، ایسی خامیوں کا ہونا لازمی ہے۔ بعض نقائص ایسے ہیں جن کی ذمہ داری اس اثر پر ڈالی جا سکتی ہے جو پرانے انشا پردازوں کو اب تک حاصل ہے۔ اس وقت ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ہمارے انشا پرداز زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کھینچنے کے اہل نہیں ہیں، اور حقیقت نگاری بھی ان کے بس کی بات نہیں۔ مختلف طبقوں کی باہمی جنگ کے جن مظاہر کا انھوں نے خاکہ اتارا ہے وہ بالکل من گھڑت ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی سیرت کا ایسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے جو دل نشیں ہو سکے، اشتراکی شخصیت کے مثالی نمونے پیش کرنے میں بھی وہ

بہت ناکامیاب ہوئے ہیں۔ ناولوں اور افسانوں میں جو اشخاص ہمیں ملتے ہیں وہ کسی خیال کے مطابق بنائے ہوئے اور اس وجہ سے مصنوعی معلوم ہوتے ہیں، زندہ آدمیوں سے ان کو دور کی بھی مشابہت نہیں۔

تھیٹر اور ڈراما | ازبکستان میں تھیٹر اور ڈراما براہ راست وہاں کی اشتراکی پارٹی کی قائم کی ہوئی چیزیں ہیں اور اسی کی بدولت چل رہی ہیں، اگرچہ وہ مسائل جو ڈراما کے موضوع ہوتے ہیں پرولتاری ہیں اور ناٹک کا فن قومی۔ اس طرح تھیٹر اور ڈراما کی بنیاد بہت مستحکم ہے۔ اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے پانچویں عام جلسے میں کومریڈ اکرامون نے ایک تقریر کی تھی جس میں اُنھوں نے کہا:

"مجھے یاد ہے کہ انقلاب سے پہلے کسی شہر میں ڈراما کا دکھایا جانا بہت ہی غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس وقت ازبکستان میں تھیٹر اور ڈراما کی حیثیت علمی اور تعلیمی ہو گئی ہے۔ مختلف شہروں میں تماشے کرائے جاتے ہیں اور فن کے نقطۂ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا ناٹک پیش خیمے کا کام کر رہا ہے۔"

دراصل اس وقت سے جب کہ روسی ڈراما نویسوں کے کارنامے ازبکستان میں دکھائے گئے ہمارے یہاں ڈراما مزدوروں کو اشتراکیت کی تعلیم دینے کا ایک بہت با اثر اور کارآمد ذریعہ بن گیا ہے۔ ازبکستان کے تھیٹر میں گوگول، شیکسپیر وغیرہ کے ڈراما بہت خوبی اور کامیابی سے دکھائے گئے ہیں اور جس وقت سے ہمارا تھیٹر قائم ہوا ہے ہمارے یہاں نہ اچھے ایکٹروں کی کمی رہی ہے نہ اسٹیج تیار کرنے والوں کی۔

اس وقت ازبکستان میں ۲۴ سرکاری تھیٹر ہیں۔ ان میں ناٹک کے شائقین کی وہ غیر پیشہ ور جماعتیں شامل نہیں ہیں جو ملک کے ہر حصے میں پائی جاتی ہیں اور جو اپنے گرد ایسے تمام نوجوانوں کو جمع کرتی رہتی ہیں جن میں یہ فن سیکھنے کی استعداد ہے۔ یہ خوشگوار حالت ایک طرف تو اس سیاسی پالیسی کی کامیابی کا نتیجہ ہے جو لینن اور سٹالن نے اختیار کی، اور دوسری طرف مزدوروں کے طبقے کی اس پوشیدہ استعداد کا جو انقلاب اور پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کی بدولت ظہور پذیر ہوئی۔

اس وقت جو ڈراما دکھائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر روسی تصانیف کے ترجمے ہوتے ہیں، لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے قابل قدر وہی ڈرامے ہیں جو ازبک انشا پردازوں نے تیار کیے ہیں۔ ان ڈراما نویسوں میں سب سے ممتاز ضیا سعیدوف، یاسین اور عبداللہ ذکور ہیں۔

اسی طرح ازبکستان کے مزدوروں نے موسیقی اور اوپرا[۵] کی ترقی کے لئے بھی زمین تیار کی ہے۔

لیکن اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ہم واقعی بہت آگے بڑھ گئے ہیں، انشا پردازی کی طرح ہمارے ڈراما میں بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ ایک ایسا وقت ضرور آئے گا جب ہم زندگی کی حقیقتوں کو نفاست کے ساتھ ایسے ڈراماؤں میں دکھا سکیں گے جن میں " خیالات کی گہرائی، تاریخ کا صحیح اور سچا تصور، شیکسپیر کی سی زندہ دلی اور عملی جدو جہد کی ایک تصویر ہو" ۔ مگر اب تک جو ڈرامے لکھے گئے ہیں ان کے ہیرو بس نام کو آدمی ہوتے ہیں، وہ نہ ہم کو جوش دلا سکتے ہیں نہ ہم پر اثر کر سکتے ہیں، اس لئے کہ ڈراموں میں حقیقی زندگی کا عکس نہیں اتارا جاتا۔ ان کے اشخاص اوچھے، من گھڑت ہوتے ہیں، اور محض پروپگنڈا اور تقریریں کرنے کے لئے اسٹیج پر لائے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔

اس وقت بورژوا قوم پرست ادیبوں کا جم کر مقابلہ کیا جا رہا ہے، اور اسی طرح ان تمام ادبی تحریکوں کا جو مارکس اور لینن کی تعلیم کے خلاف ہیں، اور ادب کے ہر شعبے میں سوویٹ کے انشا پردازوں کا پلہ بھاری ہو رہا ہے تندرست جسم اور صحیح دماغ رکھنے والے انشا پرداز جنھوں نے سوویٹ ادب کو ترقی دینے کا بیڑا اٹھایا ہے روز بروز بڑھ رہے ہیں اور ازبک مزدوروں میں سے نئے ادیب آ کر ان کی ہر کمی پوری کرتے رہتے ہیں۔ یہ علامت ہے اس حقیقت کی کہ ہماری تاریخ کے اس عظیم الشان دور کی ادبی حیثیت بھی مناسب ہو گی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انشا پردازوں کو چاہئے کہ مارکس، لینن اور ستالن کی تصانیف کا زیادہ گہرا مطالعہ کریں اور اپنی عام واقفیت بھی بڑھاتے رہیں۔ انھیں روس اور اشتراکی وفاق کی دوسری ریاستوں کے ادب کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے اور نوع انسانی کے عام ادبی ورثے کو بھی کام میں لانا چاہئے ۔

---

۵ اوپرا ڈراما کی وہ قسم ہے جس میں ساز، گانا اور ناٹک تینوں کی آمیزش ہوتی ہے ۔

ادا یا قضا؟

صبح کا وقت تھا۔ حکیم اعجاز حسین کے مکان کے سامنے والی گھنی نیم پر دھوپ پھیل چکی تھی۔ مگر سورج کی کرنوں میں ابھی گرمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ درخت کے نیچے ایک تخت پر میلی سی چادر بچھی تھی۔ جس پر جابجا پیک اور روشنائی کے دھبے تھے۔ صدر میں گاؤ تکیہ رکھا تھا جس کے سامنے حکیم صاحب کرتہ پائجامہ پہنے بیٹھے تھے۔ ان کا سن چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ ڈاڑھی کے بال سفید ہو چلے تھے۔ تخت کے ایک کونے پر دیہاتی وضع کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ ایک اور آدمی تہمت باندھے نیم کی جڑ پر بیٹھا تھا۔

حکیم صاحب چلم کے انتظار میں تھے۔ بار بار مکان کے دروازے کی طرف دیکھتے۔ اتنے میں چھدو چلم لیے ہوئے نکلا۔ راستہ میں ایک کتا ٹانگیں پھیلائے لیٹا تھا۔ چھدو نے چپکے سے ایک ڈھیلا اٹھا کر مارا۔ نشانہ پورا پڑا اور کتا ہیں ہیں کرتا ہوا بھاگا۔

چھدو۔ "جب دیکھو بیچ میں پڑا ہے۔ جب دیکھو بیچ میں پڑا ہے۔"

حکیم صاحب۔ "ابے چلم بھی لائے گا۔"

چھدو کے انداز سے ذرا بھی نہ معلوم ہوا کہ اس نے آواز سن لی۔ اسی طرح خرام خرام بلکہ مخرام پر عمل کرتا ہوا بڑبڑاتا ہوا آیا۔ حقہ ایک کنارے رکھا تھا اس پر چلم لگا کر حکیم صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

حکیم صاحب۔ "میاں براتی! ذرا حقے کی نبض تو دیکھنا۔"

میاں براتی جو تخت کے کونے پر بیٹھے تھے بہت مستعدی سے آگے بڑھے۔ حقہ آگے سرکا کر دو ایک کش لگائے۔ پھر چلم اتار کر زمین سے ایک لکڑی اٹھائی اور چلم کے نیچے ڈال کر تو اچکا دیا۔ پھر منہ اوپر اٹھا کر چلم کے نیچے زور سے پھونک ماری۔ کچھ راکھ اور چنگاریاں اڑیں۔ کچھ ان کی داڑھی اور کندھے پر بھی پڑیں مگر انھوں نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا، اور چلم حقہ پر لگا کر ایک لمبا سا کش کھینچا۔

اتنے میں ایک صاحب شرعی پیجامہ پہنے گذرتے دکھائی دیے۔ حکیم صاحب نے پکارا۔

"حافظ جی! کہاں؟"

حافظ جی گویا منتظر ہی تھے۔ آواز سنتے ہی پلٹ پڑے۔

حافظ جی "ذرا لکھنؤ گیا تھا۔ عجب قہر خدا چھایا ہوا ہے۔ طاعون کا آسا زور ہے۔ کہ ہزاروں لاشیں روز نکل جاتی ہیں۔ نہلانے اور دفن کرنے والے نہیں ملتے۔ آج کل تو بس شہدوں کی بو آتی ہے"

براتی "اللہ رحم کرے۔ ہمارا قصبہ تو ابھی تک بچا ہوا ہے۔ اور اللہ چاہے گا تو بچا ہی رہے گا"

حافظ جی "کیا خاک بچا ہوا ہے؟ ننہو رات کو مر گیا۔ دو روز سے بخشی کی بیوی کو بخار تھا۔ کل ران میں گلٹی دکھائی دی ......"

حکیم صاحب "کون بخشی؟"

حافظ جی "وہی جو ٹھنگنا ٹھنگنا ہے۔ اکہ ہانکتا ہے۔ محرم میں علم اٹھاتا ہے"

حکیم صاحب "ارے اس کی بیوی! خدا کرے اچھی ہو جائے۔ علاج کس کا کر رہا ہے"

حافظ جی "خدا جانے۔ یہ لوگ کسی کی سنتے ہیں۔ میرے پاس تعویذ لکھوانے آیا تھا۔ لکھ دیا —— اماں براتی حقہ کیسا آرہا ہے؟ ذرا ادھر بڑھانا —— حکیم صاحب! ہم تو سمجھتے ہیں کہ کوئی بیماری ویماری نہیں۔ ہمارے ہی اعمالوں کا نتیجہ ہے۔ سنا ہے کل جانو کی لڑکی بھاگ گئی"

حکیم صاحب "اللہ کو یاد کرو۔ براتی! وہ تعویذ لگ گئے"

براتی "جی ہاں حکیم صاحب۔ ہندوؤں نے بھی مانگ مانگ کر لگائے۔ مگر نور د میاں نے اپنے یہاں نہیں لگانے دئے"

حکیم صاحب خاندانی حکیم ہونے کے علاوہ قصبہ کے مشہور بزرگ شاہ ولایت حسین صاحب کے مرید و خلیفہ بھی تھے۔ لکھنؤ اور پاس پڑوس کے مقامات پر طاعون کا زور سن کر انھوں نے ایک نقش دافع طاعون چار پانچ سو کی تعداد میں لکھ کر قصبہ کے تمام گھروں میں لگانے کے لئے تقسیم کر دیا تھا۔ مگر نورو میاں جن سے اور حکیم صاحب سے خاندانی چلی ہوئی تھی۔ اس نقش کے خلاف ہو گئے اور کہنے گئے "وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ان ڈھکوسلوں سے کیا حاصل؟"

حکیم صاحب نے براتی کا جواب سن کر تاسف آمیز خاموشی اختیار کرلی۔

حافظ جی۔ "یہ بھوت جو نہ کرائے تھوڑا ہے۔"

براتی کوئی جواب دینے والا تھا کہ اتنے میں بخشی تیز تیز قدم اٹھاتا آپہونچا۔

بخشی۔ سلام حکیم جی۔ گھر میں طبیعت بہت خراب ہے۔ طاعون ہوگیا ہے۔ کل تک، دو دن کے اندر سات آٹھ دوائیاں پلائیں۔ صدقے اتارے۔ سرھانے بکرا باندھا۔ یہ حافظ جی بیٹھے ہیں انھوں نے کیلے کے پتے پر تعویذ لکھ دیا ہے وہ گلے میں ڈالا۔ مگر کچھ فائدہ نہیں۔ (ہاتھ جوڑ کر) اب حضور کے ہاتھ میں اسکی جان ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔

حکیم صاحب۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ گھبراتے کیوں ہو۔ اچھی ہو جائے گی۔ چھدو! گھر سے طاعون والے کشتوں کا صندوقچہ مانگ لاؤ۔

چھدو لپکا ہوا ڈیوڑھی میں گیا۔ اور زور سے آواز لگائی۔

"حکیم صاحب نے طاعون والے کشتوں کا صندوقچہ مانگا ہے"

یہ صدا سنتے ہی گھر میں ایک بے چینی پھیل گئی۔ ماما روٹی توے پر چھوڑ۔ گھبرائی ہوئی ڈیوڑھی میں بھاگ آئی۔ اور چھدو سے دس بارہ سوالات کر ڈالے۔ چھدو نے ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ لڑکے آنکھ مچولا کھیل رہے تھے۔ حکیم صاحب کی بیوی نے ان کو بہت زور سے ڈانٹا۔ وہ سہم کر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب کی بیوی فوراً کہنے لگیں کہ میں بچوں کو لے کر کل ہی گوالیار اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤں گی۔ حکیم صاحب کی ماں اونچا سنتی تھیں، ہر ایک سے پوچھنے لگیں کیا بات ہے کسی نے پاس جا کر چلا کر کہا کہ قصبہ میں طاعون پھیل گیا۔ یہ سنتے ہی چلا چلا کر استغفار پڑھنے لگیں۔

چھدو نے تھوڑی دیر کے بعد پھر پکارا "کشتوں والا صندوقچہ دے جاؤ"

ماما تو آواز سن کر بڑبڑانے لگی۔

"دیجاؤ، دیجاؤ کی رٹ لگائی ہے۔ میں ناحق پیدا ہوئی ایسے قصبہ میں۔ کبھی طاعون، کبھی ہیضہ مرے ماں باپ حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ وہاں کبھی ایسی بیماریاں.........."

حکیم صاحب کی بیوی نے ڈانٹ کر بلایا۔ اور ایک ٹین کا ڈبہ جس میں بہت سی پڑیاں اور شیشیاں تھیں اس کو دیا۔ وہ اسی طرح بڑبڑاتی ہوئی گئی۔ اور چھدو کو دے آئی۔

چھدو بیٹھا تنکے سے زمین کریدرہا تھا۔ ڈبہ پاتے ہی بھاگا۔ حکیم صاحب نے ڈنڈا لیا۔ اور بخشی سے بولے۔

"بسم اللہ، چلو، اللہ چاہے گا تو دوا دیتے ہی فائدہ ہوگا۔"

آگے آگے حکیم صاحب اور پیچھے پیچھے بخشی اور چھدو چلے۔ راستہ میں جو ملتا حکیم صاحب کو سلام کرتا اور بخشی سے یا چھدو سے پوچھتا کون بیمار ہے؟ بخشی ہر ایک سے بیان کرتا۔ دو ایک آدمیوں نے بخشی کو ڈھارس دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس مرض میں حکیم صاحب تو تیر بہدف علاج کرتے ہیں۔

بڈھا رامداس جو اپنی کرانے کی دوکان کھولنے جا رہا تھا۔ ہاتھ میں کنجیوں کا گچھا لئے تھا یہ باتیں سن کر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں سے کہنے لگا۔

پچھلے طاعون میں۔ جب ان کا سن سترہ اٹھارہ برس کا ہوگا، بڑے حکیم صاحب کے ساتھ مری ماں کو دیکھنے روز آتے تھے۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ ایسے ایسے بیماروں کو انکی دوا سے فائدہ ہوا جو دنیا بھر میں گھوم پھر کر مایوس ہو گئے تھے۔ رام نرائن کے بیٹے پر کوئی آتا تھا۔ اتنا خوبصورت لڑکا مگر کسی کام کا جو رہا۔ دن بھر بیری کے درخت کے نیچے کھیلا کرتا۔ واہی تباہی بکتا۔ اکثر دو دو دن تک کچھ نہ کھاتا۔ بچارا رام نرائن نہ جانے کہاں کہاں گھوم آیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ جو اچھا بھی ہوا تو حکیم صاحب کے ایک چراغ سے۔

اتنے میں دو لڑکے سودا خریدنے آگئے۔ رامداس نے اپنی بات یہیں پر ختم کر دی اور دوکان کھولنے لگا۔

اتنے عرصہ میں حکیم صاحب ایک ٹوٹے ہوئے مکان کے بیچ سے ہو کر جو اب مستقل راستہ ہو گیا تھا ایک کچے مکان کے پاس پہونچے۔ باہر چھپر پڑا تھا اس میں ایک گھوڑا بندھا تھا۔ بخشی کے ساتھ حکیم صاحب اندر گئے۔

مریضہ پلنگ پر بیہوش لیٹی تھی، آس پاس بہت سے کپڑوں اور چیتھڑوں کا ڈھیر تھا۔ پلنگ کے پایہ کے برابر چنوں سے بھرا توبڑا رکھا تھا۔ بڑھیا ماں پاس بیٹھی تھی۔ اس نے فوراً حکیم صاحب کے پاؤں پکڑ لئے اور گڑ گڑا کر کہنے لگی۔

" حکیم صاحب ! اپنے بچوں کا واسطہ اس کو جلا لو۔ ہائے ننھے ننھے بچے ہیں۔ ان کا کوئی سہارا نہیں میں کیا کروں کسی طرح یہ بچ جائے، یہ موئی بڑھیا ماں مر جائے۔ صبح ذرا ہوش آیا تھا رو رو کر کہنے لگی اماں ! اب ہم مر جائیں گے ۔ گھسیٹے اور بھورے تمھارے حوالے۔ پھر بولی حکیم صاحب کو بلا کر اور دکھا دو، زندگی ہوگی تو بچ جاؤں گی۔

حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔ قارورہ دیکھا پھر ایک پڑیا نکال کر ایک چمچے میں ڈالی۔ اس پر شہد ٹپکایا اور مریضہ کو چٹانے کے لئے ماں کو دی۔ دوا پہونچتے ہی ایک قے ہوئی۔ حکیم صاحب کو دکر الگ ہوئے ماں نے مریضہ کو سنبھالا۔ بخشی نے دوڑ کر راکھ لا کر قے پر ڈالی۔ دونوں بچے جو دور پر سہمے کھڑے تھے ماں کی حالت دیکھ کر رونے لگے۔ مریضہ کو کچھ ہوش آگیا اور کراہنے لگی۔ حکیم صاحب نے وہی دوا ایک پڑیا میں بخشی کو دی کہ شام تک چٹاتے رہو۔ گلٹیوں پر لگانے کا لیپ کا نسخہ لکھا۔ اور یہ کہہ کر کہ " شام کو دیکھنے پھر آؤں گا اس درمیان میں اگر طبیعت بگڑے تو حال کہنے فوراً آنا" حکیم صاحب چلے گئے۔

شام تک دو اور مریضوں کی خبر آئی۔ حکیم صاحب دیکھنے گئے۔ نسخہ لکھ کر اور ضروری ہدایات دیکر چلے آئے۔ شام کو بخشی کے یہاں کا ایک اور پھیرا کیا۔ وہاں سے آکر کشتے اور دوائیاں تیار کرانے کا سامان کرنے لگے۔

(۲)

اس واقعہ کو ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ مگر اب بھی حکیم صاحب کے مطب میں چھ سات ڈولیاں مریضوں کی رکھی تھیں۔ کچھ اور لوگ تھے جو حال کہنے آئے تھے۔ حکیم صاحب ابھی قصبہ کا چکر لگا کر واپس آئے تھے فوراً پھر مریضوں کے دیکھنے میں مشغول ہو گئے۔ کسی کو نسخہ لکھ دیا۔ کسی کو اپنے پاس سے دوا دی۔ اتنے میں تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا، سفید کرتا، اور بلا پھندنے کی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے مطب

میں آیا۔ حکیم صاحب اس پر نظر پڑتے ہی چونک کر بولے۔

"کیوں سلطان؟ خیریت ہے؟"

سلطان۔" دو بجے سے بجیا کو بہت تیز بخار چڑھا ہے۔ اس وقت بالکل بیہوش ہیں۔ اور برابر بک رہی ہیں"

حکیم صاحب۔" ٹہرو۔ چلتا ہوں"

یہ کہہ کر جس مریض کو دیکھ رہے تھے اس کے بھائی سے بولے۔

"کہاں رہتے ہو"

"بھنیا پار"

" بہت دور ہے۔ بہت دور ہے۔ اگر چاہتے ہو کہ مریض اچھا ہو جائے تو ہمارے احاطے میں ٹہر جاؤ" اتنے میں ایک اور آدمی دوڑا ہوا آیا، اور بولا۔

حضور لڑکی کا حال بہت خراب ہے۔

حکیم صاحب۔" سلطان! ذرا اس لڑکی کو دیکھ لوں۔ یہ بچارے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہمارے یہاں ٹہرے ہیں۔ ذرا سی جگہ میں نہ معلوم کیسے بسر کرتے ہیں۔

حکیم صاحب نے جلدی جلدی مریضوں کو دیکھا۔ اور پھر لپک کر احاطے میں پہونچے۔ یہاں دو بڑے بڑے والان تھے جس میں پہلے بھینسیں بندھتی تھیں اور بیل گاڑی رکھی جاتی تھی۔ کچھ بھوسا اور گھاس بھی رکھی رہتی تھی۔ مگر اب سب ہٹا دیا گیا تھا۔ بھینس مرگئیں تھی۔ گاڑی ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اب دالانوں میں پردے پڑے تھے۔ کسی طرف ٹٹر کھڑے تھے۔ ان میں آٹھ دس مریض مقیم تھے۔ جگہ بالکل ہسپتال معلوم ہو رہی تھی کسی طرف سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ کہیں کوئی چلّا رہا تھا۔ ایک عورت ایک ٹٹر کے پاس دوا پیس رہی تھی، اس کے برابر ایک بچی بیٹھی رو رہی تھی۔ ایک مریض زور زور سے کراہ رہا تھا۔ اور پانی پانی چیخ رہا تھا۔ ایک بڈھا اس کے حلق میں عرق ٹپکا رہا تھا۔ کچھ مریض پردے دار بھی تھے۔ حکیم صاحب ایک ٹٹر کے پاس جاکر ٹہر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پردہ ہو گیا۔ حکیم صاحب اندر گئے۔ دس گیارہ برس کی ایک

لڑکی تعویذوں کا ہار پہنے بستر پر پڑی تھی۔ پٹی کے پاس پلنگ کے پایہ سے ایک بکرا بندھا تھا لڑکی بخار کی تیزی میں واہی تباہی بک رہی تھی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی حال سُنا۔ اور نسخہ تجویز کیا۔ نسخہ لکھنے کو قلم دوات مانگی۔ مریضہ کا بھائی دوڑ کر اٹھا لایا۔ حکیم صاحب نے نسخہ پر ہوالشافی لکھا۔ آگے لکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ صدائے اللہ اکبر کان میں آئی۔ حکیم صاحب نے قلم رکھ دیا۔ اور مسجد کی طرف روانہ ہوگئے۔

شاہ ولایت حسین صاحب نے جو مغرب وعصر کی امامت کرتے تھے اس وقت بھی امامت کی۔ نماز کے بعد حکیم صاحب نے سنتیں اور نفلیں پڑھیں پھر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ سب دو ایک خاص خاص مریدوں کے علاوہ سب رخصت ہوگئے تو شاہ صاحب نے ان کو مراقبہ فرمایا۔

عبادت سے فارغ ہوکر حکیم صاحب شاہ صاحب سے کہنے لگے۔

"حضرت! آج کل مراقبہ کی طرف میرا قلب پیار رجوع ہوتا۔ نہ اس طرف بیوپاری کی طرف دھیان رہتا ہے حالت ایسی ہے کہ اگر ذرا غفلت کروں تو ایک نہ ایک کی جان چلی جائے"

شاہ صاحب۔ "دل لگے تو کیسے لگے۔ کاہن اسی وجہ سے دنیا سے پرہیز کرنے کی ہدایت کرتے ہیں دنیا سرائے ہے۔ پل ہے۔ یہاں کے "اعمال" سے دل لگانا بے سود ہے۔ یہ تمھارا خیال بالکل غلط ہے کہ تمھاری بے توجہی سے کوئی مرجائے گا۔ یا تمھاری توجہ سے کوئی بچ جائے گا موت وزندگی سوائے اس کے اور کسی کے اختیار میں نہیں۔ اگر اس کی مرضی ہی ہے کہ سب کو مار ڈالے تو اس میں کسی کا کیا اجارہ"

پھر ذرا ٹھیر کر کہنے لگے۔ "تم نے جہانیاں جہاں گشت کا قصہ نہیں سنا کہ وہ ایک مرتبہ ایک شہر سے گذرے دیکھا تو بہت دین دار لوگوں سے آباد تھا۔ سب رہنے والے خوش اخلاق۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ حضرت ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد پھر ادھر سے گذرے تو دیکھا کہ تمام شہر ویران پڑا ہے، مکان کے نشان تک نظر نہیں آتے۔ دیکھ کر ان کو بہت تاسف ہوا۔ خدمت باری میں عرض کیا کہ "اے میرے مالک تجھے اتنے اچھے بندے تباہ کرتے کچھ افسوس نہوا۔ ارشاد ہوا کہ زمین پر کچھ لکیریں بناؤ یہ عمل پیرا ہوئے۔ پھر ارشاد ہوا ان کو مٹا ڈالو۔ انھوں نے مٹا ڈالیں۔ جناب باری سے سوال ہوا تم کو ان لکیروں کے مٹانے کا کچھ افسوس تو نہیں ہوا۔ انھوں نے عرض کیا ان لکیروں کے مٹانے کا کیا افسوس ہوسکتا ہے

جب چاہوں بنالوں۔ جناب باری سے ندا آئی اسی طرح مجھے بھی اپنے بندوں کے مٹانے کا کچھ افسوس نہیں ہوتا۔

تو مقصد یہ ہے کہ یہ اسی کے کارخانے ہیں۔ وہی خوب جانتا ہے۔ ہمارے لئے تو یہ ہے کہ اسی میں خوش ہوں جو مرضی الٰہی ہو"

پھر ایک لمبی سانس بھر کر بولے ؎

ترک دنیا گیر تا سلطاں شوی

شاہ صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے۔ انھوں نے یہ تقریر آہستہ آہستہ اور دلنشین لہجے میں فرمائی تھی، حکیم صاحب اس کو سن رہے تھے، اور ایک ہاتھ سے چٹائی کا تنکا توڑتے جاتے تھے۔ جب تقریر ختم ہوئی تو اس پر غور کرنے لگے۔ مگر ذہن فوراً ہی بہک گیا۔ اور یہ دیکھنے لگے کہ شاہ صاحب کے ڈنڈے کی شام پر ایک سبز نگ لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک سیاہ دھبا معلوم ہوتا ہے۔ دھبہ کیسے لگا؟ کوئی چیز بھر گئی ہوگی کیا چیز ہو سکتی ہے؟ دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے، پھر خیال آیا لاؤ اس کو صاف کر ڈالوں۔ مگر ایکبارگی کھڑے ہوگئے۔ اور تیزی سے مسجد سے نکل کر احاطے میں آئے۔ مریضہ کے عمل کا نسخہ لکھا۔ اور پھر سلطان کے ساتھ چلنے لگے۔ مریضہ کا بھائی سمجھتا تھا کہ حکیم صاحب حسب دستور اپنے سامنے عمل دلائیں گے۔ مگر جب ان کو جاتے دیکھا نسخہ کی ترکیب پوچھی۔ حکیم صاحب نے سرسری طور پر بتا کر پیچھا چھڑایا۔ اور سلطان کے ساتھ چلے۔ سلطان کی بہن زہرہ کو بچپن میں نمونیا ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب کے علاج سے اچھی ہوئی۔ اس وقت سے وہ حکیم صاحب سے بہت ہل گئی تھی ان کو چچا چچا کہتی تھی۔ اکثر چیزیں پکا کر ان کو بھیجا کرتی۔ ان کے رومال اور تکیہ کے غلاف کاڑھ دیتی تھی۔ حکیم صاحب نے گھر جا کر زہرہ کو دیکھا۔ بخار بہت تیز تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

حکیم صاحب "زہرہ۔ زہرہ بی"

سلطان۔ بجیا حکیم صاحب پکار رہے ہیں۔

زہرہ کی ماں پردہ کے اندر سے بولیں۔ "حکیم صاحب! اس کو غفلت سی ہے اور چونک پڑتی

حکیم صاحب ۔ آپ گھبرائیے نہیں مرض کا معمولی حملہ ہے ۔ جلد ہی اچھی ہو جائے گی ۔

حکیم صاحب نے نسخہ لکھا ۔ ضروری ہدایات دیں ۔ اور سلطان سے کہا کہ گھر آکر دوائیں لیجانا ۔ اور پھر پان کھا کر کہنے لگے ۔

" معاف کیجئے گا ۔ ٹھہر نہیں سکتا ہوں ۔ سلطان سے پوچھئے مریضوں کی کتنی کثرت ہے ۔ کھانا کھانے تک کی مہلت نہیں ملتی "۔ " آپ لوگوں کی محنت خدا قبول کرے ۔ ایک ہفتہ ادھر سنا تھا کہ بیماری کا زور کم ہو گیا ہے "

حکیم صاحب " ادھر تو زور ضرور کم ہو گیا تھا ۔ میں تو سمجھا تھا کہ خدا نے اپنا فضل کیا اور یہ بلا دفان ہوئی مگر پھر اکدم سے زور بڑھ گیا ۔ عجب پریشانی ہے ۔ گھر کی ماما بھاگ گئی ۔ وحیدہ کی ماں ایک طرف تو گھر بھر کا کھانا پکاتی ہیں ۔ دوسری طرف کبھی چار چھ مریضوں کے لئے بھی کھانا تیار کرنا پڑتا ہے ۔ وحیدہ سے بھی جو بن پڑتا ہے کرتی ہے ۔ مگر اس بچاری کو اپنے بچے سے چھٹی نہیں ملتی ۔

ادھر وحیدہ کی ماں کو ان کے بھائی بہت بلا رہے ہیں ۔ وہ اس پر راضی نہیں ہوتیں کہ بچوں کو لے کر بلا میرے چلی جائیں خدا اپنا فضل کرے ۔ اب تو پورا قصبہ ویران ہو گیا ۔ بازار دیکھ کر آنسو بھر آتے ہیں ۔

زہرہ کی ماں ۔ " حکیم صاحب کچھ مریض اچھے بھی ہوتے ہیں ۔ آپ کو سلیم کی قسم ۔ مری زہرہ اچھی ہو جائے گی ؟ "

حکیم صاحب ۔ " آپ پریشان نہوں ۔ مرض کا ہلکا اثر ہے ، انشاء اللہ جلد ہی اچھی ہو جائے گی "

وہاں سے حکیم صاحب بھاگے ہوئے آئے ۔ پہلے احاطے کا ایک چکر لگایا ۔ دو ایک مریضوں کو ہدایات دیں اور پھر گھر آئے ۔ بیوی نے کھانے کو پوچھا تو بولے ۔

" نماز سے آکر "

بیوی نے لوٹا دیا ۔ انھوں نے وضو کیا ۔ پھر مسجد گئے ۔ وہاں سے آکر ایک نیا مریض آیا تھا اس کو دیکھا ۔ تقریباً گیارہ بجے کھانا کھا کر لیٹے ۔ تھکے بہت تھے فوراً سو گئے ۔ دو بجے چھدو نے آکر آواز دی کہ نیا مریض آیا ہے ۔ حکیم صاحب کا حکم تھا کہ اگر کوئی نیا مریض آئے یا کسی کی حالت نازک ہو تو فوراً

جگا دو ۔ بیوی نے چھدو کی آواز سُنی ۔ مگر خاموش رہی' چھدو نے ایک آواز اور دی ۔

حکیم صاحب کی بیوی بڑبڑانے لگیں " دن کو کھانا نہ نصیب ہو' رات کو سونے سے بھی گئے ان موئے مریضوں کو اپنی جان کی پڑی رہتی ہے ۔ حکیم کی جان کی پروا نہیں "

بڑبڑاتے ہوئے اُنھوں نے حکیم صاحب کو جگایا ۔ اُنھوں نے جیسے نئے مریض کا نام سُنا بستعدی سے اُٹھے ۔ اور باہر چلے گئے ۔

(۳)

طاعون کا اتنا زور تھا ۔ مگر حکیم صاحب کا گھرانا ابھی تک محفوظ تھا ۔ لیکن فلک کو یہ نہ بھایا اور ایک دن حکیم صاحب کی ماں کو بخار آیا جو دم بدم تیز ہوتا گیا ۔ دوسرے دن بغل میں گلٹی دکھائی دی ۔ حکیم صاحب سے جو بن پڑا کیا ۔ مگر موت سے کب رستگاری ہے پھر ضعیفی میں معمولی مرض بھی مرض الموت ہو جاتا ہے بیچاری تیسرے دن دنیا سے سدھار گئیں ۔

حکیم صاحب کے دل پر جو گذرا ہو گذرا ہو ۔ مگر ان کی زبان سے کسی نے سوائے اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون کے ایک کلمہ بھی نہیں سُنا ۔ دو ایک دن تک ذرا چپ چپ ضرور رہے' لیکن مریضوں کی خدمت یا نماز کی پابندی میں ذرا فرق نہ آیا ۔

اس کے چوتھے روز حکیم صاحب ایک مریض کو جو اب سنبھل گیا تھا' کچھ ہدایات دے کر احاطے سے رخصت کر رہے تھے کہ چھدو بھاگتا ہوا آیا ۔

چھدو ۔ " بی بی نے کہا ہے کہ بٹیا کے سر میں درد ہو رہا ہے ۔ اور بخار بھی معلوم ہوتا ہے ۔ آکر فوراً دیکھ لیجئے "

حکیم صاحب بے اختیار زنانے کی طرف بھاگے ۔ ہاتھ میں مریض کا نسخہ تھا وہ بھی دینا بھول گئے سلیمہ ماں کی گود میں لیٹی ہوئی رو رہی تھی ۔ ماں آنکھوں میں آنسو بھرے سر دبا رہی تھی ۔ حکیم صاحب نے پکارا ۔ سلیا ۔ سلیمہ

سلیمہ ۔ " ابا درد کے مارے سر پھٹا جاتا ہے "

"تو روتی کیوں ہے' ابھی درد کم ہوا جاتا ہے۔"

پھر بیوی سے بولے" ذرا پانی گنگنا کر دو اس کو ایک خوراک دوا دے دوں۔" پھر بیوی نے منہ پھیر کر دوپٹہ سے آنسو پونچھے۔ اور جھپکے سے اٹھیں۔ حکیم صاحب پاس بیٹھ گئے۔ تھرمامیٹر لگا کر بخار دیکھا تو ۱۰۵ ۔ لڑکی پھنکی جاتی تھی۔ بلبلا بلبلا کر باپ کے گلے میں باہیں ڈال دیتی حکیم صاحب اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے، سر دباتے' اور بہلاتے جاتے۔ جب پانی گرم ہو کر آگیا تو حکیم صاحب نے دوا بنا کر بیوی کو دی، اور کہنے لگے۔

"درد' اور بخار کم ہو جائے گا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

بیوی۔" لڑکی کی حالت چھوڑنے کے قابل نہیں۔"

حکیم صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا۔ باہر آئے یہاں ایک نیا مریض آیا تھا' اس کو دیکھا۔ جلدی سے نسخہ لکھا اور پھر اندر جانا چاہا مریض کا باپ اس کو اس خیال سے اٹھا لایا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے یہاں ٹھہر جاؤں گا۔ مگر انھوں نے پوچھا نہیں۔ تو خود بولا۔

"حضور میں ٹھہر جاؤں۔"

" حکیم صاحب نے روکھے پن سے جواب دیا" احاطے میں جا کر دیکھو۔ اگر جگہ ہو ٹھہر جاؤ۔"

جس مریض کا نسخہ حکیم صاحب لئے چلے گئے تھے بولا

"حضور پھر ہم جائیں۔"

حکیم صاحب۔ اور کیا کروگے۔

مریض۔ اور وہ نسخہ حضور نہیں دیں گے؟

حکیم صاحب۔ کون نسخہ؟

مریض۔ جو آپ نے لکھا تھا۔ شاید اندر لئے چلے گئے۔

حکیم صاحب نے جواب نہیں دیا' اور اندر چلے گئے۔ لوگ متحیر تھے کہ یا تو حکیم صاحب اتنی مہربانی سے پیش آتے تھے یا یہ تغیر۔

"حکیم صاحب کچھ ناراض ہیں ؟"

"بچارے گھبرائے ہوئے ہیں ۔ ان کی لڑکی کو بخار آگیا ۔"

"کون لڑکی ؟"

"چھوٹی"

"ارے توبہ ۔ کتنی پیاری بچی ہے ۔ مرے مالک اچھا رکھنا ۔"

"بچارے حکیم صاحب نے ہم لوگوں کی خاطر دن کو دن، اور رات کو رات نہ سمجھا ۔ کوئی اور ہوتا تو قصبہ چھوڑ کر بھاگ گیا ہوتا ۔ گھر میں کیا روپیہ کی کمی ہے ۔ مگر کیا دل ہے آدمی نہیں فرشتہ ہیں فرشتہ ۔"

"ان کے باپ کا بھی یہی حال تھا ۔ پچھلی مرتبہ ہیضہ کی فصل میں انھوں نے اتنی بلکہ اس سے زائد قصبہ کی خدمت کی پھر ان کا اسی میں انتقال ہوا ۔"

" اتنے میں چھدو نسخہ لئے آیا ۔ اور مریض کو دیا ۔"

"بٹیا کیسی ہیں ؟"

بخار دم بدم تیز ہوتا جاتا ہے ۔ سرسامی کیفیت ہے ۔ سر کے بال حکیم صاحب نے کٹوا دئے ہیں ۔ ماں کا تو عجب حال ہے ۔ بچے بوڑھے سب ہی پریشان ہیں ۔ لڑکی تو گھر بھر کا کھلونا ہے ۔"

دو گھنٹے کے بعد حکیم صاحب گھر سے نکلے ۔ جو مریض موجود تھے ان کو سرسری طور پر دیکھا ۔ کسی کو بھی اپنے سامنے دوا نہیں دی ۔ سلطان آیا تھا ۔ وہ کہنے لگا ۔

"بجیا کا بخار اتر گیا ہے ۔ آپ کو بہت بلا رہی ہیں ۔ کہا ہے کھڑے کھڑے آجائیے ۔"

حکیم صاحب ۔ "بٹیا سلیمہ کو تیز بخار ہے ۔ حالت اچھی نہیں ۔ ورنہ میں ضرور چلتا ۔ نسخہ لیتے جاؤ ۔

نماز میں حکیم صاحب نے پیر صاحب سے حال بیان کیا انھوں نے ہمدردی ظاہر کی اس دن مراقبہ بھی نہیں کیا گیا ۔ اور پیر صاحب حکیم صاحب کے ساتھ گھر آئے ۔ مریضہ پر پھونک ڈالی ۔ کچھ ماں کو سمجھاتے رہے ۔ پھر ایک تعویذ لکھ کر سلیمہ کے گلے میں ڈال دیا ۔ اور بولے "لڑکی اچھی ہو جائے گی ۔"

پیر صاحب کے ہمراہ حکیم صاحب باہر آئے ۔ یہاں مریضوں کا مجمع لگا تھا ۔ مگر کسی نے پکارا نہیں تھا

رام لال۔ جس کی بہن حکیم صاحب کے احاطے میں بیمار پڑی تھی۔ قریب آکر بولا۔

" حکیم جی۔ بہن کی حالت بہت خراب ہے "

حکیم صاحب خاموش اس کے ساتھ ہولئے۔ یہاں آکر دیکھا تو سانس اکھڑ چکی تھی۔ کہنے لگے

" اب کوئی امید نہیں "

مریضوں کو سرسری دیکھ رہے تھے کہ ان کے ایک دوست اکبر آگئے اور بولے کہ " لڑکے کی حالت بہت خراب ہے ان سے تعلقات ایسے تھے کہ انکار بن نہیں پڑا۔ اور ساتھ چلے گئے وہاں کافی دیر لگی، جب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ سلیمہ کے گلٹیاں ظاہر ہوگئیں۔

حکیم صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر لیپ تیار کرنے کا حکم دیا۔

دوسرے دن حالت بہت بگڑ گئی۔ حکیم صاحب نے اپنا علاج کارگر نہ ہوتے دیکھ کر لکھنؤ سے ایک مشہور ڈاکٹر بلایا۔ اس نے آتے ہی گلٹی کا اپریشن کیا۔ دو ایک انجکشن دئے۔ مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا دوسرے دن سانس اکھڑ گئی۔

حکیم صاحب کو دو گھنٹے سے اندر جانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ بھدو روتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

" بٹیا کی حالت بگڑ رہی ہے "

حکیم صاحب لپکے ہوئے اندر گئے۔ تو دیکھا ماں پٹی سے لگی بیٹھی ہے سسکیوں کی آواز آرہی ہے سلیمہ کی گردن تکیہ پر ڈھلک گئی ہے۔ دو دو منٹ کے بعد ایک تشنجی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ سانس کھینچتے وقت گردن میں سخت جھٹکا لگتا ہے۔

حکیم صاحب نے آواز دی۔ مگر جواب دینے کا سلیمہ کو ہوش کہاں تھا؟ انھوں نے شاہ ولایت حسین صاحب کے بلانے کو آدمی بھیجا وہ خبر سنتے ہی فوراً آئے۔ ماں کو صبر کی تلقین کی، اور سرہانے بیٹھ کر یٰسین پڑھنے لگے۔

اس وقت حکیم صاحب کو کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ یہ بھی بھول گئے تھے کہ باہر مریضوں کو منتظر چھوڑ

آئے ہیں۔ اسی طرح گردن جھکائے عرصہ تک بیٹھے رہے۔ سلیمہ کو سکرات کی تکلیفوں میں دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسو نہ تھم سکے۔ اور دو ایک بڑے بڑے قطرے پلکوں سے ڈھلک کر گالوں پر ہوتے ہوئے ڈاڑھی پر آگرے۔ غم کی شدت میں ان کو پوچھنا بھی بھول گئے۔ حکیم صاحب دنیا میں سب سے زیادہ سلیمہ کو چاہتے تھے۔ صرف یہی ایسی ذات تھی جس کی خاطر وظیفہ کے دوران میں اکثر بول دیتے تھے۔

ایسی حالت میں تھے کہ "اللہ اکبر" کی آواز کان میں آئی۔ جس طرح مردے صور کی آواز سے چونک پڑیں گے۔ حکیم صاحب اور شاہ صاحب دونوں چونک پڑے۔ اور بسم اللہ کہہ کر اٹھے۔ حکیم صاحب کے گھر میں بھی بچے بوڑھے سب نماز کے بہت پابند تھے۔ مگر اس وقت غم نے سب کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ کسی کے دل میں اتنی تاب نہ تھی کہ نماز کو جاتا۔ مگر آگے آگے شاہ صاحب، اور پیچھے پیچھے حکیم صاحب مسجد کی طرف چلے۔ جس طرح بجھتا چراغ بھڑک اٹھتا ہے۔ اسی طرح سلیمہ کو بھی آخری سانس کے ساتھ ہوش آگیا۔ اور اس کی زبان سے نکلا

"ابا !!!"

حکیم صاحب نے پلٹ کر دیکھا وحیدہ کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ ہونٹوں کو کچھ حرکت ہوئی اور لوگوں کو ایسا گمان ہوا کہ واپس آجائیں گے۔ مگر منہ کے الفاظ منہ ہی میں رہ گئے۔ اور وہ "یا ارحم الراحمین" کہہ کر ویسے ہی چلے گئے۔

ادھر وہ باہر نکلے ادھر لڑکی کی سانس بند ہوگئی۔ بچاری ماں نے ہائے کہہ کر پٹی پر سر دے مارا۔ اس وقت حکیم صاحب نیت باندھے نماز میں کھڑے تھے۔ نہ معلوم دل کی کیا حالت تھی، مگر بظاہر خشوع و خضوع میں کچھ فرق نہیں تھا۔

(۴۷)

ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ بیماری کی وہی حالت تھی، اور حکیم صاحب کی مصروفیت بدستور۔ حکیم صاحب کی بیوی کے پاس ان کے بھائی کے خط پر خط چلے آتے کہ تم مع حکیم صاحب اور بچوں کے یہاں چلی آؤ۔ مگر ان سے یہ تو نہ ہو سکا کہ حکیم صاحب کو چھوڑ کر چلی جائیں۔ اور حکیم صاحب سے چلنے کے لئے کہنا ہی بے سود تھا مجبوراً

انھوں نے لڑکوں کو گوالیار بھیج دیا۔ اور خود مع حکیم صاحب کی ایک بیوہ بھاوج کے گھر بھر میں تنہا رہ گئیں۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ حکیم صاحب نے بیوی سے کہا کہ "ذرا پانی رکھ دینا۔ اگر موقع ملا تو بدن پر ڈالوں گا۔"

گیارہ بج رہے تھے حکیم صاحب مطب میں تھے کہ ایک نیا مریض آیا یہ سولہ سترہ برس کا لڑکا تھا۔ بڑا ساقد خوبصورت جسم، بڑی بڑی آنکھیں جو بخار کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں گال تمتمائے ہوئے تھے ماتھے پہ چھوٹا سا سیندور کا ٹیکا تھا۔ اکثر "ابا ابا" چلاتا اور اٹھ بیٹھتا۔ بدن پر ایک پھٹی ہوئی لال لوئی پڑی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا بڈھا باپ تھا۔ اور چھوٹی سی بیوی تھی، جس کا سن مشکل سے بارہ تیرہ برس کا ہوگا۔ مگر پھر بھی گود میں ایک لڑکا تھا۔ لڑکے کو چھپائے گھونگھٹ نکالے سسکیاں لے رہی تھی۔ باپ بھی غم سے بدحواس تھا۔ اس کا یہی ایک لڑکا تھا۔ دو سال ہوئے شادی کی تھی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔ حالت نازک تھی۔ بچنے کی امید کم تھی۔ مگر تھی۔ جب لڑکے کے حواس درست ہوتے گھبرا گھبرا کر بیوی اور بچے کی طرف دیکھتا اور پھر بڈھے باپ کی طرف۔ اس کی بیکسی بھری آنکھیں مستقبل کے خطرات سے سہمی ہوئی تھیں اور ان میں ایسا درد پنہاں تھا جس نے حکیم صاحب کی ہمدردی کو جذب کر لیا۔

حکیم صاحب نے اپنے ہاتھ سے دوا دینا شروع کی سلیمہ کی موت کے بعد سے انھوں نے پہلی مرتبہ ایک مریض کا اتنا خیال کیا تھا۔

ایک گھنٹہ کے اندر مریض کو دو مرتبہ استفراغ ہوا۔ استفراغ کے بعد تھوڑی دیر کے لئے بخار کا زور کم ہو جاتا۔ مگر پھر فوراً تیز ہو جاتا۔ مریض باپ اور بیوی کی پریشانی کے خیال سے ہوشیار رہنے کی کوشش کرتا۔ مگر بے سود۔ اس کی بیماری کی غفلت سے جنگ اور پھر ناکامی باپ اور بیوی کو اور زیادہ بدحواس کئے دیتی تھیں۔ اس نے کئی بار حکیم صاحب سے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بدن میں جھرجھری پیدا ہوئی۔ حکیم صاحب نے دوا دی جس سے فوراً قے ہوئی حکیم صاحب ایسے موقعوں پر اپنی احتیاط بہت کرتے تھے اور عموماً استفراغ کے وقت دور ہٹ جایا کرتے تھے۔ مگر اس مرتبہ انھوں نے خلاف معمول لڑکے کو تھام لیا۔ چھدو جو قریب کھڑا تھا فوراً دوڑ پڑا حکیم صاحب کو دھکا دے کر الگ کیا اور خود لڑکے کو تھامنے لگا۔ باپ نے اس کا ہاتھ ہٹا لیا لڑکے کو ذرا سکون ہوا اور خاموش

لیٹ گیا۔ اذان ہوچکی تھی۔ نماز کا وقت قریب آرہا تھا۔ چھدو نے وضو کے لئے پانی لاکر رکھ دیا تھا حکیم صاحب بار بار آستین اُلٹنا شروع کرتے۔ مگر پھر رک جاتے اور ٹہلنے لگتے۔ آخر وضو کرنے کو بیٹھ گئے۔ استفراغ کے بعد لڑکے کو کوئی دوا دی گئی تھی۔ مگر پانچ ہی چھ منٹ گذرے ہوں گے کہ اس کو پھر ابکائی آئی حکیم صاحب بے تحاشا کھڑے ہوگئے۔ اور چھدو کو دوا تیار کرنے کو بھیجا خود ٹہلنے لگے۔ لڑکے کے منہ سے تھوڑا سا زرد زرد پانی گرا پھر وہی دبی سانس لیتا ہوا لیٹ گیا۔

حکیم صاحب بہت بےچینی سے ٹہلتے رہے۔ چھدو کا انتظار تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آواز دیتے نماز کا وقت گذرا جارہا تھا۔ بڈھے باپ، اور کمسن بیوی کی آنکھیں حکیم صاحب کی نقل وحرکت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ آخر حکیم صاحب ذرا تیز ہوکر مسجد کی طرف چلے۔ سب کو یقین ہوگیا کہ نماز کو گئے، اور ڈیڑھ گھنٹے سے قبل نہیں واپس ہوں گے۔ حکیم صاحب کے راستہ میں ایک بڑا سا بیپل کا درخت لگا تھا جس پر مریضوں کے بھیگے کپڑے سوکھنے کو پھیلے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب کی رفتار سست ہوتی گئی اور درخت کے پاس آکر بالکل معمولی رفتار ہوگئی۔ حکیم صاحب کپڑوں کی طرف دیکھنے لگے۔ اور درخت کے گرد چکر لگاکر واپس آگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو درخت پر کسی چیز کو تلاش کرنے گئے تھے یا ٹہلتے ٹہلتے وہاں تک بڑھ گئے تھے۔ واپس آکر مریض کی نبض دیکھی۔ اتنے میں چھدو دوا لئے ہوئے آیا۔

اور حکیم صاحب کو بالکل خلاف امید موجود پاکر حیرت زدہ ہوگیا۔ اور بولا

" حکیم صاحب!! میں عمل دے لوں گا۔ نماز کا وقت جارہا ہے۔"

حکیم صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا۔ چھدو کے ہاتھ سے دوا لے کر اس لڑکے کو پلائی۔ اپنے سامنے عمل دلایا دو گھنٹہ کے بعد جب اس کی حالت سنبھلتی معلوم ہوئی تو اپنے ساتھ لے کر احاطے میں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کرنے چلے گئے۔ حکیم صاحب کا نماز کو قضا کردینا اتنا حیرت انگیز واقعہ ہوا کہ ایک مریض جو ڈیڑھ ہفتہ سے اُٹھ نہیں پاتا تھا۔ یہ خبر سُن کر مارے حیرت کے بے تحاشا اٹھ کر بیٹھ گیا، اور پوچھنے لگا کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟

مولانا ولایت حسین صاحب یہ خبر سُن کر سناٹے میں آگئے، پھر آہستہ سے بولے " تقاضائے بشریت"۔ پھر آپ نے اس کی دو تین بار تکرار کی ؛

ہندوستان میں صنعت کی موجودہ حالت

صنعتوں کی اہمیت | ہر ملک کے باشندوں کو چاہے وہ ترقی پذیر ہوں یا پس ماندہ اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے زراعتی پیداوار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آبادی کا ایک حصہ تو ہمیشہ زرعی پیشوں میں مصروف رہے گا لیکن آج کل تمام مہذب ملکوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ جہاں تک حالات اجازت دیں معاشی طور پر کسی دوسرے ملک کا دست نگر ہو کر نہ رہا جائے بلکہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود اپنے یہاں پیدا کی جائیں۔ زراعت سے چند ابتدائی ضروریات مثلاً آبادی کے لئے غذا' صنعتوں کے لئے اشیار خام اور برآمد کے لئے زاید پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ زراعت کے بغیر کوئی ملک بھی جس کا حوصلہ یہ ہے کہ اپنی تمام ضروریات خود مہیا کرے اپنا کام نہیں چلا سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی ملک محض زراعت کی بنا پر موجودہ عہد میں دولت مند نہیں بن سکا ہے۔ تہذیب کی ترقی اور انسانی احتیاجات کے اضافے سے' ان پیشوں کا منافع اور اہمیت جو صنعتوں سے وابستہ ہیں بڑھ گئی ہے اور صنعت کی ترقی اب نہ صرف لازمی بلکہ تہذیب کے مترادف سمجھی جانے لگی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں جدید دستور یہ ہو گیا ہے کہ اپنی محنت کرنے والی آبادی کے لئے کام صنعتی اور ضمنی پیشوں میں زیادہ ڈھونڈھا جاتا ہے اور زراعت میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کی تعداد محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح گویا اس بات کو عملاً تسلیم کیا جاتا ہے کہ زراعت میں ایک محدود تعداد سے زیادہ کے کام کرنے سے افراد کی اوسط آمدنی اور قوم کی مجموعی آمدنی گھٹ جاتی ہے لیکن ہندوستان میں یہ معقول طریقۂ عمل ابھی تک رائج نہیں ہوا۔

۱۹۳۰ء میں ان صنعتی کارخانوں کی تعداد جن کے متعلق اعداد و شمار رکھے گئے تھے برطانوی ہندوستان میں ۸۰ ہزار ایک سو ۴۸ اور تمام ملک میں ۹ ہزار ۴ سو ۲۲ تھی صنعتی کارخانہ کی تعریف میں صرف وہ کارخانے آتے تھے جن میں مزدوروں کی تعداد ۲۰ سے کم نہ تھی۔ جتنا سرمایہ ان کارخانوں

میں لگا ہوا ہے اس کے مجموعی اعداد ان اعداد و شمار میں جو چھپتے ہیں علیحدہ علیحدہ فراہم نہیں کیے جاتے ہیں اس لئے ان کمپنیوں کے سرمایہ کو بھی شامل کر کے جن کی رجسٹری سلطنت متحدہ برطانیہ میں ہوئی لیکن کام ہندوستان میں کر رہے ہیں بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے مجموعی سرمایہ کا تخمینہ ماہروں نے ۷ ارب روپیہ کیا ہے۔ اس میں ہندوستانیوں کا حصہ غالباً ۳ ارب سے زیادہ نہیں ہے۔ ممالک متحدہ برطانیہ میں جس کی آبادی ہندوستان کے مقابلہ میں صرف ۱۴ فیصدی ہے۔ ان صنعتی کارخانوں کی تعداد جو ۱۹۲۶ء میں کام کر رہے تھے ایک لاکھ ۷ ہزار ۵ سو تھی۔ صرف صنعتی کمپنیوں میں ۷۰ ارب ۷۴ کروڑ کا سرمایہ یعنی ہندوستانی سرمایہ سے ۲۲ گنا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ ممالک متحدہ امریکہ میں جس کی آبادی ہندوستان کے مقابلہ میں ۵۴ فیصدی ہے ۱۹۲۹ء میں صنعتی کارخانوں کی تعداد ایک لاکھ ۴۴ ہزار ۱۳۶ تھی اور ان میں ۲۳۰ ارب یعنی ہندستان کے مقابلہ میں ۵۷ گنا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ کناڈا کی آبادی ایک کروڑ سے کچھ یونہی زیادہ ہے یعنی ہندوستان کے مقابلہ میں صرف ۳ فیصدی ہے۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں اس ملک میں ۲۴ ہزار ۲۰ صنعتی کارخانے تھے جن میں ۱۴ ارب ۵۴ کروڑ کا سرمایہ یعنی تقریباً ہندوستان سے ۵ گنا سرمایہ لگا ہوا تھا جاپان میں ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کے مقابلہ میں ۱۹ فیصدی آبادی، ۱۳ ہزار ۱۱ صنعتی کمپنیاں ۱۰،۱ ارب ۵ کروڑ یا ہندوستان سے تین گنا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جاپان میں مصنوعہ پیداوار کی قیمت ۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۶ء کی درمیانی مدت میں ۷ گنا زیادہ بڑھ گئی۔ ہندوستان بدنصیب اس عرصہ میں کوئی نمایاں ترقی نہ کر سکا۔

بڑی منظم صنعتوں میں جو لوگ مصروف تھے ان کی تعداد برطانوی ہندوستان میں ۱۹۳۰ء میں ۱۵ لاکھ یا تقریباً کام کرنے والی آبادی کا صرف ایک فیصد تھی۔ تمام ہندوستان میں یہ تعداد ۷۱ لاکھ تھی۔ تمام قسم کی صنعتوں میں مصروف آبادی کا تناسب جس میں کان کنی کی صنعت بھی شامل ہے اسی سال ۱۰٫۲ فیصد تھا۔ درآنحالیکہ سلطنت متحدہ برطانیہ میں یہ تناسب ۴۷٫۲ فیصدی، ممالک متحدہ امریکہ میں ۳۲ فیصدی، کناڈا میں ۲۵ فیصدی، جرمنی میں ۴۱٫۳ فیصدی، فرانس میں ۳۳٫۳ فیصدی اور جاپان میں ۱۹٫۵ فیصدی تھا۔

ہندوستان کے مقابلہ میں جس ترقی یافتہ ملک کو چاہیے رکھیے، ہندوستان سے دوگنے آدمی صنعت پیشہ

انحصار کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس لئے جس مسئلے سے یہ ملک اس وقت دوچار ہے وہ یہ ہے کہ اس تعداد کو کس طرح بڑھایا جائے تاکہ صنعت و زراعت میں ایک معقول تناسب قائم ہوجائے۔

صنعت و زراعت سے جو آمدنی فی کس ہندوستان کو اور دنیا کے پانچ ترقی یافتہ ملکوں کو حاصل ہوتی ہے اس کا مقابلہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

نام ملک	آمدنی فی کس	
	صنعت (روپیوں میں)	زراعت (روپیوں میں)
ہندوستان	۱۲	۵۹
جاپان	۱۵۸	۵۷
سوئیڈن	۳۸۴	۱۲۹
سلطنت متحدہ برطانیہ	۴۱۲	۶۲
کناڈا	۴۷۰	۲۱۳
ممالک متحدہ امریکہ	۷۲۱	۱۷۵

یہ اعداد محض تخمینہ کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان سے زراعت و صنعت کی آمدنیوں کے نسبتی فرق کا پتہ چل سکتا ہے۔ ان کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں صنعتوں سے جو آمدنی فی کس حاصل ہوتی ہے وہ بہت کم ہے۔ برخلاف اس کے جتنے دوسرے ملکوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں دولت کا خاص منبع یہی آمدنی ہے۔ ہندوستان کے ملک کی وسعت اور یہاں کی آبادی کی کثرت کا خیال کرتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ تمام ایسی قوموں کے مقابلے میں جن میں ایک منظم حکومت پائی جاتی ہے ہندوستان کی اہلیت کسب معاش سب سے کم ہے۔

برطانیہ عظمیٰ سب سے پہلا وہ ملک ہے جس نے صنعتوں کو ترقی دے کر اپنی آبادی کی آمدنی

اور معیارِ زندگی کو بلند کیا۔ پھر دوسرے ممالک نے برطانیہ کی پیروی کی۔ مثال کے طور پر ممالک متحدہ امریکہ کو لیجئے۔ یہاں سنہ ۱۹۰۰ء میں صنعتوں سے آمدنی زراعت کی آمدنی کے تقریباً برابر تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد سے جو آبادی زراعت میں مصروف ہے اس میں اس پیشے کے نسبتاً غیر منافع بخش ہونے کی وجہ سے اضافہ نہیں ہوا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ایسے لوگوں کی تعداد جو زراعت میں مصروف تھے ایک کروڑ چار لاکھ تھی لیکن ۳۰ سال بعد بھی یعنی سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ تعداد صرف ایک کروڑ پانچ لاکھ نظر آتی ہے حالانکہ کل آبادی میں اس عرصے میں ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اسی مدت میں صنعتوں اور میکانکی پیشوں میں جو آبادی لگی ہوئی تھی اس کی تعداد دوگنی ہو گئی۔ کناڈا جو جنگ سے پہلے بہت بڑی حد تک زراعتی ملک تھا جنگ کے بعد صنعتی ملک ہو گیا ہے۔ سویڈن ایک دوسرا ملک ہے جس میں سنہ ۱۸۷۰ء میں صنعت و تجارت کے ذریعے سے آبادی کا صرف آٹھواں حصہ کسبِ معاش کرتا تھا۔ آج ان پیشوں سے اس کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ اپنی آمدنی حاصل کر رہا ہے۔ سوویٹ روس میں صنعتوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوگا کہ سنہ ۱۹۱۳ء میں مجموعی پیداوار کا ۱ر۴۲ فی صدی حصہ صنعت سے اور ۹ر۵۷ فیصدی زراعت سے حاصل کیا جاتا تھا لیکن سنہ ۱۹۳۲ء میں پیداوار کا یہ تناسب بدل کر ۷ر۷۰ اور ۳ر۲۹ ہو گیا۔

جن ملکوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی میں بھی جو آمدنی صنعت سے فی کس حاصل کی جاتی ہے وہ زراعت کی فی کس آمدنی سے کم نہیں ہے۔ ایک مثال میں تو (یعنی برطانیہ کی مثال میں) یہ آمدنی ۴گنی زیادہ ہے۔ ہندوستان میں یہ برابر بھی نہیں ہے بلکہ صرف پانچواں حصہ ہے۔

اس وقت لوگ مصنوعہ اشیاء کو جن کی انھیں ضرورت رہتی ہے بیشتر باہر سے منگاتے ہیں (ان میں کچھ روزمرہ کی ضروریات مثلاً کپڑا، لوہا، شکر اور نمک بھی شامل ہیں) اور یہ وہ اشیاء ہیں جنھیں کسی زمانہ میں یہ خود بنایا کرتے تھے۔ اس سے صرف یہی نہیں ہوا ہے کہ صنعت سے براہِ راست جو منافع حاصل ہوتے ہیں وہ تلف ہو گئے ہیں مثلاً ترقی یافتہ مہارت، صنعت کے ذریعے سے حاصل کی ہوئی زیادہ قوتِ خرید بلکہ انھیں صرف ایک واحد غیر یقینی پیشہ یعنی زراعت کی مختصر آمدنیوں سے، درآمد کی ہوئی اشیاء کے دام ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ انتظام درست نہیں ہے کیونکہ آبادی کا دباؤ زمین پر ویسے ہی بہت زیادہ

ہے اور کسان کے منافع میں برابر کمی ہو رہی ہے۔

منظم صنعتوں کے علاوہ باقی تمام دوسری صنعتوں کے اعداد و شمار اس وقت موجود نہیں ہیں منظم صنعتوں میں صرف ان کارخانوں کو شامل کیا جاتا ہے جن میں بیس یا زائد آدمی کام کرتے ہیں۔ برطانوی ہندوستان میں جس قدر آدمی کام کرتے ہیں ان کی تعداد ۱۷ لاکھ سے کم ہے۔ ایسی چھوٹی یا گھریلو صنعتوں کی تعداد جن میں ۲۰ آدمیوں سے کم آدمی کام کرتے ہیں اور جن کا کوئی شمار سرکاری اندراجات میں نہیں کیا جاتا بہت کثیر ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق تمام صنعتوں سے جو آدمی روزی حاصل کرتے تھے ان کی تعداد ۳ کروڑ ۳۱ لاکھ ۷۶ ہزار ۱۰۸ یعنی کل آبادی کا ۱۰ر۴۹ فیصد تھی ۱۹۳۱ء کے لیے یہ اعداد ۳ کروڑ ۴۲ لاکھ یعنی ۹ر۷ فیصد ہیں۔ ان صنعتوں میں جو آدمی واقعی کام کرتے ہیں ان کی تعداد کی رفتار کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد سے ہو سکے گا:۔

سال	تعداد	تناسب فی صد
۱۹۱۱ء	ایک کروڑ ۷۵ لاکھ ۶ ہزار ۲۷۹	۵ر۶
۱۹۲۱ء	ایک کروڑ ۵۷ لاکھ ۱۴ ہزار ۹۰۷	۴ر۹
۱۹۳۱ء	ایک کروڑ ۵۳ لاکھ ۵۱ ہزار ۹۵۳	۴ر۴

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک صنعتی میدان میں برابر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ ہندوستان میں مزدوروں اور کاروبار کی تنظیم ایسی نہیں ہے جیسی ترقی یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے کام کے اوقات مقرر نہیں ہیں۔ ملک کے اکثر حصوں میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں روایتی طریقوں پر کام کو جاری رکھتی ہیں اور انھیں سائنس یا فنی ماہرین سے کسی قسم کی ہدایت نہیں ملتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ جدید مشینوں کی صنعت کے مقابلہ میں غیر منافع بخش ثابت ہوتی ہیں تو ایک ایک کرکے ختم ہو جاتی ہیں۔

ہندوستان کی درآمد | برطانوی ہندوستان میں جو خاص خاص اشیا ۳۲-۱۹۳۱ء میں درآمد کی گئیں ان کی قیمت ایک

ارب ۲۴ کروڑ ۲۰ لاکھ تھی۔ ان میں سے بڑا حصہ یعنی ۸۰ فیصدی چیزیں ایسی ہیں جو ملک کے اندر بنائی جاسکتی ہیں بلکہ ان میں سے بعض اشیاء کو بنانا تو شروع بھی کر دیا گیا ہے لیکن متعلقہ صنعتوں کی تعداد اور پیمانہ نہایت ناکافی ہے۔ ضروری صنعتوں کو شروع نہ کرنے کی وجہ تنظیم کی کمی، حکمت عملی اور کوشش کا فقدان ہے۔ روس کے تازہ ترین اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے یہ حکمت عملی اختیار کی گئی ہے کہ ملک کی تمام ضرورتیں خود ملک میں پیدا کی جائیں اس ملک کی غیر ملکی تجارت کی ایسی قلب ماہیت ہوئی ہے کہ اس کی ۸۰ فیصدی درآمد اشیاء خام، مشینری اور تعمیری اشیاء پر مشتمل ہو گئی ہے اور صرف ۱۵ فیصدی سے کم لائق صرف مکمل طور پر مصنوعہ اشیاء پر۔

ہندوستان کی برآمد | برطانوی ہندوستان میں ۳۲-۱۹۳۱ء میں برآمد اوسط سے کم رہی تھی اس کی قیمت ایک ارب ۵۵ کروڑ ۹۰ لاکھ تھی۔ روئی کی مصنوعات جو برآمد کی گئیں وہ ۹۹-۱۸۹۸ء یعنی ۳۳ سال قبل کے اعداد کے مقابلہ میں صرف ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ تھیں۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں خام روئی جو برآمد کی گئی اس کی قیمت ۲۳ کروڑ ۸۰ لاکھ تھی حالانکہ ۹۹-۱۸۹۸ء میں اس کے مقابلہ کے اعداد صرف ۱۱ کروڑ ۱۹ لاکھ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت خام روئی کو ترقی دینے کی حکمت عملی پر کاربند رہی اور سوت اور کپڑے کی برآمد کی طرف اس نے توجہ نہیں کی۔ گذشتہ ۳۴ سال میں ملک سے روئی کی مصنوعہ اشیاء جو برآمد کی جاتی تھیں ان میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ اب جو اشیاء برآمد کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر (سن کو مستثنیٰ کرنے کے بعد جس کا ہندوستان کو اجارہ حاصل ہے) خام اشیاء اور غذائی پیداواروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان اشیاء کی برآمد کو صرف اس حالت میں ترقی دینا چاہئے جب وہ ملک کی ضرورت سے زیادہ ہوں۔ اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فہرست میں بہت سی ایسی اشیاء ہیں جن کو ملکی صرف یا برآمد کے لئے مصنوعہ یا نیم مصنوعہ شکل دی جاسکتی ہے اور جن کو اس طریقہ پر مقامی محنت کو مصروف کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی یہ کام نہیں کیا جاتا۔

بہت سی اشیاء جو عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں اور جن کے بنانے کے لئے ملک میں اشیاء خام موجود ہیں یا جو ایک زمانہ میں ملک میں بنائی جاتی تھیں غیر ملکوں سے حاصل کی جاتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں ایسی حکمت عملیوں پر عمل درآمد ہو رہا ہے جن سے ملک اپنی ابتدائی ضروریات کے لئے بھی غیر ممالک

کا دست نگر ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے تیس سالوں میں مصنوعات کی کچھ ترقی ہوئی ہے خاص کر سوت اور روئی کے کپڑے کی صنعتوں میں۔ اور لوگوں میں عام طور پر اس بات کا عزم پایا جاتا ہے کہ سودیشی کو ترقی دی جائے یعنی اپنا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں جہاں تک ہو سکے مقامی سرمایہ اور مقامی محنت کو مصروف رکھ کر حاصل کی جائیں۔

واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ ہندوستان کے لوگ زمانہ قبل از تاریخ سے برابر اپنے لیے کپڑا بناتے چلے آرہے ہیں۔ روئی کے کپڑے اور سوت بننے کے لئے ملک میں مواد خام موجود ہے اس لیے انھیں باہر سے منگوانے کے لیے کوئی عذر موجود نہیں ہے تنظیم اور معقول حکمت عملی نہ ہونے کی وجہ سے ملک کو دوہرا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اول تو یہاں کے کاریگر ایسے پیشوں سے جو ان کا حق ہے محروم ہو جاتے ہیں دوسرے وہ روپیہ جو درآمد کی ادائگی میں صرف کیا جاتا ہے اور جس کے ادا کرنے کی یہاں کی آبادی میں قطعی اہلیت نہیں ہے اندرون ملک میں گردش نہیں کرتا بلکہ باہر بھیج دیا جاتا ہے جس سے ملک غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اعلیٰ قسم کے سوتی کپڑے تعیش کا سامان ہیں جنھیں صرف امرا استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر سخت امتناعی محاصل کے ذریعے سے ان کی درآمد بند کر دی جائے تو اس سے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کی جائے گی۔ حکومت کا یہ ابتدائی فرض ہے کہ موجودہ حالات میں اس قسم کے امتناعی محاصل عاید کرے۔

تین قسم کی صنعتیں

تمام صنعتوں کو تنظیم کی سہولت کے لحاظ اور سرمایہ اور پیمانہ کی مناسبت سے تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی (۱) وزنی یا بڑے پیمانہ کی صنعتیں (۲) اوسط پیمانہ کی صنعتیں اور (۳) چھوٹی صنعتیں۔

ان میں وجہ امتیاز سرمایہ کی وہ مقدار ہے جس کی ضرورت ان کے ابتدا کرنے اور فراہمی سامان میں ہوتی ہے۔ وزنی یا بڑے پیمانہ کی صنعتیں وہ ہوں گی جن میں ۳۰ لاکھ یا زاید سرمایہ لگانے کی ضرورت ہوگی اوسط پیمانہ کی وہ ہوں گی جن میں ایک لاکھ یا تیس لاکھ کے درمیان سرمایہ لگایا گیا ہے اور چھوٹی یا گھریلو صنعتوں میں ان کا شمار کیا جائے گا جن کا سرمایہ ایک لاکھ یا اس سے کم ہے اس قسم کی تقسیم غالباً من مانی اور غیر علمی ہے لیکن اس کو اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ سرمایہ کی کمی و بیشی سے ہی عموماً کسی صنعت کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پارچہ بافی کی صنعت ان تینوں قسموں میں شامل ہو سکتی ہے۔

بڑے پیمانہ کی صنعتیں

بڑے پیمانہ کی صنعتیں اس لئے اہم ہیں کہ عموماً ان میں بنیادی یا کلیدی صنعتیں شامل

ہوتی ہیں۔ ان میں ترقی یافتہ مشینری اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں بہت کثیر تعداد میں پیدا کی جاتی ہیں اور ان سے صنعتی انٹرپرائز اپنی اعلیٰ ترین شکل اختیار کرسکتا ہے۔ ذیل کی بارہ صنعتوں کو اس قسم کی صنعتوں کا نمونہ سمجھنا چاہیے:-

(۱) کان کنی ـ کوئلہ، خام دھاتیں اور مٹی کا تیل۔

(۲) لوہا اور فولاد ـ لوہا ڈھالنے والے اور فولاد بنانے والے کارخانے

(۳) انجینیرنگ کی صنعتیں ـ انجنوں، پمپوں اور مشینوں کا بنانا۔

(۴) ریلوے پلانٹ جس میں رولنگ اسٹاک بھی شامل ہے۔

(۵) ہتھیار، بارود اور فوجی ذخائر۔

(۶) تیل کی طاقت سے چلنے والی گاڑیاں اور ہوائی جہاز۔

(۷) زرعی اوزار اور مشینیں۔

(۸) پانی سے پیدا کی ہوئی بجلی اور بجلی کے اوزار اور مشینیں۔

(۹) روئی اور اون کے کپڑے۔

(۱۰) سن کی صنعت

(۱۱) کیمیاوی صنعتیں۔ وزنی کیمیاوی اشیاء

(۱۲) جہاز سازی

وزنی صنعتوں کی طرف ان کی موجودہ حالت میں حکومت، بڑے بڑے تاجروں اور ساہوکاروں کو خاص طور پر توجہ اور پوری امداد کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے بہت بڑے سرمایہ اور بامہارت نگرانی کی ضرورت ہے تاکہ یہ قائم کی جاسکیں اور ان کا معقول انتظام جاری رکھا جاسکے۔ ان پر چونکہ قیمتوں کی تبدیلیوں اور غیرملکی مقابلہ کا بہت اثر پڑتا ہے اس لیے ان کے لئے اس تمام تحفظ اور امداد کی ضرورت ہوگی جو روپیہ کی منظم قوت اور سیاسی اقتدار کے ذریعے سے دی جاسکتی ہے اور جس کے بروقت عطا کرنے کا کام قوم نے حکومت کو تفویض کر رکھا ہے۔

جب صوبوں کی حکومت کو خود مختاری مل جائے گی اس وقت تمام صوبوں کے نمایندوں کو یکجا جمع ہونا چاہئے اور اپنے مشترکہ مفاد کی خاطر تمام ہندوستان کے لئے ایک پلین (منصوبہ) بنانا چاہئے تاکہ مندرجہ بالا بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو قائم کیا جا سکے۔ ہر صوبہ کو اپنے ذرائع اور آبادی کی فطری مناسبت کے اعتبار سے چاہئے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں سے دو یا تین کی ابتدا کرنے اور چلانے کی ذمہ داری اپنے سر لے چاہے ابتدا میں اس میں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اگر ذمہ داری اس طرح تقسیم ہو جائے گی تو کسی ایک صوبہ پر بہت زیادہ بار نہ پڑے گا اور ملک میں بصورت مجموعی تمام ایسی صنعتیں قائم ہو جائیں گی جن کو ایک قومی اہمیت حاصل ہے۔

ہر صوبے کے بڑے بڑے تاجروں اور صناعوں کا حوصلہ بڑھانا چاہئے کہ وہ حکومت کی معقول امداد کے ساتھ اس قسم کی صنعتوں کو شروع کر سکیں۔ جہاں ذاتی سرمایہ کافی مقدار میں فراہم نہ ہو سکے وہاں صوبہ کی حکومت کو مدد دینے کے لئے بڑھنا چاہئے۔ روپیہ قرض لینا چاہئے جیسا کہ مرکزی حکومت نے ریلوے اور آبپاشی کی تعمیر کے لئے لیا ہے اور اپنے صوبہ کے کاروباری طبقہ سے پوری طرح اشتراک عمل کرنا چاہئے۔ زیادہ ترقی یافتہ صوبوں میں بڑے بڑے تاجروں کو اپنے نفع کی خاطر خود مل جانا چاہئے اور ان صنعتوں کو شروع کرنے کے لئے آگے بڑھنا چاہئے اور یہ صورت اس وقت ممکن ہے جب انھیں اس بات کا اطمینان ہو جائے گا کہ حکومت سخت غیر ملکی مقابلہ کی صورت میں یا ایسے دوسرے خطرات کے وقت جن کا مقابلہ ان کی طاقت سے باہر ہے ان کی پشت پناہی کے لئے اپنی پوری قوت اور ذرائع کے ساتھ آمادہ ہے۔ صنعتی ترقی میں صرف اس قسم کی حمایت نہ ہونے کی وجہ سے دقت اور دشواری ہے۔ اگر اس قسم کی حمایت حاصل ہو جائے تو سستی محنت اور وسیع قدرتی ذرائع کی بنا پر ہندوستان چند ہی سال میں صنعتی حیثیت سے بہت زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔

ہر سال ریلوے پلانٹ، رولنگ اسٹاک، ہتھیاروں، گولی بارود اور فوجی ذخائر کے لئے غیر ملکوں میں بہت روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ بعض سالوں میں ۳۰ کروڑ سے لے کر ۴۰ کروڑ تک اس طرح رقوم ادا کی جاتی ہیں۔ بجٹ ۲۸-۱۹۲۷ء میں صرف ریلوے کے جو ذخائر خریدے گئے تھے ان کی قیمت ۳۶ کروڑ روپیہ تھی۔ اگر ایک سال میں جو روپیہ اس طرح خرچ کیا جاتا ہے وہ صرف سرکاری کارخانوں میں ضروری پلانٹ اور مشینری فراہم

کرنے میں لگا دیا جائے اور عارضی طور پر عملہ بھرتی کر لیا جائے تو صرف چند سالوں میں ملک اپنی ضرورت کی چیزیں آپ پیدا کرنے لگے۔ یہی مقصد اس صورت میں بھی حاصل ہو سکتا ہے اگر پرائیویٹ فرموں کو کچھ امداد دی جائے اور مشینری اور پلانٹ معقول شرطوں پر طویل مدت کے لئے ان سے خریدنے کا معاہدہ کر لیا جائے۔

اوسط پیمانہ کی صنعتیں | یہ صنعتیں عموماً مشترکہ سرمایہ سے چلائی جاتی ہیں گو ان میں سے اکثر پرائیویٹ سرمایہ سے بھی چلتی ہیں۔ ان کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ صوبہ کی حکومت متعلقہ محکموں کی معرفت اس بات کا یقین دلائے کہ وہ نئی صنعتیں شروع کرانا چاہتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے اشتراک عمل کے لئے تیار ہے۔ حکومت کو نہایت آمادگی کے ساتھ صوبہ کے قدرتی اور معاشی ذرائع کے متعلق جتنی گزشتہ پیمائشیں ہو چکی ہیں ان کے ریکارڈوں کو بڑے بڑے تاجروں اور ایسے لوگوں کے سامنے جنہیں صنعتوں کے بنانے سے دلچسپی ہے رکھنا چاہئے۔

مقامی پبلک میں جو کاروباری لوگ ہیں انھیں دعوت دینی چاہئے کہ وہ ایسی اسکیموں کو جن سے انھیں دلچسپی ہے حکومت کے سامنے رکھیں۔ تاجروں اور صناعوں کی انجمنوں کو مشورہ دینے کے لئے کہا جائے۔ اگر کسی صنعت کے لئے مقامی یا غیر ملکی ماہروں کا رکھنا اور ان کا صوبہ میں دورہ کرنا ضروری ہو تو ایسے آدمیوں کو بھی صوبہ کی حکومتوں کو ملازم رکھنا چاہئے۔ ان ماہروں کو مقامی تاجروں اور ساہوکاروں سے مشورہ کرنا چاہئے اور نئی صنعتوں کی ابتدائی تجاویز کو حکومت کے سامنے رکھنا چاہئے اور یہ بتلانا چاہئے کہ ان میں سے کونسی ان کی رائے میں نفع بخش ثابت ہوں گی۔ اس قسم کی ابتدائی تحقیقاتیں اگر کی گئیں تو ان سے پبلک کی دلچسپی بیدار ہوگی اور وہ اشتراک عمل کے لئے آمادہ ہو جائے گی اور دس بارہ ایسی صنعتیں ضرور نمودار ہو جائیں گی جن کے متعلق تفصیلی تحقیقات ضروری ہوگی اور ان میں سے کچھ سال کے اندر اندر شروع بھی کی جا سکیں گی۔

ذیل میں اوسط پیمانہ کی کچھ صنعتیں نمونہ کے لئے درج کی جاتی ہیں:-

لوہے کے اوزار ڈھالنے کے کارخانے۔

انجینیری کی صنعتیں جن سے انجن، پمپ اور مشینیں بنائی جاتی ہیں۔

مصنوعہ فولاد

دھاتوں کے برتن بنانے والے کارخانے۔

اونی اور سوتی کپڑے کے متوسط کارخانے اور مصنوعی ریشم کے کارخانے۔

روئی اوٹنے اور دبانے والے کارخانے۔

کیمیاوی اشیا اور رنگ۔

شکر۔

کاغذ۔

دیاسلائی کے کارخانے۔

کیمیاوی کھاد۔

غذا اور مشروبات۔

شرابیں۔

تمباکو کی صنعت۔

صابن اور موم بتیاں۔

ربڑ اور ربڑ کی اشیا۔

ٹائل اور اینٹیں۔

مٹی کی صنعتیں جن میں سمنٹ، شیشہ، پتھر کی اشیا، پائپ وغیرہ شامل ہیں۔

چمڑے کی اشیا، کھالیں چمڑے رنگے ہوئے اور کمائے ہوئے۔

طباعت اور اشاعت۔

فوٹوگرافی اور سنما کی اشیا۔

کلاک اور گھڑیاں۔

ٹائپ رائٹر۔

ان میں سے بہت سی صنعتیں ملک کے مختلف حصوں میں اس وقت بھی چلائی جا رہی ہیں۔ لیکن

ان کی تعداد کم، تنظیم ناقص اور پیداوار قلیل ہے۔ مناسب تامینی پالیسی اور حکومت اور بڑے بڑے تاجروں کے اشتراک عمل سے اس قسم کی صنعتیں بہت تیزی سے ترقی کر سکتی ہیں۔

چھوٹی صنعتیں زراعتی شکل سے تجارتی اور صنعتی شکل اختیار کرنے کے لئے صنعتوں کو دستی صنعت کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ برطانوی قبضہ سے پہلے ہندوستان میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کا بہت رواج تھا۔ اس زمانہ میں ملک کو اپنی تمام ضروریات خود ہی مہیا کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن ذرائع آمد و رفت کی ترقی اور غیر ملکی تجارت کے فروغ سے بہت سی پرانی صنعتیں مثلاً لوہے، فولاد اور نمک کی صنعتیں باہر سے آئے ہوئے مال کے مقابلہ کی اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے تباہ ہو گئیں۔ جدید قسم کی صنعتیں آہستہ آہستہ جاری کی جارہی ہیں لیکن رفتار میں وہ تیزی نہیں ہے جس کا مطالبہ ملک کی وسعت ضروریات اور رفتار آبادی کی تیزی کر رہی ہیں۔ پرانے قسم کی جو چھوٹی صنعتیں بچ گئی ہیں صرف وہ ہیں جو زراعت سے وابستہ ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مقامی صناعوں کی حوصلہ افزائی کی پالیسی پر مستقل طور پر عمل کیا جائے تو چھوٹی صنعتوں کی توسیع کا خاصا امکان پایا جاتا ہے۔ ابتدا میں صرف ایسی چھوٹی صنعتوں کی سرپرستی کرنا چاہئے جو ضرورت کی چیزیں پیدا کرتی ہیں اور جن کی ملک کے اندر طلب پائی جاتی ہے۔

میونسپلٹیوں، لوکل بورڈوں، دیہی پنچایتوں اور مقامی انجمنوں کو چاہئے کہ وہ معقول رعایتیں اور سہولتیں فراہم کر کے اپنے علاقوں میں صنعتوں کی سرپرستی کریں۔ اس سے نہ صرف روپیہ کی گردش اور آبادی کی قوت خرید میں اضافہ ہوگا بلکہ اس سے مقامی حکومتوں کی آمدنی بھی بڑھے گی۔ انگلستان میں مقامی اداروں کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ وہ سرمایہ اور صنعتوں کو ہر طرح کا لالچ دے کر اپنے علاقے میں کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ذیل میں نمونہ کے لئے ایسی دستی، چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی فہرست دی جاتی ہے جنھیں آبادی کا بیشتر حصہ نفع کے ساتھ اختیار کر سکتا ہے:۔

دھاتوں کے کام۔ لوہار، زراعتی اوزار اور مشینیں۔

دھاتوں کے برتن بنانا، تانبا، پیتل، المونیم وغیرہ۔

دستی سوت کتائی اور بنائی، روئی اوٹنا، ریشم کا دھاگہ کھینچنا۔
دری اور کمبل بنانا۔
آٹا پیسنا۔
چاول صاف کرنا۔
تیل کی گھانیاں لگانا۔
غذا کی پیداواریں۔ پھلوں کا ڈبوں میں بند کرنا، مشروبات اور بوتلوں کے پانی۔
سگریٹ، بیڑی۔
اینٹیں، کھپریل اور ٹائل۔
فرنیچر، کرسیاں، میزیں، بنچیں، صندوق، کنگھیاں وغیرہ۔
مٹی کے برتن
چٹائی بنا، ٹوکری اور رسی بنانا۔
جوتا بنانا۔
شہد کی مکھی پالنا۔
کھلونے۔
نباتی رنگ، پالش، سیاہی وغیرہ۔
پنسل بنانا۔
بٹن بنانا۔
صابن بنانا۔
شیشہ کے کام، چوڑیاں۔
تام چینی کے برتن
چھپائی۔

جلد سازی۔

جدید طریقوں پر مکان بنانا۔

جرمنی اور جاپان جیسے ممالک میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو ملک کی دولت آفرینی میں بڑی اہمیت
حاصل ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جرمنی کے ۹۰ فیصدی صنعتی کارخانے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں سے وابستہ
ہیں اور ان میں آبادی کا ۲/۵ حصہ کام کرتا ہے۔ اسی طرح جاپان میں صنعتی کارخانوں کی بیشتر تعداد چھوٹے سائز
کی ہے۔ ایک تازہ تصنیف[1] میں درج ہے کہ ان ۵۵ ہزار نو سو ۴۰ کارخانوں میں سے جن کی فہرست
۱۹۲۰ء میں بنائی گئی تھی ۵۰ فیصدی ایسے تھے جن میں پانچ سے نو مزدوروں تک کام کرتے تھے اور صرف
۵۰ فی صدی ایسے کارخانے تھے جن میں ایک ہزار یا زیادہ مزدور کام کرتے تھے۔

صنعتی نظم۔ اس کے خاص لوازم | صنعتی محکموں کا انتظام کچھ سالوں سے صوبوں کو سپرد کر دیا گیا ہے مگر مرکزی
حکومت نے محاصل درآمد و برآمد کے ذریعے سے صنعتوں کی حفاظت، ساہوکارے کی سہولتوں کی نگرانی، محاصل
ریلوے میں کمی بیشی اور تجارتی اور مالی حکمت عملیوں کی تشکیل کو جن سے صنعتی ترقی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اپنے
ہاتھ میں رکھا ہے۔ صنعتی مشاغل کی طرف پورے طور پر توجہ کرنے کے لئے صوبوں کے وزرا کے پاس نہ روپیہ
ہے اور نہ اختیار۔ اسی لئے باوجود اس کے کہ نگرانی کو ان کے ہاتھ میں آئے چودہ سال گزر گئے ہیں لیکن پھر بھی
صوبہ کی حکومتیں من حیث الجماعت اس قومی ضرورت کی طرف کوئی التفات نہیں کر سکی ہیں۔
صنعتی محکموں کو اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ تنظیم اور تعین حکمت عملی کے بڑے مسائل سے موثر طریقہ
پر کوئی سروکار رکھیں اور بعض صوبوں میں ان کے مشاغل فنی مشورہ اور فنی اور صنعتی تعلیم کے ابتدائی درجوں
تک محدود رہتے ہیں۔

گذشتہ صدی کے آخری سالوں سے ان تاجروں کی کوشش سے جو ہندوستانی اور برطانوی کمپنیوں

---

[1] Harold G Moulton Japan - An Economic and Financial Appraisal (1932) صفحہ ۱۳۲

کو ترقی دینا چاہتے تھے کچھ بڑے پیمانہ کی صنعتیں قائم ہوگئی ہیں۔ بعض صوبوں میں صنعتی پیمائش کے کام بھی جزئی طور پر کئے گئے ہیں اور بقیہ صوبوں میں انفرادی طور پر بعض موجودہ یا مجوزہ اسکیموں پر بھی غور کیا گیا ہے۔ لیکن ان تحقیقاتوں کی نوعیت بہت محدود رہی ہے۔ بڑے پیمانہ کی جو چند صنعتیں پائی جاتی ہیں ان میں اور سرکاری صنعتی محکموں کے تعلقات میں کوئی زندگی نہیں پائی جاتی۔ اس بات کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی کہ ایسے پیمانہ پر ملک کی صنعتی ترقی کو جاری رکھا جائے جس کا ملکی مفاد اور ملک کی وسعت مطالبہ کر رہی ہیں اور ہر چند صنعتوں کا مسئلہ ملک کی بہبود کے مسائل میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن پھر بھی اس یتیم بچے کا آج کل کوئی والی اور وارث نہیں ہے۔

علاج | ملک میں ایک مناسب تنظیم کو شروع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صنعتوں کی ترقی کے لئے ایک تندرست ماحول پیدا ہو سکے۔ ذیل کی چند باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ کرنا چاہیئے۔

(۱) ایک عام ادارہ جس میں حکومت اور کاروباری لوگوں کے نمائندے شامل ہوں تاکہ باہمی اشتراک عمل سے ایک ایسی فضا پیدا ہو سکے جس میں صنعتیں تیزی کے ساتھ ترقی کریں۔

(۲) شہروں، ضلعوں اور دیہی علاقوں کے لئے ایک مقامی ادارہ یا کونسل جو ان معاملات میں مقامی کاروباری آدمیوں کی حوصلہ افزائی کر سکے۔

(۳) محاصل درآمد کے ذریعہ سے تامین و تحفظ۔

(۴) ساہوکارے کی سہولتیں۔

(۵) امداد و شمار کے ذریعہ سے معلومات فراہم کرنے کا معقول انتظام۔

(۶) کمپنی کے قانون اور منیجنگ ایجنسی کے نظام کے لئے ضروری قوانین بنائے جائیں۔

اس کے علاوہ جن ضمنی سہولتوں کی اور ضرورت ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) نمائشیں اور تجارتی میوزیم۔

(۲) تجربہ اور نمائشوں کے مرکز۔

(۳) صنعتی ریسرچ۔

(۴) فنی اور تجارتی تعلیم۔

(۵) غیر ممالک میں ہندوستانی تجارتی کمشنر اور تجارتی معلومات جمع کرنے والے لوگ

(۶) نقل و حمل اور کرایہ کی سہولتیں۔

صنعتی ترقی کا جو مکمل پروگرام اختیار کیا جائے گا اس میں ان تمام سہولتوں کے فراہم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ان میں سے ہر عنوان کے متعلق جو وضاحت طلب امور ہیں ان کی تشریح جامعہ کی کسی اور اشاعت میں کی جائے گی

فاشزم

(بسلسلہ گذشتہ)

اشتراکیت کے بعد فاشزم جمہوری تخیلات کے سارے نظام کا مخالف ہے اور اسے نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے رد کرتا ہے۔ فاشزم اس کا منکر ہے کہ اکثریت محض اس وجہ سے کہ اکثریت ہے انسانی سماج کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ وہ منکر ہے کہ صرف اعداد وقتاً فوقتاً استفسار کے ذریعہ حکومت کر سکتے ہیں، فاشزم تو انسانوں کی ناگزیر، مفید اور کارآمد عدم مساوات کا مقر ہے جسے عام حق رائے دہندگی جیسے میکانکی طریقوں سے کبھی بھی ہموار نہیں کیا جا سکتا۔ جمہوری حکومت میں کبھی کبھی لوگوں کو با اقتدار ہونے کا مغالطہ سا ہو جاتا ہے، حالانکہ اصلی موثر اقتدار پوشیدہ اور غیر ذمہ دار ہاتھوں میں رہتا ہے۔ جمہوریت میں برائے نام تو کوئی بادشاہ نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت میں چاہے وہ غائب ہی کیوں نہ ہو بہت سے بادشاہ ہوتے ہیں اور یہ ایک اکیلے بادشاہ سے کہیں زیادہ مطلق العنان، ظالم اور تباہ کن ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فاشزم نے اگرچہ پہلے سنہ ۲۲ء میں مصلحت کی بنا پر جمہوریت کے موافق رویہ اختیار کیا تھا لیکن روم پر اقدام سے پہلے اسے ترک کر دیا۔ اس لئے کہ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ ہیئت سیاسی کی شکل کا مسئلہ اس وقت تک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اور موجودہ اور گذشتہ شاہیوں اور جمہوریتوں کی مثالوں کا مطالعہ کرنے کے بعد فاشزم اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ شاہی اور جمہوریت کو کسی مطلق معیار سے نہیں جانچا جا سکتا، بلکہ یہ تو محض وہ شکلیں ہیں جن میں کسی خاص ملک کے سیاسی، تاریخی، روایتی اور نفسیاتی ارتقا نے اپنا اظہار کیا ہے۔ فاشزم نے شاہی اور جمہوریت کے نفاذ کو ختم کر دیا ہے حالانکہ جمہوریت اس نفاذ کے خیال کے ماتحت شاہی کی برائیاں جتلانے میں مصروف ہے اور اپنے کو مکمل طرز حکومت جتانے سے نہیں تھکتی، آج یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ جمہوریتیں موجود ہیں جو سخت قدامت پسند مطلق العنان ہیں اور شاہیاں ہیں جن سے مستقبل کی نہایت قیمتی

حامی اور سیاسی امیدیں وابستہ ہیں۔

اپنے افکار فلسفیانہ میں رینان جو فاشزم کا ایک پیش رو تھا کہتا ہے: " عقل اور حکمت انسانیت کی پیداوار ضرور ہیں، لیکن عقل کو لوگوں سے براہ راست نکلا ہوا جاننا اور اسے لوگوں کے عمل کا بلاواسطہ نتیجہ سمجھنا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔ عقل کے وجود کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اسے سمجھ سکے۔ اور اگر ایسا ہونا ضروری ہی ہوتا تب بھی ایک ادنیٰ درجہ کی جمہوریت میں اس کا حصول ناممکن تھا جس کی فطرت ہی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر برتر تربیت کا خاتمہ کر دے۔ یہ اصول کہ سماج کا وجود ان تمام افراد کی خوشحالی اور شخصی آزادی پر منحصر ہے جن سے سماج بنی ہے قدرت کے منصوبوں کے مطابق نظر نہیں آتا۔ کہ قدرت کے کارخانہ میں تو اب معلوم ہوتا ہے کہ صرف نسل کا خیال کیا گیا ہے اور فرد کو اس پر سے قربان کیا ہے۔ اس کا بڑا اندیشہ ہے کہ جمہوریت کے اسے تصور کی (میں یہ ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ لفظ جمہوریت کی مختلف تعبیریں کی جا سکتی ہیں) آخری منزل میں سماج کی یہ حالت ہوگی کہ ایک رذیل گلہ کو سوائے اس کے کوئی کام نہ ہوگا کہ اپنی ادنیٰ خواہشات کے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے۔"

یہ تھے رینان کے الفاظ۔ فاشزم جمہوریت کے اس بے معنی اور رسمی جھوٹ کا منکر ہے جس سے سیاسی مساوات کو جماعتی فقدان ذمہ داری کے پردہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ فاشزم اس جمہوریت کی 'مسرت' اور لا متناہی ترقی کے افسانوں کا بھی منکر ہے۔ لیکن جمہوریت کی مختلف تعبیریں ہو سکتی ہیں یعنی اگر جمہوریت سے مراد سماج کی وہ حالت ہو سکتی ہے جس میں عوام امور سیاسی میں بے اثر نہیں ہوتے تو فاشزم اپنے کو "منظم' مرکزی' با اقتدار جمہوریت" کہہ سکتا ہے۔

فاشزم نے سیاست اور معیشت دونوں میدانوں میں لبرل مسلک سے کامل مخالفت کا رویہ اختیار کیا ہے۔ مناظرہ و مباحثہ میں کامیابی کی خاطر لبرل مسلک کو گذشتہ صدی کی تاریخ میں بیجا مبالغہ سے کام لے کر غیر معمولی اہمیت نہ دینی چاہئیے۔ اور نہ اس مسلک کو جو اس عہد میں منجملہ بہت سے نظریوں کے

ایک نظریہ کے طور پر ظاہر ہوا تھا تمام انسانیت کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مذہب کی حیثیت دیدنی چاہیے یہ مسلک ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوا، اس اتحاد مقدس کے خلاف جس کا مقصد یہ تھا کہ یورپ کو ۱۷۸۹ء سے پہلے والے زمانہ کی طرف دوبارہ لے جائے۔ اس مسلک کی کامیابی کا زمانہ عروج ۱۸۴۸ء تھا جب کہ پوپ پائیس نہم تک لبرل تھا۔

اس سال کے بعد ہی اس میں سوال شروع ہوا۔ اس لئے کہ اگر ۱۸۴۸ء کو روشنی اور امید کا سال کہہ سکتے ہیں تو ۱۸۴۹ء تاریکی اور مصیبت کا سال تھا۔ جمہوریہ روما کو اسی سال ایک دوسری جمہوریہ فرانس نے ایک مہلک ضرب لگائی، اسی سال مارکس نے مذہب اشتراکیت کی ابتدا اپنے مشہور صحیفہ اشتراکیت سے کی۔ ۱۸۵۱ء میں نپولین ثالث نے وہ سیاسی انقلاب کیا جسے کسی حال میں لبرل نہیں کہہ سکتے اور ۱۸۷۰ء تک فرانس میں حکومت کرتا رہا، اور تب جا کر اس عام برکت کی وجہ سے اسے تخت سے اتارا گیا جو تاریخ کی سب سے زیادہ فیصلہ کن شکستوں میں سے ایک شکست فوجی کا نتیجہ تھی۔ اس معرکہ میں فاتح بسمارک تھا جسے نہ اس مذہب آزادی کی کچھ خبر تھی نہ ان پیغمبروں کی جنھوں نے اس مذہب کی تلقین کی تھی۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ ایسی مہذب قوم جیسے کہ جرمن ہیں پوری انیسویں صدی میں اس مذہب آزادی سے بالکل ناواقف رہے۔ یہ چیز بس ایک جملہ معترضہ کے طور پر وہاں آئی جس کی نتائی وہ جماعت تھی جسے "فرانکفرٹ کی مضحکہ خیز پارلیمنٹ" کہتے ہیں اور جو بہت تھوڑے عرصہ قائم رہ سکی۔ ورنہ جرمنی نے اپنا اتحاد قومی لبرل مسلک سے بالکل باہر رہ کر حاصل کیا کہ یہ مسلک تو جرمن ذہن کے لئے بالکل ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ذہن اصلاً شاہ پسند واقع ہوا ہے اور لبرل مسلک منطق اور تاریخ دونوں کے لحاظ سے تاراج کا پیش خیمہ ہے۔ جرمن اتحاد کے حصول میں ۱۸۶۴ء، ۱۸۶۶ء، ۱۸۷۰ء کی تین جنگیں منازل کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں رہنمائی کا سہرا ایسے 'لبرلوں' کے سر ہے جیسے فان مولٹکے اور بسمارک۔

رہا اٹلی کا اتحاد قومی سو یہ بھی لبرل مسلک کا اس سے کہیں کم مرہون منت ہے جتنا کہ مینزنی اور گری بالڈی کا جو لبرل نہ تھے۔ اگر لبرلوں کا مخالف نپولین مداخلت نہ کرتا تو ہمیں لمبارڈی نہ ملتا، اور لبرلوں کی مخالف بسمارک کی مدد سے مسدود اور

میدان میں ناکام ہوتی تو غالباً ہمیں ۱۸۶۷ء میں وینس کا صوبہ نہ ملتا، اور ۱۸۷۰ء میں ہم روم میں داخل نہ ہوسکتے۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۴ء تک وہ زمانہ تھا کہ خود اس مذہب کے پجاری اس کے شام زوال کے دھندلکے کو تسلیم کرنے لگے تھے، کہ ادب کے انحطاط اور عمل کی رجعت نے شکست دے دی تھی۔

لبرل عہد نے ہر طرف بے شمار گتھیاں پیدا کر دی تھیں اور گذشتہ جنگ عظیم کی خونریزی سے ان ... جات۔ کبھی کسی مذہب نے اپنے پیروؤں سے ایسی مہیب قربانی کا مطالبہ نہ کیا ہوگا۔ غالباً لبرل دیوتا خون کے پیاسے تھے! لیکن آج لبرل مذہب کو اپنے ویران مندروں کے دروازہ بند کرنے پڑے ہیں اس کے مندر اس لئے ویران ہیں کہ اقوام عالم نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی پوجا سے، جو معیشت کے میدان میں لا ادریت اور اخلاف و سیاست میں بے پروائی کے مرادف ہے، قوموں کی تباہی یقینی ہے۔ اور موجودہ دنیا کی تمام سیاسی امیدیں لبرل مذہب کی مخالف ہیں۔ اس لئے یہ نہایت مضحکہ انگیز بات ہے کہ لوگ اس مذہب کو تاریخ کے فیصلہ سے ماورا سمجھیں، جیسے کہ تاریخ انسانیت بس لبرل مذہب کے عاملوں ہی کی جولانگاہ ہے، یا جیسے لبرل مذہب ہی مذہب کا ناقابل تغیر قول فیصل ہے۔

لیکن فاسشزم جب اشتراکیت، جمہوریت، اور لبرل فلسفہ کا انکار کرتا ہے تو یہ نہ سمجھ لینا چاہئیے کہ وہ دنیا کو ۱۹۰۰ء سے پہلے والی حالت پر لانا چاہتا ہے، کہ اسی تاریخ کو بعد کی نیم لبرل صدی کا نقطۂ آغاز کہہ سکتے ہیں۔

ہم پیچھے مڑنا نہیں چاہتے فاشزم نے دی میتز کو اپنا رہنما نہیں بنایا ہے جس طرح کلیسائی اقتدار کی بے چون و چرا تسلیم پھر سے پیدا نہیں ہو سکتی اسی طرح مطلق العنان شاہی بس ہو چکی اور پھر سے واپس نہیں آسکتی۔

اسی طرح منصب داری نظام کی رعایتیں بھی ہو چکیں، اور سماج کی تقسیم ایسی ذاتوں میں جن میں باہر سے کوئی داخل نہ ہو سکے ختم ہو چکی۔ فاشزم اور اس قسم کی ہیئت اجتماعی میں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

ایک پارٹی جو پورے طور سے ساری قوم پر حکمراں ہو۔ یہ بھی بالکل نرالی بدعت ہے، اس لئے اس کی مثالیں اور حوالے نہیں ملتے۔ اشتراک، لبرل مذہب، اور جمہوریت میں جو عناصر ابھی زندہ ہیں انھیں فاشزم نے اپنی تعمیر میں استعمال کیا ہے۔ یعنی تاریخ سے جو چیزیں حقایق محکم کی حیثیت سے ملی ہیں انھیں لے لیا ہے اور باقی سب کو رد کر دیا ہے یعنی اس تصور کو کہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے ایک ہی مسلک ایک سا مفید ہو سکتا ہے۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیجئے کہ انیسویں صدی اشتراک اور لبرل مذہب اور جمہوریت کی صدی تھی تو اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ بیسویں صدی میں بھی انھیں کی فرمانروائی رہے۔ سیاسی مسلک آتے جاتے رہتے ہیں، انسانیت باقی رہتی ہے۔ اور یہ توقع کرنا بیجا نہیں کہ یہ صدی حکومت و اقتدار کی صدی ہوگی 'فاشزم کی صدی۔ اس لئے کہ اگر انیسویں صدی انفرادیت کی صدی تھی تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بیسویں اجتماعیت کی صدی ہوگی یعنی ریاست کی صدی۔ اور اس میں کون سی بات منطق کے خلاف ہے کہ یہ نیا مسلک پچھلے مذاہب کے تمام زندہ اور حیات بخش عناصر کو کام میں لائے؟

فاشزم کی اساس ریاست کا تصور ہے، اس کی ماہیت، اس کے فرائض اور مقاصد۔ فاشزم ریاست کو حقیقت مطلق سمجھتا ہے جس کے مقابلہ میں سب افراد اور گروہ اعتباری ہیں، اور صرف ریاست کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے ان کا تصور ممکن ہے۔ لبرل ریاست کا تصور ایک ہدایت کرنے والی قوت کا تصور نہیں ہے جو ایک ہیئت اجتماعی کی مادی و روحانی نشو و نما کی رہنمائی کرتی ہو بلکہ ایک قوت کا سا تصور ہے جس کا کام بس نتائج کا درج کر لینا ہو، برخلاف اس کے فاشستی ریاست میں خود شعور ہے، اس میں اپنی قوت ارادی ہے، اپنی شخصیت ہے، یعنی اسے اخلاقی ریاست کہہ سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں فاشست عہد کے پہلے پنج سالہ اجتماع میں میں نے کہا تھا: "ہم فاشستیوں کے نزدیک ریاست بس محافظ کی حیثیت نہیں رکھتی جس کا کام صرف یہ ہو کہ وہ شہریوں کے شخصی تحفظ کا یقین دلا دے، نہ ان کے نزدیک یہ ایک تنظیم ہے جس کا مقصد خالص مادی ہو مثلاً زندگی کے ایک خاص معیار اور پرامن خوشحالی کی ایک خاص سطح کی ضمانت کرنا۔ اس لئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے تو ایک انتظامی کونسل کافی ہوتی۔ نہ ہماری ریاست خالص

سیاسی تحلیل ہے جسے اس حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں جو افراد اور کل قوم کی زندگی سے عبارت ہے ۔

فاشزم نے ریاست کا جو تصور پیدا کیا ہے اور فاشزم نے جس ریاست کو قایم کیا ہے وہ بجائے خود ایک روحانی اور اخلاقی حقیقت ہے ۔ اس کی سیاسی، عدالتی، اور معاشی تنظیم قومی تو ایک محسوس چیز ہے اور لازم ہے کہ اپنی اصل اور اپنی نشو و نما میں یہ تنظیمات ایک روح کے مظاہر ہوں ۔ ہماری ریاست داخلی اور خارجی تحفظ کی ضامن ضرور ہے مگر ساتھ ہی قوم کی اس روح کی امانت دار اور اسے آگے منتقل کرنے والی بھی ہے جو صدیوں کی ترقی سے پیدا ہو کر ہماری زبان، ہمارے رسم و رواج اور ہمارے مذہب کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے ۔ اور ریاست صرف زمانہ حال ہی کی ایک جیتی جاگتی حقیقت نہیں بلکہ اس کا رابطہ ماضی سے بھی ہے اور اس سے بھی زیادہ مستقبل سے ۔ یوں یہ انفرادی زندگی کی تنگ حدود سے متجاوز ساری قوم کی روح مضمر کی نائب ہے ۔ ریاستیں اپنے کو جن شکلوں میں ظاہر کرتی ہیں وہ بدل سکتی ہیں مگر ایسی شکلوں کی ضرورت ازلی ہے ۔

ریاست ہی شہریوں کو مدنی محاسن کی تعلیم دیتی ہے، یہی ان میں اپنے مقصد حیات کا احساس پیدا کراتی ہے، انھیں متحد کرتی ہے، عدل کے ذریعہ ان کے مختلف اغراض میں یکجہتی پیدا کرتی ہے، اور آنے والی نسلوں تک علوم، فنون، قانون، کی ذہنی فتوحات اور اتحاد انسانیت کا حیات منتقل کرتی ہے ۔ ابتدائی قسم کی قبیلہ وار زندگی سے یہی انسانی قوت کے اعلیٰ ترین مظہر یعنی سلطنت تک لے جاتی ہے، یہ صدیوں تک ان کے ناموں کو باہم مربوط کر دیتی ہے جو اس کے وجود کے لئے ضروری اور اس کے قوانین کی اطاعت میں جان دیتے ہیں ۔ یہ ان فاتحوں کی جنھوں نے اس کی مملکت کے حدود کو وسیع کیا ہے، اور ان غیر معمولی شخصیتوں کی جنھوں نے اسے روشن کیا ہے یاد تازہ رکھتی ہے اور آنے والی نسلوں کے سامنے قابل تقلید مثال کی حیثیت سے پیش کرتی ہے ۔ جس قوم میں ریاست کا تصور دھندلا ہونے لگتا ہے اور انتشار کی قوتیں پھیلنے لگتی ہیں، چاہے افراد کی وجہ سے چاہے مخصوص گروہوں کی وجہ سے، تو وہ قوم زوال کے راستہ پر لگ جاتی ہے ۔

۱۹۲۹ء سے لے کر آج تک کے تمام سیاسی و معاشی تغیرات نے ان نظری بیانات کی صحت کو ثابت کیا ہے اور ریاست کی اہمیت سے ہی ایسی مہتم بالشان ۔ یہی وہ قوت ہے جو نظام سرمایہ داری کے تصادمات کا

حل نکال سکتی ہے، اور بین الاقوامی پیچیدگیوں کو سلجھا سکتی ہے۔

جولس سائمن کی روح کہاں ہے جس نے لبرل مذہب کے دورِ ابتدائی میں یہ اعلان کیا تھا کہ "ریاست کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے کو غیر ضروری بنا دے، اور خود اپنی برخاستگی کی سبیل نکالے"! یا ہمک کلاک کی، جس نے پچھلی صدی کے نصف آخر میں کہا تھا کہ ریاست کو بہت زیادہ حکومت کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے! انگریز نتھم آج یہ دیکھ کر کیا کہتا کہ معیشت کے ہر شعبہ میں برابر ریاست کی مداخلت کا مطالبہ ہوتا رہتا ہے حالانکہ اس کے نزدیک تو صنعت کو صرف یہ چاہیئے کہ ریاست اسے چین سے رہنے دے۔ یا جرمن ہم بولٹ جس کی رائے میں "سست" ریاست کو سب سے اچھی ریاست سمجھنا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ لبرل معاشیوں کی دوسری نسل پہلوں کی بہ نسبت کم انتہا پسند تھی اور خود آدم اسمتھ نے وہ دروازہ کھول دیا تھا (اگرچہ کمال احتیاط کے ساتھ) جس سے معیشت میں ریاست کی مداخلت کی راہ نکلتی ہے۔ پھر بھی جب ہم لبرل مذہب کا نام لیتے ہیں تو مراد ہوتی ہے انفرادیت سے اور جب فاشزم کہتے ہیں تو مراد ہوتی ہے ریاست۔

لیکن فاشستی ریاست ایک انوکھی چیز ہے اور بے مثل۔ یہ قدامت پسند نہیں اس لئے کہ یہ ان عالمگیر مسائل سیاسی کے حل کرنے کی توقع رکھتی ہے جنھیں دوسرے ملکوں میں سیاسی فرقوں کی رقابت، پارلیمنٹ کی غیر معمولی قوت اور سیاسی جماعتوں کی غیر ذمہ داری سے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے معیشت میں یہ مسائل کا حل سنڈیکیٹ کے نظام سے کرتی ہے جس کی اہمیت صنعت اور مزدوروں دونوں کے لئے روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اخلاق میں یہ نظم اور ضبط کا حامی ہے اور ملک کے مسلمہ قانون اخلاق کی اطاعت کرانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ فاشزم چاہتا ہے کہ ریاست مضبوط اور نمو پذیر ہو اور اسے وسیع پیمانہ پر عام پسندیدگی بھی حاصل ہو۔ فاشستی ریاست نے تو اپنے اندر قوم کے معاشی مشاغل کو بھی شامل کر لیا ہے اور مختلف صنعتی جمعیتوں کے اجتماعی اور تعلیمی اداروں کے ذریعہ جو اس نے قائم کئے ہیں اس کا اثر قومی زندگی کے ہر گوشہ میں پہنچتا ہے اور اپنی اپنی تنظیمات کی معرفت قوم کی تمام سیاسی، معاشی اور اخلاقی قوتیں اس میں شامل ہیں۔

یہ ریاست جسے کروڑوں افراد کی حمایت حاصل ہے، جو اس کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں، برابر اس کی قوت کا احساس رکھتے ہیں، اور ہر وقت اس کی خدمت کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ یہ ریاست قرونِ وسطیٰ

کی پرانی ظالم ریاست نہیں ہے، نہ اس میں اور ان مطلق العنان حکومتوں میں کوئی بات مشترک ہے جو ۱۸۰۹ء سے پہلے یا بعد کو رہی ہیں۔ فاشستی ریاست میں فرد گھٹتا نہیں، تقویت پاتا ہے۔ جیسے فوج میں سپاہی اپنے دوسرے ساتھیوں کی وجہ سے کچھ کم نہیں ہو جاتا بلکہ بڑھتا ہے۔ فاشستی ریاست قوم کو منظم کرتی ہے مگر فرد کے لئے آزادی کا کافی میدان چھوڑتی ہے۔ فرد کو بے سود اور غالباً مضر آزادی سے ضرور محروم کیا جاتا ہے مگر جو ضروری آزادی ہے وہ برقرار رہتی ہے۔ ہاں اس بات کا فیصلہ کہ کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری فرد نہیں کر سکتا، صرف ریاست کر سکتی ہے۔

فاشسی ریاست کو نہ بہ حیثیت عام دین کی حقیقت سے بے تعلقی ہے نہ اس مخصوص دین سے جسے اطالوی کیتھلک دین کہتے ہیں۔ البتہ ریاست کسی فرقہ وارانہ دینیات کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ ایک مخصوص اخلاقی تعلیم کو تسلیم کرتی ہے۔ فاشستی ریاست دین کو روح انسانی کے عمیق ترین مظاہر میں سے تسلیم کرتی ہے اور اس لئے اس کا احترام ہی نہیں کرتی بلکہ اس کی حمایت وحفاظت بھی اپنا فرض جانتی ہے۔ فاشستی ریاست نے کبھی خود اپنا نیا خدا تراشنے کی کوشش نہیں کی جیسے کہ روبس پیر اور انقلاب فرانس کے انتہا پسندوں نے کی تھی، اور نہ اس نے انسانوں کے دلوں سے دین کے نقش کو مٹانے کی بے سود سعی کی جیسے بولشوزم کر رہا ہے۔ فاشزم راہبوں اور ولیوں کے خدا اور شجاع شہداء کے خدا کا بھی احترام کرتا ہے اور اس خدا کا بھی جسے سیدھے سادے عام لوگ محسوس کرتے اور جس کے آگے وہ سر عبادت خم کرتے ہیں۔

فاشستی ریاست قوت اور حکومت کے عزم کا مجسمہ ہے۔ اس میں روما کی قوت عمل کی روایت کارفرما ہے۔ فاشزم کے نزدیک حکومت کا اظہار رقبہ مملکت یا فوجی اعتبارات سے اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ اخلاق اور روح کی کیفیات سے۔ فاشزم کو ایک سلطنت سمجھنا چاہئے یعنی ایک قوم جو براہ راست یا بالواسطہ دوسری قوموں پر حکمرانی کرتی ہے جس کے لئے ہرگز ضروری نہیں کہ وہ ان کے رقبہ زمین سے ایک مربع گز بھی فتح کرے۔ فاشزم کے نزدیک اس سلطنت کی توسیع یعنی قوم کی توسیع زندگی کی لازمی نشانیوں میں ہے اور اس کے خلاف صورت انحطاط اور زوال کی علامت۔ جو قومیں ابھرتی ہیں یا زوال کے بعد پھر ترقی کرتی ہیں وہ ہمیشہ

سامراجی ہوتی ہیں، ترک و قناعت زوال اور موت کی نشانیاں ہیں۔ جو قوم اطالوی قوم کی طرح صدیوں کی ذلت اور پردیسیوں کی غلامی کے بعد ابھرنا شروع کرے اس کے رجحانات اور توقعات کی ترجمانی کے لئے فاشزم کا مسلک ہی سب سے زیادہ مناسب ہے۔

سلطنت کے لئے ضرورت ہے ضبط کی، قوتوں کے تعاون باہمی کی اور نہایت گہرے احساس فرض اور ایثار کی۔ اس بات سے فاشستی حکومت کے عملی پہلو کے بہت سے رخ سمجھ میں آسکتے ہیں، ریاست کی بہت سی قوتوں کی ماہیت معلوم ہو سکتی ہے، اور ان سخت کارروائیوں کی وجہ کا پتہ چل سکتا ہے جو ان لوگوں کے خلاف کرنی لازم ہیں جو بیسویں صدی میں اطالوی قوم کی اس ناگزیر حرکت کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں انیسویں صدی کے وہ فرسودہ خیالات پیش کرتے ہیں جنھیں ہر اس جگہ رد کر دیا گیا ہے جہاں لوگوں کو سیاسی اور جماعتی تغیر کے کسی بڑے تجربہ کی ہمت ہوئی ہے۔ قوم کو آج جس قدر حکومت، ہدایت اور نظم کی ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ اگر ہر زمانہ کا اپنا مخصوص مسلک ہوتا ہے تو ہزاروں علامتیں اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ ہمارے زمانہ کا مخصوص مسلک فاشزم ہے۔ اس لئے کہ اگر مسلک کے لئے زندہ چیز ہونا ضروری ہے تو فاشزم نے ایک زندہ یقین پیدا کر دیا ہے اور اس یقین کی قوت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ لوگ اس کے لئے تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور جانیں دیتے ہیں۔

فاشزم کو اب ان مذاہب کی سی عالمگیر حیثیت حاصل ہے جن کی تکمیل دراصل روح انسانی کی تاریخ کی ایک منزل ہوتی ہے۔

وارداتِ نفس

نہ مجھے ابر سے مطلب نہ نمائے بہار ؛ دل کے بہلانے کو تھوڑی سی خوشی ہے درکار
ابر اُٹھا کریں، برسا کرے، بارانِ کرم ؛ سبھی اچھے ہیں، جو دم لے مری چشمِ خونبار
ایک سبزہ ہے کہ مدت ہوئی سوتے سوتے ؛ ایک میں ہوں کہ جو ہوں صبحِ ازل سے بیدار
سینکڑوں پھول ہنسے، سینکڑوں کلیاں پھوٹیں ؛ ٹوٹنا آبلۂ دل کا مگر ہے دشوار
اک شبنم ہے کہ روتی ہے تو دم لے لے کر ؛ ایک میں ہوں کہ نہ ٹوٹا کبھی اشکوں کا تار
بزمِ احباب نہیں، خلوتِ مرقد بھی نہیں ؛ نہیں معلوم ہے زندوں میں کہ مُردوں میں شمار
ساکنِ دہر ہوں کہنے کو، مگر پھیر کیا ہے ؛ آج تک تو کبھی دم بھر نہیں ٹھہرا دلِ زار
قلزمِ اشک میں طوفان کا عالم کب تک ؛ کبھی چڑھتے ہوئے دریا کا نظر آئے اُتار
زورِ ناخن میں نہیں، توتِ غم کے آگے ؛ ایک اک چاک جگر میں نے سیا سو سو بار
خود سے غربت کدۂ دہر میں آیا نہیں میں ؛ اور کے ہاتھ میں تھی باگ مگر تھا میں سوار
وہ خیابانِ عدم، اس سے کہیں بہتر تھا ؛ جس میں گل کا کوئی دھبا تھا نہ سرتابی خار
نہ کوئی نوحہ گرِ بسترِ شبہائے فراق ؛ نہ کوئی نغمہ کشِ صبحِ دل افزائے بہار
نہ سیہ خانۂ غم اور نہ زندانِ بلا ؛ نہ وہاں اہلِ جنوں اور نہ اہلِ آزار
بدعتِ اہلِ جفا پاس نہیں جا سکتی ؛ اس سے نیچا ہے کہیں گنبدِ نیلی کا حصار
تنگیٔ دہر سے جھپکی نہ کبھی آنکھ یہاں ؛ پاؤں پھیلا کے وہیں سوتے ہیں اصحابِ مزار
وہ تو اک جنتِ خاموش تھی کیا ذکر اُس کا ؛ نہ کسی سے کوئی جھگڑا نہ کسی سے تکرار

وہی ٹھہرے ہوئے دل ہیں جو تڑپتے ہیں یہاں
وہی خاموش ہیں جو کرتے ہیں نالے ہر بار

احسن الکلام

لیجئے حسنِ عمل سے کام، احساں کیجئے   کم سے کم کچھ خاطرِ بیمارِ ہجراں کیجئے
ہوکے خود معدوم، نام اپنا نمایاں کیجئے   اُٹھیے بعدِ مرگ بھی جینے کا ساماں کیجئے
جان کو مایوس، دل کو وقفِ حرماں کیجئے   پھر کسی کو چاہیئے، پھر کوئی ارماں کیجئے
ہے دلِ بے مایہ تنہا، اور صدہا تیرِ ناز   کہہ رہی ہے ہمتِ دل سب کو مہماں کیجئے
عشق ہے آوارہ قسمت، حسن ہے ذرات نصیب   آپ کیوں بے چین ہوں، ہم کو پریشاں کیجئے
ہو نہ جائے خونِ دل ناواقفیت میں کہیں   آشنائے درد بن کر دل کا درماں کیجئے
میری وحشت ہی سے ہے جمعیتِ خاطر اگر   بیٹھیے! نظارۂ چاکِ گریباں کیجئے
نقدِ دل دنیا لٹاتی ہے لٹانے دیجئے   آپ کیوں حسنِ گراں مایہ کو ارزاں کیجئے
قیدِ غم میں کس طرح رہتے ہیں ہم آزاد و شاد   یہ تماشا دیدنی ہے، سیرِ زنداں کیجئے
ڈھونڈھ لے گی ہر جگہ چشمِ تصور آپ کو   جلوہ پنہاں رکھیے اپنا یا نمایاں کیجئے
حشر سے پہلے نہو مشقِ خرامِ ناز ختم   جتنے گھر آباد ملتے جائیں ویراں کیجئے
صدقے اس حسنِ تبسم کے، ہنسی جاری رہے   دل کے زخموں پر ہی خالی یہ نمکداں کیجئے

ہو چکی صبحِ قیامت آخر، احسن آپ بھی
ختم اپنی داستانِ شامِ ہجراں کیجئے

غزل

آنکھیں[۵] ہیں بند تیری جو افسونِ خواب سے   تجھ کو جگاؤں نغمۂ تارِ رباب سے
سرمایۂ حیات ہے میرے لئے وہ نور   چھن کر نکل رہا ہے جو بند نقاب سے
برہم ہو نظم ہر دو جہاں ہو جو سامنے   کونین کو قرار ہے اس کے حجاب سے
اُس حُسنِ لازوال سے مجھ بے کمال کو   نسبت ہے وہ جو ذرہ کو ہے آفتاب سے
مجھ سے ہوا نہ شکر ترا ایک بھی ادا   شرمندہ ہوں ترے کرمِ بے حساب سے
زاہد کو فکرِ لذتِ حُسنِ عمل نہیں   اُس کو اگر غرض ہے تو بس ہے ثواب سے
اُس میں یہ حُسن و رنگ و طراوت بھلا کہاں   تشبیہ لب کو دیتے ہیں برگِ گلاب سے
ہر چند سر بہ سر یہ ہو وہ اک نامۂ عتاب   تسکین دل کو ہوتی ہے تیرے جواب سے

ناکامیاب ہوں، مجھے غم نہیں جلیلؔ
خوش ہو رہا ہوں اپنے غمِ کامیاب سے

---

۵ یہ ایک روسی شعر کا انگریزی زبان کے واسطہ سے ترجمہ ہے جو ایک کہانی کے ترجمہ کے سلسلے میں ایک عزیز دوست کے فرمائش پر کیا گیا تھا۔ بعد کو غزل مکمل ہو گئی۔ (ج)

تنقید و تبصرہ

عربوں کی جہاز رانی | از مولانا سید سلیمان ندوی۔ تقطیع چھوٹی حجم ۲۰۰ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ نہایت نفیس۔ قیمت مجلد صرف ایک روپیہ ملنے کا پتہ۔ آصف علی صاحب اصغر فیضی ام اے ۴۳ چوپاٹی روڈ بمبئی ۷۔

یہ کتاب مولانا کے اُن چار خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کے ماتحت ۱۹۳۱ء میں پڑھے تھے۔ مولانا نے اپنی تحقیق کا آغاز عہد جاہلیت کے عربوں سے کیا ہے کہ عرب اس زمانے میں بھی جہاز رانی سے واقف تھے اس امر کا ثبوت انھوں نے بحریات کے عربی الفاظ اور زمانہ جاہلیت کے اشعار سے دیا ہے۔ نیز قرآن پاک کی آیتیں بھی پیش کی ہیں جن میں سمندر جہاز اور کشتی وغیرہ کا ذکر آیا ہے اس کے بعد عہد اسلام میں اس فن کی تدریجی ترقی کا ذکر ہے اس سلسلے میں آپ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح عرب جہاز رانوں نے تجارت' یا جنگی پیش قدمیوں کے سلسلے میں تمام سمندر کو چھان ڈالا تھا اور اسے ایک مستقل فن بنا دیا تھا۔

مولانا نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد یہ مواد جمع کیا ہے اور بڑی خوش اسلوبی سے معلومات کا بہترین ذخیرہ فراہم کر دیا ہے اب تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہ تھی اور آیندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لئے ماخذ کا کام دے گی۔ کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی بہت نفاست سے کام لیا ہے۔ اور قیمت شاید افادۂ عام کے خیال سے بہت کم یعنی صرف ایک روپیہ رکھی ہے۔

نقش چغتائی | (دیوان غالب مصور) از خان بہادر محمد عبدالرحمٰن صاحب چغتائی۔ تقطیع متوسط ضخامت مع تصاویر دو سو صفحات قیمت ۵ر۔

مرقع غالب کے بعد یہ جناب چغتائی کی دوسری کامیاب کوشش ہے۔ اس میں بھی انھوں نے غالب

کے اشعار کی اپنے موئے قلم سے تشریح کی ہے۔ اس مرقع میں اُن کے پہلے مرقع کی طرح رنگوں کا سحر نہیں بجز ایک کے تمام تصاویر یک رنگ ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ فنی اعتبار سے یہ کوشش پہلی کوشش سے کہیں زیادہ کامیاب ہے۔

شروع میں انتساب کے بعد چغتائی صاحب کا مختصر دیباچہ ہے پھر کسی مغربی نقاد کی تقریب یا تعارف ہے اس کے بعد ایک رنگین تصویر ہے اس کے بعد غالب کا دیوان شروع ہوتا ہے پہلا صفحہ رنگین ہے اس کے علاوہ پورا دیوان مرقع کی طرح بلاک پر چھاپا گیا ہے۔ خط نسبتاً باریک ہے جس سے خوش نمائی میں اضافہ ہوگیا ہے دیوان کے بیچ بیچ میں ۱۷۔۱۸ تصویریں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کمال فن کی حامل ہے، ہمیں یقین ہے کہ چغتائی صاحب کا یہ نقش مرقع کی طرح خواص و عوام میں مقبول ہوگا۔

مطلع الانوار | از مولانا مفتی محمد رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ۔ حجم نوے صفحات تقطیع چھوٹی کتابت وطباعت معمولی کاغذ اوسط درجے کا۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

مولانا انوار اللہ خاں مرحوم صدر الصدور و معین المہام امور مذہبی کی ذات اقدس محتاج تعارف نہیں آپ علمائے سلف کا ایک مکمل نمونہ تھے آپ کے علم و عمل اخلاق و روحانیت کا فیض صرف حیدرآباد تک محدود نہ تھا بلکہ ہند و بیرون ہند کے تشنگان علم اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ زیر نظر کتاب ان ہی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے جو ان کے شاگرد رشید مفتی محمد رکن الدین مرحوم نے لکھی ہے، کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور ابتلا میں بھی کیسی مقدس اور جامع ہستیاں ہم میں گذر چکی ہیں۔ مواد کی جمع و ترتیب میں محنت اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے البتہ بعض بعض جگہ حیدرآباد کی زبان کا اثر نمایاں ہے۔

دنیا کی رفتار

(الف) ممالک غیر

جنگ حبش اٹلی اور حبش کی جنگ اسی طرح چل رہی ہے جیسا کہ خیال تھا۔ اٹلی والوں نے شروع شروع میں اچھی کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن بعد کو رفتار اتنی تیز نہ رہ سکی۔ ان صفحات میں اس طرف توجہ دلائی جا چکی ہے کہ اٹلی کے لئے جنگ کی طوالت مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ مالی حالت کی کمزوری، ساری دنیا کی رائے عامہ کی مخالفت، دوسروں ملکوں سے سامان اور ادھار ملنے کی دشواریاں سب یہی چاہتی ہیں کہ یا تو اٹلی جلد از جلد حبش کو ایسی شکست دے کہ اس کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے جائیں یا پھر ابتدائی کامیابیوں کے بعد گفت وشنید کا دروازہ پھر کھلے۔ اور کسی ایسی تقسیم پر سمجھوتہ ہو جائے جس سے اٹلی کو بھی بہت کچھ ملے لیکن دوسرے حقدار بھی محروم نہ رہیں۔ اٹلی نے جب ساری دنیا کے خلاف یہ جنگ شروع کی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی خواہش یہی ہوگی کہ کامل فتح سے یہ مسئلہ ہمیشہ کو طے ہی ہو جائے۔ اسی وجہ سے پیش قدمی کی موجودہ رفتار سے مسولینی غیر مطمئن معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک نئے سپہ سالار کے ذمہ جنگ کی قیادت کی گئی ہے۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رفتار میں معتدبہ اضافہ مشکل ہوگا اور اگر آگے بڑھنے میں بہت تیزی کی گئی تو ممکن ہے پیچھے ہٹنے میں اس سے زیادہ عجلت کرنی پڑے۔ حبش کا ملک بہت دشوار گذار ہے اور حبشیوں کا شبخون والا طریقہ جنگ ایک عظیم الشان جدید فوج کے لئے بہت مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ پھر قدرت کی قوتیں موسم اور بیماریاں، اٹلی والوں کے لئے سد راہ ہیں۔

خود اٹلی کی اندرونی حالت خطرات سے بالکل خالی نہیں ہے۔ مسولینی کی مطلق العنان حکومت بیشک نہایت مضبوطی سے قائم ہے لیکن اس کی جڑوں میں کہیں کہیں گھن لگنا شروع ہو گیا ہے۔ جنگ کی رفتار ایسی نہ رہی جیسی اطالوی چاہتے ہیں تو ممکن ہے کہ یہ گھن زیادہ تیزی سے، حکومت پر قومی اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیں۔ آج بھی خود روما میں ایسی افواہیں سننے میں آتی ہیں کہ مسولینی شاہ اٹلی، وکٹر ایمانول

میں سخت اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک جہاز سپاہیوں کو لے کر جاتا ہے تو دو بیماروں کو واپس لے کر آتے ہیں۔ قصہ مشہور ہے کہ سارڈینیا میں فوج نے جہازوں پر سوار ہونے سے انکار کر دیا اور مسولینی نے خود وہاں پہنچ کر انھیں غیرت دلائی اور میدان جنگ کی طرف روانہ کرایا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مانا کہ یہ افواہیں ہیں لیکن ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر کا ہے۔ اور ایسے واقعات بھی ہیں جن سے ان افواہوں کو تقویت ہوتی ہے۔ مثلاً ابھی گذشتہ چند ماہ میں کئی سو ذہنی کام کرنے والوں کو یکایک گرفتار کر کے قید خانوں میں بند کر دیا گیا۔ روم میں امریکہ کے قنصل خانوں میں صبح سے شام تک ان اٹلی نژاد امریکنوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جو پھر واپس آ کر اٹلی میں رہ پڑے ہیں لیکن اب اٹلی کو چھوڑ کر پھر امریکہ جانا چاہتے ہیں اور اپنی برائے نام امریکن قومیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے اصلی وطن کو ترک کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ جرمن وزارت نشر و اشاعت کا ایک ہدایت نامہ حال ہی میں بعض انگریزی اخباروں کو ہاتھ لگا ہے جس میں وزارت نے اپنے ملک کے اخبارات کو یہ ہدایت کی ہے کہ " اطالوی فوج میں بغاوت کی خبریں بالکل شائع نہ کی جائیں "۔ اگر ایسی خبریں آ نہ رہی ہوتیں تو غالباً یہ ہدایت نہ دی جاتی! ملک کے مختلف طبقے بوجوہ غیر مطمئن معلوم ہوتے ہیں۔ مزدور غیر مطمئن ہیں اس لئے کہ فاشزم نے ان سے تو وہ قوت چھین لی جس سے وہ خود اپنی شرح اجرت کا اچھا سودا کر سکتے تھے لیکن بے کاری کو کم نہ کیا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۳ء تک بیکاروں کی تعداد پانچ گنی ہو گئی تھی۔ اب کچھ کمی ہوئی ہے وہ بھی اس جنگ کے عارضی مشاغل کی وجہ سے۔ فاشزم نے شرح اجرت میں تخفیف سے بھی مزدوروں کو نہیں بچایا۔ ۱۹۲۶ء کے بعد سے اجرتوں کی شرح میں ۱۶ تا ۴۸ فیصد کی کمی ہو گئی ہے۔ اجرتیں گھٹنی تھیں تو گھٹیں مگر اس عہد میں یہ بھی تو نہ ہوا کہ ضروریات زندگی کی قیمتیں بھی ساتھ ہی گھٹ جائیں۔ وہاں تو پچھلے ہی ایک سال میں ۱۲۵ ضروری اجناس کی قیمت میں اوسطاً کوئی ۱۰ فیصدی کا الٹا اضافہ ہو گیا ہے۔

کاروباری لوگ اور سرمایہ دار جو فاسستی ریاست کو اپنی بقا کا ذریعہ جانتے رہے ہیں اور دل و جان سے اس کے حامی و مددگار ہیں وہ بھی کچھ کچھ بھڑکتے جاتے ہیں۔ روز بروز کاروبار میں حکومت کا دخل بڑھتا جاتا ہے، منافع کی شرح تک حکومت کی طرف سے مقرر ہونے لگی ہے، کام کے وقت اور

اجرتوں کے فیصلہ کے معاملہ میں حکومت جا و بیجا دخل دیتی رہتی ہے، کاروبار بڑھانے کے لیے پہلے حکومت سے اجازت حاصل کرنی ہوتی ہے غرض بے شمار ایسے قوانین ہیں جن سے سرمایہ دار کی آزادی بالکل تلف نہیں تو بہت کم تو ضرور ہو جاتی ہے اور ان طبقوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ فاشزم جو ہمارے تفوق کو قائم رکھنے کے لئے اٹھا تھا کہیں دھوکہ دھوکہ میں اشتراکیت کو تو ہم پر مسلط نہ کر رہا ہو۔ اس شبہ کے ساتھ ہی یہ تاریخی بات بھی یاد آجاتی ہے کہ فاشزم کا بانی اور قائد اعظم مسولینی اس تحریک کو اٹھانے سے پہلے آخر تھا تو وہی اشتراکی!

زمینداروں کو فاشستی حکومت کی یہ کارروائی ذرا نہیں بھاتی کہ ان کی جو زمین بیکار پڑی ہو وہ ان سے لے لی جائے، نہ انھیں یہ پسند ہے کہ یہ اپنے کھیت کسانوں کو بٹائی کے اصول پر کاشت کے لئے دینے پر مجبور کئے جائیں۔

ساہوکاروں کے حلقوں میں بھی بے اطمینانی ہے۔ ابھی پچھلے سال دسمبر میں ایک حکم نافذ ہوا کہ جس اطالوی شہری کے پاس چاہے وہ اٹلی میں مقیم ہو یا نہ ہو کوئی پردیسی تمسکات، یا کمپنیوں کے حصے یا بنکوں میں یافتنی رقوم ہوں وہ سب کی فہرست اطالوی قومی بنک میں پیش کردیں۔ پانچ مہینے بعد ایک اور حکم نکلا کہ ان کاغذات کو اسی بنک میں دیدیا جائے۔ بنکوں اور جمعیتوں کو یہ ہدایت ہوئی کہ اپنے تمام تمسکات کو موجودہ شرح مبادلہ پر اس قومی بنک کے ہاتھ فروخت کردیں۔ اطالوی سرمایہ کو باہر جانے سے روکنے کے لئے اور جو سرمایہ باہر جا چکا ہے اسے واپس لانے کے لئے یہ تدابیر خاصی موثر ہیں! اور ساہوکاروں کو ناگوار ہوں تو کیا تعجب۔ پھر اٹلی کا توازن تجارت بھی ملک کے خلاف ہی ہے، کہ آبادی بہت زیادہ ہے اور دولت آفرینی کے وسائل مادی مقابلۃً کم۔ ادھر لیرا کی قیمت کو مصنوعی طور پر ابھار کر اور سونے سے اس کی وابستگی قائم رکھ کر اس صورت حال میں اور بھی ابتری پیدا کردی گئی ہے۔

اور اب مصیبتوں پر مصیبت یہ کہ قائد اعظم نے جنگ کی ٹھان لی ہے، نہ معلوم یہ قصہ کب تک چلے اور اس کا مالی بار ملک سے اٹھ سکے نہ اٹھ سکے۔ یہ ضرور ہے پر اطالوی کا یہ عقیدہ ہے کہ

حبش کو اطالوی سلطنت میں شامل کرنے سے ہی ملک کی مشکلات کا حل ہو سکتا ہے۔ لیکن بہت سے سمجھدار لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ اس کے لئے جنگ ضروری نہ تھی، سیاست کے دوسرے طریقے جن پر خود اٹلی عرصہ سے چل رہا تھا شاید کافی ہوتے کہ دوسروں نے بھی تو ان طریقوں سے دنیا کا کچھ رقبہ اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔ صرف ضرورت اس کی تھی کہ وزارت خارجہ کا کام تجربہ کار ہوشیار معاشیین کے ہاتھوں میں ہوتا۔ اور مسولینی خود ہی وزیر خارجہ نہ بن بیٹھا ہوتا۔ سب کام چپ چپاتے ہو جاتا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ بجائے اس کے مسولینی نے اس قدر شور مچایا کہ ایک غیر مہذب ملک کو ہڑپ کر جانے کا چھوٹا سا معاملہ سیاست عالم کا اہم سوال ہو گیا اور اٹلی ساری دنیا میں نکو بنا۔ اور صرف اسی معاملہ میں نہیں بلکہ اور موقعوں پر بھی اطالوی سیاست خارجہ ایسی رہی ہے کہ سوچنے سمجھنے والے اطالوی اس سے شاکی ہیں۔ ان کو شکایت یہ ہے کہ سیاست خارجہ میں کسی قسم کا تسلسل نہیں۔ سنہ ۳۲ء میں اٹلی جرمن کا دوست تھا، سال بھر بعد اس کا دشمن۔ ابھی فرانس کے یورپی اقتدار کا سب سے بڑا مخالف، ابھی اس کر پریم اور بھائی چارہ۔ انگلستان سے عمر بھر کی دوستی اور دیکھتے دیکھتے تعلقات میں وہ ترشی و تلخی کہ بیان سے باہر۔ فرانس کے یورپی اثر کو مٹانے کے لئے عرصہ تک جنگ کے شکست خوردہ ملکوں سے سازباز رہا۔ پہلے ہنگری کو ساتھ لیا پھر آسٹریا کو۔ بلغاریہ کے بادشاہ کی زوجیت میں ایک اطالوی شاہزادی دی گئی۔ جرمنی کو اکسایا کہ صلح نامہ ورسائی میں ترمیم کراؤ۔

یہ سب کچھ ہوا مگر ادھر ہٹلر کا اقتدار جرمنی میں قایم ہوا ادھر جرمنی سے اَن بن شروع ہو گئی۔ جرمنی نے اسٹریا سے اتحاد کی کوشش شروع کی تو یہ سمجھ میں آیا کہ صلح نامہ ورسائی کی ترمیم کا اثر تو خود اٹلی پر پڑے گا۔ اس تجویز کو شکست دینے کے لئے اسٹریا کو ابھارا گیا کہ وہ بھی ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں عنان حکومت دیدے اور دُول فس کو عام شورش کے دبانے کے سارے ہتھکنڈے سکھائے گئے۔ مگر اس کے ہاتھوں اسٹریا کے اشتراکیوں کا قلع قمع ہو گیا تو پتہ چلا کہ اسٹریا کو نازی جرمنی سے بچانے کے لئے جو قوت تھی وہ اپنے ہی ہاتھوں تباہ ہو گئی اور جرمنی اور اسٹریا کے اتحاد کو روکنا پہلے سے کہیں زیادہ دشوار ہو گیا۔ پھر ہنگری سے اتنی دوستی اور محبت کا اظہار کرنے کے بعد شاہ انگلینڈ کے

قتل کے بعد جنیوا میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور یوں سب کیا کرایا ختم کر دیا۔ ہر چند آج بھی ہنگری پر اٹلی کا اثر باقی ہے مگر جرمنی سے اس کا رشتہ روز بروز مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اور یوگوسلاویا اور بلغاریہ میں اتحاد کی کوششیں روبراہ آتی دکھائی دیتی ہیں سیاست خارجہ کی غلطیاں اور ناکامیاں عام لوگ تو نہیں سمجھتے مگر اوپر کے حلقوں میں ان سے بھی خاصی بے اطمینانی ہے۔

غرض مختلف طبقوں کو طرح طرح کی شکایتیں ہیں۔ مسولینی کا اقتدار قایم ہے۔ اس لئے یہ شکایتیں اہم نہیں معلوم ہوتیں۔ اگر جنگ میں قوم کو توقعات سے کم کامیابی ہوئی تو یہی شکایتیں مسولینی کے خلاف فرد جرم بن سکتی ہیں۔ اور جنگ کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا رنگ اختیار کرے اور کس قدر وقت لے۔

(ب) ہندوستان

سرحدی صوبہ اور ہندی | صوبہ سرحد کے وزیر تعلیم سر عبدالقیوم نے گذشتہ جون میں ملکی زبانوں کے متعلق ایک یادداشت مرتب کی تھی جس کی بنیاد پر حکومت سرحد نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ابتدائی مدرسوں کے نیچے کے درجوں کو چھوڑ کر جہاں ہندی، گرمکھی، پشتو اور اردو وغیرہ کے ذریعہ سے حسب دستور سابق بچوں کو تعلیم دینا جاری رکھا جائے گا، باقی تمام اعلیٰ درجوں مڈل اسکولوں اور ایسے امدادی مدرسوں میں جہاں مذہبی تعلیم بھی دی جاتی ہے ذریعہ تعلیم صرف اردو یا انگریزی رہیں گے البتہ طالب علموں کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ دوسری زبانیں بھی سیکھ سکیں۔ جہاں کہیں طلبا ء اس کی خواہش کریں گے اور انتظام ممکن ہوگا وہاں ان کے سکھانے کا ضرور بندوبست کیا جائے گا۔ لیکن "عام مضامین" کی تعلیم صرف "سرکاری" زبانوں میں ہی دی جائے گی اور اگر امدادی مدرسوں میں اس کی پابندی نہیں کی گئی تو ان کی امداد بند کر دی جائے گی۔

ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے اس فیصلہ پر سخت احتجاج کیا جا رہا ہے۔ اخباروں میں مضامین نکل رہے ہیں گورنروں کے پاس وفد جا رہے ہیں۔ دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں کے

ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ انھیں ان کے مذہب اور تمدن سے محروم کرنے کی دانستہ طور پر کوشش کی گئی ہے اوران کے تحفظ کے لئے یہ ضروری ہے کہ انھیں تعلیم کی ہر منزل پر ہندی اور گرمکھی کو سرکاری، نیم سرکاری اور امدادی مدارس میں ذریعہ تعلیم بنانے کی آزادی ہو اور ذریعہ تعلیم کے اردو نہ ہونے کی وجہ سے وہ حکومت کی سرپرستی اور اعانت سے محروم نہ کئے جائیں۔

حقیقی صورت حال یہ ہے کہ لڑکوں کے تمام مدرسوں میں اردو اس اعلان سے پیشتر بھی ذریعہ تعلیم تھی۔ اس لئے اس جدید فیصلہ سے ان مدرسوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس کا اثر اگر کچھ پڑے گا تو صرف لڑکیوں کے اُن ستر اسکولوں پر جن میں ہندو لڑکیوں کو شاید ہندی اور گرمکھی کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔

وزیر تعلیم نے اپنے اعلان میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے جو دلیلیں پیش کیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) پشتو اور پنجابی گفتگو کی زبانیں ہیں۔ ان کا کوئی تحریری ادب نہیں ہے۔ اس لئے جو لوگ سرحدی صوبہ میں رہنا، کاروبار اور خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ مناسب ہے کہ اُردو کے ذریعہ جو سرحدی صوبہ کی تحریری زبان ہے تعلیم حاصل کریں۔

(۲) اردو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے اس کے اختیار کرنے سے دوسرے صوبوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے میں سہولت ہوگی۔

(۳) چونکہ سرکاری کاغذات اردو میں لکھے اور محفوظ رکھے جاتے ہیں اس لئے عملی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے بھی اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ضروری ہے۔

ہندوؤں کا اعتراض یہ ہے کہ

(۱) ہندوستان کے دس کروڑ ہندو، ہندی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے تعلقات پیدا کرنے کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہندی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

(۲) ہر چند ہندوؤں کی تعداد سرحدی صوبہ میں صرف ۸ فی صدی ہے لیکن لڑکیوں کے مدرسوں میں ان کا تناسب ۶۰ فی صدی ہے اور جو ہندو لڑکیاں مدرسوں میں تعلیم پا رہی ہیں انھیں سیاسی اور مدنی تعلیم

سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ وہ (اگر قطعی طور پر نہیں تو زیادہ تر) تعلیم اس لئے حاصل کرتی ہیں کہ اپنی مذہبی اور تمدنی کتابوں سے مانوس ہو جائیں۔ یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ انھیں اپنی زبانوں اور سادہ روایتوں سے جبراً بے تعلق کرنا درست نہیں۔"

اردو اور ہندی کے جس جھگڑے کا حال اوپر بیان کیا گیا ہے یہ ایک منفرد اور محدود قضیہ نہیں ہے بلکہ یہ ہندو مسلم مسئلہ کا ایک جزوی شاخسانہ ہے۔ جب تک اس بڑے مسئلہ کا کوئی تشفی بخش حل نہیں نکلے گا اس قسم کے فتنے برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں معاشری تعلقات، راہ و رسم، رواداری اور دوستی پیدا نہ ہوگی، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، شادی غمی میں باہم شرکت کے مواقع نہیں نکلیں گے اختلاف کی خلیج برابر بڑھتی جائے گی۔ اگر ایسی ہی صورت حال چند دن اور قائم رہی تو ہندو اور مسلمان ہمسایوں میں اتنا فرق پیدا ہو جائے گا، جتنا دو غیر ملکوں کے باشندوں میں پایا جاتا ہے۔ معمولی گفتگو اور خط و کتابت کے لئے انھیں مترجم کو بلانے کی ضرورت ہوا کرے گی۔ ایک دوسرے کے لباس، وضع قطع، تہذیب، تمدن، مذہب اور رسم و رواج کو اس طرح حیرت سے دیکھا کریں گے گویا کسی دوسرے کرہ پر پہنچ گئے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ نہ خود آزاد رہ کر جی سکیں گے نہ دوسروں کو جینے دیں گے صرف انگریز یا کسی اور غیر ملکی حکومت کا ڈنڈا انھیں ایک جوئے میں کس کر برابر برابر چلا سکے گا اور مشترکہ ضرورت کے کام ان سے لے سکے گا۔ تنگ نظری اور تعصب جو کچھ نہ کرائے کم ہے۔!

رسالہ "ہنس"

اگست کے شذرات میں ہم نے لکھا تھا کہ ہندی کانفرنس منعقدہ اندور نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک ایسا رسالہ نکالا جائے جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ادب بہ ہیئیہ "ہندوستانی" زبان میں پیش کیا جایا کرے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے منشی پریم چند صاحب کے ہندی رسالہ "ہنس" کو "ہنس" کمپنی لمیٹڈ نے اپنے انتظام و نگرانی میں لے لیا ہے اور اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لئے منشی پریم چند صاحب اور کنھیا لال منشی صاحب کا تقرر کیا ہے۔ کنھیا لال منشی صاحب گجراتی زبان کے ایک لایق ادیب ہیں اور منشی پریم چند صاحب (جن سے اردو داں طبقہ بخوبی واقف ہے) اُردو اور ہندی دونوں کے نہایت مشہور افسانہ نگار اور ادیب ہیں ان ہر دو حضرات کی مشترکہ ادارت میں ستمبر اور اکتوبر کے دو پرچے نکل چکے ہیں۔ ان میں ہندی، اُردو، گجراتی، مہاراشٹری، بنگالی، سندھی، کرناٹکی، سنہالی، ملاباری اور دوسری زبانوں کے ادب کو پیش کیا گیا ہے مضامین عموماً ادبی ہوتے ہیں جن میں نظموں، افسانوں، ڈراموں اور ادبی تنقیدوں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

یہ کوشش جس قدر لایق تعریف اور مفید ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جس وسیع ملک کے رہنے والے ہیں وہاں ایک زبان نہیں بولی جاتی بلکہ ۲۲۲ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی زبانیں محض بول چال میں استعمال کی جاتی ہیں اور ان کا تحریری ادب کوئی نہیں ہے لیکن چند زبانیں ایسی ہیں جن کے ادب کا ذخیرہ خاصا وسیع ہے اور انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ۳۵ کروڑ ہم وطنوں کے دل میں کون سے جذبات، کون سی خیالات تمنائیں اور منصوبے پرورش پا رہے ہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنا کوئی خیال، کوئی پیغام ان ۳۵ کروڑ برادران وطن تک پہنچا سکیں تو ان کے ادب سے واقفیت حاصل کرنا بالکل ناگزیر ہے۔ ملک کے رہنماؤں نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں اس کام کی ابتدا کر کے ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنے کا تہیہ کیا ہے اور وہ

یقیناً اس کے لئے مستحق مبارکباد ہیں۔

لیکن "ہنس" کے جو دو پرچے نکلے ہیں ان میں جس زبان کے ذریعہ سے مختلف زبانوں کی مضامین کو پیش کیا گیا ہے، اسے "ہندوستانی" کہنا ہٹ دھرمی ہے۔ پہلے پرچہ میں سوائے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے ایک افسانہ کے اور دوسرے میں ایک نہایت ہی مختصر اردو کی نظم کے باقی کوئی مضمون ایسی زبان میں نہیں لکھا گیا ہے جسے صحیح معنی میں "ہندوستانی" کے نام سے موسوم کیا جا سکے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو چیز اردو میں لکھی جائے صرف وہی "ہندوستانی" زبان کہلائے جانے کی مستحق ہے کیونکہ اردو میں فارسی عربی کے بہت سے ایسے الفاظ آتے ہیں جو اردو ادب نہ جاننے والے ہندوؤں کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آسکتے۔ لیکن عربی فارسی کے بہت سے ایسے الفاظ بھی ہیں جو عام طور پر ہندوؤں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں اور جنھیں روزمرہ کی بول چال میں وہ بلاتکلف استعمال کرتے ہیں۔ انھیں جان بوجھ کر زبان سے الگ کرنا اور ان کی جگہ سنسکرت بھاشا کے الفاظ استعمال کرنا "ہندی" ہو سکتا ہے لیکن "ہندوستانی" نہیں ہو سکتا۔

منشی پریم چند صاحب سے جو اردو اور ہندی دونوں کے ایک بلند پایہ ادیب ہیں ہمیں توقع تھی کہ وہ ایک ایسی صحیح "ہندوستانی" زبان کی داغ بیل ڈالیں گے جو ایک طرف غیر ضروری عربی فارسی اور دوسری طرف سنسکرت بھاشا سے آزاد ہوگی جو بجا طور پر ہندو مسلم میل جول اور ہندوستانی قومیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہوگی اور جس کو اردو اور ہندی دونوں کے ادیب اپنی مشترکہ زبان کہنے میں کسی قسم کا تامل نہ کریں گے بلکہ جس کو بولنا اور لکھنا اپنے لئے فخر و سعادت سمجھیں گے۔ یہ کام منشی پریم چند صاحب کے کرنے کا ہے قوم کی نگاہیں ان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین بہت اچھے ہیں اور انھیں لوگ عرصے تک یاد رکھیں گے لیکن اگر وہ چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان کی یاد کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھیں تو انھیں چاہیئے کہ وقت اور موقع کے اس واحد مطالبے کی طرف وہ سب سے پہلے توجہ کریں۔ اگر ایسی "ہندوستانی" زبان میں رسالہ "ہنس" نکلنے لگے تو ہمیں پورا یقین ہے کہ اس کے ایڈیشن اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں یکساں طور پر مقبول ہو سکتے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے اُن آٹھ خطبات کا مجموعہ جو موصوفہ نے جامعہ میں پڑھے۔

پہلا خطبہ۔ عثمانی ترک بانیان سلطنت کی حیثیت سے۔ دوسرا خطبہ عثمانیوں کا زوال۔ تیسرا خطبہ۔ انقلاب اور جنگ۔ چوتھا خطبہ۔ ترکی اور جنگ آزادی۔ پانچواں اور چھٹا خطبہ۔ ادب و تہذیب ساتواں خطبہ ترکی عورتیں۔ آٹھواں خطبہ۔ موجودہ حالت پر نظر اور مستقبل کی توقعات۔

اصل لیکچر انگریزی زبان میں تھے۔ اُردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کا مقدمہ ہے جو ترکی کی اجمالی تاریخ اور خود مصنفہ کے حالات پر مشتمل ہے طباعت کتابت بہت اچھی کاغذ سفید و چکنا مصنفہ کی تازہ ترین تصویر حجم تقریباً (۳۰۰) صفحات اور قیمت صرف عاً ر انگریزی نسخے کی قیمت سے ؎ ر

نجم السحر

ان گرانقدر ناولوں میں سے ہے کہ ایسے ناول اب تک ہماری زبان میں اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ عذرا اور عذرا کی واپسی کے ذہنی مصنف رائڈر ہیگرڈ کا گویا تیسرا شہ پارہ ہے جو خوشی کی بات ہے کہ مولوی عنایت اللہ صاحب بی۔ اے دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ جیسے بزرگ کے قلم سے ہماری زبان کا سرمایہ ناز بنا۔ جہاں مصنف کا کمال مسلمہ ہے مترجم کی خصوصیات ترجمہ بھی مترجمین کو قیمتی سبق دیتی ہیں۔ طباعت کتابت کاغذ وغیرہ اعلیٰ ۲۶x۱۷/۸ سائز (۳۴۸) صفحے اور قیمت صرف (عہ ر)

تسہیل العربیہ

مدت سے عربی اُردو کی ایک جامع لغت کی تلاش تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ایک ایسا لغت تیار ہوگیا جس میں سات ہزار عربی الفاظ اور ان کے اُردو معانی ہیں نئے علمی لفظ اصطلاحات بھی شامل ہیں نیز قرآن کے محاورات و الفاظ کے معانی بھی خصوصیت سے درج ہیں۔ حجم دیباچے کے علاوہ (۱۰۰۰) صفحات جلد مُطلا قیمت صرف (للعہ ر)

سخنوران ایران در عصر حاضر

ایران کی مردم خیز و شعر آفریں سرزمین شعر و ادب کا مرکز رہی ہے لیکن موجودہ انقلاب کے بعد وہاں کے شاعروں اور راویوں نے بھی پرانے ڈگر کو چھوڑ دیا ہے۔ غرضکہ ایران جدید کی اب ہر چیز جدید ہے اس بلند پایہ تصنیف میں عصر حاضر کے ایرانی شعرا کے حالات ہیں اور انکے کلام کا نمونہ۔ شعرا کی تصاویر کے اعلیٰ بلاک ہیں۔ ہندوستان میں کم کتابیں اس اہتمام سے شائع ہوتی ہیں از پروفیسر محمد اسحاق کلکتہ یونیورسٹی۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت صرف (مـ ۱۸/۱۲ ر)

ڈرامے

پردۂ غفلت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین — عہ/

فاؤسٹ۔ " " " " — للعہ/

انجام۔ پروفیسر مجیب۔ — ۱۲/

کھیتی۔ " " — ۶/

نفرت کا بیج۔ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی — ۸/

نیم شب۔ " " " " — ۸/

نقش آخر۔ " " " — ۱۰/

صید زبوں۔ " " " — ۱۰/

ہمزاد۔ " " " " — ۶/

گناہ کی دیوار۔ " " — ۸/

جلال الدین خوارزم شاہ۔ سجاد حیدر یلدرم — [illegible]

جنگ و جدال " " — ۱۲/

فریب عمل۔ جان گالزوردی — [illegible]

ناتن لیسنگ۔ — [illegible]

انار کلی۔ سید امتیاز علی تاج — [illegible]

ڈرامہ اکبر۔ مولوی محمد حسین آزاد — [illegible]

شہید وفا۔ مولانا عبد الحلیم شرر۔ — ۱۰/

وکرم اروسی۔ کالیداس۔ — [illegible]

سلمیٰ۔ اسکر وائلڈ۔ مترجمہ انصار علی — ۵/

آغاز ہستی۔ برنارڈشا۔ مجنوں گورکھپوری — ۱۲/

حشرات الارض۔ محمد فضل الرحمن۔ — [illegible]

پرواز خیال۔ حکیم یوسف حسن — ۵/

قزاق۔ محمد عمر نور الٰہی۔ — ۸/

مزاحیہ

انتخاب اودھ پنچ۔ منشی سجاد حسین — [illegible]

سرگذشت حاجی بغلول " " — ۸/

ملفوظات حاجی بغلول "ہمدرد" کے مضامین۔ — ۸/

مضامین فرحت۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب مکمل مجلد — [illegible]

پطرس کے مضامین۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری — [illegible]

مرزا جنگی۔ ایم۔ اسلم — [illegible]

چٹکیاں گدگدیاں۔ خواجہ حسن نظامی۔ — ۱۲/

ماہ پروین۔ میر ولی اللہ صاحب — ۱۲/

غنچۂ تبسم۔ تمکین کاظمی۔ — [illegible]

نکات رموزی۔ مجموعہ مضامین ملا رموزی — [illegible]

انتخاب نقیب۔ جناب "ملا" بودھا مئولی۔ — ۸/

نانی عشو۔ مولانا راشد الخیری — ۱۰/

موج تبسم۔ شوکت تھانوی مجلد مصور — [illegible]

سیلاب تبسم۔ " " " — [illegible]

طوفان تبسم " " " — [illegible]

فل بوٹ۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ — [illegible]

کولتار۔ " " — [illegible]

روح لطافت " " — [illegible]

روح ظرافت " " — [illegible]

منتخب لطافت۔ مرزا عبید زاکانی۔ — [illegible]

نمکدان فصاحت۔ میر ولی اللہ صاحب — [illegible]

بزم خیال۔ شعرائے اردو فارسی کی حاضر جوابی — عہ/

لطائف عجیبہ۔ منشی بشیر الدین صاحب — [illegible]

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

تاریخ و تنقید ادب

مقدمہ شعر و شاعری۔ خواجہ الطاف حسین حالی	۴/عہ
آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد	سے ر
تاریخ ادب اُردو۔ رام بابو سکسینہ	لعہ ر
سیر المصنفین۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا۔ دو حصے	۸/عہ
تاریخ نثر اُردو۔ احسن مارہروی۔	صہ ر
گل رعنا۔ مولوی سید عبد الحی مرحوم	صہ ر
شعر الہند۔ مولوی عبد السلام ندوی مکمل مجلد	شے ر
مراۃ الشعر۔ مولوی عبد الرحمن صاحب۔	سے ر
دکن میں اُردو۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب	عا ر
پنجاب میں اُردو۔	عا ر
محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ڈاکٹر محی الدین زور	۱۲ار
مخزن نکات (تذکرہ) مولوی عبد الحق صاحب	۸/عہ
تذکرہ ریختی۔ تمکین کاظمی	عہ ر
چمنستان شعراء	۸/صہ
نکات الشعرا۔ میر محمد تقی میر	۸/عا
ابتدائی شاعری۔ سید محمد علی اشہری	عہ ر
ہندی شاعری۔	عا ر
روح تنقید۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور	۱۲/عہ
تنقیدی مقالات۔ " "	۴/ہے
اُردو کے اسالیب بیان " "	۴/عہ
جدید اُردو شاعری۔ عبد القادر صاحب سروری	سے ر
موازنہ انیس و دبیر۔ مولانا شبلی	ہے ر
تاریخ ادبیات ایران۔ پروفیسر براؤن	للعہ

مقالات و مکاتیب

انتخاب مضامین سرسید۔	۱۲ار
مقالات شبلی چار حصے۔	۱۲/للعہ
نیرنگ خیال۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ دو حصے	۸/عہ
مقدمات عبد الحق۔ دو حصے	صہ ر
افادات سلیم۔ مولانا وحید الدین سلیم۔	۸/عہ
افادات مہدی۔ ایم مہدی حسن	۸/ہے
مقالات نیاز۔ مولانا نیاز فتحپوری۔	۶ ر
ادبستان۔ مولانا خلیقی دہلوی	۸/عا
انتخاب مخزن۔ لاہور۔	للعہ
بقائے دوام۔ ایم۔ اسلم۔	۸/عہ
سیپارۂ دل۔ خواجہ حسن نظامی	عا ر
مضامین چکبست۔ پنڈت برج نرائن چکبست	سے ر
مقالات حالی۔ خواجہ الطاف حسین حالی	۸/ہے
اُردوئے معلیٰ۔ خطوط غالب	۸/عا
عود ہندی۔ "	۱۲ر
خطوط سرسید	سے ر
مکتوبات آزاد۔ مولوی محمد حسین آزاد	صہ ر
موعظۂ حسنہ۔ مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم	۴/عہ
مکاتیب امیر مینائی۔	۸/عا
مکاتیب محسن الملک و وقار الملک	۸/عہ
مکاتیب شبلی۔ دو حصے۔	ہے ر
خطوط اکبر۔ دو حصے	۸/عا
رقعات عالمگیر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر مجلد	للعہ ر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

۲

جنوری ۳۶ء کے نگار میں کیا ہوگا؟

ہندی شاعری کی مفصل تاریخ

ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب

اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات

برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ

ہریجن شاعری کے بے مثل نمونے

ہندی کے عاشقانہ رنگ کے عجیب و غریب دوہے

ہندوستان کی گوپیوں کی شاعری

قیمت فی پرچہ دو روپیہ — نگار کے سالانہ خریداروں سے کچھ نہیں

نگار کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے

جنوری ۳۵ء کا نگار جو اُردو شاعری کے لئے وقف تھا اب بھی دو روپیہ میں علاوہ محصول ملسکتا ہے

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ایل-۱۸۹۲

جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ صہ | مطبع جامعہ دہلی | فی پرچہ ۸ر

ناول

- جویائے حق۔ مولانا عبدالحلیم شرر دو حصے — للعہ/
- زوال بغداد۔ " " — ۸/ عہ
- ایام عرب۔ " " دو حصے — ۸/ عہ
- حسن و سرور۔ حکیم محمد علی — للعہ/
- جعفر و عباسہ " " — ۱۲/ عہ
- امراؤ جان ادا۔ مرزا محمد ہادی رسوا مرحوم — ۱۲/
- چوگان ہستی۔ منشی پریم چند دو حصے — ۱۲/ للعہ
- گوشہ عافیت۔ " " — ۱۲/ سے
- پردۂ مجاز " " — ۴/ عہ
- عورت کی محبت۔ مصنفہ سدرشن — عہ/
- ایامیٰ۔ مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم — ۴/ عہ
- ابن الوقت " " " — ۸/ عہ
- منازل السائرہ۔ مولانا راشد الخیری دو حصے — عہ/
- تائیس۔ مولوی محمد عنایت اللہ صاحب — ۴/ عہ
- نجم السحر " " — ۸/ عہ
- شمیم۔ — للعہ/
- شوکت آرا بیگم۔ — ۶/ سے
- خونابۂ عشق۔ مسٹر آرتھر کانن ڈائل — عہ/
- شاہد رعنا۔ قاری سرفراز حسین عزمی — ۸/ عہ
- جور فلک۔ ایسٹلن کا ترجمہ۔ تین حصے — عہ/
- خواب ہستی۔ مرزا محمد سعید — عہ/
- عذرا۔ مولوی خلیل احمد صاحب — ۱۲/ عہ
- عذرا کی واپسی۔ " — عہ/

افسانے

- کیمیاگر۔ پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے۔ (آکسن) — عہ/
- نگارستان۔ مولانا نیاز فتحپوری — عہ/
- پریم پچیسی۔ منشی پریم چند دو حصے مجلد اعلیٰ — سے/
- پریم بتیسی۔ " " — ۸/ سے
- پریم چالیسی — ۸/ سے
- دامن باغباں۔ ڈاکٹر سید احمد بریلوی — عہ/
- بنگال نیسی۔ مترجمہ سدرشن۔ دو حصے — ۴/ سے
- حجابات زندگی۔ سید عابد علی صاحب بی اے ال ال بی — ۱۲/
- دنیا کے بہترین افسانے — عہ/
- قدیم افسانے۔ عبدالقادر صاحب سروری — عہ/
- دلگداز افسانے۔ کوثر چاندپوری — عہ/
- دلچسپ افسانے۔ " " — ۴/ عہ
- ہفت پیکر۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری — ۴/ عہ
- خیالستان۔ سید سجاد حیدر یلدرم — ۸/ عہ
- حکایات و احتساسات " " — ۴/ عہ
- ہیبتناک افسانے۔ موریس لیول مترجمہ امتیاز علی تاج — ۸/ عہ
- رفیق تنہائی۔ سید علی عباس حسینی — عہ/
- چار چاند۔ حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی — عہ/
- پیغام سروش۔ ایم۔ اسلم — ۱۲/ عہ
- عروس غربت۔ " " — ۴/ عہ
- سیر گل۔ خلیل احمد قدوائی — ۸/ عہ
- افسانہ ہائے عشق۔ حامد علی صاحب ایڈیٹر ہمایوں۔ — ۴/ عہ
- خواب و خیال۔ مجنوں گورکھپوری۔ — عہ/

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

بسم اللہ

جامعہ

جلد ۲۴ | دسمبر ۱۹۳۵ء | نمبر ۱۲

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

روسی مسلمانوں کا ادب

(ماخوذ از رسالہ REVUE DES ETUDES ISLAMIQUES)

(۲)

ترک آذربائیجاں

(کومریڈ ایک برلی کی رپورٹ)

عہد قدیم اور قرون وسطےٰ کی ممتاز ادبی شخصیتیں آذربائیجاں کے ادب کی ابتدا آٹھویں صدی سے ایک شاعرہ زبیدہ خاتون کی تصانیف سے ہوئی۔ ہمارے تاریخی ماخذ اتنے کم ہیں کہ ہم نوی صدی ء کے ادب کی نسبت کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ زبیدہ خاتون کے بعد داوا گوگت نے شہرت حاصل کی، جو دسویں صدی میں گذرا ہے۔ پھر آذربائیجاں میں اسلام پھیلا، ترکی عورت کی حیثیت گھٹ کر لونڈی کے برابر ہوگئی[5] اور اس بے عزتی سے بچنے کے لئے عورتوں نے بغاوت کی۔ ان کی رہبر ایک شاعرہ محستی خانم تھیں۔ بارھویں صدی میں ابوالعلا گنجوی نے بہت نام پیدا کیا۔ وہ "معمار سخن" کہلاتا ہے۔ اس کے کلام کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"میں اپنے معاصرین کا علم بردار ہوں۔ گنج والے میری قسمیں کیوں نہ کھائیں جب شاعر سب مجھے اتنا مانتے ہیں کہ میری نقل کرتے ہیں۔ مجھے اس اعتبار کا حق بھی ہے، کیوں کہ میں شاعروں کا سردار اور رہبر ہوں۔"

لیکن گنجوی کے حسن بیان اور کلام کی فنی قدر و قیمت کے باوجود آج کل کے انشا پرداز،

---

[5] یہ صریح جھوٹ ہے۔ عورتوں کی حیثیت گھٹنے اور ان کے حقوق سلب ہونے کا سبب ایرانی اور بازنطینی تہذیب کے اثرات تھے۔ ملاحظہ ہو:۔ خالدہ ادیب کی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" ساتواں لیکچر۔

جو " گنج سرخ " کہلاتے ہیں۔ اس کی تصانیف سے کوئی فیض حاصل نہیں کر سکتے، انھیں اپنا موروثی حق نہیں ٹھہرا سکتے، اس لئے کہ گنجوی نے دل و جان سے اپنے آپ کو دربار کے حوالے کر دیا تھا اور اپنے کلام کو امرا اور اشراف کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں مشہور شاعر شیخ نظامی، جنھوں نے ابوالعلا گنجوی کے بعد میدان ادب میں قدم رکھا، پہلے کی طرح اب تک عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور ان کے کلام میں وہی تازگی ہے جو آٹھ صدی پہلے تھی۔ یہ زبردست مفکر اور آرٹسٹ جن کی تصانیف کا یورپی اور ایشیائی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اپنے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

" اگر تو اس صدی میں کسی سے پوچھے کہ وہ کہاں ہے، تو شاعر کا ہر شعر ایک صدائے بازگشت کی طرح بتائے گا کہ یہاں!"

شیخ نظامی نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ چھوڑا ہے جو " پنج گنج " کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بعض تصورات پر دائمی حقیقت کا رنگ کیسا چڑھا ہوا ہے۔ وہ زیادہ تر الحاد کے مسئلے پر بحث کرتے ہیں اور دیوتاؤں اور مذہبی رہنماؤں کو بری طرح لتاڑتے ہیں۔ شاہی حکومت اور جاگیری نظام معاشرت کی بھی انھوں نے خوب خبر لی ہے۔ عوام میں انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، ان کے شعر اب تک لوگوں کی زبانوں پر ہیں، اور محبت اور احترام نے ان کی شخصیت کو ایسا چمکایا کہ اب تک اس کی روشنی دھیمی نہیں پڑی ہے۔ شیخ نظامی مشرقی دنیا کی نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور اس لئے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی تصانیف کے ترجمے اور اشاعت کی کتنی ضرورت ہے۔

چودھویں صدی کے آخر میں عمادالدین نسیمی، جن کا شمار آذربائجان کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے، محفل ادب میں رونق افروز ہوئے۔ تبلیغی شاعری کے علاوہ ان کی بعض تصانیف ایسی ہیں جن میں زندہ دلی اور تشبیہ اور استعارے کی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ ان کا بیان نہایت نفیس اور دلگداز ہے، اور وہ آذربائجان کے ترکی ادب کے بانی مانے جاتے ہیں۔

کوئی چار سو برس سے فضولی ترکوں کے دلوں کو گرویدہ کئے ہوئے ہے۔ وہ ایک بے مثل شاعر تھا، اور اس کی تصانیف ایک بہت غیر معمولی قابلیت کا پتہ دیتی ہیں۔ دور جدید میں فضولی نے روسی اور یورپی

مستشرقین سے بھی داد وصول کی ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کلام ترکی شاعری کا مثالی نمونہ ہے فضولی اشراف کے مذاق سے نا آشنا تھا اور عوام کے مذاق اور حوصلوں کو خوب سمجھتا تھا، اس نے کبھی دربار کی غلامی نہیں کی، اور اس نقطۂ نظر سے اس کی تصانیف بے عیب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک بڑا شاعر اور مصور مانا جاتا ہے۔ آذر بائیجانی ادیبوں کے اس سر تاج نے ترکی زبان کی نشو و نما میں بھی بہت مدد دی، کیونکہ ترکی اس وقت تک محض عربی اور فارسی الفاظ کی ایک آمیزش تھی۔

فضولی کا خاص میدان غزل ہے۔ اپنے شاہکار "لیلیٰ مجنوں" میں اس نے آزاد عشق، اور مردوں عورتوں کی مساوات کی تعلیم دی، اور اپنے زمانے کے رسم رواج کی پردہ دری کی۔ ترکی تھیٹروں میں یہ قصہ اب تک بڑے شوق سے دیکھا جاتا ہے۔

صبح انقلاب | اٹھارہویں صدی کے شاعر واقف کی تصانیف ترکوں کی قومی شاعری کی نشو و نما کے ایک قدم آگے بڑھنے کا ثبوت ہیں۔ اس کی خاص تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس میں عوام کی شاعری کی طرف رجحان پایا جاتا ہے، اور اس نے گیتوں کو رواج اور ترقی دینے کی بڑی کوشش کی۔

اس کے بعد انیسویں صدی میں باقی خائف، قاسم بے ذاکر، اور اخوندف نے ادبی تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ اگر ہم واقف اور ذاکر کا مقابلہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ذاکر کا حقیقت اور معاشرتی حالات سے بہت زیادہ گہرا تعلق تھا، اور جمہور اور اس کی زندگی سے وہ بہت زیادہ قریب تھا۔ ذاکر اس زمانہ میں، جب زار کی حکومت آذر بائیجان کو لوٹ رہی تھی، اور وہ ان زمینداروں کا نمائندہ ہے جن کے مال و دولت کو روسی غارت کر رہے تھے۔ ذاکر کے طنزیہ کلام میں اس زمانے کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تغیرات کے بہت سے اشارے ملتے ہیں، اور اسی وجہ سے اس کی خاص حیثیت ہے۔ پھر بھی ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ذاکر قدامت پسند تھا، اور ترقی کے جو آثار اس وقت تھے وہ اسے نظر نہیں آئے انیسویں صدی کے دوسرے حصے کے معاشرتی تصورات فتح علی اخوندف کی تصانیف میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اخوندف ایک بہت بڑا عالم تھا جس نے یورپی تہذیب کے بہترین عناصر کو جذب کر لیا تھا۔ اس کی تصانیف ایک تصویر خانہ ہیں جس میں ہر قسم کے لوگوں کی شبیہیں ملتی ہیں، جیسے تاجر، چھوٹے زمیندار، ایرانی نسل کے

ادنے سرکاری ملازم، حاکم، مولوی، من چلے وغیرہ، اور ان کی صورتوں اور سیرتوں میں وہی رنگا رنگی ہے جو روس کے بڑے حقیقت نگاروں کے کارناموں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف "حاجی قرا" میں نئے سرمایہ داروں کی حوصلہ مندی اور لالچ، اور چھوٹے زمینداروں کے عنقریب ناپید ہونے والے طبقے کی ذہنیت کا خاکہ خوب اتارا گیا ہے۔

اخوندف نے عورتوں کی مظلومیت اور مردوں عورتوں کے درمیان عدم مساوات کے خلاف زور شور سے احتجاج کیا۔ اس کی ہر ہیروئن عام طور سے بڑی ہنرمند، ذہین اور تیز ہوتی ہے۔ وہ ترکوں کی زندگی کو یورپی رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ اپنے مزاحیہ ڈراموں میں اس نے مدرسوں اور دینی درسگاہوں پر، جہاں نوجوان اپنا وقت ضائع کرتے تھے بڑی معاندانہ تنقید کی ہے، اور اسی کے ساتھ زاری حکومت کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ لیکن اس کا خاص حملہ ایران کی زندگی اور طرز حکومت پر تھا، اور یہیں اس کی تلوار کی دھار سب سے زیادہ تیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اخوندف نے نظام جاگیری، تنگ نظری، سرکاری ملازموں اور ملاؤں کی تنگ نظری اور حرص کا بھی بھانڈا پھوڑ دیا۔

یہ ڈرامے سب سیدھی سادی عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں، اور ان کی بدولت عام مذاق کو بہت ترقی ہوئی۔ اس اعتبار سے اخوندف نے زبان اور طرز بیان میں بڑی جدت کی، کیونکہ اس نے پرانا اسلوب، جو ادب سے لطف اندوز ہونا ایک بہت چھوٹی جماعت کے لئے مخصوص کر دیتا تھا، بالکل ترک کر دیا۔ لاطینی حروف اختیار کرنے کا مسئلہ سب سے پہلے اسی نے چھیڑا، اور یہ بھی اس کے کارناموں میں شمار ہونا چاہیئے۔

اخوندف پہلا ترکی ڈراما نویس تھا اور وہ قومی تھیٹر کا بانی مانا جاتا ہے۔

ترکی سرمایہ داروں کی جماعت ایسے زمانے میں پیدا ہوئی جب پیٹرول کی تجارت بڑھ رہی تھی، اور اس میں اپنی ذات کا احساس بھی بہت تھا۔ اسی کے بل پر اس نے عقائد اور تہذیب کو ایک نئی شکل دی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس کے تسلط کو قائم رکھے۔ رسالہ "فیوضات" جو مشہور لکھپتی تاگیف کی سرپرستی میں جاری ہوا، سرمایہ داروں کی زبان بن گیا۔ اپنی اشاعت کے پہلے ہی دن سے اس نے قدامت پسندی،

ترک اتحاد، اتحادِ اسلام اور قومیت کی حمایت شروع کر دی۔ "فیوضات" کے حلقے کے مصنف۔ علی بک، محمد ہادی۔ عوام سے علیحدہ رہے، اور قوم ان سے بیگانہ رہی، کیوں کہ ان کی تصانیف عوام کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں۔ لیکن اپنا کام وہ کر گئیں، اور سرمایہ داروں کی خود پسندی کو بڑی وفاداری کے ساتھ سراہا۔

دوسری طرف، ادنیٰ سرمایہ داروں کی جمہور، جس میں روس کی انقلابی تحریک نے جان ڈالی تھی، اپنے عقائد کا ایک رسالہ میں اظہار کرتی رہی جو ۱۹۰۶ میں قائم ہوا اور جس کا نام "ملا ناصر الدین" تھا یہ رسالہ زاری حکومت اور ملاؤں کے تسلط کا دشمن تھا، اور اس میں استبداد، تشدد، مذہب، تاریک خیالی اور مزدوروں اور کسانوں کو لوٹنے کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ صابر، ایک شاعر جو "ملا ناصر الدین" کے حلقۂ ادارت کا نمائندہ ٹھیرایا جا سکتا ہے، طنزیہ رنگ میں بہت تند و تیز ہو گیا اور اس کا کلام ٹکسالی مانا جاتا ہے۔ اس کے مضامین اور رسالے، اس کا مشہور "خپ خپ نامہ" ایسے کارنامے ہیں جنھوں نے وطن کے باہر بھی لوگوں کو اس کے نام سے آشنا کر دیا ہے۔

۱۹۱۹ کا سال ایسا گذرا ہے جو آذربائجان کی تاریخ پر ایک دھبہ ہے۔ "مساواتیوں" کا تسلط ترکی ادب کی تاریخ میں ایسے صفحات چھوڑ گیا ہے جن سے آذربائجان کی بے آبروئی ہوتی ہے، جن میں زہر اگلا گیا ہے اور خود پسندی کا ڈنکا بجایا گیا ہے۔ محفل ادب بہت سے نا اہلوں سے بھر گئی جو سرمایہ داروں اور زمینداروں کی چاپلوسی کرتے تھے، اور ملک میں فساد پیدا کر کے اس کے بڑے شاندار نام رکھتے تھے۔ "مساواتی" مصنف قومیت کو رواج دینا چاہتے تھے اور ترکی اور آرمینی بھائیوں کو اشتعال دے کر ایک دوسرے سے لڑاتے تھے۔ اس دور کی تصانیف، جو بس کہنے کے لئے "ادبی" ہیں کوئی قدر نہیں رکھتی ہیں۔

سوویٹ عہد کا ادب | اپریل سنہ ۱۹۲۰ء سے آذربائجان کی ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس وقت تک قومیت اور سرمایہ داروں کی ذہنیت ترکوں کے ادب پر حاوی رہی تھی۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں "قزل قلم" پرولتاری مصنفوں کا اتحاد، قائم ہوا، اس نے پرانے عقائد اور ذہنیت کے خلاف جم کر لڑنا اور تہذیبی انقلاب اور لینن کی تعلیمات کی حمایت کرنا شروع کیا۔ وہ مزدور جنھوں نے خط و کتابت

کے ذریعہ انشا پردازی کی مشق کی تھی اس کے گرد جمع ہوگئے، اور نئے شاعر اور نثار نمودار ہونے لگے۔

اس ادبی حلقے کا نمائندہ ، سلیمان رستم' آذربائجان کے پرولتاری ادب کا ہراول ہے' اور اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ' "رنج سے راحت تک" ادبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پرولتاری نثر کے لئے 'نذر علی' ایک اشتراکی نے مفید محرک کا کام دیا۔ خانہ جنگی کے متعلق اس نے جو ناول لکھے ہیں وہ ہر طرح سے قابل قدر ہیں۔ اس حلقے کے اور ممتاز اراکین فاروق، فیضی، اسماعیل حافظ' ابوالحسن وغیرہ ہیں۔ اس تحریک کے ایک ہمدرد' مشہور ڈراما نویس جعفر جبرلی نے سیاسی اور علمی موضوعوں پر پرولتاری پہلو سے بحث کی ہے۔

۲۳ر اپریل ۱۹۳۲ کو اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے جو فیصلہ کیا اس کا آذربائجان میں دس بارہ نئی کتابوں کے ذریعہ خیر مقدم کیا گیا جن میں نظموں کے مجموعے ہیں اور ناول بھی۔ اشتراکیت کی تعمیری کوششوں نے کئی پرانے مصنفوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے' اور بہت سے قابل نوجوان مصنفوں کی جماعت میں شامل ہوگئے ہیں۔ اس طرح پرولتاری مصنفوں کے اتحاد کے اراکین تعداد میں اب ساٹھ کے قریب ہیں۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک ہمارے یہاں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں جتنی کہ انقلاب سے پہلے پندرہ برس میں (یعنی ۱۹۰۵ تا ۱۹۲۰) اور یہ وہ زمانہ تھا جب "مساواتی" جو اپنے سوا کسی کو قومی تہذیب کی نمائندگی کرنے کا حق نہیں دیتے تھے' حکومت کر رہے تھے۔

آذربائجان کی پرولتاری شاعری ابھی تک بچپن کی کمزوریوں اور بیماریوں میں مبتلا ہے' اور اسی وجہ سے ابھی اس میں بہت سی خامیاں ملتی ہیں۔ انھیں دور کرنے کے لئے حقیقت نگاری کے اشتراکی طرز کو اختیار کرنا چاہیئے لیکن یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایسے زمانے میں جب بنیادی تغیرات عمل میں آرہے ہیں آذربائجان کا ادب عروج پر نہیں ہوسکتا۔ اس وقت کے مصنفوں میں صمد برغون کی مثال لیجئے۔ اس کا دماغ بہت الجھا ہوا ہے۔ اسے چاہیئے کہ اپنے ذہن کو' جو سرمایہ داری اور نراج' پرانی دیہاتی زندگی اور پرانے رسم رواج کے رنگ میں ڈوبا ہے' آہستہ آہستہ قابو میں لائے اور پاک صاف کرے۔

اب برغون اشتراکی ہراولوں کے خیالات اختیار کر رہا ہے اور اپنے کلام کا معیار بڑھا رہا ہے'

جیسا کہ اس کی دو نظموں "لالٹین" اور "شاعر کی نصیحت" سے ظاہر ہوتا ہے۔ صمد بُرغون دیہاتی زندگی سے بہتر واقفیت رکھتا ہے، اور اس کے جو مرقعے اس نے پیش کئے ہیں ان کا اور کہیں جواب نہیں ملتا۔ اس میدان کے باہر اس کا ذہن اتنی خوبی سے کام نہیں کرتا، پٹرول کی جنگ پر اس نے "لوک تین" کے عنوان سے جو نظم لکھی، جس میں نفط کے کنویں کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے، فنی نقطۂ نظر سے خاص قدر نہیں رکھتی۔ اس وقت وہ ایک نظم تیار کر رہا ہے جس میں ان اشتراکیوں کی زندگی بیان کی جائے گی جو دیہات میں مصروف ہیں۔

ایک اور شاعر، رفیلی میکائیل، نئے اور پرانے عقائد کی کشمکش سے گذر کر پرولتاریہ کی جنگجو صفوں میں آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس کی آخری نظمیں "لینن گراد" اور "سباستوپول" ثابت کرتی ہیں کہ وہ پرولتاری مقاصد میں محو ہو گیا ہے۔ "سباستوپول" کے بعض حصے ایسے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ رفیلی نے جو رستہ طے کیا ہے اس سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک مصور، جو کسی اور طبقے کا رکن تھا، انقلاب کے بعد کس طرح ایک پرولتاری مصنف ہو گیا، اور عقائد کے ساتھ اس کی فنی قابلیت کی بھی کس طرح اصلاح ہوئی۔

نئی تخلیقی قوتیں | اب ہمارے یہاں شاعروں کی ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے جس نے اپنا مخصوص اسلوب بیان بھی نکالا ہے۔ اگر ہم مثال کے طور پر رسول رضا کے کلام کو لیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے یہاں سیاسی خیالات کی فراوانی ہے اور وہ حقیقی مسائل سے بحث کرتا ہے، مگر وہ حقیقت نگاری سے رومانیت کے عنصر کو بالکل خارج نہیں کر سکا ہے۔ اسی طرح ایک اور شاعر، مشفق، اپنے پرانے تعصبات اور اوہام پر غالب آنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن وہ بھی پرولتاری ذہنیت کو غیر طبقوں کے اثرات سے آزاد نہیں کر سکا ہے۔

یہاں پر ہمیں فرخ اور رحیم کا بھی ذکر کر دینا چاہئے جنھوں نے پچھلے سالوں میں چند نئی تصانیف شائع کی ہیں۔

۱۹۰۶ء سے اس وقت تک ترکی ادب کی نثر کو نظم کے مقابلے میں کم ترقی ہوئی ہے، پھر بھی ہم اس میدان میں بھی زندگی اور جدوجہد کے آثار دیکھتے ہیں، اور پچھلے دو برس میں چھ ناول اور کئی لمبے افسانے چھپے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں نوجوان مصنف ابوالحسن نے اپنا زبردست ناول "ایک دنیا کی موت" لکھا۔ یہ ناول ایک تصویرخانہ ہے جس میں اشتراکیت کے جنگجو سورما قدامت پسندوں اور کچ دلے سرمایہ داروں کے مقابلے پر رکھ کر دکھلائے گئے ہیں۔ یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ابوالحسن فنا ہونے والی دنیا کے رہنے والوں کو بہتر جانتا ہے اور ان کی سیرتوں کو بہتر بیان کرسکتا ہے۔ نئے دور کے آدمیوں کی سیرتیں مصنوعی اور نامکمل معلوم ہوتی ہیں۔

حال کی تصانیف میں "ایک دنیا کی موت" کے بعد محمد سعید اردوبادی، ایک پرانے اشتراکی مصنف کے ناول "قبرستان کہرآلود" کا درجہ آتا ہے، جس کا موضوع ۱۹۰۸ء ایرانی انقلاب ہے۔ اس کتاب میں واقعات، سیاسی اور معاشرتی حالات، اور ان مختلف طبقوں کی کارگذاری جو اس انقلاب میں شریک تھے بیان کی گئی ہے۔ اس میں مجتہدوں اور تاجروں کی غداری کا پول کھول دیا گیا ہے؛ اور زاری حکومت نے انقلابی تحریک کا سر کچلنے کے لئے جو کارروائی کی اس کی مذمت کی گئی ہے۔ لیکن اردوبادی ابھی تک اشتراکی حقیقت نگاری کے خاص طرز سے مانوس نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے واقعات کو مسخ کر دیا ہے، کسانوں نے انقلاب میں جو حصہ لیا اس کا وہ حق ادا نہیں کرسکا ہے، اور ماورائے قفقاز کی انقلابی جماعت نے جو نمایاں خدمات انجام دیں ان پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔

ترکی نثر میں نوجوان اشتراکی مصنف سیمرغ کا ناول "دشمن"، جس میں زرعی اصلاح کی تحریک کا ابتدائی زمانہ دکھایا گیا ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔

مہدی حسین کا ناول "سیلاب"، جو حال ہی میں شائع ہوا ہے بہت مقبول ہوا۔ اس میں ہمارے ملک کی خانہ جنگی کے ایک دور کا قصہ سنایا گیا ہے۔ مصنف نے یہ واضح کردیا ہے کہ پرولتاری انقلاب میں مزدوروں اور کسانوں کی خاص کارگذاری کیا تھی، اور عوام کی ذہنیت میں کون سی تبدیلیاں ہوئیں جن کی بدولت وہ نئی زندگی کی تعمیر کے لئے جان دینے پر تیار ہوگئے۔ لیکن اس میں مزدوروں کی کارگذاری فرضی معلوم ہوتی ہے اور کسانوں نے جو کچھ کیا وہ بہت بڑھا کر دکھایا گیا ہے۔

یوسف وزیر اور کاشتے مروہ مصنف ہیں جنھوں نے انقلاب سے پہلے نام پیدا کیا۔ وہ کسی پارٹی کے

رکن نہیں ہیں اور اسی وجہ سے ایک عرصے تک اُنھوں نے لکھنا بند کر دیا۔ کلنتے مرمزاحیہ طرز میں ماہر ہے اور اس کے کئی افسانے چھپ چکے ہیں۔ اس کا نیا ناول "کول خوستان" جس میں دیہات کی نئی زندگی دکھائی گئی ہے، یہ ثابت کرتا ہے کہ مصنف نے کس قدر ترقی کی ہے۔ یوسف وزیر انقلاب سے پہلے کے حریت پسند بورژوا مفکروں کا ایک نمائندہ ہے۔ اس نے اپنا ناول "۱۹۱۷" ابھی ختم کیا ہے جس میں اس سال کے روسی انقلاب کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، اور انقلاب کے دشمنوں کے ہر فرقہ کی خودغرضی اور زیادتی واضح کی گئی ہے۔

حال کی تصانیف پر ہم مجموعی طور پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی طرف ایک خاص رجحان ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تقریباً تمام مصنف حقیقی زندگی اور اشتراکی نظام کی تدریجی تعمیر کا الگ کھڑے ہوئے تماشا دیکھ رہے ہیں، اور اس میں جیسا کہ چاہئے حصہ نہیں لیتے۔ ہمارے تاریخی ناولوں کا خاص نقص یہ ہے کہ وہ مصنوعی اور واقعات سے خالی ہیں، اور ان میں تاریخی واقعات کی اشتراکی نقطۂ نظر سے تشریح نہیں کی جاتی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ اور جو ہیں ان کی خامی موضوع کا غلط انتخاب ہے، ان میں اس وقت کی مصنوعات کا بہت کم ذکر آتا ہے اور تہذیب اور رسم و رواج کا بس ایک دھندلا سا خاکہ نظر آتا ہے۔ پیٹرول کے لئے جو جنگ ہوئی اس پر دو سال کے عرصے میں صرف دو کتابیں لکھی گئی ہیں جن کی کوئی خاص وقعت نہیں۔ روئی کا مسئلہ چھیڑا ابھی نہیں گیا ہے۔

آذربائجان کے سوویٹ ادب کا سب سے کمزور پہلو ڈراما ہے۔ جعفر جبرلی نے، جو ہماری ڈراما نویسی کا ہراول ہے، مرکزی اشتراکی کمیٹی کے اپریل ۱۹۳۲ء کے فیصلے کے بعد ایک ڈراما لکھا جس کا عنوان "یاچار" ہے۔ اس میں حقیقت نگاری کے صحیح اصول کے مطابق دیہات کے مختلف طبقوں کی کشمکش بیان کی گئی ہے، زمیندار کسان کے منہ پر سے نقاب ہٹا کر اس کی اصل صورت دکھائی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ نئی نسل کے کارپرداز ماہران فن کے چند مثالی نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ جعفر جبرلی کی تصنیف ان مساواتیوں کی لغویات کا دنداں شکن جواب ہے جو ملک کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ دعوے ثابت کرنے میں اپنا وقت ضایع کر رہے ہیں کہ کوئی واقعی ہنرمند مصنف سوویٹ عقائد اور عمل کا حامی نہیں ہو سکتا۔

حسین جاوید جعفر جبرلی سے بھی زیادہ قابل شاعر اور ڈراما نویس ہے جس کے خیالات اور طرز بیان میں آہستہ آہستہ تغیر ہو رہا ہے۔ اب تک اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ترک اتحاد اسلامی کے متعلق ایک قصیدہ ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں اس کا ڈراما "سیاؤش" شایع ہوا، جس میں پرانے ایرانی اور ترکی محلات کی بد اخلاقی دکھائی گئی ہے، کسانوں کی بغاوتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور حریت پسند اشراف کی دلچسپی واضح کی گئی ہے۔ حسین جاوید ایک نئے اور نرالے طریقے پر نئی زندگی سے مفاہمت کی کوشش کر رہا ہے۔

آذربائیجان کے "اتحاد انشا پردازان سوویٹ" اور اس کے شعبہ ڈراما کو اب یہ ضرورت پیش آئی ہے کہ نئے ڈراما نویسوں کے حلقے تیار کریں، انھیں تھیٹروں سے ملحق کر دیں اور انھیں کارگزاری دکھانے کا موقعہ دیں۔

ان نوجوان مصنفوں میں جنھوں نے انشا پردازی کے میدان میں ابھی قدم رکھا ہے ثابت رحمٰن، ابراہیم مرزا، یوسف شیرواں، حسین ناطق، سری ولی، جعفر ہنداں، انور اور اخوند ف حامد قابل ذکر ہیں۔ ہیں دو نوجوان ترک عورتوں کے نام بھی یاد رکھنا چاہیے جنھوں نے پردو لتا۔ یہ کی اس فتح کی شان میں قصیدے لکھے ہیں جس کی بدولت مشرقی عورتیں آزاد ہو گئیں۔ یہ ہیں دلبازی اور نگار۔ افسوس ہے آذربائیجان میں ابھی تک لوگ ان نوجوان مصنفوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے۔

آذربائیجان کے مصنفوں کی کانگریس نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہم نے ادب میں کتنی ترقی کی ہے، اور یہ بتاتے ہوئے کہ ہمیں اصلاح کے کون سے ذریعے اور طریقے اختیار کرنا چاہئیں، ہمارے کام کی خامیاں اور غلطیاں بھی جتا دی ہیں۔ اشتراکی طرز کی حقیقت نگاری اختیار کرنے کے علاوہ آذربائیجان کے مصنفوں کو چاہیے کہ ایسے موضوع منتخب کریں جن کا سوویٹ سے سچا تعلق ہے، انسان کے ذہن اور ضمیر پر سرمایہ داری کے فلسفۂ حیات کا جو کچھ اثر باقی ہے اسے بالکل مٹا دینے کی جم کر کوشش کریں، اور ملکی زندگی کی تعمیر میں عملی شرکت کریں۔

کرد ابجد اور ادب بھی تیار کر لیا گیا ہے | آرمینیا میں ایک لاکھ ترک اور پچیس ہزار آرمینی ہیں۔ انشا پردازوں کا ایک عام اتحاد قائم ہونے سے پہلے ترکوں اور کردوں کے الگ الگ حلقے تھے، ان میں صرف چند نوجوان

مصنف کام کرتے تھے جن کے مضامین وغیرہ اخباروں اور جنتریوں یا خاص مجموعوں میں شایع ہوتے تھے۔ اسی سلسلہ میں کُرد ادب کا ایک مجموعہ چھپا۔ آرمینیا میں سوویٹ حکومت قائم ہونے کے دو ایک سال کے اندر کرد آبادی کے لئے ایک لاطینی ابجد تیار کی گئی اور تعلیم کے لئے ایک ادارے کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ ابجد کا معین ہونا عام تعلیم کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لئے کہ کُردوں کے پہلے کوئی اپنی ابجد نہیں تھی، جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ عربی حروف میں۔ آرمینیا میں ابجد کے رائج ہوتے ہی کئی درسی کتابیں اور سیاسیات اور معاشیات پر رسالے شایع کئے گئے اور ایک کرو۔ آرمینی فرہنگ لغات مرتب ہوئی۔ اب "اشتراکی محضر" کا کرد زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ کردستان کے ادب العوام کا ذخیرہ بہت بڑا ہے، اور اس سے انشا پردازی کو بڑی تقویت پہنچ رہی ہے۔ پہلے زمانے کے پہاڑی قبائل اور اس وقت کے مزدور اور ان کے بچے جنھوں نے تعلیمی ادارہ اور آرمینیا کی سرکاری یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے قومی ادب کو فروغ دینے کی بہت کوشش کر رہے ہیں، اور اس کا اثر ان کردوں پر بھی پڑ رہا ہے جو سوویٹ اتحاد میں شامل نہیں ہیں۔

نئے دور کے کرد مصنفوں میں سب سے ممتاز مجیئے جندی، امینہ اودال، نوری، جرجو، عرب شمی لوف، احمدے مرازی، اتارے شیرو، جسیمہ جلیل ہیں؛

کفن

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی' اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے ۔ جاڑوں کی رات تھی' فضا سناٹے میں غرق ۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا ۔معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں ۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا ۔ جا دیکھ تو آ۔

مادھو دردناک لہجہ میں بولا ۔ مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی ۔ دیکھ کر کیا کروں ۔

" تو بڑا بے درد ہے بے ۔ سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بیوپھائی "

" تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا "

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام ۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام ۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹے بھر چلم پیتا ۔ اس لئے انھیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا ۔ گھر میں مٹھی بھر اناج بھی موجود ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی ۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا ۔ اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے' یا کوئی مزدوری تلاش کرتے ۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی ۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا ۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے ۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا ۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لئے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی ۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی ۔ عجیب زندگی تھی ان کی ۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں ۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے

ہوئے دنیا کی فکروں سے آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے، مار بھی کھاتے۔ مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھا لیتے۔ یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور رات کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی۔ اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر، وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی تھی۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے۔ بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ جا کر دیکھ تو۔ کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھساد ہوگا اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے۔

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا۔ مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔

”ڈر کس بات کا ہے۔ میں تو یہاں ہوں ہی“

”تو تمھیں جا کر دیکھو نہ“

”میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں۔ اور پھر مجھ سے لجائیگی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا۔ آج اس کا اُگھرا ہوا بدن دیکھوں! اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی“

میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہوگیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل، کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں"
"تب کچھ آجائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلاکر دیںگے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا۔ مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا"۔

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت اُن کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی، اور کسانوں کے مقابلہ میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے، وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلہ میں زیادہ باریک بیں تھا۔ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہوگیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اُسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم سے کم اُسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی، اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بیجا فائدہ تو نہیں اُٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصّہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہونچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھے۔ اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں انکی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اُس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اُسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ اور آج بھی اُس کی یاد تازہ تھی۔ بولا۔ وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھرپیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ سب کو چھوٹے بڑے، سب نے پوڑیاں کھائیں۔ اور اصلی گھی کی۔ چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری، دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔

کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو۔ اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے ایسا کھایا، ایسا کھایا، کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم، گول گول، مہکتی ہوئی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہئے۔ پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ دئے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔

"اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھوگے! مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی!"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اُس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر، پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے، جیسے دو بڑے بڑے اژدر گینڈلیاں مارے پڑے ہوں۔

اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اُس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اُس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔

پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں۔ وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا۔ کیا ہے بے گھسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نہیں نظر آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔

گھسوا نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ سرکار، بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گزر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دغا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک، تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا غلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہوگی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں۔

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو ۲
آیا کہہ دیں۔ چل دور ہو یہاں سے۔ لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش۔" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہ تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیئے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکلا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپیے دئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈھورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دئے، کسی نے چار آنے۔

ایک گھنٹہ میں گھیسو کے پاس پانچ روپیہ کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلّہ دیدیا، کسی نے لکڑی۔ اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گانوں کی رقیق القلب عورتیں آآ کر لاش کو دیکھتی تھیں، اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہونچکر گھیسو بولا۔ لکڑی تو اُسے جلانے بھر کو مل گئی ہے۔ کیوں مادھو!

مادھو بولا۔ ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہئے۔

"تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں"

"ہاں اور کیا۔ لاس اُٹھتے اُٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے"

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چھیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہئے"

"کپھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے"

"اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپیہ پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہونچے۔ اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی۔ کچھ گزک۔ اور دونوں برامدہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجّیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا۔ کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آکھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ دنیا کا دستور ہے یہی لوگ بامھنوں کو ہجاروں روپئے کیوں دیدیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا

ہے یا نہیں۔

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دوگے! لوگ پوچھیں گے نہیں کفن کہاں ہے!"

گھیسو ہنسا۔ کہہ دیں گے، روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔

مادھو بھی ہنسا اس غیر متوقعہ خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر۔ بولا۔ بڑی اچھی تھی۔ بیچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں، گوشت اور سالن۔ اور چٹپٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہوگئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جوابدہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اُسے پُن نہ ہوگا؟

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان، تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اُسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اُسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا۔ کیوں دادا، ہم لوگ بھی تو وہاں ایک نہ ایک دن جائیں گے ہی۔

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے کہ تم نے ہمیں کفن کیوں نہیں دیا تو کیا کہوگے؟"

"کہیں گے تمہارا سر"

"پوچھیگی جرور"

"تو کیسے جانتا ہے اُسے کفن نہ ملے گا؟ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے! میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اُس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ کون دے گا؟ روپئے تو تم نے چٹ کر دئے؟

گھیسو تیز ہوگیا۔ میں کہتا ہوں اُسے کفن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں؟

"کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں؟"

"وہی لوگ دیں گے جنھوں نے ابکی دیا۔ ہاں وہ روپئے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے۔ اور کفن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، مے خانہ کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے، شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں، یا مُردہ ہیں، یا زندہ درگور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اُٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "دینے" کے غرور اور مسرت اور ولولہ کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ لے جا۔ کھوب کھا اور اسیرباد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، مگر تیرا اسیرباد اُسے جرور پہونچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیرباد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بیکنٹھ میں جائے گی دادا، بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ ہاں بیٹا، بیکنٹھ میں جائیگی۔ کسی کو ستایا نہیں۔ کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے مرتے ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں۔ اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں۔

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلون نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔ مادھو بولا۔ مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔ کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے، ٹھگنی۔

سارا میخانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش مخمور محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی۔ بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

ہندو اور مسلم قومی تحریکیں

اور

ہندوستانی قومیت کی تحریک

(چودھری رحمت علی ایک صاحب ہیں جو کیمرج یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے ہیں۔ عرصہ ہوا ان کا ایک مطبوعہ خط کیمرج سے موصول ہوا تھا جس پر انھوں نے "پاکستان کی قومی تحریک" کے صدر کی حیثیت سے اپنے دستخط کئے تھے۔ اس خط کی ابتدا میں بائیں حاشیہ پر ہندوستان کا ایک نقشہ بنا ہوا تھا جس کے شمال مغربی کونہ کو سبز رنگ دے کر نمایاں کیا گیا تھا اور اس پر پاکستان کا لفظ لکھا گیا تھا۔ اس کے رنگے ہوئے حصہ میں ہندوستان کے پانچ موجودہ صوبے اور ریاستیں یعنی کشمیر، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان، پنجاب اور سندھ شامل تھے۔ اس خط پر ۸ جولائی ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج تھی اور یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ پارلیمنٹ قانون حکومت ہند کے مسودہ کو آخری شکل و صورت دے رہی تھی۔

اس تحریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دو ایسے خطے ہیں جن کے باشندے ایک دوسرے سے نمایاں طور پر ممتاز ہیں۔ ان کی تہذیبیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان کا فلسفہ، تمدن، زبان، ادب اور فنون لطیفہ ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ان کے مذہب، ان کی معاشری اور تاریخی روایات میں ابتدا سے کوئی باہمی یگانگت اور

رواسطہ

ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ان دونوں علاقوں میں ایک ہی قوم کے دو فرقے آباد نہیں ہیں بلکہ دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ان کے مسائل کا حل فرقہ وارانہ سمجھوتوں سے نہیں بلکہ بین الاقوامی معاہدہ

سبب ہے ؟

ممکن ہے۔ اس لئے مجوزہ ہندوستانی فیڈریشن میں پاکستان کو ہندوستان

مذہب، تمدن و معاشرت کا

شریک کرکے جو ظلم پاکستان کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے خلاف جدوجہد کرنا ضروری ہے تاکہ اس ناانصافی کا ازالہ ہو سکے اور پاکستان ہندوستان سے الگ ہو کر اپنی مخصوص قومی زندگی کو ترقی دے سکے۔

ہمیں چودہری رحمت علی صاحب کو کوئی ذاتی واقفیت نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عملاً کس حد تک ایک مخلص اور بے ریا کارکن ہیں۔ کیمرج میں ان کا اپنی تحریک شروع کرنا بادی النظر میں مشتبہ سا معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چودہری رحمت علی صاحب سے زیادہ شاطر ہاتھ پس پردہ اس تحریک کو چلانا چاہتے ہوں اور ہندوستان میں بھی ایک آسٹر بنا کر یا ترکوں کے خلاف جیسے عربوں کی قومی تحریک شروع کی گئی تھی ایسی ہی کسی چیز کا آغاز کرکے یہاں کی قومی تحریک کی بنیادیں بھی کھوکھلی کی جا رہی ہوں۔ اس مضمون میں ہمارے پیش نظر چودہری رحمت علی صاحب یا برطانیہ کے وہ ہونہار فرزند ہیں جو مشرقی ممالک کی ذہنیت کو یہاں کے لوگوں سے بہتر سمجھ کر کرنل لارنس بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کے خط کا حوالہ دینا یہاں صرف اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ ان کے خط میں جو مطالبہ پیش کیا گیا ہے اسے ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تحریک کے ارتقا کی آخری منزل سمجھنا چاہئے۔ جب کسی ملک کی آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے اپنے آپ کو بہت زیادہ مختلف پانے لگے اور جب مفاہمت اور مصالحت کے تمام دروازے اپنے لئے بند پائے تو اس کا انجام یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں یہ تمنا پیدا ہو کہ وہ اپنی ایک جداگانہ دولت و حکومت قائم کرے۔ ذیل کے مضمون میں اسی بات کے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا واقعی صورت حال اس درجہ خراب ہو گئی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے متحد ہو کر ایک مشترکہ قومی زندگی بسر کرنا ناممکن ہو گیا ہے اور ایک کو دوسرے ظلم سے بچانے کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ناگزیر ہو گیا ہے تاکہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہو کر اپنی مخصوص قومی زندگی کو امن و چین سے گذار سکیں۔

اس مضمون کو اس عنوان کی پہلی قسط سمجھنا چاہئے ہمیں توقع ہے کہ ملک کے اہل الرائے

حضرات بلا قید مذہب اس موضوع پر رسالہ جامعہ کے ذریعہ اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرما کر
اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے۔)

احساس قومیت کی بیداری | آدمی تنہا زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جل کر، ہنس بول کر اپنا وقت گذارتا ہے۔ لیکن سب لوگوں کے ساتھ اس کی راہ و رسم، مروت و محبت یکساں نہیں ہوتی۔ کچھ لوگوں کی صحبت میں اسے لطف حاصل ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کی صحبت اسے گراں گذرتی ہے جس کا اظہار بعض صورتوں میں وہ کراہیت اور نمایاں نفرت کے ساتھ کرتا ہے اور بعض صورتوں میں مجہول رواداری کے ساتھ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے کاروباری معاملات میں یا غیر معمولی حالات کے زیر اثر وہ ان لوگوں سے بھی جن کی صحبت اسے گراں گذرتی ہے میل جول رکھنا گوارا کرے۔ لیکن اپنے دن رات کا بیش تر حصہ برضا و رغبت وہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ بسر کرنا پسند کرے گا جن کے خیالات اور احساسات میں وہ اپنے ساتھ ہر قدم پر یگانگت، ہم آہنگی اور اتحاد و اتفاق دیکھے گا۔ ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ساتھ کھانا پینا، ایک ہی زبان میں گفتگو کرنا، ایک ہی وضع کا کپڑا پہننا، ایک ہی طرز کے مکان میں رہنا، کائنات و زندگی کے متعلق ایک طرح کے اعتقاد رکھنا، ایک ہی انداز سے عبادت کرنا، ایک ہی قسم کی چیزوں کو پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا، آپس میں شادی بیاہ کو جائز رکھنا، ایک ہی ادب، صنعت، طرز عمارت، مصوری، موسیقی سے لطف حاصل کرنا، معاشی کاروبار میں مشترکہ اغراض و مفاد رکھنا۔ غرضکہ اتنے بے شمار نقطہ ہائے اتصال ہوتے ہیں کہ جب ایسے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی جسم کے متعدد اعضاء ہیں جو باہم مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں جب ایک شخص اپنی ترقی کے لئے کوئی کوشش کرتا ہے تو اس سے کل کنبہ، برادری، قبیلہ یا قوم کی ترقی از خود ہو جاتی ہے اور جب جماعت کی ترقی کا کوئی کام کیا جاتا ہے تو اس کا اثر بالواسطہ در بالواسطہ ہر فرد کی ذات تک پہنچتا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں سے رفاقت اور بعض سے بیگانگی کا کیا سبب ہے؟ اس کا ایک سبب نہیں متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اتحاد نسل، اتحاد زبان، اتحاد مذہب، تمدن و معاشرت کا

آباد، تجارتی اتحاد، فتح و شکست، حملہ و مدافعت، رنج و راحت میں باہمی شرکت، شراکت وطن، شراکت محکومیت وغیرہ وغیرہ۔

زمانہ حال میں مغربی ممالک نے ان رشتوں میں جس رشتہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے وہ شراکت وطن کا رشتہ ہے۔ لیکن ملک پرستی بجائے خود کوئی قومی جذبہ بن سکتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ آسان نہیں ہے۔ اس کی مخالفت میں کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کسی بے جان قطعہ زمین سے محبت نہیں کرتا بلکہ اس پر بسنے والے آدمیوں سے اسے تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ آدمی ایک جگہ قیام نہ کریں تو زمین سے کوئی محبت نہ پیدا ہو۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے شکار اور گلہ بانی کی خانہ بدوش زندگی کو پیش کیا جا سکتا ہے جس میں ایک جماعت مستقل طور پر کسی جگہ قیام نہ کرنے کے باوجود اپنی جماعتی زندگی کے شیرازہ کو قائم رکھتی ہے۔ لیکن ملک پرستی کے حامی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آدمی ایک خاص قطعہ زمین پر بس جاتا ہے وہاں اپنے لئے مکان بنا لیتا ہے، باغ لگا لیتا ہے، مسلسل کھیتی باڑی کرتا ہے تو اس وقت کیا صورت ہوتی ہے؟ کیا اس وقت بھی زمین کی محبت سے انکار کیا جا سکے گا؟ لیکن تاریخ کی گردش سے ایک ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے جس میں ایک آدمی کے لئے صرف وہ مادی منافع باقی رہ جائیں جو زمین اور املاک سے حاصل ہوتے ہیں اور اس کی وہ تمام دماغی اور روحانی لذتیں اس سے چھین لی جائیں جن سے اس کی یا اس کے آباؤ اجداد کی زندگی مالا مال رہا کرتی تھی۔ آدمی عموماً کسی ایک زبان کے الفاظ میں غیر معمولی شیرینی، کسی ایک طرز کی مصوری اور صناعی میں خاص نزاکت و حسن اور کسی ایک نوع کی موسیقی میں بے مثال نغمہ پاتا ہو اور اسے اپنا سمجھ کر اس کی ۱
خاص طور پر قدر کرتا ہو۔ لیکن انسانی آبادی کے مختلف گروہوں میں جو اتحاد و ارتباط اور افتراق و انشقاق کا سلسلہ جاری ہے اور بعض وقت قربت اور بعض وقت بُعد پیدا ہوتا رہتا ہے، ایک گروہ کا اثر و اقتدار ایک وقت زاید اور دوسرے کا کم ہوتا رہتا ہے اور جسے قوموں، تمدنوں اور تہذیبوں کے عروج و انحطاط، ترقی و زوال کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے ——— کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی وقت ایسی شکل اختیار کر لے کہ جس کے زیر اثر ایک آدمی کو اپنی زمین اور املاک کے مادی منافع تو حاصل رہیں لیکن اپنی تمام تمدنی وابستگیوں سے وہ محروم کر دیا جائے تو کیا اس وقت وہ آدمی اس محرومی کو خاموشی سے گوارا کرے گا؟ کیا وہ ان کے ضائع

ہونے کے بعد بھی اپنی زندگی کو مکمل بادر کرتا رہے گا؟ کیا اس کی زندگی میں ایک خلا، ایک اشتہا، ایک خلش اور بے چینی پیدا نہیں ہوگی جسے تھوڑی سی آزادی اور اختیار کی حالت میں وہ ضرور رفع کرنے کی کوشش کرے گا؟ محکومی، مجبوری اور ظلم کی حالت میں تو یہ ممکن ہے کہ لوگ ان محرومیوں کو گوارا کرتے رہیں لیکن ان چیزوں کی یاد اندر ہی اندر ان کے دلوں میں سلگتی رہے گی۔ وہ موقع کے منتظر رہیں گے اور جب کبھی موقع ملے گا وہ اس دبے ہوئے شعلہ کو بھڑکا کر اس کی تاریکی اور ویرانی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ تدبیریں سوچتے رہیں گے کہ اپنی حالت محکومیت کو آزادی میں بدلیں اور ان کی آزادی کا مفہوم ان چیزوں کے احیاء و ترقی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اور جب کبھی یہ بجھی ہوئی چنگاری ذرا چمکے گی کیا لوگ اسے "احساس قومیت کی بیداری" کے نام سے موسوم نہ کریں گے؟

اس سے ظاہر ہوا کہ کسی ایک ملک کی محض سکونت احساس قومیت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے ضرورت اور رشتوں کی بھی ہے جن کی بنیاد پر قومیت کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی مخالفت میں یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ مادی منافع کے لالچ میں جب ایک ہی مقام پر مستقل سکونت اختیار کرنے کے لئے آدمی مجبور ہوتا ہے تو اس جگہ کے تمدن و معاشرت کے طریقوں سے بھی اسے مانوس ہونا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے پرانے طریقوں کو بھول کر نئے طریقوں کو جو جدید ماحول میں کامیاب زندگی گذارنے کے لئے زیادہ موزوں ہے اختیار کر لیتا ہے۔

زمین کی محبت اور تمدن و تہذیب کی محبت میں جب کشمکش ہو جاتی ہے اس وقت اس کا انحصار کہ دونوں میں سے کون کس پر غالب آئے گا اس بات پر ہوگا کہ آبادی کا اپنے قدیم تمدن و تہذیب سے لگاؤ کس شدت کے ساتھ ہے۔ اس تعلق کو قائم رکھنے کے لئے کس قسم کے مواقع موجود ہیں مثلاً کوئی ایسا مستحکم معاشری نظام ہے جو سخت حملوں کو جھیلنے کی اہلیت رکھتا ہے اور تہذیب و تمدن کے شیرازہ کو منتشر نہیں ہونے دیتا یا کہیں باہر کوئی ایسی جگہیں ہیں جہاں وہ تمدن و تہذیب زندہ اور مائل بہ ترقی ہو اور جہاں سے ترک سکونت کر کے لوگ برابر اس قطعہ زمین کی طرف آ رہے ہوں یا جہاں کی ترقی کی مثال یہاں سکونت اختیار کرنے والوں کے لئے حوصلہ افزا ہو پھر اس خاص قطعہ زمین پر بسنے والی دوسری آبادیوں کا رویہ بھی اس پر اثر ڈالے گا۔ یہ رویہ اگر ہمدردانہ اور مفاہمت پر

مائل ہوگا تو نقطہ ہائے اتصال جلد پیدا ہوسکیں گے اور پرانی وفاداریاں جلد فنا ہوسکیں گی ورنہ تصادم عرصہ تک جاری رہے گا۔

یہی حال تقریباً اور دوسرے رشتوں کا بھی ہے مثلاً نسل کی پاکیزگی اسی وقت تک قائم رہے گی جب باہمی ازدواج میں رکاوٹیں ہوں گی۔ زبان اور مذہب کے اختلافات بھی اسی وقت تک نمایاں رہیں گے جب تک عصبیت کے ساتھ ان کی پابندی کی جائے گی۔ تجارت وصنعت کے رشتے، مفاد کے اشتراک اور اختلاف کے ساتھ بندھتے اور ٹوٹتے ہیں۔ فتح وشکست حملہ ومدافعت، رنج وراحت اور محکومیت کے رشتوں کا انحصار، شراکت کی شدت اور مدت پر ہوگا۔

ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کس وقت اور کن اسباب کے ماتحت کسی انسانی گروہ میں احساس دوری یا قربت اس قدر قوی ہو جائے گا کہ وہ اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم کہنے لگے بہت دشوار ہے۔ اس سلسلہ میں رینان کے اس علمی انکشاف کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ قومیت کے وجود کے لئے جو شرط ضروری ہے وہ نہ نسل کا اشتراک ہے، نہ مذہب، زبان تمدن ومعاشرت وغیرہ کا بلکہ قومیت جس چیز سے پیدا ہوتی ہے وہ صرف قومیت کا احساس ہے۔ اگر یہ احساس موجود ہے (اس سے بحث نہیں کہ اس کا محرک کیا ہے) تو اور تمام دوسرے اختلافات کے ہوتے ہوئے ایک انسانی گروہ قوم کہلا سکتا ہے۔

پھر قوم کے لفظ کا جو مفہوم موجودہ زمانہ میں ہے اسے پیدا ہوئے بھی بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا لارڈ ایکٹن نے اس کی ابتدا افتراق پولینڈ سے کی ہے۔ انگلستان کو اس کے مخصوص حالات اور معاشی ضرو نے سولھویں صدی میں سب سے پہلے ایک قوم بنادیا۔ فرانس میں یہ چیز اٹھارویں صدی کے آخری حصہ میں پیدا ہوسکی۔ جرمنی کی قومیت ایک اعتبار سے نپولین سے شکست کھانے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اٹلی میں تقریباً جرمنی کے ساتھ ساتھ قومیت کا احساس پیدا ہوا۔ اس لئے مغرب میں انیسوی صدی کو قومیت کی صد کہا جاسکتی ہے۔ مشرقی ممالک نے بھی اس نئے تخیل کے اثر کو مغرب سے قبول کیا اور یہاں بھی انیسویں صد کے آخری سالوں سے قومیں پیدا ہونے لگیں۔

ہندوستان میں قومیت کا احساس کب پیدا ہوا اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف رائے ہے بعض لوگ اس کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں وہ عناصر ہی نہیں پائے جاتے جو قومیت کے لئے ضروری ہیں ان کے نزدیک ہندوستان کی حیثیت ایک جغرافی اصطلاح سے زیادہ نہیں ہے اس ملک کی وسعت اس قدر زیادہ ہے اور یہاں کے صوبوں، نسلوں، زبانوں، مذہبوں، ذاتوں، معاشرت اور پیدائش دولت کے طریقوں میں اس قدر شدید اختلاف پائے جاتے ہیں کہ یہاں کی آبادی کو آدمیوں کا ایک گروہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن جماعت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان میں باہم ایسے تعلقات اور روابط نہیں ہیں جو انھیں کسی قریبی اور پائدار رشتہ سے منسلک کرتے ہوں۔ جو رشتے ہیں وہ اس قدر سطحی اور کمزور ہیں کہ وہ قومیت کے پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔

لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو ہندوستان میں قوم و قومیت کے جو الفاظ پچھلے پچاس سالوں سے ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں ان کا کیا مفہوم ہے؟ سرسری مشاہدہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی آبادی کو مذہب، معاشرت اور تاریخی روایات کی بنا پر دو نمایاں بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں اکثر صورتوں میں باہمی اختلاف کا احساس بھی خاصا شدید پایا جاتا ہے۔ یہ دو گروہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہیں آیندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں گروہوں میں مشترک طور پر کسی بیرونی قوم کے مقابلہ میں یا باہم ایک دوسرے کے مقابلہ میں کسی قسم کا کوئی قومی جذبہ پایا جاتا ہے یا نہیں۔

ہندوؤں میں قومیت کا احساس ہندوؤں میں ایک طرح کی بنیادی وحدت تو نہایت قدیم زمانہ سے پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی نے دو کتابیں "ہندوستان کی بنیادی وحدت" اور "ہندو تمدن میں قومیت" لکھی ہیں۔ ان میں انھوں نے ان نمایاں قوتوں کو جو ہندوؤں کی زندگی میں وحدت پیدا کرتی ہیں نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ کس طرح ہندوستان کے رہنے والے نہایت قدیم زمانہ سے برہم ورت کو یعنی اس ملک کو جو ہمالیہ اور جنوبی سمندروں کے درمیان واقع ہے اپنا مشترک وطن سمجھنے لگے تھے۔ رامائن میں ایک دوہا ہے جس میں ماں اور مادر وطن کو بہشت سے بھی زیادہ عزیز اور لائق احترام بیان کیا گیا ہے۔ یہ حب وطن کی وہ صورت ہے جو ترقی کر کے قومی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر جتنے مندر، "تاریخی عمارتیں، مقدس دریا

ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی یاترا اور درشن مذہب کے پابند ہندو اکثر کرتے رہتے ہیں وہ بھی ملکی اور تمدنی اتحاد پیدا کرنے کے نہایت موثر ذرائع ہیں۔ ک۔م۔ پانیکار نے بھی اپنی کتاب "ہندوستانی قومیت : اس کی ابتدا، تاریخ اور نصب العین" میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ہندوستانی تاریخ میں چندر گپتا موریا کے زمانہ سے مرہٹوں تک برابر ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مرہٹوں اور سکھوں کا عروج ایک طرح کی قومی تحریک تھی جسے بجا طور پر ہندو جذبۂ قومی و مذہبی کے احیاء سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مسٹر پ۔ن۔ بوس نے اپنی کتاب "سوراج : تمدنی و سیاسی" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ برطانیہ کی آمد سے قبل ہندوستان میں سیاسی تو نہیں لیکن تمدنی قومیت پائی جاتی تھی جسے مغرب نے فنا کر دیا۔ بابو بپن چندر پال نے اپنی کتاب "روح ہند" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں ایک وفاقی قومیت پائی جاتی تھی جس میں بھارت ورش کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور راجدھانیاں باہمی دوستی سے ایک وفاقی حکومت بنالیتی تھیں جس کا صدر ایک بڑا راجہ ہوا کرتا تھا اور ہندوستان کی قومیت کا یہ تخیل یورپ کی ملکی قومیت سے مختلف تھا۔ ان کا خیال ہے کہ مسلم حکومت نے ہندوستانی تمدن کی اس وحدت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا لیکن مغرب نے پرانے نظام تمدن کو برباد کر ڈالا۔

لیکن جب ہندوستانی تاریخ کے تخیلات کا نہیں بلکہ واقعات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس سے قومیت کا وجود اپنے مفہوم کے تمام لوازم کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا گو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک نہایت طویل زمانہ تک ہندوستانیوں میں ایک مشترک تمدن رائج رہا ہے اور اس تمدن کا اثر اس قدر ہمہ گیر تھا کہ جنوب کے دراوڑوں کو بھی یہ اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا اور اس سے آزاد ہونے کا کوئی رجحان ان میں نہ پایا جاتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی فتح کے بعد ہندوستان کی تمدنی وحدت میں ایک بڑی خلیج پیدا ہو گئی جس کو ہموار کر کے قومی وحدت کو حاصل کرنا سہل نہیں رہا ہے۔ لیکن جو لوگ ہندو قومیت کے عناصر اتحاد کو اپنے سامنے رکھتے ہیں وہ مسلم عنصر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ہندو تمدن کی قوت انجذاب کے بہت زیادہ قائل ہیں اور ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کی صدہا مثالیں سامنے رکھ کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہندو تمدن میں جذب ہو جانا نہایت آسانی سے ممکن ہے۔

ہندو قومی تحریک کو شعوری طور پر، قصد و ارادہ کے ساتھ چلانے والی تحریکیں برہمو سماج، آریہ سماج اور رام کرشن اور ویوا کانند کے مشن تھے۔ تھیا سوفیکل سوسائٹی نے بھی بڑی حد تک ہندو قومیت کے احیاء کو ہی اپنا مقصد قرار دے لیا ہے۔ یہ سب ہندو مذہب کی اصلاحی تحریکیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جارحانہ اور کسی قسم کی مفاہمت پر نہ آمادہ ہونے والی جماعت آریہ سماجوں کی ہے۔ اس نے ابتداء سے صرف ہندو راج کا ہی خواب دیکھا ہے اور ہندوستان کو صرف ہندوؤں کا ہی موروثی حق سمجھا ہے۔ ان کی ترقی کے مفہوم میں صرف ہندو مذہب، زبان، معاشرت اور علوم و فنون کی ترقی اور احیاء شامل ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے عناصر کو وہ اپنے اندر جذب کر کے فنا کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی تعلیم یافتوں میں ابتدائی لوگ مغرب کے تمدن سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور ان کے پیش نظر جو نصب العین ہندوستانی قومیت کا تھا وہ مغربی نمونہ کا تھا جس میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی مغرب کی تقلید کے ذریعہ سے ہی ممکن تھی لیکن بعد کے تعلیم یافتہ لوگوں پر مذہبی رنگ غالب ہونا شروع ہوا اور اس کے غلبہ کے ساتھ ساتھ قومیت کی بنیاد مذہب پر رکھی جانے لگی جس میں غیر ہندوؤں کے لئے شرکت ناممکن ہو گئی۔ ہندی اور سنسکرت کی ترویج اور ترقی کی کوششیں بھگوت گیتا اور مذہبی شاستروں کا مطالعہ، ویدانت کے فلسفہ کا جدید مغربی فلسفہ سے مقابلہ اور اس کی برتری کی تبلیغ، ہندو عہد تاریخ کی خوبیاں اور کارگذاریاں، شیواجی کو قومی ہیرو سمجھنا، گروکل پاٹ شالوں کا قیام، ہندو یونیورسٹی، ہندو سماج کی اصلاحی تحریکیں مثلاً اچھوت سدھار، بیواؤں کی شادی، نو عمری کی شادی کا انسداد، تیوہاروں تقریبوں پر فضول خرچی سے پرہیز، تعلیم نسواں وغیرہ شروع کی گئیں اور ان میں صرف ہندوؤں کو پیش نظر رکھا گیا۔ پھر چونکہ مسلمان ملک کی سیاسی تحریک سے علیحدہ رہے اور بنگال کے افتراق سے ہندو مسلمانوں میں بھی کچھ بدمزگی پیدا ہوئی اس لئے دوری اور بڑھتی رہی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے نہایت شدید مظاہرے ہونے لگے اور جتنا زیادہ دھرم کے پابند لیڈروں اور پنڈتوں کا اثر پبلک زندگی میں بڑھا اتنی ہی زیادہ ہندوستانی قومیت ہندو قومیت بنتی چلی گئی۔ کانگریس لیگ سمجھوتہ کے ذریعہ ہندو قومیت اور مسلم قومیت کے علمبردار ایک دوسرے سے کچھ قریب ہوئے اور تحریک عدم تعاون کے ہنگامے میں تو اس قدر متضاد اور غیر ہم آہنگ عناصر کچھ عرصے کے لئے شیر و شکر ہوئے کہ جس کی مثال شاید کم مل سکے گی۔ لیکن یہ اتحاد عرصہ تک

قائم نہ رہ سکا۔ اس نے بنیادی اختلافات کو ایک مشترکہ شکایت کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے دبا دیا۔ مذہبی احیاء کے وہی لیڈر جو ایک دوسرے کی مخالفت میں سرگرم رہتے تھے اپنی مخالفتوں کو بھلا کر ایک دوسرے کے شریک ہو گئے۔ لیکن ان کی راہیں اس قدر بنیادی طور پر مختلف تھیں کہ تھوڑے عرصہ کے بعد جدائی لازمی تھی۔ چنانچہ نہایت سخت تصادم ہوا اور ہندو مہاسبھا، سنگھٹن، شدھی اور ایسی ہی خالص ہندو قومی تحریکیں شروع ہو گئیں جو ابھی تک ہندوستانی زندگی کے شیرازہ کو منتشر کئے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں میں قومیت کا احساس | مسلمانوں میں مذہبی عقیدے کی سادہ اور واضح یکسانیت، عبادت کے جماعتی طریقے اور معاشرتی زندگی میں مساوات ایسے عوامل ہیں جن سے اتحاد بہت جلد پیدا ہوتا اور دیر تک قائم رہتا ہے۔ پھر حکمراں طبقہ کی حیثیت سے ہندوستان میں زندگی گذارنے کی وجہ سے بھی ان میں باہمی تعلق اور یگانگت بڑھ گئی۔ تمدن و معاشرت کے مخصوص طریقے پیدا ہو گئے جن کی بنا پر مسلمان اپنے آپ کو حاکم سمجھ کر غیر مسلم رعایا سے الگ الگ رہنے لگے۔ سلطنت جب ہاتھ سے نکل گئی اس وقت بھی مسلمانوں کی عزت و عظمت یہاں کی مقامی آبادی میں باقی رہی اور ان کی معاشرت کا اختلاف نمایاں رہا جس کی تقلید کرنا یہاں کی محکوم رعایا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھی۔ انگریزوں کے برسر اقتدار ہونے سے ان کے عہدے، ریاستیں، جاگیریں، منصب اور معافیاں ان کے ہاتھ سے نکلنے لگیں لیکن پھر بھی عرصہ تک بہت سی باقی رہیں جن کی وجہ سے ان کی شان و شوکت اور نمود و نمائش اور اقتدار و برتری قائم رہی۔ غدر کے بعد غدر کا بیشتر الزام مسلمانوں پر رکھا گیا اور ان سے بدلہ لیا جانے لگا۔ ان کی تباہ حالی کو دیکھ کر سرسید نے مسلمانوں اور انگریزوں میں مفاہمت اور مصالحت کرانا چاہی۔ ابتداء میں سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی بہبودی کے خواہش مند تھے لیکن مسلم حکومت اور اقتدار کی یادگاریں ان سے اس قدر قریب تھیں کہ وہ اسلامی اثرات کو جو ایک عرصہ تک جاری رہنے کی وجہ سے ہندوستان کی زندگی کا ایک جزو بن گئے تھے اور جنھیں ہندو اور مسلمان برضا و رغبت اختیار کر چکے تھے مٹتا ہوا دیکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب کچھ ہندوؤں نے اردو کے مقابلہ میں ہندی کے رواج دینے کی کوششیں شروع کیں تو سرسید کو بہت ناگوار ہوا اور اس دن سے انھوں نے سمجھ لیا کہ ہندو مسلم اتحاد ممکن نہیں ہے اور وہ اب

پوری طور پر مسلمانوں کے لئے ہی کوشش کرنے لگے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے لئے خاص طور پر کوشش کرنے کا ایک اور سبب بھی تھا۔ مسلمان اپنے تعصب اور غرور کی وجہ سے انگریزی تعلیم سے اور انگریزوں نے ہندوستانیوں کو ترقی کے جو مواقع دئے تھے ان سے پوری طرح فایدہ نہیں اٹھا سکے تھے اور وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں تعلیم اور سرکاری ملازمتوں میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اس پس ماندگی کو مٹانے کے لئے بھی سرسید مسلمانوں کی تحریکوں کو ہندوؤں سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ سرسید کی ہستی بڑی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ انھوں نے مسلم مذہب، زبان، تمدن و معاشرت، تعلیم — سب کو بچانے کے لئے بیک وقت کوششیں شروع کیں اور مسلمانوں کی ایک قومی درسگاہ قائم کرکے ہندوستان میں مسلم قومیت کی تحریک کو مستقل بنیاد پر قائم کر دیا۔ سرسید کے علاوہ اور لوگ بھی مذہبی تحفظ اور احیا کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوہ، دارالمصنفین یہ مفید ادارے ان دوسرے لوگوں کی کوششوں سے قائم ہوئے۔ پھر مسلم قومی شاعروں میں حالی اور مصنفین میں نذیر احمد، شبلی اور سرسید کے رفقاء خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ ان سب کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایک قومی بیداری شروع ہوئی جو ہندو قومی بیداری سے بالکل علیحدہ ایک چیز تھی۔ سرندرناتھ بنرجی نے جب سرسید سے انڈین سول سروس ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں اشتراک عمل کرنا چاہا تو سرسید نے انکار کر دیا۔ کانگریس سے بھی سرسید علیحدہ رہے۔ ان کے مقابلہ میں ایک طرف تو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی گئی جس میں مسلمانوں کے تعلیمی اور اصلاح معاشرت کے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں اور دوسری طرف آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی جو مسلمانوں کے سیاسی مسائل پر غور و فکر کرنے لگی۔ سرسید ابتداہی سے حکام رس تھے اور اس حکام رسی کی بنا پر انھیں یہ اعتماد تھا کہ وہ مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے ہندوؤں کے مقابلہ میں بہتر سیاسی مراعات حاصل کرسکیں گے۔ اسی مقصد کے ماتحت انھوں نے اپنے مدرسہ کے اسٹاف میں بہت سے انگریزوں کو بھرتی کیا۔ سرسید کے پیش نظر غالباً کل ہندوستان کی آزادی کا نصب العین کبھی بھی نہیں رہا۔ ان کا مطمح نظر شاید صرف یہ تھا کہ انگریزوں کے ساتھ اشتراک عمل کرکے ہندوستان پر انگریزوں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ حکومت قائم کریں مگر سرسید اپنے مذہبی عقاید میں قدامت پسند نہیں تھے۔ وہ مغرب سے بہت زیادہ مرعوب تھے۔

اسی لئے وہ مغربی فلسفہ کے ساتھ اپنے مذہبی عقاید کی جا و بیجا مطابقت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ ممکن ہے یہ بھی ہو کہ سر سید مذہبی علمار کے ان فتووں کی مخالفت کرنا چاہتے تھے جن سے غدر کے زمانہ میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا گیا تھا اور جن کی موجودگی میں انگریزوں سے اشتراک عمل اور مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال سر سید کی تحریک انگریزوں اور مغربی تہذیب سے مفاہمت کی خواہش مند تھی۔ لیکن علی گڑھ تحریک سے علیحدہ ملک میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کی مذہبی احیار کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اسلامی ملکوں کی سیر و سیاحت سے ہندوستانی مسلمانوں کی یہ تحریکیں بیرونی اسلامی ممالک کا اثر بھی قبول کرنے لگیں۔ ان تحریکوں میں جمال الدین افغانی کی بین الاقوامی اسلامی تحریک نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ یہ تحریکیں انگریزوں سے مصالحت نہیں چاہتی تھیں بلکہ انھیں مسلمانان عالم کا سب سے بڑا دشمن سمجھتی تھیں جنگ طرابلس، بلقان اور جنگ عظیم نے مسلمانوں کی مذہبی قومیت اور غیر ملکی اسلامی ہمدردیوں کو بہت نمایاں کیا اس دور کے مصنفین میں "الہلال" کے ابو الکلام، "کامریڈ" کے محمد علی، "زمیندار" کے ظفر علی خاں اور ڈاکٹر اقبال بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ تحریک عدم تعاون اور خلافت میں مسلمان اس لئے شریک نہیں ہوئے تھے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے بہت زیادہ خواہش مند تھے بلکہ وہ اس لئے شریک ہوئے تھے کہ وہ خلافت اور اسلامی ممالک کی آزادی کے بہت زیادہ متمنی تھے۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو وقتی اتحاد خلافت کے مسئلہ کی حمایت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا وہ خلافت کے ختم ہو جانے پر باقی نہ رہ سکا۔ ہندوستان کے مسلمان مذہب اور سیاست کو دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں سمجھتے تھے اور ان کی تمنا یہ تھی کہ خلیفہ کی قیادت میں آزاد مسلمان ریاستوں کا ایک وفاق قائم کریں۔ خود اپنے لئے ہندوستان کے مسلمانوں نے کوئی سیاسی نصب العین نہیں بنایا تھا۔ ان کی ساری امیدیں اور تمنائیں غیر ملکی اسلامی ریاستوں کی آزادی سے وابستہ تھیں اور انہی کی کامیابی یا ناکامی سے وہ خوش اور رنجیدہ ہوتے تھے لیکن جب ترکوں اور دیگر اسلامی ملکوں نے مذہب اور سیاست میں تفریق پیدا کر کے خالص قومی ریاستیں قائم کرنا شروع کیں تو ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کھوکھلی ہو گئی۔ اس کے سامنے کوئی نصب العین نہیں رہا۔ دوسری طرف ہندوؤں کے شدھی اور سنگھٹن شروع کر دینے کی وجہ سے

ہندو مسلم اتحاد کے مواقع بھی بہت کم ہو گئے۔ اس کے بعد تنظیم اور تبلیغ کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اب اس بات کی کوششیں ہونے لگیں کہ مسلم قومیت کو ہندوستان میں فروغ دینے کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کی جائیں اور ان کو ایک مضبوط حیثیت دی جائے۔ مسلمانوں میں جتنا جتنا اپنی علیحدہ قومیت کا احساس بڑھتا رہا ہے اور جتنا انھوں نے ہندو قومیت کو ترقی کرتے اور منظم ہوتے دیکھا ہے اتنے ہی وہ اپنے سیاسی تحفظ کے لئے بھی زیادہ کوشاں ہوتے گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت مسلم قومیت کی انتہائی شکل پاکستان کے تخیل کو سمجھنا چاہئے۔ لیکن پاکستان کا تخیل ابھی تک مسلمانوں کی ایک نہایت ہی محدود جماعت کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ اس نے کسی منظم تحریک کی شکل ابھی تک اختیار نہیں کی ہے۔ اس کا رہنما کیمبرج میں ابھی تک تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ پاکستان کی قومی تحریک کے حامیوں کی طرف سے جن جن صوبوں کو پاکستان میں شامل کیا گیا ہے اس میں پنجاب کا پورا صوبہ بھی شامل ہے۔ لیکن اس صوبہ میں مسلم اکثریت صرف ۵۷ فی صدی ہے اور سکھوں اور ہندوؤں کی اقلیت میں ہندو قومیت اس درجہ سرایت کئے ہوئے ہے کہ وہ کسی طرح مسلم اکثریت کے پاکستان کا جزو بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس لئے پاکستان کی قومی تحریک کے نصب العین کو پورا کرنے کے لئے مسلمان اس ناراضمند، کثیر التعداد، خوشحال اور برسر اقتدار اقلیت کی خواہشات کو کس طرح پامال کر سکیں گے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کسی طرح توقع نہیں کی جا سکتی کہ یہ اقلیت ان کی خاطر پنجاب کے زرخیز صوبہ کی نفع بخش سکونت ترک کر کے یو۔ پی، بمبئی، مدراس، سی۔ پی۔ بہار اڑیسہ وغیرہ کے ہندو صوبوں میں وہاں کی مسلم آبادی کی جگہ جا بسے گی۔ اسی طرح ان ہندو صوبوں کی مسلمان آبادی بھی شاید اپنی بڑی املاک و جائداد کو چھوڑ کر پنجاب میں بسنے کے لئے بہت زیادہ بے چین نہ ہوگی۔ ایسی حالت میں پاکستان کس طرح بن سکے گا اور جو مسلمان پاکستان سے باہر ہوں گے ان کے ساتھ ہندو اکثریت کے کس سلوک کو مناسب سمجھا جائے گا ایسے مسائل ہیں جو بہت پیچیدہ ہیں اور جن کے متعلق ضرورت ہے کہ پاکستان کے حامی پوری روشنی ڈالیں۔ ان باتوں پر مسلمانوں کو بہت جلد غور کرنا چاہئے کیونکہ سیاسی زندگی میں کوئی واضح نصب العین نہ رکھنے کی وجہ سے انھیں ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

ہندوستانی قومیت

مسلم قومیت اور ہندو قومیت کے مقابلہ میں اب ہندوستانی قومیت کا مطالعہ کرنا بھی

ضروری ہے۔ یہ بالکل جدید چیز ہے اور مغرب کے اثر اور تعلیم سے ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے۔ مغرب کی آزادی کی تحریکوں پر اس کی بنیاد قائم ہے۔ ایسے لوگوں نے اسے شروع کیا جنھوں نے انگلستان اور مغربی ممالک کے عہد جدید کے ادب کا مطالعہ کیا تھا انگریزی مگنا کارٹا اور بل آف رائٹس کی دفعات، ہیمپڈن اور برک کی تقریریں، مل کی تصانیف، روسو، ماننسکو وغیرہ کی تحریریں ــــــ یہ چیزیں اس جذبہ قومی کی محرک ہوئیں۔ انگریزی تعلیم سے ان لوگوں کو ایک مشترک زبان ملی جسے صوبوں کے درمیان تبادلۂ خیال کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا، مغربی تاریخ کی معرفت اُنھوں نے مغربی تمدن اور روح قومیت کو اختیار کیا اور انگریزوں کی صحبت اور رہنمائی میں اُنھوں نے قومی تنظیم کے طریقوں کو سیکھا۔ انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کا ابتدائی طبقہ تو انگریزوں کی برتری سے اس درجہ مرعوب تھا کہ اس میں کسی قسم کا صحیح قومی احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد کے تعلیم یافتہ لوگوں نے اصلاحات کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ گورنروں کی کونسلوں میں کچھ نشستوں کی خواہش کی اور سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر چاہا۔ مگر ان کی قومیت بھی بے جان تھی یہ ملک کے فرزند ہونے کی حیثیت سے اس بات کا مطالبہ نہیں کرتے تھے کہ انھیں اور صرف انھیں ملک کی قسمت کے فیصلہ کا حق ملنا چاہیئے بلکہ وہ اپنی اہلیت اور قابلیت ثابت کرکے عہدوں کے خواہش مند ہوئے تھے۔ وہ کسی کی نمایندگی نہیں کرتے تھے بلکہ ذاتی منفعت کے لئے تمام کوششیں کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انھیں معلوم ہوا کہ جس طبقہ کی وہ نمائندگی کرتے ہیں اس کے مفاد کو اس لئے نقصان پہنچ رہا ہے کہ عنان حکومت ایک غیر قوم کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد سے وہ شعوری طور پر صحیح معنی میں قوم پرست ہو گئے جن خیالات کو اُنھوں نے انگریز مفکرین اور مصنفین کے یہاں پڑھا تھا انھیں اپنے حالات کے عین مطابق پایا۔ خصوصیت کے ساتھ جب ہندوستانی قومیت کے معاشی پہلو کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس وقت اس بات کا پورا پتہ چلتا ہے کہ ہماری تحریک قومیت کس درجہ انگریزی تعلیم کی ممنون کرم ہے۔

اسی سلسلہ میں ۱۸۵۷ء کے غدر نے قومیت کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کا بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ غدر بلاشبہ برطانوی سلطنت کے خلاف ہندوستانی قومیت کی پہلی جنگ آزادی تھی مولویوں نے جہاد کے فتوے دے کر اور پنڈتوں نے ملکشوں کو نکالنے پر آمادہ کرکے لوگوں کی ملکی، مذہبی

تمدنی اور معاشرتی روایات کو قومی احساس کی شکل میں زندہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ بات صرف ایک بہت محدود حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ قومیت صحیح معنی میں کسی جاگیردارانہ نظام میں پائی ہی نہیں جاسکتی۔ غدر کے اکثر رہنما مرہٹوں اور مغلوں کے نیم جاگیردارانہ نظام سلطنت کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ جاگیرداری نظام کے ایسے حامیوں نے جنھیں انگریزوں سے کچھ توقعات تھیں غیر ملکیوں کی حمایت کی۔ لیکن ایسے لوگوں نے جنھیں مغربی سیلاب کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا اس طوفان کو روکنے کی کوشش کی۔ باغیوں کی اس کوشش کا انجام نہایت دردناک ہوا۔ لیکن اپنی شکست کے باوجود انھوں نے عوام کی ان بےچینیوں کی طرف مفکرین کی توجہ منعطف کرادی جو پرانے نظام کے برباد ہونے اور اس کی جگہ کسی نئے نظام کے نمودار نہ ہونے سے پیدا ہوئی تھیں۔ زراعت کا زوال، صنعتوں کی تباہی، عوام کی تباہ حالی اور ناموزوں اور غیر مانوس اداروں کا قیام یہی چیزیں ہیں جن کی بنیاد پر بعد کو ہندوستانی قومی تحریک کو شروع کیا اور چلایا گیا۔

ہندوستانی قومیت کا معاشی پہلو ہندوستانی قومیت کی ترقی میں جن معاشی اسباب نے خاص طور پر اعانت کی ان میں سب سے اول لائق ذکر سفر اور ذرایع نقل و حمل کی سہولتیں اور تجارت کی ترقی ہیں۔ ان سے صوبہ جات میں باہمی میل ملاقات کے زیادہ امکانات پیدا ہوئے اور وہ موانع اور تعصبات ختم ہوگئے جو ملک کے ایک حصہ کو دوسرے سے جدا کیا کرتے تھے۔ جب ہندوستان کے لوگ دور دراز صوبوں میں بھی گھر جیسا سکھ اور آرام پانے لگے اور جب ملک کی وسعت کے باوجود قربت بڑھنا شروع ہوئی تو پھر ہندوستان ایک جغرافی اصطلاح باقی نہیں رہا بلکہ اس کے قومیت کے تخیل نے ایک زندہ وجود کی شکل اختیار کرلی۔ وسائل خبر رسانی کی ترقی سے لوگوں کے خیال میں وسعت پیدا ہوئی اور اصلاح معاشرت کی ایک قومی تحریک کا آغاز ہوا۔

پھر مغربی مادی تمدن و تہذیب نے اور زیادہ بنیادی طور پر یہاں کی زندگی پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ انگلستان نے جیسا کہ کارل مارکس نے نیویارک ڈیلی ٹریبون میں لکھا تھا غیر شعوری طور پر ہندوستان میں ایک معاشری انقلاب کی ابتدا کردی۔ لالہ لاجپت رائے نے ہندوستانی قومی تحریک کی بنیادوں کے متعلق اپنی کتاب "نوجوان ہندوستان" میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں انگریزی

حکومت کے طریقے ان کا نظام تعلیم، ان کے مطابع، ان کے قوانین، ان کی عدالتیں، ان کی ریلیں، تار گھر، ڈاکخانے، دخانی جہاز — سب کے سب ہندوستانیوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے کے موجب ہوئے برطانیہ نے اس بات کو اس وقت نہ جانا لیکن اتحاد کے یہ تمام ذرائع غیر شعوری طور پر ہندوستانی قومیت کی بنیاد رکھتے رہے۔

اس کے علاوہ ہماری قومیت کو ملک کی صنعتی ترقی سے بھی بہت گہرا تعلق ہے۔ کانگریس کی ابتدا نہایت اعتدال پسند جماعت کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن جب یہ حقیقت روز بروز زیادہ واضح شکل میں نظر آنے لگی کہ ہندوستان سے ناجائز طریقہ پر انتفاع حاصل کیا جا رہا ہے اور جب ہندوستانیوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ صنعتی ترقی کے ذریعہ جو فوائد برطانیہ کو ہندوستان سے حاصل ہو رہے ہیں ان کا حق انھیں برطانیہ سے زیادہ ہے تو کانگریس میں قومیت کا رنگ نمایاں ہونے لگا۔ "جب مشینیں کسی ایسے ملک میں جہاں کوئلہ اور لوہا پایا جاتا ہے ایک دفعہ رائج کر دی جاتی ہیں تو ایسے ملک کو ان مشینوں کے خود پیدا کرنے سے کوئی شخص باز نہیں رکھ سکتا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ریلوں کا شروع کرنا اور پھر یہ توقع کرنا کہ ہندوستان میں وہ تمام صنعتیں جو ریلوں کی فوری ضروریات کو پورا کرتی ہیں ترقی نہ پائیں گی ایک ناممکن چیز کی تمنا کرنا ہے۔ نہ صرف ایسی صنعتیں قائم ہوں گی بلکہ ان کے بعد ایسی دوسری صنعتیں بھی قائم ہوں گی جو ریلوں سے قریبی طور پر متعلق نہیں ہیں۔ غرضکہ ہندوستان میں ریلوں کے رواج کو جدید صنعت کا ہراول سمجھنا چاہئے" مارکس نے یہ پیشین گوئی ۱۸۵۳ء میں کی تھی اور یہ بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی ہے گو سامراجی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوستانی صنعت کی ترقی میں بہت سے موانع پیدا ہوئے اور رفتار خاصی سست رہی۔ ہندوستانی قومیت کا درحقیقت آغاز اس وقت ہوا جب ہندوستان کے سرمایہ داروں نے دیکھا کہ قومی آزادی کے بغیر وہ صنعت کے بیشتر منافع سے محروم رہیں گے۔

مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ہندوستانی قومیت کے تخیل کو ر۔س۔ دت، دادابھائی نارو جی، رینا ڈے اور گوکھلے کی تحریروں سے کیوں اس قدر تقویت پہنچی۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے غیر ملکی فاتح کے ناجائز انتفاع کی قلعی کھول کر رکھ دی تھی اور ہندوستانیوں کو تبلایا تھا

کہ غیر ملکی حکومت کی وجہ سے انھیں کس کس قسم کے معاشی نقصانات پہنچ رہے ہیں۔

پہلی بات جس کی طرف ان لوگوں نے توجہ دلائی یہ تھی کہ ہندوستان سے دولت مستقل طور پر انگلستان کی طرف کھنچی ہوئی چلی جارہی ہے "مطالبات وطن" کے نام سے جو رقوم انگلستان روانہ کی جاتی ہیں وہ ایک طرح کا خراج ہیں جو ہندوستان اپنی محکومیت کی وجہ سے انگلستان کو ادا کرتا ہے۔ ہندوستان میں جو انگریز ہیں ان کا اپنی تنخواہوں کو ہندوستان میں خرچ کرنے کی جگہ انگلستان بھیجنا، پنشن جلد مل جانے کی سہولتیں، رخصت انگلستان میں بسر کرنا اور اسی قسم کے ہزاروں قومی نقصانات کے خلاف نہایت تکمیل کے ساتھ رائے عامہ کو متوجہ کیا گیا پھر ہندوستان کے قرضہ عامہ کے بارے میں تحقیق کرکے یہ بتلایا گیا کہ اس کے ایک بڑے حصہ کا بار خواہ مخواہ ہندوستان کے سر منڈھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تجارت وصنعت کے منافع کی شکل میں ہندوستان کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ بھی بتلایا گیا۔ کلکتہ کے نزدیک جو یورپ والوں کے جوٹ کے کارخانے ہیں جب وہ ۱۱۲ روپیہ کماتے ہیں تو اس میں سے ہندوستانی مزدوروں کو تو صرف بارہ روپیہ اجرت کے دیتے ہیں اور باقی سو روپیہ اسکاٹ لینڈ کے سرمایہ داروں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں قحط کے بار بار واقع ہونے سے جو تباہ حالی ہندوستان کے کسانوں میں پھیلی تھی اور ہندوستان میں عسرت وافلاس ترقی پر تھا اس کی ذمہ داری بھی غیر ملکی حکومت پر رکھی گئی۔ کہا گیا کہ کسانوں سے جس قدر مالگذاری وصول کی جاتی ہے وہ تقریباً سب کی سب غیر ملکوں کو چلی جاتی ہے۔ ہندوستانی صنعتوں کی تباہی اور زراعتی پیشہ پر آبادی کے ایک روز افزوں حصہ کا انحصار یہ چیز بھی برطانوی اعمال نامے کو سیاہ کرنے کے لئے استعمال کی گئی۔ پھر غدر کے بعد سفید فوجوں کے اضافہ سے ہندوستانی مدافعت کا خرچ بہت بڑھ گیا تھا اس نے بھی قومی شکایات میں ایک نمایاں جگہ اختیار کر لی۔

اس تمام بحث کے بعد یہ بات غالباً محتاج وضاحت نہیں رہتی کہ ہندوستانی احساس قومیت کی بیداری میں غیر ملکی تسلط سے ہماری قومی عزت نفس کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے بلکہ اس میں زیادہ دخل مادی احساس زیاں کو ہے۔ ابتدا میں کانگریس کی طرف سے ہندوستانیوں کے لئے صرف چند زاید عہدوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ صورت نہیں رہی۔ کیونکہ پھر کانگریس نے ایک طرف تو

مالیات کی آزادی یعنی قومی خرچ کی نگرانی کا مطالبہ کرنا شروع کیا اور دوسری طرف قومی صنعتوں کے تحفظ کی تحریکیں چلانا شروع کر دیں۔ پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ۱۹۲۴ء تک برطانوی حکومت ایسی حکمت عملی پر کاربند رہی جس سے برطانوی درآمد، خصوصیت کے ساتھ لنکا شائر کے کپڑے کو تقویت پہنچتی تھی۔ جب کبھی سرکاری آمدنی بڑھانے کے لئے باہر کے کپڑے پر چنگی لگائی جاتی تھی تو اس کے تامینی اثرات کو زائل کرنے کے لئے ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے پر اکسائز کا محصول بھی ساتھ ہی ساتھ لگا دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں سرکار کی طرف سے جو نہریں بنائی جاتی تھیں ان سے بیشتر روئی پیدا کرنے والی زمینوں کی آبپاشی مدنظر ہوتی تھی تاکہ اس سے ایک طرف تو لنکا شائر کی روئی کی ضرورت پوری ہو سکے اور دوسری طرف سرکاری مالگذاری کے ادا کرنے میں سہولت ہو۔ لیکن ہندوستانی قومیت کو آہستہ آہستہ کامیابی حاصل ہونا شروع ہوئی۔ چنانچہ ہندوستانی فولاد کی صنعت کو سرکار کی طرف سے تامین اور عطیات دلائے گئے جس سے اس کی ترقی میں بہت مدد ملی۔ پھر ہندوستانی کپڑے کے کارخانوں کے تحفظ کے لئے لنکا شائر تک کے خلاف محاصل درآمد عاید کرائے گئے۔

غرضکہ ہندوستانی قومیت کی جنگ میں معاشی قوتوں کا اثر ہر قدم پر نمایاں نظر آتا ہے۔ بنگال میں افتراق کے خلاف جو شورش کی گئی اس میں "سودیشی" کی تحریک کو بھی ساتھ ہی ساتھ چلایا گیا۔ جنگ عظیم کے زمانہ کی معاشی ابتری نے قومی تحریک میں پرولتاریہ یعنی مزدوروں اور کسانوں کے طبقہ کو بھی قومی تحریک میں شامل کر دیا جس سے مہاتما گاندھی کی ستیا گرہ (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء) نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ ۳۰-۱۹۲۹ء میں عالمگیر کساد بازاری کے اثرات ہندوستان کے لئے نہایت تباہ کن ثابت ہوئے۔ ۱۹۳۰ء کی پیداوار کی قیمت ۱۹۲۹ء کے مقابلہ میں نصف رہ گئی۔ پھر چاندی کی قیمت گھٹنے اور شرح مبادلہ کے بڑھنے سے بھی ہندوستان کو نقصان پہنچا۔ انہی معاشی اسباب کی بنا پر مہاتما گاندھی دوبارہ قومی قوتوں کو مجتمع کر کے برطانوی حکومت کو کئی سال تک پریشان رکھ سکے۔

ان معاشی قوتوں کے مقابلہ میں جب ایسی غیر معاشی قوتوں کو رکھا جاتا ہے جیسے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں اعزاز و مرتبت کے لئے کشمکش، قانون اسلحہ سے بیزاری، ریلوں اور دوسری سرکاری ملازمتوں میں گورے

کالے کی تفریق، سی۔ آئی۔ ڈی اور سنسرشپ کی زیادتی، اخباروں اور جلسوں کے خلاف قوانین وغیرہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بجائے خود ہندوستانی قومیت کی تحریک پیدا نہ ہوسکتی تھی۔ اس اتحاد قومی کے پیدا کرنے میں مادی مفاد کے اشتراک کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

سوشلزم کی تحریک زندگی کے معاشی پہلو کی اہمیت نے ہندوستان میں ایک نئی تحریک یعنی سوشلزم کا بھی آغاز کر دیا ہے۔ یہ تحریک بھی مغرب سے آئی ہے اور مغربی مفکرین کے خیالات ہی کی رہین منت ہے۔ یورپ میں کارل مارکس جس کا ذکر ضمناً اوپر کیا جا چکا ہے اس تحریک کا بانی تھا اور لینین اور اسٹالین نے اسے روس میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ اس تحریک کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ مشین اور اعلیٰ پیمانہ پر صنعتی کاروبار کے طریقے رفتہ رفتہ انسانیت کے ارتقا کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں اور اب ان کو اختیار کئے بغیر تمام دنیا کے لئے مفر کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی ہے۔ لیکن پیداوار کے ان جدید طریقوں میں بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جسے ہر دولت پیدا کرنے والا شخص فراہم نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایک قلیل جماعت سرمایہ داروں اور ایک کثیر جماعت مزدوروں کی پیدا ہو جاتی ہے۔ سرمایہ داروں کی جماعت قلیل سے قلیل تر اور مزدوروں کی جماعت کثیر سے کثیر تر ہوتی جاتی ہے۔ نفع طلبی کی ذہنیت کے ماتحت سرمایہ داروں کی دولت اور اقتدار برابر بڑھتا جاتا ہے اور مزدوروں کے احساس افلاس اور بے بسی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے پھر سرمایہ داروں کا اقتدار ایک ملک تک محدود نہیں رہتا بلکہ کل عالم پر چھا جاتا ہے۔ اس لئے ان کی پالیسیاں تمام دنیا کے ذخائر، منڈیوں اور مزدوروں کو نظر کے سامنے رکھ کر متعین کی جاتی ہیں۔ مزدوروں کو کارخانوں میں ایک جگہ کام کرنے سے میل ملاقات کے مواقع زیادہ ملتے ہیں اور باہمی مفاد کے اشتراک کا انھیں احساس ہو جاتا ہے جس سے ایک مزدور ذاتی نفع کے لئے دوسرے کا مقابلہ نہیں کرتا بلکہ سب مزدور جماعتی نفع کے لئے مل کر سرمایہ دار سے سودا کرتے ہیں۔ اپنی قوت کا احساس رفتہ رفتہ یا کبھی یکبارگی ان کے حوصلوں کو بہت بڑھا دیتا ہے اور اب وہ اجرت میں خفیف بیشی یا اوقات کار میں کمی سے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ سرمایہ داروں کے قلیل گروہ کی جگہ مزدوروں کی جماعت کا مکمل تسلط زمین، سرمایہ اور پیداوار دولت کے وسائل پر چاہنے لگتے ہیں اور چونکہ سرمایہ داروں کا تسلط عالمگیر ہوتا ہے اس لئے ان کا ہر جگہ مقابلہ کرنے کے لئے انھیں بھی

اپنی تحریک کو عالمگیر بنانا پڑتا ہے۔ تمدن و معاشرت کے اختلاف کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں ہے وہ ان سب کو بورژوا یعنی سرمایہ داروں کی تخلیق کی ہوئی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ تحریک مذہب سے بالکل منحرف ہے۔ اسے نشہ سمجھتی ہے جسے پلاکر سرمایہ دار مزدور کو عاقبت کی امید میں دنیا کی تکالیف کو سہنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ یہ انسانی ذہنیت اور نظام معاشرت میں ایک بنیادی انقلاب چاہتی ہے۔ ہندوستان میں یہ تحریک ابھی نئی نئی شروع ہوئی ہے اور صرف ایک قلیل التعداد تعلیمیافتہ جماعت کے ذہنوں میں اس کا پورا خاکہ پایا جاتا ہے۔ صنعتی شہروں کے مزدوروں میں بھی اس کا کچھ کچھ اثر ہے۔ لیکن ابھی عام طور پر اسے کسانوں اور مزدوروں نے اختیار نہیں کیا ہے۔

خاتمہ ہندو قومیت، مسلم قومیت، ہندوستانی قومیت اور سوشلزم کی تحریکوں کا ہم نے علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ کون سی تحریک ان میں دوسری تحریکوں پر غالب آئے گی یا ان میں باہم کوئی یگانگت اور ہم آہنگی پیدا کی جاسکے گی۔ پانچ ممکن صورتیں ہیں جو رونما ہو سکتی ہیں:-

(۱) مسلم قومیت کا ہندوستان پر مکمل تسلط۔

(۲) ہندو قومیت کا ہندوستان پر مکمل تسلط۔

(۳) ہندوستان کی تقسیم دو حصوں میں۔ ایک حصہ میں خالص اسلامی قومیت اور دوسرے میں خالص ہندو قومیت۔ گویا پاکستان اور ہندوستان واقعی پیدا ہو جائیں۔ آبادیاں قومیت کی بنا پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ رہی یہ بات کہ اس پاکستان اور ہندوستان میں کون کون سے علاقے شامل ہوں یہ بات عام رائے شماری اور باہمی سمجھوتہ سے طے کر لی جائے۔

(۴) ہندو قومیت اور مسلم قومیت کی باہمی آمیزش سے ایک ایسی قومیت پیدا ہو جس میں دونوں کے عناصر شامل ہوں۔

(۵) ہندو قومیت اور مسلم قومیت دونوں کی تباہی اور ان کی جگہ مغربی وضع کی سرمایہ دارانہ قومیت یا بالشویزم کی قسم کا نیا معاشی اور معاشری نظام پیدا ہو جائے۔

اب ان میں سے واقعی کون سی صورت رونما ہوگی اس کا فیصلہ تو مشکل ہے لیکن اگر ہندو قومیت اور مسلم قومیت میں کوئی ایسا باعزت سمجھوتہ ہو سکے جس سے مذہب اور معاشرت کی بنیادی باتوں کو ترک کئے بغیر دونوں فریق اپنے سیاسی اور معاشی معاملات میں جن کی اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے شریک رہ سکیں تو میں سمجھتا ہوں یہ بہت مناسب بات ہوگی کیونکہ اور تمام کوششوں میں (چاہے ان کے دوسرے فواید اور کتنے ہی کیوں نہ ہوں) غیر ضروری فتنہ وفساد اور تکلیف ومصیبت کا احتمال ہے۔

نازو

میرے شوہر کو مناظرِ قدرت اور ان کی دلپذیر شادابیوں سے بہت محبت ہے۔ چنانچہ ہم شہر سے بہت کافی فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے مکان کے گرد ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں پھول ہیں، کیاریاں ہیں اور روشیں ہیں لیکن اس احاطے کے باہر عروسِ فطرت دستِ انسانی کی گستاخیوں سے ناآشنا ہے۔ چاند، سورج، مینھ اور شبنم مشاطہ کے فرائض دن رات انجام دیتے ہیں اور اس کے سادہ حسن اور معصوم شباب کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارا مکان فطرت کی ان شادابیوں میں اس طرح محصور ہے جس طرح ایک آشیانہ درخت کے سرسبز پتوں اور گھنی شاخوں میں گھرا ہوتا ہے۔ مکان سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ریل کی پٹری ہے، جس پر سے دن رات ریلیں گذرتی ہیں۔

یہ گذرنے والی ریلیں اکثر مجھے نازو کی یاد دلاتی ہیں۔ اُس نازو کی جو اپنی بہن کی گود میں پرورش پاکر اپنی بہن کو داغ دے گئی، جو جوان ہوئی اور جوان ہو کر مر گئی، جو گلاب کے پھول کی طرح شاداب تھی اور چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن، لیکن جس کی جوانی ان دونوں کی جوانی سے بھی زیادہ مختصر تھی۔

اماں جان کی ناگہانی موت کے وقت نازو صرف تین برس کی تھی۔ میں نے اس کو بڑی محبت، بڑی جانفشانی سے پالا۔ میں دن دن بھر اس کو گود میں لیے رہتی اور ساری ساری رات پنگوڑے میں لٹا کر لوریاں سناتی۔ میں اس کو اس قدر پیار کرتی تھی کہ اماں جان بھی اگر زندہ ہوتیں تو شاید نہ کر سکتیں۔ وہ میری محبت بھری گود میں سانس لے کر بڑی ہوئی، جوان ہوئی۔ اس کی جوانی چڑھتی ہوئی آندھی کی طرح آئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اُس کا چہرہ دمک اُٹھا، جہان بھر کی تابانیاں اور رونقیں اس میں سمٹ کر آ گئیں۔ اس کے سیاہ بال بے حد گھنے اور لانبے ہو گئے۔ اس کا قد اتنا دراز ہو گیا کہ اگر وہ منہ موڑ کر کھڑی ہوتی تو سچ مچ ایک عورت معلوم ہوتی۔ میں اس اٹھان، اس بالیدگی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی لیکن آہ مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ساری پھبن، یہ تمام رعنائی ایک فریب ہے، ایک دھوکا ہے۔ یہ جوانی جو آندھی کی طرح

آئی ہے ایک جھونکے کے مانند گزر جائے گی۔

ہائے وہ کیسی منحوس اور نامراد صبح تھی جب نازو نے مجھ سے کہا تھا کہ "آپا میرے سر میں درد ہے اور کچھ حرارت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے اس کے چڑھتے ہوئے بخار کو معمولی سوء ہضم کا نتیجہ سمجھا تھا اور اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی تھی۔ اس وقت میں کیا جانتی تھی کہ یہ بخار وہ بخار نہیں ہے جو ایک دو دن کی دوا کے بعد اتر جاتا ہے بلکہ وہ بخار ہے جو اکثر و بیشتر موت کا نقیب بن کر آتا ہے۔ ابا جان نے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دہلی کے افضل سے افضل طبیب بلائے اور جب ان کی کوششیں ناشکور رہیں تو باہر والوں سے رجوع کیا لیکن بخار کسی طرح نہ اترا۔ اور بالآخر ایک دن مجھ نامراد کو یقین دلا دیا گیا کہ کوئی ارضی طاقت میری بہن کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی۔ مجھ سے جتنا رویا گیا میں روئی، جتنا غم کیا گیا کیا اور جتنی دعائیں مانگی گئیں مانگیں، مگر طبیبوں کی اس رائے میں تبدیلی نہ ہوئی اور میری نازکی پالی ہوئی نازو اسی طرح موت سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

نازو بچپن سے ایک بہت خاموش اور کم سخن لڑکی تھی۔ وہ بات کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ صرف رونا جانتی تھی۔ جب تک اس نے ہوش نہیں سنبھالا بات کرنے کی بجائے ہمیشہ آنسو ہی بہائے۔ یعنی اگر اس کو کبھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی یا کوئی تکلیف ہوتی تو بجائے اس کے کہ مجھ سے آکر کہے وہ کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر رونے لگتی۔ جب بڑی ہو گئی تو یہ رونا تو کم ہو گیا لیکن زبان کی ویسی ہی گونگی رہی۔ چنانچہ اس نے اپنی طویل بیماری کے زمانے میں کبھی زبان سے کچھ نہ کہا۔ دن دن بھر خاموش آنکھیں کھولے پڑی رہتی۔ طبیبوں نے جو اس کی صحت کی طرف سے مایوسی ظاہر کی تھی اس کی بابت اس سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ نادان نہ تھی۔ سب کچھ سمجھتی تھی۔ اور اپنی بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایک دفعہ —— یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ چلتی پھرتی تھی اور ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی کہ بستر سے بھی نہ اٹھ سکے —— اس نے اپنے بکس میں سے ایک قیمتی دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔ ایسے دوپٹے عام طور پر کسی تقریب کے سلسلے میں نکالے جاتے ہیں اور روزانہ استعمال میں نہیں آتے۔ جس خیال کے ماتحت اس نے یہ دوپٹہ اوڑھا تھا مجھ پر اچھی طرح واضح تھا۔ تاہم میں نے تجاہل سے کام لیا اور جب وہ سامنے آئی

تو مصنوعی تعجب کا اظہار کیا لیکن وہ جواب میں بالکل خاموش رہی۔ اس طرح اکثر اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ اپنے لاعلاج مرض کو پہچانتی ہے اور نتیجے سے واقف ہے۔

جب نازو تندرست تھی ۔۔۔ ابھی بیمار نہ پڑی تھی ۔۔۔ تو اس کے جوان دل میں بہت سی جوان آرزوئیں تھیں۔ بخار میں آرزوؤں کا یہ لہلہاتا ہوا چمن جھلس کے رہ گیا اور اس کے سارے ذوق و شوق ختم ہوگئے لیکن اس حالت میں بھی دو ارمان اس کے دل میں باقی تھے۔ وہ ریل میں بیٹھنا چاہتی تھی اور "آپا زبیدہ" کے بیاہ میں شریک ہونے کی آرزومند تھی۔

نازو دہلی میں پیدا ہوئی اور ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہیں گئی۔ اس لئے اس کو ریل کے سفر کا ارمان تھا۔ جن لوگوں کی رشتہ داری شہر سے باہر ہوتی ہے ان کو ریل کا سفر آئے دن درپیش رہتا ہے لیکن ہمارے تمام اعزا و اقارب دہلی ہی میں تھے۔ صرف نانا ابا کی وجہ سے تھوڑا سا تعلق میرٹھ سے تھا کہ وہ وہاں برسوں سے مقیم تھے۔ چنانچہ جب نازو گود میں تھی تو اماں جان کے ساتھ چند مرتبہ میرٹھ گئی بھی تھی لیکن اس کو اس زمانے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر ادھر تو اماں جان کا انتقال ہوا اور اُدھر نانا ابا کی آنکھیں بند ہوئیں یہ تعلق بالکل ختم ہوگیا اور نازو ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہ جاسکی۔

نازو کی دوسری خواہش یہ تھی کہ وہ کسی لڑکی کے بیاہ میں شریک ہو۔ وہ بیاہ کی تمام رسموں کو دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے اس شوق کے متعلق اکثر باتیں کیا کرتی تھی۔

بیماری سے کچھ دنوں پہلے اس کو امید ہوگئی تھی کہ اب یہ دونوں خواہشیں بہت جلد پوری ہوجائیں گی۔ میرٹھ میں ہماری خالہ کی بیٹی زبیدہ کا بیاہ ہونے والا تھا۔ خالہ اماں نے ابا جان کو لکھا تھا کہ زبیدہ کی شادی اکتوبر میں ہوگی اور میں سب کو میرٹھ بلاؤں گی۔ نازو نے اسی وقت سفر اور شادی میں شرکت کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ وہ دن اور ہفتے گن گن کر وقت کاٹ رہی تھی اور ابھی مارچ ہی کا مہینہ شروع ہوا تھا کہ اس موذی بخار نے اس کو آلیا۔

پھر بھی میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جب زبیدہ کا بیاہ ہوگا تو میں تجھ کو اپنے ساتھ لے کر میرٹھ جاؤں گی اور فی الحقیقت میں اس کو میرٹھ لے جانا چاہتی تھی تاکہ اس کے دل میں یہ ارمان نہ رہ جائے چنانچہ

جب بیاہ میں ایک ہفتہ رہ گیا اور خالہ اماں نے بلاوے کا خط لکھا تو میں نے ابا جان سے ذکر کیا اور نازو کو میرٹھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے قطعیت کے ساتھ انکار کر دیا۔ مجھے اس کی بالکل امید نہ تھی۔ میں حیران و ششدر رہ گئی، تھوڑی دیر کے لئے بدحواس ہو گئی۔ پھر جب میں ذرا سنبھلی اور مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ صدمہ نازو کے لئے ناقابل برداشت ہوگا تو میں نے اپنی تمام کوششیں ابا جان کو راضی کرنے میں صرف کر دیں۔ میں روئی بھی، منتیں بھی کیں، اوروں سے سفارشیں بھی کرائیں، لیکن ابا جان نے جو ایک دفعہ کہہ دیا تھا وہی کہتے رہے۔

نازو خالہ اماں کے خط کی بابت سن کر بہت خوش ہوئی تھی اور اس دن سے دل ہی دل میں امید کر رہی تھی کہ اب بہت جلد میرٹھ کے سفر کی تیاریاں ہوں گی۔ لیکن تین دن گذر گئے اور نہ ابا جان نے اجازت دی اور نہ مجھ میں کسی وقت باوجود کوشش کے اتنی ہمت پیدا ہو سکی کہ میں نازو سے کہہ دیتی کہ "پیاری نازو! تمھارے ابا جان تم کو میرٹھ جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ تم وہاں نہ جاؤ گی۔" آخر چوتھے روز دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھا کر لیٹی تو میں نے جی کڑا کر کے کہا "نازو صبح کی ڈاک سے خالہ اماں کا دوسرا خط آیا ہے۔ زبیدہ کی شادی ملتوی ہو گئی، غالباً ایک دو مہینہ کے بعد ہوگی۔" نازو نے یہ سن کر اپنی نظریں جھکا لیں اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کی دوا لینے الماری تک گئی۔ جب دوا شیشے میں انڈیل کر لائی تو میں نے دیکھا کہ نازو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری ہے۔ یہ آنسو اس کے زرد زرد رخساروں سے ڈھلک کر نیچے گر رہے ہیں اور تکیے کو بھگو رہے ہیں۔

اس واقعے کو پانچ برس گذر چکے ہیں۔ اب نہ نازو ہے نہ ابا جان ہیں۔ نہ وطن ہے نہ وہ گھر جس میں میں نے اپنی زندگی کا عظیم ترین صدمہ برداشت کیا۔ میں ہوں میرا ویران دل ہے، پردیس ہے اور جنگل میں یہ مکان ہے۔ رات کو جب ہر طرف سناٹے کا عالم ہوتا ہے، آسمان سے ظلمتیں برستی ہیں، اور جنگل کی وسیع پہنائیوں سے جھینگروں اور مینڈکوں کے شور کے سوا کوئی آواز نہیں آتی تو ٹھیک ساڑھے نو بجے، ریل اپنی شاندار ہیبت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ میرے مکان کے سامنے سے گذرتی ہے۔ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ نازو افق کے کسی بعید ترین گوشے سے، حسرت و اشتیاق کے ساتھ ریل کو

دیکھ رہی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے ہوئے ہے لیکن جب ریل اس کے اشتیاق کو پامال کرتی ہوئی، اس کے ارمانوں کو کچلتی ہوئی، سفاکانہ بے التفاتی کے ساتھ نکل جاتی ہے تو اُس کے ہاتھ گر پڑتے ہیں، اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے

برطانیہ میں نئی روشنی

مزدور سبھا کا اقتدار

صنعتی انقلاب نے برطانیہ میں ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی ۔ یہ دور ہنگامی شورشوں سے پاک تھا۔ فتنہ و فساد کی آگ بجھ چکی تھی، بغاوت کے علم سرنگوں ہو چکے تھے، حکومت کی یکطرفہ جانبداری ختم ہو چکی تھی، مالک و مزدور کھلم کھلا ایک دوسرے کے درپے آزار نہ تھے "تنظیم" اصول اور یکجہتی نے انکی حالت میں نمایاں فرق پیدا کر دیا تھا' اُنھیں ایک مستقل حیثیت اور اہمیت عطا کی تھی، اور ایک معتد بہ طاقت کا مالک بنایا تھا۔

سچ یہ ہے کہ عزم و استقلال کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے ۔ سلطنت برطانیہ اور فرنگی اہل دول اگر مزدوروں کی "حقیر" طاقت کو پامال کر سکتے تو یقیناً آج صرف سرمایہ داروں کا راج ہوتا' وہ لا متناہی دولت کے مالک تھے اور رہتے' وہ دنیاوی آسائشوں کا لطف بلا شرکت غیرے اٹھا رہے تھے اور اٹھاتے' وہ بیکس غلاموں پر جابر شہنشاہ کی طرح حکمراں تھے اور ان پر انگشت نمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن ان کی طاقت حدِ کمال کو پہونچ چکی تھی ۔ ان کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا' ان کی بے اعتنائیوں نے مظلوم بندگانِ خدا میں رشک و حسد کے جذبے پیدا کر دئے تھے ۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں مزدوروں کی جس تحریک کا آغاز ہوا تھا وہ چارٹزم[۵] کے ساتھ دفن ہو گئی ۔ لیکن یہ وہ ناکامی نہ تھی جس کو ناکامی کہا جائے' یہ ابتدا تھی ان کامیابیوں کی جو آج ہماری

---

[۵] چارٹزم (CHARTISM) برطانوی مزدوروں کی وہ تحریک تھی جسکی ابتدا ۱۸۳۸ء میں ہوئی اور جس کا خاتمہ ۱۸۴۸ء ہوا ۔ اس تحریک کے حامی حکومت کو اپنے مطالبات منظور کرنے اور انقلابی اصولوں کو عمل درآمد کرنے کیلئے مجبور کرنا چاہتے تھے

نظروں کے سامنے ہے۔ یہ بنا تھی ان اصولوں کی جن کے بغیر کامیابی ناممکن تھی ان اصولوں میں کمزوریاں بھی تھیں اور غلطیاں بھی۔ مگر وقت و ضرورت کے مطابق ان کا وجود ناگریز تھا۔

ابتدائی زمانہ میں مشینوں پر جو حملے کئے گئے، بغاوت کی جو صورتیں عمل میں آئیں، اصلاح کی جو تجاویز پیش کی گئیں وہ تمام تر ایک جذبہ انتقام کے ماتحت تھیں۔ ان کا مقصد سرمایہ دار مالکان مشین کو یکسر نیست و نابود کرنا تھا؛ انکی عظمت و جاہ کو تاخت و تاراج کرنا تھا؛ مگر جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہ طاقت اس طرح فنا ہونے والی نہ تھی۔ اس پر فتح حاصل کرنے کے جو ذرایع عمل میں لائے گئے تھے وہ ناموزوں اور نامناسب تھے .. .. ضرورت اس بات کی تھی کہ طبقہ مزدوران میں یگانگت کی روح پھونکی جائے۔ ان کے درمیان سے صنعتی اور غیر صنعتی کا تفرقہ اٹھایا جائے۔ انھیں غیر طبقوں کی مدد سے مستغنی کیا جائے۔ انھیں اپنے لیڈر خود پیدا کرنے کا اہل بنایا جائے۔

گزشتہ دنوں میں مزدور طبقہ حکومت کی ہمدردی حاصل کر چکا تھا، قوم اس کی آزادی تسلیم کر چکی تھی، اتحاد کی سہولتیں حاصل تھیں، اور ترقی کی شاہراہ کھل چکی تھی۔ تجربہ ثابت کر چکا تھا کہ غارتگرانہ حملے بے سود اور سرمایہ داروں کی تباہ کرنے کی کوشش عبث تھی۔ مگر اتحاد اور مکمل اتحاد ایک ایسا حربہ ضرور باقی تھا جس پر فلاح و بہبود کا انحصار کیا جا سکتا۔ یوں تو تجارتی اتحاد کا آغاز ۱۸۲۴ء میں ہو چکا تھا لیکن اس دور نے اس کا نیا رنگ دیکھا، مزدور سبھائیں نئی طاقت و فراوانی کے ساتھ قائم ہونے لگیں۔ اتحادی اصولوں سے واقفیت حاصل کی گئی۔ اور مقاصد کے حدود متعین کئے گئے۔ مقصد اعلیٰ یہ تھا کہ اپنے جائز حقوق، اپنی آزادی، اپنا آسائش و آرام مالکان کارخانہ سے بلا جنگ و جدل حاصل کیا جائے۔

حصول کے ذرایع یہ تھے۔

(۱) اتحاد کو مکمل بنایا جائے۔

(۲) معاشی اصول کے حدود سے باہر قدم نہ رکھا جائے۔

(۳) جس طرح ممکن ہو حکومت کی ہمدردی حاصل کی جائے۔

(۴) پبلک کو ہم خیال بنایا جائے۔

اس پالسی کے مطابق مزدوروں کی جو اتحادی مجلس قائم ہوئیں ان کو "صنعتی مجالس"[۵۷] کہنا چاہیئے ان کا مقصد مالکانِ مشین سے براہِ راست مطالبات حاصل کرنا تھا۔ یہ مجلس ملکی سیاسیات سے بالکل جدا صرف معاشی اصول پر کاربند تھیں۔ اور اپنے آلام و مصائب کو دور کرنے کے لئے ساہوکاروں کو جائز طور پر مجبور کرنا چاہتی تھیں۔ گو ۱۸۳۲ء کی تجارتی کساد بازاری نے انھیں اُبھرنے کا موقع نہ دیا تھا۔ لیکن تنظیم و تدبیر کی جو ہوا چل نکلی تھی آہستہ آہستہ اپنا اثر کرتی رہی۔ ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت حاصل کرتے رہے۔ ۱۸۴۲ء کے بعد ترقی کا جو دور شروع ہوا اس نے مزدوروں کی اہمیت میں نمایاں اضافہ کیا۔ مزدور سبھا کی تعداد بڑھنے لگی۔ صنعت و حرفت کے ہر شعبے میں تجارتی اتحاد کے چرچے ہونے لگے۔ راج مزدوروں کی سبھا' بڑھیوں کی سبھا' کارخانوں میں کام کرنے والوں کی سبھا۔ غرض ہر طرف تجارتی انجمنوں کا زور تھا۔

اتحاد مہذب قوم کا وہ حق ہے جس کو دنیا کی تمام حکومتیں اور فرقے یکے بعد دیگرے تسلیم کر رہے ہیں جسے ہمیشہ ہمیشہ سے عملی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی طاقت ہر جگہ مسلم الثبوت ہے پھر کیوں کر ممکن تھا کہ برطانیہ کے مزدور اپنے اس مطالبے پر مصر نہ ہوتے اور اس کے حاصل کرنے کی امید میں اپنے خون کی ندیاں بے دریغ نہ بہاتے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تھوڑی ہی یورش کے بعد سرکاری توانین کی رو سے تجارتی اتحاد جائز قرار دیا جا چکا تھا۔ اور مزدوروں کی مجلس کو قانونی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ مگر اب بھی ان کے عمل کی راہیں محدود تھیں' قدم قدم پر رکاوٹیں حائل تھیں' جا بجا قواعد و ضوابط کی دیواریں کھڑی تھیں۔ پارلیمنٹ کا ہر اجلاس ان کی طاقت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے نت نئے توانین تیار کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ ممکن نہ تھا کہ اس نوخیز طاقت کو خس و خاشاک کی طرح کچل ڈالا جائے' ننگے اور بھوکے مزدوروں کو یکسر تہ تیغ کر دیا جائے۔ بالآخر حکومت کو انکی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ اور ۱۸۴۲ء میں جن مراعات کی ابتدا ہوئی تھی ان کا سلسلہ ۱۸۷۵ء تک جاری رہا۔ اس درمیان میں جو قوانین نافذ ہوئے اُنھوں نے

---

۵۷ "صنعتی مجالس" وہ ہیں جن کا طرز عمل (INDUSTRIAL) تھا۔

کاروباری حالات کو بہت کچھ درستی کی طرف مائل کیا۔

اس وقت مزدور سبھا بذات خود ایک جداگانہ حیثیت کی مالک تھی، ہر سبھا صرف اپنے ارکین کے بہبود کے لئے سرگرداں تھی، صرف انہی کے معاشی اور اقتصادی حالات کو بہتر کرنے کی کوششیں کر رہی تھی، اور صرف انہی کے معاوضہ میں ترقی اور اوقات میں تعین کی متلاشی تھی۔ مگر یہ جداگانہ کوششیں ایک حد تک ناکامیاب ثابت ہوئیں۔۔۔۔۔۔اب معلوم ہوا کہ اتحاد کا موجودہ اصول اور مزدور سبھاؤں کا طریقہ عمل نقص سے خالی نہ تھے۔ ہر مجلس دوسرے سے بالکل جدا اور بے تعلق تھی۔ ایک دوسرے کے عقائد میں اختلاف تعارض آپس میں ہم آہنگی کا کوئی پہلو موجود نہ تھا۔ یہ کمزوری تمام کمزوریوں پر حاوی اور تمام اصولوں کی بیخ کن تھی۔ اگر مزدور جلد ہی اسے محسوس نہ کرتے تو ان کی گردنوں میں غلامی کا طوق اور پیروں میں بیکسی کی زنجیریں ابھی مدت دراز تک پڑی رہتیں۔

ان مجالس میں اصولی اور عملی اتحاد پیدا کرنے اور مطالبات حاصل کرنے کے لئے سوائے اشتراک[1] کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

اشتراک کے مقاصد یہ تھے:۔

(۱) چھوٹی چھوٹی متعدد مجالس کو ملا کر ایک مکمل تنظیم کا وجود میں لانا۔

(۲) بیک آواز چند مستقل مطالبات کے لئے چیخ پکار کرنا۔

(۳) مقاصد کے اختلاف کو مٹا کر اپنا اقتدار سرمایہ داروں پر قائم کرنا۔

(۴) دوستانہ مصالحت اور یک جہتی کو فروغ دینا۔

اس قسم کے اشتراک کی ابتدا انجنیروں کی مجالس سے ہوئی۔ اُنھوں نے اپنے ہم پیشہ مزدوروں کی مختلف انجمنوں کو باہم دگر منسلک کرکے ایک بڑی انجمن قائم کی جس کا مقصد تیلی گھروں میں کام کرنیوالے مزدوروں کے مطالبات حاصل کرنا تھا۔ چند دنوں بعد یہی طرز عمل روئی کے کارخانوں میں کام کرنے والے

---

[1] کسی بڑی مجلس میں چھوٹی چھوٹی مجالس کو جذب کر لینے کو اشتراک یا AMALGAMATIOM کہتے ہیں

مزدوروں نے بھی اختیار کیا۔ یہ سلسلہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور صنعت و حرفت کے ہر شعبے میں مشترکہ مجالس قبولیت حاصل کرتی گئیں۔

مگر جس کامیابی کی توقع ایک زبردست مشترکہ طاقت کے ساتھ وابستہ تھی وہ حاصل نہ ہو سکی۔ اشتراک کی کمزوریاں اور نقائص جلد ہی منظر عام پر آ گئے۔ معلوم ہوا کہ

(۱) مشترکہ مجلس میں اراکین کی بڑھتی ہوئی تعداد کو قابو میں رکھنا مشکل تھا۔

(۲) ان کے مطالبات کو فرداً فرداً پورا کرنا ناممکن تھا۔

(۳) اور اب بھی بغیر حکومت کی امداد کے ساہوکاروں سے مقصد برآری کی امید نہ تھی۔

اس وقت جس بدنظمی کی ابتدا ہوئی اور جو بے چینی ہمہ گیری حاصل کرنے لگی تجارتی اتحاد کے لئے سمِ قاتل سے کم نہ تھی۔ اس حالت کا چندے قائم رہنا بھی اس کے وجود کے لئے مضر و خطرناک تھا۔ لیکن اتحادی لیڈر اپنی دھن کے پکے تھے۔ اس بنے بنائے کھیل کو بگاڑنا انھیں منظور نہ تھا جاں فشانی اور مشقت کی حاصل کی ہوئی دولت کو اس طرح تباہ کرنا انھیں گوارا نہ تھا۔ لہٰذا وہ اپنے قدم سیاسیات کی طرف بڑھانے کے لئے مجبور اور عنانِ حکومت کو مزدور پارٹی کے قبضہ قدرت میں لانے کے لئے سرگرم ہوئے۔

اس تحریک سے برطانیہ کی مزدور دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جا بجا سیاسی مجالس قائم ہونے لگیں۔ مزدور سبھا سے نمائندے چنے گئے اور ان کو منتخب کرانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ غرض یہ تھی کہ مجلس قانون ساز میں مزدور پارٹی کی اکثریت حاصل کی جائے قانون سازی کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔ اپنے مجوزہ قانون کی رو سے مطالبات حاصل کئے جائیں۔ ابھی اس تحریک کی ابتدا تھی اور اس کے حامیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ مگر عمارت بنانے والے راج مزدوروں کی سبھائیں اس کا پروپگنڈا جوش و خروش کے ساتھ کر رہی تھیں اور پبلک کے میلان کو اپنی طرف متوجہ کر کے ہر ہر قدم پر کامیابی حاصل کر رہی تھیں۔ ۱۸۶۰ء میں تجار لندن کی ایک انجمن[۵] قائم ہوئی تھی۔ شروع شروع میں یہ کسی خاص اہمیت کی مالک

---

[۵] تجاران لندن کی اس انجمن کا نام TRADE UNION COUNCIL تھا

نہ تھی ۔ مگر رفتہ رفتہ اس نے فروغ حاصل کیا اور "سیاسی مشاغل کے دور" میں اپنا سکہ پوری طرح جما لیا ۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کا وجود ضروری اور اہم خیال کیا جانے لگا ۔ اس کا مقصد مزدوروں کے مطالبات کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنا اور ان کے حصول کی کوشش کرنا تھا ۔ یہ پہلی انجمن تھی جس نے صنعتی ذرائع کو خیرباد کہہ کر سیاسی میدان میں قدم رکھا ۔ اس کے بعد سیاسی مجالس تیزی کے ساتھ قائم ہونا شروع ہوئیں اور تمام اتحادی سبھائیں قدم بقدم ان کی پیرو ہوئیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں نے سیاسیات کو حصول مقاصد کا مکمل ذریعہ بنا لیا ۔

اس زمانہ میں جو اتحادی جماعت برسر اقتدار تھی وہ "جنٹا[۵۱]" کے نام سے مشہور ہے ۔ نمائندگی اور انتخاب کے اہم مسائل اسی جماعت کی سرکردگی میں فروغ حاصل کر رہے تھے ۔ "جنٹا" کی طاقت دن بدن ترقی کر رہی تھی، وہ اپنے نمائندے مجلس قانون ساز میں کامیابی کے ساتھ بھیج رہے تھے اور ان کے ذریعہ سے اپنے مطالبات منظور کروا رہے تھے ۔ کچھ عرصہ بعد ہی انھوں نے اصلاحی قانون کے نافذ کرنے کے لئے شوروغل شروع کیا ۔ اس کا مسودہ کئی بار رد ہونے کے بعد بالآخر منظور اور قانونی شکل میں نافذ ہو گیا ۔

مزدوروں کی یہ شاندار کامیابی دل افروز تھی، ہمتیں بڑھ گئیں ۔ نئی سیاسی مجالس قائم ہونا شروع ہوئیں ۔ اور لندن کے مزدوروں کی ایک بڑی مجلس[۵۲] قائم ہو گئی ۔ چشم زدن میں اس نے اقتدار حاصل کیا اور پارلیمنٹ کی نظروں میں اہم خیال کی جانے لگی ۔ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۸۱ء تک اس جماعت کے نمائندوں نے مزدوروں کی بہبود کے لئے متعدد قوانین نافذ کرائے ۔ اس کامیابی نے مزدوروں میں نئی روح پھونکی اور ان کا عمل کلی پارلیمنٹ کے انتخاب کی طرف رجوع ہوا ۔ اس کام کو بکمال و خوبی انجام دینے کے لئے ایک انتخابی مجلس[۵۳]

---

[۵۱] جنٹا (JUNTA) مزدوروں کی وہ جماعت تھی جس کا تعلق لندن کی TRADE COUNCIL سے تھا جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں ۔

[۵۲] لندن کے مزدوروں کی اس مجلس کو LONON WORKMAN'S ASSOCIATION کہتے ہیں

[۵۳] انتخابی مجلس LABOUR REPRESENTATION LEAGUE کہتے ہیں ۔

قائم ہوئی جس کا نقطہ نظر سیاسی اور قطعی سیاسی تھا۔ اور جس کا مقصد مزدوروں کی بڑی سے بڑی تعداد پارلیمنٹ میں بھیجنا تھا۔ ان کی کاوشوں کا نتیجہ وہ مختلف قوانین تھے جو مزدوروں کی بہبودی کے لئے یکے بعد دیگرے نافذ ہوتے رہے۔ مثلاً

(۱) ضابطہ[۵۱] فوجداری کا ترمیم شدہ قانون واپس لیا گیا اور اس کے بجائے مالک[۵۲] و مزدور کا قانون نافذ ہوا۔

(۲) ۱۸۷۲ء میں کانوں[۵۲] میں کام کرنے والوں مزدوروں کی حالت قانون کی رو سے درست کی گئی۔

(۳) ۱۸۷۵ء میں جہازوں[۵۳] کے مزدوروں کے لئے قانون بنے۔

(۴) ۱۸۷۶ء میں مزدوروں[۵۴] کی صحت کو درست کرنے کے لئے قوانین جاری ہوئے۔

برطانیہ کی مزدور تحریک کا یہ وہ دور تھا جس میں ساہوکار، حکومت اور پبلک سب کے سب ان کی طاقت کے قائل ہو چکے تھے۔ اور حتی الامکان ان کے مطالبات پورا کرنے کے لئے تیار تھے۔ اس دور کا خاص طرز عمل مزدوروں کے سیاسی مشاغل سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جو دور آنے والا ہے وہ زیادہ دلچسپ اور قابل توجہ ہے۔ یعنی وہ دور جس میں پبلک خود ساہوکاروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے اور مزدوروں کی پشت و پناہ بن کر ان کے مطالبات کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔

---

۵۱ ضابطہ فوجداری کا ترمیم شدہ قانون CRIMINAL LAW AMENDMENTACT

۵۲ MINES ACT کا نفاذ ہوا۔

۵۳ جہازوں پر کام کرنے والوں کے لئے SHIPPING ACT بنا

۵۴ مزدوروں کی صحت کے لئے WORKMAN'S HEALTHACTS نافذ ہوئے۔

مجلس قانون ساز اور مزدور پارٹی

برطانیہ میں معاشرتی اور سیاسی دور کا آغاز

انیسویں صدی عیسوی کے آخری بیس سال مزدور تحریک کے لئے کچھ کم ہنگامہ خیز نہ تھے۔ اس دور کی جدوجہد نے تجارتی وصنعتی اتحاد اور سیاسی معرکہ آرائیوں سے گذر کر معاشری میدان میں قدم رکھا۔ کارل مارکس کے معاشرتی وجمہوری اشتراک[۵۱] نے ہنڈمین کی سرکردگی میں اور "نئے تجارتی اتحاد"[۵۲] نے کیر ہارڈی کی رہبری میں برطانیہ کی فضا میں ایک نئی روح پھونکی اور ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ کچھ عرصہ تک یہ دو جماعتیں جداگانہ طور پر معاشرتی تنظیم کا سبق دیتی رہیں اور دولت کی غیر موزوں تقسیم پر اظہار تاسف کرتی رہیں مگر اپنی اپنی جگہ پر ان دونوں میں کمزوریاں تھیں ہنڈمین کی جماعت نظری حیثیت سے مکمل اور مستحکم تھی مگر عمل کے لئے اس کی طاقت محدود اور نظرئے بے سود تھے۔ برخلاف اس کے کیر ہارڈی کے یہاں جوش خروش کی کمی نہ تھی۔ اس کی جماعت کے اراکین کامیابی کی تلاش میں بڑی سے بڑی قربانیاں کرنے کے لئے تیار تھے۔ مگر اصولی کمزوریاں اس کی سدراہ تھیں' ایسی حالت میں اس سے بہتر اور کیا صورت ہو سکتی تھی کہ یہ دونو جماعتیں ہم آہنگ ہو کر اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کی کوشش کرتیں۔ لہذا ان دونوں کے اختلاط سے ایک نئی جماعت ظہور میں آئی جس کو ہم "آزاد مزدور پارٹی"[۵۳] کے نام سے یاد کیا کریں گے۔ اس جماعت کا مقصد دولت کی غیر موزوں تقسیم کو درست کرنا اور معاشرتی تنظیم کا قائم کرنا تھا۔ یہ پارٹی تقسیم تبادلہ پیدلوار کے ذرائع کو قومی[۵۴] بنانا اور ابتدا' میونسپل کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لینا معاشرتی نشوونما کے۔

---

[۵۱] SOCIAL DEMOCRATIC FEDERATION

[۵۲] NEW TRADE UNIONISM جس کے بانی معاشری لیڈران تھے

[۵۳] INDEPENDENT LABOUR PARTY

[۵۴] NATIONALISE

ازبس ضروری خیال کرتی تھی گو یہ جماعت نئے معاشری تحریک کی روح رواں تھی مگر اس کے اصول اور نظریے فیبین[۵۱] جماعت کی طرف سے قائم کئے جاتے تھے۔ فیبین جماعت ایک چھوٹی سی پارٹی کا نام تھا جو سنہ ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی۔ اس کا وجود صرف چند عالی دماغ ہستیوں کی بدولت تھا جس میں سڈنی وِب اور انکی اہلیہ برنارڈ شا، مسز اینی بسنٹ اور پروفیسر گراہم والس بھی شامل تھے۔ یہ جماعت بہ لحاظ اصول ریکارڈو۔ مِل اور جیوِنس کی پیرو تھی اور کارل مارکس کی قیمت کے نظریے کو نہ صرف غلط بلکہ مضحکہ خیز تصور کرتی تھی۔

خوبیٔ قسمت سے صورت حال نے مزدور پارٹی کا ساتھ دیا۔ اس کے اصول مقبول عام ہوئے اور اس کی معاشری جدو جہد نے قوم کی ہمدردی اپنی طرف مبذول کرائی۔ اسی دوران میں مزدوروں کی ایک مجلس[۵۲] انتخابیہ بھی قائم ہوئی جس کی ترقی کے بانی جیمس ریمزے میکڈانلڈ تھے۔ انھوں نے سنہ ۱۹۰۶ء میں اس کی نظامت اپنے ہاتھ میں لے کر اس بیدار مغزی سے کام لیا کہ تمام ابتدائی دشواریاں بآسانی حل ہوگئیں اور سچ پوچھئے تو مزدور پارٹی اسی مجلس کی کامیابی کا ثمرہ ہے۔

ممکن تھا کہ باوجود ارکین کی سرگرمی اور ریمزے میکڈانلڈ کی تندہی کے اس قدر جلد مزدور پارٹی برسرِ اقتدار نہ ہوسکتی۔ مگر برطانوی مزدوروں کو شکرگذار ہونا چاہیئے وادیٔ تاف[۵۳] کے مقدمہ کا جس نے ان میں اتحادی حقوق کو حاصل کرنے اور ان کو برقرار رکھنے کا جذبہ پیدا کیا اور مجلس قانون ساز میں ایک مضبوط جماعت کی ضرورت محسوس کرائی۔ اس سلسلہ میں وادیٔ تاف کے مقدمہ کا مختصر ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں وادیٔ تاف ریلوے کے ملازمین نے اپنے مطالبات کی طرف سے منتظمین کی عدم توجہی اور سرد مہری کے عذر میں ایک زبردست ہڑتال کا اعلان کیا۔ اور بیک وقت تمام ملازمین اپنے اپنے کام سے برطرف ہوگئے۔

---

۵۱ FABIAN یہ جماعت سلطنت روم کے ایک مشہور سپہ سالار FABIUS MARCUS کے نام پر قائم کی گئی تھی۔

۵۲ LABOUR REPRESENTATION COMMITTEE

۵۳ TAFF VALE CASE

منتظمین ریلوے کو یہ طرزِ عمل بہت گراں گذرا اور انھوں نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اس یورش کی طرف سے بالکل تجاہل و بے فکری کا اظہار کریں گے اور نئے ملازمین کی مدد سے ریلوے کے کام کو بند نہ ہونے دیں گے۔ مگر یہ نہ معلوم تھا کہ ہڑتالی ان نئے مزدوروں کو بھی اپنا ہمدرد اور ہمنوا بنائیں گے اور کسی نہ کسی طرح انھیں بھی اپنی قسمت کا شریک کر لیں گے۔ اس وقت ریلوے کے افسران کو انجمن مزدوران کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور انھوں نے انجمن کے خلاف پبلک مفاد میں خلل اندازی اور کمپنی کو مالی اذیت پہونچانے کے ضمن میں ۲۳ ہزار پونڈ کا دعویٰ دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ عرصہ تک چلتا رہا اور بالآخر فیصلہ کمپنی کے خاطر خواہ ہوا، اس مقدمے کے سلسلہ میں انجمن کو تقریباً ۵۰ ہزار پونڈ کی گراں بار رقم کا صدمہ اٹھانا پڑا۔

ہونے کو تو وادی ٹاف کے مقدمہ کا فیصلہ مزدوروں کے خلاف ہوا مگر اس نے جذبہ انتقام کی آگ بھڑکا دی جس کے شعلے عرصہ دراز تک اٹھتے رہے۔ اب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ۱۸۷۱ء سے ۱۹۰۱ء تک جو قوانین نافذ ہوئے تھے وہ ان کے ذاتی و مالی تحفظ کے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ ناقابل اعتبار تھے۔ اور ایسے قوانین کی ضرورت تھی جو نئے معاشری تحریک کو کامیاب بنا سکیں۔ اس لئے مجلس آئین ساز میں نمائندگی حاصل کرنا اور وہاں اپنی مضبوط پارٹی قائم کرنا مزدوروں کے وجود کے لئے بدرجہ اتم ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف مزدور سبھاؤں نے مجلس انتخابیہ کے ساتھ شرکت کرنا اور اس کو مزدور پارٹی قائم کرانے میں امداد دینا اپنا فرضِ منصبی سمجھا۔

لیکن اگر انتخابیہ مجلس کی سرگذشت سنائی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مقاصد کی کامیابی کچھ ایسی آسان نہ تھی۔ ابتدائی زمانہ میں ہی جنگ بوئر[۵۱] نے ملک کی فضا میں لڑائی کے تاثرات پھیلا کر مزدور تحریک کو قریب قریب بالکل سرد کر دیا تھا۔ اس وقت پارلیمنٹ میں ان سیاسی جماعتوں کی ضرورت تھی جو برطانیہ کی حالت کا صحیح اندازہ لگا سکتیں اور کسی مفید حکمت عملی کا اعلان کر سکتیں۔ جان مارلے اور لائڈ جارج لڑائی میں حصہ لینے کے مخالف تھے، اور چاہتے تھے کہ نئی پارلیمنٹ میں ان کے ہمنواؤں کی تعداد زیادہ ہو۔ اسی

BOER WAR ۵۱

طرح دوسری جماعتیں بھی اپنی اپنی پالسی کو مجلس آئین ساز سے منظور کرانے کے لئے کوشاں تھیں۔ ایسی حالت میں مزدوروں کی مجلس انتخابیہ کی فکر کیسے ہوسکتی تھی۔ خصوصاً مالی کمزوریوں نے اسے بالکل ہی بے بس اور مجبور کردیا تھا۔ مگر پھر بھی سنہ ۱۹۰۰ء کے انتخاب میں رچرڈ بل اور کیر ہارڈی مزدوروں کے طرف سے منتخب ہوکر مجلس قانون ساز میں داخل ہوئے۔ انھوں نے لبرل پارٹی کی مدد سے مزدوروں کے مفاد کے لئے متعدد قانون منظور کرائے۔ انکی مختصر فہرست حسب ذیل ہے:۔

(۱) سنہ ۱۹۰۱ء فیکٹری کا قانون نافذ ہوا۔

(۲) سنہ ۱۹۰۲ء مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کے لئے قواعد منظور ہوئے۔

(۳) سنہ ۱۹۰۵ء بیکار مزدوروں کو برسر کار لانے کے ضمن میں قوانین تیار کئے گئے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مجلس انتخابیہ کی کامیابی پارلیمنٹ کے ان چند قوانین میں نہ تھی جن کا ذکر ہم نے ابھی کیا۔ درحقیقت انکی کامیابی ان کاوشوں سے ظاہر ہوتی ہے جس کا ثبوت ان کے وہ کارنامے ہیں جو پارلیمنٹ سے باہر ظہور میں آئے۔ اور اس مجلس کی مقبولیت کا راز بھی رہی بے پایاں جدوجہد تھی جس کا ذکر ہم مختصر طور پر کریں گے۔

سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۵ء تک مزدوروں کی طاقت کو بڑھانے، ان کے اتحاد کو فروغ دینے اور ان کی مالی اور جملہ اقتصادی حالت کو درست کرنے کے لئے گوناگوں کوششیں عمل میں لائی گئیں اور سب کا آخری مقصد یہی تھا کہ مجلس قانون ساز کو ہاتھ میں لیا جائے اور اپنے نمائندوں کی تعداد جس طرح ممکن ہو بڑھائی جائے۔ اس لئے

سنہ ۱۹۰۱ء میں (۱) کھانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی مشترکہ جماعت نے اپنے نمائندے مجلس قانون ساز میں بھیجنے کے لئے ایک تحویل قائم کی اور جماعت کے تمام اراکین کو اس میں حصہ لینے کے لئے مجبور کیا۔

(۲) معاشری و جمہوری مجلس مشترکہ نے اپنی جماعت کو مجلس انتخابیہ سے جدا کر کے آزادانہ جنگ کے لئے تیار ہونا چاہا۔ مگر کثرت رائے کی مخالفت نے انھیں اس ارادے سے باز رہنے پر مجبور کیا۔

(۳) FABIAN یعنی جماعت نے مشترکہ مجالس کے جملہ اراکین کو چندے کی ایک مستقل رقم مجلس انتخابیہ کو ادا کرنے کے لئے مجبور کرنا چاہا۔ مگر اس کوشش میں ناکامی ہوئی۔

(۴) اُن جماعتوں کے اراکین کی تعداد میں جو مجلس انتخابیہ میں شامل ہوئیں ۳۰۰۰۰ کا اضافہ ہوا یعنی ان کی تعداد ۳۷۶۰۰۰ سے بڑھ کر ۴۷۹۰۰۰ ہو گئی۔

(۵) اسی طرح اتحادی مجالس کے اراکین کی نمائندگی بھی تقریباً ۲ لاکھ ہو گئی۔

(۶) مگر سب سے زیادہ تعجب خیز یہ بات تھی کہ باوجود اراکین کی تعداد میں نمایاں ترقی کے مجلس انتخابیہ کی آمدنی میں صرف سو پونڈ کا اضافہ ہوا۔

۱۹۰۲ء میں (۱) وادی تاف کے مقدمہ سے یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ تجارتی مجالس کے حقوق حاصل کرنے کے لئے مکمل اتحاد کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اس لئے تجارتی مجالس کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

(۲) مجلس قانون ساز میں اپنی آواز بلند کرنے کے لئے مختلف سیاسی اخراجات کی ضرورت تھی جس کے لئے خاص تحریکیں کھولی گئیں۔

(۳) پارلیمنٹ کے درمیانی[۵۱] انتخاب میں مجلس انتخابیہ کے ایک نمائندے شیکلٹن[۵۲] صاحب کو کامیابی حاصل ہوئی۔

(۴) روئی کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی مجالس نے بھی مجلس انتخابیہ میں شرکت کی۔

---

۵۱ BYE ELECTION

۵۲ J.D SHACLETON

(۵) مشترکہ مجالس کے اراکین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا اور ۸۶۱۰۰۰ تک پہونچ گئی۔

(۶) اب کی بار آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا جو ۳۴۴۲ پونڈ بڑھ کر ۸۰۰۰ پونڈ تک پہونچی۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں (۱) نیو کاسل میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اس مجلس کی مالی حالت کو درست کرنے کے لئے مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔

(۲) تجارتی اتحادی کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔

(۳) درمیانی انتخاب میں ول کروکس[۵۱] مجلس انتخابیہ کی طرف سے پارلیمنٹ میں داخل ہوئے۔

(۴) وادی تاف کے مقدمہ کی تحقیقات کے لئے شاہی کمیشن[۵۲] مقرر ہوا۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں (۱) مجلس انتخابیہ کو تجارتی اتحادی کانگرس کی نگرانی سے آزاد کرایا گیا۔

(۲) اراکین مجلس نے چندے کی ایک مقررہ رقم ادا کرنے کا اقرار کیا جس کی وجہ سے آمدنی میں ۱۱۴۰۰ پونڈ کا اضافہ ہوگیا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں (۱) مجلس انتخابیہ کے اُن نمائندوں کو جو پارلیمنٹ کے رکن تھے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی پارٹی کے اصول پر سختی سے کاربند رہیں۔

(۲) قدامت پسند حکومت کے مستعفی ہونے پر مجلس انتخابیہ نے مزدور پارٹی کے نام سے انتخاب عامہ میں حصہ لیا۔

سنہ ۱۹۰۶ء نے انتخاب کا ایک دوسرا رنگ دیکھا۔ ابکی بار مجلس انتخابیہ کے نمائندوں کے علاوہ دیگر مزدور نمائندوں کی ایک بڑی تعداد پارلیمنٹ میں داخل ہوئی۔ نئے اراکین میں تجارتی اتحادی مجالس کے نمائندوں اور کھانوں میں کام کرنے والوں کی مشترکہ انجمن کے نمائندوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس طرح مزدوروں کی ہمنوائی اور ساہوکاروں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ایک پوری فوج مجلس قانون ساز

---

[۵۱] WILL CROOKS

[۵۲] ROYAL COMMISSION

پر حملہ آور ہوئی ۔ اس وقت مجلس انتخابیہ کے ۲۹ اراکین پارلیمنٹ میں موجود تھے مگر لبرل پارٹی کی ہمدردی اور ان کی مدد کے بغیر اب بھی کسی قسم کی کامیابی کا حاصل ہونا بعید از قیاس تھا۔ اس لئے مزدور پارٹی لبرل اراکین کا ہر خاص و عام معاملہ میں ساتھ دینے کے لئے مجبور تھی۔ اس پارلیمنٹ میں مزدور جماعت معاشری اور کاروباری اصلاحات حاصل کرنے اور وادی تاف کے مقدمہ کا پورا پورا ازالہ کرانے کے لئے بیتاب تھی۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے بھی لبرل پارٹی کی مدد و حمایت ، درکار تھی ۔ اور اس میں شک نہیں کہ مزدور پارٹی کی تمام کامیابیاں انہی لبرل ممبران کی سخاوت کا نتیجہ تھیں ۔

وادی تاف کے مقدمہ کا فیصلہ اب بھی مزدور پارٹی کے پیش نظر تھا اور نئی پارلیمنٹ میں ان کا سب سے اولین فرض یہی تھا کہ وہ اس فیصلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے ۔ اور اپنے تحفظ کے لئے قوانین نافذ کرائے۔ اس سلسلہ میں جو تحقیقاتی کمیٹی ۱۹۰۳ء میں بیٹھی تھی اس کی روداد کا انتظار ۱۹۰۶ء میں کیا جا رہا تھا اور اس کے شائع ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ اول تو یہ روداد بلحاظ اس امر کے کہ تجارتی اتحادی مجالس نے اس کے سامنے بیان دینے سے انکار کر دیا تھا ۔ دوم بلحاظ اس کے کہ اس کی سفارشات مزدوروں کے حقوق کی نگرانی کے لئے ناکافی تھیں مستند اور قابل غور نہیں خیال کی جا سکتی تھی ۔ مگر نئی پارلیمنٹ نے اس کمیٹی کی حسب ذیل سفارشات پر بحث و تبصرہ کرنے کے لئے ایک تاریخ مقرر کی :-

(۱) تجارتی مجالس کی تحویل ایسے مصارف کے لئے جن کی منظوری باضابطہ نہیں حاصل کی گئی ہے ہرگز وا نہ کی جائے۔

(۲) ان مجالس کے اراکین کی مالی امداد بوقت ضرورت کی جائے ۔ مگر صرف ایسی صورتوں میں جبکہ تجارتی اختلافات ان کی طاقت کو سلب کر رہے ہوں ۔

(۳) اراکین مجالس کا کوئی فعل جو اتحاد کے زعم میں قانونی زد سے نکل جانے کی امید میں کیا جاوے ہرگز قابل معافی تصور نہ ہو۔

(۴) PICKETING صرف اس وقت تک جائز قرار دی جائے جبتک کہ وہ خاموشی اور

امن کے ساتھ جاری رہ سکے ۔

ان سفارشات میں سب سے زیادہ اہم اور قابل غور مسئلہ تجارتی مجلس کے اخراجات اور انکی ذاتی اور مجموعی ذمہ داریوں[۱] کا تھا ۔ وادی تاف کے مقدمہ کے بعد مزدور پارٹی اپنی انجمنوں کو ان کے اراکین کے ذاتی افعال کا ذمہ دار رہنے دینا ہرگز گوارا نہیں کر سکتی تھی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس قانون ساز کے اجلاس میں اس مسئلہ پر پرجوش و گرما گرم تقریریں ہوئیں اور حکومت کو تجارتی[۲] اختلافات کے ضمن میں ایک نیا قانون وضع کرنا پڑا ۔ اور اس کے مسودے میں یہ الفاظ بڑھائے گئے ۔

" اتحادی مجلس اپنے رکن یا اراکین کے کسی فعل کی ذمہ دار اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس فعل کو کثرت رائے نے نہ منظور کر لیا ہو ۔ اور ایسی صورت میں انجمن کے خلاف مالکان کار یا دوسرے متعلقہ اشخاص کو کسی قانونی کارروائی کا حق نہ ہوگا ۔ "

اور اسی سلسلہ میں یہ بھی طے پایا کہ

" اگر تجارتی مجلس کے عہدہ داران کسی ایسے قانونی جرم کے مرتکب ہوں جس کا اذن اراکین کی کثرت رائے سے باضابطہ نہ حاصل کیا جا چکا ہو تو کسی شخص یا جماعت کو انجمن کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لانے کا مجاز نہ ہوگا ۔ "

اب نئی مزدور پارٹی کے ان کارہائے نمایاں کا مطالعہ کیجئے جن کا ظہور معاشرتی اصلاحات کی شکل میں سال بہ سال ہوتا رہا ۔

۱۹۰۶ء میں (۱) جہاز پر کام کرنے والے مزدوروں کو آسانیاں بہم پہونچانے کے لئے ایک نیا قانون تیار کیا گیا[۳] ۔

---

[۱] LIABILITIES

[۲] TRADE DISPUTES ACT

[۳] اس قانون کا نام SHIPPING ACT تھا ۔

(۲) تعلیمات کے قانون کے روسے مزدوروں کے بچوں کے خورونوش کا انتظام کیا گیا۔

(۳) مزدوروں کو صنعتی[۵۱] بیماریوں اور دیگر مصائب سے موقعوں پر لاچاری اور بےبسی سے بچانے کے لئے معاوضے[۵۲] کا قانون نافذ ہوا۔

(۴) بیکار مزدوروں کو روزی سے لگانے کے لئے دو لاکھ پونڈ کی رقم منظور ہوئی۔

۱۹۰۷ء میں قانون تعلیمات کی روسے طلبا کا ڈاکٹری معائنہ اور ان کے صحت کی دیکھ بھال کا انتظام لازمی قرار دیا گیا۔

۱۹۰۸ء میں (۱) ہر مزدور کو ایک معینہ مدت تک کام کرنے کے بعد پنشن دئے جانے کا اصول منظور کیا گیا۔

(۲) کوئلہ کی کھانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے اوقات کار کی آخری حد ۸ گھنٹے کردی گئی تاکہ اس سے زیادہ کام لینے والے منتظمین قانون کے خلاف عمل درآمد کرنے کے مرتکب ہوں۔

۱۹۰۹ء میں (۱) مزدوروں کی جائے رہائش اور شہر کو حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق درست کرنے کے لئے قانون نافذ ہوئے[۵۳]

(۲) انجمن[۵۴] تقررِ مزدوران کا قانون نافذ ہوا۔

(۳) مزدوروں کی اجرت کے حدود متعین کے گئے تاکہ بیجا تخفیف کی گنجائش باقی نہ رہے۔

(۴) مزدوروں کے کام کا تعین کرنے کے لئے تجارتی بورڈ قائم کرنے کی منظوری دی گئی اور اس کے متعلق ایک قانون تیار ہوا[۵۵]۔

---

۵۱ INDUSTRIAL DISEASES

۵۲ COMPENSATION ACT

۵۳ اس کا نام HOUSING AND TOWN PLANNINC ACT تھا۔

۵۴ LABOUR EXCHANGEACT

۵۵ اس قانون کو TRADE BOARD'S ACT کہتے ہیں۔

۱۹۱۲ء میں (۱) کوئلے کی کھانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے حالات درست کرنے کے لئے ایک نئے قانون کا نفاذ ہوا۔

(۲) لائڈ جارج نے قومی[۵۱] تحفظ کا قانون نافذ کرایا جس کی رو سے مزدوروں کی بیکاری اور ان کے حفظانِ صحت کے لئے مالکان کار پر قانونی پابندیاں عائد ہوئیں۔

(۳) دوکان[۵۲] کے قانون کی منظوری نے مزدوروں کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا کیا اور ان کو آدھے دن کی چھٹی کا استحقاق عطا ہوا۔

۱۹۱۴ء میں۔ بہت سے نئے کاروبار تجارتی بورڈ کے تحت میں لائے گئے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی ترقی نہیں ہوئی جس کا ذکر اس موقع پر کیا جا سکے۔ اس وقت جنگِ عظیم کی یورش شروع ہو گئی تھی اور اصلاحات کا دور ختم ہو چکا تھا۔

اس بحث سے جو ہم سر دست ختم کر رہے ہیں یہ شبہ ہوتا ہے کہ مزدور پارٹی کے اقتدار اور پارلیمنٹ کے متعدد قوانین نے برطانوی مزدوروں کی حالت کو ایک گونہ قابلِ اطمینان اور ان کی زندگی کو پرسکون بنا دیا ہوگا۔ مگر تصویر کا دوسرا رخ جو انشاء اللہ آئندہ پیش کیا جائے گا ظاہر کرے گا کہ مجلس قانون ساز کے باہر مزدوروں کی حالت اب بھی بہت زیادہ ہنگامہ خیز اور غیر مطمئن تھی۔

---

[۵۱] NATIONAL INSURANCE

[۵۲] SHOP ACT

کمزور پودا

پانی بھرتے بھرتے بفاطن نے ادھر اودھر دیکھا۔ پانی بھرنے والیاں دور جا چکیں تھیں۔ صرف کنیز پاس تھی۔

"کنیز یا! تجھ سے ایک بات کہوں۔ خبردار زبان سے نہ نکالنا۔ ورنہ تیرا کچھ نہیں جائے گا۔ میں مر جاؤں گی تیرے بھلے کی کہتی ہوں۔"

کنیز کا دل دھک سے ہوگیا۔ معاً اسے خیال گذرا کہ بفاطن نے شبیر میاں کو مجھ سے اشارے کنایے کرتے دیکھ لیا ہے۔ ذرا گھبراتی ہوئی بولی۔

"کہو!"

بفاطن گھڑا رکھ کر کوئیں کی جگت پر بیٹھ گئی۔ اور کنیز کو بھی اشارے سے بٹھا لیا۔

"شبیر میاں ..... "

بفاطن رکی۔ پھر کھنکھار کر بولی۔

"شبیر میاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان کا کچھ نہیں جائے گا تیری زندگی بگڑ جائے گی اور تیرے میّا باوا کا نہ معلوم کیا ہو۔"

کنیز کا رنگ فق ہوگیا۔ جواب کیا دیتی۔ بفاطن سن میں اس کی ماں کے برابر تھی۔ اور جو کہہ رہی تھی اسی کے بھلے کو کہہ رہی تھی۔ بفاطن یہ کہہ کر گھڑا اٹھا کر چلتی ہوئی۔ کنیز نے بھی گھڑا بغل میں دبایا، اور گھر کی طرف چلی لیکن سوچ رہی تھی کہ شبیر میاں کے کمرے کے نیچے سے گذرنا ہوگا۔ وہ چھیڑ ضرور کریں گے کنیز نے ابھی تک ان کی چھیڑ کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ مگر پسند ضرور کرنے لگی تھی۔ یہی لالچ تھا جو اس کو اتنے سویرے کوئیں کی جگت پر لے جاتا اگر کبھی شبیر میاں کمرے میں نہیں ملتے تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ اور پھر دن بھر افسردہ رہتی۔ اکثر اس کا دل چاہتا تھا کہ شبیر میاں اور زیادہ چھیڑ کریں، میں بظاہر ناراض

ہوں، مگر وہ اس کی پروانہ کریں۔

کوئیں سے ہٹتے ہی زمیندار صاحب کا مکان تھا۔ راستہ کے برابر کندھوں تک اونچا چبوترہ تھا۔ جس پر ایک بڑا سا مردانہ کمرہ تھا۔ دروازوں پر چکیں پڑی رہتی تھیں۔ اندر تخت بچھا تھا۔ اس پر صاف چادر تنی رہتی تھی بڑی بڑی پھیلی پھیلی کرسیاں تھیں۔ کنیز سوچا کرتی تھی کہ ان پر بیٹھنے سے بڑا آرام ملتا ہوگا۔

کنیز کی آنکھیں چکوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اور سوچ رہی تھی کہ دیکھا چاہئے آج شبیر میاں کیا سوانگ نکالتے ہیں، کوئی فقرہ کستے ہیں، یا پانی پھینکتے ہیں، یا ڈھیلا مارتے ہیں۔ کہ اتنے میں پیچھے سے شبیر میاں تیزی سے آئے زن سے اس کے گلے میں کوئی چیز لال رنگ کی ڈالی۔ اور پھر اس کا منہ چوم کر کود کر کمرے کے اندر گھس گئے۔

صبح کی خنکی ابھی باقی تھی، اور کنیز کے ہاتھ پاؤں کوئیں کے پانی سے بھیگے ہوئے تھے، اس لئے اس کو ہلکی ہلکی سردی محسوس ہورہی تھی۔ مگر اس حادثہ سے اس کا سارا بدن بھک سے جل اٹھا، پیشانی پر پسینہ کے قطرے آگئے، دل دھک دھک کرنے لگا، اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اس نے گھبرا کر چبوترے کا سہارا لیا۔ گھڑا اس پر رکھ دیا۔ اور پھر نیچی آواز سے کہنے لگی۔

"شبیر میاں! باندیوں سے دل لگی اچھی نہیں۔ میں مٹ جاؤں گی، آپ کا کچھ نہیں ہوگا۔"

نہ معلوم شبیر میاں کمرے کے اندر تھے بھی یا نہیں۔ اور کنیز کی آواز انھوں نے سنی بھی یا نہیں۔ کنیز نے حواس درست کئے، اور گھڑا اٹھا کر گھر چلی۔ ادھر ادھر دیکھتی جاتی تھی کہ کسی نے دیکھا تو نہیں۔ مگر ابھی سناٹا تھا، کوئی راہگیر نہیں تھا۔ چبوترے کے دوسری طرف چھپر کے نیچے ایک آدمی بیلوں کو کھول رہا تھا۔ مگر وہ آڑ میں تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے دل کو ڈھارس ہوئی۔ مگر شبیر میاں کی اس حرکت پر اس کو غصہ بہت تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا؟ بفاطن نے کبھی دیکھا ضرور۔ ورنہ کیسے معلوم ہوا؟ اتنے میں اس کی نگاہ اپنے گلے پر پڑی تو دیکھا شیشے کا ترشا ہوا ایک ہار پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بیر بہوٹی کے ایسے لال لال دانے تھے۔ بیچ میں ہرسنگھار کا ایسا ایک پھول تھا۔ چلنے سے اس میں جنبش پیدا ہوتی تھی جس سے

جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ غصہ تو بدستور باقی رہا۔ مگر ساتھ ہی شبیر میاں کی محبت بھی زور کر آئی، اس نے چپکے سے گھڑا ایک ہاتھ سے سنبھال کر، دوسرے ہاتھ سے ہار اتار لیا، اور اس کو کمر میں کھونس لیا۔ اور پھر گھر چلی گئی۔

ماں چولھا لیپ رہی تھی۔ باپ پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا حقہ گڑ گڑا رہا تھا۔ چھوٹا بھائی نمو مرغیاں کھول رہا تھا۔ کنیز نے گھڑا مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے سے چبوترے پر رکھ دیا، اور بولی

"اب میں اتنے سویرے پانی لینے نہیں جایا کروں گی۔"

ماں نے یہ سن کر منہ بگاڑ لیا۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ باپ نے سنا تک نہیں۔ مگر نمو بولا۔

"اب میں سویرے سویرے مرغیاں نہیں کھولا کروں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے مرغیوں کو کنیز کی طرف دونوں ہاتھوں سے ہشکا دیا۔

کنیز۔ "دیکھو نمو! مجھے یہ باتیں نہیں اچھی لگتیں۔ میری ہر بات کی نقل کرتا ہے۔ میری ہر بات کی نقل کرتا ہے۔"

نمو۔ "بڑی وہ بنی ہیں۔ میں کیا نقل کرتا ہوں۔ میں نے کوئی بات تم سے کہی۔"

نمو نے پھر مرغیوں کو ہشکا دیا۔ اسکے ایک مرغی پھڑ پھڑا کر کنیز پر آ گری۔

کنیز۔ "حرامزادہ۔ ٹھہر تو ..."

نمو فوراً گھر کے باہر بھاگ گیا۔

ماں۔ "یہ کیا ہے کنیزیا! تو ہر وقت نمو کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اس نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ میں سویرے سویرے مرغیاں نہیں کھولا کروں گا۔ اس میں کیا برائی ہے۔"

کنیز نمو کی حرکت بیان کرتی۔ مگر اس کا دل بھرا ہوا تھا، رونا آ گیا۔ چپکے سے چھپر کے نیچے پلنگ پر لیٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ ماں نے اٹھ کر مرغیوں کو گھر سے باہر نکال کر دروازے بند کر لئے باپ ویسے ہی حقہ پیتا رہا۔ بیچ بیچ میں کھانستا جاتا تھا۔ نمو باہر ہی تھا، اور جب تک کنیز گھر میں تھی اس کے لوٹنے کی کوئی امید نہ تھی تھوڑا سا رو لینے کے بعد کنیز کے دل کی بھڑاس نکل گئی۔ اب اس نے چپکے سے کمر سے

ہار نکالا۔ اور اس کو چھونے پر پھیلایا۔ اب تک شبیر میاں پر غصہ بہت کم ہو چکا تھا۔ مگر یہ سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ اگر کوئی دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟ ماں باپ مارتے مارتے میرا کیا حال کر دیتے؟ اور گاؤں میں کتنی بدنام ہو جاتی مگر، خیر، اب کیا پروا۔ کسی نے دیکھا تھوڑے۔ شبیر میاں کتنے اچھے لگتے ہیں۔ گورا گورا رنگ ہے صاف صاف کپڑے پہنتے ہیں۔ بال بہت درست رہتے ہیں۔ ان کے سفید پائوں چپلوں میں کیسے اچھے لگتے ہیں۔ جب نیکر پہنے ہوئے، بندوق ہاتھ میں لئے شکار سے واپس آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انکی قربت ہر طرح کے خطروں سے محفوظ کر دیگی۔ وہ سچ مچ محبت کرتے ہیں۔ ورنہ سویرے سویرے اٹھ کر، گھنٹوں انتظار میں کیوں بیٹھے رہتے۔ میرے ستانے کی کیا کیا تدبیریں سوچا کرتے ہیں۔ ایک دن انھوں نے پیالہ بھر سرخ رنگ ڈال دیا تھا۔ میں کتنی گھبرا گئی تھی کہ اماں دیکھیں گی تو کیا کہیں گی۔ اور پھر کوئیں پر دھونے لئی۔ مگر وہاں پہنچتے پہنچتے رنگ اڑ گیا۔

کنیز نے ہار گلے میں پہن لیا۔ اور کوٹھری کے اندر جا کر آئینہ دیکھنے لگی۔ یہاں ابھی اندھیرا تھا۔ اس لئے کچھ صاف نظر نہیں آیا۔ اتنے میں ماں کی آواز آئی۔

" زمیندار صاحب کے یہاں نہیں جائے گی؟ ابھی کوئی بلانے آتا ہوگا۔ پھر گھر میں مار بھی پڑے گی۔"

کنیز نے جلدی سے ار اتار کر کمر میں کھونس لیا۔ باہر آئی، کوئلہ چبا کر دانت مانجے پھر ایک ٹوٹی سی کنگھی جس کے آدھے آدھے دندانے میل سے بند تھے طاق پر سے اٹھا کر مانگ درست کی، اور زمیندار صاحب کے یہاں چلی۔

اب اس کو دوسری فکر دامنگیر ہوئی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شبیر میاں اس کو ڈیوڑھی میں چھپے ملتے اور اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے۔ گدگداتے۔ گالوں پر ہاتھ مارتے، اور پھر اپنے کمرے میں جس کا ایک دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا گھس جاتے۔ اب اس کا غصہ تو فرو ہو چکا تھا۔ اور دل ہی دل میں اس خیال سے کہ شبیر میاں اس کے انتظار میں کھڑے ہوں گے خوش ہو رہی تھی۔ بوسہ کے خیال میں بھی اس کو لذت محسوس ہوتی۔ مگر اس لذت میں ایک عجیب قسم کا ڈر ملا ہوا تھا۔ ایسا نامعلوم ڈر، جو بچے تاریکی میں محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ زمیندار صاحب کی ڈیوڑھی سے گذرنا ضروری تھا۔ پھاٹک تک تو

یہ آہستہ آہستہ گئی - اور وہاں پہونچنے پر ذرا رکی - پھر زن سے دوڑ کر ڈیوڑھی پار کر گئی -

زمیندار صاحب کی بہو، اور شبیر میاں کی بڑی بھاوج زچہ خانے میں تھیں - آج کل کنیز انھیں کا کام کرتی تھی - ان کی طبیعت میں حکومت بہت تھی - بات بات پر کنیز کو ڈانٹا کریں - اکثر ذرا سی غلطی پر مار بھی پڑ جاتی آج کونڈا صاف کرانے کے لئے دیر سے منتظر تھیں، کنیز کو دیکھتے ہی برس پڑیں - دور ہی سے ایک ڈانٹ بتائی - قریب آتے آتے پنکھا کھینچ مارا، مگر نشانہ خالی گیا - اب کسی دوسرے حربہ کی تلاش ہوئی - تکیئے - چادریں - پاندان - پانی سے بھرا لوٹا - اور شاید لوٹے ہی کی باری آتی - مگر جوتیوں پر نگاہ پڑ گئی - ایک اٹھا کر کھینچ ماری - جو اتفاق سے کنیز پر جا پڑی - اگر سیدھی نکل چلی جاتی تو کنیز کی اور شامت آتی - مگر طوفان اب بھی فرو نہیں ہوا تھا - اور کوسنوں کی بوچھار جاری تھی، اتفاق سے شبیر میاں آگئے - انھوں نے بھاوج کی اس فرعونیت پر دو چار فقرے کسے - جس سے وہ خاموش ہو گئیں، اور کنیز کی جان بچی -

کنیز نے چپکے سے کونڈا اٹھالیا، اور صاف کرنے چلی گئی - مگر نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شبیر میاں اس کو گھور رہے ہیں - ایک دفعہ کام کرتے کرتے اس نے دبی نظروں سے پیچھے دیکھا، تو شبیر میاں سے نگاہیں چار ہو گئیں - دونوں اضطراراً مسکرا دئے - شبیر میاں فوراً دوسری طرف دیکھنے لگے - کنیز نے بھی جھیپ کر گردن جھکالی -

کنیز کے دل میں اب اپنی قدر پیدا ہو گئی - شبیر میاں کے یہاں اتنی لونڈیاں اور مامائیں ہیں - باہر نوکر ہیں چوکیدار ہیں - مگر وہ صرف میری ہی طرفداری کرتے ہیں - کتنے فخر کی بات ہے؟

۶ رات کو کھانا کھلا کر کنیز جب گھر جانے لگی تو ڈیوڑھی کے قریب پہونچ کر اس کا دل دھڑکا وہ دروازے پر ٹھٹکی، اور صبح والی ترکیب پر عمل کرنا چاہا - مگر نہ جانے کیوں وہ دوڑنے سے باز رہی - اور معمولی تیز رفتاری سے ڈیوڑھی کو عبور کرنا چاہا - شبیر میاں جو دروازے کی اوٹ میں کھڑے انتظار کر رہے تھے فوراً اس پر جھپٹ پڑے - اس کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا - اور اپنے لب اس کے لبوں پر چپکا دئے اس فوری حملہ سے کنیز بدحواس ہو گئی - کھانا جو گھر لئے جا رہی تھی ہاتھ سے چھوٹ پڑا - شبیر میاں اس کو لے کر اپنے کمرے میں بھاگ گئے - کنیز نے ہاتھ پیر مارے - گڑگڑائی - برا بھلا کہا - چیخنے کی دھمکی دی - مگر شبیر میاں

تجربہ کار تھے۔ ان کی گرفت مضبوط تھی۔ علاوہ ازیں بے پناہ اظہارِ محبت، اور گرما گرم بوسوں سے اُنھوں نے اس کی قوت ارادی کو کمزور کر دیا۔ کنیز کے جسم میں برقی لہر دوڑ گئی۔ انجام کی تصویر دماغ کے سامنے دھندلی ہوگئی۔ اس نے اضطراراً آخری جدوجہد کرنا چاہی۔ مگر بے سود۔ وقت گذر چکا تھا شراب کا ایک نشہ رگ وپے میں سرایت کر رہا تھا رفتہ رفتہ سرور و نشاط کا جسم و دماغ پر راج ہوگیا، اور پھر اس نے خوشی خوشی اپنے کو طوفانی لہروں میں چھوڑ دیا۔

— (۲) —

اس واقعہ کو ڈیڑھ مہینہ گذر گیا۔ شبیر میاں کی چھٹیاں ختم ہوگئیں، اور کالج کھل گیا۔ اُنھوں نے مختلف بہانوں سے ایک ایک دن اور دو دو دن دیر کرنا شروع کر دی۔ ان کے والد دوسرے زمینداروں کی طرح معاملات سے بے خبر نہیں رہتے تھے۔ اس لئے شبیر میاں کے لئے یہ ناممکن تھا کہ ان کو کسی قسم کا دھوکا دیتے۔ دو ایک دن تو وہ شبیر میاں کو طرح دیتے رہے۔ اور پھر اُنھوں نے شبیر میاں کو کوچ کا حکم سُنا دیا۔

اسی رات کو کنیز شبیر میاں سے احاطے کے پچھواڑے ایک جگہ پر جو پہلے سے مقرر کر لی تھی ملنے گئی۔ شبیر میاں بہت پہلے سے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اس کو دیکھ کر آہستہ سے بولے

"کنیز یا"

"جی"

پھر کنیز نے پوٹلی ایک کنارے رکھ دی، اور شبیر میاں سے بھڑ کر بیٹھ گئی۔ اور بولی

"ہماری ایک نشانی اپنے پاس رکھئے گا؟"

"کیوں نہیں"

کنیز نے ایک رومال شبیر میاں کے ہاتھ میں دیا۔

کنیز۔ "آپ کے قابل تو نہیں ہے"

شبیر میاں نے غور سے رومال دیکھا۔ معمولی نین سک کا بنا ہوا رومال تھا جس پر انگریزی میں بعدا سا "شبیر" سرخ ریشم سے کڑھا ہوا تھا۔ شبیر تھوڑی دیر تک اس کو چاندنی کی روشنی میں جو درخت سے چھن کر

ہلکی ہلکی آ رہی تھی دیکھتے رہے - اور پھر بولے

" تو یہ تم نے بنایا؟"

" میں کیا بناتی ؟ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح سے خود بنانا سیکھ کر بناتی ۔ مگر لونڈیوں کو کام دھندوں سے کہاں اتنی چھٹی ــــــ بنوایا ہے ۔"

" بنوایا ہے ! ہائیں !! "

" جی "

" کس سے ؟"

" آپ کو اس سے کیا مطلب ؟ جس سے بنوایا ہے وہ کسی سے کہے گا نہیں ۔"

" تو بڑی گدھی ہے ۔ پگلی کہیں کی ۔ لونڈی پھر لونڈی ۔ تجھے میری عزت کی ذرا پروا نہیں ۔"

کنیز ذرا آبدیدہ ہو کر بولی

" دوسرے گاؤں میں بنوایا ہے ۔ بنانے والے کو معلوم بھی نہیں کس کے لئے بنوایا ــــــ نہیں لیجئے گا ؟"

کنیز شبیر میاں کی محبت میں سرشار تھی ۔ اس کے چھپائے نہیں چھپتی ۔ اکثر دوسروں کے سامنے ایسی حرکتیں کر بیٹھتی کہ اگر ان کو کوئی ذرا خیال سے دیکھے تو ان دونوں کے تعلقات پر شک کرنے لگے ۔ شبیر میاں کنیز کی ایسی حرکات پر بہت چراغ پا ہوتے اور انہی کے خیال سے کنیز اپنے کو امکان بھر سنبھالے رکھتی ۔ کنیز رفتہ رفتہ اپنے تعلقات کے غیر رسمی ہونے کو بھول گئی تھی ، ہاں ، اگر کبھی شبیر میاں کی شادی کا تذکرہ آتا ۔ یا کوئی بڑا ، بوڑھا شبیر میاں کو دعا دیتا " اللہ کرے شادی بیاہ ہو " تو کنیز کا دل کڑھ جاتا ۔ اور اس وقت اس کو اپنے تعلقات کی ناپائداری کا احساس ہوتا ۔ مگر پھر شبیر میاں سے ملاقات ہوتے ہی اس کو بھول جاتی ۔ اس محبت کے کھیل نے اس کی زندگی میں لذت پیدا کر دی تھی ۔ جس کی وجہ سے رنج اس کے دل میں ٹھہر ہی نہیں پاتا ۔

شبیر میاں نے آخر کنیز کے جذبات کا خیال کر کے رومال جیب میں رکھ لیا ، اور پھر بولے ۔

" کل صبح کو میں روانہ ہو جاؤں گا ۔"

"پھر اب کیا ہوگا"

"تو بھی کیسی بچوں کی ایسی باتیں کرتی ہے۔ ہوگا کیا؟ میں دسمبر کی چھٹیوں میں پھر آؤں گا۔"

کنیز تھوڑی دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ شبیر میاں نے جب کچھ ڈھارس دینے کی کوشش کی تو وہ ان کے سینہ پر سر رکھ کر رونے لگی اور ان کے سمجھانے سے کسی طرح نہیں چپ ہوتی۔ بڑی مشکلوں سے انھوں نے سمجھا بجھا کر، ڈانٹ ڈپٹ کر اور صبح پھر ملنے کا وعدہ کر کے اس کو گھر بھیج دیا۔

شبیر میاں وہاں سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے پاس کے تالاب کے پاس چلے گئے۔ یہاں مینڈک جھینگروں کے بعض سے آواز ملا کر غائیں غائیں کر رہے تھے۔ کیچڑ اور بھیگی ہوئی گھانس کی بو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ساتویں تاریخ کا چاند غروب کے قریب تھا۔ درختوں کے سایہ لمبے ہوگئے تھے، اور روشنی بھی مدھم تھی۔ اس منظر نے شبیر میاں کے دل کو ذرا سکون دیا۔ ان کی طبیعت بہت بے چین ہو رہی تھی۔ سرور کا دور گذر چکا تھا، اب خمار کا وقت تھا۔ کچھ کنیز کی بے بسی۔ کچھ اپنی عزت آبرو کا ڈر، سب سے زیادہ بد مزاج باپ کی ناراضگی کا خطرہ ان کے دل میں ہیجان مچائے تھا ان کو اپنے اوپر غصہ آرہا تھا۔ اور یہ چاہتے تھے کہ اپنے قصور کا بانی کسی اور کو قرار دیں۔ اس وقت ان کو اپنے چھوٹے بھائی کی آنا یاد آرہی تھی جو دو سال پہلے انکی زندگی کا بہت اہم جز بن گئی تھی۔ اور اس کے چلتروں پر ان کی معصومیت بھینٹ ہوئی تھی۔ یہ اپنا سارا قصور اسی کے سر منڈھتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی، دور سے کوئل کی آواز آرہی تھی۔ شبیر میاں کے دل میں گداز پیدا ہونے لگا۔ انھوں نے جیب سے رومال نکال کر دیکھا۔ کنیز کی محبت عود کر آئی۔ اور یہ سوچنے لگے کہ درحقیقت تمام قصور کی ذمے دار میری کنیز سے محبت تھی۔ اس محبت کا انجام یہ نہوتا تو کیا ہوتا؟ کیا میں کنیز سے شادی کر لیتا؟ رہی محبت سو وہ اب بھی میرے دل میں باقی ہے۔ شبیر میاں نے رومال چوما۔ سینہ سے لگایا۔ اور پھر کنیز کے ساتھ وفادار رہنے کا عہد کیا۔

(۳)

صبح کنیز بہت سویرے اٹھ کر شبیر میاں کے کمرے میں گئی۔ مگر وہ کمرے میں موجود نہیں تھے۔ اس کو

بہت حیرت ہوئی۔ ڈیڑھ مہینہ کے اندر یہ پہلا واقعہ تھا کہ اُنھوں نے وعدہ خلافی کی تھی۔ کیوں نہیں آئے؟ کیا بات ہے؟ کیا رومال کے معاملہ میں برا مان گئے۔

شبیر میاں اس ڈر سے نہیں آئے تھے کہ شاید پھر کنیز رونے دھونے لگے یا کوئی ایسی حماقت کر بیٹھے جس سے ان کی اخفا کی ساری کوششیں خاک میں مل جائیں۔ کنیز تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی اور پھر افسردہ دل گھر کے اندر چلی گئی۔

دس بجے شبیر میاں سامان واماں درست کر کے روانہ ہونے لگے۔ ماں، بھاوج کو سلام کیا۔ اُچٹتی ہوئی نگاہ کنیز پر ڈالی جو کھمبے سے لگی کھڑی ہوئی تھی۔ اور پھر باہر چلے گئے۔ کنیز آنکھ بچا کر ایک کوٹھری میں گھس گئی اور رو رو کر خوب دل کی بھڑاس نکالی۔

اب اس نے دسمبر کی چھٹیوں کا انتظار شروع کیا۔ ایک دن سے دوسرا دن ہوا۔ پھر ایک ہفتہ سے دوسرا ہفتہ۔ ایک مہینہ ہوا، پھر دوسرا مہینہ شروع ہوا، اور یوں ہی زندگی کٹنے لگی۔ وہی روزمرہ کا کام۔ بیبیوں کی ڈانٹ لونڈیوں ماماؤں کے طعن تشنیع۔ صبح کام کرنے آنا، اور رات کو گھر واپس چلا جانا۔ پہلے اسی زندگی کی عادی تھی اس لئے احساس بھی نہیں تھا۔ مگر اب ایکبار زندگی کی لذت اٹھا چکی تھی اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ جنت میں داخل کی گئی، اور پھر نکال کر پھینک دی گئی۔ اب کام بھی خراب کرنے لگی تھی، اس لئے بیبیوں کی توجہ بھی اس کی طرف سے ہٹ گئی۔

دو مہینہ کے بعد اس کی صحت میں نمایاں تغیر ہونے لگا۔ دبلی ہوگئی۔ چہرے پر زردی آگئی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ جو اس کو دیکھتا تو کہتا کہ تجھے کیا ہوگیا ہے؟ یہ چپ ہو رہتی۔ ایک مہینہ اور گذرا، اب ماں باپ کو اس کی بیماری کی طرف توجہ ہوئی۔ کنیز کا نکاح تو دو سال پہلے ہو چکا تھا، ان لوگوں نے بیماری کا رنگ بھانپ کر رخصتی کے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ کنیز کی سسرال والے راضی ہوگئے۔ مگر اُنھوں نے پانچ مہینہ کی مہلت چاہی۔ اور گیہوں کی فصل کٹنے پر رخصتی کی تاریخ مقرر کی۔ ادھر سے اور جلد رخصتی کرانے پر اصرار ہوا۔ جس کو ان لوگوں نے بالکل نامنظور کر دیا ایک مہینہ اور گذرا، اور ماں باپ کی تشویش بہت بڑھ گئی ہر ایک سے کہنے لگے کنیز یا کو جلندھر کی بیماری ہوگئی ہے۔ جب لوگوں نے رائے دی کہ گاؤں کے ویدجی کو

دکھاو۔ یا کوس بھر پر اسپتال ہے وہاں لے جاؤ تو ان دونوں نے ٹال دیا ہاں گنڈا تعویذ کرنے لگے۔ دو ایک دوائیاں بھی کھلائیں۔ آنے والی مصیبت بانجھیں چڑھائے اپنے دانت دکھارہی تھی۔ مگر یہ دونوں اپنے کو دھوکے ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے۔

کنیز کے لئے سب طرح مصیبت تھی۔ ماں طعن تشنیع کرتی۔ باپ منہ سے سیدھی طرح بات نہ کرتا اگر دونوں میں سے کبھی کوئی ہمدردی دکھاتا تو اس طرح کہ کنیز شرمندہ ہو جاتی۔ زمیندار صاحب کے یہاں ڈانٹ اور مار ان دنوں زیادہ ہو گئی تھی۔ ہاں اگر کوئی غمگسار تھا تو لطافن' اس نے دو ایک دوائیاں بھی لاکر چپکے چپکے کھلائیں۔

کنیز اب خوش تھی' کیونکہ دسمبر کی چھٹیاں قریب آرہی تھیں۔ شبیر میاں آنے والے تھے' اس کو یقین تھا کہ ان کے آتے ہی کنیز اکثر لوگوں سے پوچھا کرتی کہ چھٹیاں کب شروع ہوں گی۔ اور کب تک رہیں گی۔ رفتہ رفتہ چھٹیاں آگئیں۔ مگر کنیز کو حیرت تھی کہ شبیر میاں کی ماں اور بھاوج انکی خلاف معمول ان کے آنے کا انتظار نہیں کر رہی ہیں۔ اس وجہ کو پہلے سے اس نے سمجھنا ہی نہیں چاہا جب دن گذرتے گئے' اور شبیر میاں نہ آئے' تب یہ سمجھی گئی' اور اس کا دل اندر ہی اندر ٹوٹتا گیا آخر ایک دن شبیر میاں کی ماں سے تصدیق ہو گئی۔ وہ کسی کو بتا رہی تھیں کہ " ابکی ہم لوگوں نے شبیر میاں کو لکھا ہے کہ یہاں نہ آؤ۔ بلکہ اپنی بہن کے یہاں ہو آؤ "

کنیز اب بہت بیمار رہنے لگی۔ زمیندار صاحب کی بیوی نے اس کی ماں کو بلا کر پانچ روپیہ دئے اور کہا کہ کنیز کا علاج کرو اور جب تک اچھی نہو جائے کام کاج کے لئے نہ بھیجو۔ کنیز اب گھر میں بے کار پڑی رہتی۔ کبھی کبھی دو ایک چھوٹے چھوٹے کام کر دیتی۔ اور اس کی جلندھر کی بیماری روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ماں سب دیکھتی تھی سمجھتی تھی۔ اور ترس کھا کر چپ ہو جاتی تھی۔ باپ اکثر جلا اٹھتا تھا۔

" کبھی بڑے گھروں میں لڑکی نوکر نہ رکھائے "

ایک دن رات کو کنیز کے ماں باپ' اپنے خیال میں اس کو سوتا پاکر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

ماں۔ " بھیا کے یہاں چلے چلو۔ بہت دن سے ہم لوگ وہاں نہیں گئے ہیں "

باپ۔ "کیا خراب قسمت ہے؟ کھیتی کو دیکھوں؟ کیا کروں؟"

ماں۔ "تم پہنچا کر چلے آنا۔"

باپ۔ "کنیز جانے کے بھی قابل ہے۔"

ماں "جائے گی نہیں تو کیا کرے گی۔ بدنصیب کہیں کی۔"

باپ "منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔"

کنیز سب سن رہی تھی۔ اس نے اسی وقت طے کر لیا کہ کچھ ہو اپنے ناپاک وجود کو ماں باپ کے مکان سے ہٹا لیجاؤں، کہاں جاؤں گی؟ نہ اس نے یہ سوال سوچا، اور نہ سوچ سکتی تھی۔ رات بھر جگتی رہی جب اس کے خیال میں دو تین گھنٹہ رات رہ گئی، چپکے سے اٹھی اور کوٹھری میں چلی گئی۔ وہاں جلانے کی لکڑیاں اور کنڈے کے ڈھیر تھے۔ اس نے ان کو ایک کونے میں ہٹا دیا۔ اور ٹٹول کر ایک چھوٹی سی ہانڈی نکالی۔ اس میں سے شبیر میاں کا دیا ہوا ہار نکالا۔ اور گلے میں پہن لیا۔ اور پھر چپکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

کنیز کو وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ درحقیقت صبح ہو گئی تھی۔ اور لوگ بیلوں کو لیئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے ان میں سے ایک نے کنیز کو دیکھا، اور پہچان کر کہا۔

"کہاں جا رہی ہے کنیزیا؟"

کنیز گھبراتی، ہچکچاتی۔ پھر بولی۔

"ویدجی کے یہاں۔ ابا کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"ویدجی ادھر کہاں؟ تالاب پار جا۔"

کنیز اسی طرف مڑ گئی۔ اس کے لئے تو سب سمتیں یکساں تھیں۔ تھوڑی دور جا کر اس نے خیال کیا کہ صبح تو ہو گئی تالاب پار بہت سے جاننے والے مل جائیں گے۔ اس لئے پہلے ہی والا راستہ بہتر ہے۔ مگر جیسے ہی وہ پلٹی دیکھا کہ ان کا راہبر کھڑا دیکھ رہا ہے۔ نہ معلوم راستہ بتانے کے لئے، یا کنیز کا ارادہ دریافت کرنے کے لئے۔ مجبوراً وہ اسی سمت چلی۔ کچھ دور جا کر اس کے "علی الدی چچا" آتے دکھائی دیئے۔ اس نے فوراً راستہ بدل دیا، اور پگڈنڈی چھوڑ، سڑک پر نکل گئی۔ ادھر سے بیل گاڑی آ رہی تھی۔ گاڑی کا پردہ چھوٹا ہوا تھا

صرف ایک کونہ اٹھا ہوا تھا۔ گاڑی خیراتی ہانک رہا تھا جو کنیز کے ساتھ کا کھیلا ہوا تھا۔ کنیز نے سوچا کہ اس کو درست بنانا چاہیئے۔ قریب جا کر خوشامد سے کہنے لگی۔

"خیراتی سڑک کو جا رہا ہے؟ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتا چلتا۔"

"کہاں جائے گی؟"

"خالہ کے پاس۔ اپنا علاج کرانے۔"

"اکیلی؟"

"ہوں"

خیراتی معنی خیز تبسم سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اور بولا

"ہوں! ہوں ہوں"

کنیز کھسیا کر بولی

"اگر لیجانا ہو تو ویسا کہہ۔ نہیں تو میں خود چلی جاؤں گی۔"

کنیز اس لئے اور گھبرا گئی تھی کہ اس کے علی الدی چچا قریب آ رہے تھے۔ بارے خیراتی اس کو گھبرایا ہوا دیکھ کر ترس کھا گیا، اور بولا

"بیٹھ جا۔"

کنیز علی الدی چچا سے آڑ میں ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور پردہ چھوڑ دیا۔ گاڑی کچی سڑک پر کھسر کھسر کرتی ہوئی چلنے لگی۔ علی الدی چچا برابر سے گذر گئے۔ کنیز کے دل کو اطمینان ہوا اور وہ گاڑی کے ہچکولوں سے مزا لینے لگی۔ زندگی میں صرف تین چار بار گاڑی پر بیٹھی تھی۔ مگر کسی مرتبہ اس طرح نہیں کہ پوری گاڑی اسی کے لئے وقف ہو۔ کنیز آرام اور اطمینان پا کر گاڑی میں لیٹ گئی، اور پردے کا ایک کونہ اٹھا کر جھانکنے لگی۔ خیراتی پوری آواز سے تانیں اڑا رہا تھا۔

"مٹ نہ جائے درد دل۔ مٹ نہ جائے درد دل"

گاڑی سڑک چھوڑ ایک باغ کے بیچ سے گذری۔ اور اس کے بعد ایسے راستہ سے چلنے لگی جس کے

دونوں طرف بہت اونچے پتاور کے جھنڈ کھڑے تھے۔ کنیز بچپن میں گاؤں کے ہر حصہ میں گھوم چکی تھی۔ اس لئے اس کو تعجب ہوا کہ خیراتی کدھر جا رہا ہے۔ اور بولی

"کدھر جا رہا ہے؟"

خیراتی بدستور تانیں مار رہا تھا

"دردِ دل ہو، بھئی دردِ دل"

گفتگو کی گنجائش نہ پاکر کنیز خاموش ہو گئی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی، اس لئے لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر گذری ہوگی کہ اس کو ایک طرح کی بےچینی محسوس ہوئی اور آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو گاڑی اسی کے مکان کے دروازے پر کھڑی ہے۔ اور خیراتی اس کے ماں باپ سے باتیں کر رہا ہے۔

خیراتی۔ "ارے بیگم صاحبہ۔ سڑک آ گئی ہے"

باپ۔ ڈانٹ کر بولا۔ کنیریا۔ اتر......

کنیز ڈرتے کانپتی ہوئی اتری۔ اترتے ہی باپ نے ایک گھونسا مارا۔ اور پھر ایک لکڑی اٹھا کر چار پانچ ضربیں لگائیں۔ کنیز دروازے سے گذر کر صحن میں گر پڑی۔ باپ نے اب ایک لات رسید کی پھر بھی غصہ کم نہیں ہوا۔ برابر گالیاں دئے جا رہا تھا۔ آخر ماں کو رحم آ گیا اور بولی۔

"کیا مار ڈالو گے وہ غریب کیا کرتی تم ہی نے اس کی زندگی وبال کر دی تھی۔ زمیندار کے گھر میں نوکر رہ کر آج تک کوئی لڑکی بچی ہے۔ ابھی پارسال بھندو کی بیوہ کے بچہ ہوا تھا........"

"چپ۔ بڑ بڑ کئے جاتی ہے۔ میں گاؤں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

پاس پڑوس کے مرد، اور عورتیں آ کر جمع ہو گئیں۔ قصہ ان لوگوں کو خیراتی سے معلوم ہو گیا تھا اور جو کچھ باقی بچا، وہ ماں باپ کی لڑائی سے کھل گیا۔ ہر ایک اپنی سی کہنے لگا۔

"برا کیا۔"

"برا کیا۔"

"برا ہوا۔"

"کہاں گئی تھی؟"

"گئی ہی کیوں تھی؟ کوئی نکال رہا تھا"

"بچاری غیرت دار ہے"

"پہلے سے سوچ لیتی"

ماں باپ کا بُرا حال، سب کے سامنے دُکھڑا رو رہے تھے۔ ایک عورت بولی۔

"ایسی باتیں غریبوں کے گھر ہو ہی جاتی ہیں"

دوسری عورت:۔ "عزت آبرو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں"

غل شور سنکر زمیندار صاحب کے گھر سے بفاطن خبر لینے آئی۔ اور کنیز کے باپ سے پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟"

"کیا بتاؤں؟ شبیر میاں نے ہم لوگوں کی عزت لے لی۔ اور اس حرامزادی کو تو کسی کام کا نہ رکھا"

یہ سنتے ہی دو تین آدمی بول اُٹھے۔

"ہائیں ہائیں۔ کسی کا نام کیوں لیتے ہو؟"

"کیا کہ رہے ہو۔ کیا کہ رہے ہو؟"

"کسی کا نام کیوں لو۔ اپنی قسمت کو کہو۔ قسمت کو"

ماں۔ "ہاں اپنا لکھا"

ایک بڑھیا نے بفاطن کے پاس جا کر کہا۔

"یہ نہ کہدینا کہ کسی کا نام لیا۔ کیا فائدہ؟ جو ہونا تھا ہو چکا"

دوسری عورت:۔ "زمیندار صاحب کو خفا کر کے گاؤں میں رہنا ہو گا کیسے"

تیسری۔ "دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر"

بفاطن چپکے چلی گئی۔ جو جمع ہو گئے تھے وہ بھی ایک ایک دو دو کر کے رخصت ہونے لگے۔ دو عورتیں ٹھہر گئیں۔ اُنھوں نے کنیز کو صحن سے اٹھایا جو ابھی تک منہ ڈھکے، بے کل پڑی رو رہی تھی۔ اور اس کو لیجا کر پلنگ پر

لٹایا۔ چوٹیں بہت بے جگہ لگیں تھیں۔ خوب سینکا گیا۔ ہلدی چونا لگایا گیا۔ مگر کنیز کی بچینی میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ اکثر وہ بڑی زور سے چیخ اٹھتی۔ ان عورتوں کے کچھ سمجھ میں آیا۔ کچھ نہیں سمجھ میں آیا۔ مگر جو بن پڑا کرتی رہیں۔ آخر تین بجے آٹھ مہینہ کا چھوٹا سا بچہ پیدا ہوا۔

چار روز کے بعد کنیز کے ماں باپ گھر نمو پر چھوڑ کر صبح تڑکے کنیز کو لیکر گاؤں سے چلے، اور یہ ارادہ کیا کہ کنیز کو مصلحتاً کچھ دنوں کے لئے اس کی خالہ کے پاس پہونچا دینا چاہئے۔ پھر جیسا رنگ ہو ویسا کیا جائے گا کیونکہ اس کی رخصتی کی طرف سے تو اب بالکل مایوسی ہی ہو چکی تھی اور زمیندار صاحب نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ میں ایسی خراب عورت کو گھر میں نہیں آنے دوں گا۔ سورج نکلتے نکلتے یہ لوگ ایک کوس نکل گئے۔ وہاں کسی شاہ صاحب کا مزار تھا ان لوگوں نے جا کر دو پیسہ چڑھائے۔ ایک باباجی بیٹھے تھے، دعائیں دینے لگے۔ ان کی نگاہ کنیز پر پڑی دیکھا تو ایک نوجوان عورت گلے میں شیشے کا سرخ ہار پہنے۔ گود میں ایک لڑکا لئے کھڑی ہے۔ دوپٹہ منہ کی طرف گھونگھٹ کی طرح لٹکا ہوا ہے۔ باباجی اس کی طرف دیکھ کر۔ کنیز کے باپ سے کہنے لگے۔

" پوتا ہے کہ نواسہ ؟ "

کنیز غیرت کے مارے کٹ گئی۔ اور اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ باباجی اس شرم سے نتیجہ اخذ کر کے بولے۔

" پوتا ہے۔ اللہ اچھا رکھے۔ کما کر دادی دادا کا پیٹ بھرے "

تینوں مسافروں میں سناٹا چھا گیا، اور وہاں سے خاموش چل کھڑے ہوئے۔

پندرہ دن بعد جب کنیز کے ماں باپ کنیز کو پہونچا کر واپس ہوئے تو یہاں آتے ہی معلوم ہوا زمیندار صاحب کے یہاں شادی کے سامان ہو رہے ہیں۔ شبیر میاں کو قسمتوں سے بڑی مالدار بیوی مل رہی ہے۔ یہ دونوں ٹھنڈی سانسیں بھر کر گھر چلے گئے۔

کانگریس کی پچاس سالہ جوبلی

۲۸ دسمبر ۱۹۳۵ء کو کانگریس کی زندگی کے پچاس سال پورے ہوئے۔ اس موقع پر ملک کے تقریباً تمام شہروں اور بڑے قصبوں میں جلوس نکالے گئے اور ہندوستان کے جھنڈے کو سلامی دی گئی۔ اس تقریب میں ہندوستان کی آبادی کی خاصی کثیر تعداد شریک ہوئی اور ملک کے پڑھے لکھے اور دولتمند لوگوں کی ایک بڑی جماعت نے جسے ہندوستان کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا بجا طور پر رہنما کہا جا سکتا ہے اس جشن جوبلی کو کامیاب بنانے میں تقریر، تحریر اور اجتماع کے ذریعہ پوری سرگرمی کے ساتھ کوشش کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کانگریس کیا چیز ہے جس کی پچاسویں سالگرہ منانے کے لئے اس قدر شور و ہنگامہ برپا کرنا مناسب سمجھا گیا۔

کانگریس ایک ایسے ادارے کا نام ہے جو ایک زندہ اور ترقی پذیر تحریک کو چلا رہا ہے۔ اس کی بنا چند مفروضات پر رکھی گئی ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے چلانے والوں کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ ان میں سب سے اہم مفروضہ یہ ہے کہ اس رقبہ میں جسے انگریزوں نے اپنی سہولت کے لئے ایک واحد حکومت قرار دے رکھا ہے اور جس کا سیاسی نام انھوں نے ہندوستان قرار دیا ہے درحقیقت ایک ہی قوم آباد ہے جس کے اغراض و مفاد مشترک ہیں اور جو متحد ہو کر اپنی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنا چاہتی ہے۔ افغان، بلوچ، پنجابی، سندھی، بنگالی، گجراتی اور مدراسی جو دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں ان کے آپس کے فرق، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دوسرے مذہبوں کے اختلافات، ہندی، مرہٹی، اردو، بنگالی، تامل، تلیگو وغیرہ بولنے والوں کی باہمی بیگانگی، زمیندار اور کسان، سرمایہ دار اور مزدور، شہری اور دیہاتی کی تفریق ـــــ یہ سب چیزیں غیر اہم اور ناقابل التفات ہیں بنیادی طور پر ہندوستان کے بسنے والے ایک ہیں۔ ان میں قومی وحدت کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان کی شکایتیں اور محرومیاں یکساں، ان کی تمنائیں اور حوصلے مشترک، ان کے اغراض و مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ یہ سب ملکی ہیں اور انگریز غیر ملکیوں سے ان کا ہر قدم پر تصادم ہے کیوں کہ انگریزوں کے ہندوستان پر قبضہ کرنے سے اعلیٰ فوجی اور سول عہدے ہندوستانیوں کے ہاتھ سے چھن گئے۔ ملک کی تجارت اور صنعت برباد ہو گئی، زراعت پر محصول کا بار اس قدر بڑھا کہ کسانوں کی حالت گفتنی ہو گئی اور ان کی قوت مدافعت اس قدر کم ہوئی کہ ذرا سی بدحالی کے مقابلہ

کی بھی سکت ان میں باقی نہ رہی غیر ملکی تہذیب، زبان، مذہب اور تعلیم کو فروغ ہوا۔ ملکی علوم اور تمدن کو زوال ہوا۔ ملک کے رہنے والے ذلیل اور خوار ہوگئے۔ حکومت کے اقتدار سے ایسا ناجائز فایدہ اٹھایا گیا کہ بڑے سے بڑا ہندوستانی بھی ایک چھوٹے سے چھوٹے انگریز کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوگیا۔ قوانین کی سخت گیری نے تقریر، تحریر اور اجتماع کی آزادی سلب کرلی۔ ہتھیار اور اسلحہ رکھنا ممنوع قرار دیا گیا۔ غرضکہ زندگی کے بیشتر حقوق چھین لئے گئے جن کے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ہر ہندوستانی انفرادی طور پر تمنا کرنے لگا۔ اس انفرادی تمنا کو اجتماعی شکل و تنظیم دینے کے لئے ایک سیاسی جماعت کانگریس کے نام سے ۱۸۸۵ء میں قائم کی گئی۔ اس جماعت نے پچاس سال تک مسلسل اپنی جدوجہد کو جاری رکھا ہے۔ اس نے اپنا کام (اگر ابتدائی دو تین سالوں کو نظر انداز کردیا جائے) حکومت کی سرپرستی سے نہیں بلکہ اس سے آزاد رہ کر اور اس کی مخالفت کے باوجود اپنی ذاتی کوشش سے چلایا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول میں یہ ابھی تک ناکام ہے لیکن اس جماعت کے رہنماؤں کا خیال ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ کچھ عرصہ سے اس کا مطمح نظر موجودہ غیر ملکی حکومت کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ملکی اور نمایندہ طرز کی حکومت کو قائم کرنا ہوگیا ہے۔ یہ نصب العین اس کے سامنے اپنے قیام کی ابتدا سے ہی واضح شکل میں موجود نہ تھا۔ پہلے اس کے مطالبات بہت کم اور نرم تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے حوصلے بڑھتے گئے ہیں اور اب اس نے مکمل آزادی کو اپنا مقصد قرار دے لیا ہے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو طریقے اس نے مقرر کئے ان میں بھی رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ پہلے عرضی اور ڈیپوٹیشن کے ذریعہ حکومت ہند اور حکومت انگلستان کو اپنے مطالبات کی طرف متوجہ کیا جاتا تھا اور ان کی فیاضی اور انصاف پسندی سے اصلاحات کے ملنے کی امید کی جاتی تھی۔ لیکن اب حکومت کے فوائد کو ناممکن بناکر انگلستان کو صلح کی شرائط کے لئے مجبور کرنے کا حوصلہ کیا جانے لگا ہے۔ پہلے یہ تحریک چند اعلےٰ انگریزی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں تک محدود تھی جنھوں نے یورپ کی آزاد اور آئینی حکومتوں کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تحریک پھیل کر کم علم اور بے علم لوگوں میں بھی پہنچ گئی ہے۔ پہلے مزدوروں اور کسانوں کی شکایتوں کی ترجمانی چند خود ساختہ نمایندے کرتے تھے اب ان کے صحیح نمایندے بھی سامنے آنے لگے ہیں اور ایسے آئین دستور کے خاکے بنائے جاتے ہیں جن میں ان کے حقوق کی پوری نگہداشت ہوسکے

گی۔ کانگریس کی یہ ترقی بہت سے لوگوں کے لئے نہایت قابل اطمینان نظر آتی ہے۔ لیکن جب اس کا مقابلہ دوسرے ملکوں کی ترقی سے کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی رفتار کس درجہ سست ہے۔ امریکہ، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس، کینیڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، نیوزیلینڈ کی پچاس سال پہلے کی حالت کا جب ان کی موجودہ حالت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی مقابلہ میں ہندوستان کی رفتار کس قدر سست ہے اور اس وقت اطمینان کی جگہ رنج و افسوس کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان نے نصف صدی یونہی باتوں میں گنوادی اور جو کام کرنے کا تھا وہ ابھی تک پورا نہ ہوسکا۔

مگر اس قسم کی سخت رائے کا اظہار شدت کے ساتھ اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب یہاں کے مخصوص حالات کو غیر معمولی نہ سمجھا جائے۔ جو لوگ یہاں کے موانع اور دشواریوں کو اسی ملک کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں ان کی نگاہ میں کانگریس کی کارگذاریاں کسی طرح حقیر نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انگریزوں نے اس وسیع علاقہ کو جو آج ہندوستان میں شامل ہے رفتہ رفتہ مختلف حکمرانوں سے حاصل کیا تو اس میں کسی قسم کا کوئی ایسا قریبی رشتہ اتحاد نہیں پایا جاتا تھا جو از خود اسے ایک سیاسی وحدت عطا کرسکتا۔ ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی خامیوں کی وجہ سے آبادی کا بیشتر حصہ صرف ایک محدود علاقہ سے معاشرتی، تجارتی اور سیاسی تعلقات پیدا کرسکتا تھا۔ اکثر علاقے بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں اپنی معاشی اور اجتماعی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہ ہوتے تھے۔ ان کی آبادی کے اکثر افراد کی دنیا اپنے گاؤں یا آس پاس کے بیس پچیس گاؤں تک محدود ہوتی تھی۔ اس مختصر دنیا کے باہر دوسرے علاقوں کے معاملات سے انھیں بہت کم سروکار ہوتا تھا۔ تمام ہندو سوسائٹی ذات پات کے ایک تدریجی نظام میں بندھی ہوئی تھی۔ چار بڑی ذاتیں تھیں جن میں ہزاروں اور نئی شاخیں پیدا ہوگئی تھیں۔ برہمن، کشتری اور ویش کی دنیا شدر کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہوتی تھی۔ پھر برہمنوں، کشتریوں اور ویشوں کے بھی مختلف مدارج تھے۔ اونچے درجے کے شہر میں رہنے والے برہمن علم حاصل کرنے، یاترا درشن کے لئے اور راجہ مہاراجوں کے ساتھ دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ فوج میں لڑنے والے کشتریوں کو بھی جنگ کی وجہ سے ایک وسیع رقبہ اور کثیر آبادی سے واقفیت ہوجاتی تھی۔ قیمتی مال کی تجارت کرنے والے ویش بھی

نفع کی تلاش میں بہت سے علاقوں میں گھومتے تھے۔ لیکن اس اعتبار سے سب سے زیادہ سفر کرنے والے بیراگی اور مہاتما ہوتے تھے جو گھر بار کو چھوڑ کر سنیاس لے لیتے تھے اور خانہ بدوشی کی حالت میں مکان اور غذا کی فکر سے آزاد، جان و مال سے بے پروا، رہزنوں اور ڈاکوؤں سے نڈر ہوکر پاپیادہ جدھر چاہتے تھے گھومتے پھرتے تھے۔ ان سفر کرنے والے لوگوں کی وجہ سے زندگی میں ایک طرح کی وحدت پیدا ہوتی تھی لیکن اس کا اثر، وسعت اور گہرائی دونوں لحاظ سے، بہت محدود تھا۔ کیونکہ سنیاسی، دیش اور ایک حد تک برہمن بھی ایک طرح کی بین الاقوامی آبادی ہوتے تھے اور دو علاقوں میں ان کے باہمی تعلقات کی وجہ سے کسی سیاسی وحدت کا پیدا ہونا لازمی نہ تھا۔ کشتری لڑائی کے میدان میں مخالفت کے لئے ہی ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ پھر جو تھوڑی بہت وحدت ان سب کی وجہ سے پیدا بھی ہوتی تھی وہ مسلمانوں کے اقتدار کے بڑھنے سے ختم ہوگئی۔ کیونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ان لوگوں کی معرفت کسی قسم کا رشتہ اتحاد پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ گو منتشر مسلمانوں میں باہمی وحدت پیدا کرنے کے لئے علماء، درویش اور تاجر، ذات پات کی تفریق نہ ہونے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ کامیاب رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں گذشتہ صدی کی ایک مثال پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۸۳۰ء کے آس پاس سکھوں کے مذہبی مظالم کے خلاف جہاد کرنے کے لئے مجاہدین کی جو جماعت حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی سرکردگی میں یو۔پی۔ دہلی، راجپوتانہ، سندھ، بلوچستان اور سرحدی صوبہ کا دورہ کرتی ہوئی پنجاب پر حملہ آور ہوئی اس کا خیر مقدم مسلمانوں نے ہر جگہ اپنی قومی فوج سمجھ کر کیا۔ یہ جماعت اللہ پر توکل کرکے سامان رسد کا انتظام کئے بغیر نکلی تھی لیکن اسے کسی جگہ فراہمی رسد میں کوئی غیر معمولی دشواری نہیں ہوئی بلکہ لوگوں نے از خود برضا و رغبت اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ لے لیا اور ہر جگہ رضاکاروں کے ذریعہ اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس جماعت کا منشاء یہ تھا کہ سکھوں نے مسلمانوں کے فرائض مذہبی یعنی اذان، نماز باجماعت وغیرہ کی بجا آوری میں جو پابندیاں بہ جبر عاید کی ہیں ان کا خاتمہ کیا جائے۔ اس جماعت کو نظم و انتظام کی خرابی اور مقامی رفیقان کار کی غداری اور دغا بازی کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔ علماء اور درویشوں کے ذریعہ مسلمانوں میں آسانی سے جو وحدت پیدا کرائی جا سکتی ہے اس کی دوسری مثال ۱۸۵۷ء کے غدر کو بھی

سمجھنا چاہئے۔ بہر حال برطانوی ہندوستان میں محکوم رعایا کی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کے شامل ہو جانے سے ہندوستان کے قومی اتحاد کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ لوکمانیہ تلک کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ہندوستانی قومیت کی جنگ دو رخہ نہیں بلکہ سہ رخہ ہے جس میں فریق ایک طرف سے صرف انگریز اور دوسری طرف سے ہندوستانی نہیں ہیں بلکہ ایک طرف ہندو، دوسری طرف انگریز اور تیسری طرف مسلمان ہیں۔ مسٹر گوکھلے کے متعلق مسز سروجنی نائیڈو کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے کچھ زیادہ پُر امید نہ تھے کیونکہ انھوں نے خاتون موصوف سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ یہ اتحاد میری اور تمھاری زندگی میں تو ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور برابر ہوتے جارہے ہیں ان سے اس مسئلہ کی پیچیدگی برابر بڑھتی جارہی ہے۔ فرقہ پرست رہنما اپنے ادارے الگ الگ بناکر اپنے مورچے مضبوط کر رہے ہیں اور اپنے فرقوں کو اُکسا اُکسا کر تشدد کی طرف زیادہ مائل کرتے جارہے ہیں۔ اب ادھوری جنگ کرنے کا خیال لوگ ترک کر رہے ہیں اور آخر تک لڑکر ہمیشہ کے لئے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کی موجودگی میں یہ غالباً ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا مفاد بہ ظاہر اسی میں ہے کہ آپس کے جھگڑوں کو جہاں تک ہو سکے بڑھایا جائے تاکہ خانہ جنگی کی حالت میں کبھی ایک فریق کا اور کبھی دوسرے کا ساتھ دے کر دونوں کے زور کو کم کیا جائے اور اپنی جڑیں مضبوط کی جائیں۔ ابتدا سے وہ یہی کھیل کھیل رہے ہیں ورنہ ان کی قلیل تعداد ہندوستان کی کثیر آبادی پر کیسے حکومت کر سکتی تھی۔

مندرجہ بالا حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں نا اتفاقی اور عدم اتحاد کے عناصر کس درجہ قوی ہیں اور کسی متحدہ قومیت کا ارتقا کس قدر ناممکن الحصول نظر آتا ہے۔ کانگریس کی یہ ایک بڑی کارگذاری ہے کہ ایک ایسے ملک میں جو احساس وطنیت سے بالکل معرا تھا اس نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک یگانگت پیدا کردی۔ کانگریس کے بانیوں نے ہندوستانی ذہن کو عہد قدیم کی تنگ نظریوں، عہد متوسط کے تعصب اور جاگیر دارانہ نظام کی ہمہ گیری سے آزاد کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ اور ان کے پیروؤں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کام کو جاری رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ برطانوی حکومت کے قیام، ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی ترقی، امن و تعلیم کے رواج اور تجارت و جدید صنعت کے فروغ سے بھی اس کام میں

بہت امداد ملی بلکہ بعض انتہا پسند تو شاید یہ تک کہیں گے کہ کانگریس کا احیار ماضی کی تحریکیں ان جدید قوتوں کے آزادانہ عمل میں مزاحم ہوئیں جس کی وجہ سے ملکی اتحاد اور ارتقائے قومیت کو صدمہ پہنچا اور ترقی کی رفتار سست ہو گئی۔ لیکن جو لوگ مغربی آزاد تجارت کی تباہ کاریوں اور انتفاع ناجائز سے واقف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کے یہ عطیے کسی غیر منظم جماعت کے لئے کس درجہ نقصان رساں ثابت ہو سکتے ہیں اور وہ صحیح طور پر اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کانگریس نے نفع ذاتی کی جگہ نفع قومی کے تخیل کو ابھار کر ہندوستان کی مدافعت کی طاقت کو کس قدر استوار کیا ہے۔ اس کا کام ابھی تک نامکمل ہے۔ رجعت کی قوتوں کو کانگریس نہیں بلکہ برطانوی شہنشاہیت ابھار رہی ہے اور قوتوں کا عمل اس قدر پیچ در پیچ ہے کہ بعض وقت جو کام قومیت کی ترقی کے لئے شروع کئے جاتے ہیں وہ فی الحقیقت مخالف کو نقصان پہنچانے کی جگہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ بہرحال سیاست کی ان پیچیدگیوں کے باوجود کانگریس کی خدمت بصورت مجموعی ہندوستان کے لئے مفید ثابت ہوئی ہے۔

دنیا کی رفتار

برطانیہ اور اٹلی حبش کے معاملہ میں برطانیہ اور اٹلی کا جو اختلاف ظاہر ہوا ہے اس کے اسباب پر ذیل کے اقتباس سے روشنی پڑے گی جو ہم ایک مشہور جرمن اخبار میونشنر نواسے ناخرشٹن (MUENCHNER NEUESTE NACHRICHTEN سے لیتے ہیں)

اٹلی میں متحدہ شاہی حکومت کے قیام سے برابر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ملک کی پرامن اور خود مختار نشو و نما کے لئے بہترین ضمانت انگلستان کی دوستی ہے۔ اٹلی والے حقیقت حال سے اچھی طرح واقف تھے۔ انیسویں صدی میں انگلستان بلا شرکت غیرے بحر روم پر حاوی تھا اور وہاں کوئی بات اس کی مرضی کے بغیر نہ ہو سکتی تھی جو صورت آج باقی نہیں ہے۔ انگلستان کی غرض بھی اس میں پوشیدہ تھی کہ اٹلی مضبوط ہو۔ انیسویں صدی میں بحر روم کی سیاست میں فرانس اور انگلستان کے تصادم کو نہ بھولنا چاہیئے۔ فرانس برابر چاہتا تھا کہ بحر روم اس کا ہو جائے اور انگلستان اسے اس منصوبہ میں برابر شکست دیتا تھا۔ اسی لئے وہ اٹلی کو رفتہ رفتہ بحر روم میں تقویت دیتا جاتا تھا تاکہ ایک ایسی طاقت پیدا ہو جائے جس کے اغراض فرانس کے خلاف ہوں اور چاہے بعد کو یہ اس کی جگہ لینا چاہے مگر اس وقت اپنی کمزوری کے باوجود فرانس کے خطرہ کو دفع کر سکے۔ اٹلی چونکہ فرانس کے مقابلہ میں کمزور تھا اس لئے انگلستان کو پورا بھروسہ تھا کہ یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ اٹلی اپنے جغرافی موقع اور اپنی معاشی ساخت کی وجہ سے مجبور تھا کہ انگلستان کا دم چھلا بنا رہے۔ بحر روم کا انگریزی بیڑا اس کے ساحلی شہروں کو تباہ کر کے اس کے جسم پر کاری زخم لگا سکتا تھا۔ اور اگر کہیں فرانس سے بھی اس کی ان بن ہو تو اس کے ملک کی کامل ناکہ بندی کر سکتا تھا جنگ عظیم کے بعد بھی پہلے تو دونوں ملکوں کے اس تعلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ فاشستی حکومت نے ہر طرح انگلستان سے تعلقات استوار رکھے بلکہ انھیں اور بہتر بنانے کی کوشش کی، حالانکہ اپنے ابتدائی زمانہ میں یہ حکومت صاف صاف

فرانس کے خلاف رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اٹلی نے مصر اور ایشیائے کوچک میں تمدنی اور معاشی نشر و تبلیغ کا ایک جال بچھایا۔ پھر مصر کے بعد فلسطین میں دلچسپی لینا شروع کی۔ یہاں کی فاشستی اٹلی نے اپنے سر دوہرے فرائض لئے، ایک تو ایشیائے کوچک کے محافظ کی حیثیت سے فرانس کی جگہ لینا چاہی دوسرے صیحونی تحریک سے روابط بڑھائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات قایم کرنے کی تدبیریں شروع کیں تاکہ ان کی مدد سے حبش کو زیر کرے۔ ایشیائے کوچک کی ان تین قوتوں سے کھیلنے کے لئے ضرورت تھی کہ حکمت عملی میں لوچ ہو، چنانچہ یہی لوچ اور تغیر پذیری فاشستی سیاست خارجہ کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔

ٹلی کی یہ کوششیں ایسی تھیں جیسے کوئی خشک زمین میں آئندہ بارش کی امید پر نالیاں کھودے لیکن اس کے علاوہ بھی اٹلی نے بحر روم میں براہ راست قوت حاصل کرنے کی تدبیریں کیں۔ اس نے فاتح بننے کا حوصلہ کیا۔ اس کے لئے بس طرابلس اور ترکی میں میدان تھا۔ طرابلس جس پر پہلے برائے نام قبضہ تھا دافعی تفصیل کے ساتھ فتح کیا گیا، لیکن اناطولیہ میں قدم نہ جما پانے کی تلافی اس کم قیمت علاقہ میں تسلط سے نہ ہو سکی۔ شراکت سیاسی کے نئے شریک کی حیثیت سے روم نے انگلستان سے چاہا کہ اپنی سلطنت کے کچھ کام اس کے سپرد کئے جائیں جس سے بعض علاقوں میں اس کا درخور ہو جائے۔ فاشستی اٹلی نے نہایت زور اور اصرار سے انگلستان کو جتایا کہ یہ شرکت تاریخ نے مقرر کر دی ہے، اس کا وجود میں آنا لازم ہے، اور اٹلی صاف شرایط طے کرنے پر آمادہ ہے۔ لیکن انگلستان کئی سال تک سب سنتا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اٹلی کو لیبیا میں تسلط کے علاوہ اس سب قصہ سے جو حاصل ہوا وہ مصر کی دوستی۔ اٹلی نے مصری قومی تحریک سے اچھا تعلق پیدا کر لیا، اگرچہ صاف احتیاط کے ساتھ کہ انگلستان خفا نہ ہو جائے لیکن اٹلی اور انگلستان کے تعلقات میں کھلی ہوئی کشیدگی ۱۹۳۴ء میں رونما ہوئی جب اٹلی نے بحر احمر کے علاقہ میں اپنا سیاسی جال پھیلانا شروع کیا انگریزوں کا خیال ہے کہ یہاں اٹلی نے یمن کو ابن سعود کے مقابلہ میں ابھارا۔ عرب کے معاملات میں کسی کی مداخلت انگلستان کو ذرا نہیں بھاتی۔ انگلستان ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ہندوستان سے آمد و رفت کے راستہ میں کوئی رکاوٹ

پیدا ہو۔ اٹلی نے سلطنت برطانیہ کے اس اصول اساسی کی خلاف ورزی کی تھی، لیکن مین کی شکست فاش نے معاملہ کو طے کر دیا۔ البتہ اطالوی اور برطانوی اخبارات میں جو تو تو میں میں ہوئی تھی اس کی تلخی باقی رہی۔

اب اس مرتبہ اٹلی اور انگلستان کے تعلقات میں جو کشیدگی ظاہر ہوئی ہے وہ اس اعتبار سے بالکل نئی بات ہے کہ اٹلی والوں نے بالارادہ اسے پیدا کیا ہے۔ اب تک انگلستان سے دوستی فاسسٹی سیاست خارجہ کا ایک مسلمہ عقیدہ تھا۔ لیکن پچھلے دنوں اطالوی اخبارات نے برابر اس عقیدہ کی تحقیر کی ہے اور ہنسی اڑائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اٹلی کے ہوائی بیڑہ کی ترقی نے بالکل نئی صورت حال پیدا کر دی ہے اور اب اٹلی کو بحر روم میں برطانوی قوت کا سہارا درکار نہیں ہے۔ آج اگر اٹلی کو انگلستان سے مدد درکار ہے تو اتنی ہی انگلستان کو اٹلی سے مطلوب ہے۔ اٹلی کے ہوائی جہاز چاہیں تو مالٹا کو دو گھنٹہ کے اندر بالکل برباد کر دیں۔ آج سے پہلے اٹلی جو چیز ایک نئے کم مایہ شریک کاروبار کی حیثیت سے مانگتا تھا اسے آج وہ اپنا تاریخی حق جانتا ہے۔ بحر روم میں برطانوی تسلط ایک تاریخی یادگار ہے اور بس اس سے زیادہ نہیں۔ بحر روم۔ بحر لاطینی ہے جس میں فرانس اور اٹلی ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

یہ اطالوی اخبارات کا خیال ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ بحر روم میں قوتوں کا تناسب واقعی کیا ہے۔ کیا ہوائی بیڑہ کی ترقی نے واقعی اٹلی کا پلا بھاری کر دیا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ نہیں۔ اور یہ کچھ بحری اور ہوائی جنگ کے نقطۂ نظر سے نہیں مثلاً اس بات کے خیال سے نہیں کہ سویز پر یا قبرس پر یا مالٹا پر اطالوی حملہ کامیاب ہوگا یا نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ اس تصادم سے دونوں قوتوں کا سخت نقصان ہے۔ یہ سچ ہے کہ مالٹا کو چند گھنٹوں میں زمین کے برابر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے پلرمو، اور نیپلز اور خود روم بھی راکھ کا ڈھیر ہو چکے ہونگے۔ یعنی خود اٹلی کا وجود معرض بحث میں آجائے گا اور انگلستان کے ہاتھ سے تو زیادہ سے زیادہ بحر روم میں اقتدار کے چند وسائل نکل سکیں گے۔ یہ سچ ہے کہ مالٹا کو اٹلی کے حملہ سے بچایا نہیں جا سکتا۔ مگر مالٹا کو انگلستان اٹلی پر بم کے گولہ کی طرح پھینک سکتا ہے، بیشک دلا پاش پاش ہو جائے گا مگر اپنا تباہی کا کام تو کر جائیگا۔ پھر انگلستان کے بحری راستہ پر جو اسکندریہ، سویز

اور فلسطین کے ساتھ ساتھ جاتا ہے حملہ کرنا اور بھی مشکل اس وجہ سے ہوگیا ہے کہ پچھلے چند سال میں انگلستان نے صرف سنگاپور ہی میں نہایت تیزی سے بحری قلعہ بندی نہیں کی ہے بلکہ فلسطین کا بندرگاہ حیفہ بھی دیکھتے دیکھتے دنیا کا سب سے مضبوط جنگی مرکز بن گیا ہے۔

معاملات کا سیاسی پہلو اور بھی پیچیدہ ہے۔ جب اٹلی نے پہلے پہل بحر احمر کے علاقہ میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے تو برطانوی وزارت بحر کے ایک رکن نے اسے "سلطنت ہوا کی نالیوں یا سرطان" سے تعبیر کیا تھا۔ اور یہ بات ہے بھی بالکل ٹھیک۔ اس لئے اس علاقہ میں کسی ملک کو سرگرم عمل ہونا چاہے اس کا رخ انگلستان کے خلاف نہ بھی ہو برطانیہ کے راستہ میں جس پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے جمود اور انحطاط کا بیج بونا ہے۔ اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہے مثلاً اگر حبش پر اٹلی کا حملہ کامیاب ہو جائے تو اٹلی مشرقی افریقہ میں ایک سلطنت قایم کرے گا جو قدرتی طور پر بحر احمر کے دوسرے ساحل پر بھی پہنچنا چاہے گی۔ پھر حبش کے اندرونی حالات کا تقاضا یہ ہوگا کہ مصری قومی تحریک کی مدد کے علاوہ اور جگہ بھی اٹلی مسلمانوں کی حمایت کرے۔ اور اگر بالفرض یہ امکانات واقعہ نہ بھی بنیں تب بھی برطانوی سلطنت کی ہوا کی نالی میں یہ ہر دم کی تحریک کیا کم مصیبت ہوگی۔ جو تصادم برسوں سے برطانوی ہوشیاری سے ٹالے جا رہے ہیں مثلاً جاپان سے تصادم یا عالم اسلام سے ٹکر انھیں اٹلی کے اعمال ممکن ہے یکایک سامنے لا کھڑا کریں۔

انگلستان کو بحر روم میں ابھی تک حربی تفوق حاصل بھی ہو تب بھی اس علاقہ میں ایک ضدی اور ابھرتی ہوئی قوت کی کارفرمائی اسے ضرور بےچین رکھے گی۔ پچھلے دس برس میں انگلستان نے مشرق سے مغرب تک تحفظ بحری کی چار لائنیں قایم کی ہیں۔ سب سے دور ہانگ کانگ میں، پھر سینگاپور میں جس پر ہالینڈ کی مدد سے قبضہ رکھا جائے گا، پھر عدن، پھر حیفہ، بندر سعید اور اسکندریہ۔ یہ حفاظتی قلعہ بالکل برباد ہو جائے گا اگر سب سے قریب والی لائن اور اس کے بعد والی کے درمیان یا سب سے قریب والی لائن کے سامنے بھی کوئی قوت مسلط ہو جائے اور بلا تامل اپنی سیاست کے انجھر پر چلتی رہے۔

انگلستان والوں نے اپنی روایتی دوربینی سے ان تمام باتوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس لئے وہ جیفہ میں قلعے بنانے اور مالٹا میں اطالوی تمدن کے مقابلہ میں خود مالٹا کی زبان اور تمدن کی حمایت کرنے پر نہیں رک گئے۔ بلکہ ان کی نظر میں بحر احمر میں امن کے قیام کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حبش پر حملہ کو روکنے کے لئے انھوں نے اٹلی کو برطانوی نو آبادیوں میں سے کچھ علاقہ دینے تک پر آمادگی ظاہر کی۔ اٹلی نے اس کو یوں قبول نہ کیا کہ اس کے معنی یہی ہوئے کہ اٹلی کی توسیع کا مسئلہ پھر ٹل گیا۔ اٹلی سمجھتا ہے کہ اگر حبش کو سمندر تک پہنچنے کا راستہ مل گیا تو وہ اس سے اور قوت پکڑے گا اور اس وقت جس حملہ کو انگریز اپنی مداخلت سے رکوانا چاہتے ہیں وہ بعد کو اور بھی دشوار ہو جائے گا۔"

یونان میں شاہی | جنگ عظیم نے کتنے تخت خالی کر دئے تھے۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ردعمل شروع ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں تو بادشاہوں کی جگہ ان سے بھی زیادہ مطلق العنان قاید حکمرانی کر رہے ہیں اور کہیں تخت کی زیب و زینت کے لئے بادشاہوں کی واپسی کے ڈھنگ ڈالے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یونان نے اپنی آبادی تقریباً ۹۵ فیصدی اکثریت کی رائے سے اپنے پرانے بادشاہ جارج دوم کو پھر تخت پر متمکن کر دیا ہے۔

بظاہر تو یہ بات ہے کہ قوم اپنے پرانے بادشاہ سے راضی ہو گئی ہے۔ بادشاہ نے بھی تو آخر قوم کی خاطر اپنی رومانوی بیوی الزبتھ کو طلاق دیدی جس سے یونانی اور جو یونانیوں سے سخت خفا تھی لیکن اس تغیر میں دول عظمیٰ کی سیاست کو بھی اچھا خاصا دخل ہے۔ یعنی انگلستان کی سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ بلقان کے ممالک میں اس کا اثر شاہی خاندانوں کی وساطت سے مضبوط ہو۔ اس لئے کہ آئندہ کبھی روس سے ٹکر ہوئی تو اس کی بڑی ضرورت پڑے گی۔ جن ملکوں میں در پردہ اشتراکی تبلیغ نے روسی اثر کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے وہاں برطانیہ کی یہ کوشش اور بھی شدت کے ساتھ جاری ہے۔ اور انھیں ممالک میں سے یونان بھی ہے۔ بلغراد کا دربار شاہی انگریزی اثر میں ہے ہی۔ رومانیا سے تعلقات بہت اچھے نہ تھے مگر انھیں بھی درست کرنے کی کوشش جاری ہے بلغاریہ کے بادشاہ کی شادی ایک اطالوی شہزادی سے ہوئی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ بلغاریہ اٹلی کے موجودہ حریف برطانیہ کا ساتھ

مدد دے گا۔ مگر کہتے ہیں کہ اطالوی شہزادی کا سیاسی اثر زیادہ نہیں ہے۔ اور بلغاریہ اور یوگوسلاویا میں تعلقات روز بروز زیادہ خوشگوار ہوتے جاتے ہیں اور اس سے غالباً انگریز بھی بلغاریہ میں کام لے سکیں گے۔

یونانی تخت پر انگلستان کو شاہ جارج دوم کی واپسی میں بھی چنداں اعتراض نہ تھا مگر خبر تو یہاں تک تھی کہ ملک معظم کے نورعین شہزادہ کنٹ کو یونان کے تخت پر پہنچانے کے منصوبے بھی بنائے گئے تھے۔ اور اس سلسلہ میں یونان کے سابق وزیر اعظم سلدارلیس نے یوگوسلاویا کا سفر کرکے خود شہزادہ کنٹ اور دوسرے با اثر لوگوں سے گفتگو کر لی تھی۔ لیکن فرانس اور اٹلی جو رجعت شاہی کے حامی تھے شاید انگلستان کے اثر کو اتنا قوی ہونے دینا نہ چاہتے ہوں۔ یا اور وجوہ ہوں کہ آخر کو قرعہ شاہ جارج دوم کے نام ہی پڑا۔

بلقان میں انگلستان کی دلچسپی کا اصل سبب یہ ہے کہ اگر بلقانی حکومتوں سے دوستانہ تعلقات ہوں تو بحر روم میں انگریزی بیڑہ کو بڑی تقویت ہو جائے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جدید بحری اسلحہ نے جبل الطارق کے قلعوں کو بیڑہ کے لئے بہت کچھ بے کار بنا دیا ہے۔ اگر اطالوی ہوائی جہاز اس پر حملہ کردیں تو شاید اس کا بچانا بھی دشوار ہو۔ اسی وجہ سے انگریز مالٹا کو مضبوط بنانے میں شب و روز لگے ہوئے ہیں۔ جزیرہ قبرس بہت دور ہے اور اس پر جو کچھ سرمایہ لگا ہے اسے برطانوی بحری حلقوں میں تقریباً ضایع شدہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن قبرس اور مالٹا کے درمیان متعدد چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن سے اب تک کوئی بحری کام نہیں لیا گیا ہے اور یہ سب یونان کے ہیں۔ اب کہ شاہی قایم ہو گئی ہے غالباً ان جزیروں کے لئے بات چیت جلد شروع ہوگی۔

غرض کچھ یونانیوں کی اپنی خواہش کہ سیاست ملکی میں تبدیل اور سکون کا سامان کریں، کچھ برطانیہ کے مذکورہ بالا منصوبے، پھر فرانس اور اٹلی کا کسی خالص برطانوی شہزادے کے مقابلہ میں شاہ جارج دوم کو غنیمت سمجھنا، نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جارج تخت یونان پر رونق افروز ہیں۔ ان کی تشریف آوری سے پہلے ہی یونان کے وزیر اعظم سلدارلیس کو ان کے ایک رفیق وزیر جنگ جنرل کونڈالیس نے (شاید اس شہزادہ کنٹ کی حمایت کے شبہ پر یا کیا!) نکال باہر کیا تھا۔ اب شاہ جارج نے تخت نشین ہونے کے چند روز بعد

ہی جنرل کو نڈالیس کو رخصت کر دیا ہے اور نئی وزارت کے مشورہ سے حکومت فرما رہے ہیں ۔

جزائر فلپائن کی آزادی ہندوستانیوں کو یہ معلوم کر کے یقیناً تعجب ہوگا کہ کل ۳۶ برس ریاستہائے متحدہ امریکہ کے قبضہ میں رہنے کے بعد حکمراں ملک ہی کے ایک قانون سے جزائر فلپائن کو آزادی حاصل ہونے والی ہے ! اور انگریز حکمرانوں اور اس ملک کی آزادی خواہ جماعت کے لئے فلپائن میں یہ امرکن سیاسی تجربہ بہت سبق آموز ثابت ہو سکتا ہے ۔

آزادی کی کوشش تو اہل فلپائن کوئی بیس سال سے کر رہے تھے مگر ۱۵ نومبر گذشتہ کو مملکت فلپائن کے پہلے منتخب شدہ صدر مانول کیزون نے اپنے جلیل القدر عہدہ کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے اور امریکہ اور مشرق بعید کے باہمی تعلقات میں ایک نئے باب کا آغاز ہوگیا ۔ موجودہ قانون کی رو سے ریاستہائے متحدہ امریکہ فوراً اپنے اقتدار میں معتد بہ کمی کر دیگی اور دس سال میں ملک کا سیاہ و سفید ملک والوں کے ہاتھ میں دے کر بالکل علیحدہ ہو جائے گی ۔

لیکن ہندوستانی آزادی خواہوں کے لئے اس تجربہ کا یہ سبق بھی قابل توجہ ہے کہ آزادی کا حاصل کر لینا ہی کافی نہیں، اسے باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لئے قوم میں اخلاقی معاشی اور فوجی قوت بھی ہونی چاہیے فلپائن میں ابھی نئے دستور سیاسی کو رائج ہوئے کوئی دو ہفتے ہی ہوئے ہوں گے اور یہ سوال خود وہاں کے مفکرین سیاسی کو ستانے لگا کہ دنیا کی موجودہ حالت میں اور خصوصاً جاپانی حلقۂ اثر میں اس آزادی کو برقرار بھی رکھا جا سکے گا یا نہیں ۔

کمزور کا تعلق جب کسی طاقتور سے قایم ہوتا ہے تو طرح طرح کی گتھیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے سلجھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے ۔ امریکہ سے تعلق نے فلپائن کی معاشی زندگی میں اسی قسم کی مشکلات پیدا کر دی ہیں ۔ جب سے یہ تعلق ہوا تجارت خارجہ کو ترقی ہوئی ۔ ۱۹۰۹ء سے تجارت آزاد کا سلسلہ شروع ہوا پہلے تو کچھ پابندیاں تھیں بھی ۱۹۱۳ء سے امریکہ اور فلپائن کی تجارت میں کسی قسم کی رکاوٹ محاصل درآمدو

برآمد کی نہ رہی ۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک ۲۰ برس میں فلپائن کی تجارت خارجہ تقریباً چوگنی ہوگئی ۔ یہ اچھی بات تھی، مگر فلپائن والے امریکی منڈی کے دست نگر بھی ہوگئے ۔ یعنی پہلے سنہ ۱۹۰۱ء میں فلپائن سے جو مال باہر جاتا تھا اس کا کل ۱۲ فیصدی امریکہ میں کھپتا تھا، سنہ ۱۹۲۴ء میں ۸۰ فیصدی مال وہاں جانے لگا اور جو مال باہر سے فلپائن آتا تھا اس میں بقدر ۶۵ فیصدی ۔ یاستہائے متحدہ امریکہ کا حصہ ہوگیا ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ تجارت خارجہ چند زرعی اجناس تک محدود ہے ۔ ایک شکر ہی کا حصہ فلپائن سے باہر جانے والے مال میں ۴۰ فیصدی ہے ۔ اور یہ سب کی سب امریکہ جاتی ہے ۔ شکر، ناریل، تمباکو اور سنی کو یکجا کر لیجئے تو فلپائن کی برآمد کا ۹۰ فیصدی ہو جاتا ہے ۔ ادھر امریکہ کے سوتی کپڑے کے لئے فلپائن کی منڈی سب سے بڑی ہے اور ایشیائی منڈیوں میں امریکی گوشت، لوہے اور فولاد کی بھی بہترین منڈی ہے ۔ غرض جب ریاست فلپائن کو امریکہ سے علیحدہ خود مختار ریاست بنانے کے درپے ہے تو معیشت ان جزائر کو امریکہ کا ایک جزو بنانے کی فکر میں ہے ۔ اور سیاست کی اس جیت میں بھی بعض امریکی معاشی حلقوں کا اثر کارفرما ہے ۔ اگر امریکہ میں فلپائن کی شکر اور ناریل کے تیل کی درآمد بند کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی تو امریکہ کے زرعی حلقے اس خود مختاری کے اتنے حامی نہ ہوتے ۔ امریکہ میں فلپائن کی آزادی کی حمایت سیاسی تدبیر کی رہین منت نہیں بلکہ معاشی اغراض کی پابند ہے ۔ چنانچہ اس جدید قانون آزادی کے دفعات سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے، اس قانون کی رو سے فلپائن کی منڈی تو کامل آزادی سے دس سال پہلے کے زمانہ میں امریکی مال کے لئے بالکل کھلی رہے گی مگر امریکی منڈی میں فلپائن کے روئی، شکر اور کھوپرے کے تیل کی مقررہ مقداریں ہی جا سکیں گی ۔ اور اس مدت کے آخری ۵ سال میں خود فلپائن کی حکومت بھی خود اپنے مال کی برآمد پر محاصل لگائے گی ۔ غرض جب فلپائن کا تعلق امریکہ سے بالکل قطع ہو جائے گا ۔ تو کھوپرے کے تیل کی صنعت اور سگار سازی کی صنعت یکسر تباہ ہو جائے گی لیکن چونکہ کھوپرے اور تمباکو کی مانگ دنیا میں ہے اس لئے صنعت کی تباہی کے ساتھ ان صنعتوں کی زرعی اساس باقی رہ سکے گی ۔ مگر شکر کا حال بہت ہی خراب ہوگا ۔ شکر کی صنعت کے ہاتھ سے اگر امریکہ کی منڈی نکل گئی تو یہ اپنے کثیر مصارف پیدائش کی وجہ سے کوبا اور جاوا سے دنیا کی منڈیوں میں مقابلہ نہ کر سکے گی ۔ اور اس کی تباہی کے معنی ہیں ۲۰ لاکھ اہل فلپائن کا روٹیوں کو محتاج ہو جانا اور حکومت کی آمدنی کے ۴۰ فیصدی کا

خطرہ میں پڑ جاتا۔ اس کی تباہی کے معنی ہیں فلپائن کے تمام ساہوکارہ کا درہم و برہم ہو جانا کہ دس سب سے بڑے بنکوں کے قرضوں میں کوئی نصف کے قریب اس شکر کی حمائت پر دے جاتے ہیں، سرکاری بنک کے کوئی سوا دو کروڑ ڈالر کے قرضہ میں سے تین چوتھائی شکر پر ہی دیا جاتا ہے۔ سرکاری ریل کی آمدنی کا کوئی ۲۵ فیصد شکر کی صنعت ہی سے وصول ہوتا ہے۔ اس صنعت کی تباہی سے سارا نظام معیشت منہدم ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے خود آزادی کا تجربہ ناکام ہو جائے۔

یہ مسائل فلپائن کے اہل سیاست کو پریشان کر رہے ہیں اور ان کو امید ہے کہ ملک میں زرعی فصلوں کا تنوع بڑھا کر، اور صنعتوں کو فروغ دے کر، اور اپنی ضرورتیں آپ پوری کر کے پردیس پر اتنا سہارا لینے کی ضرورت جاتی رہے گی۔ لیکن زرعی تنوع پیدا کرنے میں بہت دیر لگتی ہے اور صنعت کے قیام کے لئے سرمایہ درکار ہوتا ہے اور اس کی ان جزائر میں کچھ ایسی بہتات نہیں۔ ڈر ہے کہ سیاسی تبدیلی کے باعث پردیسی سرمایہ کچھ عرصہ تک اُدھر کا رُخ نہ کرے گا۔ اور اس لئے صنعتی ترقی کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہ ہوگی۔

ان معاشی دشواریوں کے ساتھ مشرق بعید کے اس علاقہ میں سیاسی پیچیدگیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں اور حفاظت ملکی کا مسئلہ اس وجہ سے اور بھی اہم ہو گیا ہے، خیال ہے کہ جزائر فلپائن جمعیۃ اقوام کی رکنیت حاصل کر کے دوسروں کے غالبانہ حملوں سے اپنے کو محفوظ کر سکیں گے لیکن اس علاقہ کی جمعیۃ کے ایک رکن چین کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ بہت امید افزا نہیں ہے۔ نہ اس کے زیادہ امکانات ہیں کہ کوئی بڑی مغربی قوت ان جزائر سے جارحانہ اور مدافعانہ معاہدہ کرے۔ اس لئے کہ اس معاہدہ سے اس قوت کو چنداں فائدہ نہ پہنچے گا اور جاپان کی رقابت خواہ مخواہ کو پیدا ہو جائے گی۔ ایک صورت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ تمام دول مل کر اس علاقہ کی غیر جانبداری کی ضامن بن جائیں۔ لیکن اس میں بھی جاپان حائل ہوگا جو اس علاقہ کے معاملات میں کسی دوسری قوت کی مداخلت کو روا رکھنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ اور یقیناً جاپان کی نظر ان جزائر پر ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ یہاں اپنا اقتدار قایم کر سکے تو ایشیا کے مشرقی ساحل کے تمام جزیروں پر اس کا قابو ہو جائے گا۔ اور شرق الہند میں اسے سیاسی اور تجارتی نفوذ کے لئے بڑا سہارا مل جائے گا۔ یعنی مشرق بعید میں جاپان کے اقتدار میں اور کوئی ساجھی نہ رہے گا۔

غلامی کی مصیبت سے نکلنے کے بعد آزادی کے خطرات بھی کچھ کم فکر میں ڈالنے والے نہیں ہوتے۔ مگر جو ان سے دو چار نہ ہو وہ انھیں حل کیسے کرے۔ امید رکھنی چاہیئے کہ فلپائن والے ان دشواریوں کا کوئی حل نکال سکیں گے چاہے اس میں اپنے نظام معیشت کو بدلنے کی ضرورت ہی کیوں نہ پڑے اور دس سال کے زمانہ امیدواری کے گذرنے پر ان دقتوں سے بچنے کے لئے پھر امریکہ کا اقتدار قایم کرلنے میں مدد نہ ہونگے۔ آزادی کی سچی طلب کا یہی امتحان ہے، کہ قوم آزادی کے نقصان کو غلامی کے نفع پر ترجیح دینے کے لئے آمادہ ہو۔

تصویر ہے، ساتھ ہی ساتھ آپ کو اپنے والدین اور خصوصاً اپنی ماں سے بے حد محبت تھی آپ کا یہ قول ہے کہ ماؤں کے قدموں کے نیچے جنت ہے، اور سب سے بالاتر بات یہ تھی کہ تمام لوگوں اور اصحاب سے ان کی یکساں ہمدردی اور اخوت تھی جو موجودہ اشتراکیت کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہیں، یہ تمام باتیں عربوں کے لئے زندہ مثالیں تھیں اور آج بھی تمام دنیا کے لئے مسلمانوں کے لئے ہیں۔

اسلام کے مذہبی قوانین کی بنیاد بھی دنیا کے بزرگ ترین مصلح محمد مصطفےٰ صلعم نے ایک طرف تو اجتماعیت پر اور دوسری طرف اخوت اور مساوات پر رکھی جو جمہوریت کے زرین اصول ہیں، چنانچہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ دن میں پانچ وقت اور ہفتہ میں ایک روز ضرور تمام مسلمان امیر و غریب بلا تفریق رنگ و ملت اور جاہ و مرتبہ ایک ہی بارگاہ میں ایک ہی منتخب کردہ شخص کی اقتدا میں سر نیاز خم کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، پھر سال میں دو مواقع (عیدین) ایسے فراہم کئے گئے ہیں جب شہر کے تمام پیروان اسلام ایک واحد مقام پر جمع ہو کر اور گلے مل کر اپنی برادرانہ شفقت اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں اور پھر زندگی میں کم سے کم ایک بار ہر مسلمان پر فرض عائد کیا گیا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے اجتماع میں ضرور شریک ہو، مکہ معظمہ کا یہ عظیم الشان اجتماع جہاں ایک مرکزی مقام پر دنیا کے تمام مسلمان خواہ وہ شاہ ہوں یا گدا، ایک ہی لباس میں ایک ہی وضع قطع میں نظر آتے ہیں گویا اسلامی سوشلزم کا سالانہ مظاہرہ ہے جو اخوت و مساوات کا عملی نمونہ ہے۔ اس اجتماع میں امیر و غریب، شاہ گدا کا کوئی امتیاز نہیں، چنانچہ ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہیں اور ہر شخص پر لازم ہے کہ سب لوگوں سے خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے مساویانہ برتاؤ رکھے، یہ سالانہ اجتماع محض ظاہری یکسانی اور انسانی مساوات ہی کی بین دلیل نہیں بلکہ انسانیت کی یک جہتی اور مقصد کی یکسانی کو بھی ظاہر کرتا ہے، ہزاروں مرد و عورت، ضعیف و جوان، ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے جان و مال کو معرض خطر میں ڈال کر اس مقام پر صرف ایک ہی مقصد، ایک ہی نیت کی تکمیل کے لئے آتے ہیں تاکہ وہ ایک واحد مرکز میں، ایک واحد اجتماع میں اکٹھے ہو کر اپنے واحد معبود رب العالمین کی عبادت میں ایک ساتھ سر نیاز خم کریں، چنانچہ لاتعداد انسانوں کا یہ مجمع جب ایک ساتھ دست بدعا ہوتا ہے تو ہر شخص کے دل میں صرف واحد برادرانہ لگاؤ اور روحانی رشتہ کا جذبہ ہی سینہ میں موجزن نہیں ہوتا بلکہ خدا کی ربوبیت اور انسان کی اخوت کا خیال اچھی طرح دل نشین ہو جاتا ہے۔

کسی اور مذہب نے انسانی اخوت کے تخیل کو اس واضح طور پر پیش نہیں کیا ہے جتنا کہ اسلام نے کیا۔ ہندو مذہب کی طرح اس میں ذات پات کا بکھیڑا مطلق نہ تھا، مغربی عیسائیوں کی طرح دولت اور عہدہ کی پیدائشی تفریق اس میں نہیں پائی جاتی، پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا کوئی علیحدہ طبقہ نہیں، اور نہ ان کے کوئی خاص حقوق اور اختیارات ہیں، اور خوبی دیکھو کہ محمد صلعم نے تمام بنی نوع انسان کو آخرت میں نجات کی امید دلائی، کلام مجید میں بار بار ذکر آیا ہے کہ ”خواہ وہ ایمان والے ہوں یا یہود یا نصاری یا آتش پرست جو اللہ اور آخرت پر یقین کرے گا اور عمل صالح کرے گا اس کو اللہ کی طرف سے ضرور بخشایش ہوگی، اسے نہ خوف کرنا چاہیے اور نہ افسردہ ہونا چاہیے۔“ (سورۂ مائدہ) پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

”اے محمدؐ! تو میری طرف سے ان لوگوں سے کہہ اے میرے بندو! گناہ کرکے اپنے آپ پر زیادتیاں کرنے والو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اللہ سب گناہ بخش دے گا، وہ بخشنے والا مہربان ہے“ (زمر ۴۹ پارہ ۲۴)

اس نئی اور عجیب مذہبی سوشلزم پر مشہور مورخ گبن اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے:۔

”محمدؐ کے بدترین دشمنوں نے ان کو برا بھلا اس وجہ سے کہا کہ نجات کی امید انھوں نے انھیں یہ کہہ کر دلائی کہ تمام لوگ جو اللہ پر ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے، آخرت کے روز عمدہ صلہ پائیں گے، ایسی عقلیت پسندانہ بے نیازی ایک راسخ العقیدہ شخص کے لئے غیر موزوں ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک آسمانی پیغمبر اپنے الہامات کی قدر قیمت کو اتنا ارزاں کردے۔“

آنحضرت کے اس عظیم الشان کارنامے اور ان کے ارفع ترین سوشلزم کی قدر جس کے لحاظ سے تمام بنی نوع انسان دنیا اور آخرت میں اپنے اعمال کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں، افسوس ہے کہ مسلمانوں نے نہ کی، مسلمانوں نے اپنے رسول کی تعلیم کے ایک ہی جزیعنی وحدانیت کو ذہن نشین کیا، وہ اپنی قوت اور ذہانت کا کثیر حصہ بحث و تکرار میں صرف کرتے رہے لیکن اپنے پیغمبر کی ان تعلیمات پر زیادہ غور و خوض نہ کیا جس نے انسان اور انسان کے درمیان ساری تفریقیں نیست و نابود کردی تھیں، عرب کے بزرگ ترین سوشلسٹ نے رنگ، ملک، ملت یہاں تک کے اعتقادات کی بھی تفریق مٹادی تھی، اور اشتراکیت کا

پہلو ہر شعبہ مثلاً سیاست، معاشیات، حکومت اور یہاں تک کہ مذہب میں بھی نہ ڈال کر دیا تھا۔ مسلمان اگرچہ والہانہ حد تک اپنے اعتقادات کے علمبردار رہے مگر قرآن تعلیم یعنی تمام انسانیت کی قطعی وحدت، کو دل سے بالکل محو کر دیا۔ قرآن نے عیسائیوں اور یہودیوں کو اس خیال پر لعنت کی ہے کہ وہ اپنے کو نجات کے تنہا اجارے دار سمجھتے ہیں لیکن مسلمان اسے بھول گئے۔ قرآن شریف میں ہے :۔ وَقَالُو یدخل الجنۃ الا من کان ھوداً او نصاریٰ۔ (بقرہ) یہی وطیرہ مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیا ہے۔

(باقی)

سوانگ

راجپوت خاندان میں پیدا ہو جانے ہی سے کوئی سورما نہیں بن جاتا۔ اور نہ نام کے پیچھے 'سنگھ' کی دُم لگا دینے ہی سے بہادری آتی ہے۔ گجندر سنگھ کے بزرگ کسی زمانہ میں راجپوت تھے۔ اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن اِدھر تین پشتوں سے تو نام کے سوا ان میں راجپوتی کی کوئی علامت نہ تھی گجندر سنگھ کے جد بزرگوار وکیل تھے اور جرح یا بحث میں کبھی کبھی رجپوتی کا مظاہرہ کر جاتے تھے۔ پدر بزرگوار نے کپڑے کی دوکان کھول کر اس مظاہرے کی بھی گنجائش نہ رکھی۔ اور گجندر سنگھ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ قد و قامت میں بھی فرق آتا گیا۔ بھوپندر سنگھ کا سینہ فراخ تھا۔ نریندر سنگھ کا شکم فراخ تھا۔ لیکن گجندر سنگھ کا کچھ بھی فراخ نہ تھا۔ وہ ہلکے پھلکے، گورے چٹے، عینک باز، نازک بدن، فیشنبل بابو تھے۔ انھیں علمی مشاغل سے خاص دلچسپی تھی۔

مگر راجپوت کیسا ہی ہو، اُس کی شادی تو راجپوت خاندان ہی میں ہوگی۔ گجندر کی شادی جس خاندان میں ہوئی تھی اُس میں راجپوتی جوہر بالکل فنا نہ ہوا تھا۔ اُن کے خسر پنشنر صوبہ دار تھے۔ سالے شکاری اور کشتی باز۔ شادی ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی تک ایک بار بھی سسرال نہ آسکا تھا۔ امتحانات سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ لیکن اب تعلیم ختم ہو چکی تھی، ملازمت کی تلاش تھی۔ اس لئے اب کی ہولی کے موقع پر سسرال سے بُلاوا آیا تو اس نے کوئی حیلہ حجت نہ کی۔ صوبے دار کی بڑے بڑے افسروں سے شناسائی تھی۔ فوجی افسروں کی حکام کتنی قدر و منزلت کرتے ہیں یہ اُسے خوب معلوم تھا۔ سمجھا ممکن ہے صوبہ دار صاحب کی سفارش سے نائب تحصیلداری میں نام زد ہو جائے۔ اِدھر شیام دُلاری سے بھی سال بھر سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ایک نشانہ سے دو شکار ہو رہے تھے۔ نیا ریشمی کوٹ بنوایا اور ہولی کے ایک دن پہلے سسرال جا پہونچا۔ اپنے گرانڈیل سالوں کے سامنے بچہ سا معلوم ہوتا تھا۔

شعلۂ طور

دور حاضرہ کے رنگین بیان اور خوش فکر شاعر حضرت جگر مراد آبادی کی کلیات شائع ہو گئی جس میں آپ کا وہ ابتدائی کلام بھی شامل کر لیا گیا ہے جو کسی زمانے میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے داغ جگر کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اور اب کمیاب، بلکہ نایاب ہے۔ اپنے تمام کلام کو خود حضرت جگر نے چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اور خود ہی اس پر اپنے خاص انداز میں رائے زنی بھی کی ہے۔

حضرت جگر کے والہانہ کلام کی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ان کے دیوان کی مانگ ہر طرف سے ہو رہی تھی جو اب نہایت اہتمام اور آب و تاب سے شائع ہو گیا ہے۔

کاغذ، طباعت، کتابت اعلیٰ، سرورق خوشنما رنگین۔ مجلد قیمت .... ؎

جاپان

مصنفہ چمن لال صاحب۔ مترجمہ محمود علی خاں صاحب (جامعی)

آج سے صرف اسی برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہے۔ بالکل گمنامی میں پڑا [تھا] لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا۔ اس [ا]نقلاب کی داستان اس زبردست تصنیف میں ملاحظہ کیجئے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر جے، ٹی سنڈرلینڈ (امریکہ) [کی ر]ائے ہے کہ "مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہے کہ یہ کتاب جدید جاپان کے متعلق سب سے زیادہ پر از معلومات تصنیف [ہے۔] مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ کس خوبی سے اس کے صفحات میں تازہ ترین اور دلچسپ معلومات کوٹ کوٹ کر بھری ہیں قابل [م]صنف نے ایک ہندوستانی کی حیثیت سے کتاب لکھتے وقت ہندوستان کو پیش نظر رکھا ہے"

ضخامت ۲۰۰ صفحات بلاک کی ۳۰ تصاویر۔ مجلد عہ۔ غیر مجلد (۱۱ تصاویر) ...... عہ

نفرت کا بیج

(ڈراما) از پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی، ایم اے

زندگی میں اس سے زیادہ کوئی چیز تلخی پیدا نہیں کر سکتی کہ دوست ناراض ہو کر دشمن بن جائیں، یا اپنی خود غرضیوں پر دوستی کو قربان کریں لیکن اس کے باوجود اس سے زیادہ کوئی چیز عام بھی نہیں ہے۔ ایسا تو بہت ہوتا ہے کہ خود غرضیاں جو دوستی کو بددلی میں تبدیل کر دیتی ہیں صرف تعلقات میں خنکی تک پہنچ جائیں لیکن کبھی کبھی ان کی حد سخت [عد]اوت تک پہنچ جاتی ہے وہ لوگ جو اپنے دل میں محبت کی جگہ نفرت کا بیج بوتے ہیں اس تمثیل کو ذرا غور سے پڑھیں

قیمت ۸ر

خطبات خالدہ خانم

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے خطبات جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دیئے تھے پہلے چار لکچروں میں ترکی کی تاریخ نہایت دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے۔ پانچویں اور چھٹے لکچر میں ترکی ادب، اُن کی شاعری، اُن کے ڈرامے اور ان کے صحیح ذوق پر ایک بے انتہا دلچسپ تبصرہ ہے، ساتویں لکچر میں بتایا گیا ہے کہ وہاں عورتوں نے کس طرح مردوں کے دوش بدوش قومی تعمیر میں حصہ لیا۔ اور آٹھویں لکچر میں آئندہ کی امیدوں کو پیش کیا گیا ہے۔ انگریزی قیمت سے ر۔ اردو قیمت عہ

مکتبہ جامعہ، قرول باغ، دہلی